~~25 JUN 1983~~

for text books and Re. 1.00 for over-night books per day shall be charged from those who return them late.

damage done to the book and will have to replace it, if the same is detected at the time of return.

اِقبال کا سیاسی کارنامہ

محمد احمد خاں

نیشنل کمیٹی برائے صد سالہ تقریباتِ ولادت علامہ محمد اقبالؒ

اِقبال اکادمی پاکستان

۹۰-بی-۲-گلبرگ ۳ ○ لاہور

ناشر : ڈاکٹر محمد معز الدین
ڈائرکٹر اقبال اکادمی پاکستان
۹۰ بی - ۲ گلبرگ III، لاہور

طابع : میاں محمد یعقوب

مطبع : حمایت اسلام پرنٹنگ پریس
ریلوے روڈ ، لاہور

تعداد : ۱۱۰۰

طبع اول : ۱۹۷۷ع



علامہ محمد اقبالؒ

(۱۸۷۷—۱۹۳۸)

فہرست مضامین

حیرت ! ــــ مگر کیوں ؟

اقبال اور سیاست ، شاعر اور سیاستدان ! ! ــــــ ہے تو اچنبھے میں ڈالنے والی ، بلکہ چونکا دینے والی بات ، مگر اَن ‌مِل ، بے جوڑ نہیں اور تضاد و تناقص تو اس میں بالکل ہی نہیں ! !

واقعہ یہ ہے کہ دنیا میں جامع کمالات ہستیاں بہت کم پیدا ہوتی ہیں ، اور ایسے اشخاص تو کمتر ہی ہوتے ہیں ، جن کی شخصیت میں یک رنگی کے ساتھ ساتھ تنوع بھی پایا جاتا ہے ــــ ایک بڑے فاتح ، ایک تجربہ کار سپہ سالار ، ایک ماہرِ حرب کی زندگی یقیناً دلچسپ ہوتی ہے ، لیکن اگر یہ فاتح ، ماہرِ موسیقی بھی ہو اور یہ سپہ سالار ، بزمِ ادب کا صدر بھی ہو اور یہ ماہرِ حرب ، صاحب شعر و سخن بھی ہو تو اس کی شخصیت کس قدر دلکش ہو جاتی ہے ــــ ! جو جاذبیت ایک خوش نما گلدستہ میں ہوتی ہے ، وہ خود گل میں کہاں ؟ اقبال ایک با کمال شاعر تھے ، ایک بلند پایہ فلسفی تھے ، ایک عالی مرتبت مفکر تھے ۔ ایک شخص میں اتنے کمالات کا اجتماع بجائے خود بڑی بات ہے ، مگر حیرت و استعجاب پھر بھی نہیں ہوتا ، تاہم بزم ادب کا یہ صدر نشیں ، جب رزمِ سیاست کی کمان اپنے ہاتھ لے لے ، اور گوشۂ خلوت کا یہ فلسفی و مفکر ، جب قوم کی رہبری و رہنائی کے لئے میدانِ کارزار میں کود پڑے ــــ اور پھر بھی تعجب نہ ہو ، یہ کیسے ممکن ہے ؟

اقبال کی شاعری کے متعلق بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور بہت کچھ لکھا جائے گا ۔ ان کے فلسفہ و پیام کا تجزیہ لوگ کرتے رہے ہیں اور آئندہ کرتے رہیں گے ۔ ان کے افکار و خیالات کی تشریح بہت کچھ کی جا چکی ہے اور مستقبل میں مزید شرحیں لکھی جائیں گی ، لیکن ان کے سیاسی و معاشی

آرا و تصورات کے متعلق بہت کم لکھا گیا اور عملی سیاسیات میں ان کی مساعی اور ان کے نتائج کو اس سے بھی کم اور بہت کم منظر عام پر لایا گیا ہے -

اقبال کی شخصیت اور اس کے فلسفہ و پیام کو پوری طرح سمجھنے کے لئے اور بالخصوص اس کے سیاسی ، معاشی و عمرانی افکار کو صحیح طریقہ پر ذہن نشین کرنے کے لئے اقبال کی سیاسی زندگی کا مطالعہ ایک پس منظر کا کام دیتا ہے ، شاعر کی حیثیت سے اقبال نے نہ صرف اپنے ماحول کو متاثر کیا بلکہ آنے والی نسلوں کے ذہن و دماغ پر بھی ان مٹ نقوش چھوڑے ہیں - وہ اپنے ماحول سے خود متاثر ہوئے اور اپنے کلام سے اپنے ماحول کو بھی متاثر کیا - ان کے فلسفہ میں حال و ماضی کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں اور مستقبل کے لئے ایک پیام بھی ، انھوں نے اپنے سوز و ساز سے پڑھنے والے کی خودی کو بھی بیدار کیا اور اس کے سامنے اجتماعی نظام کا ایک ایسا نقشہ پیش کیا جس کے رنگ و آہنگ میں ان کا نورِ بصیرت جگمگا رہا ہے ، انہوں نے اپنی بانگ درا سے ملت کے کاروانِ خفتہ کو جادہ پیما کر دیا اور وہ خود اس قافلہ کے ساتھ ساتھ گام فرسا بھی ہوئے ——— وہ شاعر زیادہ بڑے تھے یا مفکر ؟ وہ فلسفہ داں زیادہ اچھے تھے یا سیاستداں ؟ یہ سوالات ثانوی حیثیت رکھتے ہیں ، لیکن یہ واقعہ ہے کہ طبعاً عزلت پسند اور فطرتاً گوشہ نشین اقبال نے سیاست کے کوچوں کی خاک بھی چھانی ہے - سیاست سے ذہنی لگاؤ تو انہیں آغازِ شعور ہی سے رہا ، لیکن زندگی کے ایک دو نہیں ، پورے بارہ سال اور وہ بھی بھرپور جوانی کے نہیں ، پختہ عمری کے بارہ سال (۱۹۲۶ تا ۱۹۳۸) انہوں نے اس وادیٔ پر خار کی بادیہ پیمائی کی ! بارہ سال ، کچھ کم مدت ہوتی ہے ؟ پورا ایک جُگ ! ! ——— پچاس سال کی عمر راحت و آرام کی عمر ہوتی ہے ، لیکن اس عمر میں انھوں نے دشتِ سیاست کی سیاحی پر کمر باندھی ! حد یہ ہے کہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے ضیق النفس کے دوروں سے بے حال و نڈھال ، ملت کی گتھیوں کو سلجھاتے اور سیاست کے کانٹوں سے اُلجھتے رہے ! ! ملک کے ایک نامور عالم دین کے سامنے ملت کے بنیادی سیاسی مسئلہ کی تشریح کرتے رہے ، ان کو اور ان کے ذریعہ قوم کو " بمصطفٰی برساں

خویش'' کا پیغام سناتے رہے ! مسلم لیگ کو ملت کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرانے کی خاطر یونینسٹ پارٹی کے سیاسی قد و قامت کی درازی کا بھرم کھولتے اور سر سکندر کے طرۂ پر پیچ و خم کی دھجیاں اڑاتے رہے ! ! ــــ جیل وہ نہیں گئے ، لیکن جیل جانے کے لئے ہمیشہ تیار رہے ، لاٹھیاں انھوں نے نہیں کھائیں ، تاہم سینہ پر گولیاں کھانے کے لئے ہر وقت آمادہ رہے ! پاکستان کا تصور انھوں نے ہی پیش کیا ، پھر وہ محض ایک مجرد تصور پیش کر دینے پر ہی اکتفا کر کے گوشۂ عزلت میں بیٹھ نہیں رہے ، اس کے لیے راہ ہموار کی ، قوم کو ادھر اُدھر بھٹکنے سے بچایا ، اور اس کو بالآخر اسی شاہراہ پر ڈال دیا ! ــــ ایسا بہت کم ہوا ہے کہ کوئی حسین تصویر ، شاعر کے حجلۂ تخیل سے باہر نکل کر عمل اور کشمکش کی اس ہمہ تن مضطرب اور ہمہ وقت متغیر دنیا میں پوری آب و تاب سے جلوہ گر ہوئی ہو - لیکن ہمارے زمانہ میں ، پیکار تصورات کی اس صدی میں ، حرب و ضرب کی موجودہ دنیا میں ایسا ہوا ، اور سب کی آنکھوں کے سامنے ہوا ! ــــ شاعر اقبال کے خیالی پیکر نے بیسویں صدی کے وسط میں ، جنوبی ایشیا کے خطہ میں ، باوجود سخت مزاحمتوں اور سخت ترین مخالفتوں کے ایک عظیم مملکت کی شکل اختیار کر لی ! ! یہ واقعہ بجائے خود اس بیسویں صدی کا ایک اعجوبہ ہے ، عقل کو عاجز کر دینے والا واقعہ ! ! پاکستان ــــ ایک شاعر کی تخیلی ریاست ، اور ایک قوم کی نظریاتی (ideological) مملکت ! ! پھر ایسا تو شاذ ہی کبھی ہوا ہو کہ خود اس شاعر نے اپنے اس تصور کو صورت پذیر کرنے کے لیے عملی جد و جہد کی ہو ، مخالفتوں کا جواب دیا ہو ، قوم کو اس کے لیے آمادہ و تیار کیا ہو ! ــــ اقبال نے یہ سب کچھ کیا ، پچاس سال کی سن رسیدہ عمر سے لے کر مرتے دم تک ! ! پھر یہ سب کچھ کر چکنے کے بعد انھوں نے اپنی ساری سیاسی کمائی خاموشی کے ساتھ اس کے حوالے کر دی ، جو ان کی نظر میں اس امانت قومی کا حقیقی پاسبان اور کشتیٔ ملت کا سچا نگہبان تھا ! ــــ قائد اعظم محمد علی جناح ! ! کیسا حسین تصور کیسی تابناک عملی جد و جہد اور کس قدر درخشاں فیصلہ ! ! ! ان کی اس روداد

زندگی کا پوری طرح جائزہ لیے بغیر فیصلہ صادر کر دینا انصاف نہیں ہے ——
نہ اقبال کی شخصیت کے ساتھ نہ ان کے کلام و پیام کے ساتھ —— ! !

پروفیسر رشید احمد صدیقی نے کہا تھا کہ " اقبال کی شاعری ، خود شاعری کی معراج[1] ہے" اور شاید یہ کہنا بھی غلط نہ ہو کہ ان کا فلسفہ ، خود فلسفہ کا تزکیہ تھا ، ان کا تفکر خود فکر کی بلندی کا کمال ! ! ——
اور ان کی سیاست ؟ آئیے دیکھیں !

——:o:——

۱۔ گنج ہائے گراں مایہ مطبوعہ سلطان بکڈپو حیدرآباد دکن ص ۱۶ ۔

باب ۱

وطن پرستی کا دور

اقبال کی زندگی کا پہلا دور | ڈاکٹر اقبال بتاریخ ۹ نومبر سنہ ۱۸۷۷ء سیالکوٹ میں پیدا ہوئے ، ابتدائی تعلیم قدیم طرز پر مکتب میں پائی ۔ بعد میں سیال کوٹ مشن اسکول میں داخل ہوئے ، پھر گورنمنٹ کالج لاہور سے سنہ ۱۸۹۷ء میں بی ۔ اے کا امتحان بیس سال کی عمر میں پاس کیا ، سنہ ۱۸۹۹ء میں انھوں نے ایم ۔ اے کیا اور اسی سال اورینٹل کالج لاہور میں تاریخ ، فلسفہ و سیاسیات کے لکچرار مقرر ہوگئے[1]۔ اس کے بعد گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ و انگریزی کے پروفیسر کی حیثیت سے کام کیا ۔ سنہ ۱۸۹۹ء سے سنہ ۱۹۰۵ء تک وہ اس عہدہ پر مامور رہے ۔ سنہ ۱۹۰۵ء میں انھوں نے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کی غرض سے ولایت کا سفر کیا ۔ یہ زمانہ اقبال کے شباب کا زمانہ ہے ۔

ہندوستان میں اپنی حکومت کا آغاز | اس وقت ملک کے سیاسی حالات کیا تھے ؟ سنہ ۱۸۵۷ء کا ہنگامہ فرو ہو چکا تھا ۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہو چکی تھی ، اور اب ہندوستان کا تعلق براہ راست تاج برطانیہ سے ہو گیا تھا ۔ حکومت کے نظم و نسق کی باگ ڈور گورنر جنرل وائسرائے کے توسط سے وزیر ہند کے ہاتھوں میں آ گئی تھی ، جو انگلستان کی پارلیمان کے سامنے جواب دہ تھا ۔ ملکہ وکٹوریہ کا تاریخی اعلان ہو چکا تھا ۔ اس

۱۔ روزگار فقیر جلد اول مصنف فقیر سید وحیدالدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی ، بار چہارم مئی ۱۹۶۳ء ص ۲۴۴ ۔

اعلان میں ہندوستان کی سیاسی منزل مقصود کو نشان زد کیا گیا تھا ، اور اہل ملک کو یہ خوش خبری سنائی گئی تھی کہ جمہوری اداروں کے قیام کے ذریعے ہندوستانیوں کو اس قابل بنایا جائے گا کہ وہ اپنے ملک کا انتظام آپ کر سکیں ۔ چنانچہ سنہ ۱۸۶۱ء میں یعنی اقبال کی ولادت سے تقریباً سولہ سال قبل آئینی اصلاحات کا پہلا قانون منظور ہو چکا تھا ، جس کی رو سے تین ہندوستانی وائسرائے کی کونسل میں نامزد کیے جا چکے تھے ، گویا یہ پہلا قدم تھا ، جو تاجِ برطانیہ نے ہندوستانیوں کے جذبات و احساسات کو مطمئن کرنے کے لیے اٹھایا تھا ، پھر جب سنہ ۱۸۸۰ء میں لارڈ رپن آئے تو انھوں نے لوکل باڈیز میں طریقۂ انتخاب جاری کر کے حکومتِ خود اختیاری کی بنیاد ڈال دی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ آئیسویں صدی کے اواخر میں خود ایوانِ حکومت کے اندر یہ رجحان پیدا ہو گیا تھا کہ مثل انگلستان کے یہاں بھی ایک حزبِ مخالف (opposition party) قائم ہو، چنانچہ خود لارڈ ڈفرن نے مسٹر ہیوم کو جو انڈین نیشنل کانگریس کے جنم داتا سمجھے جاتے ہیں ، خانگی طور پر ایک حزبِ مخالف قائم کرنے کا مشورہ دیا تھا[۲] ۔

کانگریسی تحریک کی ابتداء ادھر تو ایوانِ حکومت کا یہ رجحان تھا اور ادھر ملک میں عوامی جذبات و احساسات ، جنھوں نے سنہ ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ کو جنم دیا تھا ، اب ایک نئے روپ میں جلوہ گر ہونے کے لیے مچل رہے تھے ، البرٹ بل (جس کا مقصد ہندوستانی نظامِ فوج داری پر سے وہ پابندیاں اٹھا لینا تھا جو ، ان پر یورپی اور امریکی ملزموں کے مقدمات کی سماعت کے متعلق عائد تھیں) کی اینگلو انڈین اصحاب نے سخت مخالفت کی ، جس کے باعث ہندوستانیوں کے جذبات قومی کو مہمیز لگی اور جب مسٹر ہیوم نے دسمبر سنہ ۱۸۸۵ء میں کانگریس[۳] کی بنیاد رکھی تو ہندوستان کی پبلک زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوا ، اور یہ ادارہ تعلیم یافتہ ،

۲- اہلِ ہند کا ارتقا از اے ۔ سی مزمدار ص ۲۷ ۔

۳- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا مطبوعہ ۱۹۳۵ ص ۲۸ ۔

روشن خیال، محب وطن افراد کا ایک مرکز بن گیا ۔ اب کانگریس، برطانوی تاج کے ساتھ وفاداری کا اعلان کرتے ہوئے ہندوستان کی دفتری حکومت کی شکایت اور اس کی نا اہلیت پر تنقید کرنے لگی، وہ مزید اصلاحات کے لیے مودبانہ عرض معروض بھی کرتی اور انگریزی پارلیمان سے یہ آس لگائے ہوئے بھی تھی کہ وہ ضرور ایک نہ ایک دن ملک میں جمہوری حکومت قائم کردے گی ! ملک کے ان حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے اصلاحات کی دوسری قسط سنہ ۱۸۹۲ع کے قانون کی صورت میں عطا کی گئی تھی، جس کی رو سے بلدیات، جامعات اور تجارتی ادارات سے صوبہ کی کونسلوں میں اراکین لیے جانے لگے —— ملک کی سیاسی تصویر کا یہ خاکہ ابھی مکمل نہیں ہوا، اس کے ایک گوشہ میں اس بدقسمت قوم کی حالت بھی دکھائی ہے، جس کو ''مسلمان'' کے نام سے پکارا جاتا ہے ۔

سر سید کی تحریک کا آغاز : اس زمانہ میں مسلمانوں کی قوم ہی ایک ایسی جماعت تھی جس کو پوری طرح کچلا گیا تھا ۔ سنہ ۱۸۵۷ع کی جنگ میں اگرچہ شریک ہندو مسلمان دونوں ہی تھے لیکن نزلہ بر عضو ضعیف کے مصداق انگریزوں نے اپنا انتقام اسی بدنصیب قوم سے لیا جس کے ہاتھوں سے اس نے حکومت چھینی تھی، اقتدار سے محرومی کے باعث اس قوم کی کمر ٹوٹ گئی تھی اور اب حکومت وقت کے انتقام نے ان کا رہا سہا بل بھی نکال دیا تھا[۴] ۔ دولت و حکومت ایک دوسرے کے ساتھی ہیں، حکومت نے جب ان سے منہ موڑ لیا تھا تو پھر دولت کیوں ساتھ دیتی؟ بہرحال مسلمان زمانہ کی چکی کے ان دو سیاسی و معاشی پاٹوں کے درمیان پس رہے تھے ۔ ایسے وقت میں سر سید نے ان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا ۔ جدید تعلیم اور انگریز سے ربط و ضبط، یہ دو نسخے تھے، جو سر سید نے مسلمانوں کے مرض کے لیے تجویز کیے، اور پرہیز یہ بتایا کہ سیاسیات میں کوئی حصہ نہ لیا جائے، مسلمانوں نے اس طبیب پر پورا بھروسہ کیا اور ان دونوں نسخوں کے استعمال کے ساتھ ساتھ اس کے بتائے ہوئے پرہیز پر عمل کیا ۔

۴- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس از ڈاکٹر پتا بھی سیتا رامیا مطبوعہ ۳۵ ص ۶ -

اس علاج کا نتیجہ پوری طرح ظاہر ہونے لگا ۔ ایک طرف مسلمانوں میں روشن خیال اور تعلیم یافتہ نوجوان پیدا ہونے لگے اور دوسری طرف حکومت کے دل میں مسلمانوں کی طرف سے جو بغض پیدا ہوگیا تھا ، وہ اس تعلیم و ارتباط کے باعث بڑی حد تک زائل ہونے لگا ۔

اس دوران میں کانگریس نے سرسید کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنانے کی کوشش کی ، لیکن سرسید کے انکار کی وجہ سے مسلمان بحیثیت مجموعی اس میں شریک نہ ہوئے ۔ بلکہ سیاسیات میں حصہ لینے سے کنارہ کش ہی رہے ۔ سرسید یوں تو بنیادی طور پر ہندو مسلم اتحاد کے قائل اور ابتدائی زمانہ میں اس کے لیے سرگرم عمل رہے ، لیکن اپنی زندگی کے آخری حصہ میں ان کے خیالات بدل گئے ، اس تبدیلی کے صحیح اسباب و وجوہ کیا تھے ، ان سے ہمیں یہاں سروکار نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ سرسید نے عمر کے آخری حصے میں مسلمانوں کو کانگریس سے الگ رکھا ۔ آل انڈیا نیشنل کانگریس کے قیام کے صرف ایک سال بعد یعنی سنہ ۱۸۸۶ع میں ، اس جماعت کے مقابلہ میں ، انھوں نے علی گڑھ میں ، آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کی بنیاد
۵ رکھی اور مسلمانوں کو جدید تعلیم کے حصول کی طرف مائل کرنا ، اس کا مقصد قرار دیا ، لیکن حقیقتاً اور عملاً یہ ادارہ غیر سیاسی انداز میں مسلمانوں کے جذبات و احساسات کے اظہار کا ایک ذریعہ بن گیا ۔ ان کے اجتماعی شعور کی آبیاری کے لیے یہ ایک سرچشمہ ثابت ہوا ۔ کچھ عرصہ بعد ان کی ایک عظیم سیاسی تحریک نے اس کی گود میں جنم لیا[۵] ۔ گویا یہ ادارہ مسلمانان ہند کی اجتماعی زندگی کا ایک "مادری ادارہ" (Mother Institution) تھا ! ا———یوں سرسید نے نہایت دانائی اور ہوشیاری کے ساتھ آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے ذریعہ نہ صرف مسلمانوں کو مجتمع کرکے ان میں قومی ترقی کے جذبہ کو بیدار کیا بلکہ مستقبل میں اپنی صفوں کو منظم کرنے ، اپنے حقوق کے لیے جد و جہد کرنے اور

۵- سنہ ۱۹۰۶ع میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس ڈھاکہ کے اجلاس ہی میں مسلم لیگ کی تاسیس عمل میں آئی ، جس کا ذکر اپنی جگہ پر آگے آ رہا ہے ۔

آیندہ ترقی کرنے کی نیو بھی ، انھوں نے اس کے ذریعہ ڈال دی تھی !

کانگریس میں تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد شریک تھی ، مگر مسلمان بحیثیت مجموعی اس سے الگ ہی تھے ، اس لیے یہ کہا جا سکتا ہے کہ سرسید اور کانگریس کا یہ اختلاف ، تعلیم یافتہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا اختلاف تھا اور اس اختلاف کی نوعیت کچھ شدید بھی نہیں تھی ، عوام میں اس کا اثر ابھی پھیلنے نہ پایا تھا یہ حالات انیسویں صدی کے آخری دہے تک رہے ، لیکن اس کے بعد سے اس اختلاف کا اثر آہستہ آہستہ عوام میں پھیلنے لگا !

سنہ ۱۸۸۹ء میں لوکمانیہ تلک کانگریس کے مطلع سیاست پر نمودار ہوئے[٦] ، یہ صوبہ بمبئی کے رہنے والے ذات کے مرہٹہ ، اور خیالات کے لحاظ سے سخت متعصب ہندو تھے ، کانگریس کے غیر فرقہ وارانہ پلیٹ فارم پر وہ آئے تو تھے قوم پرستی (Nationalism) کا لبادہ اوڑھ کر ، لیکن نمایاں ہوئے اپنی کٹر فرقہ پرستی اور مسلم دشمنی کے باعث !— اور مرتے مرتے سرزمین ہند میں ہندو مسلم دشمنی کا بیج بو گئے ! ! انھوں نے ایک سخت قسم کی فرقہ پرستانہ تحریک شروع کی ، جو دراصل ہندو مت کے احیا (Revival of Hinduism) کی تحریک تھی ، اس تحریک کے دو اجزاء تھے، ایک جز کا مقصد ہندو راج کا احیا تھا تو دوسرے کا منشا ہندو دھرم کو ازسر نو زندہ کرنا ہندوؤں میں ہندو راج کی آرزو کو بیدار کرنے کے لیے انھوں نے شیواجی کی یادکو تازہ کیا ۔ اس کو "قومی ہیرو" کے طور پر پیش کیا ، اس کے یوم ولادت اور "تاج پوشی" کی یادگارمیں میلوں کا آغاز کیا ! سابق صدر کانگریس اور مصنف تاریخ کانگریس ، ڈاکٹر پتابھی سیتار امیا اعتراف کرتے ہیں کہ "لوکمانیہ تلک پہلے شخص تھے ، جنھوں نے شیواجی کی یادکو ازسرنو تازہ کرنے کے لیے قدم اٹھایا، مہاراشٹر میں پبلک میٹنگیں اور جلسے وغیرہ ہوئے[٧]" —— ہندو دھرم کی بحالی

٦- ہسٹری آف کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۱۳۹

٧- تواریخ کانگریس از پتابھی سیتا رامیا مطبوعہ ۱۹۳۵ء ص ۱۵۹ و ۱۶۰

کے لیے انھوں نے گئوماتا کا سہارا لیا ، گئو رکھشا کا نعرہ لگایا اور مخالف ذبیحہ گاؤ انجمنیں قائم کیں - ان ہی انجمنوں میں سے ایک انجمن گئو رکھشنی سبھا بنارس نے وہ اشتعال انگیز مرقع چھپوایا تھا ، جس میں مقدس گائے پر ایک خونخوار مسلمان کو تلوار سے حملہ آور ہوتے ہوئے دکھایا گیا تھا اس مسلمان کی تھوتنی خنزیر کی تھی اور گائے کے قدموں کے نیچے قرآنی آیت درج تھی ، جس میں قربانی کا فلسفہ بیان کیا گیا تھا[۸] !!

تلک مہاراج کی ان حرکتوں اور پھر ان کی آتش فشاں تقریروں کا جلد ہی یہ نتیجہ نکلا کہ سنہ ۱۸۹۳ء میں محرم کے موقع پر ، خود ان کے صوبہ بمبئی میں ، خون ریز فسادات پھوٹ پڑے - ظاہر ہے کہ ان کی تحریک کے یہ دونوں اجزاء مسلمانوں کو بھڑکانے والے اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے لڑانے والے تھے ، شیواجی ، حضرت اورنگ زیب عالمگیر کا باغی تھا ، اور عالمگیر مسلمانوں کی نظر میں نہ صرف شہنشاہ ہند ، بلکہ "کار زار کفر و دیں" میں بقول اقبال "مسلم ترکش کا آخری تیر" تھے! اس لیے شیواجی کو ہیرو قرار دینا ، مسلمانوں کا منہ چڑانا تھا اور گئو رکھشا کی تحریک چلانا ، مسلمانوں کے مذہبی جذبات کو برانگیختہ کرنا تھا - حقیقت یہ ہے کہ ہندو دھرم و ہندو راج کے احیاء کی اس "تلک تحریک" کا طرزِ فکر مخاصمانہ ، طریقۂ عمل معاندانہ ، اور مزاج جارحانہ تھا - یہ اسلام اور مسلمان دونوں کے خلاف تھی - اس کی زد تعلیمات اسلام پر پڑ رہی تھی اور اس کی ضرب سے مسلمانوں کا قومی وقار مجروح ہو رہا تھا ، ستم بالائے ستم یہ کہ انھوں نے اپنی اس تحریک کو عوامی رنگ دے دیا تھا ، جلسے و جلوس میلے اور ٹھیلے ، تقریریں و بیان بازیاں اور ساتھ ہی کارٹون اور تصویریں بھی ـــ یہ سب ہندو عوام کو متاثر کرنے اور مسلم عوام کو اشتعال دلانے کے ہتھکنڈے تھے - یوں انیسویں صدی کے وسط میں آل انڈیا نیشنل کانگریس کے قیام اور سرسید کی مخالفت کے باعث ، ہندو مسلم اختلاف کی جو ہلکی سی لہر ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی سطح پر ابھر آئی تھی ، اب وہ بیسویں صدی تک پہنچتے پہنچتے ، کافی وسیع ہو گئی تھی اور جب بیسویں

۸- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۳۲

صدی کا آغاز ہوا تو اس میں مزید وسعت اور گہرائی پیدا ہو گئی۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ اس زمانہ میں، حالات سے مجبور ہو کر، مسلمانوں نے سرسید کی عائد کردہ بندش کو توڑ دیا اور عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا!

مسلمانوں کے اس اقدام اور ہندو مسلم اختلاف کی لہر میں شدت اور وسعت پیدا ہونے کا سبب ایک اور واقعہ ہے، جو بظاہر اس وقت معمولی نظر آتا تھا، لیکن جس نے آگے چل کر مہیب صورت اختیار کر لی۔ یہ واقعہ اردو ہندی کا قضیہ ہے۔ ہندوؤں میں اردو کی جگہ ہندی کی ترویج کا خیال یوں تو سنہ ۱۸۶۷ع ہی میں پیدا ہو چکا تھا[۹] اور اس سلسلہ میں ان کی کوششیں پیہم جاری تھیں، اپریل سنہ ۱۹۰۰ع میں یہ کوششیں بارآور ہوئیں۔ ۱۸ اپریل کو صوبہ جات متحدہ (یوپی) کی حکومت نے ایک حکم جاری کیا، جس کا منشا یہ تھا کہ دفاتر میں ہندی کی ترویج ہو۔ بس پھر کیا

۹۔ ''حیاتِ جاوید'' (سرسید کے سوانح حیات) میں مولانا حالی نے اس واقعہ کا جن الفاظ میں ذکر کیا ہے، ان کا اعادہ یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔ لکھتے ہیں: ''سنہ ۱۸۶۷ع میں بنارس کے بعض سربرآوردہ ہندوؤں کو یہ خیال پیدا ہوا کہ جہاں تک ممکن ہو، تمام سرکاری عدالتوں میں سے اردو زبان اور فارسی رسم الخط کے موقوف کرانے میں کوشش کی جائے اور بجائے اس کے بھاشا زبان جاری ہو، جو دیوناگری میں لکھی جائے۔

سر سید کہتے تھے کہ یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے یقین ہو گیا کہ اب ہندو مسلمانوں کا بطور ایک قوم کے ساتھ چلنا اور دونوں کو ملا کر سب کے لیے ساتھ ساتھ کوشش کرنا محال ہے۔ ان کا بیان ہے کہ انہیں دنوں میں جبکہ یہ چرچا بنارس میں پھیلا ایک وفد، مسٹر شیکسپیئر سے جو اس وقت بنارس میں کمشنر تھے ملا، اس وفد میں میں مسلمانوں کی تعلیم کے باب میں کچھ گفتگو کر رہا تھا اور وہ متعجب ہو کر میری گفتگو سن رہے تھے، آخر انھوں نے کہا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی کا ذکر سنا ہے، اس سے

تھا ، ہندوؤں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی ، مگر مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ۔ ہندوؤں نے حکومت کی خدمت میں اظہار تشکر کے لیے جلسے کیے ، تو مسلمانوں نے بھی اس حکم کے خلاف احتجاج کرنا ضروری سمجھا ۔ چنانچہ بتاریخ ۱۳ مئی سنہ ۱۹۰۰ع علی گڑھ میں نواب محسن الملک نے ، جو سر سید کے جانشین اور محمڈن اینگلو اورینٹل کالج (ام ۔ اے ۔ او ، کالج) علی گڑھ کے سیکریٹری تھے ، ایک جلسہ منعقد کیا ۔ جس میں حکومت کے رویہ کی مذمت کی اور ناگری رسم الخط و ہندی کے اجرأ کے خلاف تقریر کی ۔ گورنر کی ناراضگی کے علی الرغم ، اسی طرح کا ایک اور جلسہ بتاریخ ۱۸ اگست سنہ ۱۹۰۰ع انھوں نے بمقام لکھنؤ منعقد کیا اور اس میں بھی سخت تقریر کی —— پھر محسن الملک ہی نے ، اسی زمانہ میں ، آردو ڈفنس ایسوسی ایشن قائم کی ، ہندوؤں کی اس تنگ نظری اور حکومت وقت کی اس بے جا طرفداری نے مسلمانوں کی آنکھیں کھول دیں اور انھیں اپنے حقوق کی حفاظت کے لیے آمادۂ عمل کر دیا ۔ چنانچہ آردو ہندی کے اس جھگڑے

بقیہ حاشیہ صفحہ نمبر ۱۱

پہلے تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کیا کرتے تھے ، میں نے کہا کہ اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ، ابھی تو بہت کم ہے آگے زیادہ مخالفت اور عناد ان لوگوں کے سبب ، جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں ، بڑھتا نظر آتا ہے ، جو زندہ رہے گا ، وہ دیکھے گا ۔ انھوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہو تو نہایت افسوس ہے ۔ میں نے کہا مجھے بھی نہایت افسوس ہے ، مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے ۔'' (حیات جاوید طبع ثانی ص ۱۴۹)

سر سید کی یہ پیشین گوئی لفظ بلفظ کتنی صحیح ثابت ہوئی ۔ ہندوؤں میں آردو کی بجائے دیوناگری ہندی کی ترویج کا محض خیال (عمل نہیں) پیدا ہو جانے پر سر سید نے جس رد عمل کا اظہار کیا ہے اس سے جہاں ان کی فراست اور دوربینی ظاہر ہوتی ہے ، وہیں اس واقعہ کے دور رس نتائج اور بنیادی اثرات کا اندازہ ہوتا ہے !

کے صرف ایک سال بعد یعنی اکتوبر سنہ ۱۹۰۱ء میں محسن الملک اور ان کے ساتھی وقار الملک دونوں نے ، مل کر " محمڈن پولیٹیکل آرگنائزیشن" کے نام سے ایک سیاسی جماعت بمقام علی گڑھ قائم کی ، جس کا مقصد مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ تھا ۔ وقار الملک اس کے سربراہ تھے ۔ انھوں نے اس تنظیم کو پھیلانے اور مسلم رائے عامہ کو بیدار کرنے کے لیے مختلف مقامات کے دورے کیے ، جلسے منعقد کیے اور تقریریں کیں ۔ اگرچہ وقار الملک اور ان کے ساتھیوں نے نہایت حزم و احتیاط سے کام لیا ، مگر حکومت مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کو اور مسلمان لیڈروں کی سرگرمیوں کو شک و شبہ کی نظروں سے دیکھتی رہی ! یہ تنظیم صرف سنہ ۱۹۰۳ء تک قائم رہی اور اس کے بعد ختم ہو گئی ۔

مندرجہ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہندو مسلم اختلافات کی وہ ہلکی سی لہر جو انیسویں صدی کے وسط میں ، ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے بحر پر سکون میں پیدا ہوئی تھی ، بیسویں صدی کی آمد آمد تک بڑھتی ہی گئی یہاں تک کہ اس صدی کے آغاز میں اس کے اندر ایک گونہ "گہرائی" بھی پیدا ہو چلی تھی اور گیرائی بھی ، وہ کچھ شدید بھی ہو گئی تھی اور نسبتاً وسیع بھی ! !

یہ ہیں وہ عام سیاسی حالات ، جو اقبال کی زندگی کے ابتدائی دور یعنی سنہ ۱۹۰۵ء تک پیش آئے ۔ ملک کا یہ ماحول تھا جس میں انھوں نے جنم لیا ، تعلیم پائی اور عملی زندگی میں قدم رکھا ۔ زیر تبصرہ دور ، ہندوستان میں عام بیداری کے آغاز کا دور ہے ۔ ایک طرف اس دور میں وطن کی آزادی اور اندرون ملک جمہوری ادارات کے قیام کی تحریکات جاری ہوئیں جن کو چلانے والی جماعت کانگریس تھی اس جماعت کو سب سے زیادہ تائید ہندوؤں سے حاصل ہوئی ، جو ملک کے دیگر باشندوں کی بہ نسبت زیادہ مال دار ، زیادہ تعلیم یافتہ اور کثیرالتعداد تھے ۔ دوسری جانب اسی زمانہ میں تباہ حال مسلمانوں میں زندگی کے آثار پیدا ہوئے ، تعلیم پھیلی اور سیاسی شعور بیدار ہوا ۔ یہ تو اس دور کے روشن پہلو ہیں لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے ، اور وہ ہے ہندو مسلم اختلاف کا آغاز ۔ اس بیداری کے ساتھ ساتھ ان دو جماعتوں میں اختلاف بھی پیدا ہوا ۔ اس اختلاف کی نوعیت

سیاسی بھی تھی اور معاشی بھی، ثقافتی بھی تھی اور لسانی بھی ۔ ابتدایہ اختلاف مخصوص طبقوں تک محدود رہا لیکن تلک مہاراج کی تحریک اور اُردو ہندی کے قضیہ کے ساتھ ، ہندو مسلم عوام بھی، اس دائرۂ اختلاف کے اندر گھر گئے ـــــ آئیے اب دیکھیں کہ اس دور نے ہمارے شاعر کے ذہن و فکر اور قوت متخیلہ و قوت عمل کو کس حد تک متاثر کیا ۔

اقبال کی پبلک زندگی کا آغاز | یوں تو سنہ ۱۸۹۹ع ہی میں عوام ، اقبال سے روشناس ہو چکے تھے ، جبکہ وہ لاہور میں زیر تعلیم تھے۔ سر عبدالقادر بانگ درا کے مقدمہ میں تحریر فرماتے ہیں :

" سنہ ۱۹۰۱ع سے غالباً دو تین سال پہلے میں نے انھیں پہلی مرتبہ لاہور کے مشاعرہ میں دیکھا ، اس بزم میں ان کو ، ان کے چند ہم جماعت کھینچ کر لے آئے اور انہوں نے کہہ سن کر ایک غزل بھی ان سے پڑھوائی، اس وقت تک لاہور میں لوگ اقبال سے واقف نہ تھے "۔

ان مشاعروں کے علاوہ سنہ ۱۸۹۹ع میں اقبال نے " نالۂ یتیم " کے عنوان سے انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ میں ایک نظم پڑھی ۔ اس کے بعد سے انجمن کے سالانہ جلسوں میں اقبال کی نظم ایک ضروری چیز ہو گئی [۱۰]۔ چنانچہ سنہ ۱۹۰۰ع میں انھوں نے "یتیم کا خطاب ہلال عید سے" اور سنہ ۱۹۰۱ع میں " ابر گہربار" کے عنوانات سے انجمن مذکور کے سالانہ جلسوں میں نظمیں پڑھیں ، یہ نظمیں بانگ درا میں شامل نہیں ہیں ۔ بانگ درا کی پہلی نظم "ہمالہ" ہے ۔ یہ نظم اقبال نے ایک ادبی مجلس میں سنائی تھی اور اس کی مقبولیت کو دیکھ کر سر شیخ عبدالقادر نے اس کو اپنے رسالہ مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں ، جو اپریل سنہ ۱۹۰۱ع میں نکلا ، شائع کر دیا ۔ یہ گویا اقبال کی پبلک زندگی کا با ضابطہ آغاز تھا ، اب ان کی شہرت صرف مشاعروں اور ادبی مجلسوں کی حد تک نہیں رہی بلکہ قومی اجتماعات اور ملکی صحافت میں بھی ان کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا ، ان کی اس عزت و شہرت کی وجہ ، محض ان کی شاعری نہیں

۱۰۔ "نیرنگ خیال" اقبال نمبر ص ۳۱ و ۳۲۔

تھی بلکہ قومی زندگی اور وطنی معاملات کے متعلق ان کے وہ خیالات تھے جو وہ اپنی نظموں میں ظاہر کیا کرتے تھے۔ ہمارے موضوع کے لحاظ سے ان کے اس دور کی نظموں میں "ہمالہ" "ترانہ ہندی" "ہندوستانی بچوں کا گیت" "نیا شوالہ" "پرندہ کی فریاد" "صدائے درد" "تصویر درد"—— اہم ترین نظمیں ہیں، ان کے علاوہ "خفتگان خاک سے" "بچے کی دعا" اور "سر سید کی لوحِ تربت" میں بھی ان کے سیاسی خیالات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ آئیے ایک نظر ان نظموں پر بھی ڈالتے چلیں۔

وطن پرستی | "ہمالہ" میں اقبال نے ایک انوکھے انداز سے، وطن پرستی کے جذبہ کا اظہار کیا ہے۔ ہمالہ پر گردش زمانہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ سالہا سال گزر جانے کے بعد بھی جوان ہے۔ اس کی وادیوں میں کالی کالی گھٹائیں ڈیرے ڈالی ہوئی ہیں، اس کی چوٹیاں ثریا سے باتیں کر رہی ہیں، فیل بے زنجیر کی مانند ابر اس کی چوٹیوں پر جھومتے اور ان سے ٹکراتے ہیں اور کلیاں اس کے دامن میں جھولا جھولتی ہیں۔ اس کی ندیاں کوثر و تسنیم کی موجوں کو شرما دینے والی ہیں۔ اس کے آبشار دل موہ لینے والے نغمے گاتے ہیں۔ اس کی وہ شام خاموش، اس کے درختوں کا پر تفکر وہ سماں، اس کے رخساروں پر شفق کا وہ غازہ —— یہ سب مناظر کیسے دل کش ہیں!! لیکن اس کوہ کی اصلی عظمت اس کی سچی بڑائی اور اس کا حقیقی وقار کیا ہے؟ —— یہی کہ وہ فصیل کشور ہندوستان ہے!

بظاہر تو یہ ایک کوہستان ہی ہے، لیکن اس کی حقیقت یہ ہے کہ وہ ہندوستان کی دیوار اور ہندوستانیوں کا پاسبان ہے!

استحان دیدۂ ظاہر میں کوہستاں ہے تو
پاسباں اپنا ہے تو دیوار ہندوستاں ہے تو

یہی وہ فضیلت ہے، جس کی وجہ سے آسمان کی بلندیاں بھی جھک کر اس کی پیشانی کو بوسہ دے رہی ہیں! طور سینا پر کلیم نے صرف ایک جلوہ ہی تو دیکھا تھا، مگر یہاں چشم بینا کے لئے بس تجلی ہی ہے!!

اے ہمالہ! اے فصیل کشور ہندوستان!

پہلے ہی مصرعہ میں نظم کی پوری روح کھنچ کر آ گئی ہے ! !

وطن پرستی کے جذبے کا پورا پورا اظہار ، اقبال نے کھل کر "ترانہ ہندی" میں کیا ہے۔ "میرا ملک غلط یا صحیح" —— (My country right or wrong) —— یہ نعرہ ایک وطن پرست ہی کا تو ہے — — اور

" سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا "

کا نغمہ ایک وطن پرست شاعر ہی گا سکتا ہے۔ یونان و مصر روما سب مٹ گئے ، لیکن وطن پرست اقبال کی نظر میں ہندوستان کا نام و نشان اب تک باقی ہے ! اس کی عظمت ابھی تک لوگوں کے دلوں میں ہے۔ پھر یہاں بھی فصیلِ کشورِ ہند کا اسی انداز میں ذکر ہے ! !

پربت وہ سب سے اونچا ہمسایہ آسماں کا
وہ سنتری ہمارا وہ پاسباں ہمارا

اس نظم میں اقبال نے نہ صرف وطن کی عظمت و بزرگی کا راگ گایا اور اس سے اپنی والہانہ وابستگی کا اظہار کیا ہے بلکہ وہ وطن کو ایک مرکزِ اتحاد بھی سمجھتا ہے —— ایک ایسا مرکز اجتماع جو مختلف مذاہب کے پیروؤں کو ایک نقطہ پر لا کر جمع کر دیتا ہے ! !

مذہب نہیں سکھاتا آپس میں بیر رکھنا
ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا

وطن پرستی کے اسی راگ کو اقبال نے "ہندوستانی بچوں کے قومی گیت" میں نہایت کامیابی کے ساتھ چھیڑا ہے۔ وہ بچوں کو یاد دلاتے ہیں کہ ہندوستان ہی وہ سرزمین ہے جہاں خواجہ معین الدین چشتی اور بابا گورو نانک نے حق کا پیغام سنایا تھا۔ اس کی سرسبزی و شادابی کو دیکھ کر تاتاریوں اور حجازیوں نے اپنا وطن چھوڑ دیا تھا۔ اس کے علم کے سامنے یونانی سرنگوں تھے۔ اور اس کی دولت سے ترکوں کا دامن مالا مال ہو گیا تھا ، اور آخر میں وہ سمجھاتے ہیں کہ ہندوستان جنت نشان نہیں بلکہ جنت ہی ہے !

رفعت ہے جس زمیں کی بامِ فلک کا زینا
جنت کی زندگی ہے جس کی فضا میں جینا
میرا وطن وہی ہے ، میرا وطن وہی ہے

یہ تو تھا '' ہندوستانی بچوں کے قومی گیت'' اور وہ خدا سے دعا کیا کرتا ہے ؟

ہو مرے دم سے یونہی میرے وطن کی زینت
جس طرح پھول سے ہوتی ہے چمن کی زینت

جذبۂ حب الوطنی کا اظہار پوری شاعرانہ فن‌کاری کے ساتھ ''نیا شوالہ'' میں ہوا ہے - یہ ''نیا شوالہ'' آپ کو بانگِ درا میں نہیں کلیاتِ اقبال۱۱ میں ملے گا - کلیات میں اقبال نے نئے شوالہ کی تعمیر اس حسن کارانہ انداز سے کی ہے -

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ و جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر و حرم کو چھوڑا
واعظ کا وعظ چھوڑا ، چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

آ غیریت کے پردے اک بار پھر اٹھا دیں
بچھڑوں کو پھر ملا دیں نقشِ دوئی مٹا دیں

۱۲- ''رختِ سفر'' کے نام سے کہ اقبال کی غیر مطبوعہ نظموں کا مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں بھی یہ نظم موجود ہے - ''کلیاتِ اقبال'' سے مراد اقبال کا وہ مجموعۂ کلام ہے ، جو بانگِ درا سے بھی پہلے ستمبر ۱۹۲۴ء میں حیدر آباد دکن سے شائع ہوا تھا اور اس کے مرتب عبدالرزاق تھے - اس کے ص ۵۰ و ۵۱ پر یہ نظم درج ہے -

سونی پڑی ہوئی ہے مدت سے دل کی بستی
آ، اک نیا شوالہ اس دیس میں بنا دیں

دنیا کے تیرتھوں سے اونچا ہو اپنا تیرتھ
دامانِ آسماں سے اس کا کلس ملا دیں

پھر اک انوپ ایسی سونے کی مورتی ہو
اس ہردوار دل میں لا کر جسے بٹھا دیں

سندر ہو اس کی صورت، چھب اس کی موہنی ہو
اس دیوتا سے مانگیں، جو دل کی ہو مرادیں

زنار ہو گلے میں، تسبیح ہاتھ میں ہو
یعنی صنم کدے میں، شانِ حرم دکھا دیں

پہلو کو چیر ڈالیں، درشن ہو عام اس کا
ہر آتما کو گویا اک آگ سی لگا دیں

آنکھوں کی ہو جو گنگا لے لے کے اس کا پانی
اس دیوتا کے آگے اک نہر سی بہا دیں

"ہندوستان" لکھ دیں ماتھے پہ اس صنم کے
بھولے ہوئے ترانے دنیا کو پھر سنا دیں

ہر صبح اٹھ کے گائیں منتر وہ میٹھے میٹھے
سارے پجاریوں کو مے پیت کی پلا دیں

مندر میں ہو بلانا جس دم پجاریوں کو
آوازۂ اذاں میں، ناقوس کو چھپا دیں

اگنی ہے وہ جو نرگن، کہتے ہیں پیت جس کو
دھرموں کے یہ بکھیڑے اس آگ میں جلا دیں

ہے ریت عاشقوں کی تن من نثار کرنا
رونا ستم اٹھانا اور ان کو پیار کرنا

آپ نے دیکھا اس نئے شوالہ کا صنم کون ہے، جس کو پوجنے کی شاعر تلقین

کر رہا ہے؟ ہندوستان!!

تعجب کیوں ہو، جب شاعر نے پہلے ہی بند کے آخری شعر میں یہ برملا کہہ دیا ہے کہ

خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے!

اقبال اس زمانہ میں ایک ”نیا شوالہ“ بنا رہا ہے اور اس میں اپنے حسین تخیل کی تراشی ہوئی موہنی مورتی ”ہندوستان“ کو نصب کرکے اس کی سندرتا میں خود کھو جانا اور دیس کے سارے رہنے بسنے والوں کو پیت کی مے پلا کر اس مورتی کے قدموں پر لا ڈالنا چاہتا ہے۔ ابھی تو وہ آذری کر رہا ہے، براہیمی دور ابھی دور ہے! اقبال کو اس زمانہ میں ہندوستانیوں کے باہمی اختلاف و افتراق کا شدید احساس ہے اور اس احساس کی بنیاد پر اس نے ”نئے شوالہ“ کی تعمیر کی ہے۔ لیکن اس اختلاف و افتراق کی نوعیت اس کی نظر میں محض مذہبی ہے۔ یہ لڑائی صرف شیخ و برہمن کی باہمی چپقلش ہے، اس لئے وہ ”واعظ کے خدا“ اور ”برہمن کے بت“ دونوں سے بیزار ہے۔ اس اختلاف اور غیریت کو مٹانے کے لیے وہ ہندو کے ”دیر“ کو چھوڑ دینا اور مسلمان کے ”حرم“ کو خیر باد کہہ دینا چاہتا ہے۔ لیکن وہ ہندو اور مسلمان سے متنفر نہیں ہے کیوں کہ یہ دونوں ایک ہی دیس کے باسی ہیں، اس لیے ان دونوں کی بہترین روایات کو ایک ہی تہذیب میں سمو دینا چاہتا ہے۔ وہ گلے میں زنار پہنے تسبیح ہاتھ میں لینا اور ناقوس کو آوازۂ اذان میں چھپا دینا چاہتا ہے۔ اقبال کے یہ خیالات کبیر کی تحریک اور اکبر کے دین الٰہی سے کس قدر زیادہ قریب ہیں!! اکبر نے ہندو مسلم اتحاد کے لیے یہ ضروری سمجھا کہ ہندو کے دھرم اور مسلمان کے مذہب کو ختم کر کے نیا دین جاری کیا جائے۔ کبیر بھی مذہبی اختلاف کو ختم کر دینا چاہتا ہے لیکن اس کی تحریک اتحاد کا مرکز جوگ ہے۔ اقبال بھی اکبر و کبیر کی مانند دھرموں کے بکھیڑوں کو پیت کی اگنی میں جلا کر بھسم کر ڈالنا چاہتا ہے اور متحدہ قومیت کی تعمیر وطن کی محسوس بنیاد پر کرنا چاہتا ہے۔ اس لیے باہمی پریم، محبت، اتفاق و اتحاد کا فارمولا اس کے پاس یہ ہے کہ ہندو مسلمان دونوں

ایک ہی صنم کے پجاری بن جائیں اور یہ صنم سوائے ہندوستان کے کوئی اور نہیں ہو سکتا ! گویا مذہب وجہ اختلاف ہے اور وطن مرکز اتحاد !

وطن کی آزادی کے لیے تڑپ | "پرندہ کی فریاد" دراصل ایک غلام ملک کے مجبور باشندوں کے دلوں کی پکار ہے :

جب سے چمن چھٹا ہے یہ حال ہو گیا ہے
دل غم کو کھا رہا ہے ، غم دل کو کھا رہا ہے

گانا اسے سمجھ کر خوش ہوں نہ سننے والے
دکھے ہوئے دلوں کی فریاد یہ صدا ہے

آزاد مجھ کو کر دے ، او قید کرنے والے !
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

کیا یہ غلام ہندوستان ہی کا درد دل نہیں ہے ، جو پرندوں کی زبان سے ادا ہو رہا ہے ؟ شاعر خود ہی تو کہہ رہا ہے کہ یہ گانا نہیں ہے بلکہ دکھے ہوئے دلوں کی فریاد ہے ، اس کا یہ وطن جب سے غلام ہو گیا ہے ، اس وقت سے وہ چمن ہی کہاں باقی رہا ؟ آزاد ہندوستان فی الواقعی ایک چمن تھا ، اس کی غلامی نے اس چمن کی ساری بہار خاک میں ملا دی ۔ قید فرنگ نے اس چمن کو اس سے چھڑا دیا اور وطن کی جدائی نے دل کی یہ حالت بنا رکھی ہے کہ

دل غم کو کھا رہا ہے ، غم دل کو کھا رہا ہے

ایسے میں اس کو گزرا ہوا زمانہ یاد آتا ہے ، اس کی نظروں کے سامنے وطن کی وہ بہاریں پھرنے لگتی ہیں جن پر ابھی غلامی کا رنگ چڑھا نہ تھا - اس کے کانوں میں ان رنگین قہقہوں کی آوازیں آنے لگتی ہیں ، جو اہل وطن کے محبت بھرے دلوں سے نکلا کرتے تھے ۔ اب باغ کی وہ بہاریں کہاں ہیں اور اب وہ چہچہے کہاں گئے ؟ یہ سب نظارے تو آزادی کے دم قدم سے تھے !

آزادیاں کہاں وہ اب اپنے گھونسلے کی
اپنی خوشی سے آنا اپنی خوشی سے جانا

شاعر کی خودی ابھی بیدار نہیں ہوئی ہے ۔ وہ ابھی تک احساس کمتری میں مبتلا ہے اس کا وطن جاگ چکا ہے ، آزادی کی خواہش اور تمنا بیدار ہو چکی ہے مگر بند ہائے غلامی کو توڑنے کی سکت ابھی پیدا نہیں ہوئی ہے ۔ قید و بند کے احساس نے ابھی صرف فریاد کی جرات دلائی ہے ، لڑنے بھڑنے کی ہمت ابھی عطا نہیں کی ہے ۔ وہ اپنے حاکم ، اپنے صیاد سے عرض معروض ہی کر سکتا ہے استدعا و التجا سے اپنا کام نکال سکتا ہے اس کو اپنی وفاداری کا یقین دلا کر اپنی بے زبانی کا واسطہ دے کر ، اس کے حق میں نیک دعائیں کر کے ہی اپنی درخواست کے منظور ہونے کی توقع کر سکتا ہے ۔ خم ٹھونک کر مقابلہ میں آنے ، چیلنج اور الٹی میٹم دینے کا وقت ابھی نہیں آیا ہے ۔ وہ صرف رو رو کر یہی گزارش کر سکتا ہے ،

آزاد مجھ کو کر دے او قید کرنے والے !
میں بے زباں ہوں قیدی تو چھوڑ کر دعا لے

کانگرس اس زمانہ میں کیا کرتی رہی ہے ؟ یہی کہ ملک کی زبوں حالی کا رونا روتی رہی ہے ، غلامی کے بندھنوں کو کم کرنے کے لئے مزید اصلاحات کے متعلق مؤدبانہ طور پر گزارشوں اور التجاوں کے ریزولیوشن پاس کرتی رہی ہے ، اور سرکار عظمت مدار کی عمر میں ترقی کی دعائیں دیتے ہوئے تاج برطانیہ سے اپنی وفاداری کا پرزور اعلان کرتی رہی ہے !

اس وقت کی کانگریسی تحریک کا عکس اقبال کے ان اشعار میں کس قدر نمایاں ہو کر جھلک رہا ہے ! کیا دادا بھائی نوروز جی اور سر فیروز شاہ مہتا کی کانگریس اور اقبال کا یہ " پرندہ " دونوں ایک ہی ہیں ؟ ! کانگریس کی قرارداد اور " پرندہ کی فریاد " گویا ایک ہی ساز کی آواز —— !!

فرقہ پرستی سے بیزاری | صرف یہی نہیں کہ اس دور میں اقبال کا دل جذبۂ وطن پرستی سے لبریز ہے ، اور وطن کی آزادی کے لئے مچل رہا ہے ، بلکہ وہ فرقہ بندی سے بیزار ہے ۔ چنانچہ وہ خفتگان خاک سے سوال کرتا ہے ،

واں بھی انسان اپنی اصلیت سے بیگانے ہیں کیا ؟
امتیاز ملت و آئیں کے دیوانے ہیں کیا ؟

"صدائے درد" میں اقبال نے ہندوستان کی فرقہ پرستی پر اپنے دلی کرب و بے چینی اظہار کیا ہے ،

جل رہا ہوں کل نہیں پڑتی کسی پہلو مجھے
ہاں ڈبو دے اے محیط آبِ گنگا تو مجھے

سر زمین اپنی قیامت کی نفاق انگیز ہے
وصل کیسا یاں تو ایک کربِ فراق آمیز ہے

"سید کی لوح تربت" پر انہوں نے جو تحریر ، لکھی دیکھی تھی وہ یہ تھی

وا نہ کرنا فرقہ بندی کے لئے اپنی زباں
چھپ کے ہے بیٹھا ہوا ہنگامۂ محشر یہاں

وصل کے اسباب پیدا ہوں تری تحریر سے
دیکھ کوئی دل نہ دکھ جائے تری تقریر سے

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ !
رنگ پہ جو، اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ !

یہ وہی سر سید ہیں ، جو ہندوستان کے مردِ بیمار مسلمان کے حق میں طبیبِ حاذق بن کر نمودار ہوئے تھے۔ جنھوں نے اپنی زندگی اور خصوصاً ابتدائی زندگی میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے زبردست کوشش کی مگر جو اپنی آخری عمر میں ہندو مسلم اتحاد سے مایوس ہو گئے تھے ۔ اقبال سر سید کی ابتدائی زندگی اور ان کے ہندو مسلم اتحاد والے مسلک سے زیادہ متاثر ہیں ، مگر وہ ان کی زندگی کے آخری ایام کے مخالف کانگریس مسلک کو نظر انداز کر دیتے ہیں ۔ یہ سر سید وہی تو ہیں جو دربار تاجپوشی سے محض اس بنا پر آٹھ آئے تھے کہ وہاں ہندوستانیوں کی کرسیاں انگریزوں کے برابر نہیں بچھائی گئی تھیں ، جنھوں نے وائسرائے کی کونسل میں جرأت اور تدبر کے ساتھ ہندوستانیوں کے جذبات کی نمائندگی کی تھی ۔ اس لیے اقبال نے ان کی لوح تربت پر یہ بھی لکھا دیکھا

تو اگر کوئی مدبر ہے تو سن میری صدا
ہے دلیری دستِ اربابِ سیاست کا عصا

عرضِ مطلب سے جھجک جانا نہیں زیبا تجھے
نیک ہے نیت اگر تیری ، تو کیا پرواہ تجھے

بندۂ مومن کا دل وہم وریا سے پاک ہے
قوتِ فرماں روا کے سامنے بیباک ہے

" تصویرِ درد " میں شاعر نے اپنے وطن کی محکومی اور بدنصیبی کا نوحہ پڑھا ہے ، پھر اہلِ وطن کو آگاہ کیا ہے۔

وطن کی فکر کر ناداں ! مصیبت آنے والی ہے
تری بربادیوں کے مشورے ہیں آسمانوں میں
نہ سمجھو گے تو مٹ جاؤ گے اے ہندوستاں والو
تمہاری داستاں تک بھی نہ ہوگی داستانوں میں

مگر وطن کی تباہی و بربادی کا اصلی سبب کیا ہے ؟

شجر ہے فرقہ آرائی ، تعصب ہے ثمر اس کا
یہ وہ پھل ہے کہ جنت سے نکلواتا ہے آدم کو

اجاڑا ہے تمیزِ ملت و آئیں نے قوموں کو
میرے اہلِ وطن کے دل میں کچھ فکرِ وطن بھی ہے

وطن کی عزت و عظمت کا احیاء اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ تعصب اور فرقہ پرستی کا خاتمہ ہو ۔ اسی لیے شاعر ہدایت کرتا ہے :

تعصب چھوڑ ناداں دھر کے آئینہ خانہ میں
یہ تصویریں ہیں تیری جن کو سمجھا ہے برا تو نے

محبت ہی سے پائی ہے شفا بیمار قوموں نے
کیا ہے اپنے بختِ خفتہ کو بیدار قوموں نے

خلاصہ | ہمالہ ، ترانۂ ہندی ، ہندوستانی بچوں کا گیت ، نیا شوالہ ، پرندہ کی فریاد ، صدائے درد ، تصویر درد ، بچے کی دعا ، سید کی لوح تربت ـــــ یہ سب نظمیں اقبال نے سنہ ۱۹۰۵ء سے قبل کہیں تھیں ان نظموں میں انہوں نے صاف طور پر وطن پرستی کا اظہار ہی نہیں بلکہ

پرچار کیا ۔ ہندوستان کا ہمالہ ، اس کی گنگا ، اس کی سرسبزی و شادابی ، اس کی فضاؑ ، اس کے آکاش اور اس کی دھرتی ، غرض کہ اس کے ذرے ذرے سے انہیں پریم ہے ۔ ان ہی نظموں میں انہوں نے فرقہ پرستی سے بیزاری ظاہر کی ہے اور ہندوستان کی غلامی کا ماتم کیا ہے ۔ اس دور کی ایک مشہور نظم ” ترانۂ ہندی “ کے متعلق ہندوستان کی تحریک آزادی کے مشہور رہنما مہاتما گاندھی نے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اس کو بھی سن لیجئے ۔ مدیر رسالہ ” جوہر “ کے نام اپنے ایک خط[۱۲] مورخہ ۹ جون سنہ ۱۹۳۸ ع میں وہ لکھتے ہیں :

” آپ کا خط ملا ڈاکٹر اقبال مرحوم کے بارے میں میں کیا لکھوں ؟ لیکن میں اتنا تو کہہ سکتا ہوں کہ جب ان کی مشہور نظم ” ہندوستاں ہمارا “ پڑھی تو میرا دل اُبھر آیا اور یار وادا جیل میں تو سینکڑوں بار میں نے اسی نظم کو گایا ہوگا ، اس نظم کے الفاظ مجھے بہت ہی میٹھے لگے اور یہ خط لکھتا ہوں تب بھی وہ نظم میرے کانوں میں گونج رہی ہے “

اس دور میں اقبال نے جن خیالات و افکار کا اظہار اپنی نظموں میں کیا وہ اپنے سیاسی ماحول سے بڑی حد تک ہم آہنگ ہیں ۔ وطن سے محبت ، ہندوستان کی غلامی کا احساس ، اس دور کے سیاسی شعور کی نمایاں خصوصیات ہیں اور یہ دونوں شعلے پوری تابانیوں کے ساتھ ان کی شاعری میں جگمگا رہے ہیں ۔ فرقہ پرستی کی ابتدا اگرچہ اس دور میں ہو چکی تھی اور آخر میں اس کی جڑیں ذرا گہری ہو چلی تھیں ، تاہم اس میں تندی و تلخی ابھی پیدا نہیں ہوئی تھی ، اقبال اس فرقہ پرستی کے خلاف رد عمل کا اظہار کرتا ہے اور متحدہ قومیت کا راگ الاپتا ہے ، انہوں نے خود ہی اعتراف کیا کہ :

” ابتدا میں بھی قومیت (Nationalism) پر اعتقاد رکھتا تھا اور ہندوستان کی متحدہ قومیت کا خواب شاید سب سے پہلے میں نے

۱۲- جوہر اقبال شمارہ خصوصی یادگار علامہ اقبال مطبوعہ سنہ ۱۹۳۸ ع ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی ۔

دیکھا تھا[۱۴] ''

بہرحال اس دور کے متعلق ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال کی شاعری کا دامن اس وقت صرف ملک کی تحریک آزادی سے وابستہ تھا لیکن خود عملی طور پر تحریک سے وابستہ نہ ہوئے تھے۔

——:o:——

حوالہ جات باب ۱

۱- روزگار فقیر جلد اول مصنفہ فقیر سید وحید الدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی بار چہارم ، مئی ۱۹۶۴ع ص ۲۴۴ -
۲- '' اہل ہند کا ارتقا '' از اے - سی مزمدار ص ۲۷ -
۳- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا مطبوعہ ۱۹۳۵ء ص ۲۸ -
۴- ایضاً ص ۶ -
۵- ص ۸ -
۶- ہسٹری آف دی کانگریس ص ۱۴۹ -
۷- ایضاً ص ۱۵۹ و ص ۱۶۰ -
۸- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ آگرہ مارچ ۱۹۴۱ء ص ۳۲ -
۹- '' حیات جاوید '' از مولانا الطاف حسین حالی طبع ثانی ص ۹۴ -
۱۰- نیرنگ خیال (ماہ نامہ) اقبال نمبر ص ۳۱ و ۳۲ -
۱۱- رخت سفر و کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق -
۱۲- جوہر اقبال (رسالہ) شمارۂ خصوصی بیاد گار علامہ اقبال مطبوعہ ۱۹۳۸ء ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی -
۱۳- روزنامہ جنگ کراچی مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ء (اقبال ایڈیشن) -

۱۴- روز نامہ جنگ کراچی مورخہ ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۶۷ع (اقبال ایڈیشن) اقبال کا خط بنام مورخ اسلام مولانا اکبر شاہ خان نجیب آبادی -

باب ۲

وطنیت سے ملیت کی طرف

اقبال کی زندگی کا دوسرا دور | اقبال کی زندگی کا دوسرا دور سنہ ۱۹۰۵ع سے شروع ہوتا ہے ، اس سال وہ اعلیٰ تعلیم کی غرض سے ولایت روانہ ہوئے اور تین سال تک وہ وہیں مقیم رہے - سنہ ۱۹۰۸ع میں وہ وطن واپس لوٹے اور گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کے اعلیٰ پروفیسر ہو گئے ، اور ساتھ ہی پیشہ وکالت بھی انجام دینے لگے ، کیونکہ گورنمنٹ نے انہیں بطور خاص اس کی اجازت دے رکھی تھی - وکالت اور پروفیسری کا یہ ملا جلا مشغلہ تقریباً ڈیڑھ سال جاری رہا ، اور غالباً سنہ ۱۹۱۰ع میں انہوں نے پروفیسری سے استعفیٰ دیا - اس کے بعد بھی حکومت نے انڈین ایجوکیشنل سروس میں ایک بڑا عہدہ انہیں پیش کیا ، لیکن ڈاکٹر صاحب کی خودداری و حریت پسندی نے اس اعزاز اور عہدہ کی پرواہ نہیں کی اور اس کو قبول کرنے سے انکار کر دیا - اب ان کا ذریعہ معاش بیرسٹری اور مشغلہ شعر و شاعری رہنے لگا - یہ تو تھی اقبال کی روداد زندگی - اب دیکھئے اس دوران میں ملک کے عام سیاسی حالات کیا تھے -

سیاسی پس منظر | سنہ ۱۹۰۵ع سے اقبال کی زندگی کا ایک دوسرا دور شروع ہوتا ہے ، اور اس سال ملک کے سیاسی حالات بھی نئی کروٹ لیتے ہیں - ہم بتا چکے ہیں کہ اسی صدی کی ابتداء میں اردو ہندی کا قضیہ پید ہوا ، جس کے باعث ہندو مسلم عوام میں اختلاف پیدا ہوا - سنہ ۱۹۰۵ع میں اس اختلاف نے شدت اختیار کر لی - اس شدت کی اہم وجہ تقسیم بنگال کا واقعہ ہے - یہ زمانہ لارڈ کرزن کی وائسرائلٹی کا تھا - صوبہ جات بنگال

بہار ، اڑیسہ کی آبادی سات کروڑ آٹھ لاکھ تھی اور یہ صوبہ جات ایک ہی لفٹنٹ گورنر کے ماتحت تھے ۔ لارڈ کرزن اور اس کے مشیروں نے محسوس کیا کہ اتنے بڑے رقبے اور اتنی کثیر آبادی کو ایک انتظامی اکائی بنا کر نہیں رکھا جا سکتا ، اس لیے انھوں نے جولائی سنہ ۱۹۰۵ع میں تقسیم بنگالہ کا اعلان کیا ۔ اس اعلان کی وجہ سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی آگ بھڑک اٹھی ۔ مسلمان اس تقسیم کے موافق تھے ،کیونکہ اس کے نتیجہ میں بنگال کے مشرقی حصوں کو آسام کے ساتھ ملا کر " مشرقی بنگال اور آسام " کے نام سے ایک نیا صوبہ بنا دیا گیا تھا ۔ جہاں مسلمانوں کو واضح اکثریت حاصل تھی ۔ ڈھاکہ اس صوبہ کا دارالحکومت تھا ۔ تقسیم سے قبل مسلمانوں کو دولتمند ، تعلیم یافتہ ، بنگالی ہندوؤں سے سیاسی و اقتصادی میدان میں مسابقت کرنی پڑتی تھی اور اب انھیں ایک کھلا موقع مل رہا تھا ، لیکن ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف پورے زور و شور سے نہ صرف احتجاج کیا ، بلکہ تشدد پسند تحریک جاری کر دی ۔ ان لوگوں کا نظریہ یہ تھا کہ حکومت نے بنگال کو تقسیم کرکے بنگالیوں کی بڑھتی ہوئی اجتماعی قوت کو توڑا اور کلکتہ کی سیاسی اہمیت کو گرایا ہے ۔ الغرض بنگال کی تقسیم کیا ہوئی ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کا لاوا پھوٹ پڑا ۔ ہندوؤں کے ان مظاہروں سے مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے ۔ اس زمانہ میں بندے ماترم کا گیت بہت عام ہو گیا ، اور اس کے بعض اشعار سے مسلمانوں کے جذبات بہت برانگیختہ ہوئے ۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد مقامات پر ہندو مسلم فسادات رونما ہوئے ، بنگال کے ان واقعات کا اثر سارے ملک پر پڑا اور ہندو مسلم اختلاف کی خلیج زیادہ وسیع ہو گئی ۔

تقسیم بنگالہ کے علاوہ دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۶ع میں مسلمانوں کے ایک وفد نے مسلم حقوق کے تحفظ سے متعلق ایک یادداشت وائسرائے کے سامنے پیش کی اور اسی سال مسلمانوں کی ایک باضابطہ سیاسی جماعت کا قیام عمل میں آیا ۔ سنہ ۱۸۹۲ع کی اصلاحات سے مسلمان مطمئن نہیں تھے اور اپنے سیاسی و تمدنی حقوق کی حفاظت کے لیے متردد تھے ۔ جولائی سنہ ۱۹۰۶ع میں جان مارلے وزیر ہند نے اپنی میزانیہ (بجٹ) والی

تقریر میں اعلان کیا کہ حکومت جدید اصلاحات عطا کرنا چاہتی ہے۔ اس اعلان کے بموجب لارڈ منٹو وائسرائے ہند نے کونسل کی توسیع کے لیے ایک کمیشن کا تقرر کر دیا۔ اس کمیشن کے قیام کی وجہ سے مسلمانوں کے دلوں میں اپنی تنظیم کا خیال اور مضبوط ہو گیا۔ نواب محسن الملک و وقار الملک اور دیگر اکابرین قوم کے مشورے سے ایک یادداشت مرتب کی گئی، جس کو بتاریخ یکم اکتوبر ۱۹۰۶ء ہز ہائی نس سر آغا خان کی قیادت میں ایک نمائندہ وفد نے گورنر جنرل لارڈ منٹو کی خدمت میں پیش کیا۔ اس یادداشت میں مسلمانوں کی کونسلوں میں مؤثر نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ جداگانہ انتخاب پر زور دیا گیا تھا۔ سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ طلب کیا گیا تھا اور میونسپل و ڈسٹرکٹ بورڈوں، لیجسلیٹو کونسلوں (مجالس قانون ساز) میں مسلمانوں کے لیے نشستوں کے تعین پر اصرار کیا گیا تھا۔

جس اجتماع میں مسلمانوں کے ان مطالبات کو مرتب کیا گیا تھا، اسی اجتماع میں مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے متعلق بھی باہم مشورے ہوئے اور بالآخر دسمبر سنہ ۱۹۰۶ء میں آل انڈیا محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس منعقدہ ڈھاکہ کے آخری اجلاس میں متفقہ طور پر کل ہند مسلم لیگ کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم لیگ کا ایک باضابطہ دفتر بھی امروہہ ضلع مراد آباد میں قائم کر دیا گیا۔ دسمبر سنہ ۱۹۰۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس کراچی میں منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں لیگ نے تقسیم بنگال کے مسئلہ پر بھی کافی توجہ کی۔

اسی زمانہ میں رائٹ آنریبل سید امیر علی کی صدارت میں مسلمانانِ ہند کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی غرض سے لندن میں ایک کمیٹی قائم ہوئی اور اس کمیٹی کا الحاق کل ہند مسلم لیگ سے کر لیا گیا۔ اس کمیٹی کا نام برٹش کمیٹی آف آل انڈیا مسلم لیگ تھا۔ سنہ ۱۹۰۹ء میں اس کمیٹی نے اپنا وفد، لارڈ مارلے وزیر ہند کے پاس روانہ کیا اس وفد نے جداگانہ انتخاب اور مسلم نشستوں کے تعین پر زور دیا۔

اِدھر مسلمانوں میں مسلم لیگ کی یہ تحریک جاری ہوئی، اور اُدھر

ہندوؤں نے ایک جماعت ہندو مہاسبھا کے نام سے سنہ ۱۹۰۶ع ہی میں قائم کر دی ۔ اس جماعت نے جداگانہ انتخابات اور مسلم نشستوں کے تعین کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا ۔ اسی طرح منٹو مارلے کی اسکیم کی منظوری تک (یعنی سنہ ۱۹۰۹ع تک) مسلمانوں اور ہندوؤں میں ایک سیاسی کشمکش جاری رہی ۔

۱۵ نومبر سنہ ۱۹۰۹ع کو منٹو مارلے اسکیم حکومت کی جانب سے شائع کر دی گئی اور جلد ہی اس نے قانونِ حکومتِ ہند سنہ ۱۹۰۹ع کا درجہ حاصل کر لیا ۔ سنہ ۱۹۱۰ع میں اس قانون کا نفاذ ہو گیا ۔ منٹو مارلے اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا اور پنجاب کے علاوہ تمام صوبائی کونسلوں میں اُن کے لیے کچھ علیحدہ نشستیں بھی متعین کر دی گئی تھیں ۔

ہندو پہلے ہی سے تقسیمِ بنگالہ کے باعث مسلمانوں سے ناراض تھے، اب منٹو مارلے اسکیم میں مسلمانوں کو جداگانہ حقِ انتخاب ملنے کے بعد وہ اور زیادہ مشتعل ہو گئے ۔ کانگریس نے بھی اس سال کے اجلاس میں تقسیم بنگال کے خلاف سخت احتجاج اور جداگانہ انتخاب پر ناپسندیدگی کا اظہار کیا ۔

منٹو مارلے اصلاحات میں ایک حد تک کامیابی اور اردو ہندی کے قضیے و تقسیم بنگالہ کے مسئلہ میں ہندوؤں کی روش کے باعث مسلمان کانگریس سے عملاً بیزار اور انگریزی حکومت پر اعتماد کرنے لگے لیکن سنہ ۱۹۱۱ع میں اور اس کے بعد کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ مسلمانوں کا یہ اعتماد متزلزل ہونے لگا ۔

۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع کو دہلی میں دربار تاجپوشی منعقد ہوا ۔ ملک معظم نے اس دربار میں تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کیا ۔ یہ اعلان مسلمانوں کے اعتماد پر برق بن کر گرا ، لیکن ہندو خوش ہو گئے ۔ کانگریس نے اس اعلان پر مسرت کا اظہار کیا اور مسلم لیگ نے سنہ ۱۹۱۲ع کے سالانہ اجلاس میں اس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔

اسی زمانہ میں اسلامی ممالک میں کچھ ایسے حالات رونما ہوئے ، جن کی وجہ سے حکومت پر مسلمانوں کا رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو گیا ۔

انگلستان میں ترکی و ایران کے جدید نظام دستوری کی در پردہ مخالفت کی جانے لگی۔ روس کو جاپان سے شکست ہو گئی تھی ، اور اس نے برطانیہ سے اتحاد کر لیا تھا۔ اس طرح ترکی و ایران کے لیے ایک خطرہ پیدا ہو گیا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ چھڑ گئی ، جس میں کئی ترک شہید ہوئے ، اور نتیجتاً اطالیہ نے طرابلس کو ترکی کے ہاتھوں سے چھین لیا۔ شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں کے ساتھ بہیمانہ برتاؤ کیا ، اور مشہد مقدس میں حضرت امام رضا کے مزار پر گولہ باری کی۔ سنہ ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہوئی کہ بلقان کی عیسائی ریاستوں نے ، جو مدت سے ترکوں کے ماتحت تھیں ، اپنا ایک اتحاد قائم کیا اور سلطنت ترکیہ کے خلاف بغاوت کر دی۔ جنگ بلقان کے اختتام پر ترکی میں صلح کانفرنس ہوئی ، لیکن اتحادی ایڈریا نوبل پر ترکی کے قبضہ کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے تھے۔ ترکوں کا یہ مطالبہ تھا کہ ایڈریا نوبل کے علاوہ مقدونیہ و البانیہ کے علاقوں کو بھی ترکوں کے ماتحت رکھا جائے۔ لیکن اتحادی اس مطالبہ کے بالکل خلاف تھے۔ اسی زمانہ میں یونانی ترکوں سے جنگ کر رہے تھے۔ ایڈریا نوبل میں ترکوں کو شکست ہوئی۔ البانیہ میں مسلمانوں کا قتل عام ہوا ، اور مقدونیہ میں مسلمانوں پر مظالم توڑے گئے۔ اب مراکش و طرابلس ترکوں کے ہاتھ سے نکل چکے تھے۔ ۲۰ مئی سنہ ۱۹۱۳ء کو ترکی اور بلقان میں صلح ہوئی ، لیکن ترک اس صلح سے مطمئن نہیں تھے۔ انہوں نے ایڈریا نوبل کو پھر فتح کر لیا ، لیکن برطانیہ نے ان کے قبضہ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ان واقعات کا مسلمانانِ ہند پر خاص اثر ہوا۔ خلافتِ ترکیہ کو مسلمان اپنا مرکز تصور کرتے تھے۔ ترکی پر جب یہ مصیبت نازل ہوئی ، تو مسلمانانِ ہند کو ایسا معلوم ہوا کہ ترکی خلافت کا جو تھوڑا بہت سہارا تھا وہ بھی اب ختم ہو جائے گا۔ ان معاملات میں برطانیہ نے جو طرزِ عمل اختیار کیا اس سے مسلمانوں کے دل حکومت کی طرف سے بالکل پھر گئے۔ بیرون ملک کے ان حالات کے علاوہ اندرونِ ملک بھی دو واقعات ایسے رونما ہوئے جنھوں نے مسلمانوں کی آتشِ غضب کو بھڑکا دیا۔ ایک واقعہ تو تقسیم بنگالہ کی تنسیخ کا تھا ، جس کا ذکر اوپر ہم کر آئے ہیں ، اور

سرا واقعہ مسجد کانپور کی شہادت کا تھا جو ۲۹ جون ۱۹۱۳ع کو پیش
۔ یو ، پی کے شہر کانپور میں میونسپلٹی ایک سڑک تعمیر کرنا چاہتی
ں ۔ اس کی تعمیر میں ایک مسجد کے غسل خانے اور پاخانے حائل تھے ،
ن کی وجہ سے سڑک سیدھی نہیں جا سکتی تھی بلکہ اس میں کجی واقع ہو
ں تھی ۔ میونسپلٹی نے مسجد کے ان حصوں کو ڈھانا شروع کیا ، تو
سلمانوں نے احتجاج کیا ، لیکن حکومت نے سنی ‌ان سنی کر دی ۔ بالآخر
حصہ منہدم کر دیا گیا ۔ مسلمانان کانپور نے سر سے کفن باندھ لیا اور
ہندم شدہ حصہ کی از نو تعمیر کرنے لگے ۔ حکومت نے مزاحمت کی ۔
لیس اور فوج حرکت میں آ گئی اور کئی مسلمان شہید ہو گئے ۔ اب اس
اقعہ نے ایک کل ہند مسئلہ کی اہمیت حاصل کر لی ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۱۳ع
ں مولانا محمد علی جوہر اور سر وزیر حسن معتمد مسلم لیگ لندن گئے
کہ ارباب حکومت برطانیہ کے سامنے واقعات کی توضیح کی جائے لیکن
زرائے سلطنت برطانیہ نے ملنے سے انکار کر دیا ، اس انکار کی وجہ سے
سلمانوں کے جذبات میں ایک تلاطم پیدا ہو گیا ۔

یہ سیاسی روئداد سنہ ۱۹۰۵ع تا ۱۹۱۴ع کی ہے ۔ سنہ ۱۹۱۴ع میں
نگ عظیم کا آغاز ہوتا ہے اور ملک کی سیاسی زندگی کا ایک نیا دور شروع
تا ہے اس دور کا مطالعہ ہم آئندہ صفحات میں کریں گے ۔

زیر تبصرہ دور کی خصوصیات یہ ہیں ۔ اس دور کے آغاز میں تقسیم
نگالہ کا آغاز ہوا ، جس سے مسلمان خوش ہو گئے ۔ اسی زمانہ میں مسلمان
ملی سیاسیات میں داخل ہوئے ، اور اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم ،
سلم لیگ کے نام سے قائم کی ۔ اس تنظیم کے ذریعہ انہوں نے حکومت کے
امنے اپنے چند مطالبات رکھے اور منٹو مارلے اصلاحات میں ان کے مطالبات
کو قبول کر لیا گیا ۔ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کی مخالفت کی اور مسلمانوں
ں سیاسی تنظیم کے مقابلے میں اپنی ایک علیحدہ جماعت ہندو مہا سبھا کے
ام سے قائم کی ، اور اس ادارے نے مسلمانوں کے مطالبہ جداگانہ انتخاب کی
سخت مخالفت کی ۔ گویا ہندوؤں اور مسلمانوں میں اختلاف کی جو خلیج
یسویں صدی کے آغاز میں پیدا ہو گئی تھی ، اب اور زیادہ وسیع ہو گئی ،
سنہ ۱۹۱۱ع میں مسلمان ہندوؤں سے دور اور حکومت سے قریب تر ہو گئے

تھے - سنہ ۱۹۱۱ء کے بعد حالات نے پلٹا کھایا ، اور مسلمانوں میں حکومت برطانیہ کے خلاف نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے - تنسیخ تقسیم بنگال کا اعلان ، مسجد کانپور کا واقعہ اور برطانیہ کی عالم اسلام سے غیر ہمدردانہ پالیسی ، یہ وہ اسباب ہیں جن کی وجہ سے مسلمان حکومت برطانیہ سے بیزار ہو گئے تھے -

آئیے اب دیکھیں کہ اس تمام عرصے میں اقبال کے سیاسی رجحانات کیا تھے - ان رجحانات کا تعین اقبال کی زندگی کے دو اہم واقعات سے ہوتا ہے -

۱- برٹش کمیٹی مسلم لیگ سے اقبال کا تعلق | اقبال کے قیام انگلستان کے زمانہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ وہ برٹش کمیٹی آل انڈیا مسلم لیگ کے رکن بن گئے تھے -[۱] یہی ان کا عملی سیاسیات سے پہلا تعلق ہے - ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ملک کے اندر ابتدائے بیسویں صدی میں جو حالات پیدا ہو گئے تھے ان کا علامہ پر بہرحال اثر ہوا ، آل انڈیا مسلم لیگ کی برٹش کمیٹی نے ہندوستانی سیاسیات کے متعلق وہی نقطہ نظر اختیار کیا جو آل انڈیا مسلم لیگ کا تھا - اس ادارہ کی حیثیت یوں بھی اہم ہو جاتی ہے کہ رائٹ آنریبل سید امیر علی کی قیادت میں اسی مسلم لیگ کے ایک وفد نے منٹو مارلے اصلاحات کے سلسلہ میں مسلم نقطہ نظر کو بڑے مؤثر طریقہ پر انگلستان کے ارباب اقتدار کے سامنے پیش کیا ، مسلم وفد نے آغا خان کی زیر سر کردگی ، جو مطالبات پیش کیے تھے ، ان کی تائید کی ، اور جداگانہ انتخاب کا پر زور مطالبہ کیا - اس لحاظ سے ڈاکٹر اقبال کا اس ادارے سے تعلق ان کی ابتدائی سیاسی زندگی کا ایک اہم واقعہ شمار کیا جا سکتا ہے -

۲- اقبال کے سیاسی رجحان میں تبدیلی | قیام انگلستان کے زمانہ کا ایک دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کے سیاسی رجحانات میں تبدیلی

۱- سیاست ملیہ از محمد زبیری مارہروی مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۵۹ -

پیدا ہو جاتی ہے اور ان کی شاعری کا موضوع بھی بدل جاتا ہے ۔ رجحان کی تبدیلی ایک گونہ طور پر اس نظم میں نظر آتی ہے ، جو ''عبدالقادر کے نام'' لکھی گئی ہے ۔ اس نظم میں وہ اپنے آشنائے راز کو اپنی اس ذہنی تبدیلی کی اطلاع دیتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ '' بتکدۂ چیں'' سے اپنا منہ موڑ کر ، میں نہ صرف خود کو ، بلکہ اپنے ساتھ سب کو ''محورخِ سعدی و سلیمیٰ'' کر دینا چاہتا ہوں ۔ میرے دل میں '' قیس'' کو '' آرزوئے نو '' سے شناسا کرنے کی تمنا بیدار ہو گئی ہے ۔ اسی زمانہ میں طلبائے علی گڑھ کالج کو جو پیام وہ روانہ کرتے ہیں ، وہ اوروں کے پیام سے ، بلکہ خود ان کے سابقہ پیام سے ، مختلف ہوتا ہے ۔ وہ برملا کہتے ہیں کہ اب تک تو وہ طائرِ زیرِ دام تھے ، لیکن اب وہ طائرِ بلند بام بن چکے ہیں ۔

طائرِ زیرِ دام کے نالے تو سن چکے ہو تم یہ بھی سنو کہ نالۂ طائرِ بام اور ہے ایک مقام پر کھل کر وہ یہ کہہ گزرتے ہیں :

جذبِ حرم سے ہے فروغ انجمنِ حجاز کا
اس کا مقام اور ہے اس کا نظام اور ہے

وہی اقبال ، جو سنہ ۱۹۰۵ع سے پہلے ''حرم '' کو چھوڑ کر اک '' نیا شوالہ '' بنا رہا تھا ، اب کسی کی کشش اس کو سوئے حرم لیے جا رہی ہے ۔ لیکن اس کشش کا ابھی صرف آغاز ہی ہوا ہے ، اس کا یہ شوق ابھی تازہ ہے ۔

بادہ ہے نیم رس ابھی شوق ہے نارسا ابھی
رہنے دو خم کے سر پہ تم خشتِ کلیسیا ابھی

جزیرہ صقلیہ والی نظم سے ان کے رجحان کی یہ تبدیلی قطعی طور پر متعین ہو جاتی ہے ۔ صقلیہ کے اس جزیرہ کو جہاں سات سو سال تک مسلمانوں کی عظیم الشان سلطنت رہی تھی ، وہ غالباً جہاز کے عرشہ سے دیکھتے ہیں اور بے اختیار پکار اٹھتے ہیں ۔

وہ نظر آتا ہے تہذیبِ حجازی کا مزار !

ان کے نہاں خانۂ تصورات میں ان شمشیر بکف گلیم بردوش مصحف در بغل صحرا نشین عربوں کی پر شوکت تصویریں ابھرنے لگی ہیں ، جن کی تلواروں میں بجلیوں نے اپنے آشیانے بنا رکھے تھے ، اور کے سفینوں نے سمندر کی سرکش موجوں کو پابہ زنجیر کر رکھا تھا ، ا جنہوں نے صقلیہ و ہسپانیہ کے جابر و قاہر شہنشاہوں کے درباروں میں زلزلے ڈال دئے تھے اور تمام دنیا کو ایک نیا پیام دیا تھا —— زندگی آزادی کا پیام ! پھر ان کے پردۂ تخیل کے سامنے وہ منظر بھی آتا ہے جبکہ یہ جلیل القدر اور عظیم المرتبت قوم اس سر زمین سے بیک بینی دو گوش نکال دی گئی اور وہ صقلیہ کو مخاطب کرکے کہتے ہیں :

تو کبھی اس قوم کی تہذیب کا گہوارہ تھا
حسنِ عالم سوز ، جس کا آتشیں نظارہ تھا

سعدی نے بغداد کی تباہی پر آنسو بہائے ، دلی کے ماتم میں داغ اپنا سینہ پیٹا ، غرناطہ کی بربادی پر ابنِ بدروں کے دلِ ناشاد نے فریاد اور اقبال "تہذیب حجازی کے مزار" پر ماتم کناں ہے ! صقلیہ در و دیوار انہیں اس قوم کی کہانیاں سناتے ہیں ، جس کی شورشِ قم ایک دنیا زندہ ہو گئی تھی اور جس کے نعرۂ تکبیر سے ایک عالمِ خوا جاگ اٹھا تھا ! ان کے چشمِ تصور نے اس جزیرہ کے ساحل کی خامو میں بھی گفتگو کا ایک نیا انداز دیکھ لیا تھا ، جس میں درد بھی تھا سوز و ساز بھی ! —— ان کا دل اس کی دکھ بھری کہانیاں سننے کے مچلنے لگتا ہے اور وہ اس سے منت کرتے ہیں

درد اپنا مجھ سے کہہ ، میں بھی سراپا درد ہوں
جس کی تو منزل تھا ، میں اس کارواں کی گرد ہوں

رنگ تصویر کہن میں بھر کے دکھلا دے مجھے
قصہ ایامِ سلف کا کہہ کے تڑپا دے مجھے

ایامِ سلف کا یہ قصہ وہی تو ہے ، جس کے متعلق اقبال سنہ ۱۹۰۵ع سے قبل کہا تھا :

محفلِ نو میں پرانی داستانوں کو نہ چھیڑ
رنگ پر جو اب نہ آئیں ان فسانوں کو نہ چھیڑ

لیکن اب اقبال کا دل ان ہی پرانی کہانیوں کو سننے کے لیے تڑپ رہا ہے ۔ وہ نہ صرف ان کو خود سننا چاہتے ہیں بلکہ دوسروں کو سنانا بھی چاہتے ہیں ۔ یہی نہیں ، صقلیہ کے اس " قصہٗ ایامِ سلف " کو وہ سوغات کے طور پر ہندوستان لے جانا اور وہاں کی محفلِ نو میں اسی پرانی داستان کو چھیڑ کر خود رونا اور دوسروں کو رلانا چاہتے ہیں !!

میں ترا تحفہ سوئے ہندوستاں لے جاؤں گا
خود یہاں روتا ہوں، اوروں کو وہاں رلواؤں گا

اس زمانہ میں ، جو غزلیں انہوں نے کہی ہیں ان میں ایک شعر یہ بھی ہے :

نرالا سارے جہاں سے اس کو عرب کے معمار نے بنایا
بِنا ہمارے حصارِ ملت کی اتحادِ وطن نہیں ہے

اس دور سے پہلے وہ وطن کے پرستار تھے ، ہندوستان ہی ان کا " صنم " تھا اور وہ دیر و حرم سے بیزار تھے ، وطن کو اس زمانہ میں وہ صرف جائے پیدائش و قیام ہی نہیں بلکہ مرکزِ اتحاد سمجھتے تھے ، لیکن اب وہ صاف طور پر وطنیت کے خلاف اپنی آواز بلند کرتے ہیں ، ان کی نظر میں وطن مرکزِ اتحاد نہیں بلکہ ملت ہی وہ ادارہ ہے ، جو السانوں کی شیرازہ بندی کر سکتا ہے ! ـــ غالباً اقبال نے وطنیت کے خلاف جو پہلا شعر کہا ہے ، وہ یہی ہے !!

" وطن " کے بجائے " ملت " اب ان کی شاعری کا موضوع بننے لگا ہے ۔ وطن کا پرستار اقبال ، ملت کے فدائی اقبال میں گم ہو کر پکار رہا ہے ۔

وجود افراد کا مجازی ہے ، ہستیٔ قوم ہے حقیقی
فدا ہو ملت پہ ، یعنی آتش زنِ طلسمِ مجاز ہو جا

یہ ہند کے فرقہ ساز اقبال آذری کر رہے ہیں گویا
بچا کے دامن بتوں سے اپنا غبارِ راہِ حجاز ہو جا

اقبال نے اپنے "صنم" کو خود ہی توڑ دیا ہے، اور اب وہ ملت پر فدا ہونا چاہتا ہے۔ دورِ آذری ختم ہو چکا، اب عنصرِ براہیمی کا آغاز ہے!! "نئے شوالہ" سے نکل کر اب وہ "سوئے حرم" روانہ ہو چکا ہے! وہ، جو پیت کی اگنی میں دھرموں کے بکھیڑوں کو جھونک کر، ہندوستان کی موہنی مورتی کو پوج رہا تھا، اب غبارِ رہِ حجاز ہو کر طوافِ حرم کر رہا ہے۔ سنہ ۱۹۰۵ع میں جن کانوں نے "ناقوس" کو "آوازۂ اذان" میں چھپا ہوا سنا تھا، اب سنہ ۱۹۰۷ع میں اسی گوشِ منتظر میں حجاز کی خاموشی، اس عہد کے استوار ہونے کی نوید سناتی ہے، جو صحرا نورد مسلمانوں اور بدوی عربوں سے باندھا گیا تھا اور قدسیوں کی زبانی اقبال اس شیر کے پھر ہوشیار ہونے کی خوش خبری سنتے ہیں، جو صحرا سے نکلا اور روما کی سلطنت کو اُلٹ پلٹ کر رکھ دیا تھا!!

سنا دیا گوشِ منتظر کو حجاز کی خامشی نے آخر
جو عہد صحرائیوں سے باندھا گیا تھا، پھر استوار ہوگا

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا

طلبۂ علی گڑھ کالج کے نام، پیام دیتے وقت جس تبدیلی، جس کیفیتِ ذوق و شوق کا اظہار انھوں نے اشاروں و کنایوں میں کیا تھا، اب اس کا وہ کھلے بندوں اعلان کرتے ہیں

زمانہ آیا ہے بے حجابی کا عام دیدارِ یار ہوگا
سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

طلبہ کو پیام روانہ کرتے وقت، ان کا شوق، "نارسا" اور ان کی شراب "نیم رس" تھی اس لیے وہ خم ملتیت کو خشتِ کلیسا سے ڈھانکے رکھنا چاہتے تھے لیکن اب وہ مئے خانۂ ملت کے رندِ قدح خوار بن چکے ہیں اس لیے اس شراب کو نہ صرف خود پینا بلکہ ساری دنیا کو پلانا چاہتے ہیں، وہ ساقی کو مخاطب کر کے کہتے ہیں۔

گذر گیا اب وہ دور ساقی کہ چھپ کے پیتے تھے پینے والے
بنے گا سارا جہان مے خانہ، ہر کوئی بادہ خوار ہوگا

تبدیلی کے اسباب | وطن کا پرستار، ملت کا فدائی کیسے بن گیا؟ رجحان کی اس تبدیلی کے اسباب کیا ہیں؟

مولانا عبدالسلام ندوی مصنف "اقبالِ کامل" نے اس تبدیلی کے دو اسباب بیان کیے ہیں۔ ایک تو یہ کہ قیامِ یورپ کے زمانہ میں اقبال نے وطنی قومیتوں کے آپس میں رشک و رقابت کے مناظر دیکھے اور اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ وطن کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل سے انسانوں کے آپس میں محبت و اُلفت کا رشتہ استوار نہیں ہوتا۔ بالفاظِ دیگر وطن کو انسانوں کے لیے مرکزِ اتحاد بنانا انسانیت کے لیے مضر ہے۔

دوسرا سبب انھوں نے یہ بیان کیا ہے کہ قیامِ یورپ سے قبل ڈاکٹر صاحب کے خیالات مادیت کی طرف مائل تھے اور انگلستان میں رہنے کے بعد ان کا رجحان روحانیت کی طرف ہو گیا، اس لیے انھوں نے انسانی اخوت کی بنیاد مادی وطنیت کی بجائے روحانی ملیت پر رکھی[۲]۔

قاضی عبدالحمید صاحب ام اے، پی ایچ ڈی نے اپنے مضمون "اقبال کی شخصیت اور اس کا پیغام"[۳] میں اس تبدیلی کے تین اسباب بیان کیے ہیں (۱) قیام یورپ (۲) تحریک تصوف کا مطالعہ (۳) اسلام کا مطالعہ۔

یہ حدیث دیگران تھی، خود اقبال نے اپنی اس ذہنی تبدیلی کے متعلق کیا کہا؟

"میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا، مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتدا ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدتِ دینی کو پارہ پارہ

۲- "اقبال کامل" از مولانا عبدالسلام ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۸ع ص ۳۲۵، ۳۲۶ -

۳- رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۹ -

کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریۂ وطنیت کی اشاعت کی جائے۔"[۴]

اقبال کا یہ بیان ان کی ذہنی تبدیلی پر تھوڑی بہت روشنی ڈالتا ہے، وہ بیان کرتے ہیں کہ اسلامی اتحاد اور یورپی سامراجی نظام میں دشمنی ہے۔ یورپ کا سامراجی نظام اسلام کے دینی اتحاد کو گوارا نہیں کرتا، اس لیے اس نے اسلامی اتحاد کو ختم کرنے کا ایک منصوبہ بنایا اور وہ منصوبہ یہ تھا کہ مسلم ممالک میں یورپی تصور قومیت کا پرچار کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب بیان کرتے ہیں کہ ان کو اس منصوبے کا علم یورپی مصنفین کی تحریروں سے ہوا۔

ڈاکٹر صاحب اپنے خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں، مذہب و سیاست، دین و دنیا کی تقسیم کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے ایک جگہ کہتے ہیں:

"کیا مذہب ایک خانگی معاملہ ہے؟ کیا آپ یہ دیکھنا پسند کریں گے کہ اسلام کا ایک اخلاقی و سیاسی نصب العین کی حیثیت سے دنیائے اسلام میں وہی حشر ہو، جو مسیحیت کا یورپ میں ہو چکا ہے؟ کیا یہ ممکن ہے کہ اسلام کو ایک اخلاقی نصب العین کی حیثیت سے تو برقرار رکھا جائے اور سیاسی نصب العین کی حیثیت سے اس کو نظر انداز کرکے قومیت کا نصب العین اختیار کر لیا جائے، جس میں مذہبی رحجانات کو کوئی عملی حصہ لینے کی اجازت نہیں دی جاتی ہے۔ یہ سوال ہندوستان کے لیے، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں، خاص اہمیت رکھتا ہے۔ 'مذہب ایک خانگی انفرادی تجربہ ہے' یہ بیان کسی یورپ نژاد کی زبان پر تعجب خیز نہیں معلوم ہوتا۔ یورپ میں مسیحیت کا تصور ایک خانقاہی نظام کا تصور تھا، جس نے مادی دنیا کو ترک کر کے اپنی نظریں روحانی دنیا پر لگا رکھی

۴۔ مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۱۶۱۔

تھیں ۔ اس تصور نے منطقی طرز تفکر کے مطابق ، اس نظریہ کی طرف رہنمائی کی ، جو اس بیان میں ظاہر کیا گیا ہے ۔ پیغمبر کے مذہبی واردات کی نوعیت ، جیسا کہ قرآن پاک میں ان کا اظہار ہوا ہے ، اس سے بالکلیہ مختلف ہے ۔ خالص حیاتیاتی واقعہ کے معنوں میں یہ محض ایسی واردات نہیں ہیں ، جو صاحبِ واردات کے اندرون ذات میں وقوع پذیر ہوئی ہوں اور جن کا ردِ عمل ، ان کے عمرانی ماحول پر لازماً نہ ہوا ہو ۔ یہ ایسی انفرادی واردات ہیں ، جنھوں نے ایک معاشرتی نظام کو پیدا کیا ۔ اس کا فوری نتیجہ ایسے نظام سیاست کے اساسی اصولوں کی صورت میں ظاہر ہوا ، جس کے اندر قانونی تصورات بھی مضمر تھے اور جن کی عمرانی اہمیت محض اس لیے گھٹائی نہیں جا سکتی کہ ان کا ماخذ الہام ہے ۔ لہٰذا اسلام کا مذہبی نصب العین اس کے اپنے پیدا کردہ عمرانی نظام سے طبعی طور پر وابستہ ہے ۔ ایک کے انکار سے دوسرے کا انکار لازم آتا ہے ۔ اس لیے اگر قومیت کی بنیاد پر نظامِ سیاست کی تشکیل کے معنے، اسلامی اصول اتحاد کو پسِ پشت ڈالنے کے ہیں تو ایسا نظام سیاست کسی مسلمان کے وہم و گمان میں نہیں آ سکتا ۔ یہ ایک ایسا معاملہ ہے ، جو بحالتِ موجودہ مسلمانانِ ہند سے راست متعلق ہے[۵] ۔

یہ طویل اقتباس بظاہر غیر متعلق معلوم ہوتا ہے ، لیکن ڈاکٹر صاحب کی اس ذہنی تبدیلی کے صحیح اسباب کا پتہ لگانے کے لیے اس کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے ۔ ڈاکٹر صاحب کے مندرجہ بالا بیان کا تجزیہ کرنے سے حسب ذیل نقاط واضح ہوتے ہیں ۔

(۱) مذہبِ اسلام ایک خانگی انفرادی معاملہ کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ اس کا ایک سماجی نصب العین ہے ۔

۵- اسپیچس اسٹیٹ مینٹس آف اقبال مرتبہ "شاملو" ناشر المنار اکادمی لاہور اشاعت ستمبر ۱۹۴۸ ص ۸ ، ۹ ۔

(۲) اس نصب العین اور وطنی قومیت کے نصب العین کے مابین پرخاش ہے -

(۳) مسلمانان ہند اگر وطنی قومیت کے نصب العین کو قبول کر لیں تو لازماً انہیں اسلام کے سیاسی نصب العین کو پس پشت ڈالنا پڑے گا اور اسلام کے سیاسی نصب العین کو پس پشت ڈالنے کے معنی یہ ہیں کہ خود اسلام سے انکار کر دیا جائے -

(۴) لہذا مسلمانان ہند جس بنیادی مسئلہ سے دو چار تھے وہ یہی تھا کہ آیا اسلام کے سیاسی نصب العین کو قبول کیا جائے یا وطنی قومیت کو اس تجزیہ کی روشنی میں جب ہم ڈاکٹر صاحب کی، اس ذہنی تبدیلی کے اسباب کا پتہ لگانا چاہتے ہیں تو لازماً ہم حسب ذیل نتیجہ پر پہنچتے ہیں -

قیام یورپ کے زمانہ میں اقبال نے یورپ کے جدید نظام زندگی اور اس نظام کے پیچھے جو فلسفہ کار فرما تھا ، اس کا گہرا مطالعہ کیا - اس مطالعہ نے ان کو اس نتیجہ پر پہنچایا کہ یہ نظام زندگی نہایت کھوکھلا ہے - اس کی بنیاد مادیت پر ہے - اس فلسفہ حیات میں نہ تو فرد کی نجات ہے اور نہ قوموں کی - افراد آوارہ ہیں اور قوموں میں ایک خاموش پیکار جاری ہے - اس فلسفہ حیات کی بوسیدگی نے انہیں ایک بہتر نظام زندگی اور فلسفہ حیات کی جستجو پر ابھارا - اقبال کی تربیت خانہ اس موقع پر کام آئی اور انہوں نے اسلام میں اس نظام زندگی اور فلسفۂ حیات کو پا لیا - جب انہوں نے ان دونوں نظام ہائے زندگی کا بنظر غائر تقابلی مطالعہ کیا تو انہوں نے اپنے قلب کی گہرائیوں میں یہ محسوس کیا کہ ان دونوں فلسفہ ہائے حیات میں بنیادی تضاد موجود ہے - یہ تضاد صرف نظری نہیں بلکہ عملی ہے - مغربی نظام زندگی کا سیاسی نصب العین وطنی قومیت ہے اور اسلامی نظام حیات کا سیاسی مطمح نظر اخوت بنی نوع انسان یا اخوت اسلامیہ ہے - اسلامی ممالک میں یورپی نظام زندگی کا یہ سیاسی نصب العین اسلامی نظام حیات کے سیاسی مسلک سے برسر پیکار ہے اور ہندوستان میں بھی مسلمان جو ایک اقلیت ہیں ، اس بنیادی مسئلہ سے دوچار ہیں - ایک طرف مغربی نظام زندگی کا پیدا کردہ سیاسی مطمح نظر متحدہ وطنی قومیت ہے ، جس

نے تحریک آزادی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے اور دوسری طرف اسلام کا سیاسی مسلک ہے ، جس سے گریز کرنا گویا اسلام کی روح کو ختم کرنا ہے - اگر اقبال کی ذہنی کیفیت کا یہ نقشہ صحیح ہے تو یہ ماننا پڑے گا کہ ان کے رجحان کی تبدیلی کا تعلق ہندوستان اور مسلمانان ہند کی سیاسی کیفیت سے بھی رہا ہے - اقبال نے مغربی نظام زندگی و فلسفۂ حیات کے شیشہ گھر کو چکنا چور ہوتے دیکھا ، تو اسلام کے آہنی قلعہ میں پناہ لی اور اس نے جب یورپ میں مغربی اقوام کی باہمی آویزش دیکھی تو کیا اس کشمکش کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں ، جو خود اس کے گھر میں جاری تھی ؟ ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال کے قیام یورپ کے زمانہ میں (یعنی سنہ ۱۹۰۵ تا سنہ ۱۹۰۸) ہندوستان میں ایسے غیر معمولی واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے سنہ ۱۹۰۰ء میں ہندو مسلمانوں میں اختلاف کی جو آبجو تھی ، اب بڑھ کر ایک بحر ذخار بن گئی تھی - یہ چھوٹے پیمانہ پر وہی کشمکش اور آویزش تھی ، جو اقبال نے یورپی ممالک میں وطنی قومیتوں کے سبب آپس میں دیکھی تھی ، فرق صرف اس قدر تھا کہ وہاں آویزش حاصل شدہ اقتدار کو برقرار و مستحکم رکھنے کے لیے تھی اور یہاں حصول اقتدار کے لیے جاری تھی — ! یورپ جانے سے پہلے یہ کشمکش سطح کے نیچے تھی اور اس کی نوعیت مذہبی مناظرے سے زیادہ نہ تھی ، لیکن جب وہ یورپ گئے تو یہ کشمکش سطح کے اوپر نمایاں ہو گئی اور اس کی نوعیت خالصتاً سیاسی بن گئی - سمندر کے بیچ میں رہ کر انھوں نے ان ہلکی لہروں کی تضاد روی کا اندازہ نہیں کیا تھا ، اب ساحل پر پہنچ کر انھوں نے ان شوریدہ سر موجوں کی مخالف روش کا صحیح نقشہ دیکھ لیا ! !

انگلستان اس زمانہ میں حقیقتاً ایک بین الاقوامی مرکز تھا ، جہاں پہنچ کر ایک مفکر کے سامنے ساری دنیا کی اجتماعی زندگی کا نقشہ اپنی ناہموار سطح اور متضاد نقش و نگار کے ساتھ ابھر کر نظر آنے لگتا تھا - اقبال کی نظر ہوشیار نے اس بین الاقوامی مرکز میں بیٹھ کر پوری دنیائے انسانیت کی باہمی کشمکش کو دیکھا - اس کی روح نے اس رشک و رقابت کا ادراک کیا ، جو اولاد آدم میں بڑی سرعت کے ساتھ پھیلتی جا رہی تھی اور اس کے ذہن و دماغ میں اس آویزش کا احساس پیدا ہوا ، جو

اواخر انیسویں صدی میں ہندوستان کے ہندوؤں اور مسلمانوں میں خاموشی کے ساتھ جاری تھی اور جس نے اب بیسویں صدی کے آغاز میں شدت اختیار کر لی تھی -

وطنیت کی پگڈنڈی کو چھوڑ کر اقبال نے ملت کی شاہراہ کیوں اختیار کی ؟ اس کے حقیقی اسباب حسب ذیل ہیں :

(۱) مغربی نظامِ زندگی کے کھوکھلے پن کا احساس ،

(۲) اسلامی نظامِ حیات کی حقیقت کا ادراک ،

(۳) مغربی نظامِ زندگی کے سیاسی نصب العین کی وجہ سے وطنی قومیتوں کی باہمی آویزش سے تنفر ،

(۴) اسلامی نظام کے سیاسی مسلک (جس کے باعث تمام بنی آدم اعضائے یک دگر بن جاتے ہیں) سے محبت -

(۵) ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہند و مسلمان کی باہمی چپقلش -

اقبال نے وطنیت کے نظریہ کو ترک کر کے ملیت کے مسلک کو جن اسباب کی بناء پر اختیار کیا ، ان میں منجملہ اور اسباب کے ایک سبب ـــــ اگرچہ یہ سبب بالراست نہ سہی بالواسطہ ہی ہو ـــــ ہندوستان کے سیاسی حالات اور ہند و مسلمانوں کی حصول اقتدار کے لیے باہمی کشمکش بھی تھی - ہمارے اس خیال کو تقویت اس واقعہ سے ملتی ہے کہ ڈاکٹر صاحب لندن مسلم لیگ کے رکن بھی تھے ، اگر ہم ہندوستان کے ان سیاسی حالات کو اقبال کے سیاسی رجحانات پر اثر انداز نہ بھی قرار دیں تو اتنا ضرور ماننا پڑے گا کہ پھر ایک مرتبہ اقبال کے سیاسی رجحانات اور ہندوستان کے سیاسی حالات میں حیرت انگیز مطابقت نظر آتی ہے - قبل ازیں ہم دیکھ چکے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر میں بھی ملک کے سیاسی حالات اور اقبال کے افکار میں بڑی حد تک ہم آہنگی پائی جاتی تھی - اس وقت ملک میں آزادی کی تحریک نئی نئی شروع ہوئی تھی ، اور اس تحریک آزادی نے ابھی اپنے بال و پر نہیں نکالے تھے - ہندوستانیوں میں آزادی کا ایک عام ولولہ پیدا ہو چکا تھا مگر حکومتِ برطانیہ سے عقیدت مندی اور نیک

توقعات کا اظہار بھی کیا جاتا تھا اور ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال کی اس زمانہ کی شاعری میں آزادی اور حب وطن کی یہ لے موجود تھی ! پھر اس زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد بڑی حد تک موجود تھا اور اگر اختلافات تھے بھی تو انہوں نے اس وقت تک شدید سیاسی نوعیت اختیار نہیں کی تھی ۔ اس زمانہ میں ، اقبال نے بھی اپنے پریم بھرے راگ اور محبت آفریں نغمے ان ہی سروں میں گائے ہیں ۔ یہ تو سنہ ۱۹۰۵ع تک کا حال تھا ۔ سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد ، ہندو مسلم اختلافات ، ایک باضابطہ کشمکش کی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں ۔' آزادی کے ولولے اب بھی موجود ہیں لیکن اس آزادی میں حصہ داری کا سوال نمایاں اہمیت اختیار کر لیتا ہے ۔ مشترکہ وطنیت اور آزادی سنہ ۱۹۰۰ع تک ہندوستانی سیاسیات کے محور رہے ہیں ، لیکن ابتدائے بیسویں صدی میں متحدہ وطنی قومیت کے تصور میں شگاف پڑنے لگتے ہیں اور اس سے علیحدگی پسندی کا رجحان پیدا ہونے لگتا ہے ۔ بنگال کی تقسیم ، مسلم لیگ و ہندو مہاسبھا کا قیام ، اس رجحان کو نشان زد کرتے ہیں ۔ اس طرح آزادی کا تصور دھندلا تو نہیں پڑتا ، مگر آزادی میں حصہ بانٹ کے رجحانات نمایاں ہو جاتے ہیں ۔ مسلمانوں کا مطالبہ جدا گانہ انتخاب و تحفظ حقوق سے ان رجحانات کا تعین ہوتا ہے ۔ اقبال اسی زمانہ میں متحدہ وطنی قومیت کے راگ کو ترک کر کے ، ملّیت کا نغمہ سناتے ہیں ۔ علیحدگی پسندی کا یہ رجحان جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے ، بالآخر نہ صرف متحدہ وطنیت کے تصور کو ختم کر دیتا ہے بلکہ اس کی وجہ سے خود وطن (ہندوستان) کے ٹکڑے ہو جاتے ہیں ۔ اقبال کا یہ تفکر ملّیت ، علیحدگی پسندی کے اس رجحان کے لیے ایک بنیادی فلسفہ کا کام انجام دیتا ہے ، یہ ایک نا قابل انکار حقیقت ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کے اندر جتنے سیاسی زعما ، کارکن اور مفکر نظر آتے ہیں ، ان سب میں اقبال ہی غالباً ایک ایسا منفرد شخص ہے ، جو متحدہ وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کے خلاف پورے زور و شور سے اپنی آواز بلند کرتا ہے ۔ خود نواب محسن الملک و وقار الملک اور ان کے دیگر ساتھیوں (جنھوں نے مسلم لیگ کی بنیاد رکھی اور اس علیحدگی پسند تحریک کی ابتداً قیادت کی) کے ذہنوں میں متحدہ وطنی قومیت اور علیحدہ

مسلم قومیت کے متعلق واضح تصورات موجود نہیں تھے اور اگر یہ تصورات تھے تو اصولی اور عملی نقطۂ نظر سے ان کے باہمی تضاد کا انہیں واضح طور پر ادراک نہیں تھا ۔ ان کی تحریروں ، تقریروں اور سیاسی مطالبوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسے طبقے کی نمایندگی کر رہے ہیں ، جو اپنی بعض ضروریات رکھتا ہے اور ماضی میں اس کی خاص روایات بھی رہی ہیں ۔ اس کے حال کی یہ ضروریات اور ماضی کی یہ روایات اس کو ملک کا ایک متمائز طبقہ تو بناتی ہیں لیکن اس کو متحدہ وطنی قومیت کے تصور سے ٹکراتی نہیں ہیں ۔ اقبال ہندوستان کا پہلا مفکر ہے ، جس نے علیحدگی پسند تحریک کی ابتدأً ہی میں علی الاعلان اس امر کا اظہار کر دیا کہ متحدہ وطنی قومیت اور مسلم قومیت کے آپس میں کوئی پیوند نہیں لگایا جا سکتا ۔ ان دونوں میں بہت ہی گہرا تضاد موجود ہے ۔ اس نے وطنی قومیت کے متعلق آغاز ہی میں کہہ دیا کہ

قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے !

ہندوستان کے سیاسی حالات نے اقبال کے ذہن و فکر پر اثر ڈالا یا نہیں ، اس مسئلہ میں دو رائیں ہو سکتی ہیں ۔ لیکن اس حقیقت سے کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا کہ اقبال کے ذہن و فکر کی اس تبدیلی نے ہندوستان کی سیاسیاتِ مابعد پر نہایت گہرے نقوش چھوڑے ہیں ۔ اس کی فکر کے اس تغیر نے ہندوستان میں مسلم قومیت کی نشو و نما کے لیے ایک فلسفیانہ اساس فراہم کر دی ، اس کے ملی نغموں سے مسلم ”فرقہ“ میں قومیت کا شعور بھڑک اٹھا ، اور اس کے تفکر کے ان خدو خال سے دو قومی نظریہ کا وہ نقش ابھرا ، جس نے بالآخر ”پاکستان“ کا نام پا لیا !!

ایک غلط فہمی کا ازالہ | سنہ ۱۹۰۵ع تک اقبال وطن کے راگ گاتے ہیں ، لیکن سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد سے ان کے اس رجحان میں تبدیلی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اس بیان سے ممکن ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ سنہ ۱۹۰۵ع تک تو اقبال وطن کے موئد و ثنا خواں رہے اور سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد وہ اس کے مخالف اور دشمن بن گئے ۔ یہ غلط فہمی صرف ان لوگوں کو ہو سکتی ہے ، جنھوں نے محض سرسری نظر سے اقبال کے کلام اور ہمارے

گذشتہ بیانات کو پڑھا ہے - حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد سے ، ان کے ذہن میں حبِ وطن کا مخالف رجحان پیدا نہیں ہوا - سچ تو یہ ہے کہ اقبال "وطن" کی نہیں بلکہ "وطنیت" کی مخالفت کرتے ہیں ، سنہ ۱۹۰۵ع بعد سے وہ وطن کے ویسے ہی مداح رہے ، جیسے پہلے تھے لیکن "وطنیت" کے سخت مخالف بن گئے - انسان کو اپنے پیدائشی مقام اور اس جغرافیائی ماحول سے ، جس میں وہ رہتا بستا ہو ، لازماً فطری محبت ہوتی ہے ، اور اسی محبت کو "حب الوطنی" کہا جاتا ہے - اقبال کا دل جس طرح سنہ ۱۹۰۵ع سے قبل وطن کی محبت سے سرشار تھا ، اسی طرح بعد میں بھی رہا ، چنانچہ وہ اپنے آخری دور کی ایک نظم "شعاعِ امید" میں اپنے جذباتِ وطن دوستی کا بڑے پر خلوص انداز میں اظہار کرتے ہیں -

جس شاعر کے حسین تصور نے "نیاشوالہ" کی تخلیق کی تھی ، اسی کی نگاہ شوخ نے اِس "شعاعِ امید" کو بھی دیکھا - وہاں شاعر نے اپنی اعلیٰ فن کاری کا مظاہرہ کیا تھا ، یہاں بھی وہ اپنے بلند آرٹ کا ایک بہت ہی دلآویز نقش پیش کرتا ہے - خاکِ وطن سے اس کو اُس وقت بھی محبت تھی ، اور اب بھی باقی ہے - اس وقت اس نے برہمن کو مخاطب کر کے کہا تھا

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے
خاکِ وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

اور اب وہ اسی خاکِ وطن سے اپنے تعلقِ خاطرکا اظہار اس طرح کرتا ہے

خاور کی امیدوں کا یہی خاک ہے مرکز
اقبال کے اشکوں سے یہی خاک ہے سیراب

چشمِ مہ و پرویں ہے اسی خاک سے روشن
یہ خاک کہ ہے جس کا خزف ریزہ درِ ناب

اس خاک سے اٹھے ہیں وہ غواص معانی
جن کے لیے ہر بحرِ پر آشوب ہے پایاب

وہاں اس نے شیخ و برہمن دونوں سے بیزار و متنفر ہو کر کہا تھا :

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے
تیرے صنم کدے کے بت ہو گئے پرانے
اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا
جنگ جدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

اور یہاں وہ شیخ کی مجبوری اور برہمن کی غلامی پر افسوس کرتا ، مگر دونوں کی حالتِ زار سے یکساں ہمدردی رکھتا ہے :

بت خانہ کے دروازہ پہ سوتا ہے برہمن
تقدیر کو روتا ہے مسلماں تہ محراب

اس وقت اس نے ہندوستان کی " انوپ ، سندر اور موہن چھب والی مورتی " کو دل کے " ہر دوار " میں بٹھا کر ہندو اور مسلمان دونوں کو اس کی پوجا کرنے کی ترغیب دی تھی ، اور اب وہ ہند کے مردانِ گراں خواب کو خواب سے بیدار کرنے کا عزمِ صمیم رکھتا ہے ۔ اس وقت اقبال ہند کا پجاری و وطن پرست تھا اور اب وہ ہند پرور و وطن دوست ہے ! !

اس زمانہ میں بھی اقبال وطن کی بربادی پر روتا تھا ، ہندوستان کی محکومی و غلامی سے اسے دلی تکلیف ہوتی تھی اور نقطۂ نظر کی تبدیلی کے بعد بھی اس کی آنکھیں وطن کی بے بسی پر اسی طرح اشکبار اور اس کا دل ہند کی غلامی پر ویسا ہی درد مند و شرمسار ہے ۔ جاوید نامہ میں اس نے مرشد رومی کی معیت میں اپنی سیرِ افلاک کا حال بیان کیا ہے ۔ اسی سیر میں وہ دونوں ایک خونی دریا کے پاس پہنچتے ہیں ۔ یہاں ان کو ایک کشتی دکھائی دیتی ہے ، جو موجوں کے تھپیڑے کھا رہی ہے ۔ اس کشتی سے آواز آتی ہے :

نے عدم مارا پذیرد نے وجود
وائے زے مہریٔ بود و نبود
تا گذشتیم از جہانِ شرق و غرب
بر درِ دوزخ شدیم از درد و کرب

یک شرر بر صادق و جعفر نزد
بر سر مامشت خاکستر نزد

گفت دوزخ راخس و خاشاک بہ
شعلۂ من زیں دو کافر پاک بہ

آنسوے نہہ آسماں رفتیم ما
پیشِ مرگِ ناگہاں رفتیم ما

گفت جاں سرے زا سرار من است
حفظِ جان و ہدمِ تن کارِ من است

جاں زشتیے گرچہ نرزد باد و جو
اے کہ از من و ہدم جاں خواہی برو

ایں چنیں کارے نمی آید زمرگ
جان غدارے نیا ساید زمرگ

یہ کون ہیں ، جن کو عدم قبول کرتا ہے نہ وجود ، جن کے لیے نہ مشرق میں جگہ ہے نہ مغرب میں ؟ جن کو دوزخ نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا اور جس کی درخواست کو مرگِ ناگہاں نے ٹھکرا دیا ؟ یہ ہندوستان کے غداروں کی روحیں ہیں جن کی وجہ سے ہندوستان کے گلے میں غلامی کا طوق پڑا ! !

جعفر از بنگال و صادق از دکن
ننگِ آدم ننگِ دیں ننگِ وطن

اور اقبال کس درد بھرے دل کے ساتھ ہندوستان کی محکومی کا رونا روتا ہے ۔

مے ندانی خطۂ ہندوستان
آن عزیزِ خاطرِ صاحب دلاں

خطۂ ہر جلوہ اش گیتی فروز
درمیانِ خاک و خوں غلطد ہنوز

در گلشن تخم غلامی را کہ کشت ؟
ایں ہمہ کردار آن رواحِ زشت

وہ کس تکلیف کے ساتھ ہند کی غلامی پر آنسو بہاتا ہے :

معلوم کسے ہند کی تقدیر کہ اب تک
بے چارہ کسی تاج کا تابندہ نگیں ہے

جاں بھی ہے گروِ غیر بدن بھی ہے گروِ غیر
افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

یورپ کی غلامی پہ رضا مند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے ہے یورپ سے نہیں ہے

الغرض پہلے بھی اقبال کو وطن سے محبت تھی اور اس تبدیلی کے بعد بھی اس محبت میں سرمو فرق نہیں آیا - فرق جو آ گیا تھا ، وہ صرف یہ تھا کہ پہلے وہ وطنیت کا قائل و حامی تھا ، اب وہ وطنیت کا دشمن و مخالف بن گیا - لیکن یہ وطنیت کیا ہے؟ یہ تو وطن ہی کا ایک مشتق ہے ! پھر اس میں یعنی وطن و وطنیت میں فرق کیا ہے ؟ اس کی تشریح بھی خود ہی اقبال نے کر دی ہے - انہوں نے ایک مشہور نظم لکھی ہے ، جس کا عنوان ہے '' وطنیت '' اور اس عنوان کے نیچے وہ قوسین میں تشریح کرتے ہیں (یعنی وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے) اور مزید وضاحت ایک شعر میں اس طرح کرتے ہیں -

گفتارِ سیاست میں وطن اور ہی کچھ ہے
ارشادِ نبوت میں وطن اور ہی کچھ ہے

یہ اشارہ ہے اس حدیث کی طرف ، جس میں فرمایا گیا ہے کہ وطن کی محبت جزوِ ایمان ہے ، یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ اس حدیث کی حیثیت کیا ہے ، آیا وہ ضعیف ہے یا قوی ، صحیح ہے یا غلط؟ اقبال بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انسان جس ماحول میں پیدا ہوتا ، جس فضا میں نشو و نما پاتا اور جس سر زمین پر وہ رہتا بستا ہے اس سے اس کو ایک گونہ محبت ہو جاتی ہے اور یہ ایک فطری لازمہ ہے - یہ ہے وطن اور اس کی محبت کا

ر ، لیکن سیاسی زبان میں وطن سے مراد یہ نہیں ہے بلکہ وطن
طنیت ہے ، جس کا مطلب یہ ہے کہ وطن ایک مرکزِ اتحاد ہے،
گوں کے لیے جو اس میں بستے ہیں ۔ وطن کا یہ تصور ان تمام
و جو ایک مخصوص جغرافی خطہ میں بستے ہیں ، ایک منظم
ر دیتا ہے جن کا باہمی مفاد ایک ہے ، جن کی زندگی کا
ن ایک ہے اور جن کا لائحہ عمل ایک ہے ۔ اس طرح روئے زمین
سان مختلف مخصوص جغرافی خطوں میں تقسیم ہو کر مختلف قومیتیں
۔ ان میں سے ہر قومیت کے افراد کے باہمی مفادات میں ممکن ہے
نگی ہو ، لیکن مختلف قومیتوں میں ہم آہنگی کی بجائے تضاد پایا
پھر یہ تضاد ان کو باہمی مسابقت ، مقابلہ اور بالآخر مقاتلہ تک
۔ سیاسی زبان میں جب وطن کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے ،
مضمرات ، یہی ہوتے ہیں اور یہی وطنیت ، اسلام سے ٹکراتی
ں وطن اور اسلام میں کوئی تصادم نہیں ہے ۔ اقبال نے خود اس
ریح کی ہے ، وہ فرماتے ہیں ۔

" اگر قومیت (وطنی قومیت) کے معنے حب الوطنی اور ناموسِ
طن کے لیے جان تک قربان کرنے کے ہیں تو ایسی قومیت
سلمانوں کے ایمان کا ایک جزو ہے ، اس قومیت کا اسلام سے اس
قت تصادم ہوتا ہے جب کہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے
ر اتحاد انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور
ہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں
ملا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے
ق نہ رہے[6] "

ظ دیگر وطن اور اسلام میں کوئی مخالفت نہیں ہے البتہ وطنی
اسلامی قومیت میں تصادم ہوتا ہے ۔ علامہ اقبال ۱۹۰۵ء سے
اور وطنیت دونوں کے قائل تھے ، سنہ ۱۹۰۵ء کے بعد وہ صرف

مین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار
آباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۱۲۶ ۔

وطن کے حامی رہ گئے ! پہلے وہ وطن پرست تھے اور اب وطن پرور بن گئے !!

مسلم لیگ میں شرکت | ہم بتا چکے ہیں کہ انگلستان سے واپسی کے بعد ڈیڑھ سال تک وہ پروفیسر بھی رہے اور بیرسٹر بھی ، ڈیڑھ سال کے بعد انہوں نے پروفیسری چھوڑ کر صرف بیرسٹری اختیار کر لی ۔ اس دور میں بھی وہ عملی سیاست سے بالکل بیگانہ و بے تعلق نہ رہے ، بلکہ وہ تعلق جو لندن میں مسلم لیگ سے ان کا پیدا ہو چکا تھا یہاں بھی برابر باقی رہا ۔ چنانچہ اقبال کے ایک پرانے دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں

" تعلیم سے فارغ ہو کر جب وہ وطن واپس آئے تو صوبائی مسلم لیگ کا قیام عمل میں آ چکا تھا ۔ اس لیگ کے صدر مولوی شاہ دین مرحوم تھے سر محمد شفیع سیکرٹری تھے اور میں اسسٹنٹ سیکرٹری ۔ اقبال آئے تو قدرتی طور پر لیگ کی جاذبیت نے انہیں اپنی طرف متوجہ کیا اور وہ بھی ہمارے ساتھ اس میں شریک ہو گئے[۷] "

لیگ میں ان کی یہ شرکت اس سیاسی عقیدہ کی بناً پر تھی کہ

" مسلمان کسی دوسری سیاسی جماعت میں مدغم ہو کر اپنی ملی حیثیت کو کھو دینے کی بجائے اپنی سیاسی تنظیم کے لیے خود کوشش کریں[۷] "

اسی زمانہ میں اقبال اچھے خاصے ، عوامی آدمی (Public-man) بن چکے تھے ۔ لاہور کے علمی اور معاشرتی جلسوں میں وہ نہ صرف شریک ہوتے بلکہ ان کی صدارت بھی کیا کرتے تھے ۔ اس زمانہ میں مسلم لیگ کے مسلک (Creed) پر ان کا عقیدہ اس قدر راسخ تھا کہ

۷- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور بار اول ص ۶۳ ۔

" حکیم محمد اجمل خان صاحب مرحوم ، کانگریس کے بہت بڑے حامی تھے - جب کبھی لاہور یا شملہ تشریف لاتے تو سیاسی مسائل پر ان سے ڈاکٹر صاحب کی بڑی گرما گرم بحث ہوتی تھی ، جو کئی گھنٹوں تک جاری رہتی[۸] "

مخلوط انتخاب کی مخالفت
جداگانہ انتخاب کی حمایت

بتایا جا چکا ہے کہ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع میں مسلمانوں کے ایک نمائندہ وفد نے گورنر جنرل کی خدمت میں ایک یادداشت پیش کی تھی ، جس میں مخلوط انتخاب کی شدید ترین مخالفت کی گئی تھی اور جداگانہ انتخاب کا مطالبہ کیا گیا تھا - یہ وفد جب شملہ میں وائسرائے سے ملا تھا ، تو اس وقت اقبال لندن میں تھے - سنہ ۱۹۰۹ع میں جب منٹو مارلے اصلاحات کی اسکیم نافذ ہوئی تو اس میں مسلمانوں کے اس مطالبہ کو مان لیا گیا تھا - اس زمانہ میں بھی ہندو جداگانہ طریقہ انتخاب کے سخت مخالف تھے اور مسلم لیگ جداگانہ انتخاب کی حامی بلکہ وکیل تھی - اقبال انگلستان سے لوٹ آئے تھے اور مسلم لیگ میں شریک ہو گئے تھے - وہ بھی جداگانہ انتخاب کے پر زور حامی اور مخلوط انتخاب کے شدید مخالف تھے ، اس کا اظہار انھوں نے مزاحیہ انداز میں اس طرح کیا ہے :

ممکن نہیں کہ ایک ہی بازار میں چلیں
ہم سکے اور دھات کے ، وہ اور دھات کے
مخلوط انتخاب سے ہے ، نا اُمید ہند
پابند یاں کے ووٹ بھی ہیں چھوت چھات کے[۹]

۸- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور طبع اول ص ۶۳ -
۹- یہ اشعار اقبال کے مطبوعہ کلام میں نہیں ملتے ، فقیر سید وحیدالدین نے اپنی کتاب روزگار فقیر جلد دوم مطبوعہ کراچی بار دوم نومبر ص ۳۱۴ پر یہ اشعار درج کیے ہیں ان کا بیان ہے کہ انھوں نے یہ اشعار علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد کی بیاض سے نقل کئے ہیں - ممکن ہے کہ علامہ نے انھیں غیر اہم سمجھ کر اپنے مطبوعہ کلام میں جگہ نہ دی ہو -

مسلک ملیت کی استواری | اسی زمانہ میں انگلستان سے واپسی کے بعد اقبال کی شاعری میں ملّیت کا جدید رجحان زیادہ استوار اور پختہ ہو گیا ۔ اب وہ ہراس چیز ، کیفیت اور مقام کی تعریف کرتے ہیں جس کا اسلام سے تھوڑا بہت تعلق رہا ہے ۔ ہندوستان کے دارالسلطنت دہلی سے انہیں دلچسپی ہے ، مگر کس حیثیت سے ؟ اس حیثیت سے کہ اس خاک میں " خیرالامم کے تاجدار " ابدی نیند سو رہے ہیں اور اس حیثیت سے کہ یہ سر زمین اب " خانقاہِ عظمتِ اسلام " ہے ۔ وہ بغداد کی تعریف کرتے ہیں کیونکہ اس نے " تہذیبِ حجاز " کے لیے " سامانِ ناز " سہیا کیا تھا ۔ اور قرطبہ ان کی " آنکھوں کا نور " ہے ، کیونکہ " ظلمتِ مغرب " میں وہ ایک " شمع طور " تھی اور اسی نے تہذیبِ حاضر کے دئیے کو فروزاں کرنے کا سامان مہیا کیا تھا ۔ قسطنطنیہ کی خاک بھی ان کی نظر میں پاک ہے ، اس وجہ سے کہ وہ خلافتِ عثمانیہ کا مرکز ہے ۔ اس کی ہواؤں میں پھولوں کی سی خوشبو ہے کیونکہ وہ فیض یافتۂ نبوت حضرت ایوب انصاری کا مدفن ہے ۔ دہلی اور بغداد ، قرطبہ اور قسطنطنیہ ، اقبال کی نگاہ میں معزز و محترم ہیں لیکن اس کی محبوب سر زمین کون سی ہے ؟

خواب گاہ مصطفیٰ ! !

کعبہ میں حج ہوتا ہے ، حج اکبر بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر حج اکبر سے بھی بڑھ کر کوئی عبادت ہے تو وہ مدینہ کی دید اور یثرب کی زیارت ہے ! اس سر زمین کو یہ افتخار کیوں حاصل ہے ؟ اس لیے کہ رحمۃ اللعالمین اس میں استراحت فرما ہیں ، اور مسلمانانِ عالم کا یہ ایک مرکز ہے ، وطن ہے ، دیس ہے ! ! کس سوز و تاثر کے ساتھ وہ بطحیٰ کی وادی کو مخاطب کرتے ہیں :

وہ زمیں ہے تو مگر اے خوابگاہِ مصطفیٰ
دید ہے کعبہ کو تیری حجِ اکبر سے سوا

خاتمِ ہستی میں تو تاباں ہے مانندِ نگیں
اپنی عظمت کی ولادت گاہ تھی تیری زمیں

تجھ میں راحت اس شہنشاہِ معظم کو ملی
جس کے دامن میں اماں اقوامِ عالم کو ملی

ہے اگر قومیتِ اسلام پابندِ مقام
ہند ہی بنیاد ہے اس کی نہ فارس ہے نہ شام

آہ! یثرب! دیس ہے مسلم کا تو ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

جب تلک باقی ہے تو دنیا میں باقی ہم بھی ہیں
صبح ہے تو اس چمن میں گوہر شبنم بھی ہیں

اس زمانہ میں ان کا ملّی تاثر اس قدر تیز ہوتا ہے کہ وہ تاجداران گولکنڈہ (حیدر آباد دکن) کے گورستان کو دیکھ کر کہہ اٹھتے ہیں ۔

ہے تو گورستاں مگر یہ خاک گردوں پایہ ہے
آہ! اک برگشتہ قسمت قوم کا سرمایہ ہے

ان کے اس رجحان کی پختگی کا اظہار اس سے بھی ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں وہ "وطنیت" کی توضیح و تشریح کرتے ہیں ۔ ایک سیاسی تصور کی حیثیت سے وطن کو وہ تہذیب جدید کا "تازہ خدا" قرار دیتے ہیں ۔ جی ہاں! یہ "تازہ خدا" وہی "قدیم دیوتا" اور "پرانا بت" تو ہے، جس کے لیے انھوں نے سنہ ۱۹۰۵ع سے قبل "نیا شوالہ" بنایا تھا اور جس کو پوجنے کی انھوں نے بلا تفریقِ مذہب و ملت سب کو تلقین کی تھی!! لیکن اب وہ "پرانا بت" اور یہ "تازہ خدا" ان کی نظر میں مردود ہے اس لیے کہ اس نے مذہب کے کفن کو پھاڑ کر اپنے لیے پیراہن فاخرہ بنا لیا ہے اور کاشانۂ دینِ نبوی کو غارت کر رہا ہے، اس نے خدا کی مخلوق کو "عیال اللہ" بنانے کی بجائے اقوام میں بانٹ کر ان میں باہمی رقابت و دشمنی پیدا کر دی ہے، اس نے "میرا ملک" حق پر ہو یا ناحق پر (My country right or wrong) کا نعرہ بلند کر کے سیاست کو میکیا ویلیت میں تبدیل کر دیا ہے ۔ تہذیبِ نوی کا یہ بت، ضعیف کا حامی اور قوی کا مخالف نہیں بلکہ کمزور کو غارت کرنے والا اور قوی کو اقویٰ بنانے والا ہے ۔ پھر وہ بہت غیر مبہم الفاظ میں کہتے ہیں ۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

اور وہ مسلمان کو اس طرح للکارتے ہیں -

بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے
نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی! خاک میں اس بت کو ملا دے

اسی زمانہ میں ترانۂ ہندی کے جواب میں اسی بحر و وزن میں انھوں نے ترانۂ ملّی لکھا - وطن پرست اقبال کے ذہن و دماغ نے ترانۂ ہندی پڑھا تھا اور مات پرور اقبال کی روح ترانۂ ملّی گا رہی ہے! اس وقت اس کی نظروں میں ہندوستان سارے جہاں سے اچھا تھا، اس لیے کہ وہ ہندی تھا اور ہندوستان اس کا وطن تھا، لیکن اب وہ مسلم ہے اور سارا جہاں اس کا وطن ہے - اس کی فکر و نظر کا مرکز اس وقت وطن تھا، اس لیے اس نے کہا تھا -

غربت میں ہوں اگر ہم، رہتا ہے دل وطن میں
سمجھو ہمیں وہیں بھی دل ہو جہاں ہمارا

لیکن اب اس کے قلب و روح کا محور کعبۃ اللہ ہے، اس لیے وہ کہتا ہے -

دنیا کے بت کدوں میں پہلا وہ گھر خدا کا
ہم اس کے پاسباں ہیں وہ پاسباں ہمارا

وطنیت کے دور میں اس نے رودِ گنگا سے مخاطب ہو کر کہا تھا -

اے آب رودِ گنگا! وہ دن ہیں یاد تجھ کو
اترا ترے کنارے جب کارواں ہمارا

اور ملّیت کے اس دور میں وہ موجِ دجلہ سے پوچھتا ہے -

اے موج دجلہ! تو بھی پہچانتی ہے ہم کو
اب تک ہے تیرا دریا افسانہ خواں ہمارا

وطن کی عزت و عظمت اس وقت اس کے دل میں اس قدر جذب ہو چکی تھ
کہ وہ سمجھتا تھا کہ دنیا کے سارے قدیم ممالک کی شان و شوکت مٹ چ
ہے مگر ہندوستان کا نام باقی ہے اور باقی رہے گا ۔

یونان و مصر و روما سب مٹ چکے ہیں لیکن
اب تک مگر ہے باقی نام و نشاں ہمارا

اب بھی وطن کی عزت و عظمت اس کی نظروں میں گھٹتی نہیں ہے ، مگر
ملت کی سربلندی اور وقار کا احساس ایک گونہ خود اعتمادی کے ساتھ ہر
چلا ہے ۔

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارے
آساں نہیں مٹانا نام و نشاں ہمارا

تیغوں کے سائے میں ہم پل کر جواں ہوئے ہیں
خنجر ہلال کا ہے قومی نشاں ہمارا

یہ عجیب بات ہے کہ " ترانۂ ہندی " لکھتے وقت اقبال کو تنہائی کا احساس
ہے حالانکہ وطن اس وقت اس کی نظروں میں انسانوں کی اجتماعیت کا ایک
مرکز تھا ، اس نے کہا تھا ۔

اقبال ! کوئی محرم اپنا نہیں جہاں میں
معلوم کیا کسی کو درد نہاں ہمارا

لیکن " ترانۂ ملی " لکھتے وقت اس کا اجتماعی شعور جاگ اٹھتا ہے ، وہ
اپنے آپ کو ایک ایسی منظم جماعت کا فرد محسوس کرتا ہے ، جو اپنی
منزل مقصود کی طرف رواں دواں ہے ۔ اقبال کا " ترانۂ ہندی " ایک ایسا
درد نہاں تھا، جو ناآشنائے محرم ہو کر رہ گیا تھا ، لیکن اس کے "ترانۂ ملی"
سے اس جمیعت کے تمام افراد گوش آشنا ہیں ، یہ ان کے لیے ایک نغمہ
سرور آفریں نہیں ہے ، بلکہ بانگِ درا ہے جس کی آواز پر پورا کارواں اپنی
منزل کی طرف چل پڑتا ہے !

اقبال کا ترانہ ، بانگ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادۂ پیما پھر کارواں ہمارا

"ترانۂ ہندی" میں اس نے جس اجتماعی شعور کا اظہار کیا ہے، اس کا مرکز وطن ہے اور "ترانۂ ملی" میں اس نے جس اجتماعیت کا ادراک کیا ہے، اس کا مرکز ایک پاکیزہ روحانی رشتہ ہے۔ وہ کس سوز و گداز سے کہتا ہے۔

سالار کارواں ہے میر حجاز اپنا
اس نام سے ہے باقی آرام جاں ہمارا

تقسیم بنگال کی تنسیخ اور اقبال | ہم بیان کر چکے ہیں کہ ۱۲ دسمبر سنہ ۱۹۱۱ع کو تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان ہوا، اس اعلان سے ہندو خوش ہوگئے اور مسلمان ناراض۔ اقبال نے تنسیخ تقسیم بنگال کو کس نظر سے دیکھا، اس کا اندازہ ذیل کے خط سے ہو سکتا ہے، جو انھوں نے اعلان تنسیخ کے دو دن بعد یعنی ۱۴ دسمبر کو عطیہ بیگم فیضی کے نام لکھا ہے:

"ہندوؤں نے بنگال کے دو حصوں (ہندو بنگال اور مسلم بنگال) میں تقسیم کو حکومت کی طرف سے بنگالی قومیت کے قلب پر ایک ضرب کاری سے تعبیر کیا ہے، لیکن حکومت نے دہلی کو دارالسلطنت قرار دے کر اپنے فیصلہ کی خود ہی پوری ہوشیاری سے تنسیخ بھی کر دی ہے۔ بنگالی سمجھتا ہے، جیت اس کی رہی لیکن اسے نظر نہیں آتا کہ اس کی اہمیت گھٹا کر صفر کر دی گئی ہے، اس مسئلہ سے متعلق دو شعر ہوگئے ہیں،

مندمل زخم دل بنگال آخر ہوگیا
وہ جو تھی پہلے تمیز کافر و مومن گئی
تاج شاہی آج کلکتے سے دہلی آ گیا
مل گئی بابو کو جوتی اور پگڑی چھن گئی[۱۰]"

عالم اسلام اور اقبال | ہم بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۱۰ع سے لے کر جنگ عظیم کے آغاز تک کا زمانہ اسلامی ممالک کے لیے صبر آزما زمانہ تھا۔

۱۰- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور سنہ ۱۹۵۱ع ص ۱۵۲، ۱۵۳

روس و برطانیہ کا اتحاد، ترکی و ایران کے لیے خطرہ بن گیا تھا۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں طرابلس کی جنگ چھڑی۔ شمالی ایران میں روس نے مسلمانوں پر ظلم ڈھائے، ۱۹۱۲ء میں جنگ بلقان کا آغاز ہوا، جس کا سنہ ۱۹۱۳ء کے وسط میں خاتمہ ہوا۔ ان واقعات کی صدائے بازگشت اقبال کی ان نظموں میں سنائی دیتی ہے، جو اس زمانہ میں لکھی گئی تھیں۔ ان کی مشہور و معروف نظم ''شکوہ'' اسی زمانہ کی یادگار نگارش ہے۔ اقبال کا یہ شکوہ کسی گستاخ کی شکایت نہیں، خوگر حمد کا گلہ ہے۔ ''شکوۂ ارباب وفا'' ہے۔ وہ خدا کے سامنے ملت بیضا کے ان کارناموں کو ایک ایک کرکے گناتے ہیں، جو اللہ کے نام کو سربلند کرنے کے لیے انجام دئیے گئے تھے۔ دنیا کے مختلف حصوں میں مختلف قومیں آباد تھیں۔ یہاں سلجوق بھی تھے اور تورانی بھی، چینی بھی تھے اور ساسانی بھی، یہودی بھی تھے اور نصرانی بھی لیکن ان میں سے کسی نے بھی کلمۃ اللہ کو علیا کرنے کے لیے اپنی شمشیر کو بے نیام نہیں کیا اور اپنی جانوں کو جوکھوں میں نہیں ڈالا۔ یہ فرزندانِ توحید ہی تھے جنھوں نے سمندر کے سینوں کو چاک کر دیا، زمین کی چھاتی پر اپنے خون کی نہریں بہا دیں، افریقہ کے صحراؤں کو ان کے صبا رفتار گھوڑوں نے روند ڈالا اور یورپ کے بازاروں میں ان کے نعرے گونجے! — مگر یہ معرکہ آرائیاں، یہ جانبازیاں کس کے لیے تھیں؟

ہم جو جیتے تھے تو جنگوں کی مصیبت کے لیے
اور مرتے تھے ترے نام کی عظمت کے لیے!!

یہ مسلمان ہی تھے جو اللہ کے پیغام کو، مۓ توحید کے جام کو لے کر ہر گلی کوچے میں پھرے۔ اور دشت و جبل میں گھومے، لیکن آج اس خدمت کا صلہ اِن کو کیا مل رہا ہے؟

بت صنم خانوں میں کہتے ہیں مسلمان گئے
ہے خوشی ان کو کہ کعبے کے نگہبان گئے
منزلِ دہر سے اونٹوں سے حدی خوان گئے
اپنی بغلوں میں دبائے ہوئے قرآن گئے

مسلمان آج مفلس و کنگال ہیں ، رسوا و بدنام ہیں ، محکوم و غلام ہیں ممالک غیر میں تو ان کے لیے جگہ ہی نہیں ــــ ترکی و ایران کے لیے خط پیدا ہوگیا ہے ، طرابلس میں وہ مٹائے جا رہے ہیں ، بلقان ان سے چ جا رہا ہے ۔ اللہ کے نام لیواؤں کا تو یہ حال ہے ، مگر "اغیار" کی کیفیت ہے ؟ "خدا بیزار" اور "مست مۓ پندار" قوموں کا کیا رُ ہے ؟ــــ ان کے خزانے معمور ہیں ، ان کے قبضہ میں حور و قصور ہیں اسی لیے شاعر شکوہ سنج انداز میں اپنے خدا سے کہتا ہے ۔

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بے چارے مسلمانوں پر

بنی اغیار کی اب چاہنے والی دنیا
رہ گئی اپنے لیے ایک خیالی دنیا

ہم تو رخصت ہوئے اوروں نے سنبھالی دنیا
پھر نہ کہنا ہوئی توحید سے خالی دنیا

پھر وہ پلٹ کر خدا سے سوال کرتا ہے

کیوں مسلمانوں میں ہے دولتِ دنیا نایاب
تیری قدرت تو ہے وہ جس کی نہ حد ہے نہ حساب

تو جو چاہے تو اٹھے سینۂ صحرا سے حباب
رہروِ دشت ہو سیلی زدۂ موج سراب

طعنِ اغیار ہے ، رسوائی ہے ، ناداری ہے
کیا ترے نام پہ مرنے کا عوض خواری ہے

اور درد انگیز لہجے میں خدا سے التجا کرتا ہے ۔

اپنے پروانوں کو پھر ذوقِ خود افروزی دے
برقِ دیرینہ کو فرمانِ جگر سوزی دے

اور اپنے رب کے حضور گڑگڑا کر عرض کرتا ہے ۔

مشکلیں اُمتِ مرحوم کی آساں کر دے
مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیماں کر دے

جنسِ نایابِ محبت کو پھر ارزاں کر دے
ہند کے دیر نشینوں کو مسلماں کر دے

حضورِ رب میں پہنچ کر اقبال کے داغ ہائے دل پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں اور وہ اپنے سینہ کو یوں چاک کرتے ہیں۔

بوئے گل لے گئی بیرونِ چمن رازِ چمن
کیا قیامت ہے کہ خود پھول ہیں غمازِ چمن

عہدِ گل ختم ہوا، ٹوٹ گیا سازِ چمن
اڑ گئے ڈالیوں سے زمزمہ پروازِ چمن

ایک بلبل ہے کہ ہے محوِ ترنم اب تک
اس کے سینہ میں ہے نغموں کا تلاطم اب تک

"غرۂ شوال یا ہلالِ عید" کو اوجِ گردوں پر دیکھ کر انھیں اپنی ملت کی پستی یاد آ جاتی ہے اور وہ "ہلال عید" کو اس پستی کا نظارہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں۔

اوجِ گردوں سے ذرا دنیا کی پستی دیکھ لے
اپنی رفعت سے ہمارے گھر کی پستی دیکھ لے

پھر اس پستی کے مختلف مناظر ناداری، محکومی اور فرقہ پرستی کو وہ یوں آنکھوں کے سامنے لاتے ہیں۔

دیکھ کر تجھ کو افق پر ہم لٹاتے تھے گہر
اے تہی ساغر! ہماری آج ناداری بھی دیکھ

فرقہ آرائی کی زنجیروں میں ہیں مسلم اسیر
اپنی آزادی بھی دیکھ، ان کی گرفتاری بھی دیکھ

روس و برطانیہ کا اتحاد ایران کے لیے ایک خطرہ بن گیا تھا، اس کی طرف اس شعر میں اشارہ کرتے ہیں۔

سازِ عشرت کی صدا مغرب کے ایوانوں میں سن
اور ایران میں ذرا ماتم کی تیاری بھی دیکھ

ترکیہ میں سلطان عبدالحمید خاں کو معزول کر کے سلطان محمد نے خلافت سنبھال لی تھی ، اقبال خلافت کے اس عزل و نصب کو ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے ہیں ، ان کو اس کے پس پردہ فرنگیوں کی عیاری نظر آتی ہے ، اس لیے وہ کہتے ہیں ،

چاک کر دی ترکِ ناداں نے خلافت کی قبا
سادگی مسلم کی دیکھ اوروں کی عیاری بھی دیکھ

" شمع و شاعر " فروری سنہ ۱۹۱۲ع میں لکھی گئی تھی ، اس نظم میں بھی عالمِ اسلام کے ان مصائب کا عکس جھلک رہا ہے ۔ شاعر شمع سے سوال کرتا ہے کہ تو جب جلتی ہے ، تو پروانے تجھ پر ٹوٹ پڑتے ہیں ۔ میں بھی جل رہا ہوں ، لیکن میرے اس سوز سے کوئی متاثر نہیں ہوتا تجھ میں یہ آتشِ عالم افروز کہاں سے آ گئی ہے ، جس نے پروانہ کو سوز کلیم عطا کر دیا ہے ؟ شمع جواب دیتی ہے ،

میں تو جلتی ہوں کہ ہے مضمر مری فطرت میں سوز
تو فروزاں ہے کہ پروانوں کو ہو سودا ترا

یوں تو روشن ہے مگر سوز دروں رکھتا نہیں
شعلہ ہے مثلِ چراغِ لالۂ صحرا ترا

شاعر سوزِ نفس رکھنے کے باوجود ، رسوا کیوں ہے ؟ اس کی وجہ شمع کی زبان سے سنئے ۔

اور ہے تیرا شعار ، آئینِ ملت اور ہے
زشت روئی سے تری آئینہ ہے رسوا ترا

کعبہ پہلو میں ہے اور سودائی بتِ خانہ ہے
کس قدر شوریدہ سر ہے شوق بے پروا ترا

شمع نے شاعر کی زبوں حالی کا جو نقشہ کھینچا ہے ، اور اس تباہی کے جو اسباب بیان کئے ہیں وہ اصل میں ملتِ اسلامیہ کے بربادی کے نقوش اور اسباب ہیں ، اقبال نے یہاں شاعر کو بطور ایک رمزیہ (symbol) کے استعمال کیا ہے ۔ مسلمان کی سربلندی کا راز آئینِ اسلام کی پابندی میں مضمر تھا ـــــ

دھر میں عیشِ دوام آئیں کی پابندی سے ہے
موج کو آزادیاں سامان شیون ہو گئیں

اس کی عزت ، ملت کی جمعیت اور شیرازہ بندی سے تھی ۔

آبرو باقی تری ملت کی جمعیت سے تھی
جب یہ جمعیت گئی ، دنیا میں رسوا تو ہوا

مسلمان کی خود فراموشی نے اس کو ڈبو دیا ہے ، اس لیے شمع اس سے کہتی ہے ۔

وائے نادانی کہ تو محتاجِ ساقی ہو گیا
مئے بھی تو مینا بھی تو ساقی بھی تو محفل بھی تو

شعلہ بن کر پھونک دے خاشاکِ غیر اللہ کو
خوفِ باطل کیا کہ ہے غارت گرِ باطل بھی تو

جون سنہ ۱۹۱۲ع میں انھوں نے " مسلم " کے عنوان سے ایک نظم لکھی یہ زمانہ جنگ بلقان کا تھا ۔ اس زمانہ کے واقعات کا مفصل ذکر ہم کر آئے ہیں ۔ اس نظم میں ان واقعات کی طرف اشارے پائے جاتے ہیں ۔

آشکارا ہیں مری آنکھوں پہ اسرارِ حیات
کر نہیں سکتے مجھے نومید پیکارِ حیات

کب ڈرا سکتا ہے غم کا عارضی منظر مجھے
ہے بھروسا اپنی ملت کے مقدر پر مجھے

یاس کے عنصر سے ہے آزاد میرا روزگار
فتح کامل کی خبر دیتا ہے جوش کار زار

اسی جنگ بلقان کے مجروحین کی امداد کے لئے چندہ جمع کرنے کی ایک تحریک شروع ہوئی ۔ اقبال نے اسی تحریک کے سلسلہ میں "جواب شکوہ" لکھا ۔ اس نے اس سے پہلے خوگرِ حمد کی زبانی خدائے تعالیٰ سے شکوہ کیا تھا ، اب اس کو بارگاہ رب العزت سے اس کا جواب ملتا ہے ۔ مسلمانوں کی گزشتہ عظمت و شوکت کا راز یہ تھا کہ وہ اللہ کے سودائی تھے ۔ احکام

خدا وندی کی پابندی ، ان کی زندگی کا نصب العین تھا ، لیکن موجودہ زمانے کے مسلمانوں میں ایثار و قربانی کے وہ جذبات باقی نہیں رہے - احکامِ الٰہی کا انہیں مطلق پاس نہیں ہے - وہ ایک ایسی قوم بن گئے ہیں جن کا نہ کوئی روحانی نصب العین ہے اور نہ دنیا میں باعزت زندگی بسر کرنے کے طور طریقوں سے وہ واقف ہیں ، ان کی پستی و زوالِ اخلاق کی انتہا یہ ہے -

جن کو آتا نہیں دنیا میں کوئی فن تم ہو
نہیں جس قوم کو پروائے نشیمن تم ہو

بجلیاں جس میں ہوں آسودہ وہ خرمن تم ہو
بیچ کھاتے ہیں جو اسلاف کے مدفن تم ہو

ہو نکو نام ، جو قبروں کی تجارت کر کے
کیا نہ بیچو گے جو مل جائیں صنم پتھر کے

فرقہ بندی اور ذات پات کی تفریق نے اس قوم کو گھن کی طرح کھا لیا ہے ، اس کے امراء نشّۂ دولت میں شرسار ہیں ، اور اس کے رہنماؤں میں ذہن و دماغ کی پختگی باقی نہیں رہی - اس قوم نے اپنے طور طریقے ترک کر دیئے ہیں - تہذیب و معاشرت میں اس نے نصاریٰ ، ہنود اور یہود کی نقالی شروع کر دی ہے - صداقت ، عدالت ، شجاعت جیسے اوصاف سے اس قوم کا سوادِ اعظم محروم ہو چکا ہے - یہ وہ بنیادی اسباب ہیں ، جن کی وجہ سے مسلم قوم اپنے زوال کو پہنچ چکی ہے ، ایکن اس کے باوجود ہاتفِ غیبی اپنے شاعر کو مایوس نہیں کرتا - وہ کہتا ہے کہ پھر ایک مرتبہ شاہدِ کامرانی اپنے کھلے ہوئے آغوش کے ساتھ اس کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہے -

عقل ہے تیری سپر ، عشق ہے شمشیر تری
مرے درویش خلافت ہے جہانگیر تری

ما سوا اللہ کے لیے آگ ہے تکبیر تری
تو مسلماں ہو تو تقدیر ہے تدبیر تری

لیکن شرط کیا ہے ؟ شرط صرف ایک ہی ہے -

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں
یہ جہاں چیز ہے کیا لوح و قلم تیرے ہیں

" حضور رسالت مآب میں " اس عنوان سے جو پر سوز نظم اقبال نے اس زمانہ میں لکھی اور شاہی مسجد لاہور میں سنائی ، اس میں طرابلس کے خونی واقعہ کا اثر پوری طرح نمایاں ہے ، فرشتے شاعر کو بارگاہ رسالت میں لے جاتے ہیں ، حضور اس سے مخاطب ہو کر فرماتے ہیں -

نکل کے باغِ جہاں سے برنگ بو آیا
ہمارے واسطے کیا تحفہ لے کے تو آیا

اور وہ دست بستہ عرض کرتا ہے -

حضور دہر میں آسودگی نہیں ملتی
تلاش جس کی ہے وہ زندگی نہیں ملتی

ہزاروں لالہ و گل ہیں ریاضِ ہستی میں
وفا کی جس میں ہو بو وہ کلی نہیں ملتی

مگر میں نذر کو اک آبگینہ لایا ہوں
جو چیز اس میں ہے جنت میں بھی نہیں ملتی

اور یہ گراں قدر سوغات ، جو جنت میں بھی نہیں مل سکتی ، کیا ہے ؟

جھلکتی ہے تیری اُمت کی آبرو اس میں
طرابلس کے شہیدوں کا ہے لہو اس میں

اسی زمانے میں ان کی وہ مشہور نظم شائع ہوئی ، جو فاطمہ بنت عبداللہ پر لکھی گئی ہے - یہ ایک عرب لڑکی تھی ، جو طرابلس کی جنگ میں غازیوں کو پانی پلاتی ہوئی شہید ہوئی ، فاطمہ شاعر کی نظر میں ایک دوشیزہ ، عرب لڑکی ہی نہیں ہے ، وہ حورِ صحرائی ہے ، غازیانِ دین کی سقہ —— نہیں ، وہ آبروئے امتِ مرحوم ہے - شاعر فرطِ طرب سے پکار اٹھتا ہے -

یہ کلی بھی اس گلستانِ خزاں منظر میں تھی
ایسی چنگاری بھی یارب اپنی خاکستر میں تھی

وہ مطمئن ہے کہ

اپنے صحرا میں بہت آہو ابھی پوشیدہ ہیں
بجلیاں برسے ہوئے بادل میں بھی خوابیدہ ہیں

چشمِ شاعر کو فاطمہ کی تربت میں آثارِ حیات نظر آتے ہیں ، اور وہ کہتا ہے

رقص تیری خاک کا کتنا نشاط انگیز ہے
ذرہ ذرہ زندگی کے سوز سے لبریز ہے

ہے کوئی ہنگامہ تیری تربتِ خاموش میں
پل رہی ہے ایک قومِ تازہ اس آغوش میں

بے خبر ہوں گرچہ ان کی وسعتِ مقصد سے میں
آفرینش دیکھتا ہوں ان کی اس مرقد سے میں

ان نظموں کے متعلق مولانا ظفر علی خان صاحب تحریر فرماتے ہیں :

"جنگِ طرابلس کے زمانہ میں اقبال کا کلام مسلمانانِ عالم پر عربوں کی رجز خوانی کا اثر رکھتا تھا ۔ ہندوستان افلاس کی وجہ سے توپ و تفنگ اور سامانِ حرب نہیں رکھتا ، لیکن اقبال کا کلام رکھتا ہے[۱۱]"

الفرض انگلستان سے واپسی کے بعد سے جنگ عظیم کے آغاز تک اقبال کے یہ سیاسی رجحانات رہے ۔ عملی سیاسیات سے ان کا ایک گونہ تعلق اس دور میں موجود رہا ، لیکن ہندوستان اور بالخصوص عالمِ اسلام کے سیاسی واقعات کا عکس ان کی شاعری کے آئینہ میں بہت ہی واضح طور پر نظر آتا ہے ۔ سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد وہ وطنیت کے سیاسی مشرب کو قطعی طور پر خیرباد کہہ دیتے ہیں اور ملیت ان کا سیاسی مسلک بن جاتی ہے ۔ جوں جوں زمانہ گزرتا جاتا ہے ، اس مسلک و رجحان میں شدت و استواری پیدا ہوتی جاتی ہے ۔ مسلمانوں کی تباہی و بربادی اور عالمِ اسلام کی زبوں حالی ،

---

۱۱ ۔ نیرنگ خیال ، اقبال نمبر ص ۷۹، ۸۰ ۔

ان کو خون کے آنسو رلاتی ہے اور یہ آنسو اس امر کی غمازی کرتے ہیں کہ شاعر نے جس مسلک کو عقل و فکر کے معیار پر پرکھ کر اختیار کیا تھا ، اب وہ مسلک دماغ سے آگے بڑھ کر دل پر قابض ہوتا اور ان کی روح کی گہرائیوں میں اُترتا جا رہا ہے ! !

——:o:——

حوالہ جات باب ۲

۱- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مارہروی مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ مارچ ۱۹۴۱ع ص ۵۹ -

۲- " اقبال کامل " از مولانا عبدالسلام ندوی مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۴۸ع ص ۳۲۵ و ص ۳۲۶ -

۳- رسالہ اُردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۹ -

۴- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۱۶۱ -

۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور ، اشاعت دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۸ و ص ۹ -

۶- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۲۶ -

۷- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور بار اول ص ۶۴ -

۸- ایضاً ص ۶۴ -

۹- " روزگار فقیر " از فقیر سید وحید الدین جلد دوم مطبوعہ کراچی بار دوم ص ۳۱۴ -

۱۰- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ محمد عطاء اللہ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ، ۱۹۵۱ع ص ۱۵۲ و ص ۱۵۳ -

۱۱- " نیرنگ خیال " اقبال نمبر ص ۷۹ و ص ۸۰ -

باب ۳

عزلت نشینی

گذشتہ باب میں ہم نے ۱۹۰۵ع تا ۱۹۱۴ع ہندوستان کے سیاسی حالات اور ان حالات کے پس منظر میں اقبال کے سیاسی رجحانات کا مطالعہ کیا تھا - اس باب میں ہم ۱۹۱۴ع سے ۲۵ع تک جو سیاسی حالات ملک کے اندر یا ملک سے باہر رونما ہوئے ، ان کا جائزہ لیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ علامہ اقبال پر ان حالات کا کیا رد عمل ہوا -

پہلی عالمی جنگ کے دوران / جولائی سنہ ۱۹۱۴ع میں برطانیہ و روس کے حلیفوں (اتحادیوں) اور جرمنی اور اس کے حلیفوں (محوری دول) کے مابین جنگ چھڑ گئی ، یہ پہلی عالمی جنگ تھی - اس جنگ عظیم کے شروع ہوتے ہی ، کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے حکومت کو اپنے اپنے تعاون کی پیش کش کی - کانگریس نے فرزندانِ وطن کی جنگی خدمات کے صلہ کے طور پر حکومت سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ اپنے لوکل سلف گورنمنٹ کے وعدہ کو پورا کرے لیکن مسز اینی بیسنٹ کو اس سے اختلاف تھا - مقامی حکومت خود اختیاری (local self government) کو وہ بطور انعام یا بھیک مانگ کر حاصل کرنا نہیں چاہتی تھیں ، بلکہ اس کو وہ ہندوستانیوں کا ایک جائز حق سمجھتی تھیں ، چنانچہ انھوں نے ہوم رول لیگ قائم کی اور ملک کا انتہا پسند طبقہ ان کے ساتھ ہو گیا -

مولانا محمد علی نے بھی ابتداً مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ حکومتِ برطانیہ سے تعاون کریں ، یہ وہ زمانہ تھا کہ ابھی اتحادیوں یعنی برطانیہ اور اس کے حلیفوں نے ترکوں سے جنگ نہیں چھیڑی تھی ، لیکن

جلد ہی ترکی کو اس جنگ عظیم میں گھسیٹ لیا گیا جس کی وجہ سے مسلمانوں میں قدرتاً اضطراب پیدا ہو گیا ۔ پھر مسلمانوں پر حکومت نے ظلم یہ کیا کہ مئی سنہ ۱۹۱۵ع میں مولانا محمد علی و مولانا شوکت علی (علی برادران) کو ترکوں سے ہمدردی رکھنے کے الزام میں نظر بند کر دیا ۔ ان کے بعد سنہ ۱۹۱۶ع میں مولانا ابوالکلام آزاد ، مولانا حسرت موہانی اور مولانا ظفر علی خاں کی نظر بندی عمل میں آئی ۔ پھر دسمبر سنہ ۱۹۱۶ع میں شیخ الہند مولانا محمود الحسن اور ان کے ساتھی مولانا حسین احمد مدنی و مولانا عزیز گل کو ریشمی رومال کی سازش کے الزام میں گرفتار کرکے مالٹا بھیج دیا گیا ۔ اس سازش کی تحقیقات کے لیے حکومت نے جو کمیٹی قائم کی تھی ، اس نے یہ رپورٹ دی تھی کہ ان علماء نے حکومت برطانیہ کا تختہ الٹنے کی غرض سے ایک سازشی منصوبہ تیار کیا تھا ۔ منصوبہ یہ تھا کہ افغانستان شمال مغربی سرحد کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کرے اور اندرونِ ملک مسلمان بھی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں ، اس سلسلہ میں ان لوگوں نے ان ممالک کے سربراہوں کو خفیہ طریقہ پر ریشمی رومالوں پر خطوط لکھے تھے اور ہندوستان کے مسلمانوں کو ورغلایا تھا ۔ حکومت نے اس منصوبہ کو " ریشمی خطوط کی سازش " کا نام دیا تھا ۔ ان گرفتاریوں کے باعث مسلمانوں میں حکومتِ برطانیہ کے خلاف ایک مرتبہ پھر نفرت کے جذبات پیدا ہو گئے ۔

سنہ ۱۹۱۵ع میں کانگریس و مسلم لیگ میں مفاہمت کی کوشش شروع ہوئی اور بالآخر سنہ ۱۹۱۶ع میں ان دونوں جماعتوں کے مابین وہ معاہدہ طے پا گیا ، جو میثاق لکھنؤ کے نام سے موسوم ہے ۔ اس میثاق کو ہندوستانی سیاست میں ایک خاص اہمیت حاصل ہے ۔ اب تک ملک کے دو بڑے طبقے ـــــ ہندو مسلمان ـــــ ایک دوسرے سے علیحدہ تھے ، ان کے اختلاف کی تہہ میں سیاسی اقتدار کی کشمکش کار فرما تھی ، اس میثاق نے اس کشمکش کو اتحاد سے بدل دیا ۔ اس کے ذریعہ مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا اور صوبائی مجالس مقننہ میں مسلم نشستوں کا اس طرح تعین کیا گیا تھا کہ جہاں مسلمان اکثریت میں تھے ، وہاں ان کی آبادی کے تناسب سے کچھ نشستیں گھٹا دی گئی تھیں اور جہاں وہ

اقلیت میں تھے ، وہاں ان کو آبادی کے تناسب سے کچھ زیادہ نشستیں دی گئی تھیں ۔ اس طریقہ کو اصطلاح میں پاسنگ ، (weightage) کہا جاتا ہے ۔ یہ بھی طے پایا کہ مرکزی مقننہ میں ۵/۴ منتخب شدہ اراکین ہوں اور مسلمان اراکین کا تناسب منتخب شدہ اراکین کے ایک تہائی کے مساوی ہوگا ۔ اور اس امر پر بھی راضی نامہ ہو چکا تھا کہ اگر کسی جماعت کے تین چوتھائی اراکین ، کسی مسودہ قانون یا تحریک کی مخالفت کریں تو ایسا مسودہ قانون یا تحریک ایوان میں پیش ہی نہیں کی جا سکے گی ۔

دسمبر سنہ ۱۹۱۶ع میں کانگریس و لیگ کے علیحدہ علیحدہ اجلاس لکھنؤ میں منعقد ہوئے ۔ امبیکا چرن موزمدار نے کانگریس کی صدارت کی اور مسٹر محمد علی جناح لیگ کے صدر تھے ، ان اجلاسوں میں لیگ و کانگریس نے میثاقِ لکھنؤ کی باضابطہ توثیق کر دی ۔

اس زمانہ میں سیاسی میدان نہ تو کانگریس کے قبضہ میں تھا اور نہ لیگ کے بلکہ عوام میں مسز اینی بیسنٹ کی ہوم لیگ کا طوطی بول رہا تھا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہوم رول لیگ نے جو تحریک شروع کی تھی ، اس میں ہندو مسلم اتحاد سے بڑی مدد ملی ۔ ہوم رول لیگ کی تحریک ، اور سر برآوردہ ہندو مسلم زعماء کی نظر بندی کے باعث کانگریس اور لیگ کے حلقوں میں خاصی بے چینی پیدا ہو گئی ۔ اس زمانہ میں ان دونوں جماعتوں کے سالانہ اجلاس ایک ہی مقام پر تقریباً ایک ہی وقت میں ہوا کرتے تھے ۔ ان دونوں جماعتوں نے حکومت کی سخت گیر پالیسی کے خلاف احتجاج کیا اور ہندوستان کو مزید دستوری اصلاحات عطا کیے جانے کے متعلق برطانیہ کے وعدے یاد دلائے اور کانگریس لیگ اسکیم یعنی میثاقِ لکھنؤ کو زیادہ سے زیادہ مقبول بنانے کی کوشش کی ۔

علامہ اقبال کے مشاغل | پہلی جنگِ عظیم کے دوران ملک کا یہ سیاسی نقشہ تھا ، اس زمانہ میں ڈاکٹر اقبال نے سیاسی معاملات میں کوئی عملی دلچسپی نہیں لی ۔ ایسے وقت میں جبکہ امنِ عالم کے خرمن میں آگ لگ چکی تھی اور اندرونِ ملک سیاسی اتحاد اور سیاسی آزادی کی جدوجہد جاری تھی ، ڈاکٹر صاحب دنیا کے ان سارے ہنگاموں سے الگ تھلگ پوری

شاعرانہ آن بان اور فلسفیانہ شان کے ساتھ ، لاہور کے ایک گوشہ میں بیٹھے ، " اسرار خودی " اور " رموز بے خودی " لکھ رہے تھے ، اسرار خودی سنہ ۱۹۱۳ع میں لکھنی شروع کی اور سنہ ۱۹۱۵ع میں اس کو ختم کیا[1] " رموز بے خودی " کے لکھنے کا آغاز سنہ ۱۹۱۵ع سے اور اس کا اختتام سنہ ۱۹۱۸ع ہوتا ہے - یہ ایک دلچسپ واقعہ ہے کہ انسان، انسانی زندگی اور اس کی حقیقت اور منزلِ مقصود کے متعلق علامہ اقبال نے اپنے فلسفیانہ افکار کو شعر کا آب و رنگ اس وقت بخشا جب کہ دنیائے انسانیت جوالا مکھی کے دھانہ پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے پھٹ پڑنے سے پرانے اقدار اور قدیم نظریے جل کر بھسم ہو رہے تھے ، اور اس کی خاکستر سے آگے چل کر ایک نیا آدم اور اس کے رہنے کے لیے ایک نئی دنیا بسائی جانے والی تھی - اس زمانہ میں ان کی ذہنی کیفیت کا اندازہ اس خط سے ہوتا ہے ، جو انھوں نے سنہ ۱۹۱۴ع میں مولانا شوکت علی کے نام لکھا تھا - مولانا نے ڈاکٹر صاحب کو اولڈ بوائز ایسوسی ایشن ایم - اے - او کالج علی گڑھ کے سالانہ اجلاس میں شرکت کی دعوت دی تھی ، ڈاکٹر صاحب شرکت کی معذرت چاہتے ہوئے اپنی قلبی واردات کا اس طرح اظہار کرتے ہیں :

" بھائی شوکت ! اقبال عزلت نشین ہے اور اس طوفان بے تمیزی کے زمانہ میں گھر کی چار دیواری کو کشتی نوح سمجھتا ہے - دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ تھوڑا بہت تعلق ضرور ہے مگر محض اس وجہ سے کہ روٹی کمانے کی مجبوری ہے - تم مجھے علی گڑھ بلاتے ہو میں ایک عرصہ سے خدا گڑھ میں رہتا ہوں اور اس مقام کی سیر کئی عمروں میں ختم نہیں ہو سکتی - علی گڑھ والوں سے میرا سلام کہیے - مجھے ان سے غائبانہ محبت ہے اور اس قدر کہ ملاقات ظاہری سے اس میں کچھ اضافہ ہونے کا امکان بہت

۱- مکاتیبِ اقبال حصہ اول مرتبہ عطاء اللہ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ، ص ۲۳ -

کم ہے[۲] "

مندرجہ بالا خط سے یہ واضح ہوتا ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران اِدھر ہندوستان کے اندر جو سیاسی مظاہرے (agitations) ہو رہے تھے ، حکومت نے جو سخت گیر پالیسی اختیار کر رکھی تھی اور اُدھر ہندوستان کے باہر یورپ میں آگ و خون کا جو کھیل کھیلا جا رہا تھا ، اس کو اقبال ایک " طوفانِ بے تمیزی " سمجھتے ہیں ، اور اس طوفانِ بلاخیز سے اپنے آپ کو بچائے رکھنے کے لیے اپنے گھر کو " کشتیٔ نوح " قرار دیتے ہیں ۔ وہ غیر سیاسی جلسوں اور جلوسوں تک سے گریز کرتے ہیں اور عزلت کی زندگی گزارتے ہیں ۔ اس زمانۂ عزلت نشینی کا سب سے بڑا کارنامہ " اسرار خودی اور رموز بے خودی " ہے لیکن جب ہم ان مثنویوں کے ان دور رس اثرات کا اندازہ لگاتے ہیں ، جو بالعموم ہندوستان اور بالخصوص مسلمانانِ ہند اور دنیائے اسلام پر مترتب ہوئے تو اقبال کا صرف یہی ایک کارنامہ اس قابل ہے کہ اس کا نام مسلم ہندوستان کی تاریخِ بیداری میں سنہری حروف سے لکھا جائے ۔ ان مثنویوں کے عدم سے وجود میں آنے کے وقت ملک کی جو سیاسی حالت تھی ، اس کو ایک مرتبہ پھر ذہن میں مستحضر کر لیجئے ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ میں ہوم رول لیگ سیاسی مطلع پر درخشندہ ستارہ بن کر چمک رہی تھی اور اس ہوم رول لیگ کی تحریک کا مقصد تھا کیا ؟ سلف گورنمنٹ ! یہی کہ حکومتِ خود اختیاری ہندوستانیوں کا فطری حق ہے ! ہوم رول لیگ سے پہلے ہندوستان میں جو سیاسی تحریکات جاری تھیں ، خواہ وہ کانگریس کی ہوں یا مسلم لیگ و ہندو مہاسبھا کی ، ان کا انداز " معروضات " سے کچھ زیادہ نہ تھا ۔ وہ عوام کے حق اور ان کی طاقت پر زیادہ بھروسہ نہیں کرتی تھیں بلکہ حکومتِ برطانیہ کی جمہوری روایات سے اُمیدیں وابستہ کئے ہوئے تھیں ۔ ہندوستان کی تاریخِ بیداری میں ہوم رول لیگ کی تحریک ہی کے سر یہ سہرا ہے کہ اس کا انداز " معروضہ " کا نہیں " مطالبہ " کا

۲- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ، ص ۲۵۵ ۔

ہے ۔ اس کو عوام پر بھروسہ ہے اور حکومتِ وقت کی طفل تسلیوں سے اعراض ہے ۔ وہ عوام کے حق پر اصرار کرتی ہے ، اور حکومت کی نگاہِ لطف و کرم کی آمیدوار نہیں ہے ۔ ہوم رول لیگ کی تحریک ، دراصل ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں عوام کی " خود اعتمادی " و " خودی " کی پہلی صدائے بازگشت ہے ! کیا یہ محض حسنِ اتفاق ہے کہ ہندوستان کے عوام کی " خودی " نے جب پہلی مرتبہ ہوم رول لیگ تحریک کی صورت میں اپنا جلوہ دکھایا ، تو اسی زمانہ میں اقبال جیسا دانائے راز "خودی" کے " اسرار " کو فاش کرتا اور " بے خودی " کے " رموز " کی تعلیم دیتا ہے ! !

بہرحال پہلی عالمی جنگ کے دوران ڈاکٹر صاحب گوشہ نشین رہے ، البتہ " اسرار خودی " و " رموز بے خودی " کے ذریعہ حقائقِ اسلامی کی اشاعت ، ہندوستانیوں کی بیداری اور مسلمانانِ ہند کے اندر اسلامی روح پیدا کرنے میں انھوں نے بہت بڑا حصہ لیا ۔

جنگِ عظیم کے بعد | سنہ ۱۹۱۸ع میں پہلی جنگِ عظیم کا خاتمہ ہوا ۔ جون سنہ ۱۹۱۸ع میں ہندوستان کو مزید اصلاحات دستوری دئے جانے کے متعلق مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ شائع ہوئی ۔ اس رپورٹ کے متعلق کانگریسی حلقوں میں اختلاف پیدا ہو گیا ایک گروہ اس کو قبول کرنا چاہتا تھا ، چنانچہ اس نے ایک باضابطہ جماعت لبرل پارٹی کے نام سے بنا لی، دوسرا گروہ اس رپورٹ کا مخالف تھا ، وہ مکمل ذمہ دارانہ حکومت سے کم کسی چیز پر آمادہ نہ تھا ۔

سنہ ۱۹۱۹ع کے آغاز ہی میں حکومت نے رولٹ بل (rowaltt bill) پاس کر دیا ۔ اس قانون کی رو سے عدالت اور پولیس کو بہت زیادہ اختیارات دئے گئے تھے ۔ اب حکومت اس قانون کے تحت اندھا دھند گرفتاریاں عمل میں لانے ، من مانے مقدمات چلانے ، اور سزائیں دینے کی مجاز تھی ۔ اس قانون کی مخالفت میں سارا ملک آٹھ کھڑا ہوا ۔ گاندھی جی نے اس قانون کے خلاف ستیا گرہ کا اعلان کیا ۔ سارے ملک میں جوش و خروش کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ اسی زمانہ میں پنجاب میں حکومت نے

سخت مظالم کئے ، جلیانوالہ باغ کا حادثہ پیش آیا ، جس میں نہتے عوام پر نہایت بیدردی کے ساتھ جنرل ڈائر نے گولیاں چلوائیں ۔ پورے پنجاب میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا ۔ عوام اور طلباء کے ساتھ نہایت ظالمانہ سلوک کیا گیا ۔

اسی دوران آئینی اصلاحات کی چوتھی قسط قانون حکومت ہند بابت سنہ ۱۹۱۹ع کی صورت میں عطا کی گئی ۔ عام طور پر ان اصلاحات کو بہت مایوس کن خیال کیا گیا ، ان اصلاحات کی بنیاد مانٹیگو چمسفورڈ رپورٹ پر رکھی گئی تھی ، اس لیے ان کو مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات بھی کہا جاتا ہے ۔

پنجاب کے حالات کی تحقیقات کرنے کے لیے حکومت نے ایک کمیٹی لارڈ ہنٹر کی صدارت میں بٹھائی تھی اور کانگریس نے بھی اپنی طرف سے تحقیقاتی کمیٹی مقرر کی تھی ، جب ان دونوں کمیٹیوں کی رپورٹیں شائع ہوئیں تو عوام کو ان مظالم کا علم ہوا ، جو پنجاب میں مارشل لاء کے زمانہ میں ڈھائے گئے تھے ۔ اس سے تمام ملک میں غم و غصہ کی ایک لہر دوڑ گئی ۔ رولٹ ایکٹ اور مظالمِ پنجاب کے باعث ملک میں ایک عام اشتعال پیدا ہو گیا ، جس کا نتیجہ ترک موالات (non-cooperation) کی صورت میں نکلا ، اور سنہ ۱۹۲۰ع میں تقریباً سارا ملک اس تحریک میں شریک ہو گیا ، اب انگریزی مال کا بائیکاٹ ہو رہا تھا ، لوگوں نے سرکاری ملازمتیں ترک کر دی تھیں ، وکلاء نے عدالتوں میں جانا چھوڑ دیا تھا ، سرکاری خطابات واپس کیے جا رہے تھے اور جیلیں بھری جا رہی تھیں ، مولانا محمد علی اب رہا ہو چکے تھے ، انھوں نے گاندھی جی کے ساتھ سارے ملک کا دورہ کیا اور ترک موالات کی تحریک کو ملک کے گوشہ گوشہ میں پہنچا دیا ۔

مسلمان اس دور کی سیاست میں دیگر ہم وطن اقوام سے ایک قدم آگے ہی تھے ، وہ بھی پنجاب پر ہونے والے مظالم سے اتنے ہی متاثر تھے جتنے برصغیر کے غیر مسلم باشندے ، رولٹ ایکٹ نے ان میں بھی غم و غصہ کی لہر دوڑا دی تھی ، قانونِ حکومتِ ہند ۱۹۱۹ع کو وہ بھی ناکافی تصور کرتے تھے ۔ لیکن ان سب سے بڑھ کر جس چیز نے ان کو حکومت

کا مقابلہ کرنے پر آمادہ کیا تھا ، وہ خلافت کا مسئلہ تھا ۔ ذیل میں ہم قدرے تفصیل کے ساتھ اس تحریک کا ذکر کریں گے ۔

ترکیہ اس زمانہ میں خلافت کا مرکز تھا ، اور مسلمان اسی وجہ سے اس کو نہ صرف تمام عالم اسلامی کا ایک نقطۂ اتحاد تصور کرتے تھے ، بلکہ اپنی شوکت و اقتدار کا ایک نشان ، اور اپنی اجتماعی زندگی کا ایک محور خیال کرتے تھے ۔ وہ ان کی قومی زندگی کے تاریک ترین لمحات میں روشنی کا ایک مینار تھا ۔ پہلی عالمی جنگ میں ترکیہ نے جرمنی کے ساتھ مل کر اتحادیوں سے نبرد آزمائی کی ۔ اس زمانہ میں مسلمانانِ ہند میں کافی اضطراب پیدا ہو گیا تھا اور اسی اضطراب کے پیشِ نظر آغاز ہی میں لائڈ جارج وزیر اعظم انگلستان نے مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا تھا کہ :

"ہم اس لیے نہیں لڑ رہے ہیں کہ ترکی کو اس کے دارالحکومت سے محروم کر دیں یا اسے ایشائے کوچک اور تھریس کی زرخیز زمینوں سے محروم کر دیں ، ہم ترکی سلطنت کے قیام و بقا کو اس کے وطن میں اور اس کے دارالسلطنت میں چیلنج نہیں کرتے [۳]"

لیکن یہ وعدے پورے نہیں کیے گئے ۔ اتحادیوں نے عربوں میں امتیازِ رنگ و نسل کا فتنہ پھیلا کر ملتِ اسلامیہ کو پارہ پارہ کر دیا ۔ عربوں نے ترکوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ۔ اس بغاوت میں شریف حسین کا خاندان پیش پیش تھا ۔ گو خلافت ترکیہ کے زمانہ میں بھی یہی خاندان حجاز میں حکومت کرتا تھا ، مگر اس وقت یہ ترکوں کے ماتحت تھا ۔ اب اس خاندان کا سربراہ شریف حسین انگریزوں کے جال میں پھنس گیا اور ان کی شہ پر سنہ ۱۹۱۶ء میں حجاز کا خود مختار اور آزاد بادشاہ بن بیٹھا لیکن دراصل یہ انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پتلی تھا ۔ انگریزوں نے یہ لالچ دی تھی کہ اس کو پورے جزیرۃ العرب کا مطلق

۳۔ ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ : کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ص ۳۱۹ ۔

العنان حکمران بنا دیا جائے گا۔ چنانچہ انگریزوں نے اس کے ایک بیٹے امیر فیصل کو عراق کا اور دوسرے بیٹے امیر عبداللہ کو شرق اُردن کا بادشاہ بنا دیا۔ حجاز سے لگا ہوا، ایک طرف نجد کا علاقہ تھا اور دوسری طرف یمن کا، لیکن ان دونوں علاقوں پر شریف حسین کو اقتدار حاصل نہ تھا۔ نجد میں ابن سعود کی حکومت تھی اور یمن میں امام یحییٰ کی۔ مصر ان سب سے الگ تھا۔ اس طرح ترکوں سے بغاوت کرنے کے بعد عرب بھی مختلف علاقوں میں بٹ گئے تھے اور یہ سارے علاقے یورپی استعماری طاقتوں خصوصاً انگریزی سامراج کے زیر اثر آ گئے تھے۔ پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کو شکست ہوئی اور ۶ نومبر سنہ ۱۹۱۸ع کو ترکوں نے التوائے جنگ کے معاہدہ پر دستخط کیے۔ اس کے بعد ہی انگریزوں نے موصل پر پیش قدمی شروع کر دی اور قسطنطنیہ پر قبضہ کر لیا، استنبول میں انھوں نے قوم پرست ترکوں پر مظالم ڈھائے۔ اس کا ردِ عمل یہ ہوا کہ نوجوان قوم پرست ترک، مصطفیٰ کمال کی قیادت میں اپنی مادرِ وطن کی خاطر اٹھ کھڑے ہوئے اور انھوں نے اناطولیہ میں اپنی عارضی حکومت قائم کر لی، کیونکہ خلیفہ کی حیثیت اب اتحادیوں کے ایک قیدی کی سی تھی۔ اسی زمانہ میں اتحادیوں کے اشارے سے خلیفہ نے قوم پرست تحریک کے قائد اور اناطولیہ کی حکومت کے صدر مصطفیٰ کمال کے لیے سزائے موت کا حکم نافذ کر دیا، مگر مصطفیٰ کمال نے انگورہ پہنچ کر سنہ ۱۹۲۰ع میں ایک مستقل حکومت قائم کر دی۔ اگست سنہ ۱۹۲۰ع میں سیورے کانفرنس ہوئی، جس میں اتحادیوں نے خلیفہ کے ساتھ شرائط صلح طے کیں۔ یہ شرائط صلح نہیں تھیں بلکہ ترکیہ کا قتل نامہ تھا، جس پر خلیفہ نے اپنے دستخط ثبت کر دئے تھے۔ اس صلح نامہ میں تھریس کا ایک بڑا حصہ اور سمرنا یونانیوں کو دے دیا گیا تھا، بندرگاہ استنبول کو آرمنیا کے علاقہ میں شامل کرکے اتحادیوں کے حوالے کر دیا گیا تھا اور ترکی کو کل پندرہ ہزار فوج رکھنے کا اختیار عطا ہوا تھا! ترکی کے مختلف علاقوں مثلاً مشرقی اناطولیہ ارضِ روم، دان، بتاس، ترایزون، آرزنجان وغیرہ کو علیحدہ کرکے ایک نئی ریاست آرمینہ کے نام سے قائم کرنے کا اعلان کیا گیا تھا، اور عرب علاقوں سے ترکیہ کو دستبردار کرا دیا

گیا تھا !! یہ صلح نامہ کیا تھا ، ترکیہ کے حصے بخرے کرنے کا ایک پروگرام تھا ۔ نوجوان ترکی کے قائد اور آزادی کے لیے جان پر کھیل جانے والے ترکوں کے ہیرو نے اس بندر بانٹ کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا ، اب پھر جانباز ترکوں نے مصطفیٰ کمال کی رہنمائی میں آزادی کی جنگ کا آغاز کر دیا اور یونانیوں کو پے در پے شکستیں دیں ۔

ان واقعات سے مسلمانانِ ہند کا متاثر ہونا لازمی تھا ، چنانچہ ستمبر ۱۹۱۹ء میں خلافت کمیٹی کا قیام عمل میں آیا ، جس کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی حکومت پر دباؤ ڈال کر اسے خلافت ترکیہ کے ساتھ ظلم و زیادتی کرنے سے روکا جائے ۔ خلافت کمیٹی نے اس غرض کے لیے سب سے پہلے تو سارے ہندوستان میں احتجاجی جلسے کروائے پھر مارچ سنہ ۱۹۲۰ء میں ایک وفد مولانا محمد علی جوہر کی قیادت میں یورپ روانہ کیا تاکہ ادارۂ خلافت کی اہمیت اور مسلمانوں کی اس سے وابستگی اور مملکت ترکیہ کی بقاء و حفاظت کے مسئلہ کو یورپی اقوام اور خصوصاً حکومتِ برطانیہ کے ارباب حل و عقد کے سامنے واضح کیا جائے ، لیکن سات ماہ کے دورے کے بعد اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ء میں یہ وفد ناکام واپس لوٹا اور سیورے کانفرنس میں وہ شرائط صلح پائیں جن کا ذکر آ چکا ہے ۔

مسلمانانِ ہند میں ان شرائط کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ۔ مسلمان اس صریح ظلم و ناانصافی سے رنجیدہ تو تھے ہی ، ہندوؤں نے بھی برطانیہ کی اس پالیسی کو سخت نفرت کی نظر سے دیکھا اور مسلمانوں کے اس دکھ میں شریک ہو گئے اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ تحریکِ ترکِ موالات اب بہت تیزی کے ساتھ آگے بڑھتی چلی گئی ۔ جولائی سنہ ۱۹۲۱ء میں خلافت کانفرنس نے ایک قرارداد منظور کی کہ مسلمان فوج میں نہ تو بھرتی ہوں اور نہ بھرتی میں مدد دیں ۔ اس جرم میں ۱۴ دسمبر کو علی برادران معہ دیگر چار رفقا گرفتار کر لیے گئے ۔ عدالت نے علی برادران کو دو سال قید بامشقت کی سزا دے دی ، گویا آگ پر تیل چھڑک دیا ۔ اب تحریکِ ترکِ موالات اپنے شباب پر تھی ۔ اس پر طرفہ یہ کہ گاندھی جی نے سول نافرمانی کی تحریک جاری کر دی ۔ ہندوستان کی آزادی ، مظالمِ پنجاب کی تلافی ، اور سلطنت ترکی کے بارے میں مسلمانوں کے ساتھ

حکومتِ برطانیہ نے جو وعدے کیے تھے ان کا ایفاء گاندھی جی کی تحریک سول نافرمانی کے یہ تین مقاصد قرار پائے ۔ لیکن یہ تحریک ابھی زیادہ پھیلنے نہ پائی تھی کہ ۵ فروری سنہ ۱۹۲۲ع کو چورا چوری کا واقعہ پیش آ گیا ، جس میں عوام نے تشدد آمیز افعال کا ارتکاب کیا ۔ گاندھی جی عدم تشدد کے بڑے سخت پابند تھے ، انھوں نے اس تشدد کو پسند نہ کیا اور فوراً تحریک سول نافرمانی کو ختم کر دیا ۔ اس تحریک کے ختم ہو جانے کے بعد ، ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۲۲ع کو گاندھی جی گرفتار کر لیے گئے اور عدالت نے انہیں چھ سال کی سزا دے دی[۴] ۔

اب ملک کی فضا بدلنے لگی ۔ حکومت سے عدم تعاون کی بجائے تعاون کا رجحان پیدا ہو گیا اور پنڈت موتی لال نہرو کی قیادت میں سوراج پارٹی کا قیام عمل میں آیا ، جس نے داخلہ کونسل کی تحریک شروع کر دی ۔ اسی زمانہ میں شردہانند جی نے شدھی (یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانا) اور لالہ لاجپت رائے نے سنگھٹن (ہندوؤں کے مختلف فرقوں میں اتحاد پیدا کرنا) تحریک کا آغاز کیا ، جس کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں میں پھر اختلاف پیدا ہونے لگے ، جنھوں نے آگے چل کر فسادات کی شکل اختیار کر لی ۔

اِدھر ترکیہ میں ایک انقلاب رونما ہوا ، مصطفیٰ کمال کو متواتر کامیابیاں ہوئیں ۔ بالآخر سنہ ۱۹۲۲ع میں لوزان کانفرنس کا انعقاد ہوا ، جس میں ترکوں نے اپنے مطالبات اور ملک کی آزادی کو منوا لیا ۔ مگر سنہ ۱۹۲۴ع میں خود ترکوں نے ادارۂ خلافت کو توڑ دینے کا اعلان کیا ! ! اس اعلان سے مسلمانوں کی امیدوں پر اوس پڑ گئی !

سنہ ۱۹۲۴ع ہی میں شریف حسین والئی حجاز کو اپنے کیے کی سزا ملی ، بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی عالمی جنگ کے دوران عربوں کو اس نے ترکوں کے خلاف بھڑکایا تھا ۔ اس کی تمنا تو یہ تھی کہ وہ خلافت ترکیہ سے الگ ہو کر پورے جزیرۃ العرب کا مطلق العنان حکمران بن جائے ۔ انگریزوں نے اس کو یہی سبز باغ دکھایا تھا مگر اس کی یہ تمنا

۴۔ ہسٹری آف دی کانگریس (کانگریس کی تواریخ ، اردو) از ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ص ۳۸۰ و ص ۳۸۶ ۔

پوری نہیں ہوئی ۔ نجد کے حکمران ابن سعود اور حجاز کے والی شریف حسین میں خاندانی دشمنی چلی آ رہی تھی ، اس لیے ان دونوں علاقوں میں سرحدی جھڑپیں ہونے لگیں ۔ پھر سنہ ۱۹۲۴ع میں دونوں میں جنگ چھڑ گئی ۔ شریف حسین کو شکست ہوئی اور اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ع میں سلطان نجد ، ابن سعود کا مکہ پر قبضہ ہو گیا اور پورا حجاز ان کے تسلط میں چلا گیا ۔ شریف حسین کو بھاگ کر قبرص میں پناہ لینی پڑی ۔ یوں ملک العرب بننے کی جس تمنا میں ، اس نے ترکوں سے بغاوت اور ملت سے غداری کی تھی ، وہ بالآخر خود اس کی تباہی ، ذلت و خواری کا باعث بنی ! !

یہ مختصر روئداد ، اختتام جنگ عظیم اول تا اختتام سنہ ۱۹۲۵ع کی ہے ، اس روئداد کا خلاصہ یہ ہے کہ جنگ عظیم کے بعد سے سنہ ۱۹۲۳ع تک ہندوستان میں برطانوی حکومت کے خلاف سخت ہیجان برپا رہا ۔ عدم تعاون ، خلافت اور سول نافرمانی اس دور کی یادگار تحریکیں ہیں ۔ ملک میں سیاسی بیداری پوری طرح پھیل چکی تھی ، اور ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ایک متحدہ قومیت عالم وجود میں آ چکی ہے لیکن سنہ ۱۹۲۳ع میں متحدہ قومیت کا خواب ایک خواب پریشان ثابت ہوا اور وطنی قومیت کی یہ کشتی ہندو مسلم فسادات کی پر شور موجوں سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ! !

جنگ عظیم کے بعد کے اس دور میں عالم اسلام مصائب و آلام کا نشانہ بنا ہوا تھا ۔ خلافت ترکیہ برطانوی استعمار کے چنگل میں پھنس چکی تھی ، اور مسلمانان عالم کے مستقبل پر بھیانک تاریکی چھا رہی تھی ۔ اس اندھیرے میں اچانک روشنی کی ایک کرن افق پر نمودار ہوئی ۔ مصطفی کمال اور اس کے ساتھیوں کی جانبازیوں اور کامیابیوں نے مسلمانوں کے ٹوٹے ہوئے دلوں کی ڈھارس بندھائی لیکن الغائے خلافت کے اعلان کے ساتھ یہ روشنی غائب ہو گئی اور ساتھ ہی مسلمانوں کے دل ڈوب گئے ! ! پھر نجد و حجاز کی آویزش اور 'حرمین شریفین' کے مستقبل نے ان کی روح پر لرزہ طاری کر دیا تھا ! !

ہندوستان اور عالمِ اسلام سے قطع نظر تمام دنیا میں جنگ عظیم کے اثرات تجارتی سرد بازاری، بے روزگاری اور افلاس کی صورت میں نمودار ہو چکے تھے - اب دنیا میں مزدور تحریک کا زور تھا - زار کی حکومت ختم ہو چکی تھی، لینن فرماں روائی کر رہا تھا ـــــ اقبال اس ہنگامہ پرور دور میں کیا کر رہے تھے؟

اقبال کے رجحانات | علامہ اقبال نے جنگ عظیم کے بعد بھی سنہ ۱۹۲۶ء تک ملکی سیاسیات میں کوئی قابل ذکر عملی حصہ نہیں لیا بلکہ اس دوران وہ اپنی شہرۂ آفاق کتاب "پیام مشرق" کی تکمیل میں لگے رہے، لیکن اس زمانہ میں بھی وہ لاہور میں بیٹھے، کبھی کسی جانثار قوم پر تحسین و آفریں کے ڈونگرے برساتے اور کبھی اس کے چٹکی بھی لے لیتے تھے - چنانچہ محمد علی جوہر کی بیتول جیل میں نظربندی پر انھوں نے یہ اشعار لکھے-

ہے اسیری اعتبار افزا، جو ہو فطرت بلند
قطرۂ نیساں ہے زندانِ صدف سے ارجمند

مشک ازفر چیز کیا ہے؟ ایک لہو کی بوند ہے
مشک بن جاتی ہے، ہو کر نافۂ آہو میں بند

ہر کسی کی تربیت کرتی نہیں قدرت مگر
کم ہیں وہ طائر کہ ہیں دامِ قفس سے بہرہ مند

شہپرِ زاغ و زغن در بند قید و صید نیست
ایں سعادت قسمتِ شہباز و شاہین کردہ اند

مولانا محمد علی جوہر کی سرکردگی میں جب وفدِ خلافت یورپ گیا تو انھوں نے دریوزۂ خلافت کے عنوان سے حسب ذیل قطعہ لکھا:

اگر ملک ہاتھوں سے جاتا ہے، جائے
تو احکامِ حق سے نہ کر بے وفائی
نہیں تجھ کو تاریخ سے آگہی کیا
خلافت کی کرنے لگا تو گدائی

خریدیں نہ ہم جس کو اپنے لہو سے
مسلماں کو ہے ننگ وہ پادشاہی
مرا از شکستن چناں عار باید
کہ از دیگراں خواستن مومیائی

اس قطعہ کے متعلق یہاں یہ کہہ دینا باعثِ دلچسپی ہوگا کہ خود مولانا محمد علی جوہر رئیسِ وفد نے اس کا بُرا نہیں مانا بلکہ بعد میں ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات سے اتفاق کیا[۵] ـــــ لیکن اس قطعہ سے یہ نہ سمجھا جائے کہ اقبال، سرے سے تحریکِ خلافت کو مہمل، وفدِ خلافت کے یورپ جانے کو فضول اور اس کی مساعی کو لایعنی تصور کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ وفدِ خلافت کے موئید تھے۔ اگرچہ وفد ناکام لوٹا تھا اور وزرائے برطانیہ نے اس کو ٹکا سا جواب دے دیا تھا، تاہم اقبال اس کی مساعی کو نہ صرف بنظرِ استحسان دیکھتے تھے، بلکہ مستقبل میں اس کے اہم اور دُور رس نتائج کے بارے میں پُر اُمید تھے، چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کے نام لکھتے ہیں۔

لاہور۔ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ع

"مخدومی، السلام علیکم،

مراجعت مع الخیر مبارک، آپ نے بڑا کام کیا، جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکرگذاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا۔ وزرائے انگلستان کا جواب وہی ہے، جو ان حالات میں ہمیشہ دیا گیا ہے۔

اَنُؤْمِنُ بَشَرَینِ مثلنا وقومهما لنا عٰبدون۔

تاہم مجھے یقین ہے کہ ہندی وفد کا سفر یورپ بڑے اہم نتائج پیدا

۵۔ مضامینِ محمد علی حصہ دوم مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامع دہلی طبع اول سنہ ۱۹۳۰ع ص ۳۲۵۔

کرے گا۔[۶]''

خط کے الفاظ '' مراجعت مع الخیر مبارک'' پر مولانا سلیمان ندوی کا حاشیہ میں ایک نوٹ ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں '' مکتوب الیہ (سلیمان) کے سفرِ یورپ سے واپسی پر '' گویا یہ خط مولانا سلیمان ندوی کے سفرِ یورپ سے واپس آنے پر لکھا گیا تھا ۔ مولانا وفدِ خلافت کے ایک اہم رکن تھے اور مولانا کا یہ سفرِ یورپ وفدِ خلافت ہی کے سلسلہ میں تھا ۔ وفدِ خلافت یورپ سے ۴ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ع کو واپس لوٹا تھا ۔ اس وفد کی واپسی کے بعد، مرکزی خلافت کمیٹی نے وفدِ خلافت کے حسابات شائع کئے تھے اس میں مولانا سید سلیمان ندوی کا ایک دیباچہ بھی شامل تھا ۔ اس دیباچہ میں مولانا نے یورپ میں وفد کی کارگذاریوں کا مجمل طور پر ذکر کیا ہے اور وفد کے ہندوستان واپس ہونے کی تاریخ ۴ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ع بتائی ہے[۷] ۔ گویا وفدِ خلافت ۴ اکتوبر کو واپس لوٹا تھا اور اقبال نے یہ خط ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۲۰ع کو اس وفد کے ایک اہم رکن مولٰنا سید سلیمان ندوی کو لکھا تھا ۔ اس لحاظ سے اس خط میں جس ہندی وفد کا ذکر ہے وہ وفدِ خلافت ہی ہے ۔ اقبال نے اس خط میں مولانا سلیمان ندوی کو لکھا ہے '' آپ نے بڑا کام کیا جس کا صلہ قوم کی طرف سے شکر گذاری کی صورت میں مل رہا ہے اور دربارِ نبوی سے نہ معلوم کس صورت میں عطا ہوگا''۔ ظاہر ہے کہ یہ '' بڑا کام'' وفدِ خلافت کی وہ مساعی ہیں جو اس نے یورپی دانشوروں بالخصوص برطانیہ کے اربابِ اقتدار کے سامنے ادارۂ خلافت اور مملکتِ ترکیہ کی بقاء و سلامتی سے متعلق مسلمانانِ ہند و مسلمانانِ عالم کے جذبات و احساسات اور ان کے نقطۂ نظر کو پیش کرنے کے سلسلہ میں کی تھیں ۔ اقبال ان مساعی کو اتنا بڑا کام تصور کرتے ہیں کہ دربارِ نبوی سے اس کے صلہ کے متوقع ہیں ! پھر وہ صاف طور پر کہتے ہیں کہ وفدِ خلافت کا یہ سفرِ

۶- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول، مرتبہ شیخ عطا اللہ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص ۱۱۲ و ۱۱۳

۷- سیرتِ محمد علی مصنفہ رئیس احمد جعفری، ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی مطبوعہ سنہ ۱۹۳۱ ص ۲۸۹

یورپ ''بڑے نتائج پیدا کرے گا''۔ اس خط سے بہرحال یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ وفدِ خلافت کے سفر کو '' یورپ گردی '' پر محمول نہیں کرتے بلکہ اس کو مناسب اور مفید خیال کرتے تھے ۔ اب رہا یہ سوال کہ پھر انھوں نے وفدِ خلافت پر یہ طنز کیوں کی تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ طنز ، وفدِ خلافت پر کوئی پھبتی یا چوٹ نہیں ہے ، بلکہ مسلمانوں کو ان کی اپنی کمزوری کی طرف توجہ دلانے اور ایک بنیادی حقیقت سے واقف کرانے کا اقبالی اسلوب ہے ۔ تحریکِ خلافت کا بنیادی محرک ایک اسلامی جذبہ تھا ۔ یہ ایک آفاقی نقطۂ نظر تھا کہ مسلمان ، خواہ کہیں رہتے ہوں ، وہ آپس میں بھائی بھائی ہیں اور خلافت ان کے اِس بھائی چارہ ، اخوت اور مرکزیت کا ایک مظہر ہے ، اِس لحاظ سے اس مرکز و مظہر پر جب برا وقت آ جائے تو اس کو بچانے کی ہر تدبیر و کوشش مستحسن و مبارک ہے ، لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ جب تک مسلمان کمزور رہیں گے ، یہ مرکزیت قائم نہ ہوگی ۔ کاسۂ گدائی لے کر طاقتور قوموں کے سامنے جانے سے ، خلافت بحال نہ ہوگی ۔ اس کے لیے تو مسلمانوں کو اپنے اندر جذبۂ اسلامی کو بیدار کرنا ہوگا ، ایثار اور قربانی کے لیے اپنے آپ کو تیار کرنا پڑے گا ۔ آزمائشوں اور امتحانوں سے گذرنا پڑے گا ، اس لیے اقبال نے جب مولانا سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک خط[۸] میں یہی قطعہ لکھ کر بھیجا تو اس کا پہلا مصرع تھا

بہت آزمایا ہے غیروں کو تو نے
مگر آج ہے وقتِ خویش آزمائی

مگر بانگِ درا جب شائع ہوئی ، تو انھوں نے نہ معلوم کیوں اس مصرع کو حذف کر دیا !

بہرحال اقبال کا یہ قطعہ وفدِ خلافت پر کوئی تعریض نہیں ہے ، زیادہ سے زیادہ اس کو طنز یا تنقید کہا جا سکتا ہے ، اگر یہ طنز ہے تو اس میں تحقیر کا کوئی پہلو نہیں ہے اور اگر تنقید ہے تو یہ تنقید ایک دکھے ہوئے

۸- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) مرتبہ شیخ عطا اللہ ص ۱۰۶

دل کی تنبیہ ہے !!

یہ تو تھے وہ تاثرات ، جو وفدِ خلافت کے متعلق اقبال کے دل میں پیدا ہوئے تھے اور جہاں تک تحریکِ خلافت کا تعلق ہے ایک روایت تو یہ بھی ملتی ہے کہ وہ خلافت کمیٹی پنجاب کے سکریٹری رہ چکے تھے ، لیکن اِس عہدہ سے انہوں نے استعفٰی دے دیا۔ یہ روایت فقیر سید وحیدالدین نے اپنی کتاب " روزگارِ فقیر " جلد دوم میں درج کی ہے ۔ فقیر صاحب نے لکھا ہے کہ " علامہ اقبال کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد سنہ ۱۹۲۱ء میں ایل۔ایل۔بی کرنے کے بعد سیالکوٹ میں وکالت کر رہے تھے اور تحریکِ خلافت میں حصہ لے رہے تھے، ان کے والد شیخ عطا محمد نے اپنے بھائی علامہ اقبال سے اس کا ذکر کیا تو اقبال نے انہیں بتایا کہ وہ بھی خلافت کمیٹی کے سیکریٹری رہ چکے ہیں اور ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا کہ انہوں نے اس سے استعفٰی دے دیا تھا۔ استعفٰی کی وجہ انہوں نے یہ بتائی تھی کہ "خلافت کمیٹی کے بعض ممبر ہر جگہ قابلِ اعتبار نہیں ہوتے۔ وہ بظاہر جوشیلے مسلمان معلوم ہوتے ہیں لیکن در باطن اخوانُ الشّیاطین ہیں ۔ اس استعفے کے وجوہ اِس قابل نہ تھے کہ پبلک کے سامنے پیش کیے جاتے لیکن اگر پیش کئے جا سکتے تو لوگوں کو سخت حیرت ہوتی۹ "

اس روایت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کو نہ صرف تحریکِ خلافت سے ہمدردی تھی بلکہ اس میں انہوں نے عملاً حصہ بھی لیا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اقبال اس دور میں یعنی سنہ ۱۹۲۶ء تک عملی سیاست سے ایک گونہ بے تعلق ہی رہے ، اور ان کا زیادہ تر وقت " عزلت نشینی" ہی میں گذرا ۔ یوں بھی وہ طبعاً ہنگاموں سے دور ہی بھاگتے تھے ۔ ان حقائق کے پیش نظر اقبال کا تحریکِ خلافت میں شریک ہونا، خلافت کمیٹی پنجاب کا سیکریٹری بن جانا ، بہرحال تحریکِ خلافت سے ان کی دلی وابستگی کی غمازی کرتا ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ تحریکِ خلافت ، سنہ ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی

۹- روزگارِ فقیر جلد دوم مصنفہ فقیر سید وحید الدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی بار اول سنہ ۱۹۶۴ء ص ۱۸۰

کے بعد مسلمانانِ ہند کے دلوں کا پہلا ارتعاش تھا ۔ اس تحریک نے ان میں بیداری کی ایک زبردست لہر پیدا کر دی، اور اسلام سے وابستگی کے جذبات کو انگیخت کیا تھا ۔ فکری لحاظ سے اسلام کے آفاقی نظریہ کا یہ ایک مظاہرہ بھی تھا اور اسلامی قومیت کا مظہر بھی ۔ یوں یہ تحریک اقبال کے ذہن و فکر سے قریب تھی ۔ اس لیے ان کا اس میں عملی حصہ لینا ، کسی حیرت و استعجاب کا موجب نہیں ۔ اگرچہ انھوں نے اس سے استعفٰی دیدیا ، تاہم اس استعفٰی کی جو وجوہ انھوں نے بیان کی ہیں ، وہ نفسِ تحریک سے ان کی مخالفت کو ظاہر نہیں کرتیں ۔ ان سے صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بعض کارکنوں کے اعمال و افعال کو پسند نہیں کرتے تھے ۔ واقعہ یہ ہے کہ خلافت ایک آندھی کی طرح اٹھی تھی ، اس میں اچھے ُبرے سبھی شریک ہوگئے تھے ۔ یہ ایک عوامی تحریک تھی اور جب کوئی عوامی تحریک اپنے شباب پر پہنچ جاتی ہے ، تو بد اعمال کارکنوں سے اس کا دامن کشاں رہنا قریب قریب ناممکن ہوتا ہے ۔

غرض کہ اقبال تحریکِ خلافت اور وفدِ خلافت دونوں کے حامی اور موئید تھے ، البتہ تحریکِ خلافت سے جب ہندوؤں نے تعاون کیا اور جب اس تعاون کے ساتھ یہ تحریک ملکی سیاست میں آگے بڑھی تو قائدینِ تحریک ہندو لیڈروں کی شاطرانہ چالوں میں آ کر متحدہ قومیت کے جال میں پھنس گئے، اقبال اس وقت اس کے مخالف ہوگئے ، جس کا ذکر اپنی جگہ پر آگے آ رہا ہے ۔

تحریک ترک تعاون سے اختلاف | ہم بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ میں تحریکِ ترکِ تعاون اپنے شباب پر تھی ۔ علی برادران نے علی گڑھ مہم سر کر لی تھی اور اب لاہور پہنچے تھے کہ اسلامیہ کالج ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو تحریکِ ترکِ تعاون میں شریک کرایا جائے ، ڈاکٹر اقبال اس زمانہ میں اسلامیہ کالج کے سیکریٹری تھے ، آپ نے علی برادران سے اختلاف کیا ۔ اس روداد کو رئیس الاحرار مولانا محمد علی کی زبانی سنئیے :

" ہم لاہور پہنچے اور اسلامیہ کالج کے ٹرسٹیوں اور اساتذہ کو دعوت الی الخیر دی تو ان کو علی گڑھ کالج کے ٹرسٹیوں اور

اساتذہ سے بھی زیادہ مستعد پایا اور اسی سے اندازہ کیا کہ طلبا کس قدر مستعد ہوں گے ، مگر ڈاکٹر محمد اقبال سیکریٹری تھے اور آپ نے ، جن سے ہم نے اسلام سیکھا تھا (نہ کہ کسی مولوی سے) ہماری دعوت کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ علمائے کرام کا فتویٰ لے لیا جائے ۔ خیر پانچ سو علماء نے بھی چند ماہ بعد فتویٰ صادر فرما دیا ، مگر ڈاکٹر اقبال نے اس پر بھی توجہ نہیں فرمائی، البتہ اجتہاد فرمایا تو علم الاقتصاد کے ماہر کی حیثیت سے ، اس وقت جبکہ مہاتما گاندھی ایک کروڑ روپیہ جمع کر لائے اور وہ اجتہاد یہ تھا کہ اس سے ٹیکنولاجیکل (صنعتی) انسٹی ٹیوٹ کا افتتاح کیا جائے [۱۰]"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہنگامہ آرائی کے اس پورے دور میں اقبال کی گوشہ نشینی کی وجہ متحدہ قومیت کے بارے میں اُن کا خاص نقطۂ نظر تھا ، انگریز دشمنی اور مشترکہ وطن کی بنیاد پر ، جس قومیت کی تعمیر ہو رہی تھی ، اُس کے متعلق وہ جانتے تھے کہ

ع جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

چنانچہ مولانا سید سلیمان ندوی کو ، جو اس زمانہ میں کانگریس میں شریک تھے ، اپنے ایک خط مورخہ ۵ ستمبر سنہ ۱۹۲۴ع میں لکھتے ہیں :

" جس راہ پر آپ اس سے پہلے قدم زن تھے (اشارہ کانگریس کی طرف ہے) اس کے متعلق انشاء اللہ بوقتِ ملاقات گفتگو ہوگی ۔ ہندوستانی نیشنلزم کی انتہا یہی تھی ، جو آپ کے مشاہدہ میں آ گئی [۱۱]"

واضح رہے کہ یہ خط ستمبر سنہ ۱۹۲۴ع میں لکھا گیا ہے اور ہم

۱۰- مضامین محمد علی حصہ دوم مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی طبع اول سنہ ۱۹۴۰ع ص ۴۲۵ و ۴۲۶

۱۱- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص ۱۴۰

بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۴ء ہی میں متحدہ قومیت کا فولادی قلعہ ، حقائق کی دنیا میں شیش محل ثابت ہو چکا تھا !!

سلطان ابن سعود کے قبضہ حجاز کی تائید

بیان کیا جا چکا ہے کہ سنہ ۱۹۲۴ء کے اواخر میں شریف حسین کو اپنے گناہوں کی سزا ملی اور اس کو حجاز چھوڑ کر بھاگنا پڑا ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۲۴ء میں مکہ معظمہ پر سلطانِ نجد ، ابن سعود کا قبضہ ہو گیا اور سنہ ۱۹۲۴ء کے ختم ہونے سے پہلے پورا حجاز ان کے زیرِ تسلط آ گیا ۔ اس خبر سے مسلمانانِ ہند کچھ مطمئن ہوئے کیونکہ شریف حسین کی غداری کا انہیں بڑا صدمہ تھا ۔ شریف حسین نے نہ صرف ترکوں سے بغاوت کی تھی بلکہ انگریزوں کا وظیفہ خوار بن کر اس نے پہلی عالمی جنگ کے دوران ، عربوں کو ترکی خلیفہ کے خلاف کھڑا کیا تھا اور اتحادیوں کا علی الاعلان ساتھ دیا تھا ۔ اس کے برعکس سلطان نجد کا رویہ غنیمت تھا ۔ انہوں نے ترکوں کے خلاف اعلانیہ کوئی حصہ نہیں لیا بلکہ در پردہ خلیفۃ المسلمین کی امداد کی تھی ۔ شریف حسین کی خارجہ پالیسی کی بنیاد ترکوں سے بغاوت ، ملت سے غداری اور انگریزوں سے ساز باز پر ، استوار ہوئی تھی تو داخلی پالیسی ظلم و جور پر قائم تھی ۔ اس کا دعویٰ تو یہ تھا کہ وہ ہاشمی ہے اور اس کا سلسلۂ نسب اشرف الانبیاء تک پہنچتا ہے اور اسی بناء پر وہ پورے عرب کا واحد حکمران بننے کا حقدار ہے ، لیکن وہ ایک ظالم حکمران تھا ، اہلِ حجاز بھی اس کی لوٹ کھسوٹ سے عاجز آ چکے تھے ۔ ملک میں امن و امان کی حالت ابتر تھی ، حاجیوں کے قافلے تک لوٹ لیے جاتے تھے ۔ الغرض بغاوت ، غداری اور ظلم و جور سے اس کا کارنامۂ حکومت مزین تھا ۔ مسلمانانِ ہند کے قلوب الغائے خلافت کی وجہ سے پاش پاش تو ہو ہی چکے تھے اور آویزش نجد و حجاز کی خبروں نے انہیں بالکل ادھ مؤا کر دیا تھا ۔ اب شریف حسین کی ناکامی اور سلطان ابن سعود کی کامیابی سے ان میں کچھ جان سی آئی ، لیکن ساتھ ہی مقابر و مآثر کے انہدام کی خبروں سے مسلمانوں کے ایک بڑے گروہ میں اضطراب کی لہر سی دوڑ گئی ۔ مگر جب سلطان ابن سعود کی طرف سے ان خبروں کی تردید آ گئی تو ان کے

آنسو کچھ خشک ہوئے ، تاہم حجاز کے مستقبل کا مسئلہ ان کے لیے باعث تشویش تھا ۔ مسلمانانِ ہند کے ایک گروہ کا خیال تھا کہ حجاز کی حکومت معزول شدہ خلیفہ عبدالمجید خاں کے سپرد کر دی جائے ۔ دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ سلطان ابن سعود اپنی شخصی حکومت وہاں قائم نہ کریں بلکہ حجاز کی حکومت شورائی طرز کی ہو ، بے شک اِس کی عنان حجازیوں کے ہاتھوں میں ہو ، لیکن حکومت کے انتظام و انصرام میں مسلمانانِ عالم کی مجلس کی رائے کو بھی وزن دیا جائے ۔ اس دوسرے گروہ کے نقطۂ نظر کو مولانا محمد علی جوہر نے بڑے زور و شور سے پیش کیا تھا ۔ ایک تیسرا گروہ مسلمانانِ ہند کا ایسا تھا ، جو سلطان ابن سعود کو ملک الحجاز و النجد دیکھنا چاہتا تھا ۔ اس گروہ کی نمائندگی مولانا ظفر علی خاں کر رہے تھے ۔ بہرحال مسلمانانِ ہند حجاز کے مستقبل کے متعلق فکرمند تھے ۔ ایسے میں سلطان ابن سعود نے موتمرِ عالمِ اسلامی کے انعقاد کی تجویز پیش کی، جس میں انھوں نے عالمِ اسلام کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ اعلان بھی کیا کہ حجاز کے مستقبل کا فیصلہ اسی موتمر میں کیا جائے گا ۔ سلطان کے اس اعلان سے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک گونہ اطمینان ہوا ۔

اسی زمانہ میں ”مسلم آوٹ لُک“ کے نمائندے نے ”مسئلۂ حجاز“ پر علامہ اقبال سے ایک انٹرویو لیا ، جو اخبار زمیندار مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۹۲۴ء میں بھی شائع ہوا ، پہلے تو اس نے حجاز کی حکومت سابق خلیفہ عبدالمجید خاں کے سپرد کرنے کی تجویز کے متعلق سوال کیا ۔ علامہ اقبال نے جواب دیا ”یہ تجویز نامناسب ہے اور اگر موجودہ نازک صورتِ حال میں اس پر زور دیا گیا تو اندیشہ ہے کہ کہیں دنیائے اسلام کے پیچیدہ معاملات میں مزید اُلجھنیں پیدا نہ ہو جائیں ۔ ابن سعود وہابیوں کا نمائندہ ہے اور سابق خلیفة المسلمین سُنّی دنیائے اسلام کے دینی پیشوا رہ چکے ہیں ۔ حجاز اس وقت عملاً وہابیوں کے قبضہ میں ہے ، اگر اس حالت میں سابق خلیفة المسلمین کو حاکمِ حجاز بنانے کی کوشش کی گئی تو اندیشہ ہے کہ مسلمانوں کے ان دو فرقوں میں سخت کشمکش شروع ہو جائے گی“

نمائندے نے سوال کیا۔

"تو ڈاکٹر صاحب کیا آپ موجودہ صورتِ حال سے پوری طرح مطمئن ہیں اور عارضی طور پر بھی حجاز کی عنانِ نظم و نسق سابق خلیفۃ المسلمین کے حوالے کرنے کو مناسب نہیں سمجھتے؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"میں اس انتظام کو عارضی اور ہنگامی طور پر بھی مناسب نہیں سمجھتا، میری رائے یہ ہے کہ ایسی تجویز کا پیش کرنا ہی ایک غلطی ہے۔ میں حجاز کی موجودہ صورت حالات سے پورے طور پر مطمئن ہوں اور ابن سعود پر بدون تذبذب، اعتماد رکھتا ہوں۔ میری رائے میں سلطان نجد ایک روشن خیال آدمی ہے اور جو لوگ سلطان موصوف سے ملے ہیں یا انھوں نے نجد کو دیکھا ہے، وہ میری اس رائے کے موئید ہیں۔ امریکہ کا ایک مصنف اپنی کتاب "الاسلام" میں سلطان نجد کو ایشیا کا بہترین حاکم اور سر زمینِ نجد کو زوال آمادہ دنیائے اسلام کی صاف اور پاک ترین جگہ بتاتا ہے"

اس پر نمائندہ نے سوال کیا:

"ڈاکٹر صاحب آپ فرماتے ہیں کہ سلطانِ نجد روشن خیال ہیں، تو کیا ان سے اُمید کی جا سکتی ہے کہ وہ حجاز کے متعلق بین المّلی اسلامی موتمر کے فیصلہ کی پابندی کریں گے؟"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا:

"میں مستقبل کے حالات و واقعات کے متعلق قطعی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا، اس وقت دنیائے اسلام میں گونا گوں تغیرات کا سلسلہ قائم ہے لیکن ابن سعود چونکہ خود نمائندگانِ عالمِ اسلام کی موتمر منعقد کرنے کے خواہاں ہیں اس لیے توقع ہے کہ وہ اس موتمر کے فیصلہ کی پابندی کریں گے"۔۔۔۔۔

بہت ممکن ہے کہ عرب میں ابن سعود کے باعث ایک زبردست قومی تحریک

نشو و نما پائے اور اس کے آثار و علائم نظر آ رہے ہیں ، اس احساس خودی کا ہمیں تہہ دل سے خیر مقدم کرنا چاہیے ، اگرچہ اس کی تہہ میں تجرد و تفرید کے مادہ کی نشو و نما کا بھی اندیشہ ہے ، لیکن کچھ مدت تک اس تجرد و تفرید کو برداشت کرنا چاہیے" -

جنگ عظیم و عالم اسلام کے متعلق تاثرات | عزلت نشینی کے اس دور میں بھی یہ ناممکن تھا کہ اقبال جیسا ذی حس شاعر دنیا کے اتنے بڑے خونیں ڈرامے اور عالمِ اسلام کے اتنے دلدوز حادثات سے متاثر نہ ہوتا - " خضر راہ " جو سنہ ۱۹۲۱ء میں اور طلوع اسلام ، جو اس کے ایک سال بعد شائع ہوئی اقبال کے ان ہی تاثرات کے نتائج ہیں -

" خضر راہ " انجمنِ حمایتِ اسلام لاہور کے ایک جلسہ میں پڑھی گئی تھی ، علامہ مرحوم جب یہ نظم پڑھ رہے تھے ، تو رقتِ قلب کا یہ عالم تھا کہ خود بھی روتے جاتے تھے اور سارے مجمع کو بھی رلاتے جاتے تھے - اس نظم میں انھوں نے جنگِ عظیم کے دوران میں اقوامِ غالب کی تباہ کاری اور اس کے بعد ان کی سیاست کاری ، قدیم سرمایہ دارانہ نظام کی فریب کاری اور مزدوروں کی تحریک بیداری ، عالمِ اسلام کی زبوں حالی اور ترکانِ عثمانی کی بے دست و پائی پر بصیرت افروز تبصرہ کیا اور آخر میں کچلی ہوئی انسانیت کو ایک نئے نظمِ عالم کا مژدہ سنایا -

جنگِ عظیم میں انھوں نے کروڑوں آدمیوں کو مرتے اور لاکھوں انسانوں کو غلام بنتے دیکھا تھا ، اس لیے واقفِ اسرارِ حیات خضر کی زبان سے زندگی کی حقیقت کا راز وہ یوں فاش کرتے ہیں :

برتر از اندیشۂ سود وزیاں ہے زندگی
ہے کبھی جاں اور کبھی تسلیم جاں ہے زندگی

زندگانی کی حقیقت کوہکن کے دل سے پوچھ
جوئے شیر و تیشہ و سنگ گراں ہے زندگی

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے اک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بے کراں ہے زندگی

جنگ عظیم کے فاتحین نے جو تباہی مچائی تھی ، اس کی طرف معنی خیز انداز میں وہ اس طرح لطیف اشارہ کرتے ہیں :

آ بتاؤں تجھ کو رمز آیۂ ان الملوک
سلطنت اقوام غالب کی ہے اک جادو گری

اور اس کے بعد استعماری طاقتوں کی سیاست کاری کے کریہ المنظر چہرہ پر سے جمہوریت کا نقاب یوں اُٹھاتے ہیں :

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سلا دیتی ہے اس کو حکمراں کی ساحری

ہے وہی ساز کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیراز نوائے قیصری

دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

جادوئے محمود کی تاثیر سے چشم ایاز
دیکھتی ہے حلقۂ گردن میں شان دلبری

مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمئی گفتار اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی ایک سرمایہ داروں کی ہے جنگ زرگری

اس سراب رنگ و بو کو گلستاں سمجھا ہے تو
آہ اے ناداں قفس کو آشیاں سمجھا ہے تو

برسوں کی نیند کے ماتے ہندوستانی اُٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ سامراج کے جیل خانوں کو انھوں نے بھر دیا تھا ، لیکن زیادہ عرصہ نہ گزرا کہ یہ ولولے سرد پڑ گئے اور سنہ ۱۹۱۹ع کے اصلاحات دستوری کے نفاذ نے ان کا رخ جیل خانوں کی بجائے حکومت کے ایوانوں کی طرف کر دیا تھا ، ان اشعار میں صاف اور واضح طور پر اصلاحات دستوری سنہ ۱۹۱۹ع کے نفاذ کی طرف اشارہ ہے اور ان لوگوں پر طنز ہے ، جنھوں نے ان دستوری

اصلاحات کا خیر مقدم کیا تھا اور ان کے تحت منعقد ہونے والے سنہ ۱۹۲۱ع کے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔

آگے چل کر سرمایہ دارانہ نظام کے فریب اور مزدور کی سادہ لوحی کا خضر کی زبانی اس طرح ذکر کیا ہے :

بندۂ مزدور کو جا کر مرا پیغام دے
خضر کا پیغام کیا ، ہے یہ پیام کائنات
اے کہ تجھ کو کھا گیا سرمایہ دار حیلہ گر
شاخ آہو پر رہی صدیوں تلک تیری برات
دست دولت آفریں کو مزدیوں ملتی رہی
اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار
انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

خضر کی زبانی عالم اسلام کی حالت کا اس طرح تجزیہ کرتے ہیں :

لے گئے تثلیث کے فرزند میراث خلیل
خشت بنیاد کلیسا بن گئی خاک حجاز

اور ترکوں کی بے بسی و مجبوری کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچتے ہیں :

ہو گئی رسوا زمانہ میں کلاہ لالہ رنگ
جو سراپا ناز تھے ، ہیں آج مجبور نیاز
لے رہا ہے مے فروشان فرنگستان سے پارس
وہ مئے سرکش حرارت جس کی ہے مینا گداز

زوال ملت اسلامی کے متعدد اسباب کو بھی خضر گناتے ہیں ۔ اس کا ایک سبب تو تقسیم کرو اور حکومت کرو کا وہ اصول ہے ، جو مغربی سامراج کی سیاست کاری کے نظر فریب قصر کا بنیادی پتھر ہے :

حکمت مغرب سے ملت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کر دیتا ہے گاز
ہو گیا مانند آب ارزاں مسلماں کا لہو
مضطرب ہے تو کہ تیرا دل نہیں دانائے راز

دوسرا بنیادی سبب رنگ و نسل اور جغرافیائی وطنیت کی بنیاد پر قومیت کی تشکیل کا وہ فتنہ ہے ، جو مغربی تہذیب اور جدید افکار و نظریات کے زیر اثر ممالکِ اسلامیہ میں پھیل گیا تھا ، جس کی وجہ سے عربوں نے جنگ عظیم کے نازک موقع پر خلافتِ ترکیہ کے خلاف علمِ بغاوت بلند کیا تھا ، اور استعماری طاقتوں کے آلہ کار بن گئے تھے، چنانچہ فرماتے ہیں :

جو کرے گا امتیازِ رنگ و خوں مٹ جائے گا
ترکِ خرگاہی ہو یا اعرابی والا گہر
نسل اگر مسلم کی مذہب پر مقدم ہو گئی
اڑ گیا دنیا سے تو مانند خاکِ رہ گذر

پھر دم توڑتی ہوئی ملت اسلامیہ کی نشأۃ ثانیہ اور سسکتے ہوئے مسلمانانِ عالم کی حیات نو کے لیے خضرِ جہاں ہیں کے آبِ حیات کو یوں پیش کرتے ہیں :

ربط و ضبطِ ملتِ بیضا ہے مشرق کی نجات
ایشیا والے ہیں اس نکتے سے اب تک بے خبر
ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لیے
نیل کے ساحل سے لے کرتا بخاکِ کاشغر

مگر یہ آبِ حیات نہ یورپ کے بازاروں میں ملتا ہے اور نہ سامراج کی اونچی دکانوں میں ، اس لیے اس آبِ حیات کی تلاش میں وفدِ خلافت کی یورپ گردی مومیائی کی گدائی ہے اور

مومیائی کی گدائی سے تو بہتر ہے شکست
مورِ بے پر حاجتے پیشِ سلیمانے مبر

یہ آبِ حیات تو مدینہ کی گلیوں میں ملتا ہے اور اس کا چشمہ تو وادی غیر ذی زرع میں پھوٹتا ہے ، اس لیے ۔

پھر سیاست چھوڑ کر داخل حصارِ دیں میں ہو
ملک و دولت ہے فقط حفظِ حرم کا اک ثمر

اور اس چشمۂ جاں بخش تک پہنچنے کے لیے خود خضر کی رہنائی بھی

ضروری نہیں ، اسلاف کے قلب و جگر کو اپنے اندر پیدا کر لینا کافی ہے

تا خلافت کی بنا دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب و جگر

" طلوعِ اسلام " میں اقبال نے جنگِ عظیم کے پیدا کردہ عالمی مسائل کی طرف اشارے کئے ہیں ، عالمِ اسلام کی تباہی و بربادی کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی پر جوش رجائی انداز میں یہ بتایا ہے کہ مغرب کا یہ طوفان ملتِ اسلامیہ کے لیے ایک فالِ نیک ہے - اس کی وجہ سے عالمِ اسلام میں بیداری اور حیات کے آثار پیدا ہو چلے ہیں - مصطفیٰ کمال کی کامیابیاں ، دراصل عالمِ اسلام میں زندگی کی نئی لہریں ہیں ، اس لیے وہ ایک مرد غازی ہے ، ایک دیدہ ور ہے - اس نظم کا پس منظر ، ترکوں کی وہ جاں فروشی ہے ، جو سنہ ۱۹۲۱ع میں ترکیہ کی آزادی کی خاطر شروع ہوئی تھی اور مصطفیٰ کمال جو اس تحریکِ حریت کی روح رواں تھا ، اقبال کے متخیلہ میں اس نظم کا در پردہ ہیرو ہے -

اقبال فرماتے ہیں کہ جنگ عظیم کے دوران اور اس کے بعد عالم اسلام میں جو دل شکن واقعات پیش آئے ، ان سے نا امید نہ ہونا چاہیے ، ان کی وجہ سے " عروقِ مردۂ مشرق میں خون زندگی " دوڑ رہا ہے ، اور طوفانِ مغرب کے طمانچے کھا کر ، " مسلماں " ، اب مسلماں بننے لگا ہے ، اس لیے -

وہ چشمِ پاک بیں کیوں زینتِ برگستواں دیکھے
نظر آتی ہے جس کو " مردِ غازی " کی جگر تابی

اور :

اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے
کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

عالمِ اسلام پر ایک قیامت گزر گئی مگر شاعرِ امید مایوس نہیں ہے ، کیونکہ وہ سمجھتا ہے کہ اس مصیبتِ عظمیٰ نے ملتِ بیضا پر ایک تازیانہ لگایا ہے اور اس درد و کرب میں چشمِ مسلم نے جو آنسو بہائے ہیں وہ آگے چل کر " گہر " بننے والے ہیں -

سر شک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا

کتابِ ملتِ بیضاؑ کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا

اقبال نے بڑی مدت کے بعد اپنے کاشانۂ دل میں امیدوں، آرزوؤں اور ارمانوں کے دئیے جلائے ہیں کیونکہ اس نے چمنِ ملت میں مصطفیٰ کمال جیسے "دیدہ ور" کو پیدا ہوتے دیکھ لیا ہے، اور اس کو یہ توقع ہو چلی ہے کہ اس کے جگر گداز ترنم سے کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا ہو کر رہے گا:

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی رہی
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

نوا پیرا ہو، اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہین کا جگر پیدا

رنج و افسوس اِس کا نہیں ہے کہ عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا، ایران کی شوکت مٹی، عرب کی عظمت پیوندِ خاک ہو گئی۔ مقامِ تاسف یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ میں امتیاز رنگ و نسل کا فتنہ پھوٹ پڑا اور

حرم رسوا ہوا پیرِ حرم کی کم نگاہی سے!

مگر خوشی یہ ہے کہ

جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے!!

جنگِ عظیم میں عالم اسلام کو جو زبردست دھکا پہنچا، اس سے دل شکستہ نہیں ہونا چاہئے کیونکہ

جہاں میں اہلِ ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے

سرمایہ دارانہ تمدن اور سامراجی تہذیب کے قصرِ فلک بوس میں اب ایک زلزلہ آ چکا ہے، خود مندانِ مغرب کی حکمتِ عملی بھی اب اس کو

سرنگوں ہونے سے بچا نہیں سکتی اس لیے مسلمان پر جو اقوامِ ایشیا ـــــ بلکہ اقوامِ عالم کا امام و لیڈر ہے ایک گراں بار فرض عاید ہوتا ہے ۔ اس کو چاہئے کہ رنگ و خون کے بت کو توڑ کر ملت میں گم ہو جائے ، کیونکہ اس بت نے انسانیت کے ٹکڑے پارچے کر دئے ہیں ،

ہوس نے کر دیا ہے ٹکڑے ٹکڑے نوعِ انساں کو
اخوت کا بیاں ہو جا محبت کی زباں ہو جا

یہ ہندی وہ خراسانی یہ افغانی وہ تورانی
تو اے شرمندۂ ساحل اچھل کر بے کراں ہو جا

غبار آلودۂ رنگ و نسب ہیں بال و پر تیرے
تو اے مرغِ حرم اڑنے سے پہلے پر فشاں ہو جا

مسلمان اُمتِ واحد ہیں ، سیسہ پگھلائی ہوئی دیوار ہیں ۔ وہ نسل ، رنگ اور وطن کی بنیاد پر ایک دوسرے کا خون نہیں بہاتے ۔ ان کی شان تو اشدّاء علی الکفار ورُحماءُ بینھُم ہے ، اس لیے اقبال فرماتے ہیں ۔

مصافِ زندگی میں سیرتِ فولاد پیدا کر
شبستانِ محبت میں حریر و پر نیاں ہو جا

گذر جا بن کے سیلِ تند رو کوہ و بیاباں سے
گلستاں راہ میں آئے تو جوئے نغمہ خواں ہو جا

مسلمان نے اپنے پرانے سبق کو فراموش کر دیا تھا ، اس لیے دنیا کی امامت اس سے چھین لی گئی ، اقبال اس کو یہ سبق یاد دلاتے ہیں ۔

سبق پھر پڑھ ، صداقت کا عدالت کا شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اقبال نے اس نظم میں جو پیشین گوئیاں کی تھیں ، وہ ایک حد تک بعد میں صحیح ثابت ہوئیں ۔ ”یورپ کا مردِ بیمار“ (ترکی) اب موت کے پنجہ سے نکل چکا تھا ۔ ایران کو رضا شاہ نے روس اور انگریز کے اثرات سے بچا لیا ۔ نجد و حجاز میں سلطان ابنِ سعود نے ایک مستحکم حکومت قائم کر لی ۔ مصر نے زاغلول کی قیادت میں آزادی کی جنگ شروع کر دی ۔

شام ، عراق اور فلسطین میں عرب اپنی آزادی کے لیے لڑنے لگے غرضیکہ ممالک اسلامیہ میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی اور ادھر یورپی سامراج و سرمایہ داری کے قلعہ کی سرنگوں میں اشتراکیت نے اپنی بارود بچھا دی لیکن اقبال نے عالمِ اسلام سے بالعموم اور ترکوں سے بالخصوص جو اُمیدیں باندھ رکھی تھیں وہ پوری نہیں ہوئیں اور ان ممالک میں اسلام کی نشأۃ ثانیہ کا جو خواب انھوں نے دیکھا تھا ، اس کی انھیں اُلٹی تعبیر ملی ۔ جس راہ پر ان ممالک کو گامزن اور جس منزل تک ان کو پہنچانے کی وہ تمنا رکھتے تھے ، وہ پوری نہ ہوئی !!

گذشتہ صفحات میں ہم نے اختتام سنہ ۱۹۲۵ع کے سیاسی حالات اور ان حالات میں علامہ اقبال کے ردِ عمل کا مطالعہ کیا ہے ۔ سنہ ۱۹۲۶ع ہی میں ڈاکٹر صاحب نے عملی سیاسیات کی خار زار وادی میں قدم رکھا اور سنہ ۱۹۳۸ع یعنی اپنی وفات تک تقریباً بارہ سال وہ اس وادی کے کانٹوں سے برابر اُلجھتے ہوئے اپنی منزلیں طے کرتے رہے ، البتہ اس دوران میں وہ اپنا دامن کبھی کبھی ان کانٹوں سے بچاتے بھی رہے ۔ اقبال کے اس سفرِ زندگی کی تین منزلیں قرار دی جا سکتی ہیں ۔ ابتدائی منزل جس کو انھوں نے سنہ ۱۹۲۶ع سے لے کر سنہ ۱۹۳۱ع تک طے کیا ۔ دوسری منزل جس پر وہ سنہ ۱۹۳۵ع میں پہنچے اور تیسری منزل کی مسافت انھوں نے سنہ ۱۹۳۵ع سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ع تک طے کی ۔ آئندہ صفحات میں اقبال کے اس سفرِ زندگی کی روداد بیان کی جائے گی ۔

———:o:———

حوالہ جات باب ۳

۱- مکاتیبِ اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ مطبوعہ لاہور ص ۲۳
۲- ایضاً ص ۲۵۵
۳- ہسٹری آف دی کانگریس (اُردو ترجمہ: کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۳۱۹

۴۔ ایضاً ص ۳۸۰ و ص ۳۸۶
۵۔ مضامینِ محمد علی حصہ دوم مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی طبع اول سنہ ۱۹۴۰ع ص ۴۲۵
۶۔ اقبال نامہ (مکاتیبِ اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ ص ۱۱۲ و ۱۱۳
۷۔ سیرتِ محمد علی مصنفہ رئیس احمد جعفری ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی مطبوعہ ۱۹۳۱ع ص ۲۸۹
۸۔ اقبال نامہ (مکاتیبِ اقبال) مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ ص ۱۰۶
۹۔ روزگارِ فقیر جلد دوم مصنفہ فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی بار اول ۱۹۶۴ع ص ۱۸۰
۱۰۔ مضامینِ محمد علی حصہ دوم مرتبہ محمد سرور ص ۴۲۵ و ۴۲۶
۱۱۔ اقبال نامہ (مکاتیبِ اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطا اللہ ص ۱۴۰

باب ۴

خار زار سیاست میں پہلا قدم

پس منظر | گذشتہ باب میں ہم نے اختتام سنہ ۱۹۲۵ء تک برصغیر ہند کے عام سیاسی حالات بطور پس منظر بیان کر دیئے تھے - اس باب میں ہمیں سنہ ۱۹۲۶ء تا اختتام سنہ ۱۹۳۰ء کے حالات بیان کرنے ہیں ، یہ دور ہمارے موضوع کے لحاظ سے بہت اہم ہے ، اس کی دو وجوہ ہیں ، ایک تو یہ کہ اس دور میں ، ملک کے اندر زبردست داخلی سیاسی کشمکش رونما ہوئی ، اور اس کے حل کے لیے سر توڑ کوششیں بھی کی گئیں لیکن بالآخر یہ کوششیں ناکام ہوئیں —— دوسرے یہ کہ اس دور میں علامہ اقبال نے سیاست کے میدان میں قدم رکھا ، اور اس کشمکش میں فعال حصہ لیا - یہ دور اپنے سابقہ دور یعنی تحریک ترک تعاون وسول نافرمانی کے دور سے بہت مختلف ہے - اس دور میں بھی سیاسی ہنگامہ آرائی اور کشمکش رہی ، مگر یہ کشمکش ہندوستانیوں اور برطانوی حکومت کے مابین تھی - گویا اس کا رخ خارجی تھا —— اس دور میں جو ہنگامہ آرائی ہوئی ، اس کا رخ داخلی تھا یعنی ملک کے دو بڑے گروہوں —— ہندوؤں اور مسلمانوں —— کے مابین زبردست سیاسی رسہ کشی ہونے لگی - اس لیے ہمیں سلسلۂ واقعات کو سنہ ۱۹۲۶ء سے ذرا پیچھے ہٹ کر سنہ ۱۹۲۳ء کی کڑیوں سے جوڑنا پڑے گا تاکہ پس منظر پوری طرح واضح ہو جائے اور پھر اس میں علامہ اقبال کے سیاسی کردار کی قدروقیمت کا صحیح اندازہ لگایا جا سکے -

گذشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ فروری سنہ ۱۹۲۲ع میں تحر
سول نافرمانی ختم کر دی گئی تھی - مارچ سنہ ۱۹۲۲ع میں گاندھی
چھ سال کی سزا پا چکے تھے اور ان سے پہلے دسمبر سنہ ۱۹۲۱ع
علی برادران جیل پہنچ چکے تھے - سول نافرمانی کے اختتام اور سر آ
و ممتاز ہندو مسلم لیڈروں کے جیل چلے جانے کے بعد ملک کی سیاسی
بدلنے لگی تھی - اس بدلتی ہوئی فضا کے دو رجحانات بہت واضح ہو
سامنے آ گئے تھے - ایک رجحان تو داخلۂ کونسل کا تھا اور دوسرا رج
ہند و مسلم اختلافات کا تھا - ان دونوں رجحانات کا نتیجہ یہ نکلا
برطانوی حکومت کے خلاف، ہندوستانیوں کا متحدہ محاذ ٹوٹ گیا
داخلۂ کونسل کا رجحان حکومت سے عدم تعاون کے منافی تھا
ہندو مسلم اختلافات سے ہندوستانیوں کے آپس میں انتشار پیدا ہوا،
انگریزی حکومت کے ہاتھ مضبوط ہو گئے - اس طرح ترکِ تعاون
سول نافرمانی کے زمانہ میں آزادی کی منزل جو قریب نظر آ رہی تھی،
دور جا پڑی ! ذیل میں ان دونوں رجحانات کا مختصراً ذکر کیا جاتا ہے

تحریکِ سول نافرمانی کے بند ہو جانے کے بعد کانگریس کا ا
گروپ داخلۂ کونسل کا حامی ہوگیا - ترکِ تعاون کے زمانہ میں کانگ
نے کونسلوں اور اسمبلیوں کے انتخاب کا بائیکاٹ کیا تھا، لیکن تحر
سول نافرمانی کے بند ہو جانے کے بعد کانگریس کے ایک گروپ میں
انتخابی اداروں میں حصہ لینے کا خیال پیدا ہوا ــــ اس گروپ کی قی
سی، آر، داس اور اور پنڈت موتی لال نہرو کر رہے تھے - اگ
گاندھی جی اور علی برادران جیل ہی میں تھے تاہم یہ گروپ ابھی اتنا ب
نہ ہوا تھا کہ کانگریس کی اکثریت کو اپنا ہمنوا بنا سکتا، اس لیے
کانفرنس میں ناکام ہونے کے بعد سنہ ۱۹۲۲ع کے آخر میں اس نے
علحیدہ جاعت سوراج پارٹی کے نام سے بنا لی تھی، جس کا پروگرام یہ
کہ سنہ ۱۹۲۳ع میں مرکزی اسمبلی اور صوبائی کونسلوں کے لیے
انتخابات ہونے والے تھے ان میں حصہ لیا جائے [1] ستمبر سنہ ۱۹۲۳ع

۱- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈا
پٹابھی ستیارامیا ص ۳۰۴ -

کانگریس نے بھی اپنے خاص اجلاس منعقدہ دہلی میں ایک قرارداد منظور کی جس کے ذریعہ خود اس نے بحیثیت جماعت تو انتخابات میں حصہ لینے سے گریز کیا ، البتہ اپنے اراکین کو اجازت دے دی کہ وہ چاہیں تو ان انتخابات میں حصہ لیں[۲]۔

تحریکِ ترکِ تعاون و سول نافرمانی کے زمانہ میں مسلمانوں کی با اثر جماعت مجلس خلافت تھی ، لیکن خلافتِ ترکیہ کے خاتمہ ، عالمِ اسلام کے دلدوز واقعات اور علی برادران کی گرفتاری کے باعث مجلسِ خلافت کا زور بھی اب ٹوٹ چکا تھا اور خلافتی کارکنوں میں بھی داخلۂ کونسلوں کا رجحان پیدا ہو گیا تھا ، جس کی تائید جمیعۃ العلماء نے بھی کی تھی[۳]۔ الغرض تحریک سول نافرمانی کے بند ہو جانے کے بعد بحثیت مجموعی ملک کے اندر اسمبلیوں اور کونسلوں کے بائیکاٹ کی بجائے ان میں داخل ہونے کا رجحان پیدا ہو گیا تھا ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ع کے آخر میں ، جو انتخابات ہوئے ان میں ہندو اور مسلمان دونوں نے حصہ لیا ۔ سنہ ۱۹۲۴ع میں کانگریسی ہندوؤں کی ایک بڑی تعداد اسمبلیوں اور کونسلوں میں پہنچ گئی خلافت ، جمعیۃ العلما اور مسلم لیگ سے تعلق رکھنے والے مسلمان بھی ان انتخابی اداروں کے رکن بن گئے ۔

اس دور کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں سخت مذہبی اختلافات پیدا ہوئے اور ساتھ ہی ان کے مابین زبردست سیاسی کشمکش رونما ہوئی ــــ تحریکِ ترکِ تعاون اور سول نافرمانی کے زمانہ میں کانگریس اور مجلس خلافت ہندوؤں اور مسلمانوں کی توجہ کا مرکز تھی اور یہ دونوں ادارے باہم اس طرح تعاون کر رہے تھے کہ گویا ایک جان اور دو قالب ہیں ۔ ہندو مسلم قائدین میں اتحاد فکر و نظر

۲۔ ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) ڈاکٹر پتابھی سیتاراما ص ۳۱۶ ۔

۳۔ ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۳۰۲ ۔

کا نیتجہ یہ تھا کہ ہندو مسلم عوام میں بھی کامل اتحادِ عمل پیدا ہو گیا تھا ، مگر تحریک سول نافرمانی کے ختم ہو جانے اور سر برآوردہ و ممتاز کانگریسی و خلافتی (ہند و مسلم) قائدین کے جیلوں میں بند ہو جانے کے بعد ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے ۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکیں ہندوؤں کے لیے تبلیغ و تنظیم کی انجمنیں ، مسلمانوں کے لیے مرکزِ کشش بن گئیں ، ہندو مسلم عوام ، ذبیحہ گاؤ ، مساجد کے سامنے باجہ بجانے ، جلوس لے جانے اور مذہب کی تبدیلی وغیرہ جیسے سوالات پر سر پھٹول کرنے لگے تو ان کے قائدین ، سیاسی اور دستوری مسائل پر ایک دوسرے سے الجھنے لگے ۔ گویا میثاقِ لکھنو اب دریا برد ہو چکا تھا اور ہندو مسام اتحاد ایک سراب ثابت ہوا ۔ ستمبر سنہ ۱۹۲۳ع میں علی برادران اور فروری سنہ ۱۹۲۴ع میں گاندھی جی رہا ہوئے ۔ ان کے علاوہ دیگر سربر آوردہ ہندو مسلم لیڈر جو تحریکِ ترکِ تعاون کے سلسلہ میں گرفتار ہوئے تھے ، اب چھوڑ دیئے گئے ۔ ان لیڈروں نے ہندو مسلم اتحاد کی متعدد کوششیں کیں ، لیکن سب کی سب نا کام ہو گئیں ۔

یہ دونوں رجحانات ـــــ داخلۂ کونسل اور ہندو مسلم اختلاف ، برطانوی حکومت کے لیے بڑے سازگار تھے ۔ داخلۂ کونسل کا مطلب یہ تھا کہ غیر آئینی طریقوں (یعنی ترکِ تعاون ، سول نافرمانی ، ستیہ گرہ وغیرہ) کی بجائے اب ملک کی سیاست کو آئینی و دستوری طریقہ پر چلایا جائے گا ، اور ہندو مسلم اختلاف کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ حکومت کے خلاف جو متحدہ محاذ بن گیا تھا ، وہ ٹوٹ گیا ! اس صورت حال ، خصوصاً ہندو مسلم اختلافات سے آزادی خواہ اور محبِ وطن طبقہ بڑا دل گیر تھا ۔ داخلۂ کونسل کا رجحان ، اس میں شک نہیں کہ حکومت کے لیے بڑا مددگار ثابت ہوا ، لیکن یہ رجحان ملک کے مستقبل کے لیے تباہ کن نہ تھا ، اس سے صرف یہ ظاہر ہوتا تھا کہ ترکِ تعاون ہی حکومت کو جھکانے کا واحد طریقہ نہ تھا بلکہ اس کو اسمبلیوں میں پہنچ کر بھی نیچا دکھایا جا سکتا تھا ۔ مگر ہندو مسلم اختلاف برصغیر ہند کے مستقبل کے لیے خطرناک اور حصولِ آزادی کی راہ میں سنگ گراں تھا ، اس لیے مخلص ، دیانت دار آزادی خواہ افراد ، اس اختلاف کو رفع کرنے کی تدبیریں سوچنے لگے ۔

اس زمانہ میں کانگریس کے غیر متعصب اور سنجیدہ ہندو لیڈروں کو بھی جدا گانہ طریقۂ انتخاب سے شکایت پیدا ہوئی ـــــ ان کا کہنا یہ تھا کہ جداگانہ انتخاب ہی فساد کی جڑ ہے۔ اس کی وجہ سے مسلمان ایسے نمایندے منتخب کرتے ہیں، جو سخت متعصب ہوتے ہیں، اور ہندو ایسے افراد کو چنتے ہیں، جو کٹّر ہندو ہوتے ہیں ـــــ یہ نمایندے اپنے فرقے کی حمایت اور دوسرے فرقہ سے نفرت کرتے ہیں۔ اسمبلیوں میں پہنچ کر خود لڑتے ہیں اور اسمبلیوں سے باہر ہندوؤں اور مسلمانوں کو لڑاتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کے حامی، سنجیدہ اہل فکر کانگریسی ہندوؤں میں نہایت ممتاز مقام سری نواس آئنگر کو حاصل تھا۔ یہ مدراس کے رہنے والے ایک کم متعصب، حوصلہ مند اور کشادہ دل ہندو تھے۔ ترکِ تعاون کے زمانہ میں اپنے خطاب (سی، آئی، ای) اور حکومت مدراس کے بہت بڑے عہدہ (ایڈوکیٹ جنرل) کو انہوں نے تیاگ دیا تھا[۳]۔ اس ایثار و قربانی کے باعث ہندوؤں میں ان کی بڑی عزت تھی اور کانگریس نے ان کو سنہ ۱۹۲۷ع میں اپنا صدر منتخب کیا تھا ـــــ

ہندو مہاسبھا والے تو شروع ہی سے جدا گانہ طریقہ انتخاب کے خلاف تھے، اب جب کہ سری نواس آئنگر جیسے ممتاز اور غیر متعصب ہندو کانگریسیوں نے بھی اس طریقۂ انتخاب کو ہدفِ ملامت بنایا تو کچھ اہلِ فکر اور آزادی کے دلدادہ مسلمان لیڈروں نے بھی ہندوؤں کے اس اعتراض پر سنجیدگی سے غور کرنا شروع کیا۔ آئے دن کے فسادات اور خون ریزی کے باعث ملک کی بگڑتی ہوئی حالت اور انگریزی سامراج کے پنجۂ استبداد کو مضبوط ہوتے دیکھ کر وہ دل گیر تھے، اس لیے انہوں نے اس بات کی کوشش کی کہ مسلمانوں کے حقوق اور سیاسی موقف کا تحفظ کرتے ہوئے کوئی ایسی تدبیر نکالی جائے، جس سے ہندو لیڈروں کا یہ اعتراض بھی رفع ہو جائے اور ہندو مسلمان، انگریزی حکومت کے خلاف پھر ایک مرتبہ متحد ہوکر آزادی کی منزل کو قریب لے آئیں۔ اس زاویۂ

۳۔ ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ: تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۳۰۲۔

نظر کے حامل مسلمان لیڈروں میں نہایت ممتاز مقام قائد اعظم مسٹر محمد علی جناح کو حاصل تھا ۔ گو وہ عدم تعاون کے حامی نہ تھے ، لیکن وہ انگریزی حکومت کے بھی خواہ کبھی نہیں رہے ۔ وہ آزادی کے اتنے ہی دلدادہ تھے ، جتنا کہ کوئی عدم تعاونی (Non-Cooperator) ہو سکتا تھا ! ان کا بنیادی سیاسی عقیدہ تھا کہ آزادی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی ، اس لیے جب سنہ ۱۹۱۶ع میں میثاق لکھنو کے ذریعہ انہوں نے ہندو مسلم اتحاد کی بنیاد رکھی تھی تو بجا طور پر انہیں ہندو مسلم اتحاد کے سفیر کا لقب دیا گیا تھا[۵]۔ اب جب کہ ملک میں ہندو مسلم منافرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا ، ان کا دل خون کے آنسو رو رہا تھا ، وہ ایسے حل کی تلاش میں تھے ، جو میثاقِ لکھنو کی یاد تازہ کر دے !

حسنِ اتفاق سے سنہ ۱۹۲۷ع میں مسٹر جناح مسلم لیگ کے صدر تھے اور آئنگر کانگریس کے ۔ سنہ ۱۹۱۶ع میں بھی جناح نے لیگ کے صدر کی حیثیت سے کانگریس کے ۔ صدر امبیکا چرن موز مدار[۶] سے لکھنؤ کا معاہدہ طے کیا تھا ۔ اب بھی ایک ایسا ہی موقع آ گیا تھا ۔ صدر مسلم لیگ جناح صدر کانگریس آئنگر دونوں وسیع النظر اور غیر متعصب سیاست داں تھے ، ہندو مسلم اتحاد کے دونوں حامی تھے ، اس پر مستزاد یہ کہ دونوں مرکزی اسمبلی کے رکن تھے اور اس حیثیت سے باہم ملتے جلتے اور ملک کی بگڑتی ہوئی حالت پر تبادلۂ خیالات کرتے رہتے تھے ۔ اس تبادلۂ خیال کا نتیجہ یہ نکلا کہ مسٹر جناح نے ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ع کو دہلی میں مسلم لیڈروں کا ایک جلسہ طلب کیا ۔ اس جلسہ میں تیس سربرآوردہ اور چوٹی کے مسلم لیڈروں نے شرکت کی ، جن میں مولانا محمد علی جوہر ، راجہ صاحب محمود آباد ، سر محمد شفیع ، ڈاکٹر انصاری ، سر محمد یعقوب ،

۵- یہ لقب کانگریس کی مشہور خاتون لیڈر مسز سروجنی نائیڈو نے دیا تھا ۔

۶- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ "کانگریس کی تواریخ") از ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ص ۲۰۹ و سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ، ص ۱۱۹ ۔

نواب اسماعیل خاں ، سر عبدالرحیم اور صاحبزادہ عبدالقیوم سر فہرست تھے۔ اس جلسہ کی صدارت خود مسٹر جناح نے کی ۔ ان لیڈروں نے ملک کی بگڑتی ہوئی سیاسی صورت حال ، ہندو مسلم کشمکش بالخصوص جداگانہ انتخاب سے متعلق آلنگر جیسے غیر متعصب سنجیدہ ہندو لیڈروں کے اعتراضات پر غور و خوض کرنے کے بعد حسب ذیل تجاویز منظور کیں :۔

(۱) سندھ کو بمبئی سے علیحدہ ایک صوبہ قرار دیا جائے۔

(۲) صوبہ سرحد اور باوچستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہو ۔

(۳) پنجاب و بنگال کی مقننہ میں مسلم اکثریت بحال کی جائے ۔

(۴) مرکزی اسمبلی میں مسلمان نمائندوں کی تعداد ، جملہ نمائندوں کے تناسب سے ایک تہائی ہو ۔

(۵) اگر مندرجہ بالا تجاویز کو ملک میں عام طور پر قبول کر لیا جائے تو مسلمان نشستوں کے تحفظ کے ساتھ مخلوط طریقہ انتخاب کو قبول کر لیں گے اور جداگانہ حق انتخاب سے دستبردار ہو جائیں گے ۔

ان تجاویز کو "تجاویز دہلی" کہا جاتا ہے ۔ ان تجاویز کے علاوہ مزید یہ بھی کہا گیا تھا کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں ، جو پاسنگ مسلم اقلیت کو دیا جائے گا وہی پاسنگ سندھ ، صوبہ سرحد اور بلوچستان میں ہندو اقلیت کو دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اس امر کی بھی وضاحت کر دی گئی تھی کہ یہ تجاویز علیحدہ علیحدہ اجزا پر مشتمل نہیں ہیں ، بلکہ ایک دوسرے سے مربوط اور غیر منفک ہیں یعنی یہ کہ مسلمان جداگانہ انتخاب سے اسی صورت میں دستبردار ہو سکتے ہیں جبکہ ان تمام تجاویز کو کلی طور پر بیک وقت قبول کر لیا جائے ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ بعض تجاویز کو قبول کر لیا جائے اور بعض کو رد کر دیا جائے ۔ اگر ان میں سے بعض کو قبول کر لیا گیا اور بعض کو رد کر دیا گیا تو پھر مسلمان جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہیں ہوں گے ۔

یہ تجاویز جس نقطہ نظر سے مرتب کی گئی تھیں ان کا اظہار مسٹر جناح نے اپنے ایک بیان مورخہ ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۲۷ع میں اس طرح کیا :

" جہاں تک طریقِ انتخاب کا تعلق ہے وہ بجائے خود مقصود بالذات نہیں ہے - انتخاب جداگانہ رہے تو کیا اور مخلوط ہو تو کیا - مقصد صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کو اپنے قومی حقوق اور اپنی قومی ہستی کے تحفظ و بقا کا پورا یقین ہو جانا چاہئے اور انہیں اس امر کا اطمینان ہو جائے کہ اکثریت محض اپنی تعداد کے بل بوتے پر ان کے حقوق پامال نہیں کر سکے گی اور اس بات کا بھی یقین ہو جائے کہ ہندوستان میں مکمل ذمہ دارانہ قومی حکومت قائم ہونے تک کا جو درمیانی وقفہ ہے اس میں وہ اکثریت کے جورواستبداد سے بالکل محفوظ رہیں گے ، اس لیے اس سارے قضیئے کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ اقلیتوں کو ان کے تحفظ و بقا کا کیوں کر اطمینان دلایا جائے - مذکورہ بالا تجاویز مرتب کرتے وقت یہی نکتہ ہمارے پیش نظر تھا[۷] "

اور ان تجاویز کے پیچھے ، جو فلسفۂ سیاست کار فرما تھا ، اس کو ان تجاویز کے بڑے سر گرم حامی ، جنگِ آزادی کے پر جوش مجاہد اور ملت کے غمخوار ، رئیس الاحرار ، مولانا محمد علی جوہر نے اس طرح بیان کیا -

" اگر ہندو چاہتے ہیں کہ ہماری چھوٹی سی اقلیت چند بڑے بڑے صوبوں میں ان کی بڑی اکثریت کے رحم پر چھوڑ دی جائے تو وہ بھی اس پر راضی ہو جائیں کہ دو بڑے بڑے صوبوں میں ان کی بڑی اقلیت بھی ہماری چھوٹی سی اکثریت کے اور تین چھوٹے چھوٹے سے صوبوں میں ان کی چھوٹی سی اقلیت ہماری بڑی اکثریت کے رحم پر چھوڑ دی جائے ، اگر ان کی اکثریت ہماری اقلیت کے ساتھ انصاف اور روا داری کا برتاؤ کرے گی تو ہماری اکثریت بھی ان کی اقلیت کے ساتھ روا داری کا برتاؤ کرے گی[۸] "

۷- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ع ص ۲۰۸ -

۸- روزنامہ ہمدرد مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۲۷ع -

یہ گویا دستوری زبان میں تحفظ و توازن (checks and balances) کا سیاسی فلسفہ تھا ۔ بالفاظ دیگر ان تجاویز کے مرتبین کا کہنا یہ تھا کہ ہندو اگر سات صوبوں میں اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں ہیں تو پانچ صوبوں میں مسلمان اکثریت میں ہندو اقلیت میں ہوں گے ۔ اس طرح دونوں قوموں کے مابین ایک قسم کا توازنِ قوت پیدا ہو جائے گا اور وہ ایک دوسرے پر زیادتی نہ کر سکیں گی ۔ واضح رہے کہ اس زمانہ میں صوبۂ سرحد اور بلوچستان میں سیاسی اصلاحات نافذ نہیں کی گئی تھیں ، سندھ صوبۂ بمبئی کا ایک علاقہ تھا ، علیحدہ صوبہ نہ تھا ۔ مسلمانوں کے صرف دو صوبے پنجاب اور بنگال تھے جہاں مقننہ بھی تھی اور اس کے لیے انتخابات بھی ہوتے تھے، مگر ان مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کی اکثریت برائے نام تھی کیونکہ یہاں مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات (قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ع) کی رو سے انہیں اپنی آبادی کے تناسب سے کم نمائندگی دی گئی تھی ۔ اب ان تجاویز کے ذریعہ یہ مسلم قائدین صرف دو کے بجائے پانچ مسلم اکثریت کے صوبے قائم کرنا چاہتے تھے تاکہ سات ہندو اکثریت کے صوبوں کے ساتھ توازن قائم ہو جائے ۔

غرض کہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ع کو تیس ممتاز اور مقتدر مسلم لیڈروں نے تجاویز دہلی کو منظور کر لیا ۔ ان رہنماؤں میں سر محمد شفیع بھی شامل تھے ، جو پنجاب صوبائی مسلم لیگ صدر تھے اور مسلم سیاست میں نمایاں مقام رکھتے تھے ۔ انھوں نے تجاویز دہلی کی منظوری کے تقریباً ڈیڑھ ماہ بعد صوبائی مسلم لیگ کا ایک اجلاس لاہور میں طلب کیا ، جس میں تجاویزِ دہلی کی بنیاد پر مخلوط انتخاب کو قبول کرنے اور جداگانہ انتخاب کو رد کرنے کی سخت مخالفت کی گئی ۔ دہلی کے جلسہ میں شریک ہونے والے دوسرے مسلم رہنماؤں پر اس مخالفت کا کوئی اثر نہ ہوا اور مسٹر جناح نے یہ تجاویز ہندو مہاسبھا اور کانگریس کو روانہ کر دیں ۔

وسط مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں کانگریس کی مجلس عاملہ کا جلسہ بمقام بمبئی زیرِ صدارت سری نواس آئنگر منعقد ہوا ۔ اس جلسہ میں " جب تجاویز دہلی پیش ہوئیں تو جس شخص نے ان کے منظور کرانے میں سب سے زیادہ حصہ

لیا ، وہ پنڈت موتی لال نہرو تھے[9] - " تجاویز دہلی " کی منظوری کے
کانگریس کی مجلس عاملہ نے یہ قرارداد بھی پاس کر دی کہ مجالس عا
صوبوں کی مجالس قانون ساز کے منتخبہ اراکین ، اور دیگر سیاسی جما
کے رہنماؤں سے مشورہ کرکے ہندوستان کے لیے ایک دستور اساسی م
کرے ، اور یہ بھی طے کیا کہ اس غرض کے لیے ایک آل پارٹیز کان
منعقد کی جائے - پھر تجاویز دہلی کو آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے ا
بمبئی میں ، جو اسی مہینہ یعنی مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں منعقد ہوا تھا
پنڈت موتی لال نہرو نے پیش کیا اور ان کی پر زور حمایت کی اور یہ
اس اجلاس میں بھی منظور کر لی گئیں[10] - دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع
کانگریس کا سالانہ اجلاس ڈاکٹر انصاری کی صدارت میں منعقد ہوا
اجلاسِ عام میں بھی تجاویز دہلی پیش کی گئیں - پنڈت مدن موہن
نے ان کی تائید کی اور یہ تجاویز منظور کر لی گئیں[11] -

دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس
والا تھا ، لیکن اب لیگ دو گروہوں میں بٹ چکی تھی ، ایک گروہ
دہلی کا حامی تھا ، جس کی سربراہی مسٹر جناح کر رہے تھے اور
گروہ ان تجاویز کا مخالف تھا ، اس کے رہنما سر محمد شفیع تھے - جناح
چاہتا تھا کہ لیگ کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں ہو ، تاکہ تجاویز دہ
وہاں باآسانی منظور کرایا جا سکے ، اور شفیع گروپ کا اس کے برعـ
خیال کیا تھا کہ اجلاس لاہور میں ہو ، تاکہ پنجاب کی مخالفانہ فضـ
تجاویز رد کی جا سکیں - اس طرح ایک بدنما صورت حال پیدا ہو گئی
ان حالات میں جناح گروپ نے مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس دسمـ
۱۹۲۷ع میں بمقام کلکتہ زیر صدارت سر محمد یعقوب منعقد کیا ،

۹- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع -
۱۰- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع و ہسٹری آ
کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیـ
ص ۵۳۱ -
۱۱- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۴ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع -

تجاویز دہلی پر مہرِ توثیق ثبت کر دی گئی ۔ اسی اجلاس میں یہ بھی طے ہوا کہ کانگریس کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس میں لیگ کے نمائندے بھیجے جائیں تاکہ ہندوستان کا ایک متفقہ دستور اساسی مرتب ہو سکے ۔ شفیع گروپ نے بھی کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس زیر صدارت سر محمد شفیع دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع ہی میں بمقام لاہور منعقد کیا ۔ اس میں تجاویز دہلی کی مخالفت کی گئی اور جدا گانہ طریقہ انتخاب کو برقرار رکھنے کا مطالبہ کیا گیا[۱۲] ۔

اِدھر کانگریس اور مسلم لیگ میں یہ ہو رہا تھا اور اُدھر نومبر سنہ ۱۹۲۷ع میں برطانوی حکومت نے مزید دستوری اصلاحات کے متعلق سفارشات پیش کرنے کی غرض سے ایک کمیشن سر جان سائمن کی صدارت میں مقرر کر دیا ۔ اس کمیشن میں کوئی ہندوستانی نہیں لیا گیا تھا ، اور اس کے سب اراکین انگریز ہی تھے ۔ کمیشن کی اس طرح تشکیل کو ہندوستانیوں کی ذہانت و صلاحیت کی اہانت کے مترادف سمجھا گیا اور ملک میں تحریک شروع ہوئی کہ جب یہ کمیشن ہندوستان آئے تو اس کے خلاف مظاہرے کئے جائیں اور اس کا مکمل مقاطعہ کیا جائے ۔ کانگریس مقاطعہ کی اس تحریک میں پیش پیش تھی ، جناح لیگ کا بھی یہی خیال تھا کہ کمیشن کا بائیکاٹ کیا جائے ، لیکن شفیع لیگ مظاہروں کے خلاف تھی اور مقاطعہ کے بجائے کمیشن سے مکمل تعاون کرنا چاہتی تھی[۱۳] ۔ بہرحال فروری سنہ ۱۹۲۸ع میں سائمن کمیشن ہندوستان آیا ، اور ملک میں عام طور پر اس کا بائیکاٹ کیا گیا ۔

ایک طرف یہ کمیشن مصروفِ کار تھا اور دوسری طرف فروری و مارچ سنہ ۱۹۲۸ع میں کانگریس کی طلب کردہ آل پارٹیز کانفرنس دہلی میں منعقد ہوئی ۔ اس میں مختلف جماعتوں ، مثلاً ہندو مہا سبھا ، جمیعۃ العلما ، مسلم لیگ ، نیشنل لبرل فیڈریشن ، سکھ لیگ وغیرہ کے نمائندے شریک

۱۲- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۲۱۴ -

۱۳- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع -

ہوئے[۱۴] - اس کانفرنس کو اصل میں یہ مسئلہ طے کرنا تھا کہ ہندوستان کے آئندہ دستور میں فرقہ وارانہ تناسب اور تعلقات کی نوعیت کیا ہو - دو ماہ میں پچیس اجلاس ہوئے مگر کوئی بات طے نہ ہو سکی اور کانفرنس ملتوی کر دی گئی - البتہ دو کمیٹیاں بنا دی گئیں - ایک کمیٹی کو سندھ کی علیحدگی سے متعلق اور دوسری کو نمائندگی کے تناسب کو طے کرنے سے متعلق رپورٹ پیش کرنی تھی - ملتوی شدہ آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس ۱۹ مئی سنہ ۱۹۲۸ع کو پھر ہوا - لیکن اس اجلاس میں بھی سب کمیٹیوں کی رپورٹیں پیش نہ ہو سکیں - عام سیاسی فضا اتنی تلخ تھی کہ اس اجلاس میں سوائے گاندھی جی ، موتی لال نہرو ، ڈاکٹر انصاری ، مولانا شوکت علی اور اینی بیسنٹ کے کوئی اور شریک ہی نہیں ہوا - مسلم لیگ ، ہندو مہاسبھا اور دوسری جاعتوں کے نمائندے سب غائب تھے - واضح رہے کہ اس دوران ہندو مہاسبھا نے تجاویز دہلی کی سخت مخالفت کی تھی - اب آل پارٹیز کانفرنس کے اس اجلاس کو ملتوی کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا ، لیکن اس طرح بار بار کے التوا سے عام مایوسی پھیلنے کا خطرہ تھا ، اس لیے یہ طے پایا کہ ایک کمیٹی موتی لال نہرو کی صدارت میں بنا دی جائے ، جو ہندوستان کے دستور اساسی کے اصولوں کا خاکہ مرتب کرے - اس کمیٹی کو نہرو کمیٹی کہا جاتا ہے - یہ کمیٹی دراصل لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کے چیلنج کے جواب میں بنائی گئی تھی - سائمن کمیشن کے مقاطعہ کی جب تحریک شروع ہوئی اور اس کمیشن کی تشکیل پر تنقید کی جانے لگی تو وزیر ہند نے یہ چیلنج دیا تھا کہ " برطانوی حکومت کے خلاف تخریبی تنقید کرنے کے بجائے ہندوستانی خود کوئی متحدہ دستوری اسکیم تیار کرکے دکھائیں "

غرض کہ ۱۹ مئی سنہ ۱۹۲۸ع کو آل پارٹیز کانفرنس کا جو اجلاس منعقد ہوا تھا ، اس میں نہرو کمیٹی تشکیل دی گئی ، صدر پنڈت موتی لال نہرو کے علاوہ اس کمیٹی کے ارکان یہ تھے (۱) ایم - ایس اینے (۲) جی - آر پردھان (۳) ایم - آر جیکر (۴) سرسپرو (۵) سردار منگل سنگھ (۶) ایم - این

۱۴- روزنامہ ہمدرد مورخہ ۱۶ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع

جوشی (۷) سر علی امام (۸) شعیب قریشی - ظاہر ہے اس کمیٹی میں مسلمان صرف دو ہی تھے - اس کمیٹی نے جو رپورٹ پیش کی اس کو نہرو رپورٹ کہا جاتا ہے - ہندوستان کی سیاسی تاریخ پر اس رپورٹ نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور دستوری نقطۂ نظر سے یہ ایک اہم دستاویز ہے - یہاں ہم اس رپورٹ کی اہم سفارشات کا خلاصہ درج کرتے ہیں -

(۱) اس رپورٹ میں ہندوستان کا سیاسی نصب العین مکمل آزادی کے بجائے درجۂ نو آبادیات قرار دیا گیا تھا -

(۲) وفاقی طرز حکومت کے بجائے وحدانی حکومت (unitary government) کا ڈول ڈالا گیا تھا - اہم اور تقریباً سب کے سب اختیارات صوبوں سے چھین کر مرکز کو دے دئے گئے تھے -

(۳) سندھ کی علیحدگی کا اس صورت میں مشورہ دیا گیا تھا ، جب کہ وہ مالی حیثیت سے خود کفیل ہو -

(۴) جداگانہ انتخاب کی شدت سے مخالفت کی گئی تھی اور صوبوں میں مخلوط انتخاب بلا تعین نشست کی سفارش کی گئی تھی - مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کا ایک تہائی کا مطالبہ رد کر دیا گیا تھا اور انھیں صرف تناسب آبادی کے لحاظ سے نشستوں کے تحفظ کا حق دیا گیا تھا ، مگر یہ حق بھی صرف دس سال کے لیے تھا -

(۵) دستور میں بنیادی حقوق کی صراحت پر کافی زور دیا گیا تھا اور اسی کو ہر فرقہ کے تحفظ کی ضمانت سمجھا گیا تھا -

پنڈت موتی لال نہرو کی شہرت یہ تھی کہ وہ نہایت ہی وسیع القلب اور وسیع المشرب انسان ہیں ، تعصب تو ان کو چھو کر بھی نہیں گیا ہے - مذہبی معاملات میں بھی وہ ہندو دھرم کے پابند نہیں تھے اور فرقہ وارانہ معاملات میں بھی وہ ہندوؤں کی پروا نہیں کرتے تھے ، بلکہ وقتاً فوقتاً انھیں ڈراتے دھمکاتے رہتے تھے - اصولی مسائل میں وہ اپنی رائے پر جمے رہتے تھے اور ہندوؤں کے ساتھ کوئی رو رعایت نہیں برتتے تھے ، بلکہ بسا اوقات اپنی مقبولیت کو بھی خطرہ میں ڈال دیتے تھے - پھر یہ موتی لال نہرو وہی تھے

جنھوں نے تجاویز دہلی کی کھلے دل سے حمایت کی تھی ، کانگریس کی مجلس عاملہ (منعقدہ مئی سنہ ۱۹۲۷ع بمقام بمبئی) میں انھیں پیش کیا تھا اور بمبئی ہی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی سے بھی انھی نے ان تجاویز کو منظور کروایا تھا اور ان کی تائید میں مدلل تقریر فرمائی تھی ، لیکن اب جب کہ ہندوستان کے دستور کا خاکہ تیار کرنے کا کام ان کے سپرد ہوا تو انھوں نے اپنی وسعتِ قلب و نظر کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ان تجاویز کو بالائے طاق رکھ دیا ! جداگانہ طریقہ انتخاب اور نشستوں کے تعین کو القط قرار دے کر وحدانی طرز حکومت کی نیو رکھ دی ! ! وحدانی حکومت کی صرف ایک سفارش ہی تجاویزِ دہلی پر ہی نہیں بلکہ مسلمانوں کی تمام خواہشات پر پانی پھیر دینے اور ان کے سیاسی مستقبل پر سیاہی مل دینے کے لیے کافی تھی - تجاویزِ دہلی کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ پانچ مسلم صوبے اور سات ہندو صوبے ہوں گے - پھر ان صوبوں کو اہم اختیارات حاصل ہوں گے اور یہ اپنے داخلی معاملات میں بالکلیہ خود مختار ہوں گے اسی طرح یہ پانچ خود مختار اور اہم اختیارات کے حامل مسلم صوبے سات ہندو صوبوں کے مقابلہ میں توازن پیدا کرنے کا موجب بنیں گے اور یوں جداگانہ طریقہ انتخاب کو درمیان سے ہٹانے کے بعد بھی ہندو مسلم گتھی سلجھائی جا سکے گی - گویا توازنِ قوت ہی برصغیر ہند کے کٹھن سیاسی مسئلہ کا حل تھا ، لیکن نہرو رپورٹ نے وحدانی حکومت کی سفارش کرکے سرے سے اسی توازنِ قوت کو درہم برہم کر دیا تھا ! سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کو مشروط قرار دیا گیا تھا - پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت کو برقرار رکھنے کی کوئی ضمانت نہیں دی گئی تھی اور صوبہ سرحد و بلوچستان کے لیے سیاسی اصلاحات کا ذکر تک نہ تھا - تاہم اگر سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا بھی دیا جاتا ، پنجاب اور بنگال میں مسلم اکثریت بھی دے دی جاتی اور صوبہ سرحد و بلوچستان میں سیاسی اصلاحات نافذ بھی کر دی جاتیں تو بھی وحدانی طرزِ حکومت میں ان مسلم صوبوں کا کیا مقام ہوتا ؟ وہ خود مختار اکائیاں (autonomous units) نہ ہوتے بلکہ صرف انتظامی علاقے (administrative territories) ہوتے - ہندو مرکز اصل ہوتا اور یہ مسلم صوبے اس کے کل پرزے - اس طرح بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے صرف ایک سیاسی اصطلاح " وحدانی طرز حکومت" کے ذریعہ

تجاویز دہلی کی روح کو سلب کر لیا گیا تھا ! ! — اور اس کے بدلے میں "بنیادی حقوق" کو نہرو رپورٹ کی سنہری کشتی میں سجا کر بطور ارمغان مسلمانوں کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا ! یہ کس قدر خوبصورت پیش کش ، اس غیر متعصب ، وسیع المشرب پنڈت موتی لال نہرو کی تھی ، جس کا رہن سہن مسلمانوں جیسا تھا اور جس نے بڑی فراخ دلی سے تجاویز دہلی کا خیر مقدم کیا تھا - یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ نہرو کمیٹی میں مسلمانوں کے صرف دو نمائندے (۱) شعیب قریشی اور (۲) سر علی امام تھے - سر علی امام نے اس کے صرف ایک ہی اجلاس میں شرکت کی تھی ، البتہ شعیب قریشی اس کے ہر اجلاس میں شریک ہوتے رہے اور بالآخر جب رپورٹ مرتب ہوئی تو انہوں نے اس سے شدید اختلاف کیا اور اپنے اس اختلاف کا علی الاعلان اظہار بھی کر دیا ، ہاں سر علی امام اس رپورٹ کے مؤید رہے -

بہرکیف جب اگست سنہ ۱۹۲۸ء میں رپورٹ تیار ہو گئی تو موتی لال جی نے آل پارٹیز کانفرنس کا اجلاس طلب کیا کیونکہ اسی کانفرنس نے نہرو کمیٹی کو دستور کا خاکہ مرتب کرنے کے لیے مقرر کیا تھا اور اب سی رپورٹ یا دستوری خاکہ کو بغرض منظوری اسی آل پارٹیز کانفرنس یں پیش ہونا تھا - چنانچہ یہ کانفرنس ۳۰/۲۹/۲۸ اگست کو بمقام لکھنؤ یر صدارت ڈاکٹر انصاری منعقد ہوئی - مسلم لیگ کی اس میں کوئی نمائندگی ہ تھی - شفیع لیگ تو شروع ہی سے اس کے خلاف تھی لہٰذا اس کی نمائندگی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا - مسٹر جناح اس وقت لندن میں تھے اس لیے یگ کی طرف سے بھی کوئی شریک نہ ہوا - مولانا محمد علی جوہر بغرضِ علاج ورپ گئے ہوئے تھے ، البتہ مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی س کانفرنس میں شریک ہوئے اور ان دونوں نے اِس کی سخت مخالفت کی یکن وہاں ان کی سنتا کون ؟ رپورٹ منظور کر لی گئی البتہ یہ شرط لگائی ئی کہ اس رپورٹ کو دوبارہ ایک آل پارٹیز کنونشن میں پیش کر کے خری منظوری لے لی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی طے پایا کہ یہ آل پارٹیز کنونشن کلکتہ میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کے ساتھ ہی ہو اور صدرِ انگریس ہی اس کنونشن کو طلب کریں -

ہندو سہاسبھا نے نہرو رپورٹ کی مکمل تائید کا اعلان کر دیا تھا ، مگر ساتھ ہی یہ الٹی میٹم بھی دیا تھا کہ اگر اس میں کسی شوشے یا کامے (comma) کی تبدیلی کی گئی تو سہاسبھا اس رپورٹ کے پرخچے اُڑا دے گی[۱۵]! گاندھی جی آل پارٹیز کانفرنس (منعقد ۲۸/۲۹/۳۰ اگست سنہ ۱۹۲۸ء) میں شریک نہیں ہوئے لیکن بعد میں انھوں نے اس رپورٹ کی پُر زور حمایت کی اور موتی لال جی کو اشیرباد دی !

اب اعلان کر دیا گیا کہ آل انڈیا کانگریس کا سالانہ اجلاس دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں بمقام کلکتہ منعقد ہوگا اور ساتھ ہی پنڈت موتی لال نہرو کو کانگریس کا صدر منتخب کر لیا گیا ۔ مہاتما جی کی اشیرباد کے بعد صدارت کا تاج انھیں کے فرق مبارک پر رکھا جاتا ہے ! ! یہی ان کی سنہری خدمت ـــــ ہندوستان کے میگنا کارٹا (Magna Carta) ـــــ نہرو رپورٹ کی تیاری کا انعام ، اعزاز و اکرام تھا ! ! !

آل انڈیا کانگریس کے اجلاس کے ساتھ ہی صدر کانگریس نے آل پارٹیز کنونشن کا اجلاس کلکتہ ہی میں بتاریخ ۲۲ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء طلب کر لیا ، جس میں نہرو رپورٹ پر آخری مہر توثیق ثبت کرنی تھی ۔ اس کنونشن میں شرکت کا دعوت نامہ تمام جماعتوں کو دیا گیا ۔ اب مسٹر جناح اور مولانا محمد علی یورپ سے واپس آ گئے تھے ۔ مسٹر جناح نے مسلم لیگ کا اور مولانا محمد علی جوہر نے مجلسِ خلافت کا اجلاس بھی دسمبر ہی میں کلکتہ ہی میں طلب کر لیا ۔ گویا دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز بنا ہوا تھا ۔

مسلم لیگ نے آل پارٹیز کنونشن میں اپنے نقطہ نظر کی ترجمانی کرنے کے لیے تیس افراد پر مشتمل ایک کمیٹی مقرر کی ، جس کے سربراہ مسٹر جناح تھے اور مجلس خلافت و جمیعتہ العلماء ہند نے مولانا محمد علی جوہر کو اپنا نمائندہ مقرر کیا تھا ۔ مسٹر جناح اور مولانا محمد علی جوہر کی رائے یہ تھی کہ نہرو رپورٹ کو مناسب ترمیمات کے بعد قبول کر لینا چاہئے ۔

۱۵- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۲۳۲

لیگ کی کمیٹی نے پہلے تو آل پارٹیز کنونشن کی سب کمیٹی سے ان ترمیمات پر گفتگو کی لیکن یہ گفتگو ناکام رہی ، اس کے باوجود مسلم لیگ کے وفد نے بسرکردگیِ مسٹر جناح اور مولانا محمد علی جوہر بحیثیت سابق صدر کانگریس و نمائندہ مجلس خلافت کنونشن کے کھلے اجلاس میں شرکت کی ۔ مولانا محمد علی جوہر نہرو رپورٹ کی نوآبادیاتی درجہ (Dominion Status) والی تجویز کے سخت مخالف تھے ۔ انھوں نے اپنی تقریر میں ابھی اس تجویز کو ہدفِ ملامت بنایا تھا کہ اجلاس میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور یہ تجویز منظور کر لی گئی ۔ مولانا سخت برہمی کے عالم میں کنونشن سے اٹھ کر چلے گئے ۔ مسلم لیگی وفد کی ترجمانی کے فرائض مسٹر جناح نے انجام دیئے ، انھوں نے کنونشن میں نہایت دل سوز تقریر کی ، انھوں نے کہا :

> "جب ایک قوم آزادی کی جدوجہد میں مصروف ہو اور فرزندانِ وطن حصولِ آزادی کے لیے بدیسی حکومت کے خلاف مصروفِ پیکار ہوں تو اس وقت آپ کو لامحالہ اقلیتوں کا مسئلہ طے کرنا پڑیگا ۔ آپ جس نوع کا دستورِ اساسی چاہیں وضع کر لیں ، جب تک اقلیتیں یہ محسوس نہیں کریں گی کہ ان کے حقوق محفوظ ہیں اس وقت تک وہ اس دستور کی حمایت کرنے میں ہمیشہ تامل سے کام لیں گی ، . . . .
>
> اگر اقلیتوں کا یہ مسئلہ آپ نے آج حل نہ کیا تو لازماً کل کو حل کرنا پڑے گا ، . . . . ،
>
> ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد اور متفق دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی آرزو ہے اور میں پورے یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کی ترقی ناممکن ہے ، اس لیے ہندو مسلم اتحاد کی تعمیر کے راستے میں کسی خیالی منطق ، کسی فلسفہ اور کسی کشمکش کو حائل نہ ہونے دیجئے[۱۶] "

پھر انھوں نے نہرو رپورٹ میں مسلم لیگ کی طرف سے حسب ذیل تین ترمیمات پیش کیں ۔

۱۶- انڈین اینول رجسٹر سنہ ۱۹۲۸ء جلد اول ۔

(۱) مابقی اختیارات صوبوں کو دے دئے جائیں -

(۲) مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کے لیے کم از کم ایک تہائی ⅓ نشستیں مختص کر دی جائیں -

(۳) پنجاب و بنگال میں حق رائے دہی بالغان کی بنیاد پر صوبائی مجالس قانون ساز کے انتخابات ہوں - اگر ایسا ممکن نہ ہو سکے تو ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں مسلمانوں کی نشستیں ان کی آبادی کے تناسب سے محفوظ کر دی جائیں -

یہ ایک بہت بڑا فراخدلانہ قدم تھا ، جو مسٹر جناح نے ہندوستان کی دستوری گتھی کو سلجھانے اور ہندو مسلم اتحاد کو مستحکم بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے اٹھایا تھا - پہلی ترمیم کا مقصد یہ تھا کہ صوبوں کے معاملات میں مرکز ، (جہاں ہندوؤں کو اپنی عددی اکثریت کے بل پر بالادستی حاصل ہوتی) کم سے کم مداخلت کرے اور اس طرح مسلم اکثریت اور ہندو اکثریت کے صوبوں میں ایک قسم کا توازن پیدا ہو جائے - یہی تجاویز دہلی کا منشا تھا - جسے نہرو رپورٹ نے وحدانی حکومت کی سفارش کے ذریعہ سبو تاج کر دیا تھا - دوسری ترمیم مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کے لیے ایک تہائی نشستیں مختص کر دینے سے متعلق تھی - تجاویز دہلی میں بھی یہ مطالبہ واضح طور پر پیش کیا گیا تھا اور اسے پنڈت موتی لال نہرو نے خود کانگریس کمیٹی منعقدہ بمبئی (مئی سنہ ۱۹۲۷ع) میں اس دلیل کے ساتھ منظور کروایا تھا کہ -

” اگر ہر صوبے سے اسمبلی کے لیے بھی اسی تناسب سے مسلمان منتخب کیے جائیں گے ، جس تناسب سے ان کے لیے صوبہ جات کی کونسلوں میں نشستیں مخصوص ہیں تو یقیناً ایک ثُلث نشستیں مسلمانوں کو مل جائیں گی[۱۷] “

مسٹر جناح کی تیسری ترمیم پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت کو برقرار رکھنے سے متعلق تھی - یہ ترمیم بھی تجاویز دہلی ہی میں شامل

۱۷- روزنامہ ہمدرد مورخہ ۱۲ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع -

تھی ، اور اس کو بھی پنڈت موتی لال نہرو جی ، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس بمبئی (منعقدہ مئی سنہ ۱۹۲۷ع) میں نہ صرف تسلیم کر چکے تھے ، بلکہ اس کی وکالت بھی فرما چکے تھے ۔ یہ ترمیم نہایت معقول تھی ۔ آبادی کے لحاظ سے پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی واضح اکثریت تھی اور اسی لحاظ سے مجالس قانون ساز میں ان کی نمائندگی ہونی چاہئے تھی ، لیکن چونکہ وہ تعلیم اور دولت میں ہندوؤں سے پیچھے تھے اس لیے فہرست رائے دہندگان میں ان کی یہ اکثریت نہیں جھلکتی تھی اور اسی لیے اندیشہ تھا کہ مجالس قانون ساز میں انہیں اتنی نشستیں نہ مل سکیں گی ، جتنی کہ اپنی آبادی کے لحاظ سے ان کو ملنی چاہئے تھیں ، اسی لیے مسٹر جناح نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ پنجاب و بنگال کی مجالس قانون ساز (صوبائی اسمبلیوں) کے انتخاب حق رائے دہی بالغان (adult franchise) کی بنیاد پر ہوں تاکہ آبادی میں مسلمانوں کا جو تناسب ہے اسی لحاظ سے مقننہ میں بھی انھیں نشستیں مل جائیں ، اور اگر حق رائے دہی بالغان نہ دیا جائے تو پھر ان دونوں صوبوں کی اسمبلیوں میں آئینی طور پر آبادی کے تناسب سے نشستیں محفوظ کر دی جائیں ۔ اس طرح مسٹر جناح نے اس ترمیم کے ذریعہ مسلمانان بنگال و پنجاب کے لیے کسی رو رعایت کا نہیں بلکہ انصاف کا مطالبہ کیا تھا ۔

الغرض مسٹر جناح کی یہ تینوں ترمیمات ، معقول اور منصفانہ تھیں ، اور یہ نئی اور انوکھی بھی نہ تھیں بلکہ تجاویز دہلی کی اسپرٹ کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھیں ، اور بڑی بات یہ کہ ان کو تجاویز دہلی کی شکل میں خود موجودہ صدر کانگریس نے مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں ، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کے اجلاس میں نہ صرف تسلیم کیا تھا بلکہ پیش بھی کیا تھا اور ان کی وکالت بھی کی تھی ! !

حقیقت یہ ہے کہ مسٹر جناح کی یہ ترمیمات ، ترمیمات نہ تھیں بلکہ مسلمانوں کی طرف سے یہ ایک فراخدلانہ پیش کش تھی ! مگر کنونشن میں کیا ہوا ؟ یہ فراخدلانہ پیش کش حقارت کے ساتھ ٹھکرا دی گئی اور نہرو رپورٹ بغیر کسی ترمیم و تبدیلی کے من و عن منظور کر لی گئی ! یعنی وہی ہوا ، جو ہندو مہاسبھا چاہتی تھی ! ! پھر یہ رپورٹ آل انڈیا کانگریس

کمیٹی کے سالانہ اجلاس کلکتہ منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع میں پیش کی گئی ۔ اس اجلاس کی صدارت موتی لال جی فرما رہے تھے ۔ یہاں اس رپورٹ کو نہ صرف منظور کیا گیا بلکہ حکومت کو الٹی میٹم دیا گیا کہ اگر ایک سال کے اندر یعنی ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع تک برطانوی پارلیمنٹ اس رپورٹ کو منظور نہ کرے تو کانگریس پھر ترک تعاون اور عدم ادائی محصول کی مہم شروع کر دے گی[18] !!

اِدھر کلکتہ میں ، دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع کے اواخر میں ، آل پارٹیز کنونشن ، آل انڈیا کانگریس ، آل انڈیا مسلم لیگ (جناح لیگ) اور مجلس خلافت کی یہ سیاسی سرگرمیاں تھیں ، جن کا مرکز و محور نہرو رپورٹ بنی ہوئی تھی ، اُدھر دہلی میں اسی زمانہ (یعنی دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع) میں مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں مسلم لیگ (بشمول جناح لیگ و شفیع لیگ) مجلس خلافت اور جمیعۃ العلمائے ہند ، مرکزی اسمبلی اور کونسل آف اسٹیٹ کے غیر سرکاری مسلمان اراکین ، صوبائی مقننہ جات کے غیر سرکاری اراکین ، اور ہر صوبے کے بیس بیس مسلمان نمائندوں پر مشتمل ایک اجتماع کو بلانے کی تیاریاں کی گئیں ، اور اس کا نام آل پارٹیز مسلم کانفرنس رکھا گیا ۔ اس کے پس منظر پر بھی نہرو رپورٹ چھائی ہوئی تھی اور اس کا مقصد کلکتہ آل پارٹیز کنونشن کا توڑ کرنا تھا ۔ اس کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ مسلم لیگ (جناح گروپ) کے نام بھی بھیجا گیا تھا ، لیکن جناح لیگ نے تو اسی زمانہ (یعنی دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع) میں اپنا اجلاس کلکتہ میں طلب کر رکھا تھا اور وہ کلکتہ آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہو رہی تھی ، اس لیے اس نے اس آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت سے نہ صرف انکار کر دیا بلکہ انتباہ دیا کہ اس قسم کی کوششوں سے مسلمانوں کے مجموعی مفاد کو نقصان پہنچے گا ۔ بہر کیف ادھر کلکتہ میں ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع کو آل انڈیا کنونشن میں جناح لیگ کے نمائندے شریک ہوئے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، ترمیمات پیش کیں اور

۱۸- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ: تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۵۴۳ -

ناکام و نامراد لوٹا دئے گئے اور اُدھر ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء تا یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کو آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے اجلاس دہلی میں زیر صدارت آغا خان منعقد ہوئے۔ اس میں شفیع لیگ، مجلس خلافت، جمیعۃ العلماؐ نے شرکت کی۔ مرکزی اسمبلی، کونسل آف اسٹیٹ اور صوبائی مجالس قانون ساز کے مسلم اراکین بھی حاضر تھے اور اکابر مسلم لیڈروں میں مولانا محمد علی جوہر اور شوکت علی، مولانا حسرت موہانی، سر محمد شفیع، مفتی کفایت اللہ، نواب اسماعیل خان وغیرہ موجود تھے۔ الغرض بقول سر شفیع واقعی یہ مسلمانانِ ہند کا نمائندہ اجتماع تھا۔ اس میں نہرو رپورٹ کی سخت مخالفت اور مذمت کی گئی، جناح لیگ پر بھی لے دے کی گئی کہ اس نے کاسۂ گدائی لے کر کلکتہ کنونشن میں شرکت کی مگر ملا کیا سوائے ذلت و رسوائی کے[۱۹]! اس جلسہ نے ایک طویل قرارداد منظور کی جس میں حسب ذیل امور کا مطالبہ کیا گیا تھا

(۱) ہندوستان کا آئندہ دستور وفاق طرز کا ہو اور باقی اختیارات صوبوں کو دے دئے جائیں۔

(۲) مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کو ایک تہائی $\frac{1}{3}$ نشستیں دی جائیں۔

(۳) مسلمانوں کو جداگانہ حقِ انتخاب سے کسی صورت میں محروم نہ کیا جائے۔

(۴) جن صوبوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، وہاں کی مقننہ میں بھی ان کو اکثریت حاصل ہونی چاہئے اور جن صوبوں میں ان کی اقلیت ہے، وہاں کی مقننہ میں ان کو جو نشستیں اس وقت حاصل ہیں، اتنی آئندہ بھی برقرار رکھی جائیں۔

(۵) کوئی ایسا قانون، جس کا تعلق کسی مذہبی یا تہذیبی مسئلہ سے ہو، منظور نہ ہو سکے گا اگر اس کی مخالفت اقلیت کے $\frac{3}{4}$ اراکین کریں۔

(۶) سندھ کو علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے۔

۱۹۔ انڈین اینول رجسٹر جلد دوم سنہ ۱۹۲۸ء۔

(۷) بلوچستان اور صوبہ سرحد میں دیگر صوبوں کی مانند اصلاحات نافذ کی جائیں۔

(۸) دستور اساسی میں مسلمانوں کے مذہب، تمدن، شخصی قانون، تعلیم و زبان کا تحفظ کیا جائے۔

(۹) مرکزی و صوبائی کابینہ میں مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دیا جائے۔

(۱۰) دستور اساسی میں کوئی تبدیلی اس وقت تک نہ ہو، جب تک کہ وفاق کے تمام اجزاء یعنی ریاستیں اور صوبے اس پر متفق نہ ہوں۔[۲۰]

نہرو رپورٹ، ہندوستان کی سیاست میں بالعموم اور مسلم سیاست میں بالخصوص ایک دھاکہ ثابت ہوئی۔ اس نے ہندوؤں کو آپس میں متحد لیکن مسلمانوں کو منتشر اور متفرق کر دیا! کانگریسی ہندو اور مہاسبھائی ہندو تو ایک ہو گئے لیکن مسلمان مختلف ٹولیوں میں بٹ گئے۔ مسلمانوں کا ایک گروہ تو وہ تھا، جو اس کو من و عن قبول کر لینا چاہتا تھا۔ دوسرا وہ تھا، جو اس میں ترسیمات کرنا چاہتا تھا اور تیسرا وہ تھا، جو اس کا سرے سے مخالف تھا۔ شفیع لیگ یا جس کو آل انڈیا مسلم لیگ (لاہور) کہا جانے لگا تھا، اس رپورٹ کی بنیادی طور پر مخالف تھی۔ اس کے اختلاف کا مرکزی نقطہ مخلوط طریق انتخاب تھا، جس کی سفارش نہرو رپورٹ نے کی تھی۔ مسلم لیگ کا یہ گروپ جدا گانہ انتخاب سے کسی صورت میں دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ جناح لیگ (جس کو آل انڈیا مسلم لیگ (دہلی) بھی کہا جاتا تھا) میں ہر نقطۂ خیال کے لوگ شامل تھے۔ اس میں وہ بھی تھے، جو نہرو رپورٹ کے حامی تھے، وہ بھی تھے جو اس رپورٹ کو بغیر کسی ترمیم کے قبول کرنا نہیں چاہتے تھے اور وہ بھی تھے، جو اس کو مسترد کر دینا چاہتے تھے۔ اسی لیے کلکتہ کنونشن کے موقع پر مسٹر جناح نے بین بین راہ نکالی تھی کہ کنونشن میں شریک ہو

۲۰۔ اسپیچس اینڈ ڈوکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن از گائر مارس اینڈ اپاڈ وری مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۵۷ء ص ۲۴۴۔

کر ترمیمات پیش کی جائیں ، لیکن جب یہ ترمیمات رد کر دی گئیں تو جناح لیگ کا اعتدال پسند طبقہ جو ترمیمات کا حامی تھا ، سخت مایوس ہو گیا اور اس کے لیے بھی اب نہرو رپورٹ کو مسترد کر دینے کے سوا کوئی چارۂ کار نہ رہا ۔ لیکن نہرو رپورٹ کے حامی اب بھی جناح لیگ میں موجود تھے ۔ گویا کلکتہ کنونشن کے بعد اس میں دو گروپ تھے ، ایک وہ جو نہرو رپورٹ کا حامی تھا اور دوسرا وہ جو اس کا مخالف تھا ، یہی وجہ تھی کہ کلکتہ میں آل انڈیا مسلم لیگ (جناح گروپ) کا جو سالانہ جلسہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں ہونے والا تھا ، وہ ملتوی کر دیا گیا !

کلکتہ کنونشن میں ناکامی اور لبرل و روشن خیال ہندوؤں کی تنگ نظری کا تلخ تجربہ ہو جانے کے بعد مسٹر جناح کے اندر ایک احساس تو یہ پیدا ہوا کہ نہرو رپورٹ میں جو ترمیمات انھوں نے پیش کی تھیں ، مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے وہ کافی نہیں ہیں ، بلکہ مزید دستوری تحفظات کا مطالبہ کیا جانا چاہئے اور دوسرا احساس یہ پیدا ہوا کہ مسلمانوں کے آپس کا اختلاف ختم ہونا چاہئے کیونکہ اس اختلاف کے باعث نہ ایوان حکومت میں ان کی رائے کی کوئی وقعت ہے اور نہ برادران وطن ہی ان کو کوئی وزن دیتے ہیں[۲۱] ، اسی لیے وہ اب لاہور مسلم لیگ (شفیع گروپ) سے اتحاد کے خواہاں تھے ۔ چنانچہ سر محمد شفیع اور مسٹر جناح نے اوائل مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں ملاقات کی اور یہ طے کیا کہ دونوں اپنی اپنی لیگوں کا اجلاس ایک ہی تاریخ کو ایک ہی جگہ دہلی میں طلب کریں گے[۲۲] ، جس میں ایک ایسی جامع قرارداد پیش کی جائے گی جو سب کے لیے قابل قبول ہوگی ۔ مختلف مکاتیب فکر کے قائدین اور مسلمانوں کی مختلف جماعتوں سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مسٹر جناح نے ایک ایسی قرارداد کے نکات مرتب کر لیے ۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد اور مسٹر جناح کے ان نکات کے باعث یہ دونوں لیگیں ایک دوسرے کے بہت قریب آ گئی تھیں اور ان کے

۲۱- اخبار ہمدرد مورخہ ۵ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء ۔
۲۲- ایضاً

اتحاد کی منزل نزدیک نظر آ رہی تھی لیکن جناح لیگ میں شامل "نہروانی پارٹی" [۲۳] جس میں مولانا آزاد، تصدق احمد خاں شیروانی، ڈاکٹر عالم وغیرہ شریک تھے، آڑے آئی۔ ۳۰، ۳۱ مارچ کو آل انڈیا مسلم لیگ کا جلسہ طلب کیا گیا تھا، تاکہ دونوں لیگوں کا انضمام عمل میں آئے اور ایک جامع قرارداد نہرو رپورٹ کی مخالفت اور مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کے تعلق سے پاس کی جائے، لیکن ہوا یہ کہ ۲۸ مارچ کو لیگ کونسل کا جلسہ ہوا اور اس میں "نہروانی پارٹی" نے اپنی پسند کے (۱۰۸) ارکان لیگ کونسل میں بھرتی کر لیے [۲۳] تاکہ ۳۱ مارچ کو جلسہ میں نہرو رپورٹ کی تائید میں قرارداد منظور کرائی جا سکے۔ ۳۱ مارچ سنہ ۱۹۲۹ع کی صبح کو لیگ کا جلسہ شروع ہوا۔ مسٹر جناح جو لیگ کے مستقل صدر تھے، ابھی جلسہ گاہ میں نہیں پہنچے تھے۔ ان کی عدم موجودگی میں "نہروانی پارٹی" نے ڈاکٹر محمد عالم کو جلسہ کا عارضی صدر بنا کر کارروائی کا آغاز کر دیا۔ مولانا محمد علی جوہر اور دیگر زعماء نے احتجاج کیا، لیکن کوئی شنوائی نہ ہوئی۔ نتیجتاً وہ مع اپنے ساٹھ ستر ساتھیوں کے جلسہ سے واک آؤٹ کر گئے [۲۳]، لیکن عارضی صدر نے ان کی کوئی پرواہ نہ کی اور نہرو رپورٹ کی تائید میں قرارداد پیش کر دی گئی۔ اس پر جلسہ میں ہنگامہ برپا ہوا مگر اسی ہنگامہ کے دوران صدر جلسہ نے بغیر رائے شماری کیے قرارداد کی منظوری کا اعلان کر دیا۔ عین اسی وقت مسٹر جناح جلسہ گاہ میں پہنچ گئے اور ان تمام واقعات سے واقف ہونے کے بعد انھوں نے جلسہ کو غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کر دیا [۲۴]! اب مسٹر جناح نے وہ فارمولا شائع کر دیا جو انھوں نے مختلف جماعتوں اور مکاتیبِ فکر کے قائدین سے صلاح مشورہ کرنے کے بعد مرتب کیا تھا۔

۲۳- مولانا محمد علی جوہر نے ان مسلمانوں کو جو نہرو رپورٹ کے حامی تھے یہ خطاب دیا تھا، دیکھئے اخبار ہمدرد مورخہ ۳ اپریل سنہ ۱۹۲۹ع۔

۲۳- اخبار ہمدرد مورخہ ۳ اپریل سنہ ۱۹۲۹ع۔

۲۴- اخبار ہمدرد مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۹ع۔

یہی فارمولا مسٹر جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہے۔ ان چودہ نکات میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ع کے وہ تمام دس مطالبات شامل تھے، جن کا تذکرہ ہم اوپر کر آئے ہیں۔ ان کے علاوہ حسب ذیل چار امور کا مزید اضافہ کیا گیا تھا:

(۱) صوبوں کو کامل خود مختاری حاصل ہو گی اور تمام صوبے خود مختاری میں مساوی طور پر شریک ہوں گے یعنی تمام صوبوں کو یکساں اختیارات حاصل ہوں گے۔

(۲) کوئی تبدیلی صوبوں کے سرحدات میں ایسی نہیں کی جائے گی، جس کا برا اثر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت پر پڑتا ہو۔

(۳) تمام قوموں کو ضمیر کی پوری آزادی، عقیدہ، عبادات و رسوم، تعلیم و تبلیغ، اجتماع و تنظیم کی کامل آزادی حاصل ہو گی۔

(۴) حکومت اور دیگر خود مختار ادارات کی ملازمتوں میں مسلمانوں کو دیگر ہندوستانیوں کے پہلو بہ پہلو مناسب حصہ صلاحیت و کارکردگی کا لحاظ کرتے ہوئے دیا جائے گا۔

آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد میں ایک مطالبہ یہ کیا گیا تھا کہ مرکزی و صوبائی وزارت میں مسلمانوں کو ان کا "جائز حصہ" دیا جائے، مسٹر جناح کے چودہ نکات میں اس کی مزید صراحت و وضاحت یوں کی گئی کہ مرکز اور صوبہ کی ہر وزارت میں ایک تہائی ۱/۳ مسلمان ضرور ہوں۔

مسٹر جناح کے ان چودہ نکات کے بعد جناح لیگ اور شفیع لیگ کے مابین جو اختلافات تھے، وہ ختم ہو گئے، اور آل انڈیا مسلم لیگ (دهلی) و آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے درمیان جو خلیج حائل تھی، وہ بھی رفع ہو گئی — اب یہ چودہ نکات مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں (مسلم لیگ مجلس خلافت جمیعۃ العلماء وغیرہ) کے مشترکہ متفقہ مطالبات بن گئے، لیکن جناح لیگ میں جو "نہروانی ٹولی" تھی، اس کو ان نکات سے سخت اختلاف تھا اور وہ نہرو رپورٹ کو صحیفۂ آسانی سمجھ کر اس پر ایمان

لا چکی تھی ۔ اب اس نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر مسلم لیشنلسٹ کانفرنس کے نام سے ایک علیحدہ ادارہ جولائی سنہ ۲۹ء میں بنا لیا ، جس کے صدر مولانا ابوالکلام آزاد ، سکریٹری تصدق احمد خاں شیروانی اور خزانچی ڈاکٹر انصاری مقرر ہوئے ۔

اس انتشار و افتراق کے باعث ، اگر مسلمانوں کے کسی سیاسی ادارہ کو سب سے زیادہ دھچکا لگا تو وہ آل انڈیا مسلم لیگ تھی ۔ اول تو اس کے دو ٹکڑے —— جناح لیگ اور شفیع لیگ —— ہو گئے اور دونوں کو آل انڈیا ہونے کا ادعا رہا ۔ پھر جناح لیگ میں تین مختلف نقطۂ خیال کے گروپ تھے ۔ علاوہ ازیں کلکتہ کنونشن میں شرکت اور وہاں ناکامی کے باعث اس کا وقار بھی متاثر ہوا تھا ۔ پھر مارچ سنہ ۲۹ء کے اجلاس میں ”نہروانی ٹولی“ کی سازش و ہنگامہ آرائی نے اس پر ایک کاری ضرب لگائی تھی ۔ اگرچہ مسٹر جناح کے چودہ نکات نے اس کو ایک سنبھالا دیا ، تاہم اب یہ محسوس کیا جانے لگا کہ موجودہ سیاسی حالات میں وہ ایک کمزور موقف میں آ گئی ہے اور اسی لئے نہرو رپورٹ کی مخالفت میں وہ پیش پیش نہ رہ سکے گی ، چنانچہ مسلم زعما ، خصوصاً مخالفینِ نہرو رپورٹ نے یہ مناسب سمجھا کہ اس موقع پر آل پارٹیز مسلم کانفرنس ہی کو ایک مستقل اور فعال ادارہ بنا دیا جائے ۔ چنانچہ مرکز میں اس کا ایک بورڈ اور مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) اور تمام اضلاع میں شاخیں قائم کر دی گئیں ۔

یہ ساری تفصیلات ، ہندو مسلم کشمکش کی داستان ، سے متعلق تھیں اب ذرا ہند اور برطانیہ کی کشمکش کی کہانی بھی سنئے ۔

اپریل سنہ ۲۹ء میں سائمن کمیشن نے اپنا کام ختم کر دیا اور اپنی رپورٹ سنہ ۱۹۳۰ء کے وسط میں پیش کر دی ، لیکن اس رپورٹ کی اشاعت سے قبل اکتوبر سنہ ۲۹ء میں لارڈ اِروِن وائسرائے ہند انگلستان گئے اور برطانوی حکومت سے مشورہ کرنے کے بعد ہندوستان واپس آ کر ۳۱ اکتوبر سنہ ۲۹ء کو اعلان کیا کہ ”مجھے ملک معظم کی حکومت کی طرف سے یہ صاف طور پر بیان کرنے کے اختیارات دیئے گئے ہیں کہ ہندوستان کی

کانسٹی ٹیوشنل (دستوری) ترقی کا قدرتی نتیجہ درجہ نوآبادیات کا حصول ہے [۲۵] " اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ سائمن رپورٹ پر کوئی فیصلہ صادر کرنے سے پہلے ہندوستان کے آئندہ دستور سازی کے مسئلہ پر غور کرنے کی غرض سے برطانوی حکومت ، برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں کی ایک گول میز کانفرنس بلائی جائے گی - کانگرس نے اجلاس کلکتہ (دسمبر سنہ ۲۸ء) میں نہرو رپورٹ کو اس شرط کے ساتھ منظور کیا تھا کہ اگر حکومت ہند اس رپورٹ کی سفارشات کو ۳۱ دسمبر سنہ ۲۹ء تک منظور نہ کرے تو آزادیٔ کامل کا اعلان کر دیا جائے گا اور حکومت کے خلاف عدم ادائی لگان و محصول کی مہم شروع کر دی جائے گی - وائسرائے کا ۳۱ اکتوبر سنہ ۲۹ والا اعلان کانگرس کی اسی قرارداد کے جواب میں ایک طرح کی طمانیت دھانی تھی - پھر وائسرائے نے ہندوستان کے ممتاز سیاسی لیڈروں سے ذاتی طور پر ملاقات کر کے مزید اطمینان دلانا چاہا اور اس غرض سے ۲۳ دسمبر سنہ ۲۹ء کو وائسریگل لاج میں گاندھی جی ، موتی لال نہرو، ولبھ بھائی پٹیل ، سر سپرو اور مسٹر جناح کو مدعو کیا گیا - اس ملاقات میں گاندھی جی نے وائسرائے سے مطالبہ کیا کہ اگر مجوزہ گول میز کانفرنس میں ، کانگریس نے شرکت کی تو درجہ نوآبادیات دینے کا وعدہ کیا جائے - مگر وائسرائے نے جواب دیا کہ وہ ۳۱ اکتوبر سنہ ۲۹ والے اعلان سے زیادہ کسی اور قسم کا تیقن نہیں دے سکتے [۲۶] وائسرائے کا یہ جواب کانگریس کے لیے مایوس کن تھا -

کانگریس نے حکومت کو نہرو رپورٹ کی منظوری کے لئے جو مدت دی تھی - وہ اب گزر رہی تھی ، اور وائسرائے کے اس جواب سے واضح ہو چکا تھا کہ حکومت برطانیہ کانگریس کے سامنے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہے - اس لیے کانگریس نے اب عدم تشدد کی جنگ کے لیے تیاریاں شروع کر

۲۵- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ص ۵۷۲

۲۶- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۵۸۱

دیں ۔ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس کا اجلاس بمقام لاہور منعقد ہوا ۔ اس اجلاس کے صدر نہرو رپورٹ کے مرتب موتی لال نہرو کے بیٹے جواہر لال نہرو تھے ۔ اس اجلاس میں آزادی کامل کی قرارداد کو منظور اور نہرو رپورٹ کو منسوخ کر دیا گیا !۔۔۔ گویا دانشور باپ کی کمائی ، ہونہار بیٹے کے ہاتھوں دریائے راوی میں غرق کر دی گئی ! ! کانگریس نے ساتھ ہی یہ اعلان بھی کر دیا کہ وہ گول میز کانفرنس میں شریک نہیں ہو گی۲۷ ۔ اقلیتوں ، خصوصاً مسلمانوں ، کی ظاہری تشفی کی خاطر حسب ذیل قرارداد بھی اسی اجلاس میں منظور کی گئی ۔

> ”نہرو رپورٹ کے خاتمہ کے بعد فرقہ وارانہ مسائل پر کانگریس کی پوزیشن کی وضاحت کی کوئی ضرورت معلوم نہیں ہوتی ۔ کانگریس کو یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں تمام فرقہ وارانہ مسائل صرف خالص قومیت کی لائنوں پر فیصل ہو سکتے ہیں ، لیکن چونکہ مسلمان اور دیگر اقلیتوں اور خصوصاً سکھوں نے نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ کو غیر تشفی بخش قرار دیا ، اس لیے کانگریس مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی نئے دستور اساسی میں اس فیصلہ کو اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک کہ وہ تمام اقوام کے لئے قابل قبول نہ ہو ۲۸“ ۔

یہ قرارداد مبہم اور غیر واضح ہونے کے ساتھ ساتھ منفی بھی تھی ۔ اس میں یہ یقین دھانی تو کی گئی تھی کہ نہرو رپورٹ میں درج شدہ ”فرقہ وارانہ فیصلہ کو کسی نئے دستور اساسی میں اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا جب تک کہ وہ تمام اقوام کے لیے قابل قبول نہ ہو ، لیکن وہ قابل قبول حل یا فیصلہ کیا ہوگا ، اس کا سرے سے اس میں کوئی ذکر ہی نہ تھا ، پھر یہ بات بھی مبہم تھی کہ آیا نہرو رپورٹ کا فرقہ وارانہ

۲۷- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ،ص ۵۸۹

۲۸- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۵۷

فیصلہ ہی قابل قبول بنایا جائے گا یا کوئی نیا حل تلاش کیا جائے گا ۔ اس کے یہ معنے بھی تھے کہ نہرو رپورٹ تو منسوخ کی جا چکی ہے لیکن اس کا فرقہ وارانہ فیصلہ جوں کا توں بحال ہے ، کیوں کہ اس کے قابل قبول بنانے کی شق اس قرارداد میں موجود تھی ۔ گویا اس قرارداد کو منسوخ اس لیے کیا گیا تھا کہ حکومت نے اس کو مسترد کر کے ، کانگریس کے چیلنج کو قبول کر لیا تھا ۔ کانگریس کا ادعا یہ تھا اس نے کامل آزادی کے بجائے نہرو رپورٹ کے ذریعہ نوآبادیاتی درجہ (Dominion Status) کا مطالبہ کر کے حکومت کے ساتھ ایک بڑی رعایت برتی تھی ۔ حکومت نے اس رعایت سے فائدہ نہ اٹھایا اور اس کو مسترد کر دیا ۔ لہٰذا اب وہ نہرو رپورٹ کو منسوخ کر کے ، اپنی یہ رعایت واپس لے رہی ہے ۔ بالفاظ دیگر نہرو رپورٹ کی تنسیخ کے معنے پوری رپورٹ کی تنسیخ کے نہ تھے بلکہ صرف نوآبادیاتی درجہ کے مطالبہ کی تنسیخ کے تھے تا کہ کانگریس ایک قدم آگے بڑھ کر نوآبادیاتی درجہ کے بجائے آزادی کامل کا مطالبہ کر سکے ، چنانچہ ہوا بھی یہی ۔ ایسی صورت میں نہرو رپورٹ کا فرقہ وارانہ فیصلہ منسوخ نہ ہوا تھا ، زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کو " ملتوی " کر دیا گیا تھا ۔

اب کانگریس نے ۲۶ جنوری سنہ ۱۹۳۰ کو پورے ملک میں یوم آزادی منایا ۔ مرکزی و صوبائی اسمبلیوں کے (۷۲) اراکین نے استعفے دے دیئے[۲۹]، ۱۴-۱۵-۱۶ فروری سنہ ۱۹۳۰ کو سابرمتی میں کانگریس کی مجلس عاملہ کے اجلاس ہوئے ، جس میں عدم تشدد کے ساتھ سول نافرمانی شروع کرنے کی قرارداد منظور کی گئی[۳۰] اور اس سلسلہ میں تمام اختیارات گاندھی جی کو دے دیئے گئے[۳۱] ۔ ۲ مارچ کو گاندھی جی نے

۲۹- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۹۸

۳۰- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۱۵

۳۱- ایضاً ص ۶۰۹ ۔

وائسرائے کو ایک طویل خط لکھا جس میں انھوں نے انگریزی حکومت کو لعنت'' قرار دیا[۳۲] ، اس کے انتظامات پر سخت نکتہ چینی کی اور آخر میں اپنی اسکیم سول نافرمانی کی تفصیلات بھی درج کر دیں ، جس کے مطابق وہ اپنے آشرم کے ساتھیوں کے ہمراہ سمندر کے کنارے نمک سازی کر کے ، قانونِ نمک کو توڑنا چاہتے تھے[۳۳]، وائسرائے نے روکھا جواب دیا کہ اس سے امن عامہ خطرہ میں پڑ جائے گا[۳۴] ۔ ۱۲ مارچ سنہ ۱۹۳۰ کو گاندھی جی اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ ڈنڈی کی طرف پیدل روانہ ہو گئے۔[۳۵] ۵ اپریل کی صبح وہ ڈنڈی پہنچ گئے[۳۶] اور ۶ اپریل کو انھوں نے قانون شکنی کا افتتاح کیا[۳۷] ، اس کے ساتھ ہی پورے ملک میں سول نافرمانی کا آغاز ہو گیا اب حکومت نے اس تحریک کو دبانے کے لیے بڑے پیمانہ پر گرفتاریاں شروع کیں آخر مئی سنہ ۱۹۳۰ میں گاندھی ، جواہر لال اور دیگر سربرآوردہ کانگریسی لیڈر گرفتار کر لئے گئے اور کانگریس کی مجلسِ عاملہ بھی خلاف قانون قرار دے دی گئی[۳۸] ۔

سول نافرمانی کی یہ تحریک ایک سال تک جاری رہی ، لیکن مسلمان بحیثیت مجموعی اس تحریک میں شریک نہیں ہوئے ، البتہ جمعیۃ العلما اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس والوں نے اس مہم میں کانگریس کا ساتھ دیا ۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جمعیۃ العلما ، نہرو رپورٹ کی مخالف اور آل پارٹیز مسلم کانفرنس و آل انڈیا مسلم لیگ کے مسلک کی موئید تھی اور اس نے آٹھویں سالانہ اجلاس منعقدہ ۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ء میں مسٹر جناح

۳۲- ایضاً ص ۶۱۴ - ۳۳- ایضاً ص ۶۲۰

۳۴- ایضاً ص ۶۲۲

۳۵- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۲۵

۳۶- ایضاً ص ۶۲۷ - ۳۷ ایضاً ص ۶۳۸

۳۸- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۶۴ -

کے چودہ نکات کی حمایت کی تھی[۳۹] لیکن مئی سنہ ۱۹۳۰ع میں جمعیت کا جو اجلاس امروہہ میں منعقد ہوا تھا ، اس میں ایک قرارداد منظور کی گئی ، جس میں مسلمانوں کو کانگریس کے ساتھ اشتراک عمل کرنے اور تحریکِ سول نافرمانی میں شرکت کا مشورہ دیا گیا تھا[۴۰] - اسی قرارداد پر جمعیت کے اندر اختلاف رونما ہوا اور اس کے دو ٹکڑے ہو گئے، ایک آل انڈیا جمعیۃ العلماء دہلی اور دوسری آل انڈیا جمعیۃ العلماء کانپور — جمعیۃ العلماء کانپور کا اجلاس سنہ ۱۹۳۰ع میں زیر صدارت مولانا محمد علی جوہر منعقد ہوا - یہ جمعیت کانگریس اور اس کی تحریکِ سول نافرمانی کے خلاف تھی اور گول میز کانفرنس میں شرکت کی حامی تھی[۴۱] - مسلم نیشنلسٹ کانفرنس والوں نے اپنا جلسہ سنہ ۱۹۳۰ع میں بمقام لکھنؤ زیر صدارت ڈاکٹر انصاری منعقد کیا - اس جلسہ میں سائمن کمیشن کی مخالفت اور تحریک سول نافرمانی کی تائید کی گئی تھی -

ابھی ہندوستان میں کانگریس کی تحریک سول نافرمانی جاری تھی کہ حکومت نے گول میز کانفرنس کے انعقاد اور اس کے مندوبین (delegates) کا اعلان کر دیا - چنانچہ ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع کو یہ کانفرنس لندن میں شروع ہوئی اس میں تیرہ (۱۳) برطانوی نمائندوں کے علاوہ ہندوستان کے بہتر (۷۲) نمائندے شریک ہوئے ، جن میں سے سولہ (۱۶) مسلمان اور چالیس دیگر اقوام سے تعلق رکھتے تھے اور سولہ (۱۶) دیسی ریاستوں کے نمائندے تھے- مسلم نمائندوں میں قابلِ ذکر مولانا محمد علی ، سر آغا خاں ، مسٹر جناح ، سر محمد شفیع اور فضل الحق تھے- اس کانفرنس کو پہلی گول میز کانفرنس کہا جاتا ہے - اس کانفرنس کی کاروائیوں میں کچھ زیادہ سرگرمی نہیں رہی - سوائے مولانا محمد علی جوہر کی تاریخی تقریر کے - کانفرنس نے حسب ذیل آٹھ سب کمیٹیاں بنا دیں -

---

۳۹- مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ مطبع دہلی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۵۳۱ ، ۵۳۲

۴۰- ایضاً ص ۵۳۲

۴۱- مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ع ص ۵۳۳

(۱) حقِ رائے دہی (فرنچائز) کمیٹی
(۲) وفاقی ہیئت (فیڈرل اسٹرکچر) کمیٹی
(۳) دفاعی (ڈفنس) کمیٹی
(۴) ملازمتوں کی کمیٹی
(۵) اقلیتی (minorities) کمیٹی
(۶) صوبہ سرحد کمیٹی
(۷) صوبہ سندھ کمیٹی
(۸) صوبہ برما کمیٹی

اقلیتی کمیٹی کو اقلیتوں ، مثلاً مسلمانوں اور سکھوں وغیرہ کے حقوق کے تحفظات کے متعلق سفارشات پیش کرنا تھا، لیکن اِن امور کے بارے میں کوئی بات طے نہ پا سکی ۔ صوبہ سرحد کمیٹی کو صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کے مساوی سیاسی اصلاحات نافذ کرنے کے متعلق سفارشات پیش کرنی تھیں ، اور سندھ کمیٹی ، سندھ کی بمبئی سے علیحدگی کے متعلق رائے اور سفارشات پیش کرنے کے لیے بنائی گئی تھی ۔ برما کمیٹی کو برما کی ہندوستان سے علیحدگی کے متعلق تجاویز پیش کرنی تھیں ۔ واضح رہے کہ برما اس زمانہ میں ہندوستان میں شامل تھا ۔

اس کانفرنس کے تعلق سے تین باتیں قابلِ ذکر ہیں :

(۱) برطانیہ میں اس زمانہ میں لیبر پارٹی کی حکومت تھی ، جس کی ہمدردیاں مسلمانوں سے زیادہ ہندوؤں بالخصوص کانگریس کے ساتھ تھیں ۔ وہ چاہتی تھی کہ مسلمان بالخصوص مسلمانانِ پنجاب و بنگال کسی نہ کسی صورت میں مخلوط طریقۂ انتخاب کو قبول کر لیں تاکہ مسلمانوں اور کانگریس کے مابین ایک بڑی وجہ نزاع ختم ہو جائے ۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اِس نے سر محمد شفیع (پنجاب) ، فضل الحق (بنگال) اور بعض دوسرے مسلم مندوبین کانفرنس پر دباؤ ڈالا ، چنانچہ اِن مسلم مندوبین نے سردار سمپورن سنگھ ، سردار اُجل سنگھ اور ڈاکٹر مونجے سے غیررسمی

بات چیت بھی کی ، لیکن بالآخر یہ کوشش ناکام ہوئی[۴۲]۔

(۲) اِس کانفرنس میں جو بات طے ہوئی وہ یہ تھی کہ ہندوستان کا آئندہ دستور وفاق طرز کا ہوگا ، جس میں نہ صرف برطانوی ہند کے صوبے بلکہ دیسی ریاستیں بھی شامل ہوں گی ۔ دیسی ریاستوں کے نمائندوں نے (جن میں خود والیانِ ریاست بھی شامل تھے) وفاق میں شرکت کا خیال ظاہر کیا ، پھر ۱۹ جنوری کو کانفرنس کے آخری اجلاس میں وزیر اعظم برطانیہ نے " واضح طور پر بیان کیا کہ فیڈرل (وفاق) بناً پر مرکزی لیجسلیچر (مرکزی مقننہ) بنائی جائے گی ، جس میں تمام صوبہ جات اور ریاستوں کے نمائندے شامل ہوں گے ۔ اگزیکیٹو (عاملہ) کی اس لیجسلیچر (مقننہ) کے سامنے ذمہ داری کو حکومتِ برطانیہ تسلیم کرے گی ۔ صرف ڈفنس (دفاع) اور معاملات خارجہ ہی ریزروڈ (محفوظ) رکھے جائیں گے[۴۳]۔

اِس اعلان کے ذریعہ مستقبل کی طرزِ حکومت کی تفصیلات تو نہیں البتہ اصول طے کر دئے گئے تھے ۔ یہ اصول دو تھے ۔

* ایک تو یہ کہ طرز حکومت وفاق ہوگا ، جس میں صرف برطانوی ہند کے صوبے ہی نہیں بلکہ دیسی ریاستیں بھی شریک ہوں گی ۔ وفاق حکومت کی بات تو انوکھی یا نئی نہ تھی کیونکہ اس پر ہندوستان کی تقریباً تمام جماعتیں غور و فکر کرتی رہی تھیں ، لیکن وفاق میں دیسی ریاستوں کی شرکت کی بات البتہ تعجب خیز اور گہرے اثرات کی حامل تھی ، کیونکہ اب تک ہندوستان کی سیاسی کشمکش سے دیسی ریاستیں علیحدہ ہی رہی تھیں اور کسی جانب سے بھی ان کو اس میں شریک کرنے کی کوشش نہیں کی

۴۲۔ فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۵۴

۴۳۔ ہسٹری آف دی کانگریس (اُردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۶۹۲

گئی تھی ، لیکن اب ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے چوکھٹے (frame) میں انہیں جگہ دی جا رہی تھی -
دوسرا اصول یہ تھا کہ صوبائی اور مرکزی حکومتوں کو بجز دفاع اور امور خارجہ کے تمام اختیارات دئے جا رہے تھے - دفاع اور امور خارجہ برطانوی حکومت اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی -

(۳) اس کانفرنس کے دوران حکومت برطانیہ نے یہ محسوس کیا کہ کانگریس کے بغیر دستوری مباحث آگے بڑھ سکتے ہیں اور نہ معاملات طے پا سکتے ہیں ، اس لیے اس نے اب پینترا بدلا اور کانگریس کو رام کرنے کی غرض سے گول میز کانفرنس کے آخری دن یعنی ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع کو وزیر اعظم برطانیہ نے یہ اعلان کیا کہ

" ملک معظم کی حکومت کا خیال ہے کہ ہندوستان کی حکومت کی ذمہ داری صوبہ جاتی اور مرکزی مجالس قانون ساز پر ڈال دی جائے لیکن مقررہ عرصہ تک صرف وہ چند اختیارات اپنے پاس رکھے جائیں ، جن سے خاص حالات پر قابو پایا جا سکے اور جن سے اقلیتوں کے سیاسی حقوق کی حفاظت کی جا سکے اس قسم کے آئینی تحفظات کی صورت میں بھی ملک معظم کی حکومت کا یہ پہلا فرض ہوگا کہ وہ دیکھے کہ خاص اختیارات ہندوستان کے نئے دستور اساسی میں اس کی مکمل ذمہ دارانہ حکومت میں مداخلت نہیں کرتے[۴۴]"

وزیر اعظم نے پھر یہ اعلان بھی کیا -

" اگر ان لوگوں کی طرف سے جو اس وقت سول نافرمانی میں مصروف ہیں وائسرائے کی اپیل کا جواب دیا گیا ، تو انہیں بھی شمولیت کی دعوت دی جائے گی[۴۴]"

۴۴- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ تواریخ کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۹۲

اس اعلان کے بعد پہلی گول میز کانفرنس ۱۹ جنوری کو برخاست کر دی گئی لیکن ساتھ ہی اسی اعلان کے ذریعہ دوسری گول میز کانفرنس میں کانگریس کی شرکت کے لیے راستہ ہموار کر دیا گیا !

یہ تھے وہ عام سیاسی حالات جو سنہ ۱۹۲۶ع سے ۱۹۳۰ع کے اختتام تک ، پانچ سال کے دوران پیش آئے ۔ ان واقعات کو بنظرِ غائر دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ :

- تحریکِ ترکِ تعاون و سول نافرمانی اور تحریکِ خلافت کے زمانہ میں ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد پیدا ہوگیا تھا ۔
- ان تحریکات کے ختم ہو جانے کے ساتھ سنہ ۱۹۲۳ع یہ اتحاد بھی ختم ہوگیا اور اختلافات نے ان کی جگہ لے لی ۔ ان اختلافات کو ختم کرنے کی سنہ ۱۹۲۳ع تا ۱۹۲۷ع کئی کوششیں کی گئیں لیکن سب کی سب ناکام رہیں ۔
- ان اختلافات کے پس پردہ محرکات کو سیاسی سطح پر تلاش کرنے کی کوشش کی گئی ۔ ہندوؤں نے جداگانہ طریقۂ انتخاب کو ان کا محرکِ اصلی قرار دیا ۔ غیر متعصب ہندوؤں اور روشن خیال کانگریسیوں نے بھی اس کو ہدفِ ملامت بنایا !
- حریت پسند اور محب وطن سربرآوردہ مسلم زعما نے پیش قدمی کرکے تجاویزِ دہلی کو مرتب کیا اور یہ پیش کش کی کہ اگر ہندو ان تجاویز کو منظور کر لیں تو مسلمان جداگانہ طریقۂ انتخاب سے دستبردار ہو جائیں گے ۔ یہ گویا ہندو مسلم اختلافات اور برصغیر کی دو بڑی قوموں کی کشمکش کو سیاسی انداز میں حل کرنے کی ایک مخلصانہ کوشش تھی ۔
- ہندو مہاسبھا نے ان تجاویز کو رد کر دیا ۔ کانگریس نے ایک نہیں ، دو مرتبہ انھیں منظور کیا ، مگر جب انھیں جزوِ دستور بنانے کی نوبت آئی ، تو سرے سے ان کو نظر انداز کر دیا اور نہرو رپورٹ کے مجوزہ وحدانی دستور کو شرفِ منظوری عطا کیا !

- مسلمان زعما کے با اثر اور سنجیدہ گروہ نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور ہندو مسلم کشمکش کو ختم کرنے اور ہندوستان کی اُلجھی ہوئی سیاسی گتھی کو سلجھانے کی خاطر اس مجوزہ دستور میں صرف تین معقول اور منصفانہ ترمیمات پیش کیں لیکن اُنھیں ناکامی ہوئی ۔ نتیجۃً ہندوستان کی سیاسی اُلجھن عمیق تر اور اور ہندو مسلم اختلاف کی خلیج وسیع تر ہو گئی ۔
- کانگریس اور ہندو مہاسبھا کی طرف سے نہرو رپورٹ کو ایک عظیم دستوری دستاویز قرار دینے کے بعد ہندو ذہنیت برافگندہ نقاب سامنے آ گئی اور جب حکومت نے اس رپورٹ کو مسترد کر دیا تو کانگریس نے ''جنگِ آزادی'' کا اعلان اور سول نافرمانی کا آغاز کر کے ہندو عزائم کو بے نقاب کر دیا !
- نہرو رپورٹ اس حقیقت کی آئینہ دار تھی کہ ہندو ''متحدہ قومیت'' اور ''مشترکہ ملک'' کی بنأ پر نہیں بلکہ ''ایک قوم'' اور ''ایک وطن'' کی بنیاد پر ہندوستان کے مستقبل کی تشکیل کرنا چاہتے ہیں ۔ بالفاظ دیگر نہرو رپورٹ ہندوؤں کی بالا دستی کی دستاویز اور اکھنڈ بھارت کا ایک دستوری خاکہ تھا ـــــ اور سول نافرمانی کی تحریک اس دستور کو روبہ عمل لانے کا جارحانہ عزم ! یہ جارحانہ عزم عدم تشدد کا نقاب اوڑھے ، بظاہر تو برطانوی حکومت کے خلاف نظر آتا تھا ، لیکن مآل کار اس کا ہدف مسلمان ہی تھے ۔ اسی لیے سمجھدار مسلم زعماء نے مسلمانوں کو اس میں شریک ہونے سے روکا اور واقعتاً مسلمان بحیثیت مجموعی اس میں شریک بھی نہیں ہوئے ۔
- نہرو رپورٹ سے جس طرح ہندوؤں کے بنیادی لیکن بظاہر نئے سیاسی رجحان کا پتہ چلتا ہے ، اسی طرح ''تجاویزِ دہلی'' سے مسلمانوں کے ایک نئے لیکن دُور رس سیاسی اندازِ فکر کا آغاز ہوتا ہے ۔
- مسلمان اب تک ''دستوری تحفظات'' ہی کو سب کچھ سمجھ

رہے تھے ۔ یہ تحفظات اولاً صرف دو تھے ۔

(۱) جداگانہ طریقہ انتخاب اور

(۲) تعین نشست ۔ اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع میں آغا خان وفد نے ان ہی کا مطالبہ کیا تھا اور منٹو مارلے اسکیم (قانونِ دستورِ حکومتِ ہند سنہ ۱۹۰۹ع) میں تقریباً دونوں تحفظات انہیں دے دیئے گئے تھے سنہ ۱۹۱۶ع میں مسلمانوں نے ان دوتحفظات کے علاوہ مزید تحفظات کا مطالبہ کیا جس میں پاسنگ (weightage) کے مطالبہ کو نمایاں حیثیت حاصل تھی۔ میثاق لکھنؤ میں ہندوؤں (کانگریس) نے ان تمام مطالبات کو تسلیم کر لیا اور پھر یہ تحفظات مانٹیگو چمسفورڈ اسکیم (قانون دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ع) میں شامل کر لیے گئے ۔ چونکہ ان تحفظات کو خود ہندوؤں نے تسلیم کر لیا تھا ، اسی لیے مسلمان اپنے دستوری حقوق کی طرف سے بڑی حد تک مطمئن ہو گئے تھے اور ہندوستان میں مثالی اتحاد پیدا ہوگیا تھا ، جس کا مظاہرہ سنہ ۱۹۲۱ع کی تحریکِ عدم تعاون و سول نافرمانی کے زمانہ میں ہوا ۔ الغرض ان تحفظات ہی کو مسلمان اپنا واحد دستوری و سیاسی سہارا سمجھے ہوئے تھے اور اب سنہ ۱۹۲۷ع میں ایک طرف نئے دستوری اصلاحات کی آمد آمد تھی اور دوسری طرف برادران وطن (ہندو) ان تحفظات (زیادہ تر جداگانہ انتخابات اور ایک حد تک تعین نشست) ہی پر اعتراضات کی بوچھاڑ کر رہے تھے ، ایسے موقع پر مسلمانوں کے جرأت آزما سنجیدہ سیاسی مکتبِ فکر نے تجاویزِ دہلی کے ذریعہ ایک نئی راہ تلاش کی ۔ یہ راہ ایک حد تک تحفظات سے گریز اور توازنِ قوت کی راہ تھی ! ان تحفظات کی حیثیت ہندوؤں کی نظر میں ''مراعات'' کی سی تھی ۔ تنگ نظر ہندو مسلمانوں کو کسی رعایت کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے اور وسیع النظر ہندو بھی یہ سمجھتا تھا کہ وہ مسلمانوں کو ان تحفظات کا ''دان'' (بھیک) دے کر دنیائے سیاست میں ''پن نہیں ، '' مہا پاپ '' کر رہا ہے

ہے ! مسلمانوں کے ایک با اثر اور سنجیدہ سیاسی مدرسۂ فکر نے "تجاویزِ دہلی" کو مرتب کرکے "مراعات" کا مطالبہ نہیں بلکہ "مساوات" کا ادعا کیا تھا ! اس نے ہندوؤں کے سامنے ہاتھ پھیلا کر نہیں ، سر اٹھا کر کہا تھا کہ اگر تم سات صوبوں میں اکثریت رکھتے ہو تو ہم بھی پانچ صوبوں میں اکثریت رکھتے ہیں ، اگر ہم تمھارے سات صوبوں میں اقلیت میں ہیں تو تم بھی ہمارے پانچ صوبوں میں اقلیت میں ہو اور بقول مولانا محمد علی جوہر

"جو تم ہم سے سیدھم سادھم سودھم
تو ہم بھی تم سے سیدھم سادھم
سودھم ، اور جو تم ہم سے ٹینڈکر
ٹانکڑ ٹونکڑ تو ہم بھی تم سے....[۳۵]"

بہرکیف "تجاویزِ دہلی" مسلمانوں کے ایک نئے سیاسی رجحان کی نشان دہی کرتی ہیں ، یہ تحفظات سے زیادہ توازنِ قوت کی اور مراعات کے بجائے "مساوات" کی راہ دکھاتی ہیں ! جوں جوں وقت گذرتا گیا ، مسلمانوں کی نظروں کے سامنے یہ راہ زیادہ واضح ہوتی گئی بالآخر یہی راہ ان کے لیے "شاہراہ" بن گئی ! !

- مسلمانوں کا پرانا سیاسی مکتبۂ فکر اس نئے رجحان کا خیر مقدم تو کرتا ہے ، لیکن ساتھ ہی وہ "تحفظات" سے فی الفور دست بردار ہونے کے لیے تیار نہیں ہے - نیا مدرسۂ فکر دستوری میدان میں نسبتاً جرأت‌مند اور مہم پسند (adventurous) ہے اور پرانا مکتبِ خیال نسبتاً ذرا محتاط و دانش مند ! !
- جب کلکتہ کنونشن میں اس نئے مسلم سیاسی مکتبۂ فکر کو ناکامی سے دوچار ہونا پڑا تو ، اس نے بھی وہی مؤقف اختیار

۳۵- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۸ اپریل سنہ ۱۹۲۷ع

کر لیا ، جو پرانے سیاسی مکتبۂ فکر کا تھا کہ " تحفظ حقوق اور توازن قوت" دونوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہیے ۔ مسٹر جناح کے چودہ نکات اسی مؤقف (تحفظ حقوق و توازن قوت) کے آئینہ دار تھے ـــــ اور جن مسلمان لیڈروں نے ان سے اس مؤقف سے انحراف کیا، وہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے کٹ کر رہ گئے، وہ صرف اپنی ذات کے نمائندہ تھے ـــــ کانگریس کے خیمہ بردار !

یہ اس پُرخار سیاسی وادی کی پہلی منزل ہے ، جس میں اقبال نے عملی ر پر قدم رکھا ، آئیے دیکھیں انھوں نے اس منزل کو کس طرح طے کیا ۔

**ں سیاست کے میدان میں
قدم : اسباب و محرکات**

یوں تو علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز بیسویں صدی کی ابتدا ہی سے ہوتا ، جب کہ انھوں نے پبلک جلسوں میں سیاسی اور نیم سیاسی نظمیں پڑھنی وع کر دی تھیں ۔ اس کے بعد دوران قیام انگلستان ان کا تعلق لندن لم لیگ سے پیدا ہو چکا تھا ۔ انگلستان سے واپسی کے بعد بھی وہ برابر لم لیگ کے رکن رہے اور ہندوستان بالخصوص ممالک اسلامیہ کے سی حالات سے متعلق وہ اپنے تأثرات و جذبات کا اپنی شاعری کے ذریعے ہار کرتے رہے ۔ ملک و ملت کے سیاسی حالات و کوائف سے اقبال کے ، تعلق کا تفصیلی جائزہ گذشتہ صفحات میں ہم لے چکے ہیں ، لیکن حقیقت ہے کہ اس تعلق کی نوعیت عملی سے زیادہ ایک گونہ علمی ہے ۔ سنہ ۱۹۱ء سے عملی طور پر علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا آغاز ہوتا ہے ۔

اقبال کے دوست احباب اور عقیدت مند ایک عرصہ سے انھیں مجبور کر ہے تھے کہ وہ مجلس قانون ساز (پنجاب لیجسلیٹیو کونسل) کے انتخابات ، حصہ لیں ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۲۳ء کے انتخاب میں انھیں بہت مجبور کیا ا ۔ دوستوں نے اصرار کیا ، عوام نے وفود بھیجے ، اگر وہ لاہور سے ونسل کی رکنیت کے لیے کھڑے ہو جاتے تو کامیابی یقینی تھی ، لیکن مہ نے محض اس بنا پر انکار کر دیا کہ اسی حلقۂ انتخاب سے میاں عبدالعزیز ونسل کی ممبری کے لیے کھڑے ہو رہے تھے اور علامہ سے ان کے دیرینہ قات تھے ۔ اقبال کی مروت نے گوارا نہ کیا کہ وہ میاں عبدالعزیز کے

مقابلہ میں کھڑے ہو کر انہیں آزردہ کریں[۳۶]۔ سنہ ۱۹۲۶ع کے انتخابات میں بھی حصہ لینے سے وہ محض اس لیے کترا رہے تھے کہ کہیں میاں عبدالعزیز ناراض نہ ہو جائیں، یا ان سے مقابلہ نہ ہو جائے۔ لیکن جب عبدالعزیز نے علامہ اقبال کے حق میں دستبرداری کا اعلان کر دیا تو دوستوں کے شدید اصرار پر وہ انتخابات میں حصہ لینے کے لیے آمادہ ہو گئے اس طرح انہوں نے گوشۂ عافیت کو ترک کر کے عملی سیاست کے میدان میں قدم رکھا۔ سابقہ طرز عمل سے یہ انحراف، انہوں نے کیوں کیا، تخیل کی بلندیوں سے اتر کر وہ سیاست کی وادیوں میں کیوں داخل ہوئے اور وہ کون سا پرزور محرک تھا جس نے انہیں شعر و شاعری کے گلزار سے دھکیل کر سیاست کے خار زار میں پہنچایا! اس کو خود ان ہی کی زبان سے سنیئے۔ ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۲۶ع کو انہوں نے اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان بذریعہ اخبارات کیا۔ اس اعلان میں وہ فرماتے ہیں۔

"اب مناسب معلوم ہوتا ہے کہ میں اپنی امیدواری کا باقاعدہ اعلان کر دوں مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغل سے بالکل علیحدہ رہا، محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کام انجام دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ اپنا حلقہ عمل قدرے وسیع کر دوں۔ **شاید میرا ناچیز وجود اس طرح اس ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے، جس کی خدمت میں میری زندگی کے تمام لیل و نہار گذرے ہیں**۔۔۔ میرے خیالات و جذبات ہر مسلمان پر روز روشن کی طرح آشکار ہیں اور مجھے کامل امید ہے کہ وہ کونسل میں اپنے حقوق کی حفاظت اور اپنے خیالات کی ترجمانی کے لیے میری ذات پر اعتماد کرنے میں ایک لحظہ کے لیے بھی متامل نہ ہوں گے۔ میں اپنے طول و طویل دعاوی کو شائستۂ توجہ نہیں سمجھتا۔ عمل دلی جذبات کے ملفوظ

۳۶۔ اخبار امروز کراچی اقبال نمبر مورخہ ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع۔

اظہارات کا بہترین معیار ہے ۔ خدا کرے میں اس معیار پر پورا اتر سکوں[۴۷]"

بتاریخ ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء ایک انتخابی جلسہ میں جو تقریر انہوں نے کی ، اس میں بھی ان محرکات کی طرف کچھ اشارے ملتے ہیں ۔

"میں انگریزی ، اردو ، فارسی میں برنگ نثر بھی اپنے خیالات کا اظہار کر سکتا تھا لیکن یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ طبائع نثر کی بہ نسبت شعر سے زیادہ متاثر ہوتی ہیں ۔ لہذا میں نے مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے ، اسلاف کے نقش قدم پر چلانے اور نا امیدی ، بزدلی اور کم ہمتی سے باز رکھنے کے لیے نظم کا ذریعہ استعمال کیا ۔ میں نے پچیس سال تک اپنے بھائیوں کی مقدور بھر ذہنی خدمت کی ۔ اب میں ان کی بطرز خاص عملی خدمت کے لیے اپنے آپ کو پیش کر رہا ہوں ۔

اسلامیان ہند پر عجب دور گزر رہا ہے ۔ سنہ ۱۹۲۹ء میں ایک شاہی مجلس تحقیقات اصلاحات ، جسے رائل کمیشن[۴۸] کہتے ہیں ، یہ تحقیق کرے گی کہ آیا ہندوستان مزید رعایات و اصلاحات کا مستحق ہے یا نہیں ـــــ ضرورت ہے کہ مسلمان بھی اس باب میں پوری توجہ سے کام لیں اور اپنے حقوق کا تحفظ کریں ۔ ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو "مقاصد قوم" پر قربان کر دے ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی بھی اپنے مفاد کو "قوم کے مصالح" کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دوں گا اور رب العزت سے دعا کرتا ہوں کہ وہ مجھے اس امر کی توفیق بخشے

۴۷- اخبار زمیندار لاہور ۲۰ جولائی سنہ ۱۹۲۶ء ۔

۴۸- جس رائل کمیشن کا ذکر علامہ اقبال یہاں کر رہے ہیں ، وہ سائمن کمیشن تھا ، جس کا اعلان نومبر ۱۹۲۷ء میں برطانوی حکومت نے کیا اور جس نے بجائے ۱۹۲۷ء کے فروری ۱۹۲۸ء میں ہندوستان کا دورہ کیا اور اپریل ۱۹۲۹ء میں اپنا کام ختم کیا ۔

کہ میں آپ کی خدمت کر سکوں ۔ میں اغراض ملی کے مقابل
" ذاتی خواہشوں " پر مر مٹنے کو موت سے بدتر خیال
ہوں[۳۹] "

ــــ تو لیجئے ذاتی خواہش یا شخصی مفاد وہ محرک نہ تھا جو ایک عزلت نشین مفکر و شاعر کو سیاست کے ہنگاموں میں لا کھڑا تھا ! عام طور پر سیاست اور خصوصاً پارلیمانی سیاست میں وہی لوگ لیا کرتے ہیں ، جو جاہ و منصب کے طالب ہوتے ہیں ۔ لیلائے وزار وصل کی خاطر ہی سیاست کے کوچوں کی خاک چھانی جاتی ہے اور صدرات کے لیے ہی اسمبلی و کونسل کی غلام گردشوں کے چکر جاتے ہیں ، لیکن اقبال کی نظر میں یہ مقاصد ہیچ تھے ، ان کے دل م تمنائے وزارت تھی اور نہ خواہش صدارت اور نہ حصول منصب و آرزو ! وہ تو " ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو موت سے برتر خیال ہیں " پھر یہ فقط زبانی جمع خرچ نہ تھا ، ووٹروں کو صرف پھلا نہ تھا ، بلکہ جو کچھ انہوں نے انتخاب سے پہلے اور انتخابی جلسو کہا تھا وہی کچھ انتخاب کے بعد اسمبلی میں پہنچ کر ، کر دکھا کا مفصل تذکرہ اپنے موقع پر آئندہ آئے گا ۔ الغرض حصول منصب یا ان کے اپنے الفاظ میں " ذاتی خواہش یا شخصی مفاد " وہ محرک جس نے ان کو سیاست کے کانٹوں میں گھسیٹا تھا ۔ تو پھر دوسرا کیا تھا ؟ قومی منفعت اور " ملی غرض" ! لیکن پھر بھی یہ سوا ہوتا ہے کہ قومی حقوق و مفادات کا حصول ہی پیش نظر تھا تو ا پہلے عملی سیاست سے صرف نظر کیوں کیا گیا اور اب اس خاص س ہی اس کی طرف قدم کیوں اٹھایا گیا ؟ اس کا جواب ان کے اعلان اسی کے ان فقرات میں ملتا ہے :

" مسلمانوں کو معلوم ہے کہ میں اب تک اس قسم کے مشاغ
بالکل علیحدہ رہا ، محض اس لیے کہ دوسرے لوگ یہ کا

۳۹- اخبار زمیندار لاہور ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ ع -

دے رہے تھے اور میں نے اپنے لیے دوسرا دائرہ کار منتخب کر لیا تھا ۔ لیکن اب قوم کی مصیبتیں مجبور کر رہی ہیں کہ میں اپنا دائرہ عمل قدرے وسیع کروں ، شاید میرا ناچیز وجود اس طرح ملت کے لیے زیادہ مفید ہو سکے[۵۰] ''

یہ دائرہ کار جس کو انہوں نے اپنے لیے منتخب کر رکھا تھا ، ظاہر ہے کہ شعر و شاعری کا '' حلقۂ ابریشم '' تھا ، جس کے ذریعہ بقول ان ہی کے وہ مسلمانوں کو زندگی کے صحیح مفہوم سے آشنا کرنے اور اسلاف کے نقش قدم پر چلانے کی کوشش کر رہے تھے ، لیکن اب '' قوم کی مصیبتوں '' نے ان کو مجبور کر دیا تھا کہ وہ بزمِ شاعری سے آگے بڑھ کر رزمِ سیاست میں داخل ہوں ! ! اب تک وہ شعر و نغمہ کے ہلکے سروں سے قوم کو جگانے کی کوشش کر رہے تھے ، لیکن اب قوم کی مصیبتیں انہیں '' صورِ اسرافیل '' پھونکنے پر مجبور کر رہی تھیں ـــ شاعر کی '' بانگ درا '' اب کافی نہ تھی ، وقت کا تقاضا سیاستدان کے ''ضرب کلیم'' کا مطالبہ کر رہا تھا !ـــ لیکن آخر یہ قومی مصائب اور وقت کے تقاضے تھے کیا ؟ اگر آپ ان واقعات پر ایک سرسری نظر ڈال لیں جو ہم اس باب میں اور اس سے پہلے کے دوسرے ابواب میں ، بطور پس منظر بیان کرتے آئے ہیں ، تو آپ خود ہی اُن '' قومی مصائب اور وقت کے تقاضوں'' کو پہچان لیں گے ، جن کی طرف اقبال نے یہاں اشارہ کیا ہے ـــ اقبال کے شعورِ اجتماعی کا آغاز ، انسیویں صدی کے اختتام اور بیسویں صدی کی ابتدأ سے ہوتا ہے ۔ اس شعور کی جھلکیاں ان کی وطن پرستانہ نظموں میں دکھائی دیتی ہیں اور یہ اس دور کے اجتماعی رجحانات کی آئینہ دار بھی ہیں ۔ سنہ ۱۹۰۵ع سے سنہ ۱۹۰۸ع تک وہ ہندوستان سے دور ، انگلستان میں رہے اور یہیں ان کی نظروں کے سامنے وطنی قومیت کا پردہ چاک ہوا اور مسلم قومیت کا عقدہ ان پر وا ہوا ۔ جب وہ ہندوستان واپس لوٹے تو انہوں نے مسلم قومیت کے حامل افراد کو وطنی قومیت کے علمبرداروں سے دور اور کھنچا کھنچا سا پایا اور انہیں اندرونی و بیرونی پریشانیوں میں مبتلا

۵۰- اخبار زمیندار لاہور مورخہ ۲ جولائی سنہ ۱۹۲۶ع ۔

دیکھا ۔ اردو ہندی کے جھگڑے اور تقسیم بنگال کی تنسیخ نے مسلمانوں کو ہندوؤں سے دور کر دیا تھا ۔ مسجد کانپور کا حادثہ ، ترکی و ایران کے لیے روس کا خطرہ ، طرابلس کی جنگ ، ریاست ہائے بلقان کی مملکت ترکیہ کے خلاف جنگ وغیرہ ، یہ وہ مصائب تھے جن سے مسلمانان ہند دلگیر تھے ۔ تاہم ملکی سیاست میں یہ امر باعث طمانیت تھا کہ منٹو مارلے اصلاحات میں جدا گانہ انتخاب کے ذریعہ انہیں اپنے قومی تشخص کی ضمانت مل گئی تھی ۔ ان حالات میں اقبال نے اس قومی تشخص کے ثبات و قرار کے لیے " ملی ترانے " گائے ، خدا سے " شکوہ " کر کے مسلمانوں کے زخموں پر ہمدردی و دلاسائی کا پھاہا رکھا ، " شاعر " کی زبانی ملت کا دکھڑا بیان کر کے "شمع" کو رلایا ، "مسلم" کی حالت زار کا نقشہ کھینچا" ، حضور رسالت مآب میں طرابلس کے شہیدوں کا لہو بطور نذرانہ پیش کیا اور غمگین و مایوس مسلمانوں کو ، خزاں رسیدہ گلشن میں "نئی کلیوں" کے کھلنے اور بجھی ہوئی خاکستر سے "نئی چنگاریوں" کے نکلنے کی نوید سنائی !۔۔۔ اس کے بعد حالات میں ایک غیر معمولی تغیر ہوا ، پہلی عالمی جنگ چھڑ گئی ، ترکوں نے اتحادیوں کے خلاف اس جنگ میں جرمنی کا ساتھ دیا ۔ جرمنی کی شکست کے بعد اتحادیوں کا نزلہ ترکی کے عضو ضعیف پر کیا گرا ، مسلمانان ہند پر بجلی سی گر گئی ۔۔۔ تحریک خلافت شروع ہوئی ۔ رولٹ بل ، پنجاب پر مظالم ، جلیانوالہ باغ کا حادثہ اور پنجاب میں مارشل لا کے واقعات سے دلوں میں آگ لگ گئی ۔ علمبرداران وطنی قومیت نے موقع سے فائدہ اٹھایا اور ترک تعاون اور سول نافرمانی کی تحریکیں شروع کر دیں ، جس میں مسلمانوں نے ہندوؤں کے دوش بدوش نہیں بلکہ ان سے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ۔ برطانوی حکومت کے خلاف ہندو مسلم تعاون و اشتراک کے اس زمانے میں ایسے ایسے مناظر دیکھنے میں آئے کہ اچھے خاصے سمجھدار لوگوں نے بھی دھوکہ کھایا کہ ہندو مسلم اتحاد نہیں بلکہ " متحدہ قومیت " عالم وجود میں آ چکی ہے ۔ اقبال اس زمانہ میں مسلمانوں کو درس " خودی " دیتے اور " رموز بے خودی " سے آشنا کرتے رہے ۔ یہ درس خودی کیا تھا ؟ ساری دنیا کی دوسری قوموں اور خصوصاً وطنی قوموں سے علیحدہ ، مسلمانوں کی اپنی پہچان ، اور اپنی

نا " کی دریافت ! اور بے خودی کے رموز کیا تھے ؟ " انفرادی انا "
" ملی انا " سے وابستگی ، ربط و اتصال ! ! گویا علمبردارانِ وطنی
یت سے اس بڑھتے ہوئے اشتراک و تعاون کے دور میں مسلمانوں کو ان
اپنی اصلیت یعنی مسلم قومیت کے تحفظ کی بار بار یاد دہانی !
۱۹۲۳ء میں حالات نے ایک اور پلٹا کھایا - وطنی قومیت کے چہرہ
سے متحدہ قومیت کی نقاب الٹ گئی - ہندو جارحیت علی الاعلان خم
نک کر میدان میں آ گئی - سنہ ۱۹۲۱ء کی تحریکِ ترکِ تعاون و سول
رمانی میں ہندوؤں کو گلے لگانے اور ان کے گرو کو " مہاتما " بنانے
صلہ ، مسلمانوں کو شدھی و سنگھٹن کی صورت میں ملا ! ان کے خون سے
ہ رنگین کیے گئے ، دینِ حق اور پیغمبر برحق پر حملے کیے گئے !
ی قومیت کے یہ آثارِ جنوں کس بات کی غمازی کر رہے تھے ؟ صرف
، امر کی کہ ترکِ تعاون اور سول نافرمانی کے ہتھیاروں سے مسلح
کر برطانوی حکومت سے ٹکر لینے کے بعد اب اس میں یہ طنطنہ پیدا
چلا تھا کہ وہ چاہے تو انگریز کو جھکا سکتی اور اس سے اپنے من مانے
البات منوا سکتی ہے ، لہذا اب مسلمانوں کو ملائے رکھنا نہیں بلکہ
یں تو دبائے رکھنا چاہیے ! اسی زعم و پندار کا نیتجہ ، وہ دستوری اسکیم
ی ، جو نہرو رپورٹ کی شکل میں سامنے آئی - ایک طرف ہندوؤں کے یہ
ائم اور ان کا یہ دم خم تھا اور دوسری طرف برطانوی حکومت سیاسی
لاحات کی پانچویں قسط دینے کا اعلان کر چکی تھی - اب تک تو منٹو
رلے اور مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات میں مسلمانوں کے قومی تشخص کا
ظ ، جدا گانہ انتخابات اور نشستوں کے تعین کی صورت میں موجود تھا -
ر ان دستوری اصلاحات کے ذریعے عملاً حقیقی اختیارات ہندوستانیوں کو
ئے بھی نہیں گئے تھے - منٹو مارلے سکیم میں تو تمام اختیارات انگریز
ورنر و وائسرائے کے ہاتھوں میں تھے ، منٹیگو چمسفورڈ اسکیم میں گنے
ے اختیارات عطا کیے گئے تھے ، مگر گورنر و وائسرائے ہی مقتدر حاکم
ے - بات دراصل یہ تھی کہ یہ اصلاحات عرض معروض کر کے مانگے گئے
ے ، لڑ بھڑ کر حاصل نہیں کیے گئے تھے - لیکن ترکِ تعاون اور سول
فرمانی کی تحریکات کی نوعیت درخواستوں اور التجاؤں کی نہیں لڑائی اور

جنگ کی تھی —— عدم تشدد کی لڑائی ، ستیہ گرہی جنگ ! اس لیے دستوری اصلاحات کی جو قسط آنے والی تھی ، وہ محض دکھاوا نہ ہوتی بلکہ حقیقی اختیارات کی منتقلی کی بڑی حد تک آئینہ دار ہوتی ۔ پھر اس امر کا بھی اندیشہ اور خطرہ تھا کہ عدمِ تشدد کی اس جنگ سے گھبرا کر برطانوی حکومت ، مسلمانوں کو نظر انداز کر کے جارحانہ وطنی قومیت کے سامنے گھٹنے نہ ٹیک دے ! ! رائل کمیشن (سائمن کمیشن) کا اعلان جس کی طرف علامہ اقبال نے اپنی انتخابی تقریر میں اشارہ کیا ہے ، حکومت کی اسی گھبراہٹ کا اظہار تھا ۔ وطنی قومیت کی جارحیت ننگی ہو چکی تھی ۔ نام نہاد '' متحدہ قومیت '' کی لاش کو وہ ٹھکانے لگا چکی تھی اور اب وہ مسلمانوں کو دبوچ لینا اور ان حاصل ہونے والے اختیارات سے بھرپور فائدہ اٹھانے پر تلی بیٹھی تھی —— یہی وہ '' قومی مصیبت '' تھی ، جس کی طرف علامہ اقبال نے اپنی انتخابی تقریر میں اشارہ کیا ہے اور اس کے باعث انہیں ، شاعرانہ پیغام رسانی کی دلکش روش کو چھوڑ کر سیاست کی پرخطر راہ کو اختیار کرنا پڑا ۔

حقیقت یہ ہے کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی سیاست ایک نازک موڑ پر آ گئی تھی ۔ مسلمان ایک دوراہے پر حیران و سراسیمہ کھڑے تھے ۔ انہوں نے بھائی بنا کر جنھیں گلے لگایا تھا ، ترکِ تعاون و سول نافرمانی کے زمانہ میں جنھیں ساتھ لے کر برطانوی حکومت سے ٹکر لی تھی ، اب انہوں نے ان کے دستِ تعاون کو جھٹک دیا تھا ۔ وہ اپنی بالا دستی ان پر قائم کرنا اور انہیں اپنا دست نگر بنانا چاہتے تھے ۔ مسلمان گو مگو کے عالم میں تھے کہ کیا کریں کیا نہ کریں ۔ اگر اس نازک مرحلہ پر علامہ اقبال عملی سیاست کے میدان میں قدم نہ رکھتے اور حسب سابق شاعرانہ راگ الاپتے رہتے تو کیا وقت کے تقاضوں کو پورا کرتے؟ —— یہ وہ حالات تھے جنھوں نے اقبال کو شاعری کی دنیا سے نکل کر سیاست کی دنیا میں قدم رکھنے پر مجبور کیا تھا !

اقبال بحیثیت رکن پنجاب کونسل

بہرحال سنہ ۱۹۲۶ع میں وہ پنجاب کونسل کی رکنیت کے لیے لاہور کے حلقۂ انتخاب سے کھڑے ہوئے ۔ ان کی شاعرانہ شہرت اور عملی رفعت کے پیش نظر تو انہیں

بلا مقابلہ منتخب ہو جانا چاہیے تھا ، چنانچہ ان کے مقابلہ میں دو جلیل القدر اسیدواروں نے اپنے نام واپس لے لئے ۔ لیکن خان بہادر ملک محمد دین نے مقابلہ کا تہیہ کر لیا اور ان کی وجہ سے علامہ کو انتخابی کشمکش کے میدان میں اترنا پڑا ۔ لاہور کے ہر محلے میں ان کی حمایت میں جلوس نکالے گئے ، جلسے ہوئے اور بعض جلسوں سے خود علامہ نے خطاب کیا ۔ شہر کی تمام برادریوں نے ان کی حمایت میں پمفلٹ شائع کئے[۵۱]۔ یہ انتخابی مہم بڑی دلچسپ بن گئی تھی ، اس لیے کہ ملک صاحب کے کارکنوں میں اکثر افراد ایسے تھے ۔ جو علامہ کی عظمت سے نا آشنا نہ تھے[۵۲]۔ انتخابی مہموں میں امیدواروں کو ہزاروں روپے خرچ کرنے پڑتے ہیں ، لیکن علامہ نے معتدبہ رقم خرچ کیے بغیر اپنے حریف کے مقابلہ میں تقریباً تین ہزار آراء (ووٹوں) کی اکثریت سے شاندار کامیابی حاصل کی[۵۳]۔ انہیں پانچ ہزار چھ سو پچھتر ووٹ ملے اور ان کے مقابل اسیدوار کو دو ہزار چھ سو اٹھانوے[۵۴] اس طرح ۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ع کو وہ پنجاب کونسل کے رکن منتخب ہو گئے[۵۵]۔

پنجاب کی مقننہ میں آپ نے مختلف اوقات میں جو کچھ کیا اس کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

(۱) ۲۳ فروری ۱۹۲۸ع کو آپ نے مقننہ میں مسئلہ لگان پر بڑی دلچسپ تقریر کی ، جس میں آپ نے واضح کیا کہ لگان وصول کرنے کا موجودہ طریقہ سراسر نا انصافی پر مبنی ہے ، اس سلسلہ میں آپ نے بتایا کہ حکومت لگان وصول کرنے کو اپنا حق اس لیے تصور کرتی ہے کہ وہی

۵۱- نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۴۰ ۔

۵۲- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور ص ۶۷ ۔

۵۳- مکاتیب شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ حیدر آباد دکن ص ۱۷۳ ۔

۵۴- روز گار فقیر '' جلد اول از فقیر وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم مارچ ۱۹۶۵ع ص ۱۰۳ ۔

۵۵- سول ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۲۶ع ۔

زمین کی مالک ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس نظریہ کی تردید کرتے ہوئے واضح کیا کہ یہ خیال اب فرسودہ ہو چکا ہے۔ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا ۔

”پہلا یورپی مصنف ، جس نے سنہ ۱۷۷۷ء میں اس نظریہ کی تردید کی ، وہ ایک فرانسیسی برن نامی تھا ، اس کے بعد سنہ ۱۸۳۰ء میں برگس نے مملکت کے حق ِ ملکیت ِ زمین کے نظریہ اور ہندوستان میں اس سے متعلق قانون و رسم و رواج کے متعلق وسیع تحقیق و تفتیش کی ۔ اس نے اپنی کتاب میں منو کے قوانین اور اسلامی شریعت اور ان رسوم کا ، جو ہندوستان کے مختلف اقطاع میں رائج تھے ، مفصل تذکرہ کیا ہے اور اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ تاریخ ِ ہند کے کسی زمانہ میں بھی مملکت نے زمین پر اپنی حقیقت کا ادعا نہیں کیا ۔ لارڈ کرزن کے زمانہ میں یہ نظریہ ضرور پیش کیا گیا تھا ، مگر محصول کمیٹی اس نتیجہ پر پہنچی کہ اس نظریہ کی کوئی بنیاد ہی نہیں ہے[۵۶]“

اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس خیال کا اظہار کیا کہ اس نظریہ کی بنیاد پر لگان وصول کرنا غلط ہے ۔ علاوہ بریں لگان کی وصولی کا موجودہ طریقہ سراسر نا انصافی پر مبنی ہے ۔ محصول آمدنی (Incom Tax) کی وصولی کے سلسلہ میں محصول ادا کنندہ کی صلاحیت و استطاعت کو ملحوظ رکھا جاتا ہے ۔ یعنی جس شخص کی آمدنی زیادہ ہوتی ہے ، اس سے زیادہ محصول لیا جاتا ہے اور جس کی آمدنی کم ہوتی ہے اس سے کم لیا جاتا ہے اور بعض ایسے اشخاص سے جن کی آمدنیاں بالکل کم ہوتی ہیں ، یہ محصول لیا ہی نہیں جاتا ۔ زراعت من جملہ ذرائع معاش کے ایک ذریعہ معیشت ہے ، لیکن یہاں لگان ہر زراعت پیشہ سے وصول کیا جاتا ، چاہے وہ کتنے ہی چھوٹے سے رقبۂ زمین پر کاشت کرتا ہو اور خواہ اس سے اس کو کتنی ہی کم آمدنی حاصل ہوتی ہو ۔ چنانچہ آپ نے اپنی تقریر میں فرمایا ۔

۵۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۷۵ ، ۷۶ ۔

" اگر کوئی شخص زمیندار ہو ، خواہ چھوٹا ہو یا بڑا تو اس کو لازماً لگان ادا کرنا پڑتا ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص زمین کے علاوہ کسی اور ذریعہ سے دو ہزار روپیہ سالانہ سے کم آمدنی پیدا کرے تو آپ اس پر محصول عائد نہیں کرتے[۵۷] "

اس لیے ڈاکٹر صاحب کی تجویز یہ تھی کہ جس شخص کے پاس پانچ بیگھے سے زیادہ زمین نہ ہو اور جہاں آبپاشی نہ کی جا سکتی ہو اور جس کی پیداوار عملاً معین مقدار میں ہوتی ہو ، اس پر لگان نہ لگایا جائے[۵۸]۔

(۲) حکومتِ پنجاب نے نیلی بار ضلع منٹمگری میں سوا تین لاکھ ایکڑ رقبہ زیادہ تر سرمایہ داروں کے ہاتھ فروخت کیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ تحریک پیش کی تھی کہ اس زمین کا نصف حصہ مزارعین کے لیے مخصوص کر دیا جائے ۔

(۳) پنجاب میں ایک بے ہودہ جماعت ایسی موجود تھی ، جو مذہبی پیشواؤں کے متعلق ذلیل قسم کا لٹریچر شائع کر رہی تھی اور بزرگان دین کی توہین کو اپنا شعار بنائے ہوئے تھی ۔ اس جماعت کی وجہ سے ہندوستان کی فضا بالعموم اور پنجاب کی فضا بالخصوص بہت مکدر ہو گئی تھی ، ڈاکٹر صاحب نے مقننۂ پنجاب میں یہ تحریک پیش کی کہ گورنر جنرل با جلاس کونسل سے یہ سفارش کی جائے کہ مذہبی پیشواؤں اور بزرگوں پر جو کینہ پرور اور اہانت آمیز حملے کئے جاتے ہیں ان کے انسداد کے لیے ایک قانون نافذ کیا جائے ۔ چنانچہ یہ قانون سنہ ۱۹۲۷ع میں نافذ ہو گیا ۔

(۴) ڈاکٹر صاحب نے مقننۂ پنجاب میں انسدادِ شراب نوشی اور تلوار کو قانون اسلحہ سے مستثنٰی کرانے کی تحریکیں بھی پیش کی تھیں ۔

(۵) ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۲۷ع کے اجلاسِ مقننہ میں سرکاری عہدوں کو کھلی مسابقت کے ذریعہ پر کرنے کی تجویز سردار اجل سنگھ نے پیش

۵۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی طبع دوم ص ۷۶ ۔

۵۸- ایضاً ص ۷۹ ۔

کی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تحریک کی مخالفت کی اور یہ ترمیم پیش ک
کہ مسابقت اور ناسزدگی و انتخاب (Selection) کا ملا جلا طریقہ اختیا
کیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب نے کھلی مسابقت کی مخالفت اس بناء پر کی تھ
کہ ملک میں فرقہ واریت کا زور ہے ، متحدہ قومیت کا نعرہ صرف زبا
پر ہے اور دلوں میں فرقہ پرستی کا زہر بھرا ہوا ہے ، ہر فرقہ دوسر
فرقہ کی تخریب کے در پے ہے اس لیے سرکاری عہدوں پر تقررات کا طری
ایسا ہونا چاہیے جس سے تمام فرقوں کو یکساں مساوی مواقع سلیں[59]۔

(٦) علامہ مرحوم نے مقننۂ پنجاب میں آیورویدک اور یونانی طری
علاج کی ہمت افزائی کرنے کے لیے حکومت کو متوجہ کیا ۔ آپ نے یہ را
ظاہر کی کہ مغربی طب اب بھی بہت کچھ مشرقی طب سے سیکھ سکتا ۔
مشرقی طب ملک کی آب و ہوا کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ موزوں ہے ، پ
اقتصادی نقطہ نظر ہندوستان جیسے غریب ملک کے لیے مشرقی طب سس
طریقۂ علاج ہے اس لیے حکومت کو چاہئے کہ اس طریقۂ علاج کی ہمت افزا
کرے ۔

(٧) آپ نے صوبہ کی صنعتی ترقی ، تعلیم کی عام اشاعت اور غری
طبقہ کی فلاح و بہبود کے مسائل پر ہمیشہ زور دیا ۔

(٨) ٥ مارچ سنہ ١٩٢٧ع کو آپ نے سنہ ٢٨ ، ١٩٢٧ع کے میزانی
پر تقرر کرتے ہوئے دو اہم تجاویز پیش کیں ۔

(الف) دیہات میں صفائی کے بہتر انتظامات اور عورتوں کو طبی امدا
بہم پہنچانے کے لیے رقم کا ایک خاص حصہ محفوظ کر دیا جائے ۔ آپ ک
دلیل یہ تھی کہ معتمد مالیات کے بیان کے مطابق صوبہ کی مالی حالت
اطمینان بخش ہے اور کافی رقومات صوبہ کی ترقی کے کاموں پر صرف کی ج
رہی ہیں اس لیے آپ نے اس امر پر زور دیا کہ سب سے پہلے ہمیں دیہات ک
صفائی اور عورتوں کی طبی امداد پر زیادہ رقم خرچ کرنی چاہیے ۔

٥٩- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمہ
لاہور طبع دوم ١٩٤٨ع ص ٤٢ -

(ب) محاصل خصوصاً لگان میں کمی کی جائے۔ آپ نے یہ بھی بتایا کہ حکومتِ ہند نے ۸۶ لاکھ روپیہ کی گرانقدر رقم صوبہ کو دینے کا وعدہ کیا ہے۔ اگر یہ رقم وصول ہو جائے تو محاصل میں کمی ہونی چاہیے۔ آپ نے ساتھ ہی ساتھ اس امر کی تشریح کی کہ محاصل میں کمی کرنے سے آپ کی مراد یہ ہے کہ طریقہ محصول اندازی میں جو نا انصافی ہے اس کو رفع کیا جائے۔ آپ نے پہلی مرتبہ مقننۂ پنجاب میں یہ واضح کیا کہ محصول آمدنی کو عائد کرتے وقت تو اس اصول کو مدنظر رکھا جاتا ہے کہ ہر شخص پر اس کی قابلیت ادائی محصول کے لحاظ سے محصول عائد کیا جائے لیکن لگان کے سلسلے میں اس اصول کو نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ آپ نے اس امر پر زور دیا کہ حکومتِ ہند ۸۶ لاکھ کی رقم صوبہ کو دے رہی ہے اس لیے حکومت پنجاب اس اصول کو لگان پر منطبق کرے اور اس میں کمی کر دے۔

(۹) ۱۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ع کو ڈاکٹر صاحب نے مقننہ میں حکومتِ پنجاب کی تعلیمی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے ابتدائی تعلیم کے جبری نفاذ پر زور دیا۔ آپ نے پنجاب میں تعلیمی ترقی کی رپورٹ بابت ۲۶ ، ۱۹۲۵ع کا حوالہ دیتے ہوئے یہ بتایا کہ تعلیم پر جو معتدبہ رقومات صرف کی جا رہی ہیں ان کا خاطر خواہ نتیجہ نہیں نکل رہا ہے۔ اس رپورٹ میں یہ سفارش کی گئی تھی کہ تعلیمی مدات پر جو رقومات صرف کی جا رہی ہیں اگر ان سے خاطر خواہ فائدہ اٹھانا پیش نظر ہے تو پھر جبری تعلیم کا نفاذ ہونا چاہیے۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی تقریر میں یہ بتایا کہ ۴۲ بلدی مدارس اور چار سو چار مدارس میں جبری تعلیم کے اصول پر عمل کیا جا رہا ہے۔ لیکن یہاں حقیقی اور ٹھوس کام نہیں ہو رہا ہے۔ صرف چند مدارس میں جبری تعلیم کے نفاذ سے تعلیم کو عام نہیں کیا جا سکتا۔ پھر ان مدارس میں بھی اس اصول پر سختی سے عمل نہیں کیا جا رہا ہے اس لیے آپ نے حکومت سے اپیل کی کہ فوراً پورے صوبہ میں ابتدائی جبری تعلیم نافذ کرے۔

(۱۰) ۴ مارچ سنہ ۱۹۲۹ع کو آپ نے مقننہ پنجاب میں سنہ ۳۰ ، ۱۹۲۹ع کے موازنہ پر نہایت مبسوط تبصرہ کیا۔ اس موازنہ کا قبیح پہلو یہ تھا کہ متواتر پانچ سال کی خوشحالی کے دور کے بعد یہ پہلا موازنہ تھا ،

جس میں خسارہ دکھایا گیا تھا اور اس خسارہ کو پورا کرنے کے لیے حکومت نے ایک کروڑ چالیس لاکھ روپیہ قرض لینے کی تجویز پیش کی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس تجویز کی مخالفت کی اور صوبے کی مالی حالت کو بہتر بنانے اور اس کے ذرائع آمدنی میں اضافے کے لیے حسب ذیل تجاویز پیش کیں۔

(الف) حکومتِ پنجاب حکومتِ ہند کو توجہ دلائے کہ وہ محصول آمدنی کو مرکزی حکومت کے ذریعۂ آمدنی کی بجائے صوبہ واری حکومتوں کا ذریعۂ آمدنی قرار دے۔

(ب) محصول فوتگی (Death Duty) عائد کیا جائے۔ بیس ہزار روپیہ سے زائد مالیت کی جائداد اگر کوئی شخص ورثہ میں حاصل کرے، تو اس پر یہ محصول لگایا جائے۔

(ج) اونچی تنخواہوں میں تخفیف کی جائے اور مشنری سستے بازاروں سے حاصل کی جائے۔

(۱۱) ۷ مارچ سنہ ۱۹۳۰ع کو آپ نے مقننہ میں سنہ ۳۱، ۱۹۳۰ع کے موازنہ پر بڑی دلچسپ تقریر کی۔ اس سال کے موازنہ میں خسارہ تھا اور معتمدِ مالیات نے یہ اعتراف کیا تھا کہ موازنہ کی یہ ایک مستقل خصوصیت بن گئی ہے۔ آپ نے معتمدِ مالیات کے اس اعتراف پر تبصرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ۔

> " جناب والا! ہم جانتے ہیں کہ صوبہ پہلے ہی سے مقروض ہے۔ بیروزگاری کا مسئلہ آئے دن سخت تر ہوتا جا رہا ہے۔ تجارت سرد پڑ گئی ہے۔ آپ آسانی سے تصور کر سکتے ہیں کہ صوبہ کا مالی مستقبل کیا ہوگا۔ میں یہ خیال کرنے کی طرف مائل ہوں کہ موجودہ صورت حال کی ذمہ داری بندھی ہوئی آمدنیوں پر اتنی زیادہ عائد نہیں ہوتی، جتنی کہ موجودہ نظم و نسق پر عائد ہوتی ہے، جس کی وجہ سے اونچی تنخواہیں دینی پڑتی ہیں اور اس معاملہ میں اس صوبہ کے عوام کی آواز کو کوئی دخل نہیں ہے۔ میرے خیال میں اس صوبہ کے عوام کے لیے تین متبادل صورتیں ہیں

(۱) یا تو موجودہ طریقہ کار کو معہ اس کی بد صورت اولاد یعنی خسارہ والے موازنوں ، فرقہ وارانہ تلخیوں ، بھوکے عوام ، قرضوں اور بیروزگاری کے قبول کر لیا جائے یا (۲) موجودہ طریقہ کو بیخ و بن سے اکھاڑ پھینک دیا جائے (۳) یا موجودہ طریقہ کی ظاہری شکل کو برقرار رکھا جائے اور ایسی طاقت حاصل کی جائے کہ اس کا معاوضہ کم ادا کرنا پڑے ۔

ان کے علاوہ کوئی متبادل صورت نہیں ہے ۔ اگر تم ایک آرام دہ زندگی کے طالب ہو تو یہ طریقہ کار ختم ہونا چاہیے ۔ ہم دنیا کے ہر ملک سے زیادہ موجودہ نظم و نسق پر خرچ کرتے ہیں ۔ کوئی ملک ایسا نہیں ہے جو نظم و نسق پر اتنا خرچ کرتا ہو ۔ میرا یہ ایقان ہے کہ ہم اپنی آمدنی کا لحاظ کیے بغیر نظم و نسق پر خرچ کرتے ہیں[۶۰] ۔

یہاں یہ واضح رہے کہ قانونِ حکومتِ ہند بابت سنہ ۱۹۱۹ع کے تحت صوبوں کو ابھی پوری خود مختاری نہیں ملی تھی بلکہ دو عملی حکومت (Diarchy) رائج تھی یعنی بعض امور تو ایسے تھے جن پر عوامی نمایندے مقننہ میں صرف بحث و مباحثہ کر سکتے تھے مگر ان میں اپنی کثرت رائے سے کسی قسم کی ترمیم یا ان کی تنسیخ نہیں کر سکتے تھے ۔ ان کو امور محفوظہ کہا جاتا تھا ۔ نظم و نسق کے اخراجات اور سول سروس کے امور محفوظہ میں تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنی مندرجہ بالا تقریر میں انہیں امور پر سخت تنقید کی ہے ۔ ان کی سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ تھی کہ نظم و نسق کے اخراجات صوبہ کی مالی حالت کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ ہیں اور اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں کی سول سروس میں زیادہ تر غیر ہندوستانی ہیں جو اونچی تنخواہیں پاتے ہیں ۔ صوبہ کے عوام اگر چاہیں بھی تو ان کی تنخواہوں میں کمی نہیں کر سکتے کیونکہ دستوری لحاظ سے یہ امور محفوظہ میں شامل ہیں اس لیے آپ کی رائے تھی کہ جب تک دستور میں

۶۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ص ۸۷ و ۸۸ ۔

پریمیم نہ ہو اور نمایندوں کو یہ حق حاصل نہ ہو کہ وہ نظم و نسق کے ان اخراجات کو کم کر سکیں اس وقت تک پنجاب کا موازنہ خسارہ والا موازنہ رہے گا۔

اسی تقریر میں آگے چل کر آپ نے صنعت اور تعلیم پر اظہار خیال کیا۔ آپ نے فرمایا:

"صنعتی ترقی ہی ہم کو بیروزگاری کی مصیبت سے بچا سکتی ہے پارچہ بافی اور جفت سازی کی صنعتوں کے لیے اس صوبہ میں اچھا مستقبل موجود ہے۔ اگر ہم ان صنعتوں کی ہمت افزائی کریں تو ہم اس صوبہ کو بیروزگاری سے بچا سکتے ہیں، بشرطیکہ ہم ان صنعتوں کو کانپور اور احمد آباد کی مسابقت سے بچا سکیں[۶۲]"

تعلیم کے متعلق آپ نے کہا:

"پھر ہم نے کافی رقم تعلیم پر خرچ کی مگر کن نتائج کے ساتھ؟ صوبہ کی تعلیمی ترقی کے متعلق جو رپورٹ شائع ہوئی، اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ طلبا کی تعداد میں ۲۷ ہزار کی اور مدرسین میں ایک ہزار کی کمی واقع ہوئی ہے۔ اس کمی کی وجہ رپورٹ میں یہ بتائی گئی ہے کہ مدارس کے انسپکٹروں نے پروپگنڈہ کا کام نہیں کیا۔ میں اس سے اتفاق نہیں کرتا کہ یہ حقیقی سبب ہے۔ میرے سامنے ان اعداد و شمار کی ایک نقل ہے، جن کا تعلق وزیرِ تعلیم (عزت مآب منوہرلال) کے سہ سالہ کام سے ہے۔ بد قسمتی سے میں مقررہ وقت کے اندر ان تمام اعداد و شمار کا مطالعہ نہیں کر سکا، تاہم میں صرف اُن خاص امدادوں کی طرف آپ کی توجہ منعطف کراتا ہوں، جو سنہ ۲۹ ، ۱۹۲۸ع میں غیر امدادی مدارس کو دی گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ جملہ ۳۱ مدارس کو امداد دی گئی ہے۔ ان میں سے ۱۳ ، ہندو، ۶ سکھ اور دو مسلم ادارے ہیں۔ ہندو اداروں کو ۱۶ لاکھ نو

۶۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال، مرتبہ شاملو، ص ۴۸۸۔

ہزار ۳۰۷ روپے اور سکھ اداروں کو ۹ ہزار ۹ سو آٹھ روپے اور مسلم اداروں کو دو ہزار دو سو روپے امداد دی گئی ہے ۔ اس غیر معمولی صورت حال کی وجہ وہ طریقہ ہے جس کے ذریعہ رقم صرف کی جاتی ہے ''

صوبہ کی عام معاشی خوشحالی ، غریبوں کی مالی امداد ، بزرگانِ دین کی توہین کا انسداد ، امتناع شراب نوشی ، شمشیر کی آزادی ، یونانی و آرویدک طریقہ علاج کی ہمت افزائی ، دیہات کی بہتر صفائی ، عورتوں کی طبی امداد ، جبری ابتدائی تعلیم کا نفاذ ، مسلم تعلیمی اداروں کی بہتر مالی امداد ، محصولِ فوتی کے نفاذ ، محصولِ آمدنی کو صوبوں کے سپرد کرنے کی تجویز اونچی تنخواہوں میں تخفیف ، صوبہ کی صنعتی ترقی کے مسائل ، ان تمام امور پر ڈاکٹر صاحب نے اپنے زمانۂ رکنیتِ کونسل میں وقتاً فوقتاً بڑے سلجھے ہوئے انداز میں اظہار خیال کیا ہے ، لیکن جن مسائل کو آپ نے بڑے زور و شعور کے ساتھ پیش کیا وہ محاصل ، خصوصاً لگان کی تخفیف اور مسلمانوں کی تعلیمی پستی اور مسلم مدارس کے ساتھ نا انصافی کے مسائل تھے ۔

پنجاب کونسل میں ایک رکن کی حیثیت سے ڈاکٹر صاحب نے بعض بہت ہی مفید اور اپنے نتائج کے لحاظ سے دوررس تجاویز پیش کیں خصوصاً مسئلہ لگان کے متعلق ان کی تجویز نہ صرف اپنی نوعیت کے لحاظ سے انوکھی بلکہ ملک کے ایک غریب طبقہ خصوصاً چھوٹے مزارعین کے حق میں ایک نعمت غیر مترقبہ تھی ۔ غالباً ڈاکٹر صاحب ہی پہلے ہندوستانی ہیں جنہوں نے ملک کی مقننہ میں لگان کی وصولی پر اسی اصول کو منطبق کرنے کی وکالت کی جو محصول آمدنی کے سلسلے میں استعمال کیا جاتا تھا ، اور اب بھی کیا جاتا ہے ۔ اسی طرح آپ نے فوتی محصول (Death Duty) عائد کرنے کی جو تجویز پیش کی تھی ، اس کے پس منظر میں غریبوں سے ہمدردی کا جذبہ کام کر رہا تھا ۔ پھر جس زمانہ میں آپ نے یہ تجویز پیش کی تھی ، اس وقت اس قسم کی محاصل اندازی کا کوئی شخص تصور ہی نہیں کر سکتا تھا ۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے خیالات اس سلسلے میں کس قدر ترقی پسندانہ تھے ۔

پنجاب کونسل میں ڈاکٹر صاحب کی ایک تجویز یہ بھی تھی کہ محصول آمدنی کو صوبوں کے سپرد کر دیا جائے اور مرکز ہر صوبہ سے اپنا حصہ رسدی وصول کرے -

انتظامی نقطۂ نظر سے ممکن ہے کہ یہ طریقہ کار مناسب نہ سمجھا جائے لیکن جہاں تک اس زمانہ میں قومی اور ملکی مفاد کا تعلق تھا ، یہ تجویز بہت مفید تھی - صورت حال یہ تھی کہ صوبوں میں دو عملی حکومت (diarchy) تھی یعنی صوبائی مقننہ کو بعض امور میں بحث و گفتگو کرنے اور ان کا فیصلہ کرنے کا اختیار تھا ، بعض امور براہ راست گورنر کی نگرانی میں رہتے تھے - پھر صوبائی عاملہ یعنی وزارت میں بعض وزراء مقننہ کے منتخب اراکین میں سے لیے جاتے تھے اور انھیں ان اراکین کی اکثریت کا اعتماد حاصل رکھنا ضروری تھا - یہ تو صوبہ جات کا حال تھا - مرکز کی یہ صورت نہ تھی وہاں نہ تو مرکزی مقننہ سے وزراء لیے جاتے تھے اور نہ مقننہ کی آواز اتنی مؤثر تھی کیونکہ اگر مرکزی مقننہ کسی سرکاری تجویز کو رد کر دیتی تھی تو وائسرائے اپنے اختیارات خصوصی سے اس تجویز کو نافذ کر دیتا تھا - بالفاظ دیگر صوبائی مقننہ میں عوام کی آواز بہ نسبت مرکزی مقننہ کے زیادہ باثر تھی ، اس لیے اگر محصول آمدنی کو صوبہ جات کے سپرد کر دیا جاتا تو اس کے خرچ اور تقسیم میں صوبے کے عام باشندوں کی ضروریات اور خواہشات کو زیادہ پیش نظر رکھا جا سکتا تھا - علاوہ ازیں مرکزی حکومت کے اخراجات کی نوعیت بیشتر سامراجی تھی - فوج اور انتظامی محکموں پر مرکزی حکومت زیادہ رقومات صرف کرتی تھی - قومی تعمیر پر اس کے بہت کم اخراجات ہوا کرتے تھے کیونکہ قومی تعمیر کے بیشتر محکمے مثلاً حفظان صحت ، زراعت ، صنعت وغیرہ صوبہ جات کے سپرد تھے ، لیکن صوبوں کو آمدنی کے جو مدات دئے گئے وہ بہت ہی محدود تھے - اسی طرح قومی تعمیر کے اہم فرائض کو وہ پوری طرح انجام نہیں دے سکتے تھے - محصول آمدنی ، حکومت کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا - اگر یہ ذریعہ مرکزی حکومت کی بجائے صوبائی حکومتوں کو دے دیا جاتا تو وہ قومی تعمیر کے کاموں کو با حسن الوجوہ انجام دے سکتی تھی - اس طرح بحیثیت مجموعی ملک کے عام باشندوں کی

فلاح و بہبود میں مدد ملتی ۔ علاوہ ازیں ہندوستان کا دستوری ارتقاء جن خطوط پر ہو رہا تھا ، اس سے یہ امر متعین ہو چکا تھا کہ ایک نہ ایک دن صوبوں کو حکومت خود اختیاری دے دی جائے گی ۔ ڈاکٹر صاحب کی دور بیں نظروں نے اس صورت حال کو بھانپ لیا تھا ۔ محصولِ آمدنی کو صوبوں کا حصہ قرار دے دیا جاتا تو حکومتِ خود اختیاری کے بعد ملک کے سب سے بڑے ذریعۂ آمدنی پر غیر ملکی حکومت کا کوئی اختیار باقی نہ رہتا !

پنجاب کونسل کی صدارت | سر فضل حسین ، اقبال کے بچپن کے دوستوں میں سے تھے ۔ دونوں نے ایک ہی جگہ تعلیم پائی تھی ۔ سر فضل حسین اس زمانے میں پنجاب کی سیاست کے محور تھے ۔ انھوں نے سنہ ۱۹۲۳ء میں غیر فرقہ وارانہ اصولوں پر ایک جماعت بنائی تھی ، جس کا نام یونینسٹ پارٹی تھا ۔ یہ پارٹی پنجاب کونسل میں اکثریت رکھتی تھی ۔ سر فضل حسین اس پارٹی کے نہ صرف بانی ، بلکہ اس کی روح رواں بھی تھے ۔ اپنی ذہانت اور قابلیت کے باعث سرکاری حلقوں میں ان کا بڑا اثر تھا اور عوام میں بھی وہ بڑے ہردلعزیز تھے ۔ ان کے انتقال کے بعد ان کے فرزند ، عظیم حسین صاحب نے انگریزی زبان میں ان کے سوانح زندگی شائع کیے ہیں ، جس میں وہ لکھتے ہیں ۔

> " انھوں نے (سر فضل حسین نے) یہ تجویز پیش کی کہ بحیثیت صدر مقننہ پنجاب (پنجاب کونسل) چوہدری شہاب الدین کی میعاد ختم ہونے کے بعد ، ڈاکٹر اقبال کو یونینسٹ پارٹی کی حمایت کے ذریعہ صدر منتخب کیا جائے ۔ ڈاکٹر اقبال نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید اور اخبارات میں سخت حملے کرکے ان کی ہمدردیاں کھو دیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونینسٹوں کی اکثریت نے ان کو امیدوار بنانے سے انکار کر دیا[۶۲] "

۶۲- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ جام جمشید پریس بمبئی ستمبر ۱۹۴۵ء ص ۳۱۹ -

یہ روئیداد تو مقننہ پنجاب (پنجاب کونسل) کے اندر کی تھی ، اب بھی دیکھئیے کہ مقننہ کے باہر پنجاب کے اجتماعی معاملات اور سیاست میں انھوں نے کیا حصہ لیا -

شردھانند کا قتل بیان کیا جا چکا ہے کہ سوامی شردھانند شدھی کے بانی تھے ، تحریکِ ترکِ تعاون کے زمانہ میں انھیں گرفتار کر لیا گیا تھا ، مگر مارچ سنہ ۱۹۲۲ع میں گاندھی جی کی سزایابی کے بعد ، سوامی جی اپنی میعاد سزا پوری کرنے سے قبل ہی رہا کر دئے گئے اور رہا ہوتے ہی انھوں نے شدھی یعنی مسلمانوں کو ہندو بنانے کی تحریک شروع کر دی - راجپوتانہ کو اپنا مرکز بنایا اور نو مسلم ملکانوں کو شدھ کرنا شروع کر دیا - ان کی اس تحریک سے مسلمانوں کے جذبات کو سخت ٹھیس لگی - نتیجتاً مختلف مقامات پر فرقہ وارانہ فسادات ہوئے - غالباً سوامی جی کی قبل از وقت رہائی سے حکومت یہی مقصد حاصل کرنا چاہتی تھی - یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ یہی وہ سوامی شردھانند تھے ، جنھیں تحریک ترک موالات و خلافت کے زمانہ میں مسلمانوں نے جامع مسجد دہلی کے منبر پر لا بٹھایا تھا اور وہاں کے مکبر سے انھوں نے تحریکِ خلافت اور مسلمانوں کی تائید میں تقریر کی تھی[63] -

بہرحال سوامی شرد ھانند ہندوؤں کے ایک بااثر مذہبی گرو اور تحریک شدھی کے بانی تھے - ان کو عبدالرشید نامی ایک شخص نے جو سوامی جی کے اخبار " تیج " میں اُجرت پر کتابت کا کام کیا کرتا تھا ، دسمبر سنہ ۱۹۲۶ع کے آخر میں قتل کر دیا - یہ قتل ایک شخص کا انفرادی فعل کا نتیجہ تھا ، لیکن ہندو لیڈروں نے بات کا بتنگڑ بنا دیا اور ہندو اخبارات نے اسے ہندو قوم کا مسئلہ قرار دے دیا - ہندو عوام کی آتش انتقام بھڑک اٹھی - قتل کے دوسرے ہی دن دہلی میں زبردست فساد ہوا جس میں چھ مسلمان شہید کر دئے گئے - پھر ہندو اخبارات میں اسلام پر حملے کیے جانے لگے - پنجاب کے ہندو اخبارات " پرتاب " اور "

۶۳- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۱ فروری سنہ ۱۹۲۷ع -

نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور بڑے دلآزار مضامین شائع کیے ۔ اس پراپیگنڈے کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرنے کے لیے مسلمانان لاہور نے دو جلسہ ہائے عام جنوری میں بمقام موچی دروازہ منعقد کیے ، جن کی صدارت علامہ اقبال نے فرمائی ۔ ان جلسوں میں اقبال نے ہندو اور مسلمان دونوں کو باہمی اتحاد و اتفاق کی تلقین کی ۔ ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۲۷ع کے جلسہ کی صدارت کرتے ہوئے آپ نے کہا -

> " ہندوستان اور ہندوستان سے باہر دیگر ممالک میں ہر جگہ ہماری رسوائی کے چرچے ہیں ۔ ہمارے باہمی تنازعات بہت افسوس ناک ہیں ۔ ہم یہ بھی نہیں سوچتے کہ ہماری اس کشمکش کے نتائج ایشیا کے دیگر ممالک کے حق میں کیا ہوں گے "

آخر میں آپ نے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں سے پُر امن رہنے کی اپیل کی -

> " میں تم سے صداقت کے نام سے اپیل کرتا ہوں کہ خدا کے لیے حقائق کی طرف دیکھو اور آپس میں نہ لڑو ۔ ہندوستان میں بعض ایسے لوگ ہیں ، جو اپنی اغراض کے لیے تمھارے درمیان پھوٹ ڈالنے کی مساعی میں رہتے ہیں ۔ اگر تم آپس میں لڑو گے تو ملک میں بدامنی ہو گی ۔ سب کو تکلیف اٹھانی پڑے گی[۶۴] "

فسادات لاہور سنہ ۱۹۲۷ع | بیان کیا جا چکا ہے کہ تحریک ترک تعاون کے خاتمہ کے بعد پورے ہندوستان میں فرقہ وارانہ فسادات کا ایک سلسلہ سا بندھ گیا تھا ۔ معمولی معمولی باتوں پر ہندوؤں اور مسلمانوں میں اشتعال پیدا ہو جاتا اور پھر سر پھٹول ہوتی ۔ لاہور میں ۳ مئی سنہ ۱۹۲۷ع کو ایک ایسا ہی فساد ہوا ۔ پہلے تو یہ خبر اڑی کہ ایک مسلمان نے ایک سکھ لڑکی پر مجرمانہ حملہ کیا ہے ۔ سکھوں اور ہندوؤں کی ایک کثیر تعداد باولی صاحب ڈبی بازار میں جمع ہو گئی ۔ ان کے مشتعل ہجوم نے حویلی قابلی مل میں داخل ہو کر مسلمانوں پر حملہ کر دیا ۔ بس پھر کیا تھا سارے شہر میں فساد کی آگ پھیل گئی ۔ علامہ اقبال اس آگ کو

۶۴- اخبار زمیندار لاہور ۲ فروری سنہ ۱۹۲۷ع -

فرو کرنے کے لیے خود حویلی قابلی مل گئے ، شہر کے مختلف مقامات کے دورے کیے اور مسلمانوں کو صبر و تحمل کی تلقین کی۔ مسلمان اپنے شہیدوں کا جلوس نکالنا چاہتے تھے ۔ اندیشہ تھا کہ کہیں اس جلوس کی وجہ سے مزید اشتعال نہ پیدا ہو ، اس لیے علامہ نے دیگر اکابرینِ شہر کے ساتھ اس جلوس میں شرکت کی اور مسلمانوں کے جذبات کو بے قابو ہونے نہ دیا[۶۵] ۔ مولانا محمد علی جوہر ، علامہ اقبال کی ان مساعی سے اتنے متاثر ہوئے کہ انھوں نے اپنے اخبار ہمدرد مورخہ ۸ مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں لکھا ۔

> " میں نے جب اخبارات میں پڑھا کہ کس طرح علامہ اقبال نے مسلمانوں کو ایک بار نہیں بلکہ بار بار اور دن رات صبر و تحمل کی تلقین فرمائی تو میرے دل سے اس سچے محبِ وطن کے لیے دعا نکلی[۶۶] "

راجپال کی گندہ ذہنی | لاہور کے ایک متعصب ہندو راجپال نے ایک کتاب لکھی اور اس کا نام رکھا ، " رنگیلا رسول " ۔ اس کتاب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی کی گئی تھی ۔ اس گندہ ذہن مصنف پر مقدمہ دائر کیا گیا ، جو دو ڈھائی سال تک چلتا رہا ۔ لاہور ہائی کورٹ کے جسٹس دلیپ سنگھ نے مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں اس مقدمہ کا فیصلہ سنا دیا اور راجپال کو بری کر دیا ! مسلمانوں میں اس فیصلہ کے خلاف بڑا سخت ردِ عمل ہوا ۔ مسلمانانِ پنجاب کے ایک وفد نے ، جس میں علامہ اقبال بھی تھے ، گورنر پنجاب سے ملاقات کی اور مطالبہ کیا کہ اس قسم کی دلآزار تحریروں کی اشاعت ممنوع قرار دی جائے اور اس غرض کے لیے ایک آرڈی نینس فوراً جاری کیا جائے ۔ گورنر نے مسلمانوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا ۔

مسلمانوں میں چونکہ سخت اشتعال پھیلا ہوا تھا اور فسادات کا اندیشہ تھا ، اس لیے حکومت نے لاہور میں دفعہ ۱۴۴ نافذ کر دی ۔ مجلسِ

۶۵- اخبار انقلاب لاہور ۱۲ مئی سنہ ۱۹۲۷ع ۔

۶۶- اخبار ہمدرد مورخہ ۸ مئی ۱۹۲۷ع ۔

خلافت پنجاب نے اس حکم کی خلاف ورزی کرنے کا اعلان کیا اور تحریک سول نافرمانی شروع کر دی ۔ مجلس خلافت کے اس اعلان سے پیدا شدہ صورت حال پر غور کرنے کے لیے لاہور کے سربرآوردہ حضرات کا ایک جلسہ برکت علی اسلامیہ ہال میں بتاریخ ۸ جولائی سنہ ۱۹۲۷ع زیر صدارت سر عبدالقادر منعقد ہوا ۔ اس جلسہ میں علامہ اقبال نے شرکت کی ۔ انھوں نے کتاب راجپال کی سخت مذمت کی مگر مجلس خلافت کو مشورہ دیا کہ وہ تحریک سول نافرمانی کو ملتوی کر دے[۶۷] ، کیونکہ اس وقت کی فضا اس قسم کی سول نافرمانی کے لیے سازگار نہ تھی ۔ پھر ۱۰ جولائی کو مجلس خلافت کی اس تحریک پر غور کرنے کے لیے ایک جلسۂ عام بادشاہی مسجد لاہور میں منعقد ہوا ۔ وہاں بھی علامہ اقبال نے اپنی تقریر میں راجپال کی سخت مذمت کی ، مگر مسلمانوں کو یہی مشورہ دیا کہ تحریک سول نافرمانی ملتوی کر دیں[۶۸] ۔

علامہ اقبال نے تحریک سول نافرمانی کی مخالفت تو کی لیکن وہ راجپال کی گندی ذہنیت سے بے حد ملول و رنجیدہ تھے ، چنانچہ انھوں نے اس کی مذمت کرتے ہوئے بادشاہی مسجد والی تقریر میں کہا ۔

> " ایک مسلمان کے لیے اس سے بڑھ کر کوئی ابتلا نہیں ہو سکتی ، جو اس وقت در پیش ہے ، راجپال کی تصنیف نے جس کا نام لینا میں پسند نہیں کرتا ، مسلمانوں کے قلب کے نازک ترین حصے کو چوٹ لگائی ہے "

وہ چاہتے تھے کہ اس قسم کے افسوس ناک واقعات کا انسداد ہو اور توہین انبیاء و بزرگان دین کا ہمیشہ کے لیے سد باب ہو جائے ۔ اس غرض سے انھوں نے پنجاب کی صوبائی کونسل میں ایک قرارداد پیش کی ، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں ۔ پھر جب کچھ عرصہ کے بعد شاتم رسول راجپال کو علم دین نامی ایک نوجوان نے لاہور میں فی النار والسقر کر دیا تو اقبال نے اس پر کہا ۔

۶۷- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۰ جولائی سنہ ۱۹۲۷ع -

۶۸- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۳ جولائی سنہ ۱۹۲۷ع -

"اسی گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا[۶۹] " یعنی

"ہم باتیں ہی کرتے رہے اور ایک بڑھئی کا لڑکا (علم دین) عشق رسول میں ہم سے بازی لے گیا"۔

اسی طرح کا ایک واقعہ سنہ ۱۹۳۳ع میں کراچی میں پیش آیا تھا۔ نتھو رام نے ایک کتاب "ہسٹری آف اسلام" لکھی تھی، جس میں اس نے حضرت ختمی مرتبت کے متعلق نازیبا الفاظ استعمال کیے تھے۔ عبدالقیوم ایک گاڑی بان نے اس کو قتل کر دیا۔ علم دین اور عبدالقیوم کو عدالت نے پھانسی کی سزا دی، علامہ اقبال نے ان دونوں کی مدح میں ایک قطعہ لکھا[۷۰] جس کا عنوان تھا "لاہور اور کراچی" قطعہ یہ ہے۔

نظر اللہ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور
موت کیا شئے ہے؟ فقط عالمِ معنی کا سفر
ان شہیدوں کی دیت اہل کلیسا سے نہ مانگ
قدر و قیمت میں ہے خوں جنکا حرم سے بڑھ کر
(ضرب کلیم)

یہ ذکر تو اقبال کی ان سیاسی کارگزاریوں کا تھا، جو انھوں نے صوبہ پنجاب میں انجام دیں۔ اب یہ دیکھئے کہ اس دور میں انھوں نے سیاسیاتِ ہند میں کیا حصہ لیا۔

تحریک تبلیغ کی تائید بیان کیا جا چکا ہے کہ تحریک ترک تعاون کے خاتمہ کے بعد ملک میں شدھی و سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کی متوازی و متخالف تحریکیں زور و شور سے شروع ہو گئی تھیں۔ میر سید غلام بھیک

۶۹- روزگار فقیر جلد دوم از فقیر وحید الدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی، نومبر سنہ ۱۹۶۴ع ص ۳۰۔

۷۰- روزگار فقیر جلد دوم از فقیر وحید الدین مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی، سنہ ۱۹۶۴ع ص ۳۲۔

نیرنگ ، انجمن تبلیغ اسلام کے معتمد تھے ۔ حضرت علامہ کو تبلیغ اسلام سے دلی لگاؤ تھا اور اسی لیے انھوں نے مولانا نیرنگ کی تحریک کی نہ صرف تائید کی بلکہ اس کے لیے بطور ایجنٹ اپنی خدمات بھی پیش کیں ۔ میر صاحب کے نام اپنے خط مورخہ ۵ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں وہ لکھتے ہیں ۔

" میرے نزدیک تبلیغ اسلام کا کام اس وقت تمام کاموں پر مقدم ہے ، اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبودی ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے ، جیسا کہ آج کل کے قوم پرستوں کے رویہ سے معلوم ہوتا ہے ، تو مسلمان اپنے مقاصد میں کبھی کامیاب نہ ہوں گے ۔ یہ بات میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں اور سیاسیات حاضرہ کے تھوڑے سے تجربہ کے بعد ۔ ہندوستان کی سیاسیات کی روش جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ، خود مذہب اسلام کے لیے ایک خطرۂ عظیم ہے ۔ میرے خیال میں شدّھی کا خطرہ ، اس خطرے کے مقابلہ میں کچھ وقعت نہیں رکھتا یا کم از کم یہ بھی شدھی ہی کی ایک غیر محسوس صورت ہے ۔ بہرحال جس جانفشانی سے آپ نے تبلیغ کا کام کیا ہے ، اس کا اجر حضور سرور کائنات ہی دے سکتے ہیں ۔ میں انشاء اللہ جہاں جہاں موقع ہو گا ، آپ کے ایجنٹ کے طور پر کہنے سننے کو حاضر ہوں[۱۷] ۔"

مولانا غلام بھیک نیرنگ سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک ایسی تبلیغ کانفرنس کرنا چاہتے تھے ، جس میں نو مسلم یورپین شریک ہوں ۔ علامہ نے نہ صرف ان کے اس خیال کو پسند کیا بلکہ اس کانفرنس کے لیے چندہ جمع کرنے اور اس کے انتظامات میں عملی حصہ لینے کا ارادہ ظاہر فرمایا ۔

۲۴ جنوری سنہ ۱۹۲۷ء کو وہ میر صاحب موصوف کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

۱۷- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطا اللہ ناشر شیخ محمد اشرف ، ص ۲۰۹ ۔

" چندہ اس کانفرنس کے لیے انشاء اللہ ہو جائے گا بڑے آدمیوں کی منت نہ کرنی پڑے گی - فی الحال تین آدمیوں نے آٹھ ہزار روپیہ جمع کر دینے کا وعدہ کر لیا ہے - باقی روپیہ بھی اس غرض کے لیے عام مسلمان دینے کو تیار ہو جائیں گے اور میں سمجھتا ہوں کہ رقم مطلوبہ کا بہت بڑا حصہ غالباً لاہور ہی سے جمع کر لوں گا ، بلکہ میرا ارادہ یہ ہے کہ جب تک رقم مطلوبہ کے وعدے پرائیویٹ طور پر ہو نہ جائیں ، اس کانفرنس کے متعلق کوئی اعلان نہ کیا جائے - یورپ اور امریکہ سے کم از کم آٹھ دس آدمیوں کو دعوت دی جائے گی ، باقی جو مسلمان یورپین ہندوستان میں موجود ہیں ، ان کی فہرست تیار کی جائے گی - - - - - - - - کم از کم سو یورپین مسلمان اس کانفرنس میں جمع ہو جائیں تو خوب ہو ! - - - - - - - - میں انگلستان سے خط و کتابت کر رہا ہوں[۷۲] "

تجاویز دہلی ، جداگانہ انتخاب اور اقبال بیان کیا جا چکا ہے کہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء کو بمقام دہلی مسلم سربرآوردہ لیڈروں کے ایک اہم اجتماع میں ، جو مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا تھا ، وہ تجاویز منظور کی گئی تھیں ، جنھیں " تجاویز دہلی " کہا جاتا ہے -

سر محمد شفیع بھی جو صوبائی مسلم لیگ پنجاب کے صدر تھے دہلی کے اس اجتماع میں شریک تھے اور وہاں انھوں نے تجاویز کی تائید ہی نہیں کی تھی بلکہ یہ دعویٰ بھی کیا تھا کہ -

" یہ سب تجاویز خود ان ہی کی پیش کردہ ہیں اور وہ اپنے زمانہ وزارت میں انھیں ایک یادداشت کی شکل میں تحریر فرما چکے ہیں[۷۳] "

۷۲- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ، ص ۲۰۷ و ۲۰۸ -

۷۳- اخبار ہمدرد مورخہ ۲۹ جنوری سنہ ۱۹۲۸ء مولانا محمد علی کا مضمون سائمن کمیشن اور ہندوستان -

ان تجاویز کی اشاعت کے بعد ہندو مہاسبھا نے سخت مخالفت کی ، غالباً اس مخالفت سے متاثر ہو کر سر شفیع نے دہلی سے لوٹنے کے بعد ، لاہور میں صوبائی مسلم لیگ پنجاب کا ایک جلسہ طلب کیا ۔ یہ جلسہ بتاریخ یکم مئی سنہ ۱۹۲۷ع برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں ان ہی کی زیر صدارت منعقد ہوا ۔ سر شفیع نے اپنی صدارتی تقریر میں تجاویز دہلی پر تبصرہ کیا اور پھر جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کی مشروط پیش کش کی مخالفت کی ۔ علامہ اقبال نے اس جلسہ میں نہ صرف شرکت کی بلکہ سر شفیع کے نقطۂ نظر کی پر زور تائید اور حسب ذیل قرارداد پیش کی ۔

> " پنجاب پراونشیل مسلم لیگ اپنے اس عقیدے کا اعادہ کرتی ہے کہ ملک کی موجودہ سیاسی حالت میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی کے ذریعہ مرکزی مجلس وضع قوانین اور صوبوں کی مجالس وضع قوانین ، باشندگانِ ہند کی حقیقی نمائندہ مجالس بن سکتی ہیں ۔ حلقہ ہائے انتخاب کی علیحدگی ہی سے باشندوں کے جائز حقوق و فوائد محفوظ رہ سکتے ہیں اور اسی صورت میں وہ فرقہ وار کشمکش دور ہو سکتی ہے ، جو وقتاً فوقتاً پیش آتی رہتی ہے اور جو مخلوط و مشترک حلقہ ہائے انتخاب سے پیدا ہو گی ، اس لیے لیگ کی یہ قطعی رائے ہے کہ جب تک اقلیتوں کے حقوق کی مؤثر حفاظت کا انتظام نہ ہو ، اس وقت تک مسلمان فرقہ وار حلقہ ہائے انتخاب کو دستور ہند کے ایک اساسی جز کی حیثیت سے قائم رکھنے پر لازماً مصر رہیں[۴۳] "

پھر اس قرارداد کی تائید میں علامہ اقبال نے مختصر لیکن مدلل تقریر بھی کی ، جس میں انہوں نے کہا ۔

> " مجھے یہ کہنے کا حق پہنچتا ہے کہ سب سے پہلا ہندوستانی ہوں ، جس نے اتحاد ہندو مسلم کی اہمیت و ضرورت کا احساس کیا اور میری ہمیشہ سے آرزو ہے کہ اتحاد مستقل حیثیت اختیار کر لے ، لیکن حالات حلقہ ہائے انتخاب کے اشتراک کے لیے موزوں

۴۳۔ اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۳ مئی سنہ ۱۹۲۷ع ۔

نہیں ہیں اور ہمارے صدر (سر محمد شفیع) نے ہندو رہنماؤں کی تقریروں کے جو اقتباسات اپنے خطبۂ صدارت میں دئے ہیں ان سے ہندوؤں کی افسوس ناک ذہنیت آپ پر آشکار ہوتی ہے ۔ اس ذہنیت کو ملحوظ رکھتے ہوئے تو حلقہ انتخاب کا اشتراک کسی حالت بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا ۔ میں حیران ہوں کہ مسلمانوں کے خلاف اس قسم کی ذہنیت اختیار کرنے کی ہندوؤں کو کیوں ضرورت پڑی ۔ مسلمان تعداد میں کم ہیں ، اقتصادی حیثیت سے پیچھے ہیں ، تعلیم میں پسماندہ ہیں ، ویسے بڑے بھولے بھالے ہیں ۔ حکومت انھیں آسانی سے چکنی چپڑی باتیں کرکے پُھسلا لیتی ہے ، ہندو انھیں پُھسلا لیتے ہیں ۔ میں حیران ہوں کہ ہندوؤں نے یہ ذہنیت کیوں اختیار کی اور یہ اعلیٰ تعلیم یافتہ ہندوؤں کی ذہنیت ہے اور اگر کوئی وجہ نہ ہوتی تو میں کہتا کہ تنہا اسی وجہ سے حلقہ ہائے انتخاب الگ رکھے جائیں ۔

آخر میں مسلمانوں سے ایک ضروری بات کہنا چاہتا ہوں ، وہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں ایک طرف ہندوؤں کی کوششیں ان کے خلاف ہو رہی ہیں ، دوسری طرف حکومت کے موجودہ نظام کی سرگرمیاں مسلمانوں کے خلاف جاری ہیں ۔ ان مصیبتوں میں بچاؤ کی صورت محض یہ ہے کہ مسلمان اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں اور مردانہ وار مصیبت کا مقابلہ کریں[۷۵] "

پھر اپنے اس عزم و ارادہ کا اظہار کیا کہ وہ صدر کے ساتھ تمام بڑے بڑے شہروں کا دورہ کرنے اور مسلمانوں کو موجودہ خطرات سے آگاہ کرنے کے لیے ہمہ تن تیار ہیں ۔

مندرجہ بالا قرارداد اور تقریر سے واضح ہوتا ہے کہ اقبال تجاویز دہلی سے بحیثیت مجموعی اختلاف نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کے صرف اس جُز سے اختلاف کرتے ہیں ، جس میں مشروط طور پر ہی سہی ، جداگانہ

۷۵- روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۳ مئی سنہ ۱۹۲۷ع ۔

انتخاب سے دستبرداری کی پیش کش کی گئی تھی ۔ حقیقت یہ ہے کہ و
جداگانہ انتخاب سے کسی صورت میں دستبردار ہونا نہیں چاہتے تھے ۔ ان کا
خیال تھا کہ جداگانہ انتخاب سے دستبرداری اور مخلوط انتخاب پر عملدرآمد
سے بالآخر ایک ایسی قومیت کی تشکیل ہو گی ، جو اسلام کے صحیح
نصب‌العین کے منافی ہے ۔ تحریکِ خلافت کی روح رواں مولانا محمد علی جوہر
ہندو مسلم اتحاد کے پُر جوش حامی تھے اور اسی لیے تجاویزِ دہلی کی پیش
کردہ شرائط کے ساتھ جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کے لیے تیار تھے ۔
انہوں نے اپنے اس نقطۂ نظر کی تائید میں مسلسل مضامین لکھے ، تقریریں
کیں ، دورے کیے اور ان کو کانگریس و مسلم لیگ دونوں سے منوانے
کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا ۔ اپنے اخبار ہمدرد مورخہ ۲۰ مارچ
سنہ ۱۹۲۸ء میں مولانا نے خود ہی لکھا ۔

" مسلمانوں کے ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ء کے تاریخی فیصلے کے بعد
سے جو تجاویز دہلی کے نام سے مشہور ہے ۔ اس وقت تک یعنی
پورے سال بھر اس کی کوشش کی ہے کہ ہندو اور مسلمان ، سکھ
اور دوسری ملتیں سب اس کو قبول کر لیں اور یہ بین الملل
جھگڑے ختم ہو جائیں ، سارا ہندوستان متحد اور متفق ہو کر
تمام ان وسائل اور ذرائع کو کام میں لائے ، جس تک آج ہماری
دسترس ہے تا کہ اس استبدادی اجنبی حکومت کا خاتمہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔
اور دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ سات کروڑ مسلمانوں میں سے
ایک بھی ایسا نہیں ہے جس نے کم از کم اس کام میں مجھ سے
زیادہ وقت صرف کیا ہو اور مجھ سے زیادہ جان کھپائی ہو[76] "

علامہ اقبال ، مولانا کی ان مساعی کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے ۔
علامہ سید سلیمان ندوی تحریک خلافت کے زمانہ میں مولانا کے ساتھی رہ
چکے تھے ، اقبال نے ان کے نام ایک خط مورخہ ۱۸ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء
میں مولانا محمد علی جوہر کی ان مساعی پر نہایت بلیغ اور معنی آفریں تبصرہ
کیا ، لکھتے ہیں ۔

۷۶- اخبار ہمدرد مورخہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۲۸ء ۔

" بزمِ اغیار کی رونق ضروری تھی ۔ اسلام کا ہندوؤں کے ہاتھ بک جانا گوارہ نہیں ہو سکتا ۔ افسوس اہلِ خلافت اپنی اصلی راہ سے بہت دور جا پڑے ۔ وہ ہم کو ایک ایسی قومیت کی راہ دکھا رہے ہیں جس کو کوئی مخلص مسلمان ایک منٹ کے لیئے بھی قبول نہیں کر سکتا>> "

یہ بات ذہن نشین رہے کہ تجاویزِ دہلی کا مطلب یہ تھا کہ مسلمانوں کے چار مطالبات ۔

(۱) سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ۔

(۲) صوبہ سرحد و بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ۔

(۳) پنجاب و بنگال کی مجالس وضع قوانین میں مسلم اکثریت کی برقراری اور

(۴) مرکزی اسمبلی میں ایک تہائی —— مسلم نشستوں کا تحفظ ۔ کو ہندوؤں سے منوا کر ، ہندوؤں کے ایک مطالبہ —— مخلوط انتخاب —— کو تسلیم کر لیا جائے اور جداگانہ حق انتخاب سے دستبرداری کر لی جائے ۔

گویا یہ " کچھ لو اور دو " کے اصول پر ہندو مسلم اتحاد کے حصول کی ایک کوشش تھی ۔ ان تجاویز کو آگے بڑھانے میں سب سے زیادہ پیش پیش مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر تھے ۔ ان دونوں کا منشاء اصلی یہ تھا کہ تجاویز دہلی کے اس " کچھ لو اور کچھ دو " کے اصول کی بنیاد پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین مستحکم اتحاد قائم کیا جائے کیونکہ ان دونوں قائدین کی نظر میں ہندو مسلم اتحاد کے بغیر ہندوستان کی آزادی ناممکن الحصول تھی ۔ بالفاظ دیگر ان قائدین کے نقطۂ نظر سے تجاویز دہلی ایک تدبیر تھی ہندو مسلم اتحاد کے حصول کی ۔ اور ہندو مسلم اتحاد ایک سنگ میل تھا ، منزل آزادی کا ! علامہ اقبال کو تجاویز

۷۷۔ اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور ، ص ۱۵۸ ع ۔

دہلی کے اس جُز سے اختلاف تھا ، جس میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کی پیش کش کی گئی تھی ۔ اگرچہ یہ پیش کش مشروط تھی ، تاہم وہ مشروط طور پر ہی سہی ، جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے اور ہندوؤں کو سب سے زیادہ اعتراض اسی جداگانہ انتخاب پر تھا ۔ جداگانہ انتخاب پر اس قدر شدید اصرار سے ، بادی النظر میں ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اقبال ہندو مسلم اتحاد کے حامی نہ تھے، کیونکہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین جو وجہ نزع تھی ، اس کو وہ رفع کرنا نہیں چاہتے تھے ۔ یوں وہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرکے آزادی کی منزل کو نظروں سے اوجھل کر دینا چاہتے تھے ۔ لیکن حقیقت یہ نہیں ہے ۔ تجاویز دہلی ، ہندو مسلم اتحاد اور آزادی سے متعلق اس زمانہ میں ، ان کے اندرونی خیالات اور دلی احساسات کیا تھے ، اس کا صحیح اندازہ حکیم محمد حسن قرشی کے مندرجہ ذیل بیان سے ہو جاتا ہے ۔ واضح رہے کہ حکیم صاحب موصوف علامہ کے نہایت عزیز دوست اور معالج رہے ہیں ۔ حکیم صاحب لکھتے ہیں ۔

" وسط دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کی ایک شام ، میں ۔ ۔ ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوا ۔ علامہ مرحوم اس زمانہ میں میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں مقیم تھے ۔ میں نے اس دور کی سیاسیات پر مختصر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ۔

" اسلام اور غلامی میں نسبت تضاد ہے ، اس لیے قرآن حکیم میں محکوم مسلمانوں کے لیے کوئی ضابطہ حیات تجویز نہیں کیا گیا بلکہ غلامی کو تعزیر و عقوبت قرار دیا ہے کہ موجودہ جہاد آزادی میں مقدمة الجیش کی حیثیت سے معرکہ آرا ہوں ، حضرت علامہ نے فرمایا کہ مجھے اس سے اتفاق ہے کہ مسلمانوں کو جنگ آزادی میں پیش پیش ہونا چاہیے، مگر سوال تو یہ ہے کہ کیا موجودہ تحریک کے نتیجہ میں مسلمان آزاد ہو سکیں گے ؟ مجھے تو یہ افسوس ہوتا ہے کہ مسلمان انگریز کی جگہ ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے ۔ پھر فرمائیے اس سے کیا فائدہ مرتب ہوگا ؟ " میں نے عرض کیا

" اسی حدّت کو رفع کرنے کے لیے مسٹر محمد علی جناح نے چودہ نکات۷۸ مرتب کیے ہیں اور مولانا محمد علی جوہر کی بے تکان مساعی سے دہلی کے جلسہ میں انھیں منظور کیا گیا ہے۔ بمبئی کی کانگریس کمیٹی ان کی تصدیق کر چکی ہے۔ اُمید ہے کہ مدراس میں نیشنل کانگریس اپنے کھلے اجلاس میں ان کو منظور کر لے گی " ڈاکٹر صاحب نے فرمایا۔

" ہندو اس وقت اپنے آپ کو مضبوط کرنے کے لیے سنگھٹن کر رہے ہیں اور اسی لیے وہ جگہ جگہ فسادات کو ہوا دے رہے ہیں۔ ہندو زعماء کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ میں ہندوؤں میں جو بزدلی اور احساس کمتری ہے اس کو دور کیا جائے ، اس لیے مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتہ پر رضا مند ہو سکیں ، بلکہ میرا تو خیال ہے کہ اگر مسلمان زعماء ہندو لیڈروں کی سب شرطیں مان لیں اور بلاشرط مفاہمت کی پیش کش کریں ، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے "۔

میں نے عرض کیا :

" ہندو مسلم اتحاد کے بغیر انگریز سے جنگ نہیں لڑی جا سکتی اور اس جنگ سے ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا کہ انگریز کے کمزور ہو جانے کی صورت میں اسلامی ممالک پر انگریز کی گرفت کمزور ہو جائے گی۔ فرض کیجئے کہ آپ کے نظریے کے مطابق مسلمان ، ہندوؤں کے غلام ہو جائیں گے جب بھی ہم فائدہ میں رہیں گے کیونکہ ہم تو پہلے ہی غلام ہیں "

۷۸- جناب حکیم صاحب کو یہاں تسامح ہوا ہے جس زمانہ یعنی سنہ ۱۹۲۰ع کا ذکر وہ کر رہے ہیں ، اس زمانہ میں مسٹر جناح نے چودہ نکات نہیں بلکہ تجاویز دہلی مرتب کیے تھے۔ چودہ نکات تو تجاویز دہلی کے نہرو رپورٹ میں مسترد کر دئے جانے کے بعد مارچ سنہ ۱۹۲۹ع میں مرتب کیے گئے۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ۔

" قباحت یہ ہے کہ ہندو نہیں چاہتا کہ وہ انگریز کو ہندوستان سے نکال کر اس سے قطع تعلق کرے ۔ اس کی زیادہ سے زیادہ خواہش یہ ہے کہ وہ داخلی آزادی حاصل کرے ، مسلمان اور دیگر اقوام پر حکومت کرے ۔ اس طرح برطانیہ مطلق کمزور نہ ہوگا بلکہ ہندوؤں کی اعانت سے زیادہ قوی ہو جائے گا ۔ اگر کانگریس ہندوستان کے لیے واقعی کامل آزادی کی طلب گار ہو اور اس غرض کے لیے وہ کوئی پروگرام وضع کرے تو مجھے اس کا ساتھ دینے میں تامل نہ ہوگا[۹۷] "

علامہ اقبال اور حکیم محمد حسن قرشی کی اس تاریخی گفتگو سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم ہندو مسلم مفاہمت کے متعلق پُر اُمید نہ تھے ، حالانکہ تجاویز دہلی کو کانگریس کی مجلس عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی منعقدہ بمبئی نے مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں منظور کر لیا تھا اور اب آخر دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں بمقام مدارس کانگریس کا سالانہ اجلاس ہونے والا تھا ، جہاں یہ تجاویز کھلے اجلاس میں پیش اور منظور کی جانے والی تھیں ، لیکن وسط دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں علامہ اقبال کہہ رہے تھے کہ " مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کسی سمجھوتہ پر رضا مند ہو سکیں گے" پھر انہوں نے پیشگوئی کی کہ " اگر مسلمان زعماء ، ہندو لیڈران کی سب شرطیں مان لیں اور بلاشرط مفاہمت کی پیش کش کریں ، جب بھی ہندو اس سے انحراف کی کوئی نہ کوئی صورت پیدا کرنے کی سعی کریں گے " ۔ اور یہ پیشین گوئی حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی ۔ مدراس کانگریس کے کھلے اجلاس منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں تجاویز دہلی منظور کر لی گئیں لیکن صرف آٹھ ماہ نہ گزرے تھے کہ اگست سنہ ۱۹۲۸ع میں نہرو رپورٹ کے ذریعہ " مسلمان زعماء " کی اس " پیش کش سے انحراف کی صورت پیدا " کر لی گئی اور آل پارٹیز کانفرنس لکھنؤ (منعقدہ اگست سنہ ۱۹۲۸ع) اور آل پارٹیز کنونشن کلکتہ (منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع) میں مسٹر جناح

۹۷- اخبار جنگ کراچی مورخہ ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۶۷ع (اقبال ایڈیشن) ۔

کی نہایت ہی فیاضانہ شرائط مفاہمت کو پائے حقارت سے ٹھکرا دیا گیا ! ! اس طرح علامہ اقبال کی یہ بات کہ " مجھے یقین نہیں آتا کہ ہندو کبھی سمجھوتہ پر رضا مند ہو سکیں " پتھر کی لکیر ثابت ہوئی ! !

سائمن کمیشن سے تعاون اور آل انڈیا مسلم لیگ کی معتمدی

بتایا جا چکا ہے کہ ۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع کو حکومتِ برطانیہ نے سائمن کمیشن کے تقرر کا اعلان کر دیا - یہ کمیشن ہندوستان کا دورہ کرکے ، شہادتیں قلمبند کرنے ، تجاویز وصول کرنے اور حالات کا مطالعہ کرنے کے بعد مزید دستوری اصلاحات کے متعلق سفارشات پیش کرنے والا تھا - اس کمیشن کے تمام اراکین انگریز تھے ، اس لیے ہندوستانی لیڈروں کو بالعموم اس پر اعتراض تھا اور وہ کمیشن کی اس طرح کی تشکیل کو ہندوستان کی عزت و وقار پر حملہ کے مترادف سمجھتے تھے - علامہ اقبال کی رائے ان لیڈروں سے کچھ مختلف تھی - ۹ نومبر کو سائمن کی تشکیل کے سلسلہ میں انھوں نے ایک بیان جاری کیا ، جس میں انھوں نے کہا -

" کمیشن میں کسی ہندوستانی کا نہ ہونا غیر متوقع ، مایوس کن اور تکلیف دہ ہے - ایک ایسے کمیشن میں جو ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا ہے اور جس کے ہاتھ میں یہاں کے قانونِ اساسی کا مستقبل ہے ، کسی ہندوستانی کا نہ ہونا میرے نزدیک انگریزی نقطہ خیال سے بھی ایک بہت بڑی غلطی ہے ، لیکن ہندوستانیوں کے لیے کمیشن کی رکنیت کا دروازہ بالکل بند رہنے کے متعلق رائے دیتے وقت ملک کی موجودہ افسوس ناک حالت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا - معلوم ہوتا ہے کہ ہندوستان کی مختلف اقوام کے باہمی اختلافات اور الم انگیز کشمکش کو مدِ نظر رکھتے ہوئے ، پارلیمنٹ کے لیے اور کوئی راستہ باقی نہ تھا - بہرحال کمیشن میں ہندوستانی ممبر نہ ہونے کے ایک بڑی حد تک ہم خود بھی ذمہ دار ہیں --- بلاشبہ کمیشن میں کسی ہندوستانی کا نہ لیا جانا ہندوستان کے وقار پر حملہ ہے لیکن یہ حملہ میرے نزدیک اس بات کا نتیجہ نہیں کہ برطانوی

پارلیمنٹ کو ہندوستان کے فہم و ادراک یا دماغی قابلیت کے متعلق سوءظن ہے، بلکہ اس کی وجہ وہ بے اعتمادی اور بدظنی ہے جو ہندوستان کی مختلف اقوام کو ایک دوسرے کے متعلق ہے[۸۰]"

سائمن کمیشن میں چونکہ کسی ہندوستانی کو نہیں لیا گیا تھا، لہٰذا یہ تحریک شروع ہوئی کہ اس کا مقاطعہ (بائیکاٹ) کیا جائے اور جب یہ کمیشن ہندوستان میں قدم رکھے تو اس کے خلاف مظاہرے کیے جائیں۔ کانگریس نے تو مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ مسلمان لیڈروں میں اس سوال پر اختلاف پیدا ہو گیا اور ان کے دو گروہ بن گئے۔ ایک گروہ مقاطعہ (بائیکاٹ) کرنا چاہتا تھا اور دوسرا تعاون۔ مقاطعہ (بائیکاٹ) کی تحریک کے حامی مسلم لیڈروں میں سب سے زیادہ نمایاں نام مولانا محمد علی جوہر اور مسٹر محمد علی جناح کا تھا اور تعاون کے حامی، رئیس الاحرار حسرت موہانی، علامہ اقبال اور سر شفیع تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے زیر اثر مجلس خلافت نے بھی مقاطعہ کا اعلان کر دیا۔ مسٹر جناح چونکہ لیگ کے مستقل صدر تھے، اس لیے یہی سمجھا گیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ بھی مقاطعہ کی حامی ہے۔ اسی زمانہ میں علامہ اقبال صوبائی مسلم لیگ پنجاب کے معتمد اور سر محمد شفیع اس کے صدر تھے، صوبائی مسلم لیگ کا ایک جلسہ سر محمد شفیع کے مکان پر ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع کو منعقد ہوا اور اس میں یہ قرارداد منظور ہوئی کہ کمیشن کا مقاطعہ (بائیکاٹ) نہ کیا جائے بلکہ اس کے ساتھ تعاون کیا جائے۔ اس قرارداد کا اعلان کرتے ہوئے علامہ اقبال نے بحیثیت معتمد ایک بیان جاری کیا، جس میں انھوں نے کہا۔

" پنجاب پراونشیل مسلم لیگ نے مسئلہ کے تمام پہلوؤں پر کامل غور و خوض کے بعد ایک قرارداد منظور کی ہے جس کا مفاد یہ ہے کہ کمیشن کا بائیکاٹ ملکی زاویہ نگاہ سے علی العموم اور اسلامی نقطۂ نظر سے علی الخصوص نقصان رساں ہوگا۔ میرے خیال میں یہ قرارداد پنجابی مسلمانوں کے احساسات کا آئینہ ہے۔۔۔۔

۸۰۔ اخبار انقلاب لاہور ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع۔

اس ملک کی قلیل التعداد جاعتوں کو رائل کمیشن کی آمد سے بڑھ کر اپنے اندیشے ، اپنی آمیدیں اور اپنے مقاصد ظاہر کرنے کا اور کوئی موقع نہیں مل سکتا - میری رائے میں ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنی تہذیبوں کے مطابق نشو و ارتقا حاصل کریں - یہ مقصد حاصل ہونا چاہیے ، خواہ مغرب کے دستوری اصول سے حاصل ہو یا کسی دوسرے ایسے ذریعہ سے جو وقت کے مطابق ہو اور لوگوں کی ضروریات پوری کرے[۸۱] " .

مولانا محمد علی جوہر کمیشن کے سخت مخالف اور مقاطعہ (بائیکاٹ) کے پُر جوش حامی تھے - انھوں نے جب علامہ کا یہ اعلانِ تعاون پڑھا ، تو انھیں ایک دھچکا سا لگا - چنانچہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع کے ہمدرد میں سائمن کمیشن کے مقاطعہ (بائیکاٹ) کی پُر زور حمایت کرتے ہوئے ، انھوں نے اقبال کے مندرجہ بالا بیان پر سخت گرفت کی ، مولانا نے لکھا -

" سر محمد شفیع سے بھلا یہ کیونکر ممکن ہے کہ کسی وائسرائے کی رائے سے ہم رائے نہ ہوں ؟ انھوں نے وفاداری کا راگ گانا شروع کر دیا ہے - یہ پنجاب کی بدقسمتی ہے کہ سر محمد اقبال جیسے لیڈر ، سر محمد شفیع جیسے وفادار کو اپنی آزاد خیالی کی سطح تک نہ ابھار کر لا سکے بلکہ برخلاف اس کے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی سر محمد شفیع کی وفاداری کی پست سطح پر آتر آئے ہیں - چنانچہ کمیشن کے متعلق پنجاب مسلم لیگ کے سیکرٹری کا بیان اس کے صدر کے بیان سے کہیں زیادہ چاپلوسی کا ہے - پنجاب حقیقتاً اچھے لوگوں کا خطّہ ہے مگر ان کی رہنمائی صحیح طور پر نہیں کی جاتی[۸۲] "

دسمبر ۱۹۲۷ع میں مسٹر جناح نے چند دیگر سربرآوردہ لیڈروں کے ساتھ ایک بیان میں کمیشن کی تشکیل پر سخت تنقید کی اور مسلمانوں سے

۸۱- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۸ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع -
۸۲- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع -

اس بائیکاٹ کی اپیل کی ۔ علامہ اقبال نے اس کے جواب میں پانچ دیگر مسلمان رہنماؤں کے ہمراہ ۸ دسمبر کو اخبارات کے نام ایک بیان جاری کیا ، جس میں انھوں نے کہا ۔

"چند روز ہوئے مسٹر جناح اور چند ایک دیگر سربرآوردہ اشخاص نے ایک اعلان جاری کیا تھا ، جو ملک کے موجودہ ناگوار حالات کی طرف سے پریشان کر دینے والی بے حسی کو ظاہر کرتا ہے ۔ اس اعلان میں اس حقیقت عظمیٰ کو نظر انداز کر دیا گیا کہ رائل کمیشن (سائمن کمیشن) موجودہ تاسف زا حالات ہی کی پیدائش ہے ۔ جب تک ان حالات کی بیخ کنی نہ کی جائے گی ، متحدہ عمل کا کوئی صاف اور واضح اصول ہی طے نہیں ہو سکتا ۔ ہماری رائے میں مشترکہ لائحہ عمل کے لیے سب سے پہلی شرط یہی ہے کہ فرقہ وارانہ اختلاف کا فیاضانہ اور منصفانہ تصفیہ کر لیا جائے ۔ ہم نہایت عاجزی سے اپنے اہلِ وطن کو بالعموم اور مسلمان بھائیوں کو بالخصوص متنبہ کرنا چاہتے ہیں کہ مقاطعہ کی لاحاصل روش اختیار کرنے سے ، جیسا کہ مسٹر جناح اور ان کے ہم خیالوں نے تجویز کی ہے ، افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا ۔ ہم اپنے مسلمان بھائیوں کو متنبہ کرنے کی جرأت کرتے ہیں کہ انھیں اس موقع پر ناقابل مصالحت مزاحمت کا رویہ ہرگز اختیار نہ کرنا چاہیے ۔ یہ امر نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنے ان حقوق کا تحفظ کر لیں ، جو ہندو ہمیں دینے سے انکار کر رہے ہیں ۔ باوجودیکہ جناب وزیرِ ہند اس امر کی دعوت دے چکے ہیں کہ آئینِ حکومت کے متعلق تجاویز پیش کی جائیں اور یہ دعوت ابھی تک قائم ہے ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ ہندو سیاستیں اس اہم سیاسی مسئلہ کا تصفیہ کرنے میں محض اس خوف سے پہلو تہی کر رہے ہیں کہ انھیں اس ملک کی قلیل جماعتوں کے منصفانہ حقوق تسلیم کرنے پڑیں گے ، اس لیے ہمارا فرض ہے کہ ہم اپنے بھائیوں کو ان تباہ کن نتائج و عواقب سے باخبر کر دیں ، جو ایک ایسے کمیشن کا مقاطعہ کرنے سے پیدا ہوں گے ،

جو ہندوستان کی اقلیتوں کے ساتھ انصاف کرنے کی پوری ضمانت لے کر آ رہا ہے "

آخر میں انھوں نے کہا ۔

" ہمارا صاف اور غیر مبہم رویہ اس خیال پر قائم ہے کہ ملک کی اکثریت سے اپنے منصفانہ حقوق حاصل کرنے میں ناکام رہ کر ہم یہ خیال کرنے لگے ہیں کہ ایسا قیمتی وقت ضائع کرنا ، ہمارے اہم مفاد کے منافی ہوگا ۔ ہندوؤں کو اچھی طرح جان لینا چاہیے کہ ہم باہمی اختلافات کے تصفیہ کے معاملہ کو مزید التوا میں ڈالنے کے لیے آمادہ نہیں ہو سکتے ، جیسا کہ ہندو مہاسبھا کے معتقدین اور خود لالہ لاجپت رائے نہایت ہوشیاری سے کہہ رہے ہیں ۔ لالہ لاجپت رائے راونڈٹیبل کانفرنس کے انعقاد کی تجویز پیش کرتے ہیں ، مگر تمام اختلافی مسائل کو خصوصاً فرقہ وارانہ نیابت کے معاملہ کو اہل برطانیہ کی ثالثی پر چھوڑ دینے کے خواہاں ہیں ۔ مسلمان ایسی چالوں سے ناواقف نہیں ۔ ملک کی اکثریت کو چاہیے کہ ابھی ہمارے ساتھ دیانت دارانہ مفاہمت کرکے مسلمانوں کے دل میں اپنا اعتماد پیدا کریں ۔ مسلمانوں کو محض اعمال ہی قائل کر سکتے ہیں ، اقوال اور بلند بانگ دعوؤں سے کچھ نہ بنے گا ۔ کیونکہ مسلمان بیش بہا تجارب کے بعد قدرے سوچ بچار کے عادی ہو گئے ہیں "

" ہم نہایت جرأت اور زور سے کہتے ہیں کہ ہم کرایہ کے ٹٹو بننے کے لیے تیار نہیں ۔ مسٹر جناح اور دیگر حضرات نے یہ فقرہ اُڑا لیا ہے کہ ہماری خودداری ہمیں رائل کمیشن (سائمن کمیشن) کی تائید کی اجازت نہیں دیتی ۔ ہم اس کے برعکس یہ کہتے ہیں کہ فرقہ وار جنگ اور خودداری یکجا قائم نہیں رکھی جا سکتیں ، تدبر کا اقتضا یہ ہے کہ اس نازک موقع پر جذبات کو عقل اور دلیل پر حاوی نہ ہونے دیں[۸۳] "

۸۳- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۸ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع -

بہر کیف سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے سلسلہ میں مسلمان لیڈروں کے دو نقطۂ نظر سامنے آئے ۔ ایک نقطۂ نظر عدم تعاون یا مقاطعہ کرنے والوں کا تھا ، اس نقطۂ نظر کی ترجمانی مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جوہر کر رہے تھے ، مسٹر جناح کی دلیل یہ تھی کہ سائمن کمیشن میں کوئی ہندوستانی شریک نہیں کیا گیا ہے ، اس لیے یہ کمیشن ہماری قومی خودداری کے منہ پر ایک طمانچہ ہے ، اس سے ہماری توہین ہوتی ہے ، اس لیے اس کا مقاطعہ کرنا چاہیے ، مولانا محمد علی جوہر اس دلیل پر ایک اور دلیل کا اضافہ کرتے ہیں ۔ وہ کہتے ہیں کہ ۔

> "جو فیصلہ برطانوی کابینہ نے کیا ہے ، اس کی حقیقی خباثت یہ نہیں ہے کہ کمیشن میں ایک ہندوستان بھی شریک نہیں کیا گیا بلکہ یہ ہے کہ فیصلہ ہندوستان کے گھر والوں کی گول میز کی موتمر پر نہیں چھوڑا گیا بلکہ برطانوی پارلیمنٹ پر ، جس میں تعصب بھرا پڑا ہے[۸۳] "

مختصراً یہ کمیشن کے مقاطعہ کے تائید میں دو دلیلیں پیش کی گئی تھیں ، ایک تو یہ کہ اس میں کوئی ہندوستانی شریک نہیں ہے اور دوسرے یہ کہ کمیشن کی رپورٹ پر فیصلہ کا حق ، ہندوستانیوں کو نہیں دیا گیا ہے بلکہ یہ حق برطانوی کابینہ نے اپنے پاس رکھا ہے ۔

اقبال کے مندرجہ بالا بیانات سے نہ صرف ان دونوں دلیلوں کا ابطال ہو جاتا ہے ، بلکہ وہ دلائل بھی سامنے آ جاتے ہیں ، جن کی بنیاد پر وہ اس کمیشن کے ساتھ تعاون کرنا چاہتے تھے ۔ اقبال اور ان کے ساتھیوں کا کہنا یہ تھا کہ کمیشن کا محض اس بنیاد پر مقاطعہ کرنا کہ اس میں کوئی ہندوستانی شریک نہیں ہے ، محض جذباتی بات ہے ۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کسی ہندوستانی کو اس میں کیوں شریک نہیں کیا گیا ۔ اقبال کا خیال یہ تھا کہ ہندوستانیوں کے آپس کے اختلافات ، خصوصاً فرقہ وارانہ اختلافات ہی کی وجہ سے کسی ہندوستانی کو اس میں جگہ نہیں دی گئی تھی ، اس طرح ایک حد تک خود ہندوستانی اس قومی توہین کے ذمہ دار

۸۳- اخبار ہمدرد مورخہ ۱۴ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع ۔

تھے - اب رہی یہ دلیل کہ فیصلہ کا حق ہندوستانیوں کو نہیں دیا
بلکہ برطانوی حکومت نے اپنے ہاتھ میں رکھا تھا تو اقبال کا کہنا یہ
کہ یہ دلیل بھی کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے - وزیرِ ہند لارڈ برکن ہیڈ
پیشکش کی تھی کہ ہندوستانی اپنا متفقہ دستور بنا کر لائیں - لیکن ملک
ہندو اکثریت اس سلسلہ میں لیت و لعل سے کام لے رہی تھی ، صرف
وجہ سے کہ انہیں مسلم اقلیت کے منصفانہ مطالبات اور جائز حقوق تسلیم
کرنے پڑیں گے - یہ اکثریت چاہتی تھی کہ ان مطالبات اور حقوق
التواء کے چکر میں ڈالا جائے تا کہ بالآخر برطانیہ کی ثالثی کے ذریعہ
حسبِ دلخواہ فیصلہ کرا لیا جائے - ایسی صورت میں یہ دلیل کہ ہندوستان
کے دستوری مسائل پر آخری فیصلہ دینے کا اختیار ہندوستانیوں کو
دیا گیا بلکہ سائمن کمیشن کے ذریعہ یہ اختیار برطانوی حکومت نے
ہاتھ میں رکھا ، کچھ زیادہ معقول نظر نہیں آتی ، کیونکہ ملک کی اکثریت
کا رویہ اس امر کی غمازی کر رہا تھا کہ یہ فیصلہ بہرحال برطانیہ ہی
کرنا پڑے گا - اقبال کا کہنا یہ تھا کہ ایسی صورت میں مسلمان
کمیشن سے مقاطعہ کریں گے تو " افسوس اور ندامت کے سوا کچھ حاصل
نہ ہوگا " -

ان کی ایک دوسری دلیل یہ تھی کہ سنہ ۱۹۱۹ع کی اصلاحات
" پاسنگ " (weightage) کی بدولت مسلمانوں کے مؤقف کو خصوصاً ا
اور پنجاب میں کافی نقصان پہنچا ہے ، اس لیے مستقبل کی دستوری اصلا
میں مسلمانوں کے مؤقف کو مضبوط بنانے کی خاطر یہ ضروری ہے
کمیشن کے سامنے مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو پیش کیا جائے - کانگریس
دوسری ہندو انجمنیں اس کا مقاطعہ کرتی ہیں تو اس سے ہندوؤں کو نقصان
نہیں پہنچے گا کیونکہ کمیشن کی سفارشات کی بنیاد پر دستوری اصلاحات
جو قسط بھی حکومت عطا کرے گی ، اس سے عام ہندوستانیوں کو ،
اختیارات ملیں گے ، ان سے ہندوؤں کو جو اکثریت میں ہیں ، فائدہ
پہنچے گا ، لیکن اگر مسلمانوں کے نقطۂ نظر کو کمیشن کے سامنے پیش
کیا گیا تو جو نقصان سنہ ۱۹۱۹ع والی اصلاحات میں مسلمانوں کو
چکا ہے ، اس کی تلافی نہ ہو سکے گی اور آئندہ دستور میں جو مزید ا

کیے جائیں گے ، ان میں بھی مسلمان اپنا واجبی و جائز حصہ نہ پا
ین گے ۔

الغرض سائمن کمیشن سے تعاون یا عدم تعاون کے سلسلہ میں علامہ
، کا مؤقف یہ تھا کہ یا تو ہندو اکثریت ، مسلم اقلیت کے جائز
ق اور مطالبات تسلیم کر لیے ۔ اور اس طرح ہندوستان کے دستوری
ئل کا متفقہ حل سامنے آ جائے یا پھر ان مطالبات کو کمیشن کے سامنے
، کیا جائے ۔ اس تمام بحث و نزاع میں ان کے نزدیک مسلم حقوق اور
لبات کو تسلیم کروانا ہی اصل مسئلہ ہے ، چاہے یہ حقوق اور
لبات ہندو اکثریت تسلیم کرے یا برطانوی حکومت انھیں منظور کرے۔
ہندو انھیں تسلیم کرتے ہیں تو پھر کمیشن سے تعاون کی کوئی ضرورت
، اور اگر ہندو انھیں نہیں مانتے ہیں تو پھر حکومت سے منوانے کے لیے
یشن سے تعاون کرنا چاہیے ۔ تدبر کا یہی تقاضا ہے ۔ کمیشن کا
یض اللون " ہونا ، اگرچہ ان کی نظروں میں بھی " ہندوستان کے وقار
حملہ " کے مترادف اور " قومی خودداری کے منافی " تھا تاہم حالات کا
ما یہ تھا کہ تدبر کو " وقار " اور " خودداری " پر ترجیح دی جائے۔

یہاں یہ بات واضح کر دینی ضروری ہے کہ علامہ اقبال پنجاب
بائی مسلم لیگ کے معتمد تھے ۔ صوبائی مسلم لیگ نے سائمن کمیشن سے
ون کا اعلان کیا تھا اور علامہ اقبال کی ذاتی رائے بھی یہی تھی ۔
ر محمد علی جناح کل ہند مسلم لیگ کے مستقل صدر تھے اور وہ سائمن
یشن سے تعاون کرنے کے خلاف تھے ۔ یہ دوسرا موقع تھا کہ پنجاب
بائی مسلم لیگ اور اس کے معتمد و صدر نے کل ہند مسلم لیگ کے صدر
اختلاف کیا تھا ۔ پہلا موقع تو وہ تھا جبکہ یکم مئی سنہ ۱۹۲۷ع کو
گانہ حق انتخاب سے تجاویز دہلی کے ذریعے دستبرداری کی مخالفت کی گئی
۔ یہ دونوں اختلافات علامہ اقبال نے صوبائی مسلم لیگ کے معتمد کی
ت سے کیے تھے ، کیونکہ پنجاب مسلم لیگ ، آل انڈیا مسلم لیگ ہی
یک صوبائی شاخ تھی اور ابھی تک آل انڈیا مسلم لیگ نے نہ تو
ب ضابطہ تجاویز دہلی کو منظور کیا تھا اور نہ اس کے دو ٹکڑے
ئے تھے ۔ یہ صورت حال تو ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کے بعد پیدا ہوئی

جس کا ذکر ہم سائمن کمیشن کے سلسلۂ بیان کو روک کر دیں
کرتے ہیں ، تاکہ کمیشن کے ساتھ تعاون کرنے کے سلسلہ میں جو و
بعد میں پیش آئے ، ان کے سمجھنے میں سہولت ہو -

آل انڈیا مسلم لیگ کے مستقل صدر مسٹر جناح اور معتمد سیف الدین کچلو تھے - اس زمانہ میں سالانہ جلسہ منعقد کرنے کے میں لیگ کا ازروئے دستور طریقۂ کار یہ تھا کہ لیگ کی کونسل پہ مقام جلسہ کا تعین کرتی پھر جس صوبہ میں اجلاس منعقد ہو رہ وہاں کی صوبائی لیگ سے مشورہ کرنے کے بعد صدر کا انتخاب کیا تھی - اس طرح سالانہ اجلاس کی صدارت مستقل صدر نہیں بلکہ ملا کوئی دوسری ممتاز ہستی کیا کرتی تھی - اب دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں سالانہ اجلاس ہونے والا تھا اور اس کے لیے لیگ کی کونسل کو کرنا تھا - اب کی مرتبہ فیصلہ معرکتہ الآراء اور ساتھ ہی پیچیدہ تھا - اس پیچیدگی کی اصل وجہ تجاویز دہلی تھیں - لیگ کے مستقل مسٹر جناح اور معتمد سیف الدین کچلو ان تجاویز کے پُر زور حامی اور چاہتے تھے کہ کسی طرح مسلم لیگ بھی ان تجاویز پر اپنی مہر ثبت کر دے - واضح رہے کہ تجاویز دہلی ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۲۷ع کے جلسہ میں منظور ہوئی تھیں اور جس کی صدارت مسٹر جناح نے کی وہ مسلم لیگ کا جلسہ نہ تھا نہ مسٹر جناح نے صدر مسلم لیگ کی سے اس کی صدارت کی تھی - وہ تو تیس مسلمان سربرآوردہ لیڈروں کا اجتماع تھا ، جس کی صدارت مسٹر جناح نے اپنی ذاتی حیثیت میں کی ہندو مہاسبھا نے تو ان تجاویز کی مخالفت کر دی تھی ، مگر کانگریس عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی نے مئی سنہ ۱۹۲۷ع میں بمقام انھیں تقریباً منظور کر لیا تھا اور اب دسمبر میں یہ تجاویز کانگریس سالانہ اجلاس مدراس میں پیش ہونے والی تھیں اور توقع یہ تھی کہ بھی یہ منظور کر لی جائیں گی - مسٹر جناح ہندو مسلم اتحاد کے ز حامی تھے اور اس غرض سے انھوں نے یہ تجاویز پیش کی تھیں - اب کانگریس کی عاملہ اور آل انڈیا کانگریس کمیٹی انھیں منظور کر چکی اور کانگریس کے سالانہ اجلاس دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں یہ پیش ہونے

ھیں ، مسٹر جناح ، ڈاکٹر کچلو اور ان کے ہم خیال ساتھی یہ چاہتے تھے کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں بھی یہ تجاویز منظور ہو جائیں تاکہ میثاق لکھنؤ کی طرح ایک نیا ہندو مسلم میثاق وجود میں آ جائے ، مگر اب دقت یہ تھی کہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ سے جداگانہ حق انتخاب کی دستبرداری کے خلاف آواز بلند ہو چکی تھی اور پنجاب کی پوری فضا ، صوبائی مسلم لیگ کی ہمنوا تھی ۔ ان حالات میں ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۲۷ع کو آل انڈیا مسلم لیگ کی کونسل کا جلسہ ہوا اور اس میں یہ فیصلہ کیا گیا کہ سالانہ اجلاس لاہور میں ہو اور صدارت کے لیے قرعہ فال سر شفیع کے نام نکلا ۔

اس فیصلہ سے ڈاکٹر کچلو معتمد آل انڈیا مسلم لیگ اور ان کے ساتھیوں کو اختلاف تھا ، کیونکہ وہ جانتے تھے اگر لیگ کا سالانہ اجلاس لاہور میں ہوا تو تجاویز دہلی مسترد کر دی جائیں گی اور جداگانہ انتخاب پر اصرار کیا جائے گا ۔ بہرحال لاہور اور سر شفیع کے انتخاب سے اس گروپ کو شکست ہو رہی تھی ، اس لیے ڈاکٹر کچلو معتمد آل انڈیا مسلم لیگ نے کونسل کا ایک دوسرا اجلاس ۱۱ دسمبر کو طلب کیا ۔ اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت مولوی محمد یعقوب منعقد ہو ۔ اس فیصلہ کا مقصد ہی یہ تھا کہ کلکتہ کے ماحول میں تجاویز دہلی پر آسانی سے آل انڈیا مسلم لیگ کی مہر توثیق لگائی جائے ۔

علامہ اقبال نے ڈاکٹر کچلو کے اس طرز عمل کے خلاف سخت احتجاج کیا اور اپنے ایک اخباری بیان میں اس پر شدید اعتراضات کیے اور ۱۱ دسمبر والے فیصلہ کو غیر دستوری اور ناجائز ٹھہرایا اور آخر میں لکھا ۔

"کلکتہ میں اجلاس منعقد کرنے کی وجوہ کچھ اور ہی ہیں اور وہ نہیں ، جو ہمیں یا پبلک کو بتائے جا رہے ہیں ۔ اصل وجہ یہ ہے کہ کلکتہ میں مشترکہ حلقہ ہائے انتخاب کے متعلق ۲۰ مارچ کی منظور کردہ تجاویز دہلی کو مسلمانوں کے سر منڈھنے کا موقع لاہور کی بہ نسبت بہت زیادہ ہے کیونکہ مسلمانان پنجاب متفقہ

طور پر جدا گانہ حلقہ ہائے انتخاب کے حامی ہیں[۸۵] "

اس کے بعد یہ ہوا کہ آل انڈیا مسلم لیگ میں پھوٹ پڑ گئی ، جو لوگ لیگ کونسل کے ۲۰ نومبر ۱۹۲۷ع کے فیصلہ کے حامی تھے، انھوں نے اس لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ کہنا شروع کر دیا جس کے سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے سر شفیع منتخب ہوئے تھے اور ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کو لیگ کونسل نے جو فیصلہ کیا تھا ، اس کے حامی اس لیگ کو آل انڈیا مسلم لیگ کہنے لگے جس کا سالانہ اجلاس کلکتہ میں زیر صدارت مولوی محمد یعقوب ہونے والا تھا ۔ اس طرح ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کو لیگ دو حصوں میں تقسیم ہو گئی ، ایک شفیع لیگ کہلائی اور دوسری جناح لیگ ، ایک تجاویز دہلی کی مخالف اور جدا گانہ انتخاب کی حامی تو دوسری تجاویز دہلی کی حامی اور مشروط طور پر جدا گانہ انتخاب سے دست بردار ہونے کے لیے تیار ۔ شفیع لیگ سائمن کمیشن سے تعاون کرنا چاہتی تھی ۔ جناح لیگ اس کا مقاطعہ کرنے پر تلی ہوئی تھی ۔ اِدھر جناح لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع میں زیر صدارت سر محمد یعقوب کلکتہ میں منعقد کیا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، تجاویز دہلی کو منظور کیا اور اُدھر شفیع لیگ نے اپنا سالانہ اجلاس زیر صدارت سر محمد شفیع ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع کو لاہور میں کیا ، جس میں جداگانہ انتخاب پر اصرار کیا گیا ۔ اسی اجلاس میں علامہ اقبال نے حسب ذیل قرارداد پیش کی

"موجودہ انتظام میں بنگال و پنجاب کے مسلمانوں کو مجلس وضع قوانین میں اکثریت سے محروم رکھا گیا ہے ۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس اس کے خلاف پُر زور احتجاج کرتا ہے اور اسے اصولِ جمہوریت کے منافی بتاتا ہے ۔ لیگ حکومت سے مطالبہ کرتی ہے کہ سنہ ۱۹۲۱ع میں مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی کی گئی تھی ، اسے دور کیا جائے[۸۶] "

۸۵- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۲۷ع -

۸۶- اخبار انقلاب مورخہ ۳ جنوری ۱۹۲۸ع -

اس قرارداد میں وہی بات کہی گئی ، جس کی تشریح ہم اوپر کر آئے ہیں ۔ اب شفیع لیگ یا آل انڈیا مسلم لیگ (لاہور) کے صدر سر شفیع تھے اور معتمد ڈاکٹر اقبال !

اب ہم پھر سائمن کمیشن کے سلسلۂ واقعات کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ ڈاکٹر اقبال سائمن کمیشن سے تعاون کے حامی تھے اور ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ڈاکٹر اقبال کا یہ طرزِ عمل مولانا محمد علی جوہر کو بہت کھل رہا تھا ۔ وہ اقبال سے محبت کرتے تھے ، اس لیے انھیں یہ توقع تھی کہ وہ ان کے خیالات کو بدل سکیں گے اور ان کے ذریعہ مسلم لیگ لاہور کو اپنا ہم خیال بنا سکیں گے ۔ چنانچہ اسی غرض سے وہ لاہور تشریف لے گئے اور مولوی عبدالقادر صاحب قصوری کے ذریعہ جو اس زمانہ میں خلافت کمیٹی کے ایک سرگرم لیڈر تھے ، ڈاکٹر صاحب سے سائمن کمیشن سے تعاون کے سلسلے میں گفتگوئے مفاہمت شروع کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنا نقطۂ نظر واضح کرنے کے بعد اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر کانگریس اور ہندو قائدین مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرکے ان سے مفاہمت کر لیں تو وہ سائمن کمیشن سے تعاون نہیں کریں گے بلکہ سر محمد شفیع کو بھی مجبور کریں گے کہ سائمن کمیشن کا مکمل مقاطعہ کیا جائے ۔ مولانا حسرت موہانی جیسے انتہا پسند لیڈر بھی ڈاکٹر صاحب کے اس نقطۂ نظر سے اس قدر متاثر تھے کہ انھوں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ اگر ہندو مسلمانوں کے مطالبات مان لیں اور باہمی مفاہمت ہو جائے تو پھر کمیشن کا مقاطعہ نہیں بلکہ مقابلہ کیا جائے ، لیکن اس وقت مسلمانوں کے مطالبات کو ہندوؤں سے منوانا آسان نہ تھا ، اس لیے مولانا محمد علی جوہر کی یہ سعیٔ مفاہمت ناکام رہی اور وہ ڈاکٹر صاحب کو اپنا ہمنوا نہ بنا سکے[۸۷] ۔

اس کمیشن کے لیے یادداشت کا مسودہ مرتب کرنے کی غرض سے شفیع لیگ نے ایک کمیٹی مقرر کر دی تھی جس کے ایک رکن ڈاکٹر اقبال بھی تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کمیٹی کے پہلے جلسے ہی میں بعض اہم

۸۷۔ یہ روایت مولانا غلام رسول مہر نے مجھ سے بیان کی تھی ۔ مصنف

نکات مثلاً صوبہ جاتی خود مختاری سے متعلق اپنے اختلاف رائے کا اظہار کر دیا تھا ، اس کے بعد ہی ڈاکٹر صاحب درد گردہ میں مبتلا ہو گئے اور انھیں اپنے علاج کے سلسلہ میں دہلی جانا پڑا - اس دوران یادداشت کے مسودہ کو آخری شکل دے دی گئی اور اس کے بعض حصوں کو اخبارات میں شائع بھی کر دیا گیا - ڈاکٹر صاحب نے دہلی سے لوٹ کر جب اخبارات میں اس یادداشت کے مضامین کو دیکھا تو سخت ناراض ہوئے کیونکہ اس میں مکمل صوبہ جاتی خود مختاری کا مطالبہ نہیں کیا گیا تھا بلکہ قانون اور عدلیہ کے محکمہ جات کو حسبِ سابق گورنر کی تحویل میں رکھنے پر رضا مندی کا اظہار کیا گیا تھا - ڈاکٹر صاحب مکمل صوبہ جاتی خود مختاری کے حامی تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ قانون اور عدلیہ جیسے اہم امور براہ راست گورنر کی نگرانی میں رہیں ، چنانچہ جب ان کی عدمِ موجودگی میں لیگ نے اس قسم کی یادداشت مرتب کر لی ، تو انھوں نے فوراً ۲۴ جون سنہ ۱۹۲۸ع کو لیگ کی معتمدی سے اپنا استعفاٰ پیش کر دیا ، چنانچہ وہ اپنے استعفیٰ میں لیگ کی شائع شدہ یادداشت کے متعلق لکھتے ہیں -

" میں اب یہ دیکھ رہا ہوں کہ اخبارات میں لیگ کی یادداشت کے جو حصے شائع ہوئے ہیں ان میں مکمل صوبہ جاتی خود مختاری کا مطالبہ نہیں کیا گیا ہے - ایسی وحدانی صوبہ جاتی حکومت کی تجویز پیش کی گئی ہے جس میں قانون ، نظم و ضبط اور عدلیہ گورنر کی براہ راست نگرانی میں رہیں گے - یہ کہنے کی مجھے چنداں ضرورت نہیں ہے کہ یہ تجویز دو عملی کی ایک نقاب پوش صورت ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی دستوری ترقی ہی نہ ہو - چونکہ مجھے اب بھی اپنی رائے پر اصرار ہے جو میں نے مسودہ نگار کمیٹی کے پہلے جلسے میں ظاہر کی تھی کہ کل ہند مسلم لیگ کو چاہیے کہ مکمل صوبہ جاتی خود مختاری کا مطالبہ کرے ، اس لیے مجھے ان حالات میں کل ہند مسلم لیگ کا معتمد نہیں رہنا چاہیے - براہِ مہربانی میرا استعفیٰ قبول کر لیا جائے[۸۸] "

۸۸- اسپیچس اینڈ سٹیٹ مینٹس آف اقبال مرتبہ شاملو، المنار اکادمی لاہور طبع دوم سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۶۴

ڈاکٹر صاحب کے اس استعفا کا یہ اثر ہوا کہ سر محمد شفیع صدر مسلم لیگ کو اس یادداشت میں ترمیم کرنی پڑی اور ڈاکٹر صاحب کے مطالبہ صوبجاتی خود مختاری کو صراحت کے ساتھ یادداشت کا جزو بنانا پڑا ۔ سائمن کمیشن کے سامنے مسلم لیگ کی جانب سے جو یادداشت پیش کی گئی تھی اور جس پر ڈاکٹر صاحب کے دستخط بھی ثبت تھے ، اس کا خلاصہ حسب ذیل ہے ۔

(۱) حق رائے دہی کو وسیع کیا جائے ۔ صوبائی مقننہ کے لیے ہر بالغ کو حق رائے دہی حاصل ہو ۔
(۲) طریقۂ انتخاب جداگانہ ہو ۔
(۳) مرکزی مقننہ کی نشستوں میں اضافہ کیا جائے ، ایوان بالا میں ایک سو پچاس اور زیریں میں چار سو نشستیں ہوں اور ہر ایوان میں مسلمانوں کو ۳۳ فی صد نشستیں دی جائیں ۔
(۴) سنہ ۱۹۱۹ع کی اصلاحات میں پنجاب و بنگال کے مسلمانوں کے ساتھ جو بے انصافی ہوئی ہے (یعنی ان کی اکثریت کو مقننہ میں اقلیت بنا دیا گیا) اس کی تلافی کی جائے ۔ ان دونوں صوبوں کی مقننہ میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل رہے اور ان کی اکثریت کو اقلیت یا مساوات میں تبدیل نہ کیا جائے ۔ ان دونوں صوبوں کی مقننہ میں ان کی آبادی کے تناسب سے مسلمانوں کو نمائندگی دی جائے ۔
(۵) صوبہ سرحد میں دوسرے صوبوں کی مانند اصلاحات نافذ کی جائیں اور برطانوی بلوچستان میں بھی اصلاحات کا نفاذ ہو ۔
(۶) سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ قرا دیا جائے ۔
(۷) جن صوبوں میں مسلمانوں کی اقلیت ہے وہاں ان کو
(الف) مذہبی حقوق خصوصاً ذبیحہ گاؤ کی آزادی دی جائے ۔
(ب) تمام سیاسی اداروں میں مناسب اور مؤثر نمائندگی بذریعہ جداگانہ انتخاب دی جائے ۔
(ج) مرکزی اور صوبائی کابینہ میں خاص تحفظعطا کیا جائے ۔
(د) سرکاری ملازمتوں میں مناسب حصہ دیا جائے ۔

(۸) مدارس میں مسلم طلبأ کے داخلہ پر پابندیاں عائد نہ کی جائیں بلکہ ان کی ہمت افزائی کی جائے۔

(۹) سرکاری اداروں میں اُردو کا عام استعمال ہو۔

(۱۰) ہندوستان کے آئندہ دستور کی نوعیت وفاق ہو اور مابقی اختیارات (Residuary Powers) صوبوں کو دئیے جائیں۔

(۱۱) وائسرائے کی کابینہ آٹھ اراکین پر مشتمل ہو، جس میں سے چار اراکین ہندوستانی ہوں، اس میں مسلمانوں کو مناسب حصہ دیا جائے۔

(۱۲) صوبوں میں دو عملی حکومت (diarchy) ختم کی جائے اور صوبجاتی خود مختاری کا نفاذ ہو۔ وزرأ مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں۔ گورنر صرف دستوری طور پر صوبہ کا صدر رہے۔ وزرأ کی ذمہ داری مشترکہ ہو۔

(۱۳) محصول آمدنی وصول کرنے اور خرچ کرنے کا اختیار صوبوں کو حاصل رہے اور مرکز ہر صوبہ سے اپنا مقررہ حصہ وصول کرے۔

(۱۴) کوئی مقننہ خواہ وہ صوبجاتی ہو یا مرکزی کسی ایسے مسودۂ قانون کو جس کا تعلق کسی مذہب سے ہو، منظور نہیں کر سکے گی۔ اگر متعلقہ فرقہ کے ۳/۴ اراکین اس مسودہ کے خلاف رائے دیں۔

اِس یادداشت[۸۹] کے پیش کیے جانے کے بعد ۵ نومبر سنہ ۱۹۲۸ع کو مسلم لیگ کے ایک وفد نے، جس میں ڈاکٹر اقبال بھی بحیثیت ایک رکن کے شریک تھے، سائمن کمیشن کے سامنے شہادت دی۔ سر محمد شفیع اس وفد کے قائد تھے اس لیے سوالات زیادہ تر انھیں سے کیے گئے، البتہ درمیان میں ڈاکٹر اقبال بھی بعض امور کی صراحت کرتے رہے۔ ڈاکٹر صاحب

۸۹- یہ یادداشت نیو یونین پریس لاہور میں چھپوائی گئی تھی، اس کو مطبوعہ صورت میں دیکھنے کا موقع مجھے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے ذاتی کتب خانہ میں ملا تھا۔ مصنف

اور مسلم لیگ کی اس نمائندگی کا یہ نتیجہ نکلا کہ سائمن کمیشن نے جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھنے کی سفارش کی ۔گو کمیشن نے لیگ کے اس مطالبہ کو تسلیم نہیں کیا کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی ان کی آبادی کے تناسب سے ہو لیکن اس نے یہ رائے دی کہ میثاقِ لکھنؤ میں ہندو مسلمانوں کی نشستوں کا جو تعین کیا گیا تھا اس کو رائے عامہ کی تائید حاصل نہیں ہے ، اس لیے اس کو ختم کیا جائے ، البتہ مسلمانوں کو جو پاسنگ دیا گیا ہے اس کو برقرار رکھا جائے ۔ لیگ نے مرکزی مقننہ کے لیے ۳۳ فی صد نمائندگی کا مطالبہ کیا تھا ۔کمیشن نے ۲۸ فی صد نمائندگی کی رائے دی ۔ مسلم لیگ نے اپنی یادداشت میں اس امر کا مطالبہ کیا تھا کہ ایسا مسودۂ قانون جس کا تعلق کسی مذہب سے ہو ہرگز منظور نہیں کیا جائے گا ۔ اگر متعلقہ فرقہ کے $\frac{3}{4}$ اراکین اس کے مخالف ہوں ۔کمیشن نے یہ سفارش کی کہ ایسا مسودۂ قانون گورنر کی اجازت کے بغیر مقننہ میں پیش نہ ہو ۔ علامہ مرحوم دو عملی حکومت کے سخت خلاف اور مکمل صوبجاتی خود مختاری کے پُرزور حامی تھے اور اسی مسئلہ پر سر شفیع سے اختلاف ہو جانے کے باعث انھوں نے مسلم لیگ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا تھا لیکن بالآخر لیگ نے ان ہی کے دباؤ سے متأثر ہو کر دو عملی حکومت کے خاتمے اور مکمل صوبجاتی خود مختاری کے نفاذ کا سائمن کمیشن کے سامنے مطالبہ کیا تھا اور اب سائمن کمیشن نے بھی دو عملی حکومت کے خاتمے اور صوبوں میں ایسی وزارتوں کے قیام کی سفارش کی تھی جو تمام صوبائی معاملات میں صوبائی مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں ۔ کمیشن کے الفاظ یہ تھے :

> " ہر صوبہ کو جہاں تک ممکن ہو سکے ، اپنے گھر کا مالک بنایا جائے گا [۹۰] ۔

اِس تجزیہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے سائمن کمیشن کے سامنے علامہ اقبال اور مسلم لیگ (شفیع لیگ) کی نمائندگی کے قدرے امید افزا نتائج برآمد ہوئے تھے ، لیکن علامہ بحیثیت مجموعی سائمن کمیشن کی رپورٹ سے مطمئن

۹۰- رپورٹ سائمن کمیشن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۰ع ص ۶

نہ تھے ۔ جون سنہ ۱۹۳۰ء میں سائمن رپورٹ شائع ہوئی اور ۲۴ جون سنہ ۱۹۳۰ء کو علامہ اقبال نے سر ذوالفقار علی خاں کے ساتھ ایک بیان اخبارات میں شائع کیا ، جس میں انھوں نے اِس رپورٹ پر تنقید کی ۔ اِس تنقید کی کچھ جھلکیاں دیکھتے چلیے ۔

(۱) ہندوستانی خواہشات کی تکمیل کے لیے کم سے کم جو بات کی گئی ہے ، وہ یہ ہے کہ صوبجاتی خود اختیاری عطا کر دی گئی ہے ،گو وہ بھی واضح اور نمایاں نہیں ۔ ہمارے اپنے صوبے میں اور بنگال میں مسلمانوں سے اصولِ جمہوری کے حقوق بھی چھین لیے گئے ہیں ، لیکن آٹھ صوبوں میں سے چھ صوبوں کے اندر ہندو اکثریتیں اپنی حکومتیں آپ مرتب کرنے کے حق سے مستفیض ہوں گی اور مسلمان ان دو صوبوں میں جہاں ان کی اکثریت ہے ، پنجاب میں مساویانہ درجہ اور بنگال میں اقلیت میں تبدیل کر دئیے گئے ہیں ۔ ہندوستان میں طاقت کا ایک خفیف توازن قائم رکھنے کے متعلق مسلمانوں کی اُمیدیں قطعی طور پر خاک میں ملا دی گئی ہیں ۔ وہ صرف ان چھ صوبوں ہی میں گھاٹے میں نہ رہیں گے جہاں ان کی اقلیت ہے ، بلکہ اس بات کا شدید احتمال ہے کہ ان دو صوبوں میں بھی ، جہاں وہ اکثریت میں ہیں ، ان پر " اقلیتوں کا ظلم " ہوتا رہے گا ۔

حیرت ہے کہ سر جان سائمن اور ان کے رفقأ نے یہ کہہ کر پنجاب اور بنگال میں فرقہ وار حکومت قائم ہو جائے گی ، عجیب ناسطابقت کا اظہار کیا ہے لیکن یہ دیکھ کر اور زیادہ تعجب ہوتا ہے کہ کمیشن نے نہایت آسانی سے اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا ہے کہ اسی قسم کی فرقہ وار حکومت باقی چھ ہندو صوبوں میں بھی قائم ہو جائے گی ۔ پس یہ واضح ہے کہ کمیشن مسلمانوں کے معاملہ میں اس بات کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں جس کی ہندوؤں کے معاملے میں پورے طور پر حمایت کی گئی ہے ۔ . . . .

سندھ کی علیحدگی کے مسئلہ سے عملی طور بے پروائی کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ متنازعہ فیہ مسئلہ ہندوستانی مسلمانوں کو اس وقت تک چین سے بیٹھنے نہ دے گا، جب تک نئے دستور کے نفاذ سے قبل اس کا کوئی اطمینان بخش تصفیہ نہیں ہو جاتا۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اور بلوچستان کے بارے میں ہمیں سخت مایوسی ہوئی ہے اور ہمارا خیال ہے کہ اس ضمن میں کمیشن کی سفارشات نہ ہندوستانی مسلمانوں کی تسلی کر سکیں گی اور نہ ان دو صوبوں کے مسلمانوں کو خوش کر سکیں گی۔ ان دو صوبوں کے ساتھ دوسرے صوبوں سے مخالف سلوک کرنا کسی طرح بھی قرینِ انصاف نہیں ہے۔

رپورٹ کی سفارشات کی تہ میں جو پالیسی کارفرما ہے، اِس کا مطلب ہمارے نزدیک اس کے سوا اور کچھ نہیں کہ مسلمانوں کے اہم مطالبات کو ٹھکرا کر انتہا پسند ہندوؤں کو خوش کرنا مقصود ہے[۹۱]"

نہرو رپورٹ: اقبال کے ابتدائی تاثرات

اگست سنہ ۱۹۲۸ع میں نہرو رپورٹ مرتب ہو گئی اور اس کے کچھ حصے اخبارات میں شائع ہوئے۔ یہ رپورٹ اس لحاظ سے بہت اہم تھی کہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہندوستان کے لیے، خود ہندوستانیوں نے ایک دستوری خاکہ پیش کیا تھا۔ پھر یہ خاکہ لارڈ برکن ہیڈ وزیر ہند کے چیلنج کے جواب میں پیش کیا گیا تھا۔ اس نقطۂ نظر سے ہر محبِ وطن کو اس رپورٹ کا انتظار تھا۔ یہ خبر کہ ایک دستور اپنے ملک کے لیے خود ہندوستانیوں نے تیار کیا ہے، ہر آزادی خواہ کے لیے خوش آئند تھی اسی لیے جب اس رپورٹ کے چیدہ چیدہ کچھ حصے اخبارات میں شائع ہوئے تو لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ علامہ اقبال نے بھی جب اخبارات میں رپورٹ کے بعض اجزا کا مطالعہ کیا، تو ان کے ذہن پر خوشی اور افسوس کا ملا جلا تاثر

۹۱- اخبار انقلاب لاہور ۲۶ جون سنہ ۱۹۳۰ع

قائم ہوا - خوشی اس بات کی کہ بہزار دقت ملک کے لیے ایک دستور تو خود ہندوستانیوں نے وضع کیا اور افسوس اس امر کا کہ اس کی بعض باتیں قابلِ اعتراض تھیں - چنانچہ ایک بیان مورخہ ۲۰ اگست سنہ ۱۹۲۸ع میں انھوں نے اپنے ان ہی تاثرات کا اظہار کیا - اس بیان کے جستہ جستہ اقتباسات یہاں پیش کیے جاتے ہیں - ابتداً میں انھوں نے اپنی مسرت کا اظہار اس طرح کیا :

" میں نے ابھی تک نہرو کمیٹی کی مکمل رپورٹ کا مطالعہ نہیں کیا ، میں نے صرف وہی حصے دیکھے ہیں ، جو اخبارات میں شائع ہو گئے - جو کچھ میں نے پڑھا ہے ، اس سے میں نے یہی نتیجہ نکالا ہے کہ . . . . اس سے ملک کی اہم آئینی مشکلات کے حل کرنے کی حقیقی خواہش کا اظہار ہوتا ہے[۹۲] "

پھر انھوں نے اخبارات میں شائع شدہ رپورٹ کے بعض اجزا پر اس طرح نکتہ چینی کی :

" رپورٹ کے مرتب کرنے والے حضرات نے اپنے دلائل میں یہ فرض کر لیا ہے کہ پنجاب اور بنگال کی مختلف اقوام اپنی اپنی قوم کے نمائندوں کے حق میں رائے دیں گی - اس قیاس کی بناً پر پنجاب کے مسلمانوں کو یقین دلایا گیا ہے کہ کونسل (مقننہ) میں مسلمانوں کی اکثریت رہے گی - اگر ایسا ہے تو جداگانہ طریقِ انتخاب کو کیوں منظور نہیں کیا جاتا - کم از کم نشستوں کی تخصیص کیوں نہیں کی جاتی[۹۳] "

ہم گذشتہ اوراق میں مجملاً بیان کر آئے ہیں کہ نہرو رپورٹ نے جداگانہ انتخاب اور تحفظ نشست دونوں کو ختم کر دیا تھا ، اور بالغ حقِ رائے دہی کی سفارش کی تھی - مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کی عام آبادی میں مسلمانوں کو اکثریت حاصل ہے ، اس لیے وہاں مجالس وضع قوانین میں بھی ان کی اکثریت برقرار رکھی جائے - تجاویز دہلی

۹۲- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ع
۹۳- ایضاً

میں بھی اس مطالبہ کو پیش کیا گیا تھا ، لیکن نہرو رپورٹ میں اس کو نظر انداز کر دیا گیا تھا اور بلا تعین نشست مخلوط انتخاب بذریعہ حقِ رائے دہی بالغان کی سفارش کی گئی تھی اور دلیل یہ دی گئی تھی کہ چونکہ پنجاب میں مسلمانوں کی اکثریت ہے ، اس لیے حقِ رائے دہی کی بنیاد پر مخلوط انتخاب کے ذریعہ مقننہ میں بھی مسلمانوں کی اکثریت پہنچ جائے گی ۔ علامہ اقبال نے اس دلیل کا پول یوں کھولا

" ۲۰ سال کے مسلمان بالغوں کی تعداد تمام بالغ مردوں کے مقابلہ میں ۵۴ فی صد ہے حالانکہ کل آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کا تناسب ۵۶ فی صد ہے ، اس دو فی صد خسارہ سے ہندوؤں اور سکھوں کی تناسب آبادی میں دو فی صد کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ کل آبادی کے لحاظ سے ان دونوں قوموں کو ۴۲ فی صد نیابت کے حقوق حاصل ہوتے ہیں لیکن اس طریقِ انتخاب سے انھیں ۴۴ فی صد نیابت ملتی ہے ۔

مسلمان نابالغ خواتین کو تمام صوبہ کی بالغہ خواتین میں ۵۵ فی صد کی نسبت حاصل ہے لیکن وہ مقابلۃً غیر تعلیم یافتہ اور بے حد قدامت پسند ہیں ، اس لیے عرصہ دراز تک ان کا پولنگ سٹیشن پر ووٹ دینے کے لیے جانا محال ہے ۔ غیر مسلم خواتین مقابلۃً زیادہ ترقی یافتہ ہیں ، اس لیے وہ زیادہ تعداد میں رائے دینے کے لیے جائیں گی ، اس لیے مسلمانوں کی نشستوں کو نقصان پہنچے گا گذشتہ انتخاب سے مسلم خواتین کی قدامت پسندی کا ثبوت بہم پہنچ گیا ہے ۔

ایک لاکھ کی آبادی کی طرف سے ایک نمائندہ مقرر کرنے سے پنجاب میں حلقہ جاتِ انتخاب کی بھی از سرِ نو تقسیم کرنی پڑے گی ، اس سے بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچنے اور اکثریت سے اقلیت میں بدل جانے کا اندیشہ ہے ۔ نہرو کمیٹی کے خیال میں مسلمانوں کو ۴۷ نشستیں مل جائیں گی لیکن اگر ایک لاکھ کے پیچھے ایک نمائندے کی تجویز قائم رہے تو پنجاب کی دو کروڑ چھ لاکھ کی آبادی سے (۲۰۷) ارکان کا انتخاب لازمی ہوگا ، ان

کے لیے اسی قدر حلقے بھی تجویز کیے جائیں گے - ظاہر ہے کہ حلقۂ انتخاب کی زیادتی سے ان حلقوں میں کمی ہو جائے گی جن میں مسلمان امیدواروں کے کھڑے ہونے کی توقع ہے - جیسا کہ نہرو کمیٹی نے مسلمانوں کی اکثریت کا یقین دلایا ہے ، اگر ایسا ہی عمل میں آئے تو مسلمانوں کو ۷ء۲ کی نصف سے زیادہ نشستیں ملنی چاہئیں- جس صورت میں اس وقت مسلمانوں کی آبادی واقع ہے اس سے اس کی توقع نہیں ہو سکتی[۹۴] " -

نہرو رپورٹ میں بمبئی سے سندھ کی علیحدگی کا اس صورت میں مشورہ دیا گیا تھا جب کہ وہ مالی حیثیت سے خود کفیل ہو - علامہ کا اس پر تبصرہ ملفظہ ہو :

" سندھ کی علیحدگی مشروط ہے - برما کی مثال سامنے ہے - میرے خیال میں اس قسم کی کوئی قید نہیں لگانی چاہیئے[۹۵] "

نہرو رپورٹ میں شہریوں کے بنیادی حقوق پر بڑا زور دیا گیا تھا - اس کے متعلق بھی علامہ نے بعض چبھتے ہوئے ریمارکس دئیے تھے -

" حقوقِ شہریت کے متعلق میرا خیال ہے اس میں کوئی شک نہیں کہ ملک کا انتظام اعلٰی ترین دماغوں کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے ، لیکن ہندوستان کے حالات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے میری رائے ہے کہ قابلیت کا معیار مقرر کر دیا جائے تاکہ ہر قوم کو انتظامِ ملک میں کافی حصہ مل سکے - فرقہ وار رقابت اور دشمنی کے تمام ممکن مواقع کو رفع کرنے کے لیے اس کی ضرورت ہے[۹۶] "

یہ ہے وہ تبصرہ جو اقبال نے پوری نہرو رپورٹ کے بغائر نظر مطالعہ کے بعد نہیں ، بلکہ اس کے بعض اجزاء کو اخبار میں سرسری طور پر پڑھ کر لیا تھا ، تاہم اس سے ان کی دقت نظر کا اظہار ہوتا ہے - ان ابتدائی

۹۴- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ع
۹۵- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ع
۹۶- ایضاً

تاثرات کے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ فلسفی کی تعمیم پسندانہ نگاہ ہی نہیں رکھتے بلکہ ایک عملی سیاستدان کی طرح مسائل کی جزیات پر بھی ان کی نظر رہتی تھی ، وہ اعداد و شمار کی الجھنوں میں پھنس نہیں جاتے تھے ، بلکہ ان کی گرھوں کو کھول کر حقائق کو واشگاف انداز میں سامنے رکھ دیا کرتے تھے ! !

نہرو رپورٹ ان کے نزدیک حرفِ آخر نہ تھی ، البتہ ہندوستان کے پیچیدہ دستوری مسائل کے حل کی طرف یہ ایک طرح کی پیش قدمی ضرور تھی - ان کی اس وقت بھی سوچی سمجھی ہوئی رائے یہ تھی کہ آخری فیصلہ "باہمی سمجھوتہ" ہی سے ہو سکتا ہے - چنانچہ انھوں نے اس تبصرہ کے آخر میں کہا -

"آخر میں میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ اس ملک کی جماعتیں اس رپورٹ کی طرف پوری توجہ دیں اور بجائے فرقہوار تنازعات میں اپنا وقت ضائع کرنے کے ، دستوری اساس کے متعلق کسی مستحسن باہمی سمجھوتہ پر پہنچیں - اسی پر ملک کی موجودہ نجات اور آئندہ عظمت کا انحصار ہے ۹۷"

نہرو رپورٹ و آل پارٹیز کانفرنس کی مخالفت

نہرو رپورٹ کی اشاعت کے ساتھ ہی شعیب قریشی رکن نہرو کمیٹی کا اختلافی نوٹ اور ان کے بیانات اخباروں میں آ چکے تھے ، تاہم امید بندھی ہوئی تھی کہ نہرو رپورٹ میں مسلم نقطۂ نظر سے جو خامیاں رہ گئی تھیں ، وہ آل پارٹیز کانفرنس میں رفع کر دی جائیں گی اور اس طرح ایک متفقہ دستوری خاکہ بن جائے گا - لیکن مولانا شوکت علی اور مولانا حسرت موہانی کی آل پارٹیز کانفرنس لکھنو منعقدہ ۲۸ - ۲۹ - ۳۰ اگست سنہ ۱۹۲۸ میں ناکامی کے بعد یہ آس بھی ٹوٹ گئی - مولانا شوکت علی نے ستمبر سنہ ۱۹۲۸ع میں آل پارٹیز کانفرنس کا کچا چٹھا کھولا - اخبارات میں نہرو رپورٹ اور کانفرنس کے خلاف بیانات دیئے - سر علی امام نے ، جو نہرو کمیٹی کے ایک رکن تھے ، جواباً ایک بیان شائع کیا ، جس میں انھوں نے نہرو رپوٹ کی تائید

۹۷- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۲۸ع

کی — اب اخبارات میں یہ بحث چل پڑی — علامہ نے مولانا شوکت علی اور سر علی امام کے بیانات پڑھنے کے بعد فری پریس کے نمائندے کو ایک انٹرویو دیا ، جس میں انہوں نے کہا -

" مجھے ڈر ہے کہ آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس لکھنؤ کے فیصلہ جات اور مولانا شوکت علی کے وہ حیرت انگیز انکشافات ، جو انہوں نے اپنے ابتدائی بیان میں کئے ہیں ، ہندوستان کی فرقہوار صورت حال کو بد سے بدتر بنا دیں گے . . . . ہندوستان کا مسلمان اب اس جذبہ کو از سر نو سمجھنے اور اس کی قدر و قیمت مقرر کرنے پر مجبور ہوجائے گا جسے ، " ہندی قومیت " کے جذبہ سے موسوم کیا جاتا ہے - جونہی وہ اس امر پر غور کرے گا وہ اپنے آپ کو مولانا شوکت علی کی طرح پائے گا ، جن کی آنکھیں اب کھل چکی ہیں اور جو کمال رنج و احساس درد کے ساتھ اپنے دل کو آزادی کے اس جوش اور جذبہ سے خالی پاتے ہیں ، جس نے ان کی ہستی میں ایک قسم کی بجلی بھر رکھی تھی - تمام باتیں مسلمانوں کے احساس عدم اعتماد کو مستحکم و مضبوط کرنے کا موجب ہوں گی۹۸ "

ہم بتا چکے ہیں کہ سر سید کے مکتبہ فکر کے مسلمان سیاستدان سنہ ۱۹۰۶ سے دو دستوری تحفظات (۱) جداگانہ طریقۂ انتخاب اور (۲) تعین نشست پر زور دیتے چلے آئے تھے ، اور یہی دو تحفظات ہندوؤں کی نظر میں ابتدا سے کھٹکتے رہے تھے - سنہ ۱۹۲۷ میں مسلمان سیاست دانوں کی ایک جماعت نے تجاویز دہلی کی صورت میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کی ایک راہ نکالی تھی لیکن مسلم سیاست دانوں کے ایک دوسرے با اثر گروہ کو ، جو سر سید کے پرانے سیاسی مکتبۂ فکر کا حامی تھا ، ان سے اختلاف تھا اور وہ کسی صورت جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونا نہیں چاہتا تھا اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ علامہ اقبال کا تعلق بھی اسی سیاسی

۹۸- اخبار انقلاب لاہور ٦ ستمبر سنہ ۱۹۲۸ع

مکتبۂ فکر سے تھا ۔ اب جو نہرو رپورٹ کی موافقت و مخالفت میں اخبارات کے صفحات پر بحث چھڑی تو سر علی امام نے نہرو رپورٹ کی تائید میں من جملہ اور باتوں کے ان ہی دو تحفظات (۱) جداگانہ انتخاب اور (۲) تعین نشست کے خلاف عجیب و غریب دلائل پیش کئے کیوں کہ نہرو رپورٹ نے ان تحفظات کو ختم کر دیا تھا ۔ علامہ نے اپنے اس انٹرویو میں علی امام کے ان دلائل کا جواب دیا ۔ جداگانہ انتخاب کے سلسلہ میں انھوں نے کہا :

> " ذاتی طور پر میں جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب کا حامی ہوں ، اس کی وجہ کسی حد تک تو مسلمانان ہند اور خاص کر مسلمانان پنجاب کی موجودہ اقتصادی حالت ہے لیکن بڑی وجہ فرقہوار امن و آشتی کے قیام کا احتمال ہے ، جو میرے خیال میں صرف جداگانہ حلقہ ہائے انتخاب ہی سے متعین ہو سکتا ہے ۔ اگر ایک ہی حلقہ سے دو یا دو سے زیادہ ایسے امیدوار انتخاب کے لیے کھڑے ہوں گے ، جن کے مذہب مختلف ہوں تو ان لوگوں کی طرف سے بدترین مذہبی احساسات کو مستقل کرنے کا بہت بڑا احتمال بلکہ گمان غالب ہے ، جو جداگانہ فرقہوار انتخاب کی صورت میں مذہبی فرقہ بازی اور برادری کے احساسات سے فائدہ اٹھانے پر شرمسار نہیں ہوتے[۹۹] "

جداگانہ طریقہ انتخاب کی مخالفت اور مخلوط انتخاب کی موافقت میں سر علی امام نے بھی وہی دلیل دھرائی تھی ، جو ہندو لیڈر بالعموم پیش کیا کرتے تھے کہ جداگانہ انتخاب کے ذریعہ مذہبی تعصبات کو ہوا دی جاتی ہے ، اس کی وجہ سے ہر فرقہ ایسے نمائندوں کو منتخب کرتا ہے جو سخت متعصب ہوتا ہے ۔ اس طرح " قومی اتحاد " کی راہ میں یہ طریق انتخاب حائل ہے ۔ اقبال نے مندرجہ بالا اقتباس میں اس دلیل کی تردید محض قیاس ، ظن و تخمین کی بنیاد پر نہیں بلکہ عملی شواہد کی بناء پر کی ۔ انھوں نے کہا کہ جداگانہ انتخاب کے طریقہ میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ہی مذہب کے دو امیدوار مثلاً مسلمان باہم مقابلہ کرتے ہیں ۔ اس مقابلہ میں

۹۹- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۶ ستمبر سنہ ۱۹۲۸ع

اگرچہ دونوں امیدوار مسلمان ہوتے ہیں پھر بھی فرقہوارانہ اعتقادات مثلاً شیعہ، سنی، وهابی وغیرہ کو چھیڑا جاتا، برادری اور ذات پات کے تعصبات کو بھڑکایا جاتا ہے ۔ چنانچہ تمام صوبوں بالخصوص پنجاب میں یہ صورت حال واقعتاً موجود تھی ۔ اقبال کا کہنا یہ تھا کہ جب جداگانہ طریقۂ انتخابات کی صورت میں یہ حالت پیدا ہو چکی ہے ، تو مخلوط انتخاب کی صورت میں تو مذہبی تعصبات ، ہندو مسلم اختلافات کو اور اچھالا جائے گا ، اس طرح مخلوط انتخاب کے نفاذ کی صورت میں ہندو مسلم اختلافات کم ہونے کے بجائے اور گہرے ہو جائیں گے ۔

یہ تو تھی مسلمانوں کے تحفظ نمبر (۱) یعنی جدا گانہ انتخاب کے خلاف سر علی امام کی دلیل اور اس کا علامہ اقبال کی طرف سے جواب ، اب سنئیے مسلمانوں ، بالخصوص پنجاب و بنگال کے مسلمانوں کے مطالبۂ دستوری تحفظ نمبر (۲) یعنی تعین نشست کے خلاف سر علی امام کی دلیل ۔

" اول تو اس سے (یعنی تعین نشست سے) قوم (یعنی مسلمانوں) کے دل میں تحفظ کا غلط احساس پیدا ہو گا اور دوم یہ کہ یہ تخصیص اسے معین شدہ نشستوں سے زیادہ نشتسیں حاصل کرنے کے لیے مقابلہ کرنے سے روک دے گی ۱۰۰"

یہ اگر خود فریبی نہ تھی تو طفل تسلی ضرور تھی ۔ علامہ اقبال نے علی امام پر نہایت معنی خیز اور چبھتا ہوا طنز کیا اور ان کی اس دلیل کے متعلق کہا ۔

" میں نہیں کہہ سکتا کہ آیا سر علی امام نے یہ دلائل اپنے ضمیر کی تسلی کے لیے وضع کیے ہیں یا وہ ان کے زور پر اپنی قوم کو قائل کرنا چاہتے ہیں ۔ ان کے سے تجربہ رکھنے والے شخص کو اچھی طرح معلوم ہونا چاہیے کہ ہندوستان ایسی سرزمین نہیں ، جس میں ہر شے کو تعمیم کلی کے ساتھ کہا جا سکے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔
۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ سر علی امام وطن پرست ہونے کی حیثیت میں ، جیسا کہ وہ ہیں ، مسلمانوں کو پنجاب کے اندر مکمل فرقہ وار

۱۰۰- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ٦ ستمبر ۱۹۲۸ع ۔

تفوق قائم و مستحکم کرنے کی دعوت نہیں دے سکتے - پنجاب کے مسلمانوں کو اگر قانون ساز مجالس اور ملازمتوں میں ان کا مناسب حصہ دے دیا جائے تو وہ پوری طرح مطمئن اور قانع ہو جائیں گے ، انہیں اقتدار تفوق قائم کرنے کی ہرگز خواہش نہیں -

مزید برآں جیسا کہ میں اپنے پہلے انٹرویو میں کہہ چکا ہوں ، نہرو رپورٹ کے اندر پنجاب کی آبادی کے متعلق اعداد و شمار کی جو توضیح کی گئی ہے ، وہ سراسر گمراہ کن ہے - بالغ مردوں اور عورتوں کو رائے کا حق دینے کے بعد اس صوبہ کے مسلمانوں کے لیے اپنی اکثریت کو کونسل میں بحال رکھنا مشکل سی بات ہے[۱۰۱]''

نہرو رپورٹ کے خلاف متحدہ محاذ : آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں اقبال کا سرگرم حصہ

سنہ ۲۸ و ۲۹ کی ہندوستانی سیاست نہرو رپورٹ کے اطراف میں گھومتی ہے - نہرو رپورٹ اور شعیب قریشی کے اختلافی نوٹ کی اشاعت کے بعد ہی سے مسلمانوں کے اندر ایک بے چینی سی پیدا ہو گئی تھی - تاہم آل پارٹیز کانفرنس کے نتائج کا انتظار تھا لیکن جب اس کانفرنس میں مولانا شوکت علی کے اعتراضات اور مولانا حسرت موہانی کی تجاویز کو در خور اعتناء نہ سمجھا گیا تو مسلمانوں کا وہ گروہ ، جو شروع ہی سے آل پارٹیز کانفرنسوں سے بد دل ہو چکا تھا اور نہرو رپورٹ کے خلاف تھا ، اب زیادہ سر گرم کار ہو گیا - اس کا خیال تھا کہ اب کانگریسی اپنے اصلی روپ میں سامنے آ گئے ہیں ، اور ان کا اعتدال پسند اور روشن خیال طبقہ بھی مہا سبھا کے زیر اثر ہے - ایسی صورت میں نہرو رپورٹ میں ترمیم و تبدیلی محض خام خیالی ہے - آل پارٹیز کانفرنس لکھنو میں نہرو رپورٹ کی منظوری کے بعد کلکتہ کنونشن میں اس کو پیش کرنے کی تجویز محض ایک ڈھونگ ہے جو دنیا کو محض یہ دکھانے کے لیے رچایا جا رہا ہے کہ اس پر ہر مکتب خیال نے مہر توثیق ثبت کر دی ہے - مسلمانوں کے اس گروہ نے یہ سوچا کہ ان نازک حالات

۱۰۱- اخبار انقلاب ۶ ستمبر سنہ ۱۹۲۸ع -

میں نہرو رپورٹ کے جادو کا توڑ اسی طرح کیا جا سکتا ہے کہ اس کے خلاف مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ بنایا جائے۔ چنانچہ دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کر دیا گیا، جس کا ذکر ایک گونہ تفصیل کے ساتھ اس باب کے "پس منظر" میں ہم کر آئے ہیں۔

اب نہرو رپورٹ کے تعلق سے مسلمانوں کے اندر تین گروہ بن گئے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا جو شروع ہی سے اس کی تائید کر رہا تھا، اور جس نے آگے چل کر "مسلم نیشنلسٹ" کا لقب اختیار کر لیا، اس کے سرکردہ لیڈر، سرعلی امام، مولانا آزاد، ڈاکٹر انصاری وغیرہ تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا، جو اب بھی اس میں ترمیمات کر کے، اس کو مسلمانوں کے لیے قابل قبول بنانا چاہتا تھا۔ اس کے سربراہ مسٹر محمد علی جناح، مولانا محمد علی جوہر اور مہاراجہ محمود آباد وغیرہ تھے، اور تیسرا گروہ وہ تھا جو اس رپورٹ کا سرے سے مخالف تھا اور وہ جدا گانہ انتخاب اور تعین نشست کے دونوں تحفظات سے کسی صورت میں بھی دستبردار نہیں ہونا چاہتا تھا۔ اس گروہ کے سربرآوردہ لیڈروں میں سر شفیع اور علامہ اقبال شامل تھے اور یہی گروہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا داعی اور بانی تھا۔ ادھر نہرو رپورٹ کے مسلم موئیدین اور ترمیمات پسند گروہ آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہونے کے لیے دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں کلکتہ گئے اور ادھر نہرو رپورٹ کے مخالفین دہلی میں جمع ہوئے۔ وہاں کلکتہ کنونشن میں ۳۱ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء کو مسٹر جناح کی پیش کردہ تینوں ترمیمات رد کر دی گئیں اور مولانا محمد علی سابق صدر کانگریس کی توہین و تحقیر کی گئی، اور یہاں دہلی میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے شاندار اجلاس ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء تا یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ء زیر صدارت ہزہائی نس آغا خان منعقد ہوئے، جن میں نہرو رپورٹ کی مذمت کی گئی اور مسلم مطالبات کے سلسلہ میں ایک دس نکاتی قرارداد منظور کی گئی جس کو ہم اس باب کے پس منظر میں درج کر آئے ہیں۔ اس قرارداد کی خصوصیت یہ تھی کہ اس میں جدا گانہ انتخاب اور تعین نشست کے ساتھ سندھ کے لیے علیحدہ مستقل صوبہ کی حیثیت، بلوچستان اور سرحد میں اصلاحات کے نفاذ، پنجاب اور بنگال کی مجالس وضع قوانین میں مسلم اکثریت کی برقراری اور

مابقی اختیارات صوبوں کو دینے کے مطالبات کیے گئے تھے ۔ گویا دستوری تحفظات کے پرانے اصول اور توازنِ قوت کے جدید نظریہ دونوں کو اس میں سمویا گیا تھا ۔ یہ قرارداد آل پارٹیز کانفرنس کے اجلاس مورخہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع میں سر شفیع نے پیش کی اور علامہ اقبال نے اس کی تائید کی ۔ اس موقع پر جو تقریر علامہ نے کی وہ درجِ ذیل ہے ۔

" حضرات ! گذشتہ تین چار سال سے ہم کو جو مشاہدات و تجربات حاصل ہو رہے ہیں وہ نہایت مفید اور نتیجہ خیز ہیں ۔ ہم کو جو باتیں اپنے برادرانِ وطن کے متعلق سیاسی طور پر معلوم نہ تھیں اب وہ یقینی طور پر ہمارے علم میں آ گئی ہیں ۔

میں اس حقیقت کا اعتراف کرتا ہوں کہ آج سے نصف صدی قبل سر سید احمد خاں مرحوم نے مسلمانوں کے لیے جو راہِ عمل قائم کی تھی ، وہ صحیح تھی اور تلخ تجربوں کے بعد ہمیں اس راہِ عمل کی اہمیت محسوس ہو رہی ہے ۔

حضرات ! آج میں نہایت صاف لفظوں میں کہنا چاہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں کو ہندوستان میں بحیثیت مسلمان ہونے کے زندہ رہنا ہے تو ان کو جلد از جلد ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانا چاہیے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان میں بعض حصے ایسے ہیں ، جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے ۔ آج ہر قوم اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش کر رہی ہے ۔ پھر کیا وجہ ہے کہ مسلمان اپنے حقوق کے تحفظ کے لیے سعی و کوشش نہ کریں ۔ آج اس کانفرنس میں متفقہ طور پر جو ریزولیوشن پیش ہوا ہے ، وہ نہایت صحیح ہے اور اس کی صحت کے لیے میرے پاس ایک مذہبی دلیل ہے اور وہ یہ کہ ہمارے آقائے نامدار حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری امت کا

اجتماع کبھی گمراہی پر نہ ہوگا[۱۰۲]''

واقعہ یہ ہے کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس، نہرو رپورٹ کے خلاف متحدہ مسلم محاذ تھا اور اس کی یہ قرارداد مسلمانانِ ہند کی متفقہ آواز تھی، جس کی گونج علامہ اقبال کی تقریر میں سنائی دے رہی تھی! ـــــ اس تقریر میں علامہ نے تین باتیں بیان کیں۔

(۱) ہندوؤں کے متعلق جو اندازہ، ظن و تخمین کی بنیاد پر قائم کیا گیا تھا، تلخ تجربات کے بعد اب وہ صحیح ثابت ہوا۔

(۲) ہندوؤں کی تنگ نظری کے باعث متحدہ قومیت کے قیام سے مایوس ہو کر سر سید نے ہندو اکثریت کی چیرہ دستی سے بچنے کے لیے دستوری تحفظات اور ان کی بالادستی سے محفوظ رہنے کی خاطر علیحدگی کی جو پالیسی وضع کی تھی، وہ درست تھی۔

(۳) ہندوستان کے بعض حصوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، اور بعض میں ان کی اقلیت ہے۔ اس حقیقت کی روشنی میں ایک علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے۔

ان نکات سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اس زمانہ میں علامہ اقبال کی سیاسی فکر کس سمت میں کام کر رہی تھی۔ اب انہیں پختہ یقین ہو گیا تھا کہ ''ہندی قومیت'' کے بجائے ''مسلم ملیت'' کا جو نظریہ انہوں نے سنہ ۱۹۰۸ع میں قائم کیا تھا، ہندوستانی سیاست کی کسوٹی پر گھسے جانے کے بعد وہ عملاً صد فی صد درست ثابت ہو چکا ہے۔ سرسید نے مسلمانوں کے لیے سیاسی تحفظات کا مطالبہ کیا تھا اور پشین گوئی کی تھی کہ دونوں قومیں (ہندو اور مسلمان) مل کر نہ رہ سکیں گی(الف)۔ علامہ اقبال یہاں اسی کا حوالہ دے رہے ہیں اور اسی کی روشنی میں آیندہ علیحدہ پولیٹیکل پروگرام بنانے کا مشورہ دے رہے ہیں اور ساتھ ہی یہ کہہ رہے ہیں کہ مسلمان ہندوستان کے بعض حصوں میں اکثریت میں ہیں اور بعض حصوں میں اقلیت میں ہیں، یہ گویا سیاسی شاہراہ کی طرف اشارہ تھا،

۱۰۲- اخبار انقلاب لاہور یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ع۔

(الف) سر سید کی اس پالیسی کا مختصراً ذکر ہم پہلے باب میں کر آئے ہیں۔

جس پر وہ مسلمانوں کو مستقبل میں چلانا چاہتے تھے ۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی زمانہ میں ان کے ذہن میں برصغیر ہند کے مسلمانوں کے لیے علیحدہ اسلامی مملکت کا ایک ہیولیٰ سا تیار ہو رہا تھا ۔

الغرض نہرو رپورٹ نے ہندوستانیوں کو دو کیمپوں میں تقسیم کر دیا تھا ایک کیمپ ان لوگوں کا تھا ، جو وحدانی طرزِ حکومت اور مشترکہ انتخابات کو رائج کرنا اور کسی فرقہ کو مخصوص حقوق و تحفظات دینا نہیں چاہتا تھا ۔ بدقسمتی سے کچھ "نہرو زدہ" مسلمان (نیشنلسٹ) بھی اس کیمپ میں چلے گئے تھے ۔ دوسرا کیمپ ان لوگوں کا تھا جو وحدانی طرز حکومت کے برعکس ایک ایسے نظام حکمرانی و دستورِ سیاسی کا حامی تھا ، جس میں اقلیتوں کے لیے تحفظات بھی ہوں اور اکثریت کے خلاف "توازنِ قوت" بھی ۔ اس کیمپ میں ہندو کوئی نہ تھا ، سب کے سب مسلمان تھے ، لیکن یہ مسلمان مختلف گروہوں اور جماعتوں —— جناح لیگ ، شفیع لیگ ، مجلس خلافت ، جمیعۃ العلماٴ وغیرہ —— میں بٹے ہوئے تھے ۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں ان مختلف گروہوں اور جماعتوں کو اکٹھا کیا گیا تھا اور ان کے لیے ایک متحدہ پلیٹ فارم مہیا کیا گیا تھا ، پھر اس متحدہ پلیٹ فارم سے نہ صرف نہرو رپورٹ کے خلاف متحدہ آواز اٹھائی گئی تھی بلکہ مسلمانوں کے متفقہ مطالبات کو پیش کیا گیا تھا ۔ اس متحدہ محاذ کی تشکیل اور ان متفقہ مطالبات کی تدوین میں شفیع لیگ نے پیش قدمی کی تھی ۔ علامہ اقبال اس زمانہ میں شفیع لیگ کے سیکرٹری جنرل تھے اور اس لحاظ سے وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے بانیوں اور ان متفقہ مطالبات کے مرتب کرنے والوں میں سے ایک تھے ۔ یوں اس نازک زمانہ میں انھوں نے جو سیاسی خدمت انجام دی ہے ، اس کی اہمیت محتاج بیان نہیں ہے ۔

مسلم لیگ کا اجلاس دہلی
مارچ سنہ ۱۹۲۹ع نہروانی ٹولی کی سازش اور علامہ اقبال کے انکشافات

علامہ اقبال اور ان کے ساتھیوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے ذریعہ نہ صرف نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ بنایا تھا بلکہ مسلمانوں کی مختلف سیاسی

جماعتوں کو بھی باہم متحد کر دیا تھا ، تاہم جناح لیگ ابھی تک اس متحدہ محاذ سے الگ تھی ، اور وہ دہلی کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں بھی شریک نہیں ہوئی تھی ۔ اس عدم شرکت کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اس آل پارٹیز کنونشن میں شریک ہو رہی تھی ، جو ان ہی تاریخوں میں کلکتہ میں منعقد ہو رہا تھا ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ اس کو تمام مسلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کا دعویٰ تھا ۔ لہذا وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کو اپنا حریف سمجھ رہی تھی ۔ تیسری اور سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ اس کے اندر "نہروانی ٹولی" موجود تھی ، جو نہرو رپورٹ کو من و عن مسلم لیگ سے بھی منظور کروانا چاہتی تھی ، اس لیے یہ ٹولی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کی شدید مخالف تھی ۔ پھر نہرو رپورٹ میں ترمیم پسند گروہ بھی آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں شرکت کی بہ نسبت کلکتہ کنونشن میں شریک ہو کر وہاں اپنی جنگ لڑنا زیادہ پسند کرتا تھا ۔ اس طرح نہروانی گروہ کی آواز ترمیم پسند گروہ کی آواز کے ساتھ مل کر جناح لیگ میں زیادہ مؤثر ہو گئی تھی[۱۰۳] ۔ بہرحال یہ وہ مختلف وجوہ تھے ، جن کی بناء پر جناح لیگ مارچ سنہ ۱۹۲۹ع تک اس متحدہ مسلم محاذ سے علیحدہ تھی ۔

کلکتہ کنونشن میں ناکامی کے بعد مسٹر محمد علی جناح کو ہندوؤں سے سخت مایوسی ہوئی اور ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ان کی پیش کردہ تین ترمیمات کافی نہیں ہیں ، بلکہ مسلمانوں کے حقوق کے تحفظ کے لیے مزید مطالبات کرنے چاہئیں اور یہ بھی کہ جب تک تمام مسلمان سیاسی طور پر متحد و متفق نہ ہو جائیں ، ان کے ان مطالبات پر نہ تو ہندو کان دھریں گے اور نہ انھیں حکومت ہی سنے گی ۔ اسی لیے انھوں نے مختلف مسلم قائدین اور جماعتوں سے گفت و شنید کے بعد وہ فارمولا مرتب کیا جو چودہ نکات کے نام سے مشہور ہے اور پھر باہمی اتحاد کی کوشش کی ۔ اس اتحاد کی طرف پہلا قدم ، فطری طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ جناح لیگ اور شفیع لیگ کا انضمام ہو جائے ،

۱۰۳- ہندوستان کا مستقبل از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲۶۲ ۔

چنانچہ، وہ سر محمد شفیع سے اوائل مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں ملے اور یہ فیصلہ کیا کہ مسلم لیگ کا اجلاس مارچ کی آخری تاریخوں میں ، بمقام دہلی بلایا جائے تاکہ وہاں شفیع لیگ اور جناح لیگ کا انضمام بھی ہو جائے اور چودہ نکات بشکل قرارداد منظور بھی کر لیے جائیں - چنانچہ مقررہ تاریخوں میں شفیع لیگ کے ارکان ، جن میں علامہ اقبال بھی شامل تھے وہاں پہنچے - لیکن جناح لیگ میں شامل "نہروانی ٹولی" اپنا کھیل کھیل رہی تھی - اس کا مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے اس اجلاس میں مسٹر جناح کے چودہ نکات کے بجائے نہرو رپورٹ کی تائید میں ایک قرارداد منظور ہو جائے -

علامہ اقبال کا مسلم لیگ کے اس اجلاس سے قریبی تعلق رہا ہے ، اس لیے انھوں نے اس اجلاس کے پس منظر اور پیش منظر ، دونوں پر سے پردہ اٹھایا ہے - ۷ اپریل سنہ ۱۹۲۹ء کو انھوں نے سر فیروز خان نون اور سر عبدالقادر کے ساتھ مل کر ایک بیان جاری کیا جس میں وہ کہتے ہیں :

"لاہور لیگ (الف) کے ارکان کی ایک بہت بڑی تعداد جن میں کئی اہم ایم - ایل - سی اور دیگر سرکردہ حضرات شامل تھے ، محض اس مفاہمت کی بناء پر دہلی گئی کہ جناح لیگ اس قرارداد کو منظور کرنے کے لیے تیار ہے ، جو آل انڈیا مسلم کانفرنس دہلی نے ہزہائی‌نس آغا خاں کے زیر صدارت مسلمانوں کے متحدہ مطالبہ کے طور پر پاس کی تھی -

ہمیں یہ معلوم کرکے سخت مایوسی ہوئی کہ اگرچہ مسٹر جناح متذکرہ تجویز کو منظور کرنے کے لیے ذاتی طور پر تیار تھے ، کیونکہ وہ مسلمانوں کی اکثریت کے نقطۂ نگاہ کی نمائندگی کرتی تھی ، جیسا کہ ان کی تیار کردہ قرارداد سے ظاہر ہے ، تاہم ان کی لیگ میں ایک ایسا گروہ بھی تھا جو ہرحال میں نہرو رپورٹ کی تائید کرنے پر تلا ہوا تھا اور اس نے اجلاس پر غلبہ حاصل

(الف) لاہور لیگ سے مراد شفیع لیگ ہے ، جس کو آل انڈیا مسلم لیگ لاہور بھی کہا جاتا تھا -

کرنے کے لیے ناواجب کوششیں بھی کی تھیں - اس طبقے نے ۲۸ مارچ تک اپنی پسند کے ارکان لیگ میں بھرتی کر لیے لیکن جب اس سے ہماری جماعت کے ارکان کو بھرتی کرنے کے لیے کہا گیا تو صاف انکار کر دیا - - - - - - - - - - - - - - - - - - تجویز کی گئی کہ ہم میں سے ان اشخاص کو جن کے نام ابھی تک دہلی لیگ (الف) کی فہرستِ ارکان میں موجود ہیں اجلاس میں شامل ہونے کی اجازت دی جائے ، لیکن ایسے لوگوں کی تعداد جو اس وقت موجود تھی بہت کم تھی - مزید برآں جب ہماری جماعت کا ایک وفد دونوں لیگوں کے اتحاد کی گفت و شنید کرنے کے لیے مسٹر جناح سے ملا تو موصوف نے انھیں من جملہ دیگر امور کے یہ بھی بتایا کہ ہماری لیگ کونسل کے ارکان جناح لیگ کونسل میں صرف اسی حد تک لیے جا سکتے ہیں جس حد تک کہ وہاں نشستیں خالی ہیں، اور خالی نشستیں بہت کم تھیں - یہ بات اس کے بالکل برعکس تھی ، جو سر محمد شفیع نے ہمیں بتائی تھی - اس طرح کا انتظام اور اتنی تھوڑی تعداد میں ہماری شمولیت صورتِ حالات کو جوں کا توں چھوڑ دیتی چونکہ ہم دہلی کی جمیعت کے ساتھ جنگ کرنے کے خیال سے نہیں گئے تھے ، اس لیے ہم متفق ہو کر لیگ کے اجلاس میں نہیں گئے تا کہ وہاں دوسری پارٹی سے تصادم نہ ہو - لیکن ہم نے اس بات کی اجازت دے دی کہ جس شخص کا نام دہلی لیگ کی فہرست پر اب تک باقی ہو ، وہ اپنی انفرادی حیثیت میں وہاں چلا جائے -

نہرو رپورٹ کی مختصر سی حامی ٹولی کا رویہ دہلی لیگ میں بڑا ہی افسوس ناک تھا - تاہم ہمارا خیال ہے کہ مسلمان قوم کو اس بات پر پریشان نہیں ہونا چاہیے ، جس پر اس مختصر سے گروہ کی مساعی منتج ہوئی ہیں - قوم اس امر کا مظاہرہ کرنا چاہتی ہے کہ

(الف) دہلی لیگ سے مراد جناح لیگ ہے ، جسے آل انڈیا مسلم لیگ دہلی بھی کہا جاتا تھا -

نہرو رپورٹ ہندوستان کی اکثریت کے لیے قابل قبول نہیں ہے۔ دہلی کے گذشتہ واقعات نے اس امر کا مظاہرہ بہ صورت ذیل کر دیا ہے۔

(الف) اگر حامیان نہرو رپورٹ کا گروہ رپورٹ کی حمایت میں قرارداد منظور کرانا چاہتا اور لاہور لیگ کے ارکان اس میں شامل ہوتے تو وہ ہرگز ایسا نہ کر سکتا ،

(ب) اگر وہ حاضرین جلسہ کی موجودگی میں قرارداد منظور کرانے پر مطمئن تھے تو بھی وہ ایسا کرنے میں ناکام رہتے کیونکہ ۶۲ ارکان کی ایک بڑی جمیعت جس میں مولانا شفیع داؤدی مولانا محمد علی ، مولانا شوکت علی ، مولانا محمد یعقوب اور نواب اسماعیل خاں جیسی شخصیتیں بھی تھیں ایک روز قبل لیگ کے اجلاس سے اٹھ کر چلے گئے تھے ، جنھیں پھر جلسے میں نہیں بلایا گیا ،

(ج) حامیان نہرو رپورٹ کو سمجھ لینا چاہیے کہ ۶۲ ارکان کے چلے جانے کے بعد جب کہ آل انڈیا مسلم لیگ کا ایک معمولی حصہ باقی رہ گیا تھا ، کسی قرارداد کی منظوری کوئی معنی نہیں رکھتی ۔ بہرحال وہ نہرو رپورٹ کی حمایت میں قرارداد کی برائے نام منظوری پر تلے ہوئے تھے اور انھوں نے کھلا اجلاس لیگ کے مستقل صدر مسٹر جناح کا انتظار کیے بغیر شروع کر دیا ۔ مسٹر جناح اس وقت روٹھے ہوئے ارکان سے گفت و شنید کر رہے تھے ۔ ڈاکٹر عالم کو عارضی طور پر صدر بنایا گیا ۔ کہا جاتا ہے کہ اس تجویز نے اس اجلاس میں اتنا شور و غل برپا کر دیا کہ قرارداد مذکور پر نہ بحث ہو سکی ، نہ غور کیا جا سکا اور اجلاس سراسر بے نتیجہ رہا ۔ ڈاکٹر عالم کا بیان ہے کہ قرارداد باقاعدہ پیش ہوئی ، اس کی تائید کی گئی اور بغیر تقریروں کے اس کی منظوری کا اعلان کر دیا گیا ۔ اس بیان کی تردید مسٹر محمد صادق ایم ۔ ایل ۔ سی کے بیان سے ہوتی ہے

جو اس اجلاس میں موجود تھے، نیز مسٹر جناح کے بیان سے ہوتی ہے، جنھوں نے اجلاس میں پہنچ کر لیگ کے سیکرٹری ڈاکٹر کچلو سے خود یہ سنا کہ قرارداد منظور نہیں ہوئی - ہم اجلاس میں موجود نہ تھے اور ہمیں وہاں کے حالات کا ذاتی علم نہیں - مسٹر صادق نے اپنے بیان میں لکھا ہے کہ انہوں نے اجلاس کی کارگذاری کی بے قاعدگی کی طرف صدر کی توجہ مبذول کرائی اور انہیں ترمیم پیش کرنے کی اجازت مل گئی - ابھی ترمیم پیش نہ ہوئی تھی کہ اجلاس ملتوی کر دیا گیا - یہ بیان واقعات کے اقرب معلوم ہوتا ہے - مزید برآں جو لوگ مسٹر جناح کو جانتے ہیں، وہ سمجھ سکتے ہیں کہ انہوں نے سیکرٹری سے پوچھ کر معلوم کیا کہ قرارداد ابھی تک منظور نہیں ہوئی - مسٹر جناح یہ بھی کہتے ہیں کہ ڈاکٹر عالم نے اس وقت اس امر واقعہ کو تسلیم کرنے سے انکار نہیں کیا تھا -

ہمارا خیال ہے کہ محض لیگ کے اجلاس کے التواء ہی میں ہماری فتح مضمر ہے - ہم نے مسٹر جناح کو ایک مکتوب لکھا تھا، جن میں یہی تجویز کی گئی تھی"[۱۰۳] -

پہلی گول میز کانفرنس کے اعلان انعقاد پر اقبال کے تاثرات!

بیان کیا جا چکا ہے کہ سائمن کمیشن کی رپورٹ پیش ہو جانے کے بعد وائسرائے ہند لارڈ اِروِن انگلستان گئے اور وہاں صلاح مشورہ کرنے کے بعد ہندوستان لوٹے اور ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۲۹ع کو گول میز کانفرنس کے انعقاد کا اعلان کیا - علامہ اقبال نے اپنے سیاسی رفقاء کے ساتھ ایک مشترکہ بیان دیتے ہوئے اس اعلان کا اس طرح خیر مقدم کیا:

"وائسرائے نے جو اعلان کیا ہے وہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا اطمینان بخش حل پیش کرتا ہے - - - - - - - - - - - - - - - - - - -

---

۱۰۳- اخبار انقلاب لاہور ۱۰ اپریل سنہ ۱۹۲۹ع -

سائمن کمیشن کی رپورٹ کے بعد ملک معظم کی حکومت اور ہندوستان کے رہنماؤں اور دیسی ریاستوں کے نمائندوں کی جو کانفرنس تجویز کی گئی ہے ، وہ ہماری رائے میں دور اندیشی اور تدبر کا فعل ہے - - - - - - - ہم ملک معظم کی حکومت کے دانشمندانہ فیصلے کا خیر مقدم کرتے ہیں ''

پھر اسی بیان میں آگے چل کر ان دو شرائط کا ذکر کیا جو اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے ضروری تھیں ۔ ان شرائط کو بھی ان ہی کی زبان سے سنیے ،

'' ہماری رائے میں مجوزہ کانفرنس کی کامیابی کے لیے دو شرطوں کا پورا کیا جانا ضروری ہے ۔

(۱) ہندو مسلم اختلافات نمائندگان ہند کے اس تاریخی اجتماع میں جانے سے پہلے طے ہو جانے چاہئیں ، تمام صحیح الخیال اصحاب پر واضح ہو گا کہ ان اختلافات کے طے کیے بغیر ہندوستانی نمائندے اپنی صلاحیت درجہ مستعمرات کی بے حقیقتی نمایاں کرنے کے سوا کچھ نہ کر سکیں گے ۔ اگر ہندوستان کی مختلف سیاسی جماعتوں کے رہنما اس نازک موقع پر اتحاد قائم نہ رکھ سکے تو کانفرنس افسوس ناک ناکامی پر منتج ہو گی ،

(۲) دوسری ضروری بات یہ ہے کہ جو نمائندے اس کانفرنس میں جائیں ، وہ تمام قوموں کے حقیقی نمائندے ہونے چاہئیں ۔ ہم حکومت کو متنبہ کرتے ہیں کہ اگر مختلف مفادات کے حقیقی نمائندوں کے انتخاب کا خیال نہ رکھا گیا اور زیادہ شور مچانے والے طبقے کو مطمئن رکھنے کے اضطراب کو دستور عمل بنا لیا گیا تو کانفرنس یقیناً ناکام رہے گی ۔ ہمیں یقین ہے کہ اگر حقیقی ہندوستانی رہنماؤں کو بلا لیا گیا تو کانفرنس حقیقی طور پر اصل مقصد حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائے گی[۱۰۵] '' ۔

۱۰۵- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۹۲۹ع ۔

۱۲ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع کو لندن میں گول میز کانفرنس شروع
لیکن کن حالات میں ؟ ایسے حالات میں کہ وائسرائے کے اعلان کے
ہندو مسلم اختلافات کو حل کرنے کی طرف کوئی توجہ ہی نہیں دی
تھی ، اس کی بڑی وجہ کانگریس کا متکبرانہ طرز عمل تھا ۔ ہندو سبھا
کانگریس نے نہرو رپورٹ کو ہندوستان کے دستوری و سیاسی مسائل کا آ
حل اور کلکتہ کنونشن کو ہندو مسلم اتحاد کے حصول کی کوششو
آخری باب قرار دے دیا تھا ، پھر ۱۹۲۱-۲۰ع کی تحریک عدم تعاون کی کا
کا نشہ ہندو کانگریس پر سوار تھا ۔ اب تو اس کی روش یہ تھی کہ
مسلمان ساتھ آتے ہیں تو فبہا ، ورنہ ہم اپنے زور بازو سے برطانوی حک
کو نیچا دکھائیں گے اور پروانۂ آزادی حاصل کر کے رہیں گے ۔
نفسیاتی کیفیت کے پس منظر میں اس نے ہندو مسلم اتحاد سے صرف
کر کے ، بمقام لاہور دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع میں آزادئ کامل کا اعلان کیا
حکومت کو الٹی میٹم دیا تھا ، پھر اسی زعم میں اس نے اپریل ۳۰
میں سول نافرمانی کا آغاز کر دیا تھا ۔ اس طرح جب نومبر سنہ ۳۰
میں گول میز کانفرنس شروع ہوئی تو وہ دونوں شرطیں جو علامہ اقبال
اس کانفرنس کی کامیابی کے لیے پیش کی تھیں ، پوری نہ ہوئیں ۔ ہندو
اختلافات علی حالہ باقی تھے ۔ سول نافرمانی کی مہم کے باعث کانگریہ
اس کے کسی نمائندے نے اس کانفرنس میں شرکت ہی نہیں کی تھی ،
ہندو مہاسبھا کے "غوغائی" اس میں موجود تھے ، گویا ہندوؤں کے
نمائندوں کے بجائے "زیادہ شور مچانے والے ہندو رہنما" شریک تھے ۔
یہ کہ یہ کانفرنس کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ملتوی کر دی گ
یوں اس کے ناکام ہو جانے کی اقبالی پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی ۔

اقبال کی یہ غور کردہ رائے تھی کہ گول میز کانفرنس میں شر
سے قبل خود ہندوستانیوں کو آپس میں متحد ہو جانا چاہئے اور انگل
میں متحدہ طور پر اپنے مطالبات پیش کرنے چاہئیں ۔ پھر اس اتحاد کے
ان کے ذہن میں دو مرحلے تھے ۔ پہلا مرحلہ اتحاد بین المسلمین کا تھا
دوسرا ہندو مسلم اتحاد کا ۔ ان کا خیال تھا کہ متحدہ انگلستان کا م
اسی طرح کا متحدہ ہندوستان ہی کر سکتا ہے اور اپنے مقاصد میں کا

ہو سکتا ہے ۔ ۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع کو برکت علی اسلامیہ ہال لاہور میں مسلمانوں کے ایک جلسہ عام کو خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا ۔

”خدا کے لیے مسلمانوں کے تحفظ حقوق کے لیے کچھ کرو ، تمام سٹیجوں کو جلا دو اور ایک متحدہ سٹیج بناؤ اور آئندہ گول میز کانفرنس میں جانے سے پیشتر ایک کانفرنس کر لو ۔ ہندوؤں کو ایک موقع دو محض اتمام حجت کے لیے، تاکہ ان سے مفاہمت اگر ممکن ہو تو ہو جائے ، گو مجھے اس کا یقین نہیں ۔ انگلستان متحد ہو گا ، ہندوستان کو بھی متحد ہو جانا چاہئے اور متحد ہندوستان کو انگلستان کا مقابلہ کرنا چاہئے ۔ پہلے مسلمان آپس میں اتحاد کریں ، پھر ہندو مسلم اتحاد ہو گا[۱۰۶] “ ۔

پہلی گول میز کانفرنس کے دوران اقبال کا اضطراب

پہلی گول میز کانفرنس ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع کو شروع ہوئی ۔ برطانیہ کی لیبر گورنمنٹ نے مسلمانوں کے نمایندوں بالخصوص سر محمد شفیع (پنجاب) اور فضل الحق (بنگال) پر دباؤ ڈالا کہ وہ ہندوؤں سے مفاہمت کر کے مخلوط انتخاب کو کسی نہ کسی شکل میں قبول کر لیں ۔ یہ خبر اس شکل میں ہندوستان پہنچی کہ گول میزکانفرنس کے مسلم مندوبین اس قسم کی مفاہمت کے لیے تیار ہوگئے ہیں ۔ اس خبر سے علامہ اقبال بہت مضطرب ہوگئے اور انھوں نے سر آغا خاں کو ، جو گول میز کانفرنس میں مسلم مندوبین کے سربراہ تھے ، بتاریخ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع حسب ذیل برقیہ (Telegram) روانہ کیا ۔

”تازہ خبریں اضطراب انگیز آ رہی ہیں ۔ مسلمانان پنجاب کی رائے عامہ دہلی مسلم کانفرنس کی منظور کردہ قراردادوں پر قائم ہے اور ان میں رد و بدل کو ناقابل برداشت خیال کرتی ہے ۔ اگر کوئی رد و بدل کیا گیا تو مسلم مندوبین پر اعتماد نہیں رہے گا ۔ اگر ہندو مسلم مطالبات کو نہیں مانتے تو مسلمان کانفرنس چھوڑ

۱۰۶- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع ۔

کر چلے آئیں[۱۰۷]"

اس تار پر ہندو اخبارات نے بڑا شور مچایا ، اخبار ٹریبیون (Tribune) لکھا ۔

" ہندو مسلم مفاہمت نہ ہونے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ڈا اقبال ہیں ، جنہوں نے گول میز کانفرنس کے مسلم مندوبین اس وقت تار دیا جب کہ وہ مخلوط انتخاب پر رضامند چکے تھے[۱۰۸]"

اپر انڈیا مسلم کانفرنس آغا خاں کے نام یہ برقی پیغام روانہ کے بعد وہ مطمئن ہو کر بیٹھ نہیں گئے بلکہ ہندوستان اور پنجاب مقامی اخبارات میں بھی انہوں نے اس مسئلہ کو اٹھایا اور اس قسم مفاہمت کے خلاف عملی اقدام کرنے کی ایک تجویز بھی پیش کی ۔ وہ یہ تھی شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریت والے صوبوں یعنی پنجاب ، سند سرحدی صوبہ اور بلوچستان کو متحد کیا جائے اور اس غرض سے کانفرنس بلائی جائے اور اس کانفرنس کے پلیٹ فارم سے اس مبینہ مفا کی پر زور مخالفت کی جائے ۔ اس کانفرنس کو انہوں نے " اپر انڈیا ، کانفرنس" کا نام دیا تھا ۔ ۲۳ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع کو علامہ اقبا " مسلم آوٹ لک" کے نمائندے کو انٹرویو دیتے ہوئے مبینہ " مفاہمت" پر تبصرہ کیا اور اس تجویز کا ذکر بھی کیا ، انہوں نے

" پنجاب اور دوسرے حصوں کے مسلمان جداگانہ انتخاب مضبوطی کے ساتھ جمے ہوئے ہیں ۔ آل انڈیا مسلم کانفرنس اجلاس لکھنؤ کے صدر (نواب محمد اسمعیل خاں) نے اس باب مسلمانوں کی رائے کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، نیز یہ سمجھتے کہ فرقہ وار مسائل کے متعلق بیان کردہ مفاہمت مسلمانا مفاد کے لیے نقصان رساں ہو گی ، ہزہائی نس سر آغا خاں

۱۰۷- اخبار انقلاب لاہور ۱۸ نومبر ۱۹۳۰ع ۔
۱۰۸- اخبار ٹریبیون یکم جنوری ۱۹۳۱ع ۔

تار دیا کہ مسلمان کسی حالت میں بھی جدا گانہ انتخاب ترک کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں - پنجاب اور دوسرے صوبوں سے بھی اسی مضمون کے برقی پیغامات آغا خان اور دوسرے مندوبین کے نام بھیجے جا چکے ہیں - میری رائے میں مسلمانوں کا خوف بالکل حق بجانب ہے[۱۰۹]"

پھر انہوں نے اپر انڈیا مسلم کانفرنس کا ذکر اسی انٹرویو میں ان الفاظ میں کیا -

" یہ تجویز پیش ہو چکی ہے کہ شمالی و مغربی ہند اور پنجاب کے مسلمان لاہور میں ایک اجلاس منعقد کر کے بیان کردہ مفاہمت کے متعلق اپنی رائے کا پر زور طریق پر اظہار کریں - جن صوبوں میں مسلمانوں کو بہ اعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے ان میں حصول اکثریت کے لیے اصرار ضروری ہے[۱۰۹]"-

اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی یہ تجویز علامہ اقبال کے ذہن میں، محض اس مفاہمت کے رد عمل کے طور پر وقتی لحاظ سے پیدا نہیں ہوئی تھی، بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ تجویز ایک مستقل تحریک کی حیثیت سے بہت پہلے سے، شاید عملی سیاست میں ان کے داخلہ کے وقت ہی سے ان کے ذہن میں گردش کرتی رہی ہے - تاہم اس کی طرف، پہلی مرتبہ اشارہ، انہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی (۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع) کی تقریر میں کیا تھا اس تقریر میں انہوں نے کہا تھا -

" آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے بعض حصے ایسے ہیں جن میں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بعض حصے ایسے ہیں جن میں وہ قلیل تعداد میں ہیں - ان حالات میں ہم کو علیحدہ طور پر ایک پولیٹیکل پروگرام بنانے کی ضرورت ہے[۱۱۰]"-

بہرحال اب نومبر سنہ ۱۹۳۰ع میں انہوں نے اپر انڈیا مسلم کانفرنس

۱۰۹- اخبار انقلاب لاہور یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ع -
۱۱۰- اخبار انقلاب لاہور مورخہ یکم جنوری سنہ ۱۹۲۹ع -

کی تجویز پیش کی اور اس تجویز کو روبہ عمل لانے کی غرض سے ۲۳ نومبر سنہ ۱۹۳۰ع کو مسلم اکابرین لاہور کو برکت علی اسلامیہ ہال میں جمع کیا ۔ علامہ اقبال کی دعوت پر اس اجتماع میں لاہور کے ۲۲ نہایت ممتاز حضرات نے شرکت کی جن میں قابل ذکر مولانا غلام رسول مہر ، مولانا عبدالمجید سالک ، خان سعادت علی خان رئیس اعظم ، ڈاکٹر خلیفہ شجاع الدین ، مولانا غلام محی الدین ، ملک محمد دین ، سید مراتب علی شاہ گیلانی وغیرہ تھے ۔ اس اجتماع میں علامہ اقبال نے ایک مختصر سی تقریر کی اور اس میں اس کانفرنس کے اغراض و مقاصد بیان کیے ، انہوں نے کہا ۔

" حالات حاضرہ کے اعتبار سے شمالی ہند کے مسلمانوں کی ایک خاص کانفرنس کا انعقاد ضروری ہے جس میں صوبہ سرحد ، بلوچستان ، پنجاب و سندھ کے نمایندے شریک ہوں اور ان صوبوں کے مسلمانوں کو اسلامی حقوق کے حصول کے لیے منظم بنانے اور ان میں جوش عمل پیدا کرنے کی تدابیر اختیار کی جائیں[۱۱۱] " ۔

اسی اجتماع میں اس کانفرنس کی ایک مجلس استقبالیہ ترتیب دی گئی ، اور مجلس استقبالیہ کے سکریٹری اور فنانشیل سکریٹری کا انتخاب بھی عمل میں آیا ۔ علامہ اقبال مجلس استقبالیہ کے صدر منتخب ہوئے ۔ اس کانفرنس کا ایک باضابطہ دفتر بھی قائم کر دیا گیا اور عملی کام بھی شروع ہو گیا ۔

۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع کو مجلس استقبالیہ کا ایک جلسہ علامہ اقبال کی کوٹھی پر منعقد ہوا ، جس میں کانفرنس کے سکریٹری کا انتخاب عمل میں آیا ۔ پہلے خیال یہ تھا کہ دسمبر ۱۹۳۰ع ہی میں کانفرنس منعقد کی جائے لیکن چونکہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کا انتخاب عمل میں آ چکا تھا ، اس لیے طے پایا کہ یہ کانفرنس بجائے دسمبر ۱۹۳۰ع کے اواخر جنوری سنہ ۱۹۳۱ع میں بمقام لاہور منعقد کی جائے[۱۱۲] ۔

۱۱۱- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ع ۔

۱۱۲- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ع ۔

۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ء کو اس کانفرنس کی جانب سے اہلِ فکر مسلمانوں کے نام ایک اپیل شائع کی گئی ، جس پر علامہ مرحوم اور دیگر اراکینِ مجلس استقبالیہ کے دستخط تھے ۔ اس اپیل سے اس کانفرنس کی ہیئتِ ترکیبی ، اس کے اغراض و مقاصد ، اس کے طریقۂ کار اور اس کے محرکات پر روشنی پڑتی ہے ، اس لیے اس کو من و عن درج ذیل کیا جاتا ہے ۔

" دفتر اپر انڈیا مسلم کانفرنس لاہور مورخہ ۱۶ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء ۔ برادران اسلام ! السلام علیکم ۔ آپ "مسلم آوٹ لک" "سیاست" ، " انقلاب " اور دیگر اخبارات کے ذریعہ سے یہ خبر سن چکے ہوں گے کہ جنوری ۱۹۳۱ء میں ہم لوگ لاہور میں مسلمانوں کے ایک اجتماع کا بندوبست کر رہے ہیں ، جس کا نام بالائی ہند کے مسلمانوں کی کانفرنس (اپر انڈیا مسلم کانفرنس) تجویز کیا گیا ہے ۔ اس اجتماع میں شمولیت کے لیے ہم (۱) شمال مغربی سرحدی صوبہ (۲) بلوچستان (۳) سندھ اور پنجاب کے مسلمان نمایندوں کو . . . . دعوت دینا چاہتے ہیں اور جن نمایندوں کو مدعو کرنے کا ارادہ ہے ان کی تفصیل یہ ہے ۔

۱۔ ان صوبوں کے وہ مسلمان بزرگ جو کونسل آف اسٹیٹ یا اسمبلی کے ارکان ہیں ۔ ان صوبوں میں سے جن میں مجالس آئین ساز (کونسلیں) موجود ہیں ، ان کے مسلمان ارکان ۔

۲۔ ان صوبوں میں ، جہاں ڈسٹرکٹ بورڈ یا بلدیات یا مشتہرہ علاقہ جات (نوٹی فایڈ ایریاز) یا پنچایتیں یا دوسری ایسی جماعتیں موجود ہیں ، جو بروئے قانونِ ملک معرض وجود میں آئی ہوں ، ان کے مسلمان ارکان ،

۳۔ مقتدر مسلم جماعتوں کے نمایندے ۔

۴۔ دیگر معزز مسلمان اکابر ۔

اس کانفرنس کے طلب کرنے کا مقصد یہ ہے کہ

ان صوبہ جات کے مسلمانوں کو حالات حاضرہ اور آج کی سیاسی تحریکات سے آگاہ کیا جائے اور ہماری ہمسایہ اقوام اور ہندوستان

کی حاکم قوم کی حکمت عملی سے واقف کر کے ان خطرات سے آگاہ کیا جائے جن سے اس وقت ملت مرحومہ دوچار ہے اور اس کے بعد مسلمانان ہند کی اس کثرت کو جو ان صوبہ جات میں ہے، اور جن کو خدائے حکیم و علیم و خبیر نے یقیناً بلا مصلحت نہیں بلکہ کسی ایسی مصلحت کے لیے جو ارباب دانش و بنیش پر روز بروز عیاں ہوتی جا رہی ہے، یکجا رکھا ہے، اور ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لیے سرگرم عمل ہونے کا پیغام دیا جائے۔

آپ جیسے باخبر حضرات کو خطاب کرتے ہوئے سیاسیات حاضرہ پر تفصیلی بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ دور کیوں جائیے نہرو رپورٹ کے اجرا کے زمانے کے بعد سے جو سیاسی تغیر رونما ہوئے اور سیاسیات کے بحر ذخار میں جو تموج پیدا ہوئے آپ ان کے اسباب و علل، تاثرات اور یقینی نتائج سے نا آگاہ نہیں ہو سکتے۔ آپ نے دیسی ریاستوں کے متعلق بٹلر کمیٹی کی رپورٹ اور ہندوستان کے آئندہ دستور اساسی کے انصرام کے واسطے سائمن کمیشن اور اس کی امدادی کمیٹیوں کی تگ و دو کا مطالعہ کیا ہوگا۔ اس کے بعد جس طرح سر جان سائمن نے دیسی ریاستوں اور برطانوی ہند کے اتحاد کی اہم پیدا کی اور حکومت ہند نے سائمن رپورٹ پر تبصرہ کیا ہے، اس سے بھی آپ کا واقف ہونا غیر مشتبہ ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ جس وقت وائسرائے کے نامزد کردہ مسلمان ہندو گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن کو سدھارے تھے، تو ہم مسلمان چاہتے تھے کہ

۱- ہندوستان کا نظام حکومت فیڈرل ہو

۲- پنجاب و بنگال کی مسلم اکثریتیں قائم رہیں

۳- بلوچستان، سرحد اور سندھ کے مسلمان صوبوں کو مکمل اصلاحات ملیں۔

۴- وزارتوں اور ملازمتوں میں مسلمانوں کا حصہ بروئے دستور اساسی محفوظ کر دیا جائے۔

شریعت، فقہ، تمدن اسلام، تعلیم اسلام اور مسلمانوں کا انفرادی قانون غیر مسلم دسترس سے بروئے دستور اساسی محفوظ کر دیا جائے۔

۶- غیر مصرحہ اختیارات (Residuary powers) صوبجات کے قبضہ میں رہیں، اور

۷- مرکز کی مجالس آئین ساز اور وزارت میں ہمارا حصہ ایک تہائی ہو۔

یہ مختصر سی روئداد ہے ان مسلم مطالبات کی، جو مسٹر جناح کے چودہ نکات یا دہلی کی مشہور قرارداد کے نام سے معروف ہیں جو سر آغا خاں کی صدارت میں آل انڈیا مسلم کانفرنس سنہ ۱۹۲۹ع کے پہلے روز منظور کی گئی تھی۔ لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ لندن میں دیسی ریاستوں کو فیڈرل نظام ہند میں شمولیت کی دعوت دی جا رہی ہے اور دیسی ریاستوں کی طرح تمام برطانوی ہند کو اس نظام کا ایک صوبہ یا جزو تسلیم کرانے کی سعی کی جا رہی ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہندوستان کے موجودہ صوبہ جات کی حیثیت وہی ہوگی جو پنجاب کے کسی ضلع کو اپنے صوبہ کے اندر حاصل ہے۔ یوں جہاں ہم مسلمان فیڈرل نظام کو تسلیم کیے جانے پر اظہار مسرت کر رہے ہیں، وہاں ہم بلاشبہ اس حقیقت سے نا آگاہ ہیں کہ اس لفظی ٹٹی کی آڑ میں ہمیں شکار بنایا جا رہا ہے۔ پھر جن صوبوں میں مسلمانوں کی تعداد اقلیت میں ہے، ان کو قدرے زیادہ نشستیں دے کر شطرنج سیاست پر سکھوں کے مہرہ کو بڑھایا جا رہا ہے اور ہمیں شہ مات دینے کی کوشش کی جا رہی ہے[۱۱۳]۔"

آپ انڈیا مسلم کانفرنس کی ان تمام تفصیلات پر ان کی آل پارٹیز مسلم کانفرنس دہلی (۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع) والی تقریر کی روشنی میں

۱۱۳- اخبار انقلاب مورخہ ۱۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع -

غور کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سیاست کے عملی میدان میں داخل ہونے کے بعد ایک مسلم مملکت کی تصویر کا خا کہ ان کے نہاں خانۂ تصورات میں بننے لگا تھا ، جس کی جھلکیاں ہمیں اس محولۂ بالا تقریر اور اس تجویز میں دکھائی دیتی ہیں ۔ بہرحال اپر انڈیا مسلم کانفرنس کی تجویز علامہ اقبال نے پیش کی اور اس کی پیش رفت میں یہ کچھ انتظامات انھوں نے کیے ، جن کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے ۔ لیکن یہ تجویز روبہ عمل نہ آ سکی ۔ اس کی بعض وجوہات تھیں :

(۱) پہلے تو خیال یہ تھا کہ کانفرنس دسبر ۱۹۳۰ع میں منعقد کی جائے ، لیکن دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع کے سالانہ اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کے لیے علامہ اقبال کا انتخاب عمل میں آ چکا تھا اس لیے اس کو ملتوی کرنا پڑا ۔

(۲) تجویز یہ تھی کہ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع میں یہ کانفرنس منعقد کی جائے لیکن علامہ اقبال کے تار کے جواب میں ہزہائی‌نس آغا خان نے سینہ لندنی مفاہمت کی تردید کی تھی[۱۱۳] ۔ مزید یہ کہ پہلی گول میز کانفرنس ، جس میں مفاہمت کا یہ شوشہ چھوڑا گیا تھا ، کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع کو برخاست ہو گئی اور یقین ہو گیا کہ کسی قسم کی ہندو مسلم مفاہمت ہوئی ہی نہیں ۔ ایسی صورت میں اس کانفرنس کا جو وقتی محرک تھا ، وہ ختم ہو چکا تھا ۔

(۳) جناب نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں ۔

" اس کی سب سے بڑی وجہ گول میز کانفرنسوں کا انعقاد تھا ، جن میں خود حضرت علامہ کو شریک ہونا پڑا ۔ یہ کہنا کہ اس کانفرنس کی ناکامی میں بعض افراد کا بھی ہاتھ ہے ، غلط ہو گا ۔ کیونکہ حضرتِ علامہ کسی فرد یا جماعت کے چکر میں نہیں آئے ، خواہ اس فرد یا جماعت کے عزائم کچھ بھی ہوں ۔

۱۱۳- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۵۶ ۔

کارزار سیاست میں پہلا قدم

گول میز کانفرنسوں کی کارروائی اور اس کے نتائج کا انتظار بہر کیف ضروری تھا اور اس طرح حضرت علامہ کے ارادوں میں کوئی تزلزل پیدا نہیں ہوا ۔ لیکن جب صورتِ حالات یہ تھی کہ ہر شخص کی آنکھیں لندن پر لگی ہوئی تھیں اور اربابِ سیاست ، لندن ہی کی گفتگوؤں کے پیش نظر اپنا مؤقف طے کر رہے تھے نہ کہ بحیثیت ایک تحریک ، ایک اجتماعِ مدنی ، ایکِ ہئیت سیاسی اور ایک عالمگیر تہذیب اسلام کی بناء پر ، تو اس کانفرنس کا انعقاد کیسے عمل میں آتا ؟ عملی اور ذہنی دونوں اعتبار سے حالات اس کے مساعد نہ تھے۔ پھر جب سنہ ۱۹۳۳ع میں گول میز کانفرنس سے واپسی پر کچھ سفر کی کلفت اور کچھ اس وقت کے مخصوص احوال کے پیش نظر حضرت علامہ نے یہی بہتر سمجھا کہ اپنے اس ارادہ کو چند دن اور ملتوی رکھیں حتیٰ کہ سنہ ۱۹۳۴ع کے آغاز میں حضرت علامہ خود ہی بیمار ہو گئے اور یہ کانفرنس رہ گئی[۱۱۵] "

(۴) بہرحال دسمبر میں یہ کانفرنس ملتوی ہو گئی اور اس کے بعد بھی پھر کبھی منعقد نہ ہو سکی ۔ تاہم اس قسم کی کانفرنس کا خیال ان کے ذہن سے محو نہیں ہوا۔ ۱۹ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو جناب سید نذیر نیازی کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں ۔

" اپر انڈیا کانفرنس کا جلسہ بھی انشاء اللہ ہو گا[۱۱۶] "

سید نذیر نیازی لکھتے ہیں ۔

" وہ الہ آباد(الف) سے واپس آئے تو شمال مغربی ہندوستان یعنی

مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی ناشر اقبال اکیڈمی کراچی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۵۷ع ص ٦٦ و ٦٧ ۔

مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی مطبوعہ سنہ ۱۹۵۷ع ص ۵۴ ۔

مراد ہے مسلم لیگ کا اجلاس الہ آباد منعقدہ دسمبر جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی ۔

اسلامی اکثریت کے صوبوں کی مسلمان آبادیوں کے لیے ایک ایسی مشترکہ سیاسی جماعت کا تصور لیے ہوا جس سے صوبائی امتیاز یک قلم ختم ہو جائے اور مسلمان الگ تھلگ ایک قوم کی حیثیت سے اپنا سیاسی موقف متعین کریں۔ چنانچہ لاہور پہنچ کر انہوں نے اپر انڈیا کانفرنس کے انعقاد کا مصمم ارادہ کر لیا بلکہ ایک خطبہ (ایڈریس) بھی لکھنا شروع کر دیا تھا جو شاید بعد میں تلف کر دیا گیا، لیکن یہ کانفرنس کبھی منعقد نہیں ہو سکی۔[۱۱۷]

سید نذیر نیازی صاحب آگے چل کر یہ بھی لکھتے ہیں کہ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں بھی علامہ "اپنے خیال پر قائم تھے" بلکہ وہ اس کانفرنس کے لیے خطبہ لکھ رہے تھے[۱۱۸] یہ تو خیر سنہ ۱۹۳۱ء تو ۱۹۳۲ء کی باتیں تھیں۔ ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء کو جو خط انہوں نے قائد اعظم محمد علی جناح کے نام لکھا ہے اس میں بھی "شمال مغربی ہند مسلم کانفرنس" کا ذکر کیا ہے[۱۱۹]، اور پھر قائد اعظم ہی کے نام ۱۱ اگست سنہ ۱۹۳۷ء کے خط میں "شمالی مغربی ہند کے مسلمانوں کو مسلم لیگ کی سرگرمیوں کا "محور" بنانے پر زور دیا ہے"[۱۲۰]

الغرض مندرجہ بالا واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اپر انڈیا مسلم کانفرنس تو منعقد نہ ہو سکی لیکن یہ تجویز آخر وقت تک ان کے ذہن میں موجود رہی۔ قائد اعظم کے نام محولہ بالا خطوط میں یہ اشارا بھی ملتا ہے کہ غالباً انہوں نے اس قسم کی کانفرنس کی تجویز قائد اعظم کے سامنے پیش کی تھی، لیکن قائد اعظم نے مسلمانوں کی سیاسی تنظیم کے عدم استحکام اور نظم ضبط کے فقدان کے باعث اس تجویز کو قبل از وقت قرار دیا اور

۱۱۷- مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی مطبوعہ سنہ ۱۹۵۷ء ص ۶۳۔

۱۱۸- مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی مطبوعہ سنہ ۱۹۵۷ء ص ۶۳۔

۱۱۹- اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی) مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء، ص ۲۱ و ۲۲۔

۱۲۰- ایضاً ص ۲۳۔

علامہ اقبال نے بھی ان کی اس رائے سے اتفاق کیا ۔ گویا اس کانفرنس کے عدم انعقاد کی حقیقی وجہ مسلمانوں کی اپنی اندرونی کمزوری تھی ، ابھی ان کی سیاسی تنظیم اتنی مضبوط نہ تھی کہ اس کانفرنس کا انعقاد کامیابی کے ساتھ کیا جا سکتا ۔ مسلمانوں کا سیاسی انتشار ہی مقاصد ملی کے حصول میں ہمیشہ خارج رہا ہے اور جس زمانہ میں علامہ نے یہ تجویز پیش کی تھی ، ہم بتا چکے ہیں کہ مسلمانوں کے اندر بہت زیادہ سیاسی انتشار تھا اور اس کے بعد سے علامہ کی وفات تک یہ انتشار کسی نہ کسی صورت میں موجود رہا ، جیسا کہ آئندہ صفحات کے ملاحظہ سے واضح ہو گا ۔ ان حالات میں اس قسم کی کانفرنس کا التواء ہی تدبر کا تقاضا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ کانفرنس کوئی وقتی جلسہ یا وقتی ہنگامہ آرائی نہ تھی بلکہ یہ ایک تحریک تھی یا صحیح الفاظ میں تحریکِ پاکستان کا مقدمۃ الجیش ! اور اسی لیے اس کو بروئے کار لانے کے لیے مسلمانوں کی مضبوط سیاسی تنظیم ناگزیر تھی ، جو سنہ ۱۹۳۰ء میں تو خیر نہ ہونے کے برابر تھی لیکن اقبال کے حینِ حیات بھی مکمل نہ ہونے پائی تھی ؟ !

(۵) ایک اور وجہ بھی اس کانفرنس کے التواء کی سمجھ میں آتی ہے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے اپنی اس تجویز کا ذکر کر دیا تھا ، جس کو پیش کرنے کے لیے یہ کانفرنس بلانا چاہتے تھے ۔ ظاہر ہے کہ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اپنی پیش کردہ تجویز کے بارے میں موافق و مخالف ردِ عمل کا مطالعہ کرنا از بس ضروری تھا ۔ یہ تجویز ہر سیاسی مکتبِ فکر کے لیے نئی اور ایک گونہ انوکھی تھی ۔ غیر تو غیر ، اپنے بھی اس سے مانوس نہ تھے ۔ یہ گویا ایک بالکل نیا بیج تھا جو ہند کی سیاسی زمین میں پھینکا گیا تھا اور ابھی یہ دیکھنا باقی تھا کہ یہ زمین اس کو قبول کرتی ہے یا اسے رد کرتی ہے اور اگر قبول کرتی ہے تو کس حد تک اور کس نوعیت سے ، پھر یہ بھی تو دیکھنا تھا کہ اس قبولیت کے بعد بھی اس بیج کو برگ و بار لانے میں کتنا عرصہ لگے گا ! مسلم لیگ کے اجلاس سنہ ۱۹۳۰ع

کے باعث اس کانفرنس کو ایک مرتبہ ملتوی کرنے کے بعد، ہو سکتا ہے کہ اسی انتظار کشی نے اس کو ہمیشہ کے لیے ملتوی کر رکھا ہو!

مسلم لیگ کی صدارت / ہم دیکھ آئے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۶ء میں پنجاب کونسل کا رکن منتخب ہونے کے بعد علامہ اقبال نے عملی سیاست کے میدان میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا، وہ ہر سیاسی تحریک میں پیش پیش رہے۔ مقامی سیاست میں بھی عملاً دلچسپی لی اور کل ہند سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ وہ پنجاب کونسل کے "خفیہ رکن" (sleeping member) نہیں نہایت بیدار بلکہ "بیدار مغز" رکن تھے۔ کونسل سے باہر بھی انھوں نے سیاسی جدوجہد کے سلسلہ میں لاہور کے گلی کوچوں کی خاک چھانی۔ کل ہند سیاست میں انھوں نے اس سے بھی بڑھ کر حصہ لیا۔ وہ لاہور سے دہلی، دہلی سے لاہور، اسی سلسلہ میں بھاگ دوڑ کرتے رہے اور ہر مرحلہ پر ملت کے صحیح جذبات و احساسات کی نہ صرف نمائندگی کی بلکہ اس کو صحیح راستہ پر ڈالنے کی کوشش کی۔ اس طرح اس دور میں انھیں کل ہند مسلم سیاست میں نہایت ہی نمایاں اور ممتاز مقام حاصل ہو چکا تھا اور ہندو پریس نے تو انھیں چوٹی کا فرقہ پرست لیڈر قرار دے دیا تھا!! غالباً اس لیے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کو کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کا صدر منتخب کیا گیا۔

ہم بتا چکے ہیں کہ وسط سنہ ۱۹۲۹ء ہی میں قوم پرست مسلمانوں نے مسلم لیگ سے کٹ کر، اپنی ایک علیحدہ جماعت مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے نام سے بنائی تھی۔ اس طرح کل ہند مسلم لیگ کی تطہیر عمل میں آ چکی تھی اور اب آل پارٹیز مسلم کانفرنس و آل انڈیا مسلم لیگ کے نقاطِ نظر میں کوئی فرق باقی نہیں رہ گیا تھا۔ دونوں جماعتوں نے چودہ نکات کو اپنا لیا تھا۔ ان حالات میں علامہ اقبال کا صدارت مسلم لیگ پر انتخاب ایک معنی میں سر سید کے سیاسی مکتبِ فکر کی کامیابی تھی، جو مسلمانوں کے لیے دستوری تحفظات اور سیاسی توازن دونوں کا خواہاں تھا!

علامہ اقبال نے جس زمانہ میں مسلم لیگ کے اس اجلاس کی صدارت

کی ہے ، وہ ہندوستانی سیاست کا بالعموم اور برصغیر کی مسلم سیاست کا بالخصوص ، نہایت ہی اہم زمانہ تھا ۔ سائمن کمیشن نے اپنی سفارشات حکومت کے سامنے پیش کر دی تھیں مگر ان کی روشنی میں کوئی عملی قدم نہیں اٹھایا گیا تھا ۔ لندن میں برطانوی حکومت کی دعوت پر پہلی گول میز کانفرنس کے اجلاس منعقد ہو رہے تھے ، جس میں برطانوی ہند کے نمائندوں کے علاوہ دیسی ریاستوں کے نمائندے بھی شریک تھے ۔ لیکن کانگریس اس کانفرنس سے غائب تھی ۔ وہ اس کانفرنس کی میز پر بیٹھ کر سیاسی مسائل پر ٹھنڈے دل و دماغ سے غور کرنے اور دستوری الجھنوں کو سلجھانے کے بجائے سول نافرمانی اور عدم تشدد کے ہتھیاروں سے آزادی کی جنگ لڑنے میں مصروف تھی ۔ مسلمان بحیثیت قوم اس نام نہاد جنگِ آزادی سے علیحدہ تھے کیونکہ کانگریس نے نہرو رپورٹ کو اپنا کر ان کے دستِ تعاون کو جھٹک دیا تھا ! یوں برصغیر ہند کے بنیادی سیاسی مسئلہ — ہندو مسلم مفاہمت —— کو سرد خانہ میں بند کرکے انگریزی حکومت گول میز کانفرنس میں اپنا کھیل کھیل رہی تھی اور ہندو کانگریس ڈنڈی اور احمد آباد میں آزادی کا سوانگ بھر رہی تھی ! —— اور مسلمانوں کی نظریں ان دونوں "تماشوں" پر لگی ہوئی تھیں ! !

ایسے ہنگامہ پرور ماحول اور ایسی کشیدہ فضا میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس آخر دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں گنگا و جمنا کے متلاطم سنگم —— الہ آباد —— میں منعقد ہوا اور اس کی صدارت ہندوستان ہی نہیں عالم اسلام کے نامور فلسفی و عالم ، بے مثال شاعر اور ممتاز سیاستدان اقبال نے کی ! مسلم لیگ کے اس اجلاس کی جان وہ خطبہ صدارت تھا جو انھوں نے ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کو پڑھا ۔ یہ خطبہ اقبال جیسے عالم ، شاعر اور سیاستدان کے شایانِ شان تھا ، اس میں علمیت بھی تھی، شعریت بھی تھی اور سیاست بھی ! اس خطبہ میں انھوں نے سب سے پہلے نہایت فاضلانہ انداز میں اسلام کو بحیثیت ضابطہ حیات کے پیش کیا اور اس کے عمرانی نظام کے بعض پہلوؤں پر عالمانہ روشنی ڈالی ۔ پھر ہندوستان کے مختلف سیاسی مسائل جداگانہ و مخلوط انتخاب ، مرکزی وفاق ، دفاع ہند ،

صوبہ جات بنگال ، پنجاب ، سندھ ، سرحد اور بلوچستان کے حالات پر بحث کی ، گول میز کانفرنس پر تبصرہ کیا ، برصغیر ہند کے بنیادی مسئلہ کو "بین الفرقی" نہیں ، بلکہ "بین الاقوامی" مسئلہ قرار دیا ۔ بحیثیت صدر اجلاس آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء کی قرارداد اور کل ہند مسلم لیگ کے مطالبات موسومہ چودہ نکات کی پُر زور تائید کی ، لیکن شخصی حیثیت سے تقسیم ہند کی وہ تجویز پیش کی ، جس کو بعد میں چل کر "پاکستان" کا نام دیا گیا اور آخر میں مسلمانوں کو متحد و منظم ہونے کی تلقین کی ! ! وقتی مسائل کی بحث سے قطع نظر دیگر سیاسی و عمرانی مسائل پر اس خطبہ میں جو گفتگو کی گئی ہے اور بالخصوص اسلامی نظام کی جس دقتِ نظر سے اور اچھوتے انداز میں تشریح کی گئی ہے ، اس کی اہمیت وقتی نہیں مدامی ہے اور بحیثیت تمدنی قوت کے اسلام پر جس ایقان و ایمان کا اظہار کیا گیا ہے ، وہ روح کو وجد میں لانے والا ہے ! اس دائمی اہمیت کے علاوہ اس خطبہ کو قیام پاکستان کے بعد ایک تاریخی اہمیت بھی حاصل ہو گئی ہے ! !

یہ کیسی عجیب اور دلچسپ حقیقت ہے کہ نہرو رپورٹ کے واضع ، اکھنڈ بھارت اسکیم کے مجوز و محرک (موتی لال نہرو) کے جنم بھوم اور بھارت ماتا کے مقدس مقام گنگا جمنا کے سنگم الہ آباد میں تقسیمِ ہند اور قیامِ پاکستان کا نعرہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ جیسی قدیم ذمہ دار سیاسی جماعت کے صدر اقبال نے بلند کیا اور اقبال ہی کے مرز بوم سلطنت مغلیہ کے دوسرے دارالسلطنت اور مسلمانانِ برصغیر کے مرکزِ اعصاب ، لاہور میں اکھنڈ بھارت کی اسکیم نہرو رپورٹ کو ایک سال قبل دسمبر سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریس جیسی اہم سیاسی جماعت کے صدر ، جواہر لال نہرو نے دریائے راوی میں ڈبو دیا ! ! ـــــ گویا متحدہ ہندوستان کے "شیش محل" کو دریائے راوی کی شوریدہ سر لہروں نے چکنا چور کر دیا مگر پاکستان کے "تاج محل" کو گنگا جمنا کی بل کھاتی ہوئی لہروں نے سر جھکا کر سلام کیا ! !

خلاصہ | علامہ اقبال کی عملی سیاسی زندگی کا پہلا دور ختم ہوتا ہے ، اس پانچ سالہ دور میں علامہ مرحوم نے نہ صرف پنجاب کی سیاست میں

بلکہ کل ہند سیاست میں بھی کار ہائے نمایاں انجام دئیے ۔
ںاب کونسل میں ایک رکن کی حیثیت سے انہوں نے بعض بہت ہی، اپنے نتائج کے لحاظ سے دور رس تجاویز پیش کیں ـــــ حکومت ، بعض کاموں پر سخت تنقید کی اور یونینسٹ پارٹی کی پالیسی پر بدیں کیں اور ان تلخ و ترش تنقیدوں کی بدولت پارلیمانی سیاست ، پھل ـــ " پنجاب کونسل کی صدارت " ـــ سے محروم رہے ! شردہانند ، مقدمہ راجپال اور فسادات لاہور سنہ ۱۹۲۷ء کے جذباتی اور ںر زمانہ میں مسلمانوں کی صحیح رہنمائی کی اور ان کو بے قابو دیا ۔ پنجاب کونسل میں وہ ایک منجھے ہوئے پارلیمانی سیاس کی ں نظر آتے ہیں ، تو ان ہنگاموں کے دوران ، موچی دروازہ ، ا مل ، برکت علی اسلامیہ ہال ، بادشاہی مسجد کے عوامی ںر جلوسوں میں ایک مقبول عام سیاسی لیڈر کا کردار ادا کرتے یتے ہیں ۔

ہند سیاست میں ان کی سر گرمیاں جاذب توجہ ہیں ۔ وہ تجاویز دہلی زو کی مخالفت کرتے ہیں ، جس میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری ا پیش کش کی گئی تھی ، لیکن مسلم اکثریت کے پانچ صوبوں کی پر زور تائید کرتے ہیں ۔ ہندوستان کے صف اول کے سیاسی ، مخالفتوں کے علی الرغم سائمن کیمشن سے تعاون کر کے ، مسلم کو پیش کرتے ہیں ۔ وہ نہرو رپورٹ کو " ہندی قومیت " کا ایک ۔کرتے ہیں اور اسی لیے اس کی مخالفت کرتے ہیں ۔ انہیں ہندوؤں طری ، تنگ دلی اور خواہش بالا دستی کا پوری طرح احساس ہے ، ندو مسلم مفاہمت کی ناکامی کا یقین رکھتے اور آل پارٹیز کنونشن بعض مسلم لیڈروں کی صلح جو یانہ مساعی کو لا حاصل سمجھتے ں مجالس کو لائق اعتناء نہ سمجھ کر ان سے گریز کرتے ہیں ۔ ؤں کے میگنا کارٹا " نہرو رپورٹ " کے خلاف مسلمانوں کے متحدہ ارٹیز مسلم کانفرنس دہلی کی تشکیل میں سر گرمی دکھاتے اور رروائیوں میں پیش پیش رہتے ہیں ، پھر اس کانفرنس کی قرارداد ب کرنے میں حصہ لیتے اور جلسہ عام میں اس کی پرزور تائید

کرتے ہیں - دہلی میں وہ شفیع لیگ اور جناح لیگ کے انضمام کی کوششوں میں شریک رہتے اور مسلمانوں کے سیاسی خلفشار کو رفع کرنے کی خاطر "نہرو انی ٹولی" کی سازشوں کا انکشاف کرتے ہیں۔ اور اس طرح مسلمانوں کی اندرونی سیاسی جماعت بندیوں کے کانٹوں سے الجھتے ہیں - وہ گول میز کانفرنس (لندن) کی کاروائیوں پر گہری نظر رکھتے اور وہاں کی ہر سرگرمی سے باخبر رہتے ہیں، اور جب یہ سنتے ہیں کہ مسلم مندوبین گول میز کانفرنس نے جدا گانہ انتخاب کی قیمت پر ہندو مسلم مفاہمت کا سودا کر لیا ہے تو مضطرب و بے چین ہو جاتے ہیں ، آغا خاں کو تار دیتے ہیں ، ہندوستان کے اخبارات میں ایجی ٹیشن کرتے اور "بالائی ہند مسلم کانفرنس" کے انعقاد کی عملاً تیاریاں کرنے لگ جاتے ہیں - وہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے معتمد ، پھر آل انڈیا مسلم لیگ (لاہور) کے جنرل سکریٹری اور آخر میں کل ہند مسلم لیگ کے صدر منتخب ہوتے ہیں !

اس دور کے کل ہند سیاسی افق پر اقبال کا طلوع اس قدر تابناک ہے کہ بہت سے قدیم ستاروں کی چمک دمک ان کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے اور بہت سے دیکھنے والوں کی آنکھیں چند ھیا جاتی ہیں ــــ اور یہ بات تو سبھی محسوس کرتے ہیں کہ وہ اس میدان میں محض ذاتی نمود و نمائش کے لیے نہیں آئے تھے بلکہ اس کے ذریعہ اپنے چند اٹل اصول اور مخصوص معتقدات سیاسی کو پھیلانا اور سر بلند کرنا چاہتے تھے ان اصولوں اور معتقدات کی روح یہ تھی کہ مسلمان برصغیر کے سیاسی دھارے میں بہہ کر اپنے آپ کو "ہندی قومیت" کے "بحر ظلمات" میں گم نہ کر دیں بلکہ اپنا علیحدہ ، جداگانہ اور متمائز ملی تشخص قائم و برقرار رکھیں ! کل ہند سیاست میں ان کی تمام تگ و دو کا محور بس یہی ایک نکتہ ہے ! اسی ایک نکتہ پر وہ غیروں (کانگریس) سے لڑتے ، اپنوں (مسٹر محمد علی جناح ، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ) سے جھگڑتے اور خود اپنے رفیقوں (سر شفیع وغیرہ) سے الجھتے ہیں ، مگر اس نکتہ سے سرِ مو اِدہر یا اُدہر نہیں ہوتے ! وہ اس پر اتنے اٹل ہیں کہ جس قومی ادراہ ــــ کل ہند مسلم لیگ ــــ سے وہ سیاسی طور پر وابستہ ہوتے ہیں ، اس کے دو ٹکڑے ــــ جناح لیگ و شفیع لیگ ــــ ہو جانے کو انگیز کر لیتے ہیں ، مگر اس سے ذرا سا بھی

گریز کرنا نہیں چاہتے اور اسی ایک نکتہ کی خاطر اصول "تحفظِ حقوق" و نظریۂ "توازنِ قوت" دونوں کو باہم سمو کر لئے چلتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک سے بھی دستبردار ہونا نہیں چاہتے —— پھر وہ اسی تشخصِ ملی کے استقرار و استقلال کے لیے نظریہ توازنِ قوت کو مزید وسعت دیتے اور اس کو ایک نئی شکل میں ڈھالتے ہیں اور اس کی بنیادوں پر اسی ملی تمکن کے لیے برصغیر میں ایک نئی منزل کا تعین کرتے اور ایک نئے ایوان کی داغ بیل ڈالتے ہیں —— اور یوں پرشور فضاؤں میں "آزاد ہندوستان میں آزاد اسلام" کا نعرہ بلند کرتے اور بڑی ہمت و جرأت اور نہایت ہی وضاحت اور صاف گوئی کے ساتھ ملک کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ برصغیر جنوبی ایشیا میں ایک اسلامی مملکت کے قیام کی تجویز پیش کرتے ہیں !

کیا یہ سب کچھ سننے اور پڑھنے کے بعد بھی یہی کہا جائے گا کہ ارے اقبال اور سیاست ! بھلا اقبال کو سیاست سے کیا واسطہ ؟ وہ تو محض ایک شاعر تھا ، فلسفی تھا ! !

——:o:——

حوالہ جات باب ۴

۱- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۳۰۲ -

۲- ایضاً ص ۳۱۶ - ۳- ایضاً ص ۳۰۲ -

۴- ایضاً ص ۳۰۲ - ۶- ایضاً ص ۱۱۹ -

۷- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ناشر اقبال اکادمی کراچی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ع ، ص ۲۰۸ -

۸- روز نامہ ہمدرد ، مورخہ ۱۸ اپریل ۱۹۲۷ع -

۹- ایضاً ، ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ع -

۱۰- ایضاً ، ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ع و ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پٹابھی ستیا رامیا ص ۵۱۳ -

۱۱- اخبار ہمدرد، مورخہ ۱۴ جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۲- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۲۱۴ -
۱۳- اخبار انقلاب لاہور، مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۲۷ع -
۱۴- روزنامہ ہمدرد، مورخہ ۱۶ جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۵- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ ۱۹۴۱ع ص ۲۳۲ -
۱۶- انڈین اینول رجسٹر ۱۹۲۸ع جلد اول -
۱۷- روزنامہ ہمدرد، مورخہ ۱۲ جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۸- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ : کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۵۴۳ -
۱۹- انڈین اینول رجسٹر جلد دوم ۱۹۲۸ع -
۲۰- اسپچیس اینڈ ڈاکومینٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن از مارس گائر اینڈ اپپا ڈورای مطبوعہ بمبئی ۱۹۵۷ع ص ۲۴۴ -
۲۱- اخبار ہمدرد، مورخہ ۵ مارچ ۱۹۲۹ع -
۲۲- ایضاً، مورخہ ۵ مارچ ۱۹۲۹ع -
۲۳- ایضاً، مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۹ع -
۲۴- اخبار ہمدرد، مورخہ ۳ اپریل ۱۹۲۹ع -
۲۵- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ : کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۵۷۲ -
۲۶- ایضاً، ص ۵۸۱ -
۲۷- ایضاً، ص ۵۸۹ -
۲۸- ایضاً، ص ۵۶۷ -
۲۹- ایضاً، ص ۶۹۸ -
۳۰- ایضاً، ص ۶۱۵ -
۳۱- ایضاً، ص ۶۰۹ -
۳۲- ایضاً، ص ۶۱۴ -
۳۳- ایضاً، ص ۶۲۰ -
۳۴- ایضاً، ص ۶۲۲ -
۳۵- ایضاً، ص ۶۲۵ -
۳۶- ایضاً، ص ۶۳۷ -
۳۷- ایضاً، ص ۶۳۸ -
۳۸- ایضاً، ص ۶۶۴ -
۳۹- "مسلمانوں کا روشن مستقبل" از طفیل احمد منگلوری مطبوعہ دہلی ۱۹۴۵ع ص ۵۳۱ و ۵۳۲ -
۴۰- ایضاً، ص ۵۳۲ -
۴۱- ایضاً، ص ۵۳۳ -

۴۲- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ع ص ۲۵۴ -
۴۳- ہسٹری آف دی کانگریس (اردو ترجمہ : کانگریس کی تواریخ) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۶۹۲ -
۴۴- ایضاً ، ص ۶۹۲ -
۴۵- اخبار ہمدرد ، مورخہ ۸ اپریل ۱۹۳۷ع -
۴۶- اخبار امروز کراچی ، اقبال نمبر مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ع -
۴۷- اخبار زمیندار لاہور ، ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ع -
۴۹- ایضاً ، ۱۴ اکتوبر ۱۹۲۶ع -
۵۰- ایضاً ، مورخہ ۲۰ جولائی ۱۹۲۶ع -
۵۱- نیرنگ خیال اقبال نمبر ص ۴۰ -
۵۲- ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور ص ۶۷ -
۵۳- مکاتیبِ شاد و اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور مطبوعہ حیدر آباد دکن ص ۱۷۳ -
۵۴- "روزگارِ فقیر" جلد اول از فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم ۱۹۶۵ع ص ۱۰۳ -
۵۵- سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۳۰ نومبر و یکم دسمبر ۱۹۲۶ع
۵۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع دوم ۱۹۴۸ع ص ۵۷ و ۷۶ -
۵۷- ایضاً ، ص ۷۶ -
۵۸- ایضاً ، ص ۷۹ -
۵۹- ایضاً ، ص ۷۲ -
۶۰- ایضاً ، ص ۸۷ و ۸۸ -
۶۱- ایضاً ، ص ۴۸۸ -
۶۲- "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ستمبر ۱۹۴۵ع ص ۳۱۹ -
۶۳- اخبار ہمدرد ، مورخہ ۱۱ فروری ۱۹۲۷ع -
۶۴- اخبار زمیندار لاہور ، ۲ فروری ۱۹۲۷ع -
۶۵- اخبار انقلاب لاہور ، ۱۲ مئی ۱۹۲۷ع -
۶۶- اخبار ہمدرد ، مورخہ ۸ مئی ۱۹۲۷ع -

۶۷- اخبار انقلاب لاہور، مورخہ ۱۰ جولائی ۱۹۲۷ء -
۶۸- ایضاً، ۱۳ جولائی ۱۹۲۷ء -
۶۹- "روزگار فقیر" جلد دوم از فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی نومبر ۱۹۶۴ء ص ۳۰ -
۷۰- ایضاً، ص ۳۲ -
۷۱- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطاء اللہ ص۲۰۹
۷۲- ایضاً، ص ۲۰۷ و ۲۰۸ -
۷۳- اخبار ہمدرد، مورخہ ۲۹ جنوری ۱۹۲۸ء -
۷۴- اخبار انقلاب لاہور، مورخہ ۳ مئی ۱۹۲۷ء -
۷۵- ایضاً، -
۷۶- اخبار ہمدرد، ۲۲ مارچ ۱۹۲۸ء -
۷۷- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطاء اللہ ص۱۵۸
۷۹- اخبار جنگ کراچی، مورخہ ۲۱ اپریل ۱۹۶۷ء -
۸۰- اخبار انقلاب لاہور، ۱۲ نومبر ۱۹۲۷ء -
۸۱- ایضاً، ۱۸ نومبر ۱۹۲۷ء -
۸۲- اخبار ہمدرد، ۱۵ نومبر ۱۹۲۷ء -
۸۳- ایضاً، ۸ دسمبر ۱۹۲۷ء -
۸۴- اخبار ہمدرد، مورخہ ۱۴ نومبر ۱۹۲۷ء -
۸۵- اخبار انقلاب لاہور، مورخہ ۱۶ دسمبر ۱۹۲۷ء -
۸۶- ایضاً، ۲ جنوری ۱۹۲۸ء -
۸۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ لاہور ص۱۶۴
۸۹- یاد داشت مسلم لیگ (موریںڈم مسلم لیگ) مطبوعہ نیو یولین پریس لاہور -
۹۰- رپورٹ سائمن کمیشن مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء ص ۶ -
۹۱- اخبار انقلاب لاہور، ۲۶ جون ۱۹۳۰ء -
۹۲- ایضاً، مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء -
۹۳- ایضاً، مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء -
۹۴- ایضاً، مورخہ ۲۱ اگست ۱۹۲۸ء -

۹۵- ایضاً ، - ۹۶- ایضاً ، -
۹۷- ایضاً ، -
۹۸- ایضاً ، مورخہ ٦ ستمبر ۱۹۲۸ع -
۹۹- ایضاً ، - ۱۰۰- ایضاً ، -
۱۰۱- ایضاً ، -
۱۰۲- ایضاً ، مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۰۳- ہندوستان کا مستقبل از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲٦۲ -
۱۰۴- اخبار انقلاب لاہور ، مورخہ ۱۰ اپریل ۱۹۲۹ع -
۱۰۵- ایضاً ، مورخہ ۳ نومبر ۱۹۲۹ع -
۱۰٦- ایضاً ، مورخہ ۲۴ دسمبر ۱۹۲۹ع -
۱۰۷- ایضاً ، مورخہ ۱۸ نومبر ۱۹۳۰ع -
۱۰۸- اخبار ٹریبیون ، یکم جنوری ۱۹۳۱ع -
۱۰۹- اخبار انقلاب لاہور ، مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۱۰- ایضاً ، مورخہ یکم جنوری ۱۹۲۹ع -
۱۱۱- ایضاً ، مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۰ع -
۱۱۲- ایضاً ، مورخہ ۱۹ دسمبر ۱۹۳۰ع -
۱۱۳- ایضاً ، -
۱۱۴- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ع ص ۲۵٦ -
۱۱۵- مکتوبات اقبال از سید نذیر نیازی مطبوعہ ۱۹۵۷ع ص ٦٦ و ٦۷
۱۱٦- ایضاً ، ص ۵۴ - ۱۱۷- ایضاً ، ص ٦۳ -
۱۱۸- ایضاً ، ص ٦۳ -
۱۱۹- اقبال کے خطوط جناح کے نام (انگریزی) مطبوعہ ۱۹۴۳ع ص ۲۱ و ۲۲ -
۱۲۰- ایضاً ، ص ۲۳ -

باب ۵

وادی سیاست میں آبلہ پائی

پس منظر | اس باب میں ہم کو سنہ ۱۹۳۱ع سے اختتام سنہ ۱۹۳۵ع تک کے حالات بیان کرنے ہیں ۔ گذشتہ باب میں بیان کیا جا چکا ہے کہ پہلی گول میز کانفرنس ، وزیر اعظم برطانیہ کے ایک اعلان کے بعد ۱۹ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع کو برخاست کر دی گئی ۔ اس اعلان کا مقصد کانگریس کو دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے ترغیب دینا تھا ۔ اسی کے پیش نظر کانفرنس کے اختتام کے صرف دو دن بعد یعنی بتاریخ ۲۱ جنوری سنہ ۱۹۳۱ع ، گاندھی جی کو غیر مشروط طور پر رہا کر دیا گیا[1] اور ۵ مارچ سنہ ۱۹۳۱ع کو وائسرائے ہند لارڈ ارون اور گاندھی جی کے مابین ایک معاہدہ ہوا ، جس کو "گاندھی ، ارون" ، معاہدہ کہا جاتا ہے ۔ اس معاہدہ کی رو سے حکومت نے تحریک سول نافرمانی کے گرفتار شدگان کو رہا کرنے کا وعدہ کیا اور کانگریس نے سول نافرمانی کی مہم ترک کر دی[2] ۔ یوں دوسری گول میز کانفرنس کی شرکت کے لیے راستہ ہموار ہو گیا[3] اور کانگریس نے اپنے سالانہ اجلاس کراچی ، منعقدہ مارچ سنہ ۱۹۳۱ع میں یہ طے کر دیا کہ گاندھی جی کانگریس کے واحد نمائندے کی حیثیت سے دوسری گول میز کانفرنس میں

۱- "کانگریس کی تواریخ" (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۹۲ -

۲- ایضاً ص ۷۰۸ -

۳- ایضاً ص ۷۳۶ -

شریک ہوں گے۔ ۸ اپریل کو لارڈ ارون وائسرائیگل لاج دہلی سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گئے اور ان کی جگہ ۱۷ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع کو لارڈ ولنگڈن وائسرائے بن کر لندن سے ہندوستان آ گئے۔ یہ نسبتاً سخت گیر تھے، کانگریس نے گاندھی ارون معاہدہ کے بموجب سول نافرمانی کی تحریک بند کر دی تھی، لیکن حکومت کی جانب سے اس معاہدہ پر پوری طرح عمل نہیں ہو رہا تھا۔ لارڈ ولنگڈن آئے تو اس معاہدہ کی بعض تعبیرات پر گاندھی جی اور حکومت میں اختلافات پیدا ہوئے، جس کی بناء پر گاندھی جی نے گول میز کانفرنس میں عدم شرکت کا ارادہ ظاہر کر دیا[۴] اور کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بھی اپنے اجلاس، منعقدہ ۱۳ اگست سنہ ۱۹۳۱ع میں ان کی اس ناراضگی پر صاد کر دی[۵]۔ گول میز کانفرنس میں شرکت کے تعلق سے گاندھی جی اور کانگریس کی پالیسی میں اس تبدیلی کی وجہ بڑی دلچسپ تھی۔ وہ در حقیقت گول میز کانفرنس میں شرکت سے گریز نہیں کر رہے تھے، بلکہ حکومت برطانیہ پر دباؤ ڈال رہے تھے۔ عدم شرکت یا گول میز کانفرنس سے بائیکاٹ کا تاثر دے کر وہ دراصل دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ایک مقصد تو یہ تھا کہ "گاندھی ارون" معاہدہ پر ٹھیک ٹھیک طریقہ سے عمل ہو اور دوسرا مقصد یہ تھا کہ حکومت برطانیہ ڈاکٹر انصاری کو مسلمانوں کے نمائندے کی حیثیت سے گول میز کانفرنس کے لیے نامزد کرے۔ کانگریسی مورخ کا بیان ہے کہ۔

> "حکومت نے ڈاکٹر انصاری کو گول میز کانفرنس میں نمائندہ منتخب نہیں کیا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس انھیں لے جا سکتی تھی، مگر وہ کانگریس کے علاوہ ہندوستان کی ایک زبردست پارٹی قوم پرست مسلم پارٹی کی بھی نمائندگی کرتے تھے۔ قوم پرست مسلم پارٹی کو مسلمانوں میں کوئی کم رسوخ نہ تھا

۴۔ کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۷۶۳۔

۵۔ ایضاً ص ۷۶۸۔

اور نہ تمام مسلمان قوم ہی رجعت پسند ہو سکتی ہے ، اس لۓ
قوم پرست مسلمانوں کے خیالات کی نمائندگی کے لیے ڈاکٹر انصار
کا انتخاب نہایت ضروری تھا ۔ لارڈ ارون نے مہاتما جی سے وع
کیا تھا کہ پنڈت مدن موہن مالویہ ، شریمتی سروجنی دیوی ا
ڈاکٹر انصاری کو بھی نامزد کریں گے ، اول الذکر ہر
اصحاب تو نامزد کر لیے گئے مگر ڈاکٹر انصاری کا نام کہ
نظر نہ آتا تھا[6] "

اور اسی کانگریسی مورخ کے الفاظ میں یہ " ایک بڑا سبب تھا
گاندھی جی اور کانگریس کے اس فیصلہ کا کہ وہ گول میز کانفرنس م
شریک نہیں ہوں گے ۔ دراصل بات یہ تھی کہ لارڈ ارون سے گاندھی ج
نے ڈاکٹر انصاری کی نامزدگی کا وعدہ تو لے لیا تھا ، مگر اب لارڈ ارو
ہی موجود نہ تھے اور ان کے بجائے لارڈ ولنگڈن وائسرائے کی گدی
براجمان تھے ۔ ان سے ایفائے عہد کا مطالبہ تو نہیں کیا جا سکتا تھا
انھوں نے یہ وعدہ کیا ہی نہ تھا ۔ لہذا سابق وائسرائے کے اخلاق وعد
کو موجودہ وائسرائے سے منوانے کے لیے اب سیاسی دباؤ کے سوا کو
اور چارۂ کار نہ گاندھی جی کے پاس تھا اور نہ کانگریس کی مجلس عاملہ
پاس ! ـــــ یوں گاندھی جی کا یہ فیصلہ دراصل ایک سیاسی دھونس تھی
لیکن لارڈ ولنگڈن اس دھونس میں نہیں آئے اور انھوں نے صاف کہہ
" مسلمان ڈیلی گیشن (مسلم وفد) ان کی (یعنی ڈاکٹر انصاری کی) نامزد
کے خلاف[8] ، ہے البتہ گاندھی ارون معاہدہ " پر عملدرآمد اور اس
تعبیرات سے متعلق انھوں نے قدرے نرم رویہ اختیار کیا ۔ گاندھی جی
اپنے رفقا کے ہمراہ لارڈ ولنگڈن سے اواخر اگست سنہ ۱۹۳۱ع میں بم
شملہ ملاقات کی ۔ " یہ ملاقات کامیاب ثابت ہوئی اور یکا یک حالات

۶- ایضاً ص ۲۷۰ ۔
۷- ایضاً ص ۲۷۰ ۔
۸- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی
رامیا ص ۲۷۱ ۔

تبدیلی ہو گئی[۹]" ۔ وائسرائے نے گاندھی جی کو یقین دلایا کہ گاندھی اروِن معاہدہ برقرار ہے اور اس کی پابندی کی جائے گی[۹] ۔ گاندھی جی مطمئن ہو گئے اور " پہلی گاڑی سے شملہ سے بمبئی کو روانہ ہو گئے تاکہ ۲۹ اگست کو انگلستان روانہ ہو جائیں[۱۰] " ۔ جہاں دوسری گول میز کانفرنس کا افتتاح بتاریخ ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع ہونے والا تھا ۔

یہ کہانی تو کانگریس اور حکومت کے باہمی روابط کی تھی ، اب ذرا ہندو مسلم تعلقات کی داستان سنئے ۔

اسی زمانہ میں یعنی گاندھی اروِن معاہدہ کے بعد ہی ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی گئی ۔ " کانگریس کی تواریخ " کے مصنف ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا(الف) کا بیان ہے کہ ۔

" مہاتما جی ہندو مسلم اتحاد کے بغیر انگلستان جانا بے سود سمجھتے تھے[۱۱] "

پتابھی سیتا رامیا کے اس بیان کی تائید پنڈت نہرو بھی کرتے ہیں[۱۲] ۔ مورخ کانگریس یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ " گاندھی اروِن معاہدہ کے مکمل ہونے پر کانگریس نے یہ سمجھا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد حاصل کرنے میں جلد ہی کامیابی ہو جائے گی[۱۳] " ۔ شاید یہی وجہ تھی کہ گاندھی جی نے آل

۹- ایضاً ص ۲۲۶ ۔

۱۰- ایضاً ص ۲۲۶ ۔

(الف) ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ، صرف کانگریس کے مورخ ہی نہیں تھے بلکہ وہ مخلص " گاندھی وادی " گاندھی جی کے پرستار تھے اور ان ہی کی امداد سے وہ کانگریس کے صدر بھی منتخب ہوئے تھے ، مصنف

۱۱- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۲۴۹ ۔

۱۲- " میری کہانی " حصہ اول از جواہر لال نہرو مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ص ۴۶۰ ۔

۱۳- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۲۴۹ ۔

پارٹیز مسلم کانفرنس والوں سے ملاقات کی[۱۳] - لیکن یہ ملاقات ناکا
رہی - انھوں نے مسلم کانفرنس کے مطالبات ماننے سے اس بنا پر انکار کر
دیا کہ یہ مطالبات متفقہ نہیں ہیں اور یہ بھی کہا کہ جب تک کانگریس
میں شامل مسلمان ان مطالبات سے اتفاق نہیں کریں گے ، وہ ان مطالبہ
کو تسلیم نہیں کر سکتے[۱۵] - اس پر مولانا شوکت علی اور دیگر مسلما
قائدین نے یہ محسوس کیا کہ مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) کانفرنس والو
سے گفتگو کی جانی چاہئیے تاکہ ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار ہو سکے
واضح رہے کہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) کانفرن
کا ایک اجلاس علی امام کی صدارت میں بمقام لکھنؤ منعقد ہوا تھا - اس م
جو قرارداد منظور کی گئی تھی ، وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہ
(جنوری سنہ ۱۹۲۹ع) کی قرارداد سے بہت قریب تھی ، یعنی اس میں وفا
حکومت کے قیام ، مابقی اختیارات صوبوں کو دینے ، صوبہ سندھ کو علیحہ
مستقل صوبہ بنانے ، سرحد اور بلوچستان میں سیاسی اصلاحات نافذ کرنے
مذہبی آزادی ، تمدن و زبان وغیرہ کی بابت تحفظات دینے کے مطالبات شا
تھے - البتہ جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب کی حمایت کی گئی ت
اور وہ بھی رائے دہی بالغان کے ساتھ[۱۶] - پھر ڈاکٹر انصاری نے ،
اس جماعت کے روح رواں تھے ، یہ تشریح بھی کر دی تھی کہ پنجاب
بنگال میں مسلم اکثریت کو برقرار رکھا جائے گا اور اس کو مب
بہ اقلیت یا مبدل بہ مساوات نہیں کیا جائے گا اور جن صوبوں میں مسلمان
کی آبادی ۲۵ فیصد سے کم ہے ، ان میں مسلم نشستیں آبادی کے لحا
سے محفوظ کر دی جائیں گی - یوپی اور بہار کی مسلم اقلیت کو وہی تحفظ
دئیے جائیں گے ، جو ہندو اقلیت مسلم اکثریت کے صوبوں میں مانگ
ہے[۱۷] - مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی یہ قرارداد اور ڈاکٹر انصاری کی

۱۴- فضل حسین " ایک سیاسی سوانح عمری " ، (انگریزی) از عظیم حس
ص ۲۵۸ -
۱۵- ایضاً ص ۲۵۸ -
۱۶- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ع ص ۲۵۱ -
۱۷- ایضاً ص ۲۵۲ -

تشریح و توضیح ، مسلمانوں کے متفقہ مطالبات یعنی چودہ نکات سے گو پوری طرح مطابقت نہ رکھتی تھی ، تاہم مسلم قوم پرستوں کا یہ ایک ایسا قدم تھا ، جو انھیں آگے کی طرف لے جاتا تھا اور مسلم کانفرنس والوں سے ہاتھ ملانے کے قابل بناتا تھا ۔ اس قرارداد اور اس کی ڈاکٹر انصاری والی توضیح و تشریح کو پیش نظر رکھا جائے تو پھر آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور مسلم نیشناسٹ پارٹی کے مابین سب سے بڑا نزاعی مسئلہ جداگانہ انتخاب کا تھا ۔ اس مسئلہ سے قطع نظر باقی مسائل اور معاملات میں دونوں جماعتوں کے سیاسی رجحان میں یک گونہ مماثلت سی پیدا ہو گئی تھی اور یہ بہت ہی اُمید افزا بات تھی ، کیونکہ مسلم نیشنلسٹ پارٹی کو کانگریس اور گاندھی جی کی اشیر باد حاصل تھی اور اس کے تمام اراکین کانگریس میں شریک تھے ۔ اسی لیے جب گاندھی جی نے مسلم کانفرنس کے قائدین کے سامنے یہ شرط رکھی کہ وہ اپنے مطالبات کو کانگریس میں شریک مسلمانوں سے بھی منوا لیں ، تو ان میں مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے نمائندوں سے گفتگو کرنے کا خیال پیدا ہوا ، تاکہ اس طرح ہندو مسلم اتحاد کی راہ ہموار ہو جائے ۔ چنانچہ مولانا شوکت علی اور گاندھی جی کی تحریک پر نواب صاحب بھوپال نے مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے نمائندوں کو بھوپال مدعو کیا[۱۸] ۔ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۳۱ء کو ان دونوں جماعتوں کے نمائندوں کا ایک غیر رسمی جلسہ ہوا ، زیرِ بحث مسئلہ وہی جداگانہ انتخاب یا مخلوط انتخاب تھا ۔ بحث و تمحیص کے بعد کئی فارمولے پیش ہوئے اور یہ طے پایا کہ ان تجاویز کو اپنی اپنی جماعتوں کے سامنے پیش کرکے منظوری حاصل کر لی جائے اور اس کے بعد پھر ایک مشترکہ کانفرنس جون سنہ ۱۹۳۱ء کے پہلے ہفتہ میں بمقام شملہ منعقد کی جائے تاکہ آخری فیصلہ ہو جائے ۔ گاندھی جی اس زمانہ میں شملہ ہی میں تھے ۔ اس مشترکہ کانفرنس کے انعقاد سے قبل ہی ان تجاویز کو ، جو بھوپال کانفرنس میں زیرِ غور آئی تھیں ، گاندھی جی کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے اب

۱۸- " فضل حسین " ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۵۸ ۔

ایک نئی شرط یہ لگائی کہ مسلمان باہم متفق ہو کر سکھوں کو بھی ملا لیں ۔ اس کے بعد بقول ڈاکٹر انصاری فضا "کچھ ایسی ناموافق ہوئی کہ مسلم کانفرنس والوں کا قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلمانوں سے کوئی سمجھوتہ نہ ہو سکا[19] ۔ پھر یہ ہوا کہ جون سنہ ۱۹۳۱ع میں شملہ ہی میں مسلم مطالبات پر مشتمل ایک منشور مرتب کرکے ۵ جون کے اخبار اسٹیٹسمین میں شائع کر دیا گیا ۔ اس میں ہندوؤں کی زیادتیوں کا تذکرہ بھی تھا ۔ یہ منشور آغا خان کے پاس لندن بھی بھیجا گیا ، جس کو انھوں نے ۱۱ جون کے لندن ٹائمز میں شائع کرا دیا ۔ ڈاکٹر انصاری ، دیگر قوم پرستوں اور ارکان جمیعۃالعلماء نے اس کا جواب دیا ۔ مسلم کانفرنس کے لیڈروں نے اس منشور کی حمایت کی اور ساتھ ہی سر علی امام کی بھی مخالفت کی ، جنھیں برطانوی حکومت نے دوسری گول میز کانفرنس کے لیے مندوب نامزد کیا تھا ، کیونکہ وہ بھی مسلم نیشنلسٹ پارٹی کے رکن تھے[20] ۔ اس طرح مسلم کانفرنس اور مسلم نیشنلسٹ پارٹی میں اختلاف کی خلیج بجائے گھٹنے کے بڑھ گئی اور دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہندو مسلم اتحاد کی جو کوشش کی گئی تھی ، وہ لاحاصل ہی رہی ۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ ہندوستان کی منزلِ آزادی کو قریب تر لانے یا اس کو دور کرنے کا انحصار ، ہندو مسلم اتحاد کے مسئلہ پر ہی تھا ۔ اس کو گاندھی جی بھی محسوس کرتے تھے اور کانگریس بھی ، لیکن جب کبھی اس مسئلہ کو حل کرنے کی مخلصانہ کوشش ہوتی ، ان ہی کی طرف سے روڑے اٹکائے جاتے تھے ۔ اب پھر ملک اسی صورت حال سے دو چار تھا اور ادھر وسط ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع میں دوسری گول میز کانفرنس کا لندن میں افتتاح ہونے والا تھا ، جس میں گاندھی جی کی شرکت کا فیصلہ ہو چکا تھا ۔ ان حالات میں اپنے واحد نمائندہ کو خالی ہاتھ یا نہتا لندن بھیجنے کی بہ نسبت کانگریس نے مناسب یہ سمجھا کہ اس کو اپنے "فرقہ وارانہ حل" کے ہتھیار سے مسلح کیا جائے تاکہ جب وہ وہاں اس بنیادی مسئلہ سے دو چار ہو تو اس ہتھیار سے اس کا مقابلہ کر سکے ۔ یہ "حل" ، اسی

۱۹- "ہندوستان کا مستقبل" از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲۲۶ ۔

۲۰- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ع ص ۲۵۳ ۔

زمانہ میں کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے بہت "غور و خوض" کے بعد حسب ذیل قرارداد کی صورت میں پیش کر دیا ۔

" گو اس کا احساس نہ کیا گیا ہو ، مگر کانگریس شروع ہی سے قومیت اور خالص قومیت کے ادرش کو پیش کرتی ہے اور اس نے ہمیشہ فرقہ وارانہ حدود کو دور کرنے کی سعی کی ہے ۔ لاہور کانگریس کا مندرجہ ذیل ریزولیوشن اس حقیقت کا زندہ ثبوت ہے ۔ "نہرو رپورٹ کے خاتمہ کے بعد فرقہ وارانہ مسائل پر کانگریس کی پوزیشن کی وضاحت کی کوئی ضرورت نہیں معلوم ہوتی ۔ کانگریس کا یقین ہے کہ آزاد ہندوستان میں تمام فرقہ وارانہ مسائل صرف خالص قومیت کی لائینوں پر ہی فیصل ہو سکتے ہیں ۔ لیکن چونکہ مسلمان و دیگر اقلیتوں نے اور خصوصاً سکھوں نے نہرو رپورٹ کے فرقہ وارانہ فیصلہ کو غیر تشفی بخش قرار دیا ہے ۔ اس لیے کانگریس سکھوں ، مسلمانوں ، دیگر اقلیتوں کو یقین دلاتی ہے کہ کسی نئے دستور اساسی میں بھی اس فیصلہ کو اس وقت تک منظور نہیں کیا جائے گا ، جب تک وہ تمام اقوام کے لیے قابل قبول نہ ہو"

اس لیے کانگریس کسی قسم کے فرقہ وارانہ فیصلہ کی طرف متوجہ نہیں ہو سکتی ، لیکن اس موقع پر یہ محسوس کیا گیا ہے کہ ورکنگ کمیٹی ملک کے سامنے ایک فارمولا تجویز کرے ، جو بظاہر فرقہ وارانہ ہو ، لیکن اس کی بنیاد قومیت کے اصولوں پر رکھی گئی ہو اور تقریباً تمام اقوام کے لیے قابل قبول ہو ۔ اس لیے کانگریس نے بہت غور و خوض کے بعد ذیل کی اسکیم پاس کی ہے ۔

۱۔ (الف) شخصی اور شہری حقوق کے متعلق جو قرارداد منظور کی گئی ہے ، اس میں ہندوستان کی تمام اقوام کی تہذیب ، زبان ، مذہب ، پیشوں اور تعلیم وغیرہ کی حفاظت کی گارنٹی شامل ہو گی ۔

(ب) شخصی قوانین کی دستور اساسی کی خاص شرائط کے ذریعہ حفاظت کی جائے گی -

(ج) مختلف صوبوں میں اقلیتوں کے سیاسی و دوسرے حقوق کی حفاظت فیڈرل گورنمنٹ کے ہاتھوں میں ہو گی -

۲- تمام بالغ مرد اور عورتوں کو حق رائے دہی حاصل ہو گا -

۳- ہندوستان کے لیے دستور اساسی میں نمائندگی مشترکہ انتخاب کے ذریعہ ہو گی -

(الف) سندھ میں ہندوؤں ، آسام میں مسلمانوں ، پنجاب اور صوبہ سرحد میں سکھوں کے لیے اور ان تمام صوبوں میں جہاں ہندو ، مسلمان ۲۵ فیصد سے کم ہیں ، فیڈرل اسمبلی اور صوبہ جاتی کونسلوں میں آبادی کے تناسب سے نشستوں کی تخصیص کر دی جائے گی اور اس کے ساتھ ہی مشترکہ انتخاب میں مقابلہ کرنے کے حقوق دئیے جائیں گے -

۴- ملازمتوں کی تقرری ، نان پارٹی پبلک سروس کمیشن کے ذریعہ ہو گی ، جو تمام اقوام کو مناسب حصہ کے لیے مساوی موقع دے گی -

۵- پراونشیل اور فیڈرل وزارتوں کی تشکیل کے وقت اقلیتوں کے مفاد کا خاص خیال رکھا جائے گا -

۶- سندھ کو علیحدہ صوبہ بنا دیا جائے گا بشرطیکہ سندھ کے لوگ اس کے علیحدہ ہونے پر اس کے مالی اخراجات کا بوجھ اٹھا سکیں -

۷- صوبہ سرحد اور بلوچستان میں بھی وہی اسکیم نافذ ہو گی ، جو ہندوستان کے دوسرے صوبوں میں ہو گی -

۸- ہندوستان کا آئندہ دستور اساسی فیڈرل ہو گا -

ورکنگ کمیٹی نے یہ اسکیم درمیانی راستہ اختیار کرکے تیار کی ہے - ورکنگ کمیٹی جہاں یہ چاہتی ہے کہ ملک کی تمام اقوام

ے تسلیم کریں ، وہاں ان لوگوں کے لیے بھی جو انتہا پسند
یالات کے مالک ہیں ، یقین دلاتی ہے کہ وہ ان کی کوئی بھی
کیم منظور کرنے کو تیار ہے ، بشرطیکہ وہ تمام اقوام کے لیے
بل قبول ہو[۲۱] "

گ کمیٹی کی یہ اسکیم تقریباً ان ہی خطوط پر تھی ، جو اس کی
اور نوساختہ انجمن مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) کانفرنس نے اپنے
ندہ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میں پیش کی تھی اور جس کا ذکر ہم اوپر
، تاہم کانگریس کی یہ اسکیم مسلم قوم پرستوں سے دو قدم پیچھے
سلم قوم پرستوں نے سندھ کی علیحدگی کی تجویز پیش کی تھی ،
نے اس کو پھر مشروط کر دیا تھا ۔ مسلم نیشناسٹ کانفرنس نے واضح
تی اختیارات صوبوں کو دیئے جانے اور پنجاب و بنگال کی مسلم
کو ہر حال میں برقرار رکھنے کے مطالبات کیے تھے ۔ کانگریس
، مطالبات کی طرف سے آنکھیں بند کر لی تھیں اور اسی طرح
ے دیگر مطالبات کو بھی در خور اعتناء نہ سمجھا تھا اور سب
ت یہ تھی کہ یہ اس کا اپنا " یک طرفہ حل " تھا ، ہندوؤں ،
باہمی سمجھوتہ نہ تھا ، گویا اس نے گول میز کانفرنس میں پیش
طوفان سے پہلے ، پھر ایک مرتبہ شتر مرغ کی سی پالیسی اختیار
!

س دور میں ہندوستان کے اندر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین
ی داستان تھی ، لیکن یہ داستان یہیں پر ختم نہیں ہو جاتی ۔ یہ
نکمش کا صرف سیاسی پہلو تھا ، ابھی اس کے " عوامی پہلو " کا
ہے ۔ اسی زمانہ میں یعنی اپریل سنہ ۱۹۳۱ء میں متعدد مقامات
اور مسلمانوں میں وسیع پیمانہ پر فسادات ہوئے ۔ بنارس ، آگرہ ،
اور کانپور ان فسادات کے بدترین مراکز تھے ۔ یہاں کے مسلمان ،
، مظالم ، قتل ، غارت گری ، آتش زنی وغیرہ کے بد ترین شکار بنے ۔

گریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا
ا ص ۷۶۳ تا ۷۶۶ ۔

ان میں سب سے بڑا فساد کانپور کا تھا ، جہاں نہتے۔ مسلمانوں کو گھیر گھیر کر قتل کیا گیا ، گھروں کو مٹی کا تیل ڈال کر جلایا گیا اور تین مساجد کو مسمار کر دیا تھا ۔

اب ہم پھر ہندوستان کے سیاسی ڈرامہ کی طرف رجوع کرتے ہیں ۔ جون ۱۹۳۲ء میں ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں کے ناکام ہو جانے اور کانگریسی مجلس عاملہ کی قرارداد کے منظور ہو جانے کے بعد ، اس سیاسی ڈرامہ کا منظر بدل جاتا ہے ۔ اور اب اس ڈرامہ کے سیاسی کردار ہمیں ، شملہ ، دہلی یا بھوپال میں نظر آنے کی بجائے لندن میں نظر آتے ہیں ۔ گاندھی جی اگست سنہ ۱۹۳۱ء کے آخر میں بمبئی سے لندن کے لیے روانہ ہو گئے ۔ راستہ میں عدن پڑتا تھا ۔ جہاں ان کی بڑی آؤبھگت ہوئی ، انگریز ریزیڈنٹ نے پہلے تو مخالفت کی ۔ لیکن بعد اس کو رعایت دینا پڑی کہ لوگ گاندھی جی کو سپاس نامہ پیش کر سکیں ۔ چنانچہ یہاں گاندھی جی کو ایک جلسہ عام میں سپاس نامہ پیش کیا گیا ۔ میڈم زاغلول پاشا اور وفد پارٹی کے لیڈر مصطفےٰ نحاس پاشا نے خیر سگالی کے پیغامات بھیجے ۔ پھر پورٹ سعید پر مصری وفد نے ان کا خیر مقدم کیا ۔ بہرحال اس طرح ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو وہ لندن پہنچ گئے ۔

لندن میں ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو دوسری گول میز کانفرنس کا افتتاح ہوا ۔ اس کانفرنس میں بھی دو اہم کمیٹیاں بنائی گئیں ، ایک اقلیتوں کی کمیٹی (Minorities Committee) اور دوسری وفاق ہیئت کی کمیٹی (Federal Structure Committee) ۔ اقلیتوں کی کمیٹی وفاق ہیئت کی کمیٹی سے زیادہ اہم تھی ۔ اس کی کامیابی کے بعد ہی وفاق ہئیت کی کمیٹی وفاق سے متعلق مسائل پر غور کر سکتی تھی کیونکہ وفاق کے اکثر و پیشتر مسائل کسی نہ کسی صورت میں فرقہ وارانہ مسائل سے گہرا تعلق رکھتے تھے ۔ اقلیتوں کی کمیٹی میں برطانوی نمایندوں کے علاوہ ہندو ، مسلمان ، سکھوں اور اچھوتوں وغیرہ کے نمایندے شامل تھے ۔ اس میں ہندو مہاسبھا ، مسلم لیگ ، مسلم کانفرنس ، مسلم نیشنلسٹ یا خلافت کمیٹی ، سکھ لیگ وغیرہ کی نمایندگی بھی تھی اور کانگریس کی نیابت تو خود گاندھی جی اکیلے کر رہے تھے ۔

اس کمیٹی کے سامنے سب سے بڑا سوال ہندو مسلم اختلاف کو رفع کرنے کا تھا ۔ ہندو سبھا سبھا والے تو کسی صورت مسلمانوں سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ سر شفیع جو کٹر فرقہ پرست سمجھے جاتے تھے اور جنھوں نے جدا گانہ انتخاب کی ہمیشہ حمایت کی تھی ، ایک موقع پر گول میز کانفرنس میں اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے تعین نشست کے ساتھ مخلوط انتخاب کی تجویز پیش کر دی ، لیکن ہندو مہاسبھا کی روح و رواں پنڈت مدن موہن مالویہ نے اسے محض ایک نشست کی کمی بیشی کی بنیاد پر رد کر دیا ۲۲۔

اسی گول میز کانفرنس میں گاندھی جی نے اس بنیادی مسئلہ کے تعلق سے جو رویہ اختیار کیا ، وہ عجیب و غریب تھا ۔ وہ بار بار پنتیرے بدلتے اور ہر وقت ایک نیا موقف اختیار کرتے رہے ۔ لندن کے ساحل پر قدم رکھتے ہی انھوں نے اخبار آبزرور کے نمایندے کے ایک سوال پر کہا کہ "میں مسلمانوں کو ایک سادہ چیک دستخط کر کے دے دوں گا ، پھر وہ جو چاہیں اس پر لکھ لیں ، لیکن ساتھ ایک شرط بھی لگا دی کہ "مسلمانوں کا یہ مطالبہ متحدہ ہو ، ایک نیشنلسٹ مسلم پارٹی بھی ہے ۔ میں اس سے دغا نہیں کر سکتا ۲۳۔

۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو اقلیتوں کی کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا ، جس کو دو روز کے لیے ملتوی کر دیا گیا تاکہ اراکین کمیٹی غیر رسمی گفت و شنید کے ذریعہ کسی متفقہ نتیجہ پر پہنچیں ۔ اس اجلاس کے التوا سے قبل گاندھی جی نے مسلمان نمایندوں سے کہا کہ وہ ڈاکٹر انصاری کو مسلمان نمایندے کی حیثیت سے کانفرنس میں مدعو کرنے کے لیے حکومت سے مطالبہ کریں ۔ یہ ایک مضحکہ خیز بات تھی کیونکہ ان مسلمان نمایندوں نے گول میز کانفرنس سے قبل ہی ڈاکٹر انصاری کی نامزدگی کی شدید مخالفت کی تھی ۔ پھر ڈاکٹر انصاری کا تعلق مسلم نیشنلسٹ (قوم

۲۲- تصدق احمد خان شیروانی کا بیان مورخہ اخبار لیڈر الہ آباد ۳۰ اگست سنہ ۱۹۳۲ع ۔

۲۳- روزنامہ انقلاب لاہور یکم نومبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

پرست) پارٹی سے تھا جس کی نمایندگی اسی گول میز کانفرنس میں، سر علی امام کر رہے تھے - پہلی اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو اقلیتوں کی کمیٹی کا دوسرا اجلاس ہوا، لیکن گاندھی جی کی درخواست پر اسے مزید آٹھ دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا تاکہ پھر ایک مرتبہ باہمی مشاورت ہو - اس اس غرض سے ایک چھوٹی سی سب کمیٹی بنائی گئی، جس کے صدر خود گاندھی جی تھے - اس سب کمیٹی کے مختلف اجلاس ہوئے - ایک اجلاس میں گاندھی جی بوکھلا گئے، جب انہوں نے یہ دیکھا کہ اس سب کمیٹی کی اکثریت حتلی یہ کہ بعض ہندو نمایندوں مثلاً سر سپرو اور اے پٹبرو نے بھی جدا گانہ انتخاب کی حمایت کی - تاہم انہوں نے یہی کہا کہ وہ کانگریس مجلس عاملہ کی ہدایات کے خلاف نہیں جا سکتے - اس سب کمیٹی کا جب دوسرا اجلاس ۶ اکتوبر کو ہوا، تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ گاندھی جی نے ہتھیار ڈال دیئے ہیں - مگر کس انداز سے؟ انہوں نے مسلمان نمایندوں کو تاثر دیا کہ وہ ان کے تقریباً تمام مطالبات ـــــ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی ۵۱ فی صد آئینی اکثریت، سندھ کی غیر مشروط علیحدگی، سرحد کے لیے سیاسی اصلاحات، مرکزی وفاق اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمایندگی، صوبوں کو مابقی اختیارات کی سپردگی، ـــــ کو تسلیم کرتے ہیں اور طریقہ انتخاب کا فیصلہ عام مسلمانوں کے استصواب پر چھوڑتے ہیں ـــــ اور یہ سب کچھ وہ ذاتی و شخصی حیثیت میں مان لینے کے لیے تیار ہیں اور ان کو وہ کانگریس، ہندوؤں اور سکھوں سے منوانے کی کوشش بھی کریں گے مگر ساتھ ہی انہوں نے اپنی اس پیش کش کے ساتھ چند شرطیں لگا دیں کہ (۱) مسلمان حق رائے دہی بالغان کی تائید کریں (۲) کامل آزادی کی حمایت کریں - (۳) اچھوتوں کے مطالبۂ جدا گانہ نیابت کی تائید نہ کریں - مسلم نمایندوں نے گاندھی جی کی تجاویز اور شرائط پر غور کرنے کا وعدہ کیا، لیکن مہاتما جی نے نہ تو اس معاملہ کو کانگریس کے سامنے رکھا، نہ ہندوؤں اور سکھوں سے منوانے کی کوشش کی - ۷ اکتوبر کو ہندوؤں کی طرف سے ڈاکٹر مونجے اور سکھوں کی طرف سے سردار اجل سنگھ نے مسلمانوں کے ان مطالبات کی مخالفت کی اور سر سپرو اور سروجنی نائیڈ نے اس معاملہ کو ثالثی کے سپرد کرنے کی تجویز پیش

کی ، جس کو مونجے اور اجل سنگھ نے مسترد کر دیا ۔ ۸ اکتوبر کو وزیر اعظم برطانیہ کی صدارت میں اقلیتوں کی کمیٹی کا تیسرا جلسہ ہوا ۔ اس جلسہ میں گاندھی جی نے فرقہ وارانہ مفاہمت کی نا کامی کا اعتراف کیا مگر ساتھ ہی اس نا کامی کی ذمہ داری حکومتِ برطانیہ پر رکھی کہ اس نے ایسے ہندوستانی مندوبین کو اس کانفرنس میں نامزد کیا تھا ، جو منتخبہ نمایندے نہ تھے ۔ پھر انہوں نے فرقہوارانہ مسائل کے حل کے سلسلہ میں کانگریس کی قرارداد لاہور ، اور مجلس عاملہ کی قرارداد (جن کو ہم صفحات گذشتہ میں نقل کر آئے ہیں) حوالہ دیا اور یہ تجویز پیش کی کہ اقلیتوں کی کمیٹی کو غیر معین مدت تک ملتوی کر دیا جائے ۔ گاندھی جی کے بعد مسلمان ، سکھ اور اچھوتوں کے نمایندوں نے تقریریں کیں اور تجویز التوا کی مخالفت کی ۔ آخر میں وزیر اعظم برطانیہ نے صدارتی تقریر میں اقلیتوں کی کمیٹی کو اپنا کام جاری رکھنے کا مشورہ دیا اور یہ اعلان کیا کہ اس کمیٹی کے آئندہ اجلاس کے لیے تاریخ اور وقت کا تعین وہ بعد میں کریں گے ۔ اس اعلان کی وجہ یہ تھی کہ اس زمانہ میں برطانیہ میں عام انتخابات ہو رہے تھے ، اور وزیر اعظم و دیگر انگریز مندوبین اس سلسلہ میں زیادہ مصروف تھے ۔ الغرض اقلیتوں کی کمیٹی کا یہ تیسرا جلسہ بھی کسی نتیجہ پر پہنچے بغیر ملتوی ہو گیا ۔ پھر غیر رسمی بات چیت کے نئے دور کا آغاز ہوا ۔ ۱۶ اکتوبر کو مسلمان مندوبین گاندھی جی سے ملے لیکن نتیجہ ڈھاک کے وہی تین پات ! وہ اپنی گذشتہ تین شرائط پر مصر تھے اس کے بعد گاندھی جی، سر آغا خاں کی قیام گاہ پر مسلمان مندوبین سے خود ملے اور درجِ ذیل تین متبادل تجاویز پیش کیں ،

۱۔ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکاون فی صد نمایندگی اور طریقہ انتخاب کا فیصلہ ان صوبوں کے مسلمانوں سے استصواب عامہ (Referendum) پر ۔ مسلم اقلیتی صوبوں میں مسلمانوں کا موجودہ پاسنگ برقرار اور طریقہ انتخاب کا فیصلہ وہاں کی رائے عامہ پر ، مرکز میں مسلمانوں کی ۳۳ فیصد نمایندگی اور مابقی اختیارات صوبوں کے حوالے ۔

۲۔ سر جیوفر کاربٹ کی اسکیم پر عمل ، جس کے مطابق پنجاب سے

انبالہ ڈویژن کو علیحدہ کرنے کے بعد پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۶۲ فیصد ہو جاتی تھی، اس لیے یہاں مخلوط انتخاب رائج کر دیا جائے۔

۳۔ فرقہ وارانہ مسئلہ کو ثالثی بورڈ کے حوالے کر دیا جائے۔

گاندھی جی کی پہلی تجویز کے ساتھ شرط یہ لگی ہوئی تھی کہ پنجاب میں سکھوں اور سندھ میں ہندوؤں کے سوا کسی دوسری اقلیت کو نہ جدا گانہ انتخاب کا حق دیا جائے اور نہ ان کے لیے نشستیں مخصوص کی جائیں۔ مسلمان، چونکہ خود جدا گانہ حق انتخاب کے لیے لڑ رہے تھے، اس لیے اخلاقی لحاظ سے یہ شرط ان کے لیے قابل قبول نہ تھی اور اگر وہ اس شرط کو تسلیم کر لیتے تو ظاہر ہے کہ دیگر اقلیتوں خصوصاً اچھوتوں کی حمایت سے محروم ہو جاتے۔ اس لیے مسلم مندوبین نے اس شرط کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ علاوہ بریں پنجاب و بنگال میں اکاون فیصد کی مسلم اکثریت کے فارمولے کو ہندو مندوبین نے رد کر دیا۔ گاندھی جی کی دوسری متبادل تجویز (جیوفرے کاربٹ والی اسکیم) سکھوں نے مسترد کر دی۔ ان کی تیسری تجویز (ثالثی بورڈ والی تجویز) ناقابل عمل تھی! اس کے بعد بھی ہندو مسلم مندوبین، گاندھی جی، آغا خان، سپرو وغیرہ باہم ملتے رہے، لیکن ان ملاقاتوں کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ ان طول طویل مذاکرات کے بعد مسلم مندوبین پر یہ حقیقت واضح ہو چکی تھی کہ گاندھی جی، ہندوؤں اور سکھوں سے کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی۔ اب ان کے لیے ایک ہی راہ کھلی ہوئی تھی کہ وہ دیگر اقلیتوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں، چنانچہ سکھوں کے سوائے تمام اقلیتوں (مسلمان یوروپین، اچھوت، اینگلو انڈین) نے باہمی مفاہمت سے اقلیتوں کا میثاق (Minorities Pact) تیار کیا، اور اس پر ۱۲ نومبر کو اقلیتوں کے نمایندوں نے دستخط کر دئیے۔

اقلیتوں کی کمیٹی کا آخری اجلاس ۱۳ نومبر کو ہوا۔ اس اجلاس میں آغا خاں نے "اقلیتوں کے میثاق" کو پڑھ کر سنایا اور وزیر اعظم برطانیہ کے حوالے کر دیا۔ سکھ اور یورپین نمایندوں نے تقریریں کیں، پھر گاندھی جی نے اپنے دل کا بخار نکالا، کانگریسی قرار دادوں کو دہرایا

بصورت عدم منظوری فرقہ وارانہ مسئلہ کو ثالثی بورڈ کے سپرد کرنے کی تجویز اس اجلاس میں بھی دہرائی اور آخر میں اچھوتوں کو جدا گانہ حق انتخاب دینے کی سختی سے مخالفت کی اور اس مسئلہ پر اپنی جان کی بازی لگا دینے کا ارادہ ظاہر کیا ۔ تقریر کے بعد جلسہ تو برخاست ہو گیا مگر " اقلیتوں کے میثاق " سے ہندوؤں میں ایک کھلبلی مچ گئی ۔ ان کے سامنے سوال یہ تھا کہ اب کیا کیا جائے ، پھر بھی وہ مایوس نہ تھے ۔ کتاب "بیداری ہند" کے مصنف ، وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ سے اب بھی توقعات وابستہ تھیں ، اس لیے پنڈت مالویہ ، مونجے اور دیگر ہندو زعما نے ان کی خدمت میں ایک چٹھی روانہ کی ، جس میں ان سے "فرقہ وارانہ فیصلہ " (Communal award) کی درخواست کی گئی تھی[۴۲]۔ خود گاندھی جی نے اس درخواست کی تائید ایک علیحدہ خط لکھ کر کی ، لیکن مسلمانوں نے اس درخواست پر دستخط نہیں کئے ۔

یہ ہے ان کوششوں کی مختصر روئیداد (الف) ، جو ہندوستان کے بنیادی سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کے لیے دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر کی گئیں ۔ اور افسوس ہے کہ یہ کوششیں سب کی سب ناکام رہیں ۔ اب آئیے یہ دیکھیں کہ گول میز کانفرنس کی دوسری کمیٹی یعنی وفاق ہیئت کی کمیٹی (Federal Structure Committee) میں کیا ہوا ۔ اس کمیٹی میں بھی تمام فرقوں کے نمایندے شامل تھے اور تقریباً ہر سیاسی مکتب خیال

۴۲۔ تصدق احمد خاں شیروانی کا بیان مندرجہ لیڈر الہ آباد مورخہ ۳۰ اگست ۱۹۳۲ع ۔

الف ۔ اس روئیداد کو مختصراً مگر زیادہ سے زیادہ واضح طور پر پیش کرنے کی یہاں کوشش کی گئی ہے ۔ اس کو ہم نے علامہ اقبال کے خطبہ صدارت مسلم کانفرنس منعقدہ مارچ سنہ ۱۹۳۲ع ، روزنامہ انقلاب لاہور اکتوبر و نومبر سنہ ۱۹۳۱ع کے مختلف پرچوں اور "سیاست ملیہ" از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ع دوسری گول میز کانفرنس کی رپورٹ اور کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر سیتا رامیا ، سے مرتب کیا ہے مصنف ۔

کی اس میں نمایندگی ہو رہی تھی - اس کے بعض اراکین اقلیتوں کی کمیٹی کے بھی رکن تھے - اس کمیٹی کا اجلاس ۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء کو ہوا - اس اجلاس میں مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں کے نمایندوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ وہ فرقہ وارانہ مسائل کے طے ہونے تک وفاق ہیئت کی کمیٹی کے مباحث میں حصہ نہیں لے سکتے ، کیونکہ ان مباحث کا زیادہ تر تعلق فرقہ وارانہ مسائل سے بھی ہے - علاوہ ازیں چونکہ اس کمیٹی کے بعض ارکان ، اقلیتوں کی کمیٹی کے رکن بوی تھے ، اس لیے انہیں اپنے مباحث کی تیاری کے لیے وقت بھی درکار تھا - غرض کہ ان وجوہ کے پیش نظر یہ اجلاس نہایت مختصر کاروائی کے بعد ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء تک ملتوی ہو گیا -

۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء وفاق ہیئت کی کمیٹی کا دوسرا اجلاس ہوا - اس اجلاس میں گاندھی جی نے اس بات پر زور دیا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کا انتظار کیے بغیر ، عام دستوری مسائل پر غور کیا جائے اور ان کے متعلق فیصلے کیے جائیں - مسلم مندوبین نے اس نقطۂ نظر کی مخالفت کی - انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل مقدم ہے ، اس کے بغیر وہ عام دستوری مباحث میں حصہ نہیں لے سکتے - بحث و تمحیص کے بعد یہ طے ہوا کہ فی الحال صرف مالیاتی امور اور وفاق عدالت کے مسائل پر غور کیا جائے ، اس دوران فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی کوشش جاری رہیں گی اور اس کے بعد وفاق کے دیگر معاملات کا فیصلہ کیا جائے گا - واضح رہے کہ اس دوران فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کے لیے اقلیتوں کی سب کمیٹی کے اراکین کی کوشیش جاری تھیں اور ابھی ان کا اختتام نہ ہوا تھا - یہ اختتام تو ۱۳ نومبر کو ہوا - غرض کہ وفاق ہیئت کی کمیٹی میں ان دو معاملات سے متعلق غور و خوض ہونے لگا - ابھی یہ سلسلہ جاری تھا اور اس کمیٹی کے اجلاس وقتاً فوقتاً ہو رہے تھے کہ اس کمیٹی کے مسلم مندوبین نے باہمی مشورے کے بعد یہ طے کیا کہ اس کمیٹی میں جو مسئلہ بھی زیر بحث آتا ہے وہ کسی نہ کسی صورت میں فرقہ وارانہ مسئلہ سے تعلق رکھتا ہے لہذا اس کے جلسوں میں شرکت سے قبل ہر مرتبہ عام مسلم مندوبین سے مشورہ کر لینا

چاہیے ۔ اب وفاقِ ہیئت کی کمیٹی کا اجلاس کچھ دنوں ملتوی رہنے کے بعد ۲ نومبر کو ہوا ۔ اس میں وفاقی عدالت کے متعلق بحث چھڑی ۔ مسلمان مندوبین نے فرقہ وارانہ مسئلہ کا فیصلہ ہونے تک اس بحث میں حصہ لینے سے انکار کر دیا ۔

۲۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ء کو برطانوی پارلیمان کے انتخابات ختم ہو گئے اور ۱۰ نومبر کو نئی پارلیمان کا افتتاح ہوا ۔ ۱۳ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کو جیسا کو بیان کیا جا چکا ہے ، اقلیتوں کی کمیٹی کا اجلاس ہوا ، جس میں فرقہ وارانہ مسئلہ کے حل کی ناکامی کا اعلان کر دیا گیا اور وزیر اعظم برطانیہ پر اس مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری ڈال دی گئی ۔ اب پھر وفاق ہئیت کی کمیٹی کا اجلاس ۱۶ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کو ہونے والا تھا ۔ ان حالات میں اس کمیٹی کی کاروائیوں میں مسلم مندوبین کی شرکت یا عدم شرکت کا مسئلہ نزاکت اختیار کر گیا ۔ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کو مسلم مندوبین نے یہ طے کیا کہ وہ ۱۶ نومبر کو ہونے والے وفاق ہئیت کی کمیٹی کے مباحث میں کوئی حصہ نہیں لیں گے [۲۵] اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ اقلیتوں کی کمیٹی ”فرقہ وارانہ مسائل“ کا حل دریافت کرنے میں ناکام ہو گئی تھی اور مسلمانوں کے حقوق و تحفظات بالفاظ دیگر آئندہ دستور اساسی میں ان کے سیاسی موقف کے متعلق کوئی فیصلہ نہ ہو پایا تھا ۔ اب ۱۶ نومبر کو وفاق ہئیت کی کمیٹی کا اجلاس ہوا ۔ اس اجلاس کی کاروائی دلچسپ رہی ۔ عام خیال یہی تھا کہ چونکہ اقلیتوں کی کمیٹی ناکام ہو چکی ہے ، اس لیے وفاق ہئیت کی کمیٹی میں اس ناکامی کا اعلان کرنے کے بعد خود برطانوی مندوبین یعنی حکومت وفاق کمیٹی کو بھی برخاست کر دے گی ۔ لیکن اس کے برعکس ہوا یہ کہ برطانوی مندوبین نے گو اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی کا اعتراف کیا ، لیکن وفاق ہئیت کی کمیٹی کے مباحث کو آگے بڑھانے پر بہت زور دیا ۔ یہ صورت حال مسلم اراکین کمیٹی کے لیے پریشان کن تھی ۔ وہ تو کمیٹی کے اختتام کا اعلان

۲۵۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۱

سننے کے منتظر تھے اور یہاں بجائے اختتام کے اس کی کاروائیوں کو جاری رکھنے پر زور دیا جا رہا تھا ۔ اس غیر متوقع صورت حال کے پیش آ جانے پر مسٹر جناح نے جو اس کمیٹی کے رکن تھے ، اجلاس کے التواء کی خواہش کی تا کہ تمام مسلم مندوبین باہم مشورہ کر سکیں ۔ چنانچہ یہ اجلاس دو گھنٹے کے لیے ملتوی ہو گیا ، اور مسلم مندوبین آغا خاں کی قیام گاہ پر جمع ہوئے ۔ یہاں مسئلہ زیر بحث یہی تھا کہ موجودہ صورت حال کے پیش نظر وفاق ہئیت کی کمیٹی میں حصہ لیا جائے یا نہیں ۔ اب تک تو گول میز کانفرنس کی تمام کاروائیوں میں ، اقلیتوں کی کمیٹی کے تمام رسمی و غیر رسمی مباحث اور نجی گفتگوؤں میں ، وفاق ہئیت کی کمیٹی کے جلسوں میں بھی مسلم مندوبین نے متحدہ متفقہ روش اختیار کی تھی ۔ لیکن اب ان میں اختلاف پیدا ہو گیا ۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد یہ طے پایا کہ گول میز کانفرنس کی ناکامی کا الزام اپنے سر لینا مناسب نہیں ہے ۔ لٰہذا مسلم اراکین وفاق کمیٹی مباحث میں حصہ لیں ۔ البتہ یہ اعلان ضرور کر دیں کہ مسلمان کسی ایسے دستور کو قبول نہیں کریں گے ، جس میں ان کے مطالبات کو نظر انداز کر دیا گیا ہو ۔ اس اجتماع میں سر شفیع نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور یہ فیصلہ کروانے میں ان ہی کا بڑا ہاتھ تھا ۔ اس فیصلہ کے بعد مسلم اراکین وفاق کمیٹی اجلاس میں شریک ہوئے اور مسٹر محمد علی جناح نے مسلم مندوبین کا یہ فیصلہ وہاں سنایا اور سر شفیع نے اس موقع پر ایک تقریر بھی کی ۔ اس کے بعد وفاق کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے تاایں کہ یکم دسمبر ۱۹۳۱ء کو دوسری گول میز کانفرنس کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا ۔ آخری اجلاس میں وزیر اعظم برطانیہ مسٹر ایمرے میکڈانلڈ نے تقریر کی ۔ ان کی تقریر کے حسب ذیل نکات اہم تھے :

۱۔ مرکز میں ذمہ دارانہ وفاقی حکومت قائم کی جائے گی

۲۔ صوبوں کو بعض تحفظات کے ساتھ خود مختاری دی جائے گی

۳۔ سندھ کی مالی حالت اجازت دے تو اسے ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا

۴۔ سرحد میں مساوی سیاسی اصلاحات نافذ ہوں گے

۵- فرقہ‌وارانہ مسئلہ حل نہ ہونے کی ذمہ داری برطانیہ پر نہیں ، خود ہندوستانیوں پر ہے ، تاہم اس مسئلہ کو ملک کی دستوری ترقی کی راہ میں روڑا بننے نہیں دیا جائے گا - اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے حکومت برطانیہ اپنی ایک عارضی اسکیم پیش کرے گی جس میں اصول جمہوریت کو برقرار رکھتے ہوئے اقلیتوں کے حقوق کا تحفظ کیا جائے گا [۲۶] ،

یہ گویا اختتام کانفرنس پر ہندوستان کے آئندہ دستوری خاکہ سے ، حکومت برطانیہ کی پالیسی کا اعلان تھا (الف)

اِدھر انگلستان میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ، اس کی سب کمیٹیوں ،لسے ، غیر رسمی ملاقاتیں ، نجی گفتگوئیں ، بحث مباحثے اور تقریریں ہی تھیں ، اور اُدھر ہندوستان میں حالات آئے دن خراب ہو رہے تھے ، ت اور کانگریس میں جھڑپیں ہو رہی تھیں ، اور ان جھڑپوں اور وں کی وجہ وہی "گاندھی ارون معاہدہ" تھا ! حکومت اور کانگریس دوسرے پر اس معاہدہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا رہے تھے - واقعہ ہا کہ گزشتہ تحریک سول نافرمانی کے زمانہ میں کانگریس نے ادائیگی لگان کی مہم بھی چلائی تھی - "گاندھی ارون معاہدہ" ت یہ تحریک ختم کر دی گئی اور حکومت نے ستیہ گرھیوں کو رہا نے کا وعدہ کر لیا تھا ، لیکن اس نے تمام گرفتار شدگان کو رہا نہیں - علاوہ ازیں اب اس نے لگان کی وصولی میں سختی شروع کر دی - ب سول نافرمانی کے زمانہ میں جو بقایاجات تھے ، ان کی ادائی کا مطالبہ اور عدم ادائی کی صورت میں قانونی کاروائیوں کا آغاز کر دیا گیا - ت کی اس سخت گیر پالیسی سے کسانوں میں بے چینی پیدا ہوئی -

---

انڈین اینول رجسٹر جلد دوم سنہ ۱۹۳۱ع ص ۳۳۶ (ملخصاً)

) گول میز کانفرنس کی یہ روئیداد ، اقبال کے خطبہ صدارت کل ہند مسلم کانفرنس سنہ ۱۹۳۲ع ، ان کے بعض بیانات روزنامہ انقلاب لاہور بابت اکتوبر و نومبر ، گول میز کانفرنس کی رپورٹ ، انڈین اینول رجسٹر جلد دوم سے مرتب کی گئی ہے -

گاندھی جی تو لندن میں تھے ، پنڈت جواہر لال نہرو ٹنڈن اور شیروانی نے کسانوں کے اس ایجی ٹیشن میں نمایاں حصہ لیا ۔ حکومت نے ان کانگریسی لیڈروں اور ان کے ساتھیوں کو جیلوں میں بند کر دیا ، پھر صوبہ سرحد میں خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو حوالۂ زنداں کر دیا ۔ ان دونوں بھائیوں پر الزام یہ تھا کہ انھوں نے اپنی تقریروں سے لوگوں کو حکومت کے خلاف اکسایا تھا اور سرکاری درباروں میں شرکت سے انکار کر دیا تھا ۔ واضح رہے کہ خاں برادران اور ان کی سرخپوش جماعت اگست سنہ ۱۹۳۰ء میں کانگریس سے وابستہ ہو چکی تھی[۲۷] ۔ یہ حالات صرف یوپی ، اور سرحد ہی میں پیدا نہ ہوئے تھے ، بلکہ گجرات ، مدراس ، اور بنگال وغیرہ تمام صوبوں میں کانگریس اور حکومت کے مابین رسہ کشی جاری تھی ۔ ان حالات میں گاندھی جی نے ۲۸ دسمبر ۱۹۳۱ء کو ہندوستان کے ساحل پر قدم رکھا ۔ اب وہ ایک نئی صورت حال سے دو چار تھے ۔ انھوں نے دوسرے ہی دن وائسرائے کو تار دیا اور ملاقات کی خواہش ظاہر کی ، لیکن ادھر سے انکار کر دیا گیا ۔ اب کانگریس کی مجلسِ عاملہ نے ایک قرار داد منظور کی ، جس میں اس نے حکومتِ ہند کی سخت گیر پالیسی پر سخت تنقید کی ، گول میز کانفرس کی کاروائیوں کو غیر تسلی بخش قرار دیا ، اور بالخصوص اس امر پر افسوس ظاہر کیا کہ برطانوی حکومت نے کانگریس کو "تمام قوم کی بلا امتیاز مذہب و ملت و رنگ نمائندگی کرنے اور اس کی طرف سے بولنے اور کام کرنے کی حقدار" جماعت تسلیم کرنے سے انکار کیا ۔ اسی قرارداد میں آزادیٔ کامل کا مطالبہ کیا گیا تھا اور بصورت عدم منظوری تحریک سول نافرمانی کو دوبارہ جاری کرنے کی دھمکی بھی دی گئی تھی[۲۸] ۔ وائسرائے نے اس

۲۷- "کانگریس کی تواریخ" (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۷۹۵ و کانگریس بلیٹن (۴) مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۳۰ء

۲۸- "کانگریس کی تواریخ" (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۰۹ تا ص ۸۱۵

قرارداد کا نہایت سخت جواب دیا اور فوراً ہی متعدد ہنگامی قوانین نافذ کر دیئے - ابھی سول نافرمانی کا آغاز بھی پوری طرح نہ ہو پایا تھا کہ بتاریخ ۴ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع گاندھی جی کو گرفتار کر کے یرودا جیل پہنچا دیا گیا - کانگریس اور اس سے متعلقہ تمام اداروں اور جماعتوں کو غیر قانونی قرار دے دیا گیا اور کئی کانگریس لیڈروں اور کارکنوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا ۲۹ - اس طرح حکومت نے تحریک سول نافرمانی کو اس کے آغاز ہی میں کچل کر رکھ دینے کا تہیہ کر لیا -

۱۷ جنوری کو لارڈ لوتھیان کی کمیٹی ، رائے دہندگی اور نشستوں کے تعین کا فیصلہ کرنے کے لیے ہندوستان پہنچ گئی - گاندھی جی کو جیل میں بھی نئے دستور کی تیاری سے متعلق حکومت کی کارروائیوں کی اطلاع مل جایا کرتی تھی - انھوں نے غالباً بھانپ لیا تھا کہ حکومت اچھوتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دینے والی ہے ، اسی لیے یرودا جیل ہی سے ۱۱ مارچ سنہ ع کو سر سموئیل ہور ، وزیر ہند کے نام انھوں نے ایک خط لکھا ، جس میں اپنی گول میز کانفرنس والی تقریر کا حوالہ دیتے ہوئے ، پھر اس بات کو انھوں نے دھرایا کہ اگر اچھوتوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیا گیا تو وہ فاقہ کشی کر کے جان دے دیں گے - وزیر ہند نے انھیں جواب دیا کہ وہ لارڈ لوتھیان کمیٹی کی سفارشات کا انتظار کریں اور یہ بھی اطمینان دلایا کہ حکومت اس معاملہ کا فیصلہ کرتے وقت ان کی رائے کو بھی پیش نظر رکھے گی -

۱۷ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو وزیر اعظم برطانیہ ، ریمزے میکڈانلڈ نے فرقہ وارانہ فیصلہ (communal award) کا اعلان کر دیا - اس فیصلہ کے بعض اہم نکات درج ذیل ہیں :

۱- مرکز یا مرکزی اسمبلی کے سلسلہ میں کوئی تجویز پیش نہیں کی گئی تھی - صرف یہ اعلان کیا گیا تھا کہ چونکہ ہندوستانی ریاستیں

۲۹- ''کانگریس کی تواریخ'' (هسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۲۲ و ۸۲۳

وفاق میں شریک ہو رہی ہیں اور مختلف امور میں ان سے مشورہ کرنا
باقی ہے ، اس لیے مرکزی مقننہ کی ہئیت ترکیبی کے متعلق اعلان
کیا جائے گا ۔

۲۔ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ قرار دینے کا
اعلان نہیں کیا گیا ، صرف یہ کہا گیا تھا کہ وفاق مالیات کے
سلسلہ میں مختلف مالی امور پر جب غور کیا جائے گا تو سندھ کی
مالیات پر بھی سوچا جائے گا اور اسی روشنی میں اس کی علیحدگی
فیصلہ ہو گا ۔ تاہم موجودہ فرقہ وارانہ فیصلہ میں سندھ کی علیحدہ
نشستوں کا ذکر بھی کیا گیا تھا اور بمبئی بشمول سندھ کی نشستو
کا تعین بھی کیا گیا تھا ۔

۳۔ صوبائی مجالس قانون ساز میں مختلف فرقوں مثلاً مسلمانوں ، سکھو
یورپینوں ، ہندوستانی عیسائیوں کے لیے نشستوں کا تعین کیا گیا ت
اور انھیں جداگانہ حقِ انتخاب دیا گیا تھا ۔ ساتھ ہی یہ بھی ک
گیا تھا کہ دس سال کے بعد متعلقہ فرقہ کی رضا مندی سے اس طر
انتخاب میں تبدیلی کی جا سکے گی ۔ یہ وضاحت بھی کر دی گئی ت
کہ یہ فرقے اپنے اپنے حلقہ ہائے انتخاب کے سوا ، عام حلقہ ہا
انتخاب میں حصہ نہ لے سکیں گے ۔ واضح رہے کہ عام حلقہ ہا
انتخاب سے مراد ہندو حلقہ ہائے انتخاب تھا ۔

۴۔ اچھوتوں کے لیے علیحدہ نشستوں کا تعین کیا گیا تھا اور انھیں !
سال کے لیے جداگانہ حقِ انتخاب بھی دیا گیا تھا ۔ مگر اس
ساتھ ساتھ عام (یعنی ہندو) حلقہ ہائے انتخاب میں بھی انھیں و
دینے اور اپنا امیدوار کھڑا کرنے کا مستحق قرار دیا گیا تھا ۔
طرح جداگانہ نیابت کے باوجود انھیں ہندو قوم کا ایک جز رہنے
گیا تھا ۔ گویا برطانوی حکومت نے اس تجویز میں اچھوت لیڈ
کے مطالبہ اور گاندھی جی کے نقطۂ نظر کو سمونے کی کو
کی تھی ۔

۵۔ یہ اعلان بھی کیا گیا تھا کہ جدید دستور کی تدوین سے قبل مذ

فرقے کسی دوسری متبادل تجویز پر متفق ہو جائیں تو اس کو قبول کر لیا جائے گا اور حسبہ ترمیم کر دی جائے گی ۔

فرقہ وارانہ فیصلہ ، (کمیونل وارڈ) میں اچھوتوں سے متعلق جو تجویز تھی ، وہ گاندھی جی پر بہت شاق گزری ۔ انھوں نے اس فیصلہ کے اعلان کے دوسرے ہی دن (یعنی ۱۸ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو) وزیر اعظم برطانیہ کے نام ایک چٹھی لکھی ، جس میں اس تجویز کو بدل دینے کا مطالبہ کیا اور بصورت عدمِ منظوری ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع سے مرن برت رکھنے کا اعلان کیا ۔ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو وزیر اعظم نے اپنے جواب میں اس تجویز کی تشریح کی اور بتایا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) میں ترمیم کی صرف ایک ہی صورت ہے کہ متعلقہ فرقے باہمی رضا مندی سے کوئی متبادل تجویز پیش کریں ، اس سے ہٹ کر حکومت اپنے طور پر اس فیصلہ میں کسی قسم کا رد و بدل کرنا نہیں چاہتی ۔ ۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو گاندھی جی نے وزیر اعظم کے اس خط کا جواب دیا جس میں انھوں نے اس تجویز کے خلاف فاقہ کشی کرکے جان دینے کے عزم کا اظہار کیا اور ۲۰ ستمبر کو مقررہ وقت پر انھوں نے مرن برت کا آغاز کر دیا ۔ اس کا ردِ عمل فوراً ہوا ۔ صرف پانچ دن ہی گزرے تھے کہ ۲۶ ستمبر کو آونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے مابین ایک سمجھوتہ ہو گیا ، جس کو " میثاق پونا " کہا جاتا ہے ۔ اس میثاق کی رو سے اچھوت جداگانہ نیابت کے حق سے دستبردار ہو گئے اور آونچی ذات کے ہندوؤں نے ان کو ان کی تعداد کے لحاظ سے قدرے زائد نشستیں دے دیں[۳۰] ۔ ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو حکومت نے اس باہمی سمجھوتہ کو فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کا ایک جز بنا دیا اور گاندھی جی نے بھی اسی روز اپنا برت ختم کر دیا !

مسلمان بھی اس فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) سے مطمئن نہیں تھے ۔ ان کی بے اطمینانی کی سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ بنگال و پنجاب

۳۰۔ کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۸۵۰ ۔

میں جہاں ان کی واقعی اور قطعی اکثریت تھی ، انھیں مجالس وضع قوانین میں آئینی اکثریت (Statutory Majority) سے محروم کر دیا گیا تھا ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ بنگال اسمبلی میں فرقہ وارانہ فیصلہ کی رو سے مسلمانوں کو ۲۵۰ کے ایوان میں ۱۱۹ نشستیں یعنی ۴۷٫۶ فیصد نشستیں دی گئی تھیں ، حالانکہ پورے صوبہ میں ان کی آبادی جملہ آبادی کا ۵۴٫۸ فیصد تھی اور یورپینوں و دیسی عیسائیوں (اینگلو انڈین) کو ۱۰٫۳ فیصد نشستیں دی گئی تھیں ، جو ان کی آبادی کی بہ نسبت پچیس گنا زیادہ تھیں ۔ اس کی وجہ سے یورپینوں اور دیسی عیسائیوں کی حیثیت بمنزلہ پاسنگ کے ہو جاتی تھی ۔ گویا یورپینوں اور دیسی عیسائیوں کی خاطر مسلم اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کر دیا گیا تھا ۔ اسی طرح پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فیصد تھی مگر ۱۷۵ نشستوں کے ایوان میں انھیں صرف ۸۶ نشستیں یعنی ۴۹٫۱۴ فیصد نشستیں دی گئی تھیں ۔ اس طرح سے مسلمانوں کے ان دونوں اہم اور اکثریت والے صوبوں میں ان کے نمائندوں کی تعداد کو اس حد تک گھٹا دیا گیا تھا کہ وہ کل نشستوں کی تعداد کے تناسب سے اقلیت میں آ گئے تھے ، اگرچہ ان دونوں صوبوں کی مجالس قانون ساز کے اندر ان کے نمائندوں کی تعداد ہر فرقہ کے نمائندوں کی جداگانہ تعداد کے مقابلہ میں زیادہ تھی ۔ بالفاظ دیگر اگر ان صوبوں کی مجالس قانون ساز میں ایک ایک فرقہ کے نمائندوں کی تعداد کا مقابلہ مسلم نمائندوں کی تعداد سے کیا جائے تو مسلمان اکثریت میں تھے ، لیکن مجموعی نشستوں کے لحاظ سے دیکھا جائے تو مسلمان اقلیت میں آ جاتے تھے ۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ انھیں ان دو صوبوں میں اپنی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں تاکہ نہ صرف وہ فرداً فرداً ایک ایک فرقہ کے مقابلہ میں بلکہ بحیثیت مجموعی پوری مقننہ میں اکثریت میں رہیں ۔ بالفاظ دیگر چونکہ ان دونوں صوبوں میں آبادی کے لحاظ سے وہ واقعی اکثریت رکھتے تھے اس لیے وہ اپنے تناسب سے مقننہ میں بھی آئینی اکثریت کا مطالبہ کر رہے تھے ۔ لیکن فرقہ وارانہ فیصلہ میں ان کے اس مطالبہ کو نہیں مانا گیا بلکہ ایک طرح سے انھیں اقلیت بنا دیا گیا ، اس لیے مسلمان اس فیصلہ سے ناراض تھے ۔

ہندو بھی فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) سے خوش نہ تھے ۔ ان کی ناراضگی کے اسباب یہ تھے ۔

۱- فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا ۔ اس طریقۂ انتخاب کو ہندو " متحدہ قومیت " کے خلاف سمجھتے تھے ۔ بنگال میں ہندوؤں کی آبادی کا تناسب (۴۴ء۸) فیصد تھا لیکن مقننہ میں انھیں صرف ۳۲ فیصد نشستیں دی گئی تھیں ۔

۲- پنجاب میں بھی ہندوؤں کی چند نشستوں کو پاسنگ کی غرض سے سکھوں کے حوالے کر دیا گیا تھا ۔ ہندوؤں کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ پنجاب و بنگال میں اقلیت ہونے کے لحاظ سے وہ پاسنگ کے مستحق ہیں اور اس اصول کے تحت انھیں اپنی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں ملنی چاہئے تھیں ، لیکن اس کے برعکس انھیں اس تناسب سے بھی کم نشستیں دی گئی تھیں ۔ ہندوؤں نے اس فیصلہ کے خلاف احتجاج کیا ۔ کانگریس کا رویہ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کے تعلق سے عجیب و غریب تھا ۔ اس نے گو مگو کا انداز اختیار کیا ۔ کانگریس نے طے کیا کہ وہ اس ایوارڈ کو نہ تو منظور کرتی ہے اور نہ مسترد ۔ جن کانگریسی ہندوؤں نے اس ایوارڈ کو ہندو قوم کے ساتھ ناانصافی کا مظہر قرار دیا تھا وہ کانگریس کی اس پالیسی سے سخت ناراض ہو گئے اور انھوں نے اپنی ایک جماعت " نیشنلسٹ پارٹی " کے نام سے قائم کر لی !

فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کی ان خرابیوں سے مسلمان بھی ناراض تھے اور ہندو بھی ، لیکن اس کی ایک خوبی یہ تھی کہ اس میں متعلقہ فریقین کی باہمی رضا مندی سے تبدیلی کی جا سکتی تھی اور ایسی تبدیلی ابھی ۲۶ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو " میثاق پونا " یعنی اونچی ذات کے ہندوؤں اور اچھوتوں کے باہمی سمجھوتہ کے مطابق کر دی گئی تھی ۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی ان شکایات اور اس واقعہ کی روشنی میں ، بعض مسلم زعماء کو بھی یہ خیال آیا کہ اگر ہندوؤں اور مسلمانوں میں کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس فیصلہ میں تبدیلی کی جا سکتی ہے اور اس طرح

ان دونوں قوموں کی شکایات کا ازالہ ہو سکتا ہے - چنانچہ اسی خیال کے پیش نظر مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالمجید سندھی صدر خلافت کمیٹی نے بمبئی میں پنڈت مدن موہن مالویہ اور مولانا ابوالکلام آزاد سے اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے متعلق گفتگو کی - اس ابتدائی گفتگو کے بعد مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے اجازت طلب کی کہ انھیں گاندھی جی سے یرودا جیل میں ملاقات کرنے دی جائے - لیکن وائسرائے نے انکار کر دیا اور انکار کی وجہ یہ بتائی کہ خود مسلمان لیڈر باہم متحد نہیں ہیں - وائسرائے کے اس جواب کے بعد مولانا شوکت علی نے مسلمان لیڈروں کو باہم متحد کرنے کی کوشش کی ، تاکہ اس کے بعد مسلمان متحدہ طور پر ہندوؤں سے کوئی سمجھوتہ کرکے فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) میں تبدیلی کرا سکیں - چنانچہ انھوں نے اور صدر خلافت کمیٹی عبدالمجید سندھی نے ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کو لکھنؤ میں مسلم زعماء کی ایک کانفرنس منعقد کی - اس کانفرنس میں متفقہ طور پر ایک قرارداد منظور ہوئی ، جس میں کہا گیا کہ مسلمان مسئلہ انتخاب پر اسی صورت میں غور کر سکتے ہیں ، جب کہ ان کے دیگر تیرہ(الف) مطالبات ہندو قوم تسلیم کر لے - اس کے علاوہ اس کانفرنس میں ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی کہ ہندوؤں اور سکھوں کے نمائندوں سے مل کر فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) میں ترمیم کے لیے کوئی متفقہ تجویز پیش کرے - اس کمیٹی نے ہندوؤں سکھوں کی ایک مشترکہ کانفرنس میں جو بعد میں یونٹی کانفرنس (unity conference) یا "اتحاد کانفرنس" کے نام سے موسوم ہوئی ، بمقام الہ آباد فرقہ وارانہ مسئلہ کا متفقہ حل دریافت کرنے کی کوشش کی - چنانچہ کئی دنوں کی محنت شاقہ اور بحث مباحثوں کے بعد اس کانفرنس میں حسب ذیل امور طے پائے -

---

(الف) یہاں اشارہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ان قراردادوں کی طرف ہے ، جن کی بنیاد پر قائد اعظم نے اپنے مشہور و معروف چودہ نکات مرتب کیے تھے ، جن کا مفصل تذکرہ ہم کر آئے ہیں ، تیرہ مطالبات سے مراد جداگانہ انتخاب کے علاوہ بقیہ نکات ہیں ، مصنف -

۱- ہندو اس بات پر رضا مند ہو گئے کہ مسلم اکثریت کے صوبوں یعنی پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو ۵۱ فیصد نشستیں دی جائیں ۔

۲- مرکز میں مسلمانوں کو ۳۳ فیصد نشستیں دی جائیں ۔

۳- طریقۂ انتخاب مشترکہ ہو ، مگر اس شرط کے ساتھ کہ صرف وہی اُمیدوار کامیاب قرار دیا جائے گا جس نے اپنے فرقہ کی بیس فیصد آراء حاصل کی ہوں ۔

اب مسئلہ یہ تھا کہ ان طے شدہ تجاویز پر عمل کیسے ہو ؟ اور ان تجاویز کی رو سے مسلمانوں کو مرکز میں جو زائد نشستیں دی جانی ہیں ، وہ کہاں سے دی جائیں ؟ پنجاب و بنگال میں فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کی رو سے تو مسلمانوں کو ۵۱ فیصد سے کم نشستیں ملی ہوئی تھیں اور اب ان مذکورہ بالا تجاویز کی رو سے ان دونوں صوبہ جات میں انھیں جو زائد نشستیں ملنی چاہئیں ، وہ کس سے لی جائیں ؟ ہندوؤں کا کہنا یہ تھا کہ مرکز میں ہم اپنی نشستیں کیوں کم کریں؟ پنجاب و بنگال میں ہم پاسنگ کے حقدار تھے ، لیکن ہماری نشستیں کم کرکے یورپینوں اور سکھوں کو زائد نشستیں دی گئیں ۔ ہم تو یہاں پہلے ہی سے گھاٹے میں ہیں ، مزید نقصان کیوں برداشت کریں ؟ جب معاملات اس نوبت پر پہنچے تو " اتحاد کانفرنس " نے یہ طے کیا کہ کلکتہ میں یورپینوں سے بات چیت کی جائے ۔ اِدھر یہ لوگ راضی نہیں ہوئے اور اُدھر ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو وزیر ہند سر سوئیل ہور نے اعلان کیا کہ

۱- مرکزی (وفاقی) مقننہ میں مسلمانوں کو ۳۳ $\frac{1}{3}$ فیصد نشستیں دی جائیں گی ۔

۲- صوبہ سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ بنا دیا جائے گا ۔

اس اعلان کے ساتھ ہی " اتحاد کانفرنس " کی کوششوں پر پانی پھر گیا اور ہندو مسلم اتحاد کا خیال پھر ایک مرتبہ دیوانے کا خواب ثابت ہوا !!

۱۷ نومبر سنہ ۱۹۳۲ع کو لندن میں تیسری گول میز کانفرنس شروع ہوئی - اس کے اراکین کی تعداد سابقہ دونوں گول میز کانفرنسوں کے مقابلہ میں نصف سے بھی کم تھی - کانگریس اس تیسری کانفرنس میں بھی پہلی کانفرنس کی طرح شریک نہیں ہوئی، کیونکہ وہ اب پھر محاذِ جنگ پر تھی ! اس تیسری گول میز کانفرنس میں مختلف سب کمیٹیوں کی رپورٹوں پر غور ہوا اور زیادہ تر مباحث وفاق اور اس سے متعلقہ امور پر ہوتے رہے - ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو یہ کانفرنس ختم ہو گئی اور برطانوی حکومت نے دستورِ جدید کا خاکہ قرطاس ابیض (White Paper) کے نام سے مارچ سنہ ۱۹۳۳ع ہی میں شائع کر دیا - اس کے بعد ۲۸ نومبر سنہ ۱۹۳۳ع کو قرطاس ابیض کی تجاویز پر غور کرنے اور ہندوستان کے آئندہ دستور کے متعلق سفارشات پیش کرنے کے لیے حکومت برطانیہ نے ایک کمیٹی مقرر کی - اس کمیٹی کے سولہ اراکین دارالعلوم (House of Commons) سے اور سولہ اراکین دارالامرا (House of Lords) سے لیے گئے تھے اور اس کے صدر لارڈ لن لتھگو تھے - اس کمیٹی کو مشترکہ پارلیمانی کمیٹی (Joint Parliamentary Committee) کہا جاتا ہے - اس کمیٹی نے برطانوی ہند اور ریاستوں کے مختلف نمائندوں کے بیانات وغیرہ سننے اور مختلف تجاویز پر غور کرنے کے بعد اپنی رپورٹ حکومت برطانیہ کے پاس پیش کر دی ، جس کو مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ کہا جاتا ہے - فروری سنہ ۱۹۳۵ع میں یہ رپورٹ ہندوستان کی مرکزی اسمبلی میں بھی بغرض بحث پیش ہوئی اور اسی رپورٹ کی سفارشات کی بنیاد پر ہندوستان کے دستور جدید کا مسودہ جون سنہ ۱۹۳۵ع میں مرتب ہوا ، جس کو اگست سنہ ۱۹۳۵ع برطانوی پارلیمنٹ نے شرف منظوری عطا کرکے قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع (Government of India Act, 1935) بنا دیا !

یہاں تک تو زیرِ تبصرہ دور (آغاز سنہ ۱۹۳۱ع تا اختتام سنہ ۱۹۳۵) میں ہم نے ہندو مسلم کشمکش کی داستان اور ملک کے دستوری ارتقاء و عام سیاسی حالات کی کہانی سنائی ہے - اب ذرا اس دور میں مسلمانوں کی اپنی سیاسی جماعتوں کا قصہ بھی سن لیجئے -

بتایا جا چکا ہے کہ جولائی سنہ ۱۹۲۹ء میں کانگریسی نقطۂ خیال کے مسلمانوں نے مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نام سے اپنی ایک جماعت بنا لی تھی - زیرِ تبصرہ دور میں بھی اس کانفرنس کے مختلف جلسے ہوتے رہے، جس کا ذکر اپنے مقام پر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے - یہ جماعت بہرحال کانگریس کی ساختہ پرداختہ تھی - اس کے ایک نہایت ممتاز لیڈر ڈاکٹر مختار احمد انصاری تھے - یہ بڑی دلکش قد آور شخصیت کے مالک تھے - اپنے ایثار، خلوص اور جرأتِ اظہار کی بدولت کانگریس کے مختلف حلقوں میں ان کا بڑا اثر تھا - گاندھی اور نہرو بھی ان کا لوہا مانتے تھے - وہ خلوصِ دل سے ہندو مسلم اتحاد اور متحدہ قومیت کے قائل تھے اور مختلف مواقع پر انھوں نے اس کے لیے مخلصانہ کوششیں کی تھیں، لیکن انھیں کامیابی نہ ہوئی - بالآخر جب فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کا اعلان ہو گیا تو اس کو انھوں نے قبول کر لیا، البتہ وہ یہ ضرور چاہتے تھے کہ ہندو مسلم باہمی راضی نامہ کے ذریعہ سے اس میں مناسب تبدیلی کی جائے، اس کے لیے انھوں نے اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء میں کوششیں بھی کیں، تاہم کسی سمجھوتہ کی عدم موجودگی میں وہ اسی فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کو غنیمت سمجھتے تھے اور اس کے حامی تھے - چنانچہ سنہ ۱۹۳۳ء کے وسط میں جب آل انڈیا کانگریس کمیٹی فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کی مخالفت کرنے والی تھی، تو ڈاکٹر انصاری اس وقت ہندوستان سے دور وائنا میں تھے - وہاں سے انھوں نے گاندھی جی کو تار دیا کہ کمیونل اوارڈ کا بدل صرف ایک متفقہ راضی نامہ ہی ہو سکتا ہے- اگر اس راضی نامہ کے بغیر کمیونل اوارڈ کو مسترد کر دیا گیا تو وہ کانگریس سے علیحدہ ہو جائیں گے[۳۱] - بہرحال ڈاکٹر انصاری اور ان ہی کی طرح، گنے چنے اشخاص کے سوا مسلم نیشنلسٹ کانفرنس میں سب کانگریس کے ہوا خواہ جمع تھے - یہ لوگ کانگریس میں شریک تھے اور کانگریس کی ہر تحریک کا ساتھ دے رہے تھے - چنانچہ تحریک سول نافرمانی میں بھی ان لوگوں نے حصہ لیا -

---

۳۱- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۳۰۳ -

جمیعۃ العلماءِ ہند دہلی مسلمانوں کی ایک دوسری انجمن تھی اور جیسا کہ ہم گذشتہ صفحات میں ذکر کر آئے ہیں، یہ انجمن بھی مئی سنہ ۱۹۳۰ع سے کانگریس کا ساتھ دے رہی تھی - اس دور میں بھی اس نے کانگریس کی ہمنوائی کی - چنانچہ اس کے بعض کارکنوں نے سنہ ۱۹۳۰ع اور اس کے بعد سنہ ۱۹۳۲ع کی کانگریس تحریک سول نافرمانی میں حصہ لیا -

اگرچہ یہ دونوں جماعتیں ——— مسلم نیشنلسٹ کانفرنس اور جمیعۃ العلماءِ ہند دہلی ——— بحیثیت مجموعی اور بڑی حد تک مسٹر جناح کے تیرہ نکات کی قائل تھیں، تاہم وہ مخلوط انتخاب کی حامی تھیں اور اسی لیے وہ مسلمانوں کے سوادِ اعظم سے کٹی ہوئی اور کانگریس کا دم چھلا بنی ہوئی تھیں!

مجلس خلافت، مسلمانوں کی پرانی انجمن تھی اور تحریکِ ترکِ تعاون و تحریک خلافت کے زمانہ (سنہ ۱۹۲۰ع تا سنہ ۱۹۲۴ع) میں تو صرف اسی کے لیڈروں کے ہاتھ میں مسلمانوں کی قیادت کی باگ ڈور تھی، لیکن سنہ ۱۹۲۴ع میں الغائے خلافت اور جنوری سنہ ۱۹۳۱ع میں مولانا محمد علی کی رحلت کے بعد یہ انجمن اپنا اثر و نفوذ کھو چکی تھی - تاہم مولانا شوکت علی کے دم سے اس کا بھرم قائم تھا اور زیرِ تبصرہ دور میں بھی زیادہ تر مولانا شوکت علی کی بدولت، اس کا نام سننے میں آ جاتا تھا - یہ انجمن مسٹر جناح کے چودہ نکات کی حامی اور مسلم حقوق کی محافظ تھی اور ساتھ ہی ساتھ ہندو مسلم اتحاد یا فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے لیے کوشاں تھی - دراصل اس پورے دور میں اس کی کارگذاریوں کا سہرا صرف مولانا شوکت علی کی فعال اور متحرک قیادت کے سر ہے -

آل پارٹیز مسلم کانفرنس جس کو اب آل انڈیا مسلم کانفرنس کہا جانے لگا تھا جیسا کہ گذشتہ باب میں تفصیل سے بیان کیا جا چکا ہے، جنوری سنہ ۱۹۲۹ع میں عالم وجود میں آئی تھی - وہ صرف ایک وقتی کانفرنس ہی نہ تھی بلکہ اس کو ایک منظم ادارہ کی شکل سنہ ۱۹۲۹ع ہی میں دے دی گئی تھی اور اس کے بعد سے اس نے ملک کی سیاست اور خصوصاً مسلم سیاست میں بڑا قابلِ قدر کردار ادا کیا - گذشتہ دور

نی سنہ ۱۹۲۹ع و ۱۹۳۰ع) میں اس نے جو کارنامے انجام دئے ان کا
ٔر سابقہ باب میں آ چکا ہے ۔ اس دور میں بھی یہ ادارہ نہایت کارگذار
۔ اس کے سالانہ اجلاس تقریباً ہر سال ہوتے رہے ، مفید اور مؤثر
ردادیں پاس ہوتی رہیں ۔ گول میز کانفرنس کے مواقع پر اسی ادارہ نے
لم مندوبین کانفرنس کو ہدایات و مشورے دئے اور مسلم رائے عامہ
مؤثر نمائندگی کی ۔ اس ادارہ کی کارگذاریوں کی تفصیلات آئندہ صفحات
، ، اقبال کی سیاسی زندگی کے اس دور کے واقعات کے ضمن میں مناسب
قعہ پر بیان کی جائیں گی ، کیونکہ اس دور میں علامہ مرحوم اسی
رہ سے منسلک رہے تھے اور اس کی کاروائیوں میں انہوں نے بڑھ چڑھ
حصہ لیا تھا ۔ یہ ادارہ ظاہر ہے کہ مسلم حقوق کا محافظ ، جناح کے
دہ نکات کا زبردست حامی اور اس دور میں مسلمانوں کے سوادِ اعظم کا
ئندہ ادارہ تھا ۔ سنہ ۱۹۳۴ع سے اس میں اضمحلال کے آثار پیدا ہو گئے
اور سنہ ۱۹۳۵ع میں یہ ادارہ سیاسی منظر سے غائب ہو گیا ۔ اس کی
ں وجوہ تھیں ۔ ایک وجہ یہ تھی کہ جس بڑے اور اہم مقصد کی خاطر
ادارہ عالمِ وجود میں لایا گیا تھا ، وہ مقصد حاصل ہو چکا تھا ۔ بیان
ا جا چکا ہے کہ یہ ادارہ نہرو رپورٹ کی مخالفت کی بناء پر وجود میں
تھا اور اس کا مقصد یہ تھا کہ مستقبل کے دستور میں مسلمانوں کے
ـف کا تعین اور ان کے حقوق کا تحفظ کیا جائے جس کا اظہار اس کی
رداد مورخہ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع سے ہوتا تھا ۔ اگست سنہ ۱۹۳۲ع
، وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) ، دسمبر سنہ ۱۹۳۲ع
، وزیر ہند کی طرف سے مرکزی مقننہ کی مسلم نشستوں اور صوبہ سندھ
علیحدگی کے بارے میں اعلان اور مارچ سنہ ۱۹۳۳ع میں قرطاس ابیض
اشاعت کے بعد مسلم کانفرنس کے اغراض و مقاصد تقریباً پورے ہو چکے
، ۔ گویا وہ مہم سر کر لی گئی تھی ۔ جس کے لیے یہ ادارہ بنایا گیا
۔ غالباً اسی لیے سنہ ۱۹۳۴ع میں اس کی طرف سے سرد مہری برتی
نے لگی ۔ دوسری وجہ یہ تھی کہ یہ ادارہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں
ملا کر بنایا گیا تھا ۔ اسی لیے ابتداء میں اس کا نام آل پارٹیز مسلم
مرنس تھا ۔ اب جب کہ اس کے اغراض و مقاصد پورے ہو چکے تھے ،

تو ظاہر ہے کہ اس میں شریک افراد کو اپنی اپنی جماعتوں میں زیادہ کشش محسوس ہونے لگی اور اسی کشش نے ان کی اس ادارہ سے وابستگی کو ختم کر دیا ۔ تیسری اہم وجہ یہ تھی کہ سر فضل حسین نے جو اپریل سے سنہ ۱۹۳۰ء تک وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن تھے، اس ادارہ کو حکومت کے چشم و ابرو کے اشاروں کو پیش نظر رکھتے ہوئے ، اپنے حسبِ مرضی چلانا چاہا ۔ اس ادارہ میں صوبائی مجالسِ قانون ساز اور مرکزی مقننہ کے اراکین بھی شریک تھے ، جن میں سے کچھ ان کے آلہ کار تھے ۔ آخری زمانہ میں ان کے ذریعہ سر فضل کی مداخلتیں حد سے زیادہ بڑھ گئی تھیں ۔ حریت پسند اراکینِ مسلم کانفرنس کو یہ بات ناگوار ہوئی اور انھوں نے اس سے علیحدگی اختیار کر لی[۳۲] ۔

مسلم یونٹی بورڈ ، اس نام سے مسلمانوں کی ایک جماعت مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں بنائی گئی ۔ یہ جماعت مسلم کانفرنس ، جمیعۃ العلماءٔ ہند دہلی اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے بعض اراکین پر مشتمل تھی ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کے متعلق کانگریس نے گومگو کی پالیسی اختیار کی تھی ۔ کانگریس میں شریک بعض مسلمانوں کو اس پالیسی سے اختلاف تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ کانگریس اس فیصلہ کو قبول کر لے ۔ گویا وہ کانگریسی ہونے کے باوجود فرقہ وارانہ فیصلہ کے مؤید تھے ۔ ان لوگوں نے جب کانگریس کا یہ رویہ دیکھا تو انھوں نے کانگریس سے علیحدگی اختیار نہیں کی بلکہ کانگریس میں رہتے ہوئے ایک نئے ادارہ کی تشکیل کی ۔ مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نام سے ان کانگریسی مسلمانوں کی ایک جماعت پہلے ہی سے موجود تھی لیکن اس پر کانگریس کی گہری چھاپ لگی ہوئی تھی ۔ پھر اس میں وہ مسلمان بھی شریک تھے جو کمیونل اوراڈ کے تعلق سے بھی کانگریس کی ہمنوائی کر رہے تھے ۔ نیشنلسٹ مسلمانوں کا وہ گروپ جو کمیونل اوارڈ کا حامی تھا ، یہ چاہتا تھا کہ وہ

۳۲- "پاکستان ناگزیر" تھا ، از حسن ریاض صاحب اشاعت دوم اگست ۱۹۷۰ء مطبوعہ کراچی ، ص ۱۶۷ -

کانگریس سے بھی تعلق برقرار رکھے اور ساتھ ہی کمیونل اوارڈ کی حامی دوسری جماعتوں مثلاً مسلم کانفرنس سے بھی ہاتھ ملائے ۔ مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے نام سے وہ یہ کھیل نہیں کھیل سکتے تھے ۔ اسی لیے انہوں نے مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں راجہ سلیم پور کی صدارت میں بمقام لکھنؤ ایک کانفرنس منعقد کی ، جس میں مسلم کانفرنس ، مسلم نیشنلسٹ کانفرنس اور جمیعۃ العلماء ہند کے بعض اراکین نے شرکت کی[۳۳]۔ اسی کانفرنس میں "مسلم یونٹی بورڈ" کے نام سے ایک جماعت بنائی گئی ، اس کے روحِ رواں چودھری خلیق الزمان تھے ۔ مقصد یہ تھا کہ آنے والے انتخابات میں اس جماعت کے ٹکٹ پر انتخابات لڑے جائیں ۔ فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کے تحت جدا گانہ انتخابات کا طریقہ برقرار رکھا گیا تھا ۔ اسی لیے نیشنلسٹ مسلمان کانگریس کے ٹکٹ پر انتخابات لڑنے اور جیتنے کی ہمت نہیں کر سکتے تھے کیونکہ عامۃ المسلمین ، اس پورے دور میں کانگریس کے حقیقی ہندوانہ روپ کو بے نقاب دیکھ کر اس سے متنفر ہو چکے تھے ۔ لہذا نیشنلسٹ (قوم پرست) مسلمانوں نے مسلم یونٹی بورڈ کی اوٹ میں مسلم کانفرنس والے " فرقہ پرست" مسلمانوں کی مدد سے انتخابات جیتنے کی ایک کوشش کی تھی ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۴ء میں مرکزی اسمبلی کے جو انتخابات ہوئے ۔ اس میں مسلم یونٹی بورڈ کے نامزد بارہ تیرہ مسلمان کامیاب بھی ہوئے تھے[۳۴]۔ اس کے بعد ، اس جماعت کا ارادہ دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء کے تحت منعقد ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کا تھا ، گویا یہ جماعت محض انتخابات میں حصہ لینے کے لیے عالم وجود میں لائی گئی تھی ۔ اس کے ذہنی پس منظر میں کوئی سیاسی فکر نہ تھی اور اس کے پیش نظر مسلمانوں کے لیے کوئی تعمیری لائحہ عمل نہ تھا ۔

آل انڈیا مسلم لیگ مسلمانوں کی بہت ہی قدیم اور نمایندہ انجمن تھی ،

۳۳۔ " شاہراہ پاکستان " از چودھری خلیق الزمان اشاعت اول اکتوبر ۱۹۶۷ء مطبوعہ کراچی ، ص ۵۳۹ ۔

۳۴۔ " شاہراہ پاکستان " از چودھری خلیق الزمان اشاعت اول اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ء مطبوعہ کراچی ، ص ۵۸۸ ۔

لیکن جیسا کہ گذشتہ باب میں وضاحت کی جا چکی ہے ، نہرو رپورٹ کے مناقشہ نے اس کو بڑا دھکا لگایا تھا اور لیڈروں کے باہمی اختلافات کے باعث اس کی ساکھ کو بڑا صدمہ پہنچا تھا ۔ اگرچہ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں جناح کے چودہ نکات اور دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں علامہ اقبال کی صدارت نے اس کو سنبھالا دیا ، تاہم زیر تبصرہ دور (سنہ ۱۹۳۱ء تا ۱۹۳۵ء) میں اس کی حالت گو مگوں ہی رہی ۔ مسلم لیگ کی روح رواں قائد اعظم جناح تھے اور وہی ایک عرصہ سے سنہ ۱۹۳۱ء تک اس کے مستقل صدر بھی تھے ۔ تجاویز دہلی (مارچ سنہ ۱۹۲۷ء) کے بعد ۱۹۳۱ء تک جو سیاسی حالات ملک میں رونما ہوئے اور مسلم لیگ کے اندر جو دھڑے بندیاں ہوئیں ان سے دل برداشتہ ہو کر مسٹر جناح پہلی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جو لندن گئے تو بس وہیں کے ہو رہے ۔ انہوں نے مستقلاً لندن ہی میں قیام کا ارادہ کر لیا تھا ، اسی لیے ان کی جگہ سر محمد شفیع کو لیگ کا مستقل صدر بنا دیا گیا ۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں مسلم لیگ کا سالانہ جلسہ تو ہوا ، مگر سنہ ۱۹۳۲ء میں کوئی جلسہ ہی نہ ہو سکا ۔ اسی سال سر محمد شفیع کا بھی انتقال ہو گیا ۔ سنہ ۱۹۳۳ء میں لیگ کی صدارت کے بارے میں بدنما جھگڑے پیدا ہو گئے اور لیگ پھر ایک مرتبہ دو جماعتوں میں منقسم ہو گئی ۔ ایک جماعت نے اپنا سالانہ اجلاس ۲۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۳ء کو کلکتہ میں زیر صدارت میاں عبدالعزیز منعقد کیا اور دوسری جماعت کا سالانہ جلسہ ۲۵ نومبر کو دہلی میں منعقد ہوا ، جس کی صدارت حافظ حسین نے کی ۔ لیکن دونوں جماعتوں نے فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) کو بحالات موجودہ قبول کرنے کا فیصلہ کیا ۔ ہندو مہاسبھا نے جو اس ایوارڈ کی سخت مخالفت کر رہی تھی ، اس فیصلہ پر اپنے غم و غصہ کا اظہار کیا ۔ بالآخر مارچ سنہ ۱۹۳۴ء میں مسٹر جناح اور سر آغا خان کی مساعی سے مسلم لیگ کے یہ اندرونی اختلافات ختم ہو گئے ۔ قائد اعظم محمد علی جناح اب پھر ہندوستان واپس آ گئے اور انہوں نے دوبارہ لیگ کی عنان قیادت سنبھال لی ۔ اپریل سنہ ۱۹۳۴ء میں لیگ کی کونسل کا اجلاس ان ہی کی زیر صدارت منعقد ہوا ، جس میں باہمی اتحاد کی باتیں تو بہت ہوئیں مگر حقیقی طور پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اتحاد نہ ہو سکا ۔

اسی سال (۱۹۳۴ء) مرکزی اسمبلی کے انتخابات عمل میں آئے تو آل انڈیا مسلم کانفرنس کے کارکنوں نے مسلم یونٹی بورڈ کے ٹکٹ پر انتخابات میں حصہ لیا اور مسلم لیگ پارلیمانی مجلس اس کے مقابلہ میں ناکام رہی - اسی زمانہ یعنی اکتوبر سنہ ۱۹۳۴ء میں بمبئی کے مسلمانوں نے مسٹر جناح کو آزاد (انڈ ینپڈنٹ) امیدوار کی حیثیت سے مرکزی اسمبلی کے لیے اپنا نمایندہ منتخب کیا تھا - مسٹر جناح نے یونٹی بورڈ کے منتخب شدہ مسلم اراکین اور دوسرے مسلم اراکین اسمبلی کو ملا کر ایک انڈیپنڈنٹ پارٹی بنائی اور اس کے ذریعہ مرکزی اسمبلی میں بڑی " فتوحات " حاصل کیں ، اور اپنی بے مثال پارلیمانی قابلیت بہترین دستوری فہم و فراست اور اعلیٰ ترین سیاسی قیادت کا لوہا سب سے منوا لیا - ان کی انڈ ینپڈنٹ پارٹی کو اسمبلی میں اکثریت حاصل نہ تھی - اس کے کل اراکین کی تعداد ۲۲ تھی - کانگریس پارٹی اس سے بڑی تھی - اس کے ممبروں کی تعداد ۴۴ تھی اور نیشنلسٹ پارٹی جس کے اراکین کی تعداد ۱۱ تھی ، کانگریس کے ساتھ ملی ہوئی تھی اس کے مقابلہ میں سرکاری پارٹی ۵ اراکین پر مشتمل تھی - مسٹر جناح نے اپنی پارٹی کی پوزیشن کچھ اس طرح بنائی تھی کہ کانگریس اور حکومت کی صورت میں "توازن قوت" اس پارٹی کے ہاتھ میں رہتا تھا اور وہ اپنا وزن جس پلڑے میں ڈال دیں ، وہی وزنی ہو جاتا تھا - انھوں نے اکثر اہم مواقع پر کانگریس پارٹی کے ساتھ مل کر حکومت کو شکستیں دیں ، جس سے حکومت بوکھلا اٹھی اور بعض مواقع پر کانگریس پارٹی کو بھی نیچا دکھایا - ایک بڑا ہی نازک موقع اسمبلی کے پہلے سیشن میں پیش آیا - ۷ فروری سنہ ۱۹۳۵ء کو مشترکہ پارلیمانی کمیٹی (جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی) کی رپورٹ اسمبلی میں پیش ہوئی - یہ بہت ہی اہم رپورٹ تھی - اسی کی بنیاد پر ملک کا آئندہ دستور مرتب ہونے والا تھا اور فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل اوارڈ) اس رپورٹ کا ایک اہم جز تھا - رپورٹ کو اسمبلی میں یا تو منظور کرنا تھا یا مسترد - اگر رپورٹ منظور کر لی جاتی تو صوبوں اور مرکز سے متعلق اس کی سفارشات پر بھی مہر توثیق ثبت ہو جاتی اور اگر مسترد کر دی جاتی تو فرقہ وارانہ فیصلہ بھی مسترد ہو جاتا تھا - مسٹر جناح فرقہ وارانہ فیصلہ (کمیونل ایوارڈ) کے حامی اور مرکز و

صوبوں کے متعلق رپورٹ کی پیش کردہ سفارشات کے مخالف تھے کیونکہ ان سفارشارت میں ان کے نقطہ نظر سے اختیارات و اقتدار کی صرف پرچھائیں تھیں ، حقیقی تصویر نہ تھی ۔ اس موقع پر جناح کی پارلیانی قابلیت اور سیاسی دانائی و فراست کے جوہر کھلے ۔ انہوں نے اس رپورٹ سے متعلق ایک قرارداد پیش کی جس میں رپورٹ کو تین حصوں ، (۱) کمیونل ایوارڈ (۲) صوبائی اسکیم ، (۳) مرکزی اسکیم میں تقسیم کیا گیا تھا ۔ انہوں نے یہ قرارداد پیش کرتے ہوئے معرکۃ الاراٗ تقریر کی اور پہلے حصہ کو یعنی ایوارڈ کو سرکاری پارٹی کے ساتھ مل کر منظور کرا لیا ۔ دوسرے حصہ یعنی صوبائی اسکیم کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس کو درست کیا جائے اور اس میں ترمیم کی جائے ۔ تیسرے حصہ کے متعلق انھوں نے کہا کہ اس کو بالکلیہ رد کر دیا جائے ۔ انھوں نے ان دونوں حصوں کو کانگریس کے ساتھ مل کر ایوان سے منظور کرا لیا ! یہ جناح کی بہت بڑی کامیابی تھی ، کانگریس کے مقابلہ میں بھی اور حکومت کے مقابلہ میں بھی ! !

الغرض یہ کامیابیاں جناح کی اپنی کامیابیاں تھیں ، مسلم لیگ کا ان سے تعلق نہ تھا ۔ اس کی حالت تو مریض کی سی تھی ۔ گو مسیحا آ چکا تھا ، مگر وہ بستر بیماری پر پڑی ابھی تک کراہ رہی تھی ! !

یہ پانچ سالہ دور (سنہ ۱۹۳۱ع تا سنہ ۱۹۳۶ع) کی سیاسی تصویر ہے اس تصویر کے اہم اور نمایاں خد و خال یہ ہیں ۔

- گاندھی ارون معاہدہ سے اس دور کا آغاز ہوا گویا حکومت اور کانگریس میں جنگ کی بجائے صلح ہو گئی گو یہ صلح عارضی ثابت ہوئی ۔
- ہندوستان کے دستوری و سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لیے لندن میں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس ہوئی ۔ ان میں سے دوسری بہت اہم تھی کیونکہ اس میں ہندوستان کے تمام سیاسی مکاتیب فکر کی نمایندگی ہوئی اور چوٹی کے لیڈر اس میں شریک ہوئے ۔
- ہندوستان کی بنیادی سیاسی گتھی ـــــ ہندو مسلم اتحاد ـــــ

کو سلجھانے کی اس دور میں تین مرتبہ کوششیں کی گئیں ۔ پہلی بھوپال کانفرنس میں ، دوسری خود گول میز کانفرنس میں اور تیسری اس کے بعد الہ آباد یونٹی کانفرنس میں ، لیکن یہ ساری کوششیں ناکام ہوئیں ۔ گول میز کانفرنس میں اس گتھی کو سلجھانے کی کوششیں یوں اہم تھیں کہ یہ کوششیں بہت ہی اونچی سطح پر ہوئی تھیں اور ان میں کانگریس کے ''مہاتما'' نے خود حصہ لیا تھا ، لیکن اس موقع پر انہوں نے جس شتر گربگی کا مظاہرہ کیا اس نے کانگریس کی ''آتما'' کو دنیا کے سامنے ننگا کر دیا ۔

- ہندوستان کی اس بنیادی سیاسی گتھی کو سلجھانے میں ناکامی کے بعد اس کو سمندر پار کے ایک ثالث کے سپرد کر دیا گیا ، جو برطانیہ عظمیٰ کا وزیر اعظم تھا ۔ اس ثالث نے اسی دور میں اس عظیم دستوری مسئلہ کا تصفیہ کر دیا ۔ جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایک عرصہ سے مابہ النزاع چلا آ رہا تھا ، اور یہ ثالثی فیصلہ کمیونل ایوارڈ کے نام سے موسوم ہوا ، جس کو سب فریقوں نے بادلِ نخواستہ ہی سہی ، تسلیم کر لیا ! !
- اسی زمانہ میں برصغیرِ ہند کا وہ آئین و دستور تیار ہوا جس کے لیے گذشتہ دس سال سے متواتر کوششیں ہو رہی تھیں ۔ اور یہی وہ دستورِ حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء تھا جس کی قسمت میں آخری آئین ہند ساختۂ برطانیہ ہونا لکھا تھا ! !

آئیے اب دیکھیں اس دور میں علامہ اقبال کی کیا سیاسی سرگرمیاں رہیں ۔

ہندو مسلم مفاہمت ، اقبال گاندھی مذاکرات

بیان کیا جا چکا ہے کہ گاندھی اروِن معاہدہ (مارچ سنہ ۱۹۳۱ء) کے بعد بحیثیت واحد نمایندۂ کانگریس گول میز کانفرنس میں گاندھی جی کی شرکت کا فیصلہ ہو چکا تھا ۔ وہ بجا طور پر محسوس کرتے تھے کہ ہندو مسلم سمجھوتہ کا سوال ہی ایک ایسا سوال ہے جس پر ان کی اور گول میز کانفرنس کی کامیابی کا انحصار ہے

اسی لیے انہوں نے اپریل میں مسلم کانفرنس والوں سے ملاقات اور گفتگو کی۔ اقبال مسلم کانفرنس کے بانیوں اور اس کے نمایاں لیڈروں میں سے تھے۔ وہ بھی اس صحبت میں موجود تھے۔ گفتگو مسلم کانفرنس کے مطالبات اور خصوصاً مطالبۂ جدا گانہ انتخاب پر ہوئی۔ گاندھی جی نے ان مطالبات کی معقولیت نا معقولیت پر بحث کرنے کے بجائے اعتراض یہ کیا کہ یہ مطالبات مسلمانوں کے متحدہ و متفقہ مطالبات نہیں ہیں۔ ان کا اشارہ مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) کانفرنس کی طرف تھا، جس کا ایک جلسہ سر علی امام کی صدارت میں اسی مہینہ (اپریل) میں ہوا تھا۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس جلسہ میں جو قرار داد منظور کی گئی تھی۔ اس میں مسلم کانفرنس ہی کے تقریباً تمام مطالبات کا اعادہ کیا گیا تھا لیکن جدا گانہ انتخاب کی مخالفت کی گئی تھی۔ گاندھی جی نے اس گفتگو میں اسی "اختلاف" کو اچھالا تھا علامہ اقبال نے گاندھی جی کے اس اعتراض کا نہایت معقول لیکن ساتھ ہی کھرا جواب دیا۔ انہوں نے کہا۔

> "ہندوؤں کا ایک طبقہ جدا گانہ انتخاب مانگتا ہے دوسرا مخلوط انتخاب کا حامی اور تیسرا سوشل ڈیماکریسی (Social Democracy) چاہتا ہے۔ ہندوؤں میں اس قدر اختلاف ہے تو مسلمانوں کے معمولی اختلاف کو بہانہ بنا لینا اگر منافقت نہیں تو کیا ہے[۳۵]"

مسلم نیشلسٹ (قوم پرست) کانفرنس پر اقبال کی تنقید۔

کانگریسی ہندوؤں نے یہ وطیرہ اختیار کر رکھا تھا کہ ہندو مسلم اتحاد کی جب کبھی کوئی بات ہوتی تو ان کی تان جدا گانہ انتخاب کی مخالفت پر ٹوٹتی تھی۔ پھر مسلم نیشلسٹ (قوم پرست) کانفرنس ان کا آلۂ کار بنی ہوئی تھی۔ اس کے لیڈروں کو وہ مسلمانوں کے نمایندے اور اس کی قراردادوں کو وہ مسلم رائے عامہ کا عکس قرار دیتے تھے!۔۔۔ ابھی اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں لکھنو میں "مسلم قوم پرستوں" کا جو جلسہ ہوا تھا، کانگریسی اخباروں نے اس کا بڑا ڈھنڈورا پیٹا تھا۔ ضرورت تھی کہ مسلم رائے عامہ کو اس

۳۵- روزنامہ انقلاب، لاہور ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع۔

پروپیگنڈے سے بچانے کی تدبیریں کی جائیں ، اور اس نمایندگی کی حقیقت پر سے پردہ اٹھایا جائے ۔ چنانچہ اسی غرض سے لاہور میں عوامی جلسوں کا سلسلہ شروع ہوا ، جس کا افتتاح علامہ اقبال نے ۲ مئی سنہ ۱۹۳۱ع کو کیا ۔ اس افتتاحی جلسہ میں علامہ مرحوم نے تقریر کرتے ہوئے مسلم قوم پرستوں کی لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد پر تنقید کی ، مخالفین جدا گانہ انتخاب کی قلعی کھولی اور قوم پرستی کے نتائج سے نوجوانوں کو آگاہ کیا ۔

انہوں نے لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ۔

"آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد اور لکھنؤ کانفرنس (جو دو ہفتوں کی پیدائش ہے) کی قرارداد کی تیرہ دفعات ایک ہی ہیں ، صرف چودھویں دفعہ میں اختلاف ہے[۳۶]"

اس چودھویں دفعہ سے ان کی مراد لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد کا وہ جز تھا جس میں مخلوط انتخاب کی تائید کی گئی تھی ، اس جز پر علامہ اقبال کی تنقید ملاحظہ ہو ۔

" وہ (نیشنلسٹ مسلمان) مخلوط انتخاب کو بالغوں کے حق رائے دہی سے مشروط کرتے ہیں ۔ مولانا ظفر علی خان دس سال کے لیے جدا گانہ انتخاب کے حامی ہیں اور اس کے بعد بھی بالغوں کی حق رائے دہی کی شرط لگاتے ہیں اور زمیندار کی اشاعت دیروزہ میں لکھتے ہیں کہ بالغوں کا حق رائے دہی ابھی ممکن ھی نہیں ..... جدا گانہ انتخاب سے پہلے مخلوط انتخاب کا کافی تجربہ ہو چکا ہے ۔ سر علی امام جو لکھنو کانفرنس کے صدر تھے ، اس تجربے کی بناء پر ، اس وفد میں لارڈ منٹو کے پاس گئے تھے ۔ جس نے مسلمانوں کی حالت زار کا حوالہ دے کر جدا گانہ انتخاب کا مطالبہ کیا تھا ۔ لارڈ منٹو ان کے دلائل سے متوثر ہو کر جداگانہ انتخاب نافذ کرنے پر تیار ہو گئے[۳۷]......

۳۶- روزنامہ انقلاب ، لاہور ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -

۳۷- روزنامہ انقلاب ، لاہور مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -

واضح رہے کہ مولانا ظفر علی خاں اس زمانے میں مخلوط انتخاب کے حامی تھے لیکن ان کا کہنا یہ تھا کہ اگر بالغ رائے دہی کا اصول نافذ کر دیا جائے تو پھر جداگانہ انتخاب کے بجائے مخلوط انتخاب کو قبول کر لینا چاہیے - علامہ اقبال یہاں مولانا کے اسی نقطۂ نظر کو بیان کر رہے ہیں پھر ساتھ ہی وہ مولانا کی اس تجویز کا حوالہ بھی دے رہے ہیں جس میں انھوں نے کہا تھا کہ بالغ رائے دہی کا اصول فی الوقت نافذ نہیں ہو سکتا اس کے یہ معنے ہوئے کہ مخلوط انتخاب بھی اس وقت نافذ نہیں ہو سکتا بالفاظِ دیگر وہ اس وقت کے حالات میں جداگانہ انتخاب کے حامی تھے - یہ تو ایک حامیٔ مخلوط انتخاب کا طرزِ فکر تھا - علامہ نے مخلوط انتخاب کے ایک دوسرے بڑے موئید اور مسلم قوم پرست کانفرنس لکھنؤ کے صدر سر علی امام کے طرز عمل پر سے بھی یہ کہہ کر پردہ اٹھایا کہ وہ خود بھی ایک زمانہ میں جداگانہ انتخاب کے حامی ہی نہیں وکیل تھے - جس وفد کا ذکر علامہ نے یہاں کیا ہے ، وہ مسلمانوں کا وہ وفد تھا ، جس نے آغا خان کی سرکردگی میں سنہ ۱۹۰۶ع میں لارڈ منٹو ، گورنر جنرل ہند کی خدمت میں وہ مشہورِ زمانہ یاد داشت پیش کی تھی جس میں پہلی مرتبہ جداگانہ انتخاب کا پر زور مطالبہ کیا گیا تھا - اس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں - یہ ایک تاریخی واقعہ ہے کہ اس وفد کے ایک نمایاں رکن سر علی امام بھی تھے[۳۸] ، لیکن اب سنہ ۱۹۳۱ع میں یہی سر علی امام جداگانہ انتخاب کی مخالفت ، مخلوط انتخاب کی حمایت اور قوم پرست کانفرنس کی صدارت فرما رہے تھے ! !

۳۸- ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی کتاب (Pakistan or Partition of India) کے ص ۴۲۸ پر اس یاد داشت کا پورا متن درج کیا ہے ، جس کو مسلم وفد نے یکم اکتوبر سنہ ۱۹۰۶ع میں لارڈ منٹو کے سامنے پیش کیا تھا اور ص ۴۲۹ پر اراکین مسلم وفد کے نام دیئے ہیں - ان میں سر علی امام کا نام بھی ہے ، یاد داشت کا یہ متن اور اراکین وفد کے یہ نام ڈاکٹر امبیڈکر نے روز نامہ انڈین ڈیلی ٹیلیگراف لکھنو ، مورخہ ۳ اکتوبر ۱۹۰۶ع سے اخذ کیے ہیں -

جداگانہ انتخاب کے ان " مسلم " مخالفین نے اپنا نام "قوم پرست" (نیشنلسٹ) رکھ لیا تھا ۔ علامہ نے ان کی " قوم پرستی" پر سے بھی پردہ اٹھایا اور اس کا کریہہ چہرہ اس طرح دکھایا ۔

" پہلے معلوم کرنا چاہیے کہ " قوم پرستی"، کا مفہوم کیا ہے ۔ نیشنلزم کا جو تجربہ یورپ میں ہوا ، اس کا نتیجہ بے دینی اور لا مذہبی کے سوا کچھ نہیں نکلا ۔ وہی ہندوستان میں ہو رہا ہے ۔ رسول عربی (صلعم) کا وہ حکم موجود ہے ، جس میں فرمایا گیا تھا کہ آج میں نسل ، ذات پات اور برادری کے تمام امتیازات کو پاؤں کے نیچے کچلتا ہوں ۔ تم سب مسلمان ہو اور یہی صحیح " نام " ہے ۔ ہندوستان میں جس قدر اقوام ہیں ، سب چاہتی ہیں کہ ان کی خصوصیات باقی رہیں اس لیے مسلمان بھی یہی چاہتے ہیں[۳۹]"

بھوپال کانفرنس اور اقبال | لندن روانہ ہونے سے قبل گاندھی جی چاہتے تھے کہ ہندو مسلم مسئلہ حل ہو ، لیکن جب مسلم کانفرنس کے زعماء ، اس کا حل چودہ نکات کی صورت میں ان کے سامنے پیش کرتے تو وہ اس سے اعراض کرتے اور اعراض کرنے کی وجہ " مسلم قوم پرستوں " کو قرار دیتے کہ یہ لوگ اس "حل" سے متفق نہیں ہیں ۔ اس ہیرا پھیری کا مطلب یہ تھا کہ یا تو مخلوط انتخاب کو قبول کر لو یا پھر ان مسلم قوم پرستوں کو قائل کر دو ۔ گویا جب تک مسلم قوم پرستوں کو منایا نہیں جائے گا ہندو مسلم سمجھوتہ کا باب وا نہ ہو گا ۔ یہ تھا گاندھی جی کا طرز فکر اور طریقہ کار ہندوستان کی سب سے بڑی سیاسی الجھن کو سلجھانے کے سلسلہ میں! علامہ اقبال نے اس طرزِ عمل کو گاندھی جی کی منافقت کہا تھا ۔ تاہم زعمائے مسلم کانفرنس خصوصاً مولانا شوکت علی نے جو ہمیشہ ہندو مسلم اتحاد کے لیے کوشاں رہا کرتے تھے ، یہ مناسب سمجھا کہ مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کے لیڈروں سے بھی بات چیت کی جائے تاکہ قوم پرست مسلمانوں سے اتحاد کی راہ نکل آئے اور اس طرح گاندھی جی

۳۹- روزنامہ انقلاب ، لاہور مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع ۔

پر اتمام حجت بھی ہو جائے۔

علامہ اقبال ان کانگریسی مسلمانوں کی قوم پرستی یا " نظریۂ وطنی قومیت " کے شدید مخالف تھے اور عواقب و نتائج کے لحاظ سے اس کو "بے دینی و لا مذہبی" کی ابتداء قرار دیتے تھے، تاہم وہ اتحاد بین المسلمین کے زبردست حامی تھے۔ پھر وہ نیشنلسٹ مسلم کانفرنس لکھنو کی قرارداد کو اپنے نقطۂ نظر سے بہت قریب پاتے تھے۔ اس طرح مسلم قوم پرستوں سے بات چیت کرنے میں ان کے نقطۂ نظر سے بھی کوئی حرج نہ تھا۔ چنانچہ مولانا شوکت علی کی تحریک اور گاندھی جی کی تائید سے ١٠ مئی سنہ ١٩٣١ع کو بھوپال کانفرنس منعقد ہوئی، جس میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کی طرف سے علامہ اقبال، مولانا شوکت علی، نواب اسمعیل خان، سر محمد شفیع اور مولانا شفیع داودی اور مسلم نیشنلسٹ کانفرنس کی جانب سے ڈاکٹر انصاری، تصدق احمد خاں شیروانی اور چودھری خلیق الزمان شریک ہوئے [٣٠]، اس کانفرنس کی روئیداد علامہ اقبال، سر شفیع، مولانا شوکت علی اور شیروانی کی زبان سے سنیے۔

" ہم ١٠ مئی سنہ ١٩٣١ع کو بھوپال میں غیر رسمی جلسہ میں جمع ہوئے تاکہ ان اختلافات کو مٹائیں جن کی بناء پر مسلمان اس وقت دو سیاسی طبقوں میں تقسیم ہوا ہے۔ ہمارا مقصد ہندو مسلم سوال کے حل کرنے میں آسانیاں پیدا کرنا تھا۔ ہماری متفقہ رائے ہے کہ اس منزل پر بحث و تمحیص کی تفصیلات شائع کرنا، مفاد عامہ کے لیے اچھا نہیں ہو گا۔ ہم خوشی سے بیان کرتے ہیں کہ طرفین کے درمیان انتہائی خوش گوار اور دوستانہ جذبات میں گفتگو ہوتی رہی۔ دوران گفتگو یہ امر عیاں تھا کہ حاضرین میں سے ہر ایک کی یہی آرزو اور خواہش ہے کہ ایسے فیصلے پر پہنچ جائیں جو مسلمانوں کے اتحاد کا ذریعہ بن جائے اور انھیں اس قابل بنا دے کہ وہ متحد ہو کر ملک کی سیاسی ترقی اور نشو و

٣٠۔ " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ٢٥٨۔

ارتقاء میں حصہ لے سکیں - جون کا پہلا ہفتہ گفت و شنید کی تجدید کے لیے مقرر کیا گیا ہے ، امید کی جاتی ہے کہ اس وقت آخری اور تسلی بخش فیصلہ ہو جائے گا[۳۱]"

بھوپال کانفرنس کے اجلاس سے متعلق اس زمانہ میں بعض ایسی خبریں شائع ہوئیں - جن سے نہ صرف غلط فہمیوں کے پیدا ہونے کا امکان تھا ، بلکہ اس گفتگوئے مفاہمت کو نقصان پہنچنے کا بھی خطرہ تھا - اس لیے بھوپال سے واپس آتے ہوئے دہلی ریلوے اسٹیشن پر اخبار سٹیٹسمین کے نمایندہ کو بتاریخ ۱۳ مئی علامہ اقبال اور نواب اسمعیل خان نے حسب ذیل بیان دیا ، جس سے ۱۰ مئی والے اجلاس کی مزید تفصیلات سامنے آتی ہیں ، انہوں نے کہا -

" بھوپال کانفرنس کے متعلق . . . . یہ بیان صحیح نہیں کہ ہم دونوں (الف) مولانا شوکت علی اور سر محمد شفیع کے ساتھ مل کر جداگانہ نیابت کے موئد رہے اور ڈاکٹر انصاری اور مسٹر تصدق احمد خاں شیروانی مخلوط نیابت کی حمایت پر اڑے رہے - ہم چاروں(الف) دہلی کی قراردادوں(ب) کے موئید رہے لیکن ہم مختلف جماعتوں میں منقسم ہو کر متضاد مقاصد کی خاطر جد و جہد نہیں کر رہے تھے - جب واقعات کا سامنا ہوا تو ہمیں معلوم ہوا کہ دونوں فریقوں میں بہت تھوڑا اختلاف رائے ہے - ہمیں یقین ہے کہ جس طریق پر یہ کام شروع ہوا ہے اسی طرح یہ خفیف اختلاف بھی جاتا رہے گا -

ہم تفصیلات میں نہیں جا سکتے ، البتہ ہم یہ ظاہر کر دینا چاہتے

۳۱- روزنامہ انقلاب ، لاہور ۱۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -

الف - یعنی علامہ اقبال اور نواب اسمعیل خاں -

الف - یعنی (۱) علامہ اقبال ، (۲) نواب اسمعیل خان ، (۳) شوکت علی (۴) سر شفیع -

ب - آل پارٹیز کانفرنس دہلی منعقد ۵ جنوری سنہ ۱۹۲۹ع کی قرار دادیں

ہیں کہ اتحاد المسلمین کی طرف تسلی بخش ترقی ہوئی ہے - اب گفت و شنید ایسے مرحلے پر پہنچ گئی تھی کہ ہم انفرادی حیثیت سے اسے جاری نہیں رکھ سکتے تھے - اس لیے ہمیں اپنی اپنی مجلس عاملہ کی طرف منظوری اور رہنمائی کے لیے رجوع کرنا پڑا ہے ہمیں امید ہے کہ جب جون کے پہلے ہفتہ میں کانفرنس کا اجلاس دوبارہ ہو گا تو اس وقت تک کوئی ایسا اصول تیار ہو جائے گا جو سب مسلمانوں کو قبول ہو گا اور موجودہ خفیف اختلاف بھی معدوم ہو جائے گا[۴۲]"

مندرجہ بالا بیانات سے ۱۰ مئی سنہ ۱۹۳۱ع کی اس کانفرنس کے متعلق بعض باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں

۱- یہ کانفرنس خیر سگالی اور اتحاد بین المسلمین کے جذبہ سے شروع ہوئی -

۲- گفتگو جماعت بندی کی بنیاد پر نہیں ہوئی بلکہ تمام اراکین کانفرنس کی کوشش یہ تھی کہ جماعتی اختلافات کے بجائے اصولی مسائل پر بحث و گفتگو ہو اور ان کا متفقہ حل تلاش کیا جائے -

۳- جب گفتگو آگے بڑھی تو معلوم ہوا کہ " اختلاف بہت خفیف ہے[۴۳]" - ظاہر ہے کہ یہ اختلاف جداگانہ و مخلوط انتخاب کے متعلق ہی ہو سکتا تھا کیونکہ بقول علامہ اقبال " آل انڈیا مسلم کانفرنس کی قرارداد اور لکھنؤ کانفرنس کی قرارداد کی تیرہ تیرہ دفعات ایک ہی تھیں - صرف چودھویں دفعہ میں اختلاف تھا[۴۴] اور یہ چودھویں دفعہ جداگانہ انتخاب و مخلوط انتخاب سے متعلق تھی -

۴- علامہ اقبال ، نواب اسماعیل خان ، مولانا شوکت علی اور

۴۲- روزنامہ انقلاب ، لاہور مورخہ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۳- روز نامہ انقلاب ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -

سر شفیع نے اس کانفرنس میں بھی جداگانہ انتخاب کی حمایت کی تھی کیونکہ وہ ۱۳ مئی والے بیان میں کہتے ہیں کہ "ہم چاروں دہلی کی قراردادوں کے موئید تھے" ظاہر ہے کہ دہلی کی قرارداد میں جداگانہ انتخاب کا مطالبہ بطور خاص کیا گیا تھا ۔

۵۔ بھوپال کی اس کانفرنس میں کوئی متفقہ فیصلہ نہیں کیا گیا ، البتہ مختلف تجاویز و فارمولے دوران گفتگو ضرور سامنے آئے ہوں گے ۔ تب ہی تو اس امر کی ضرورت محسوس کی گئی کہ ان سے متعلق اپنی اپنی مجالس عاملہ کی رائے اور منظوری لی جائے ۔ اسی لیے کانفرنس کا اجلاس جون کے پہلے ہفتہ تک ملتوی کر دیا گیا ۔

اب رہی یہ بات کہ وہ تجاویز یا فارمولے کون سے تھے ۔ جو اس کانفرنس میں پیش ہوئے ، تو اس سے متعلق علامہ اقبال یا ان کے ساتھیوں کا کوئی بیان نہیں ملتا ۔ البتہ سر فضل حسین کے فرزند عظیم حسین نے اپنے والد کے سوانح حیات میں اس کانفرنس کی دو متبادل تجاویز کا ذکر کیا ہے جن کو درج ذیل کیا ہے ۔

"۱۔ دس سال کے بعد ، مشترکہ انتخاب بالغ رائے دہی کی بنیاد پر رائج کر دیا جائے گا لیکن ساتھ ہی یہ شرط بھی رہے گی کہ اگر کسی مقننہ (چاہے وہ مرکزی ہو یا صوبائی) کے مسلم اراکین کی اکثریت مشترکہ انتخاب کو دس سال کی میعاد گزرنے سے پہلے قبول کر لے تو جداگانہ انتخاب کا طریقہ اس مقننہ کی حد تک ختم کر دیا جائے گا ،

یا

۲۔ نئے دستور کے تحت پہلا انتخاب ، جداگانہ طریق انتخاب کی بنیاد پر ہو گا اور پہلی مقننہ کے پانچویں سال کے آغاز میں جداگانہ طریقۂ انتخاب و مخلوط طریقۂ انتخاب کے مسئلہ پر

استصواب رائے کرایا جائے گا۴۴ "

عظیم حسین نے یہ بھی لکھا ہے کہ " بھوپال سے واپسی پر علامہ اقبال نے ان دو تجاویز کو سر فضل حسین کے سامنے رکھا ، جس کو موخرالذکر نے قبول کرنے سے انکار کر دیا۴۵ " پھر انھوں نے ان تجاویز پر فضل حسین کی تفصیلی تنقید بھی درج کی ہے ، جس سے ہمیں یہاں سروکار نہیں ہے ، البتہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ عظیم حسین نے اس واقعہ کے سلسلہ میں انداز بیان کچھ اس طرح کا اختیار کیا ہے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ گویا اقبال نے جداگانہ انتخاب سے دستکش ہو کر ان دونوں تجاویز کو قبول کر لیا تھا اور انھوں نے یہ تجاویز سر فضل کے سامنے بغرض مشورہ یا برائے اظہار رائے نہیں رکھی تھیں بلکہ وہ ان تجاویز کو ان سے منوانا چاہتے تھے - ہماری رائے میں یہ انداز بیان اقبال پر الزام تراشی کے مترادف ہے - یوں تو عظیم حسین نے اپنے والد کی عظمت کو بڑھانے کے لیے اسی کتاب میں بعض اور مقامات پر بھی علامہ اقبال کی فضیلت کو گھٹانے کی کوشش کی ہے - یہاں تو انھوں نے اپنی جانبدارانہ ذہنیت کا بہت کھل کر مظاہرہ کیا ہے - ہو سکتا ہے کہ یہ دونوں متبادل تجاویز اس کانفرنس میں پیش کی گئی ہوں ، لیکن ان کو اقبال اور ان کے رفقاء نے قبول یا تسلیم نہیں کر لیا تھا - اس کانفرنس کے اختتام پر وہ خود کہتے ہیں کہ " ہم چاروں دہلی کی قراردادوں کے موئید تھے " جس کے صاف اور واضح معنی یہ تھے کہ وہ اس کانفرنس میں بھی جداگانہ طریقہ انتخاب کے حامی تھے - پھر وہ یہ بھی بیان کرتے ہیں کہ یہ کانفرنس ملتوی ہو گئی تاکہ " مجلس عاملہ سے منظوری و رہنمائی حاصل کی جائے " جس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ کوئی تجویز یا فارمولا اس کانفرنس میں متفقہ طور پر منظور نہیں ہوا تھا - اب رہا یہ سوال کہ جب

۴۴- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۵۶ و ۲۵۷ -

۴۵- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۵۸ -

علامہ اقبال نے خود ان کو قبول نہیں کیا تھا تو پھر ان تجاویز کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ یا سر فضل کے سامنے رکھا ہی کیوں ، تو اس کا جواب ذرا سے غور و فکر سے سامنے آ جاتا ہے ۔ یہ بات صحیح ہے کہ اس کانفرنس میں پیش شدہ متذکرہ بالا تجاویز یا کسی اور تجویز کو ، علامہ اقبال اور ان کے رفقاء نے اسی کانفرنس میں رد کرنے کے بجائے مناسب یہی سمجھا کہ انھیں اپنی مجلس عاملہ یا اپنے دیگر دوست احباب کے سامنے رکھا جائے اور ان سے صلاح مشورہ کیا جائے ۔ ان تجاویز کے تعلق سے علامہ اقبال کا یہ طرز عمل نہایت معقول تھا ۔ اگر وہ ان تجاویز کو اسی کانفرنس میں رد کر دیتے تو اتحاد بین المسلمین کی راہ بالکل مسدود ہو جاتی تھی ۔ لیکن اگر وہ ان پر غور و فکر اور صلاح مشورہ کرتے ہیں تو یہ راہ کھلی رہتی تھی ۔ پھر ان پر غور و فکر اور صلاح و مشورہ کرنے میں کوئی حرج بھی نہ تھا ، اس لیے کہ ان تجاویز سے جداگانہ انتخاب کا طریقہ فی الفور ختم نہیں ہو جاتا تھا ۔ پہلی تجویز کے مطابق یہ طریقہ دس سال تک جاری رہتا اور دس سال کے بعد ختم بھی ہوتا تو صرف اسی صورت میں جب کہ حق رائے دہی بالغان نافذ کیا جاتا ۔ دوسری تجویز جداگانہ انتخاب کے حامیوں کے نقطۂ نظر سے پہلی تجویز سے زیادہ بہتر تھی کیونکہ اس کی رو سے جدید دستور کے تحت پہلے انتخابات تو جداگانہ طریقہ کی بنیاد پر ہوتے اور پھر چار سال گذر جانے کے بعد طریقۂ انتخاب کے مسئلہ کا تصفیہ بذریعہ استصواب رائے (Referendum) ہوتا ۔ استصواب رائے کسی اہم مسئلہ کے حل کا جمہوری طریقہ ہے ۔ جس سے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں ہو سکتی تھی ۔ پھر یہ بھی توعین ممکن تھا کہ اس استصواب رائے کا نتیجہ جداگانہ انتخاب کے حق میں نکلتا ، جس سے مسلم قوم پرستوں کا دعوائے مشترکہ انتخاب ہمیشہ کے لیے باطل قرار پا جاتا ۔ اس زمانہ کی تلخ فرقہ وارانہ فضا کو دیکھتے ہوئے جداگانہ طریقۂ انتخاب کے حق میں " فیصلہ " کی ننانوے فیصد توقع کی جا سکتی تھی ۔ الغرض ان ہی مصالح کے پیش نظر ہو سکتا ہے کہ علامہ اقبال اور ان کے رفقاء نے ان دو تجاویز کو کانفرنس میں رد نہ کیا ہو اور ان پر اپنے دیگر ساتھیوں اور مجلس عاملہ سے مشورہ کیا ہو ۔

ہمارے اس قیاس کی تائید خود علامہ کے ایک بیان سے ہوتی ہے ، جو انھوں نے ۱۵ مئی کو دیا - یہ بیان آئندہ سطور میں مناسب موقع پر درج کیا جا رہا ہے -

بہرحال ۱۰ مئی کو بھوپال کانفرنس ہوئی - ۱۳ مئی کو اقبال بھوپال سے لاہور واپس ہوئے اور کانفرنس میں پیش شدہ تجاویز کو مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اور اپنے بعض دوستوں کے سامنے رکھا - ابھی کوئی فیصلہ نہ ہونے پایا تھا کہ بھوپال کانفرنس کی تجاویز کو ڈاکٹر انصاری نے شملہ میں گاندھی جی کے سامنے پیش کیا - اخبارات میں یہ خبر اس انداز سے چھپی کہ "بھوپال کانفرنس میں ایک عارضی معاہدہ طے پا گیا ہے ، جس کو گاندھی جی کے سامنے پیش کیا گیا ہے ، اس عارضی معاہدہ کی رو سے جو فارمولا طے ہوا ہے ، اس میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب والوں کے نقطۂ نظر کا امتزاج پایا جاتا ہے - یہ فارمولا دس سال تک نافذ رہے گا اور اس کے بعد مخلوط انتخاب ہر جگہ جاری کر دیا جائے گا" - علامہ اقبال نے جب یہ خبر اخبار میں پڑھی تو وہ چیں بہ جبیں ہو گئے ، اور ۱۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع کو حسب ذیل بیان اخبارات کے نام جاری کیا -

"شملہ سے ایسوسی ایٹڈ پریس کا ایک پیغام بدیں مضمون شائع ہوا ہے کہ ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب قریشی شملہ پہنچتے ہی گاندھی جی کے مکان پر گئے اور انھیں اطلاع دی کہ ہزہائی نس والئی بھوپال نے جن اصحاب کو مدعو کیا تھا ، انھوں نے ایک عارضی میثاق مرتب کر لیا ہے - اس پیغام میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس میثاق میں جو فارمولا پیش کیا گیا ہے اس میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب والوں کا امتزاج پایا جاتا ہے اور تقریباً دس سال تک نافذ رہے گا اور اس کے بعد ہر جگہ مخلوط انتخاب جاری کر دیا جائے گا - چونکہ میں بھی مدعو تھا اس لیے میں یہ ظاہر کر دینا اپنا فرض سمجھتا ہوں کہ اگر ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شعیب نے بھوپال کانفرنس کے غیر رسمی مباحث کو بمنزلہ عارضی میثاق پیش کیا ہے تو انھوں نے یقیناً

نہ صرف ان لوگوں کے ساتھ جن کے ساتھ انھوں نے گفت و شنید کی بلکہ تمام مسلم قوم کے ساتھ برائی کی۔ میں اسے کامل طور پر واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ عارضی میثاق کی سی کوئی چیز حاضرین جلسہ کے خیال میں بھی نہیں آئی تھی۔ اس جلسہ میں اس سے زیادہ کوئی کارروائی نہیں ہوئی کہ نام نہاد مسلم نیشنلسٹوں کو انتخابات کے متعلق، آل انڈیا مسلم کانفرنس کے فیصلوں کے قریب تر لانے کے لیے بعض تجاویز پیش کی گئیں، تاکہ یہ لوگ پھر کامل مسلم قوم میں شامل ہونے کے قابل ہو سکیں، جس نے جداگانہ انتخاب کے بدستور بحال رکھنے کا ایسا فیصلہ صادر کیا ہے جس میں کسی قسم کے مغالطہ کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اس جلسے میں ان تجاویز پر عمداً کوئی بحث نہیں کی گئی، کیونکہ فیصلہ ہو چکا تھا کہ ان کے رد یا قبول کرنے کے لیے مختلف سیاسی جماعتوں کی مجالس عاملہ کے رو برو انھیں پیش کیا جائے۔ ایسی تجاویز کو گاندھی جی کے پاس بھاگے بھاگے لے جانے، جن پر کسی قسم کی بحث بھی نہیں ہوئی اور انھیں عارضی میثاق کے نام سے تعبیر کرنے سے شبہ پیدا ہوتا ہے کہ بھوپال کانفرنس کو پروپاگنڈے کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔ اگر اس کی کوئی حقیقت ہے تو مجھے کامل یقین ہے کہ بھوپال یا شملہ میں دوسرا جلسہ کرنا نہ صرف مفید نہ ہوگا بلکہ لازمی طور پر مسلمانانِ ہند کے مفاد کے لیے ضرر رساں ہوگا[۳۶]"۔

ادھر اقبال بھوپال کانفرنس سے متعلق اس خبر سے ناراض اور اس کے دوسرے اجلاس کی کامیابی سے مایوس ہو گئے اور ادھر گاندھی جی نے مسلمانوں کو باہم متحد ہوتے دیکھ کر پھر پینترا بدلا اور یہ شرط لگا دی کہ مسلمان متحد ہو کر سکھوں کو بھی راضی کر لیں۔ گویا پہلے مسلمان متحد ہوں، پھر وہ سکھوں کو راضی کریں، تب کہیں جا کر ہندو مسلم گفتگوئے مفاہمت کا آغاز ہو گا! گاندھی جی کا یہ بیان مسلمانوں کے باہمی

۳۶- روز نامہ انقلاب لاہور ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -

اتحاد میں رخنہ اندازی کے مترادف تھا ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بھوپال کانفرنس ناکام ہو گئی ۔ اس کا دوسرا اجلاس ہو ہی نہ سکا اور اس ناکامی کا ذمہ دار ڈاکٹر انصاری نے بھی گاندھی جی ہی کو قرار دیا !

فسادات کانپور اور اقبال سیاسی واقعات کے تسلسل کو قائم رکھنے کے لیے ہم نے بھوپال کانفرنس کے ذکر کو مقدم رکھا ۔ بھوپال کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ۱۰ اپریل و مئی سنہ ۱۹۳۱ع میں بنارس ، آگرہ ، مرزا پور اور کانپور میں فسادات ہوئے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ان فسادات میں مسلمانوں کا بہت بھاری جانی نقصان ہوا اور کئی مساجد شہید ہوئیں ۔ کانپور کا فساد بڑا درد ناک تھا ۔ علامہ اقبال اس فساد کی خبریں سن کر بے حد متاثر ہوئے اور اپنے چند رفقاء کے ساتھ بتاریخ ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۳۱ع اخبارات میں ایک بیان شائع کروایا ، جس میں انھوں نے مظلومین کانپور کی امداد کے لیے چندہ کی اپیل کی ۔ اس بیان کے جستہ ، جستہ حصے درج ذیل ہیں ، جن سے اس فساد کی نوعیت اور علامہ کے شدت تاثر کا اندازہ ہوتا ہے ۔

"کانپور کا بلوہ کوئی معمولی بلوہ نہ تھا بلکہ وہ ایک وسیع ہندو سازش کا آخری مظاہرہ تھا ۔ بنارس ، آگرہ اور مرزا پور کے بعد کانپور میں مسلمانوں کا قتل عام ، ہندوستان کے مسلمانوں کو چیلنج تھا کہ وہ ایک ایک کرکے اس ملک سے نابود کر دئے جائیں گے اور کوئی ان کی امداد کرنے والا نہ ہوگا ۔ بنارس میں مسلمان مارے گئے اور دوسرے مسلمانوں نے ان کی مدد نہ کی اور متعصب ہندوؤں نے ایک یادداشت لکھ لی کہ مسلمانوں کا خون ہندوستان میں بہت ارزاں ہے ۔ آگرہ میں مسلمان مارے گئے اور کسی نے ان کی مدد نہ کی اور مہاسبھائی ذہنیت والوں نے ایک اور یادداشت لکھ لی کہ مسلمانوں کا خون بہت ارزاں ہے ۔ مرزا پور میں مسلمان مارے گئے اور کسی مسلمان نے ان کی مدد نہ کی اور مہاسبھائی ذہنیت والوں نے ایک اور یادداشت لکھ لی کہ مسلمانوں کا خون بہت ہی ارزاں ہے ۔ اس کے بعد کانپور کی باری

آئی اور اس میں غدر سے زیادہ دل ہلا دینے والے واقعات ظاہر ہوئے . . . . جس طرح جنگلی جانوروں کے ایک گلے میں گھس کر شکاریوں کا گروہ بے تحاشا بندوقیں چلانا شروع کرتا ہے ، اسی طرح کانپور میں ہوا ۔ مسلمانوں کے ہزار ہا مکانات جلا دئے گئے ، کئی محلے ایسے ہیں کہ ان میں شاید ہی کوئی مکان سلامت کھڑا ہو . . . . بے کس مسلمانوں کو مارا ہی نہیں گیا بلکہ ان پر تیل ڈال کر ان کو جلایا بھی گیا اور بعض جگہ تو سسکتے ہوئے زندہ آدمی جلا دئے گئے . . . . . تیس مسجدیں کلی طور پر یا جزوی طور پر توڑ دی گئیں . . . . کئی جگہ قرآن کریم کی بے حرمتی کی گئی ،

اس بلوہ کے بعد پھر متعصب ہندو دلوں میں خوش ہیں کہ گو اس دفعہ مسلمانوں نے کروٹ بدلی تھی لیکن صرف ایک ہمدردی کا پیغام دے کر وہ پھر سو گئے ہیں ! تین مہینے فساد کو ہو گئے ہیں ۔ ہزاروں بے خانماں ہو رہے ہیں ، سینکڑوں یتیم اور بیوائیں بھوکوں مر رہی ہیں ، لیکن ان کا کوئی پرسان حال نہیں[۴۷] ''

دوسری گول میز کانفرنس سے قبل حکومت برطانیہ کو انتباہ

بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس کا افتتاح لندن میں ۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ہونے والا تھا ، گاندھی جی کی غیر مشروط طور پر رہائی اور '' گاندھی ارون '' معاہدہ کے بعد ، کانگریس کی گول میز کانفرنس میں شرکت یقینی ہو گئی تھی اور اس زمانہ میں ہندو مسلم سمجھوتہ کی جو کوشش کی گئی تھی ، وہ مئی سنہ ۱۹۳۱ع میں ناکام ہو چکی تھی ۔ کانگریس کے تعلق سے حکومت برطانیہ کا رویہ بھی بالکل بدل چکا تھا ۔ اب کانگریس سے اس کے تعلقات معاندانہ نہیں بلکہ دوستانہ ہو چکے تھے اور وہ گاندھی جی کی بڑی پذیرائی کر رہی تھی ۔ حکومت کے اس طرز عمل سے مسلم قائدین اور مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں کو یہ اندیشہ ہو چلا

۴۷- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۴ جولائی سنہ ۱۹۳۱ع ۔

تھا کہ گول میز کانفرنس میں ایسا دستورِ اساسی مرتب کیا جائے گا، جس پر کانگریسی نقطۂ نظر حاوی ہو گا اور اقلیتوں، خصوصاً مسلمانوں کے حقوق و تحفظات کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ علامہ اقبال کو بھی یہ خطرہ نظر آ رہا تھا۔ ۳۰ جولائی سنہ ۱۹۳۱ع کو انھوں نے ایک اہم بیان سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع کیا۔ یہ بیان، دراصل اس خط کا ایک اقتباس تھا، جو انگلستان کی ایک علمی و ادبی انجمن، انڈیا سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام لکھا گیا تھا۔ اس بیان میں آپ نے مسلمانوں کے ان ہی خدشات کا ذکر کیا اور حکومتِ برطانیہ کو سخت الفاظ میں تنبیہ دی۔ انھوں نے کہا۔

" ہندوستان کی اندرونی کشمکش اور نا اتفاقی امنِ عالم میں ایک بہت بڑا خلل ڈالنے والا عنصر ہے۔ موجودہ صورتِ حال بہت ہی تشویش ناک ہے۔ تاہم میں فرقہ وارانہ سمجھوتہ کے امکان سے مایوس نہیں ہوں . . . . . . ہونے والی گول میز کانفرنس کے موقع پر حکومت برطانیہ کی طرف سے فرقہ وارانہ اختلاف سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش، دونوں ملکوں کے لیے بالآخر تباہ کن ثابت ہو گی، اگر تم سیاسی اختیارات ہندوؤں کے حوالے کر دو گے اور ان کو برطانیہ عظمیٰ کے مادی مفادات کی خاطر برسر اقتدار رکھنا چاہو گے تو تم ہندوستانی مسلمانوں کو سوراج یا اینگلو سوراج کے خلاف وہی ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور کر دو گے، جو گاندھی جی نے برطانوی حکومت کے خلاف استعمال کیے تھے[۴۸] "

دوسری گول میز کانفرنس کے لیے نامزدگی

ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع میں دوسری گول میز کانفرنس ہونے والی تھی، اس کے شرکاء کو حکومت برطانیہ نے نامزد کیا تھا۔ واضح رہے کہ گول میز کانفرنس

۴۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۶۶ و ۱۶۷-

کے اراکین یا شرکاء عوام یا عوامی جماعتوں کے منتخب کردہ نہیں ہوتے تھے ، بلکہ ان سب کو حکومت نامزد کیا کرتی تھی ۔ مگر یہ نامزدگی من مانے طریقہ پر نہیں ہوتی تھی بلکہ نامزدگی کے وقت رکن کی ذاتی حیثیت ، سیاسی مرتبہ اور جماعتی نمائندگی کو پیش نظر رکھا جاتا تھا ۔ اس نامزدگی میں جانبداری اور سرکاری نوازش و مہربانی کا کوئی سوال نہیں تھا ، کیونکہ حکومت کے پیش نظر مقصد یہ تھا کہ مستقبل کے دستور کی تدوین کے سلسلہ میں ہندوستان کے مختلف سیاسی مکاتبِ فکر سے صلاح و مشورہ کیا جائے ۔ بہرحال دوسری گول میز کانفرنس کے لیے حکومت برطانیہ نے ہندوستانی مندوبین کو بھی نامزد کیا اور برطانوی مندوبین کو بھی اور ان نامزد کردہ ہندوستانی مندوبین میں علامہ اقبال بھی شامل تھے ۔ واضح رہے کہ پہلی گول میز کانفرنس میں انھیں شرکت کی دعوت نہیں دی گئی تھی ۔ اس طرح حکومت برطانیہ کی جانب سے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے یہ ان کی پہلی نامزدگی تھی ۔ اس نامزدگی کے متعلق عظیم حسین لکھتے ہیں ۔

> ” سنہ ۱۹۳۱ء میں فضل حسین کے کہنے پر وائسرائے نے دوسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر اقبال کو نامزد کیا تھا[۴۹] “

ہو سکتا ہے کہ سر فضل حسین کے توجہ دلانے پر حکومت نے ڈاکٹر اقبال کو دوسری گول میز کانفرنس کی رکنیت کے لیے نامزد کیا ہو ، کیونکہ اس زمانہ میں سر فضل حسین وائسرائے کی کونسل کے رکن تھے اور ممکن ہے کہ وائسرائے نے دوسری گول میز کانفرنس کے اراکین کو نامزد کرتے وقت سر فضل حسین سے بحیثیت ہندوستانی رکنِ کونسل صلاح و مشورہ کیا ہو ، لیکن اس نامزدگی سے نہ سر فضل حسین کی مہربانی کا اظہار ہوتا ہے اور نہ وائسرائے کے مراحم خسروانہ کا ۔ ڈاکٹر صاحب نے دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد تک ملک کی سیاسیات میں جو حصہ

۴۹- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ء ص ۳۱۹ ۔

لیا تھا ، اس کو پیش نظر رکھا جائے تو ان کی یہ نامزدگی قابل تعجب نہیں ہے ۔ علامہ اقبال ابتداً سے ہندوستان کی مسلم سیاست میں ایک خاص مکتبِ فکر کی نمائندگی کر رہے تھے ۔ اس مکتبِ خیال کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کی ہئیت سیاسی میں مسلمانوں کی اپنی انفرادیت باقی رہے اور ان کی حیثیت دوسری جماعتوں میں مدغم نہ ہونے پائے ۔ اس نقطۂ خیال کے علمبرداروں میں اقبال بہت ہی پیش پیش تھے ۔ دوسری گول میز کانفرنس میں اصلی حل طلب مسئلہ مختلف اقوامِ ہند کی دستوری حیثیت کے تعین اور ان کی باہمی مفاہمت کا تھا ۔ ایسے موقع پر ناممکن تھا کہ حکومت اس مکتبِ خیال کو نمائندگی کا موقع نہ دیتی اور جب اس مکتبِ فکر کی نمائندگی لازمی ٹھہری تو یہ ناممکن تھا کہ علامہ اقبال کو نظر انداز کر دیتی ۔ پھر وہ کل ہند مسلم لیگ کے معتمد رہ چکے تھے ، کل ہند مسلم کانفرنس کے بانیوں میں سے تھے ، اس کے اجلاس دہلی (سنہ ۱۹۲۹ع) میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا اور اس کی قرارداد کے مرتبین و موئیدین میں سر فہرست تھے اور دوسری گول میز کانفرنس سے چند ماہ پیشتر انھوں نے مسلمانوں کی سب سے قدیم اور نمائندہ انجمن کل ہند مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس کی صدارت کی تھی اور وہ معرکۃ الآرا خطبہ پڑھا تھا ، جس نے ہندوستان اور برطانیہ کے تمام سیاسی حلقوں میں ایک ہلچل سی مچا دی تھی ! مختصر یہ کہ سنہ ۱۹۲۶ع سے لے کر دوسری گول میز کانفرنس کے آغاز تک وہ مسلمانوں کی سیاسی اور اجتماعی تحریک میں پیش پیش رہے تھے ۔ پھر ان سب پر مستزاد ان کی بین الاقوامی شہرت تھی ۔ الغرض اقبال کی اپنی حیثیت کے پیشِ نظر حکومت کے لیے یہ ناممکن تھا کہ انھیں اس مرتبہ نظر انداز کر دیتی ۔ اگر سر فضلِ حسین وائسرائے کے سامنے علامہ کا نام تجویز نہ بھی کرتے تو یقیناً وائسرائے کو ان کا انتخاب کرنا ہی پڑتا تھا ۔ عظیم حسین نے اس نامزدگی کا ذکر فضل حسین کی ان الطاف و عنایات کے سلسلہ میں کیا ہے جو انھوں نے اپنی زندگی میں اور خصوصاً رکنیت کونسل کے زمانہ میں علامہ اقبال کے ساتھ کرنے کی کوشش کی تھی ۔ پھر جن الفاظ میں اس نامزدگی کا ذکر کیا ہے ، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ محض فضل حسین کے کہنے سننے یا سفارش کی بناء پر وائسرائے

نے اقبال کو دوسری گول میز کانفرنس کی رکنیت کا اعزاز بخشا تھا ! حالانکہ نہ تو یہاں کسی اعزاز کا سوال تھا اور نہ کسی بخشش کا اور نہ کسی کی سفارش کا ۔ یہ تو حق بحقدار رسید والا معاملہ تھا ! !

گول میز کانفرنس کے لیے لندن روانگی

بہرحال اگست سنہ ۱۹۳۱ع میں اقبال دوسری گول میز کانفرنس کے رکن نامزد کر دئے گئے اور ۴ اگست کو ان کے نام شرکت کا دعوت نامہ پہنچا ۔ ۸ ستمبر کو وہ لاہور سے روانہ ہوئے اور لاہور اسٹیشن ہی سے انھوں نے مدیر انقلاب کے اصرار پر مسلمانانِ ہند کے نام ایک پیغام دیا ، جو درج ذیل ہے ۔

" اس پیغام کے بعد جو مسٹر جناح نے دیا ہے مسلمانانِ ہند کے لیے کسی مزید پیغام کی ضرورت نہیں ۔ مختصراً میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ کوئی ایسا دستورِ اساسی جو مسلمانوں کے لیے اجتماعی حیثیت سے موت کا پیغام ہو ہرگز قبول نہیں کیا جا سکتا ۔ ہندوستان کی آزادی ، ہندوستان کی قوموں کے ہاتھ میں ہے ۔ اگرچہ ہندوستان کی آب و ہوا میں کوئی سمجھوتہ ہندی اقوام کے درمیان نہیں ہو سکا ، حالانکہ کم از کم مسلمانوں نے اپنے بعض ضروری اقتصادی اور اجتماعی مقاصد کو نظر انداز کرکے گذشتہ دس سال میں اس کے لیے کوشش بھی کی ہے ۔ تاہم مجھے خیال ہے کہ انگلستان کی فضا اور برطانوی مدبرین کا جینیس (genius) شاید اس گتھی کو سلجھا سکے ، جس کو ہندوستانی مدبرین نہیں سلجھا سکے ،

آخر میں میں اپنے ہندو بھائیوں سے اور خصوصاً ہندو اخبار نویسوں سے یہ گذارش کرنا چاہتا ہوں ،

سخن درشت مگو ، در طریق یاری کوش
کہ صحبتِ من و تو در جہان خدا ساز است"[۵۰]

۵۰- روز نامہ انقلاب لاہور ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ ۔

اقبال نے مسٹر جناح کے جس پیغام کا یہاں حوالہ دیا ہے ، وہ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ان کی نظر سے گزر چکا تھا - ذرا اس پیغام کو بھی دیکھتے چلیے - یہ پیغام دراصل مسٹر جناح کی وہ تقریر ہے ، جو انھوں نے اسی گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن روانہ ہونے سے قبل بمبئی میں مسلم سٹوڈنٹ یونین بمبئی کے عصرانہ میں کی تھی - اس تقریر میں مسٹر جناح نے کہا تھا -

" نئے دستور میں مسلمانوں کے حقوق کی معقول ضمانت مہیا نہ کی گئی تو نیا دستور ہرگز کامیاب نہ ہو سکے گا . . . . . . جمہوری حکومت کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ سات کروڑ مسلمانوں کو بے دست و پا کرکے ہندوؤں کے ایک طبقہ کو ان پر مسلط کر دیا جائے کہ جس وقت چاہے اور جو چاہے انھیں دیدے - کیا یہی نیابتی حکومت ہے؟ کیا اسی کو جمہوریت کہتے ہیں؟ حکومت ایسی چیز نہیں ہے جو ہر ایک شخص کو فرداً فرداً دی جا سکے - حکومت کرنے کے لیے چند شرائط کی پابندی لازمی ہے اور وہ یہ ہیں کہ لوگوں کی تربیت اس طریق پر کی جائے کہ وہ مل چل کر رہ سکیں اور خواہ کتنے اختلاف اور مشکلات حائل ہوں وہ خود ہی انھیں دور کر لیں - یہ پرانی کسوٹی ہے - فرض کرو کہ اگر حکومتِ برطانیہ نے ہندوؤں کو ایسا دستور دے دیا ، جو ان کی مرضی کے مطابق ہے تو قدرتی طور پر مسلمان اس کے مخالف ہوں گے اور وہ اس دستور اساسی کو تباہ کرنے کے لیے لازمی طور پر اپنی تمام قوت صرف کریں گے[۵۱] "

مسٹر جناح کے اس پیغام سے علامہ اقبال کو نہ صرف پورا اتفاق تھا بلکہ اس پیغام کے بعد وہ خود اپنے کسی پیغام کی ضرورت محسوس نہیں کرتے تھے - مسٹر جناح نے اپنی اس تقریر میں جو بات کہی ہے ، تقریباً وہی بات علامہ اقبال نے اس سے قبل اپنے اس بیان میں کہی تھی ، جو ۳۰ جولائی کے سول اینڈ ملٹری گزٹ میں شائع ہوا تھا اور جس کو

۵۱- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع -

ہم اوپر درج کر آئے ہیں ۔ اگرچہ اقبال لاہور میں تھے اور جناح بمبئی میں لیکن دونوں کا ذہن ایک ہی سمت میں کام کر رہا تھا ۔ دونوں ایک ہی خطرہ محسوس کر رہے تھے کہ کہیں آئندہ ایسا دستور مدون نہ ہو جائے ، جو مسلمانوں کے لیے مضر ہو اور جس کے ذریعہ زیر سایہٗ برطانیہ ہندوؤں کی بالا دستی یا اقبال کے الفاظ میں " اینگلو سوراج " قائم نہ ہو جائے ۔ پھر دونوں نے اس عزم کا اظہار کیا تھا کہ ایسا دستور " ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا بلکہ اس کو تباہ کر دیا جائے گا " ۔ یہاں اس امر واقعہ کا اظہار باعث دلچسپی ہو گا کہ سنہ ۱۹۲۷ء میں تجاویز دہلی کے بعد اقبال اور جناح کے سیاسی افکار دو مختلف سمتوں میں کام کر رہے تھے ۔ جناح تجاویز دہلی کی بنیاد پر مخلوط انتخاب کے قائل تھے اور اقبال کسی صورت میں بھی جداگانہ انتخاب سے دستبردار ہونے کے لیے تیار نہ تھے ۔ ان کا یہ اختلاف سنہ ۱۹۲۸ء کے آخر تک برقرار رہا ۔ مارچ سنہ ۱۹۲۹ء میں چودہ نکات کی تدوین کے بعد یہ اختلاف رفع ہو گیا تھا اور اب اواخر سنہ ۱۹۳۱ء میں دونوں میں ایسا ذہنی توافق پیدا ہو گیا تھا کہ لاہور اور بمبئی سے ایک ہی آواز اٹھ رہی تھی ! گویا بُعدِ مکانی کے باوجود قربِ ذہنی پیدا ہو گیا تھا ! !

بہرحال علامہ اقبال نے لاہور اسٹیشن پر اپنے پیغام میں وہی بات کہی ، جو بمبئی میں مسٹر جناح نے کہی تھی ۔ اس کے بعد وہ لاہور سے روانہ ہو کر دوسرے دن یعنی ۹ ستمبر کو دہلی پہنچے ۔ یہاں ریلوے اسٹیشن پر ان کا شاندار استقبال ہوا ۔ کئی انجمنوں کی طرف سے سپاس نامے پیش کیے گئے ۔ ان کے جواب میں جو تقریر انھوں نے کی ، اس کے بعض حصے سیاسی نقطہٗ نظر سے اہم بھی ہیں اور دلچسپ بھی ۔ انھوں نے کہا ۔

" میرے ساتھ نہ کوئی پرائیویٹ سیکرٹری ہے کہ میرے لیے ضروری مواد فراہم کرے ، نہ میرے ساتھ سیاسی لٹریچر کا پلندہ ہے ، جس پر اپنی بحثوں کی اساس قائم کروں گا ، بلکہ میرے ساتھ حق و صداقت کی ایک جامع کتاب (قرآن مجید) ہے ، جس کی روشنی میں مسلمانانِ ہند کے حقوق کی ترجمانی کرنے کی کوشش

کروں گا ،

گذشتہ دس سال سے ہم اپنے اقتصادی و سیاسی فوائد کو پس پشت ڈال کر کانگریس اور ہندوؤں کے ساتھ اتحاد کی کوشش کرتے رہے ، لیکن اس میں ہم کو برابر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا - لٰہذا اب اگر لندن میں بھی فرقہ وار اتحاد کی کوئی قابل اطمینان صورت نہ نکلی اور مکمل پراونشیل اٹانمی (Provincial-Autonomy) نہ دی گئی اور مرکزی حکومت میں ان کا کافی خیال نہ کیا گیا ، تو مسلمانان ہند کو اجتماعی زندگی پر انفرادی زندگی کو قربان کرنا پڑے گا - اور مجھے یقین ہے کہ اگر بنگال اور پنجاب کی اکثریت اور مسلمانوں کے دیگر مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو جو دستور اساسی بھی ہندوستان کو دیا جائے گا مسلمانان ہند اس کے پرخچے اڑا دیں گے[۵۲] "

اسی موقع پر ہندوستان ٹائمز کے نمائندے نے علامہ اقبال سے دریافت کیا کہ آپ کیا خاص بات لے کر گول میز کانفرنس میں شریک ہو رہے ہیں تو جواب میں انھوں نے پھر دہرایا -

" میرے پاس کچھ اور نہیں ہے ، لیکن قرآن ہے ، میں اسی کو پیش کروں گا[۵۳] "

یہ سب کچھ دہلی اسٹیشن پر ہی ہوا - یہاں آپ نے قیام نہیں کیا - دہلی سے ہوتے ہوئے وہ ۱۰ ستمبر کو بمبئی پہنچ گئے - یہاں بمبئی کرانیکل کے نمائندہ نے ان سے ایک انٹرویو لیا - اخباری نمائندہ کے سوالات اور علامہ کے جوابات سیاسی نقطۂ نظر سے بڑے دلچسپ ہیں - واضح رہے بمبئی کرانیکل کانگریس کی حمایت کرتا تھا - ظاہر ہے کہ اس اخبار کے نمائندہ کی نظر میں اقبال کانگریس کے مخالف ایک فرقہ پرست (Communalist) لیڈر تھے - اسی نقطۂ نظر سے اس نے سوالات بھی کیے تھے - یہاں ہم

۵۲- روز نامہ انقلاب لاہور ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء -
۵۳- اقبال اور قرآن از ابو محمد مصلح ص ۱۸ -

صرف ان سوالات اور جوابات کو درج کرتے ہیں ، جو سیاسی اہمیت کے حامل ہیں ۔

بمبئی کرانیکل کے نمائندہ کا پہلا سوال علامہ اقبال کی فرقہ پرستانہ حیثیت کے متعلق تھا ، جواب میں انھوں نے کہا ۔

” میں دنیا کے کسی فرقہ قوم سے تعصب نہیں رکھتا ۔ جو کچھ میں چاہتا ہوں وہ صرف اس قدر کہ اسلام اپنی دیرینہ اصلی سادگی پر واپس آ جائے ۔ میں ہندوستانیوں کو پُر امن زندگی بسر کرتے دیکھنا چاہتا ہوں اور مجھے یقین ہے کہ یہ چیز اس صورت میں بھی ممکن ہے ، جب کہ ہر فرقہ اپنی ثقافت اور انفرادیت کو برقرار رکھے ۔

سوال : ” آپ کے بعض نقاد ایمانداری سے یہ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کا موجودہ (سیاسی) طرز عمل ان تعلیمات کے برعکس ہے ، جو آپ اپنی شاعری میں پیش کرتے ہیں ۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ شاعر اقبال کو سیاستدان اقبال نے پچھاڑ دیا ۔ آپ کا کیا جواب ہے ؟

جواب : یہ میرے نقادوں کا کام ہے کہ وہ میرے بارے میں جو چاہے فیصلہ دیں ۔ انھیں یہ فیصلہ کرتے وقت میری تحریروں کو پیش نظر رکھنا چاہیے ۔ لیکن مجھے افسوس ہے کہ ان ناقدین میں سے چند ہی ایسے ہیں ، جو میری ان تحریروں کو پڑھتے یا ان کو سمجھتے ہیں ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ قومیت(الف) (Nationalism) کے بارے میں میرے خیالات بالکلیہ بدل چکے ہیں ۔ کالج کے

(الف) ” قوم از وطن است “ کا نظریہ دراصل یورپ کا آفریدہ تھا ، جس کو ہندوستان کی عملی سیاست میں کانگریسی ہندوؤں نے اپنا لیا تھا ۔ بعض مسلمان لیڈروں نے بھی اسی کو اختیار کر لیا تھا ۔ اسی لیے وہ اپنے آپ کو مسلم نیشنلسٹ کہتے تھے ۔ سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد اقبال اس نیشنلزم یعنی وطنی قومیت کے خلاف ہو گئے تھے ۔ اس بیان میں انھوں نے اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔

دنوں میں ایک جوشیلا قوم پرست تھا ، لیکن اب نہیں ہوں ۔ اس تبدیلی کی وجہ فکر کی پختگی ہے ۔ افسوس ہے کہ میری بعد کی تمام تحریرات فارسی میں ہیں ، جو اس ملک میں کم سمجھی جاتی ہیں ۔

سوال : آپ " قومیت " (یعنی وطنی قومیت) کے خلاف کیوں ہیں ؟

جواب : میں اس کو اسلام کے اعلیٰ نصب العین کے خلاف سمجھتا ہوں ۔ اسلام صرف ایک مذہب یا مجموعۂ عقائد (Creed) نہیں ہے ۔ وہ ایک عمرانی ضابطہ (Social code) ہے ۔ اس نے رنگ و نسل کے مسئلہ کو حل کر دیا ہے ۔ وہ انسانوں کے ذہن کو ایک ہی راستہ پر ڈالنا چاہتا ہے ۔ اسی نے سب سے پہلے انسانی نسل کے اراکین کے مابین اتحاد اور روحانی مماثلت کے تصور کو اپنایا ہے ۔ قومیت (یعنی وطنی قومیت) ، جیسا کہ آج کل اس کو سمجھا جاتا ہے ، اس نصب العین کے حصول میں آڑے آتی ہے اور یہی میری دلیل ہے ، "قومیت" کے خلاف ۔

سوال : " پان اسلامزم " کے متعلق آپ کا تصور کیا ہے ؟

اس سوال کا ایک تاریخی و سیاسی پس منظر ہے جس کو سمجھے بغیر اقبال کے جواب کی معنویت پوری طرح سمجھ میں نہیں آ سکتی ۔ خلافت ترکیہ کو کمزور کرنے اور مختلف یورپی اقوام کو اس کے خلاف نفرت دلانے اور انھیں باہم متحد کرنے کے لیے بعض یورپی سیاستدانوں اور صحافیوں نے " پان اسلامزم " کی اصطلاح گھڑی ۔ جس کا مطلب یہ تھا کہ تمام دنیا کے مسلمان خلافتِ ترکیہ کے تحت متحد ہو کر یورپی اقوام کو غلام بنا لیں گے ۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت نے اس اصطلاح کو سنہ ۱۹۲۳ء میں بہت اچھالا ۔ اور اس کی ایک خاص وجہ تھی ۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریکِ ترک تعاون کے زمانہ میں ہندو مسلم اتحاد کے نہایت دل خوش کن مناظر دیکھنے میں آئے تھے ، لیکن اس تحریک کے ختم ہو جانے کے بعد ہی سنہ ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم منافرت کا لاوا پھوٹ پڑا تھا ۔ اس زمانہ میں اس نفرت کی آگ کو بھڑکانے اور ہندوؤں کو مسلمانوں

سے خوف زدہ کرنے کے لیے یہ خبریں آڑائی جاتی تھیں کہ صوبہ سرحد و پنجاب کے مسلمان افغانستان سے مل کر ہندوستان پر حملہ کرنے والے ہیں ۔ اگر برطانیہ ہندوستان کی حفاظت نہ کرے تو ہندوستان پر مسلمانوں کی بادشاہت قائم ہو جائے گی ۔ اس کو ایک تحریک کے طور پر پیش کیا جاتا تھا ۔ اس زمانہ میں اس اصطلاح کو ہندوستان میں خوب زور و شور سے پھیلایا گیا ۔ دراصل برطانوی حکومت نے اس اصطلاح کو ہندوؤں کو ڈرانے اور سرحد کے مسلمانوں کو دبانے کے لیے استعمال کیا ۔ صوبہ سرحد میں جب کبھی کوئی معمولی سماجی یا سیاسی تحریک اٹھتی تو حکومت اس کو " پان اسلامزم " سے تعبیر کرتی اور فوراً اس کا گلا گھونٹ دیتی تھی ۔ ہندو بھی حکومت کی اس جابرانہ پالیسی کے خلاف محض افغانی ہوّے اور " پان اسلامزم " کے ڈر سے آواز بلند نہ کرتے ۔ اسی پان اسلامزم کی آڑ لے کر حکومت نے صوبہ سرحد کو سنہ ۱۹۳۵ء تک سیاسی اصلاحات سے محروم رکھا تھا اور ہندوؤں نے انگریزوں کی اس پالیسی کی حمایت کی تھی ۔ بمبئی کرانیکل کے نمائندہ کے اس سوال کے پیچھے ہندوؤں کا یہی ذہن کار فرما تھا ۔ مطلب یہ تھا ہندی مسلمان تو ہندوستان کی جغرافیائی حدود سے ماوریٰ (Pan) دوسرے اسلامی ممالک مثلاً افغانستان ، ایران اور ترکی وغیرہ کی طرف دیکھتے ہیں ۔ ان مسلم ممالک سے ہاتھ ملا کر کہیں وہ کسی نازک موقع پر انگریزی تسلط کو ہٹا کر ہندوستان پر قابض تو نہیں ہونا چاہتے؟ اقبال نے جواب میں کہا

" پان اسلامزم کی اصطلاح کو ایک فرانسیسی صحافی نے گھڑا تھا اور جس معنی میں اس نے اس اصطلاح کو استعمال کیا تھا ، پان اسلامزم کا سوائے اس کے متخیلہ کے کہیں وجود نہ تھا ۔ جہاں تک میرا خیال ہے اس فرانسیسی صحافی کا مقصد (یورپ کے خلاف) اس خطرہ کو ایک شکل دینا تھا ، جس کو وہ اپنے تصور میں دنیائے اسلام میں پرورش پاتے دیکھ رہا تھا . . . . اس اصطلاح کے ایک اور معنی ہیں ۔ اور ان معنوں میں اس کو جمال الدین افغانی نے استعمال کیا ہے ۔ میں نہیں جانتا ، کہ انھوں نے واقعتاً یہ اصطلاح استعمال کی تھی یا نہیں ۔ بہرحال انھوں نے

افغانستان ، ایران اور ترکی کو یورپی جارحیت کے خلاف متحد ہونے کا مشورہ دیا تھا ۔ یہ ایک دفاعی تدبیر تھی اور شخصی طور پر میں خیال کرتا ہوں کہ جمال الدین کا یہ مشورہ بالکل صائب تھا ۔

اس اصطلاح کے ایک اور معنی بھی ہیں اور اسی معنی میں اس کو استعمال بھی کیا جانا چاہیے ۔ اس معنی کے لحاظ سے ، اس اصطلاح میں قرآن کریم کی تعلیم موجود ہے اور ان معنی میں یہ ایک سیاسی منصوبہ نہیں بلکہ ایک سماجی تجربہ کی حامل اصطلاح ہے ۔ اسلام ذات پات ، نسل و رنگ کے فرق و امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام کا تصور حیات ہی وہ نظریۂ زندگی ہے ، جس نے رنگ کے سوال کو کم از کم اسلامی دنیا میں حل کرکے بتا دیا ہے ۔ یہ ایک ایسا مسئلہ ہے ، جس کو موجودہ یورپی تہذیب ، سائنس اور فلسفہ میں اپنی تمام تر کامیابیوں کے باوجود ، حل نہیں کر پائی ہے ۔ پان اسلامزم کی ، اگر یہ تعبیر کی جائے تو پھر اس کی تعلیم پیغمبر اسلام نے دی ہے اور یہ تعلیم ہمیشہ کے لیے باقی رہے گی ۔ ان معنوں میں پان اسلامزم صرف پان ہیومنزم ہے ۔ اور ان معنی کا لحاظ کرتے ، ہر ایک مسلمان پان اسلامیسٹ ہے اور اس کو ایسا ہی ہونا بھی چاہیے ۔ حقیقت یہ ہے کہ لفظ " پان " کو " پان اسلام ازم " کی اصطلاح سے علیحدہ کر دینا چاہیے ، کیونکہ " اسلامزم " خود ایک ایسی اصطلاح ہے ، جو ان معنوں پر پوری طرح حاوی ہے ، جو میں نے ابھی بیان کیے ہیں ۔

سوال : کیا برطانوی سامراج کو آپ بے عیب ، پاک و منزہ سمجھتے ہیں؟
جواب : تمام مملکتیں جو استحصال ناجائز میں ملوث ہیں ، وہ سب کی سب ناپاک ہیں[۵۴] ۔

۵۴- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۵۵ تا ۶۰ ۔

یہ اس انٹرویو کے کچھ اجزاء تھے ، جو اقبال نے لندن روانہ ہونے سے قبل بمبئی میں ایک اخباری نمائندہ کو دئے۔ اس انٹرویو سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کے متعلق ہندو پریس کی رائے کیا تھی۔ ہم دیکھ چکے ہیں کہ پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر ہندو پریس نے اقبال کو بدنام و مطعون کرنے کی کوشش کی تھی ، اگرچہ وہ پہلی گول میز کانفرنس کے رکن نہیں تھے اور نہ انھوں نے اس میں حصہ لیا تھا۔ تاہم اس موقع پر کانفرنس سے باہر جداگانہ انتخاب کے سلسلہ میں انھوں نے سخت مؤقف اختیار کیا تھا ، جس کی تفصیلات ہم بیان کر آئے ہیں۔ اسی مؤقف کے باعث انھیں متشدد فرقہ پرست قرار دیا گیا تھا۔ اب جب کہ وہ دوسری گول میز کانفرنس میں ذمہ دارانہ اور نمائندہ حیثیت سے شریک ہو رہے تھے تو ہندو پریس نے ان کے خلاف فرقہ پرستی کے الزامات لگانے شروع کر دئے تھے۔ اس زمانہ میں کانگریس کا پراپیگنڈا یہ بھی تھا کہ یہ مسلم فرقہ پرست لیڈر ، برطانوی سامراج کے حامی اور آزادیٔ ہند کے مخالف ہیں۔ بمبئی کرانیکل کے نمائندہ نے فرقہ پرستی قوم پرستی ، پان اسلامزم اور برطانوی سامراج کے متعلق جس انداز میں اقبال سے سوالات کیے تھے ، ان سے اس کا کانگریس پراپیگنڈے کے لیے مسالہ (Material) حاصل کرنا مقصود تھا ، تاکہ اس کو نمک مرچ لگا کر سنسنی خیز بنایا جائے اور اقبال کی حیثیت کو گرایا جائے۔ لیکن اقبال نے ان زہر آلود سوالات کے جو واضح ، دو ٹوک اور مدلل جوابات دئے ، انھوں نے کانگریسی پراپیگنڈے کے غبارہ میں سے ہوا نکال دی۔

الغرض بمبئی میں یہ انٹرویو دینے کے بعد اقبال ۲۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو لندن پہنچ گئے۔ لندن میں ان کا قیام تقریباً دو ماہ (۲۷ ستمبر تا ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء) رہا۔ اس دوران ، ان کی بہت سی علمی ، ادبی ، سیاسی مصروفیتیں رہیں۔ یہاں ہم ان کی صرف سیاسی مصروفیتوں کا ذکر کریں گے۔ یہ مصروفیتیں بھی کچھ بیرونِ کانفرنس رہیں اور کچھ اندرونِ کانفرنس۔ پہلے بیرون کانفرنس مصروفیتوں کا حال سنیے۔

اقبال کی گول میز کانفرنس سے باہر سیاسی مصروفیتیں

لندن میں علامہ مرحوم کا قیام سینٹ جیمز کورٹ میں تھا ، جو سینٹ جیمز پیلیس کے بالکل قریب واقع تھا اور سینٹ جیمز پیلیس ہی میں گول میز کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے۔ اقبال کے لندن پہنچنے کے چوتھے دن یعنی یکم اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو سر سیموئیل ہور وزیر ہند ان سے ملنے کے لیے سینٹ جمیز کورٹ آئے ۔ علامہ کی ان سے کافی دیر تک ملاقات رہی ۔ اس ملاقات میں ہندوستان کے دستوری مسائل اور بالخصوص مسلمانوں کی سیاسی حیثیت کے متعلق گفتگو ہوتی رہی اور عالم اسلام کے سیاسی حالات بھی زیرِ بحث آئے ۔ عالمی سیاست کے پس منظر میں روس اور برطانیہ کی پالیسی پر علامہ نے بصیرت افروز روشنی ڈالی ۔ انھوں نے سیموئیل ہور سے کہا ۔

" روس اور برطانیہ کی کشمکش دراصل قیادت کا جھگڑا ہے ۔ روس اپنے اثرات وسطِ ایشیا کے اور اسلامی دنیا میں پھیلانا چاہتا ہے اور برطانیہ کی سیاسی غلطیوں کی وجہ سے وہ اپنے منصوبے میں کامیاب ہو سکتا ہے ۔ برطانیہ اپنی سابقہ پالیسی کی بناء پر دنیائے اسلام کا اعتماد کھو چکا ہے ۔ کابل میں لوگ باہم لڑتے ہیں اور گالیاں آپ کو دیتے ہیں ۔ ایران میں ایک امریکی مسافر اس لیے مارا گیا کہ لوگ اسے انگریز سمجھتے تھے ۔ ہندوستان میں بھی لوگ برطانیہ سے شدید نفرت کرتے ہیں ۔ اگر آپ ہندوستانیوں کا اعتماد دوبارہ حاصل کر سکیں تو معاملات بہتر ہو سکتے ہیں ۔ اب حالت یہ ہے کہ بنارس میں ایک مسلمان تاجر اس لیے مارا گیا کہ وہ برطانوی کپڑا بیچتا تھا اور آپ نے اس کی کوئی حفاظت نہ کی ۔ اگر یہی حالات رہے تو ہندوستان اور برطانیہ کے درمیان اشتراک ناممکن ہو جائے گا[۵۵] "

کیا اس سے بڑھ کر آزادی ہند کی وکالت کوئی " قوم پرست " کر

۵۵- سفر نامہ اقبال مرتبہ محمد حمزہ فاروقی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۷۳ع ص ۳۱ -

سکتا تھا؟ عالمی قیادت کے سلسلہ میں ، روس اور برطانیہ کی اس زمانہ میں باہمی کشمکش اور اس کشمکش کے تعلق سے عالم اسلام کے رد عمل کا اظہار جس جچے تلے انداز میں علامہ نے کیا ہے ، وہ ان ہی کا حصہ ہے ۔ اس بلیغ طریقہ سے انھوں نے عالم اسلام اور ہندوستان دونوں کی آزادی کی وکالت کی اور برطانیہ کو ان دونوں کے تعلق سے اپنی پالیسی پر نظر ثانی کرنے کی دعوت دی ۔ اسی انوکھے انداز میں انھوں نے سر سیموئیل ہور کے سامنے مسلمانان ہند کے دستوری و سیاسی مقدمہ کو رکھا ۔ افسوس کہ ان کی اس گفتکو کی تفصیلات نہ مل سکیں ، تاہم یہ یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس مقدمہ کی وکالت میں کوئی کسر اٹھا نہ رکھی ہو گی ، کیونکہ ان کی شرکت گول میز کانفرنس کا حقیقی مقصد و مدعا اسی مقدمہ کی حمایت کرنا تھا ۔ مولانا غلام رسول مہر بحیثیت ایک صحافی کے اسی زمانہ میں لندن گئے تھے اور اپنے اخبار انقلاب کے لیے وہاں سے گول میز کانفرنس کی رپورٹیں روانہ کیا کرتے تھے ۔ وہ اس ملاقات کے چشم دید گواہ ہیں ان کا بیان ہے کہ

”وزیر ہند سے ملاقات کے دوران (علامہ اقبال نے) مسلمانوں کے مطالبات کو نہایت بلیغ انداز میں پیش کیا تھا ، جس سے وزیر ہند اس درجہ متاثر ہوا کہ دوبارہ ملاقات کی آرزو ظاہر کی[۵۶]“

۹ اکتوبر کو سفیر البانیہ نے حضرت علامہ کو دعوت دی ۔ اس موقع پر انھوں نے ایک گھنٹہ تک سفیر مذکور سے اسلامیات اور سیاسیات کے متعلق گفتگو کی[۵۷] ۔ اسی طرح آپ نے دیگر اکابرین سے بھی ملاقاتیں کیں اور ہندوستان کے سیاسی مسائل کو اپنے انداز میں پیش کیا ۔

اسی زمانہ میں ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا ۔ لندن ٹائمز نے ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ایک مقالہ افتتاحیہ بعنوان ”ہندوستانی اقلیتیں“ شائع کیا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ میں مسلمانوں کے خلاف انگریزی اور

۵۶- روز نامہ انقلاب لاہور ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔
۵۷- روز نامہ انقلاب لاہور ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

ہندو پریس نے برطانوی حکومت کے زیر اثر ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر یہ پراپیگنڈا بڑے زور و شور سے کر رکھا تھا کہ برطانیہ کی سامراجی گرفت کے ڈھیلے پڑتے ہی ہندوستانی مسلمان بالخصوص پنجاب و سرحد کے مسلمان افغانستان ، ایران اور ترکی کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے - اسی کو وہ کبھی "افغانی سازش" اور کبھی "پان اسلامی سازش" کا نام دیتے تھے - ان کے بعض بڑے جیالے اور نامور لیڈر مثلاً لالہ لاجپت رائے وغیرہ تک بھی اس پان اسلامی سازش کے خیالی ہوّے سے خائف رہا کرتے تھے[۵۸] - لندن ٹائمز کے ایڈیٹر نے اپنے مقالۂ افتتاحیہ میں مسلمانوں پر لگائے جانے والے اس الزام پر اظہار افسوس کیا تھا - ڈاکٹر ایڈورڈ تھامسن نے جو آکسفورڈ میں بنگالی زبان کے اُستاد تھے ، اس اداریہ کے جواب میں ، مدیر لندن ٹائمز کے نام ایک مراسلہ لکھا ، جس کا عنوان تھا

"پان اسلامی سازش"

یہ عنوان بڑا سنسنی خیز اور شر انگیز تھا - مراسلہ کا مضمون یہ تھا -

"۲۹ ستمبر کے مقالۂ افتتاحیہ میں ، جس کا عنوان "ہندوستانی اقلیتیں" تھا ، آپ نے "پان اسلامی سازش" کی الزام تراشی پر اظہار افسوس کیا ہے - اس کی بنیاد ایسے بیانات پر ہے ، جیسے کہ سر محمد اقبال نے گذشتہ دسمبر میں اپنے خطبۂ صدارتِ لیگ میں دئے ہیں - اس خطبہ کی جو رپورٹ شائع ہوئی ہے ، اس میں اقبال کا یہ بیان جلی حروف میں طبع ہوا ہے ، تاکہ کوئی اس کو نظر انداز نہ کرے - بیان یہ ہے -

"میری یہ خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ شمال مغربی سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو یکجا کرکے ایک واحد ریاست بنا دی جائے -

---

۵۸- دیکھیے لالہ لاجپت رائے کا خط بنام سی - آر داس مطبوعہ اخبار مرہٹہ ، ۲ فروری سنہ ۱۹۴۰ع ، بحوالہ سیاست ملیّہ از محمد امین زبیری ، ص ۱۹۰ -

خود مختار حکومت ، برطانوی سلطنت کے اندر ملے ، یا برطانوی سلطنت کے باہر ، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم ریاست کی تشکیل ، مسلمانوں ، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے بالآخر مقدر ہو چکی ہے"

ہر اس شخص کو جو یہ کہتا ہے کہ ہندوؤں کے مقدمہ پر (جو افسوس ہے کہ لرزہ خیز حد تک بری طرح مرتب کیا گیا ہے) منصفانہ انداز میں غور کیا جائے " مسلم دشمن " قرار دے دیا جاتا ہے - لہذا مجھے یہ کہنے کی اجازت دیجئے کہ میں ہندو مت کے برخلاف اس جمہوریت کو پسند کرتا ہوں ، جو آغا خان اسلام کے اندر پاتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ وہ (آغا خان) اس سے بھی آگے بڑھ جاتے ، اگر مروت ان کے آڑے نہ آتی اور وہ یہ بھی بتاتے کہ اسلام ، اپنی انسانی اخوت والی تعلیم کو روبہ عمل لانے میں عیسائیت پر بھی فوقیت رکھتا ہے - میں شمال مغربی ہند میں مسلم " فرقہ وارانہ صوبوں " کے قیام کے خلاف استدلال نہیں کر رہا ہوں ، لیکن جو کچھ سر محمد اقبال مطالبہ کر رہے ہیں ، وہ ایک عہدیہ (Confederation) ہے ، خواہ وہ وفاقِ ہند کے اندر ہو یا باہر - ذرا نقشہ پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ بقیہ ہندوستان کے لیے کسی قسم کی قابلِ دفاع سرحد باقی رہ جاتی ہے[۵۹] "

یہ تھا ، وہ مراسلہ ، جو سنسنی خیز عنوان کے ساتھ ڈاکٹر تھامسن نے ٹائمز میں ، اقبال کے زمانۂ قیام لندن میں شائع کروایا - یہاں یہ بتا دینا باعث دلچسپی ہوگا کہ ڈاکٹر تھامسن نہ صرف آکسفورڈ میں پڑھاتے اور کئی کتابوں کے مصنف تھے بلکہ کانگریس کے بڑے زبردست حمایتی تھے - یہی وہ تھامسن ہیں ، جنھوں نے علامہ اقبال کے انتقال کے

۵۹- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۷ و ۱۱۸ -

بعد یہ روایت گھڑی تھی کہ اقبال نے اپنے تصور پاکستان سے رجوع کر لیا تھا ۔ اس روایت پر آئندہ مناسب موقع پر تنقید کی جائے گی ۔ یہاں تو صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ان ہی ایڈورڈ تھامسن نے اپنے اس مراسلہ کے ذریعہ پھر ایک مرتبہ گول میز کانفرنس کے نازک موقع پر نہ صرف ہندوؤں کے مقدمہ کی وکالت کی ، بلکہ افغانی ہوّے ، نام نہاد پان اسلامی سازش کو اچھال کر مسلمانوں کے مقدمہ کو کمزور کرنے اور اقبال کے مؤقف کو گرانے کی کوشش کی تھی ۔ لندن ٹائمز کے اداریہ میں ہندوستانی اقلیتوں ، خصوصاً مسلمانوں کا ذکر تھا اور پان اسلامی سازش کا جو الزام ان پر تراشا گیا تھا ، اس پر صرف اظہار تاسف کیا گیا تھا ۔ اس میں دفاعِ ہند کا کوئی مسئلہ نہیں اٹھایا گیا تھا اور نہ علامہ اقبال کا کوئی ذکر تھا ۔ لیکن ایڈورڈ تھامسن کی شرانگیزی ملاحظہ کیجیے کہ انھوں نے اس پان اسلامی سازش کے ثبوت میں علامہ اقبال کے تصور " متحدہ مسلم مملکت شمال مغربی ہند " کو پیش کیا اور ساتھ ہی اس کو دفاع ہند کے لیے خطرہ بتایا ۔ پھر اقبال کے فقرہ حکومت خود اختیاری برطانوی سلطنت کے اندر ہو یا اس کے باہر ، میں سے اندر ہو یا باہر (Within or with ut) کے الفاظ کو واوین میں رکھ کر ، ان کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ۔ ان کے خط کے نہج کو دیکھنے کے بعد ایک قاری پر یہی اثر مرتب ہو سکتا تھا کہ علامہ اقبال کی یہ مملکت ، " پان اسلامی سازش " ہے اور اس مملکت کے قیام کے بعد بقیہ مملکت ہند ناقابل دفاع رہ جاتی ہے ، اور اس طرح کسی وقت بھی یہ خطرہ پیدا ہو سکتا ہے کہ شمال مغربی ہند کی یہ مسلم مملکت دوسری ہمسایہ مسلم مملکتوں افغانستان ، ایران وغیرہ کے ساتھ مل کر بقیہ ہندی مملکت پر ہلّہ بول دے ۔ پھر یہ مسلم مملکت نہ صرف ہندی مملکت کے خلاف ایک سازش ہے بلکہ وہ برطانوی دولت عامہ کے خلاف محاذ کی ایک کڑی بھی ہے اور اس سارے " فساد " کا ذمہ دار اقبال ہے ! ! یہی ان کے اس مختصر سے خط کے مضمرات تھے ۔ گویا تھامسن نے بیک وقت ہندوؤں کو خوش کرنے اور ڈرانے کی کوشش کی تھی ، اور انگریزوں کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکانے اور مسلمانوں کے مؤقف کو اربابِ اقتدار کی نظروں میں گرانے کی سعی کی تھی ، اور سارا الزام

علامہ اقبال کی گردن پر رکھ دیا تھا ۔ اس خط میں زیادہ زور دفاعِ ہند پر دیا گیا تھا ، حالانکہ علامہ اقبال نے اپنے اس خطبۂ صدارت میں جہاں اس مسلم مملکت کا تصور پیش کیا ہے ، وہیں دفاعِ ہند کے مسئلہ پر بھی بحث کی تھی اور نہایت ہی محکم دلائل پیش کرتے ہوئے یہ بتایا تھا کہ اس مسلم مملکت کے قیام کے بعد ہندوستان کا دفاع کمزور نہیں ، بلکہ طاقتور بن جائے گا ۔ لیکن ایڈورڈ تھامسن نے اس بحث کو سرے سے نظر انداز کر دیا تھا اور وہ صرف بقیہ ہند کے نقشہ کو لیے بیٹھے تھے اور وہ بھی سلطنتِ برطانیہ سے باہر ! ! --- غرض کہ ایڈورڈ تھامسن کا یہ خط ، ایک زہریلا پراپیگنڈا تھا ، مسلمانوں اور اقبال کے خلاف ۔ اور اس زہریلے پراپیگنڈے کے لیے انھوں نے وقت بھی وہ منتخب کیا تھا جب کہ لندن میں دوسری گول میز کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے ۔ علامہ نے ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو اس کا جواب دیا ۔ انھوں نے لندن ٹائمز کے ایڈیٹر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا ۔

" آپ کے اخبار مورخہ ۳ اکتوبر میں ڈاکٹر ای ۔ تھامسن نے جو لکھا ہے ، اس میں انھوں نے گذشتہ دسمبر کے اجلاس مسلم لیگ میں جو خطبہ صدارت میں نے پڑھا تھا ، اس کا حسب ذیل فقرہ سیاق و سباق سے علیحدہ کرکے پیش کیا ہے ۔

' میری خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ شمال مغربی سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو یکجا کرکے ایک واحد ریاست بنا دی جائے ۔ خود مختار حکومت برطانوی سلطنت کے اندر ملے یا برطانوی سلطنت کے باہر ، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم ریاست کی تشکیل ، مسلمانوں ، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لیے بالآخر مقدر ہو چکی ہے '

کیا میں ڈاکٹر تھامسن سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے برطانوی سلطنت سے باہر ایک مسلم مملکت کا مطالبہ پیش نہیں کیا ہے بلکہ دھندلے مستقبل میں ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی کے متعلق یہ ایک تخمینہ ہے ، جو برِ صغیر ہند کے مقدر کی اس وقت صورت گری کر رہی ہیں ۔ کوئی ہندوستانی مسلمان

جو عقل کا ادنیٰ سا شائبہ رکھتا ہے ، عملی سیاست کے ایک
منصوبہ کی حیثیت سے برطانوی دولتِ عامہ سے باہر شمال مغربی ہ
میں ایک مسلم مملکت یا مملکتوں کے سلسلہ کو قائم کرنے
خیال نہیں کر رہا ہے ،

وسطِ پنجاب کے متعلق ، ایک تجویز جوشیلے حضرات نے پیش
ہے - یہ فرقہ وارانہ کشاکش کا ایک اکھاڑا ہوگا اور میں اگر
اس کے خلاف ہوں ، تاہم میں ہندوستان کی ایسے صوبہ جات ...
از سر نو تقسیم کا حامی ہوں ، جس میں کسی ایک فرقہ کی مؤ
اکثریت ہو ، جس کی وکالت نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ ...
بھی کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم صوبوں کے متعلق میری تجو
اسی تخیل کو آگے بڑھاتی ہے - ہندوستان کی شمال مغربی سرحد
مطمئن اور منظم مسلم صوبوں کا ایک سلسلہ ، سطح مرتفع ایشا
کی بھوکی نسلوں کے خلاف ہندوستان کے لیے ایک برطانوی سلطن
کے لیے فصیل ثابت ہو گا[۶۰] ،،

علامہ اقبال کے اس جواب کے مندرجات پر ہم آگے چل کر مناسب
موقع پر تفصیلی بحث کریں گے ، یہاں اس قدر اشارہ کر دینا کافی ہے
علامہ نے اپنے اس جواب میں ، برطانوی مدبرین کے ذہنوں کو صا
کرنے کی کوشش کی ہے ، جن کے مسموم ہونے کا خطرہ تھا سن ...
زہریلے مراسلہ کی وجہ سے پیدا ہو چلا تھا -

یہاں تک تو ہم نے گول میز کانفرنس سے باہر علامہ اقبال کی سیاسی
مصروفیتوں کا ذکر کیا ہے - اب یہ دیکھیے انھوں نے گول میز کانفرنس
کے اندر کیا کیا -

اقبال دوسری گول میز کانفرنس میں / بیان کیا جا چکا ہے کہ دوسری
گول میز کانفرنس میں دو کمیٹیاں مقرر کی گئی تھیں - ایک کمیٹی اقلیت

۶۰- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے - ڈار ناشر اقبال اکاد
کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۹ و ۱۲۰ -

سے متعلق تھی اور دوسری وفاقی ہئیت کے بارے میں غور کرنے کے لیے بنائی گئی تھی ۔ علامہ اقبال جس نقطۂ نظر کے حامی تھے ، اس کے لحاظ سے آپ کو لازماً اقلیتوں کی کمیٹی میں رکھنا چاہئے تھا ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور آپ کو اقلیتوں کی کمیٹی کا رکن بنا دیا گیا ۔ واضح رہے کہ یہ کوئی لزوم نہ تھا کہ گول میز کانفرنس کا مندوب صرف کسی ایک کمیٹی ہی کا رکن رہے اور دوسری کمیٹی میں حصہ نہ لے ۔ بعض مندوبین دونوں کمیٹیوں یعنی اقلیتوں کی کمیٹی اور وفاقی ہیئت کی کمیٹی کے رکن تھے ۔ لیکن علامہ اقبال صرف ایک ہی کمیٹی —— اقلیتوں کی کمیٹی —— کے رکن تھے ۔ اس کی وجہ حکومت کی طرف سے کوئی رکاوٹ یا مزاحمت نہ تھی ۔ غالباً اقبال کا اپنا اندازِ فکر اور رجحان اس کا سبب تھا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہو جائے گا ۔

گول میز کانفرنس اور اس کی ذیلی کمیٹیوں کا طریقۂ کار یہ تھا کہ اس میں ہر وفد کے تمام اراکین شریک تو ہوتے تھے لیکن عموماً گفتگو کا مجاز سرگروہ وفد ہی ہوتا تھا ۔ اراکین وفد اس کو مختلف امور میں مشورہ دیا کرتے تھے ۔ خصوصاً مسلم وفد نے یہ طریقہ کار اس لیے اختیار کیا تھا کہ مختلف معاملات و مسائل سے متعلق ان کی روش متحدہ و متفقہ رہے ۔ البتہ بعض اہم مواقع پر وفد کی پالیسی کی مزید وضاحت کے سلسلہ میں رکنِ وفد اپنا خیال بھی ظاہر کر سکتا تھا ۔ لیکن ، بہرحال ، وفد کی پالیسی کا تعین اراکین اپنی انفرادی و نجی گفتگوؤں میں ہی کر لیا کرتے تھے ۔ مسلم وفد کے صدر ہزہائی نس سر آغا خان تھے اور انھوں نے ہی بالعموم گول میز کانفرنس اور اس کی ذیلی کمیٹیوں کے مختلف جلسوں میں مسلم وفد کی جانب سے اظہارِ خیال کیا ۔ علامہ اقبال ہز ہائی نس کو مختلف مسائل و معاملات میں مشورے دیتے رہے ۔

اقلیتوں کی کمیٹی کے کل چار باضابطہ اجلاس ہوئے ۔ پہلا جلسہ ۲۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ہوا ۔ یہ ایک رسمی سا اجلاس تھا ، جس میں وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کی اپیل کی ۔ گاندھی جی جلسہ میں شریک تھے ، انھوں نے مسلمان نمائندوں سے کہا کہ وہ حکومت سے مطالبہ کرکے ڈاکٹر انصاری کو ایک مسلمان مندوب کی

حیثیت سے لندن بلوا لیں ۔ تعجب ہوتا ہے کہ گاندھی جی جیسا فرزانہ ، ایک بیگانہ سی بات آن مسلمان نمائندگان ِ کانفرنس سے کہہ رہا تھا ، جنھوں نے ڈاکٹر انصاری کی نامزدگی کی انعقاد ِ کانفرنس سے قبل سخت مخالفت کی تھی ، پھر گاندھی جی کا یہ اصرار اصولی بھی نہ تھا بلکہ خالصتاً شخصی تھا ۔ وہ کہہ تو یہی رہے تھے کہ ڈاکٹر انصاری کے بغیر قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلمانوں کی نمائندگی نہیں ہوتی ، لیکن درحقیقت یہ قوم پرست مسلمانوں کی نمائندگی کا مسئلہ نہ تھا ، کیونکہ قوم پرست (نیشنلسٹ) مسلم کانفرنس کا جو اجلاس لکھنؤ میں دوسری گول میز کانفرنس کے انعقاد سے صرف پانچ ماہ قبل یعنی اپریل سنہ ۱۹۳۱ع میں ہوا تھا ، اس کے صدر سر علی امام اسی گول میز کانفرنس میں بحیثیت مندوب موجود تھے ! پھر بھی گاندھی جی مصر تھے کہ ڈاکٹر انصاری کو لندن بلوایا جائے بلکہ انھوں نے یہ تک کہہ دیا کہ اگر انصاری نہ آئے تو میں کوئی بات نہیں کر سکتا[۶۱] ! علامہ اقبال اقلیتوں کی کمیٹی کے اس پہلے اجلاس میں شریک تھے ۔ انھوں نے جب گاندھی جی کی " بالک ہٹ " دیکھی تو ان سے ایک بہت ہی واضح سوال یہ کیا کہ ۔

> " ڈاکٹر انصاری کے آنے یا نہ آنے سے قطع نظر کرکے ، یہ بتائیے کہ مسلمانوں کے مطالبات سے متعلق آپ کی کیا رائے ہے ؟ "

گاندھی جی نے جواب دیا :

> " میں انھیں درست سمجھتا ہوں[۶۱] "

گاندھی جی کے اس جواب کے بعد فطری طور پر ہر شخص کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب گاندھی جی ، مسلمانوں کے مطالبات کو بذات ِ خود درست سمجھتے تھے تو ڈاکٹر انصاری کی شرکت ِ بزم پر اتنا اصرار کیوں تھا ؟ کیا ان کی شرکت سے بزم کی رونق بڑھانی مقصود تھی یا اس میں کوئی " فی " تھی ؟ گاندھی جی اتنے بھولے تو نہ تھے کہ ڈاکٹر انصاری کو محض " رونق ِ محفل " کے لیے بلا رہے تھے ۔ ان

۶۱- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۴ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

اندرونی منشا تو یہ تھا کہ ڈاکٹر انصاری کی آمد کے بعد اقلیتوں کی کمیٹی کو مسلمانوں کے باہمی اختلافات کا اکھاڑا بنا کر ، برطانوی مدبرین کو یہ "تماشا" گول میز کانفرنس کے سینٹ جیمز پیلس میں دکھا دیا جائے اور اپنی "مہاتمائیت" کا سکہ ان پر جمایا جائے ۔ علامہ اقبال کے اس ایک سوال نے گاندھی جی کی اس ذہنیت کو بے نقاب کر دیا ! الغرض یہ پہلے اجلاس کی کارروائی تھی ۔ اس مختصر کارروائی کے بعد یہ جلسہ مالویہ جی اور سر آغا خان کی درخواست پر دو روز کے لیے ملتوی کر دیا گیا ، تاکہ اس دوران اقلیتوں کی کمیٹی کے ارکان خانگی اور نجی صحبتوں میں باہم صلاح مشورے کر سکیں ۔

دوسرا اجلاس پہلی اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ہوا ، مگر صرف تھوڑی ہی دیر کے بعد گاندھی جی کی تحریک پر یہ اجلاس بھی مزید آٹھ دن کے لیے ملتوی کر دیا گیا ۔ مقصدِ التواء پھر وہی تھا کہ غیر رسمی گفت و شنید کے ذریعہ کسی متفقہ حل کو تلاش کیا جائے ۔ لیکن اس دوسرے جلسہ میں یہ ہوا کہ ہر فرقہ کے دو ، تین افراد پر مشتمل ایک سب کمیٹی بنا دی گئی ، جس کے صدر خود آنجہانی گاندھی جی تھے ۔ اب ان آٹھ دنوں میں اس سب کمیٹی کے اجلاس ہوتے رہے ۔ ان اجلاسوں کی کچھ جھلکیاں علامہ اقبال کے ایک بیان میں نظر آتی ہیں ، جو انھوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کے چند اعتراضات کے جواب میں گول میز کانفرنس میں مسلم وفد کے طرزِ عمل کی مدافعت کرتے ہوئے دیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

> "سچی بات یہ ہے کہ یہ آغا خان ہی تھے ، جنھوں نے کئی ہندوستانی مندوبین کی موجودگی میں اور میرے سامنے مسٹر گاندھی کو یہ یقین دلایا تھا کہ اگر ہندو یا کانگریس مسلمانوں کے مطالبات مان لے تو پوری مسلم جماعت سیاسی جنگ میں ان کے (یعنی مسٹر گاندھی کے) خیمہ بردار کی حیثیت سے خدمت انجام دینے کے لیے تیار ہے ۔
>
> مسٹر گاندھی نے آغا خان کے ان الفاظ کے وزن کو محسوس کیا اور پھر مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرنے کی پیشکش کی ، لیکن یہ پیشکش شرائط کے خار دار تاروں سے گھری ہوئی تھی !

پہلی شرط یہ تھی کہ مسٹر گاندھی اپنی ذاتی حیثیت میں ان مطالبات کو تسلیم کرتے ہیں اور اپنے مؤقف کو کانگریس سے منوانے کی ضمانت نہیں دیں گے بلکہ ''کوشش'' کریں گے - میں نے ان سے کہا کہ وہ کانگریس کی عاملہ کو تار دے کر اپنی اس پیشکش سے متعلق رضا مندی حاصل کر لیں - انھوں نے جواب دیا کہ وہ جانتے ہیں کہ اس مسئلہ میں کانگریس ان کو اپنا ایلچی نہیں بنائے گی -

پنڈت جواہر لال نہرو ، مسز سروجنی نائیڈو سے جو میرے برابر بیٹھی ہوئی تھیں ، ان کے اس وقت کے تاثرات کے بارے میں پوچھ سکتے ہیں ، جو بعینہ میرے ہی تاثرات تھے - مسٹر گاندھی سے پھر یہ کہا گیا کہ وہ کم از کم ہندوؤں اور سکھوں کی رضا مندی اپنی اس پیشکش کے بارے میں حاصل کر لیں - انھوں نے اس قسم کی کچھ کوشش تو کی لیکن ناکام رہے اور خانگی طور پر ان کے رویہ کے بارے میں اپنی مایوسی کا اظہار کیا[۶۲] ''

اقبال کے اس بیان سے یہ بھی معلوم ہو جاتا ہے کہ باہمی مفاہمت کی گفتگو میں انھوں نے کیا حصہ لیا -

مسلم مطالبات کو ماننے کے سلسلہ میں علامہ اقبال نے گاندھی کی جس پیشکش کا یہاں ذکر کیا ہے ، اس کو بھی سامنے رکھ لیجیے - وہ پیشکش یہ تھی -

۱- پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی اکیاون فی صد اکثریت

۲- سندھ کی بمبئی سے غیر مشروط علیحدگی ،

۳- سرحد میں دوسرے صوبوں کے مماثل سیاسی اصلاحات کا نفاذ

۴- وفاقی اسمبلی میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی

۶۲- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی ص ۲۰۸ و ۲۰۹ -

۵- طریقۂ انتخاب کا فیصلہ عام مسلمانوں کے استصواب پر

مگر یہ پیش کش غیر مشروط نہ تھی - اس کے ساتھ انہوں نے ایک شرط تو وہی لگا دی تھی ، جس کا ذکر علامہ اقبال نے کیا ہے کہ یہ ان کی اپنی انفرادی و شخصی پیش کش ہے ، جماعتی و کانگریسی پیش کش نہیں ہے اور نہ وہ اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ کانگریس ان کو تسلیم کر لے گی اور نہ ہندوؤں اور سکھوں کو اس کے قبول کرنے پر آمادہ کر سکتے ہیں - اس کے علاوہ ان کی تین شرطیں اور بھی تھیں کہ

۱- مسلمان حق رائے دہی بالغاں کی تائید کریں

۲- کامل آزادی کی حمایت کریں

۳- سکھوں کے سوائے ، دیگر اقلیتوں بالخصوص اچھوتوں کی خاص یا جداگانہ نیابت کی تائید نہ کریں[۶۳]-

اول تو یہ پیش کش منصفانہ نہ تھی - مسلمانوں کے تمام مطالبات کو جو نہایت معقول اور منصفانہ تھے مانا نہیں گیا تھا - پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فی صد تھی اور بنگال میں ۵۴ء۸ فیصد - اور اسی تناسب سے وہ صوبائی اسمبلیوں میں نشستوں کے حق دار تھے اور یہی ان کا مطالبہ تھا - لیکن مہاتما جی نے ان دونوں صوبوں کو صرف اکیاون فیصد نشستیں دینے کی پیش کش کی تھی ! اکیاون فیصد یعنی صرف برائے نام اکثریت ! ! گویا بنیا تولنے پر تو رضامند ہوا ، مگر ڈنڈی مارنے سے نہ چوکا ! ! مسلمانوں کا مطالبہ تھا سرحد اور بلوچستان میں وہی سیاسی اصلاحات نافذ کی جائیں ، جو دوسرے صوبہ جات میں نافذ ہوں گی - بالفاظ دیگر ان دونوں مسلم صوبوں کا سیاسی مرتبہ ملک کے دیگر صوبوں کے مساوی ہو - گاندھی جی نے صوبہ سرحد کے لیے تو حامی بھر لی تھی ، لیکن بلوچستان کی طرف سے آنکھیں میچ لیں - شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں "خدائی خدمت گاروں کے رہنما خان عبدالغفار خان ان کے معتقد بن کر "سرحدی گاندھی" کا پر فخر لقب اختیار کر چکے تھے ، لیکن بلوچستان میں اس

۶۳- مکتوب مہر، اخبار انقلاب ، لاہور مورخہ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -

وقت تک ان کو اپنا کوئی قابل اعتماد پیرو نہ ملا تھا ! جداگانہ حقِ انتخاب کا مطالبہ مسلمانوں کا دیرینہ ، اصولی اور اٹل مطالبہ تھا ۔ سنہ ۱۹۱۶ع کے میثاقِ لکھنو میں کانگریس نے بھی اس مطالبہ کو تسلیم کر لیا تھا ۔ سنہ ۱۹۲۳ع کے بعد اس سے انحراف کی کوششیں ہونے لگی تھیں ۔ اسی ایک مطالبہ کے نہ ماننے کی وجہ سے مسلمانوں اور ہندوؤں کے مابین اختلاف کی خلیج وسیع تر ہو گئی ۔ گاندھی جی نے اپنی پیش کش میں اس مطالبہ کو سبو تاج کرنے کے لیے ایک شاطرانہ چال چلی کہ اس کو سیدھے طریقہ پر مان لینے کی بجائے مسلمانوں کے استصواب رائے پر منحصر کر دیا ! یہ وہی بات تھی ، جو انہوں نے ڈاکٹر انصاری وغیرہ قوم پرست مسلمانوں کی زبان سے بھوپال کانفرنس میں کہلوائی تھی ! یہ تھی گاندھی جی کی اس پیش کش کی حقیقت ! وہی پرانی مثل کہ نیا جال لائے پرانے شکاری ! ! پھر اس جال میں " شرائط " کی تہہ در تہہ گرہیں بھی پڑی ہوئی تھیں ۔ ان کی شرائط پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے کھلے ذہن اور صاف دلی کے ساتھ یہ پیش کش کی ہی نہ تھی ، بلکہ ان کے پس پردہ کچھ ذہنی تحفظات کار فرما تھے ۔ خصوصاً ان کی آخری شرط کہ مسلمان اچھوتوں کے حق جداگانہ نیابت کی تائید نہ کریں ۔ ان کے ذہنی تحفظات کی پردہ دری کر رہی تھی !

علامہ اقبال گاندھی جی کی اس آخری شرط کے سخت خلاف تھے ۔ وہ مسلمانوں کے جداگانہ حقِ انتخاب کے مطالبہ کو ایک بنیادی مطالبہ سمجھتے تھے ۔ اس لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ مسلمانوں کے لیے جس حق کے سب سے بڑے علمبردار تھے ، اچھوتوں کو اسی حق کے دئیے جانے میں رکاوٹ ڈالتے ! مولانا غلام رسول مہر جو گاندھی جی کی مسلم مندوبین سے خانگی ملاقاتوں اور گفتگوؤں کے عینی شاہد تھے ، گاندھی جی کی اس آخری شرط کے بارے میں اقبال اور دیگر مسلم مندوبین کے ردِ عمل کا ان الفاظ میں ذکر کرتے ہیں ۔

" اچھوتوں کے مطالبہ نیابتِ خصوصی کے بارے میں اقبال اور دیگر مسلم مندوبین کا خیال تھا کہ اگر ہندو بطور خود اچھوتوں یا دوسری اقلیتوں کے ساتھ کوئی فیصلہ کر لیں تو ہمیں اس پر

کوئی اعتراض نہیں ، لیکن اگر اس طرح فیصلہ نہ ہو سکے یعنی دوسری اقلیتیں مطمئن نہ ہو سکیں اور خاص نیابت کا مطالبہ کریں تو مسلمانوں کے لیے اصولاً اور "اخلاقاً" ہرگز مناسب نہ ہو گا کہ ان کے مطالبے کی مخالفت کریں اور اپنے لیے خاص نیابت کا مطالبہ کریں[۶۴]"

یہ تو مولانا مہر کا بیان تھا اب خود اقبال کی زبان سے سنئے کہ گاندھی جی کی اس شرط کے متعلق سب کمیٹی کے اجلاس میں ان کا رد عمل اور طرز عمل کیا تھا ۔ اپنے محولہ بالا بیان کا سلسلہ جاری رکھتے ہوئے وہ لکھتے ہیں ۔

"مسٹر گاندھی جی کی دوسری اور سب سے زیادہ ناجائز (Unrighteous) شرط یہ تھی کہ مسلمان اچھوتوں کے خصوصی مطالبات ، بالخصوص ان کے مطالبہ نیابتِ خاص کی تائید نہ کریں ۔ انہیں یہ بتلایا گیا کہ مسلمانوں کی زبان سے اچھوتوں کے اسی مطالبہ کی مخالفت زیب نہیں دیتی جس کا ادعا وہ خود اپنے لیے کرتے آئے ہیں اور پھر انہیں یہ بھی بتایا گیا کہ اگر وہ (یعنی مسٹر گاندھی) اچھوتوں سے کوئی باہمی سمجھوتہ کر لیں تو مسلمان ان کے راستے میں حائل نہیں ہوں گے ۔ مسٹر گاندھی نے بہرحال اس شرط پر اصرار کیا ۔ میں جاننا چاہوں گا کہ پنڈت جواہر لال نہرو اپنے مشہور و معروف اشتراکی نظریات کے باوجود اس قسم کی "غیر انسانی" (Inhuman) شرط کے ساتھ ، کیسے اظہار ہمدردی کریں گے[۶۵]"

اس طرح اقبال نے ان نجی گفتگوؤں اور سب کمیٹی کے اجلاس میں گاندھی جی اس شرط کو "نا جائز اور غیر انسانی" (Inhuman) قرار دیا اور اس کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس انکار کی بنیاد سراسر "اخلاقی"

۶۴- اخبار انقلاب ، لاہور ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔
۶۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع ثانی ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۲۰۹ ۔

تھی ! اگر وہ اس اخلاقی بنیاد کو پیش نظر نہ رکھتے تو وہ بھی "مول تول" (Bargaining) کر سکتے تھے ! !

بہرحال اقلیتوں کی کمیٹی نے جو سب کمیٹی یکم اکتوبر کو قائم کی تھی ، وہ ناکام ہو گئی اور اس کے ساتھ خانگی اور نجی گفتگوؤں کا دوسرا دور بھی ختم ہو گیا - اب پھر حسبِ اعلان اقلیتوں کی کمیٹی کا تیسرا اجلاس ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو وزیر اعظم برطانیہ کی صدارت میں ہوا - گاندھی جی نے بحیثیت صدر سب کمیٹی کو مطلع کیا کہ سب کمیٹی اپنے مقصد میں ناکام ہو چکی ہے اور فرقہ وارانہ مفاہمت ، لاینحل مسئلہ بنی ہوئی ہے - اس کی وجہ ، جو انھوں نے بیان کی ، اس کو اقبال ہی کے الفاظ میں سنیے -

> "۸ اکتوبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کا تیسرا اجلاس ہوا - اس اجلاس میں گاندھی جی نے فرقہ وارانہ مفاہمت کی ناکامی کے بارے میں حکومت کا محاسبہ کیا کہ اس نے برطانوی ہند کے وفد کے لیے ایسے اشخاص کا عمداً انتخاب کیا ، جو جیسا کہ انھوں نے کہا ،
>
> نمایندہ حیثیت نہیں رکھتے تھے"[66]

گاندھی جی کی اس تقریر کا جواب ، مسلمانوں کے وفد کی طرف سے سر شفیع نے دیا - گاندھی جی نے اپنی تقریر کے آخر میں یہ تجویز پیش کی تھی کہ اقلیتوں کی کمیٹی کے اجلاس کو غیر معینہ مدت تک ملتوی کر دیا جائے - دوسرے لفظوں میں اس کے معنے یہ تھے کہ اس کمیٹی کو برخاست کر دیا جائے - دوسرے مندوبین نے اس تجویز کی مخالفت کی - تاہم اس اجلاس میں بھی اس مسئلہ پر کوئی گفتگو نہ ہوئی بلکہ الزامات جوابی الزامات ہی میں اجلاس کا سارا وقت ضائع ہو گیا - صدر اجلاس ریمزے میکڈا نلڈ نے پھر ایک مرتبہ اپیل کی اور خانگی گفت و شنید

۶۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی ۱۹۴۸ع ص ۳۰-

کے لیے اجلاس کو ملتوی کر دیا ۔

اب پھر خانگی صحبتوں میں گفتگوئے مصالحت کا تیسرا دور شروع ہوا ، جو ۱۲ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء تک جاری رہا ۔ اس دور میں بھی گاندھی جی نے اپنی سابقہ مشروط پیش کش کے ساتھ دو متبادل تجاویز (یعنی جیوفر کاربٹ کی اسکیم اور فرقہ وارانہ مسئلہ کو ثالثی بورڈ کے حوالے کرنے کی تجویز) پیش کی تھیں جن کا ذکر ہم "پس منظر" میں کر آئے ہیں ۔ مسلمانوں نے گاندھی جی کی اس مشروط پیش کش کو ان ہی وجوہات کی بنیاد پر رد کر دیا جن کا ذکر اوپر آ چکا ہے ۔ سر جیوفرے کاربٹ کی اسکیم کو ہندوؤں اور سکھوں نے مسترد کر دیا اور گاندھی جی کی ثالثی بورڈ والی تجویز نا قابل عمل تھی !

اقلیتوں کی کمیٹی کے سلسلہ میں اب تک جو روئیداد ہم نے بیان کی ہے ، علامہ اقبال نے نہایت مختصر طور پر اس کا ذکر اپنے ایک خط میں کیا ہے ، جو ۳ نومبر کو سنیٹ جیمز کورٹ لندن سے لکھا گیا ہے

" یہ دن بہت مصروفیت کے گذرے ۔ میناریٹی کمیٹی کی میٹنگ تین دفعہ ہوئی اور تینوں دفعہ پرائیوٹ گفتگوئے مصالحت کے لیے ملتوی ہو گئی ۔ پرائیویٹ گفتگو بہت ہوئی ، مگر اب تک کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا ۔ ہندو اور سکھ مسلمانوں کی مخالفت پر اڑے ہوئے ہیں ۔ اب میناریٹی کمیٹی کی میٹنگ جس کا میں ممبر ہوں ۔ شاید ۱۱ نومبر کو ہو ۔ اس میں بھی کچھ نہ ہو سکے گا ۔ حقیقت یہ ہے کہ میناریٹی (کمیٹی) کا کام محض مصالحت کی کوشش ہے ۔ یہ کوشش کی گئی ، جس کا نتیجہ اس وقت کچھ نہیں ہوا [۶۷]"

علامہ اقبال کے اس خط سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اقلیتوں کی کمیٹی کے جلسوں میں وہ برابر شریک ہوتے رہے ، نجی گفتگوؤں اور صلاح مشوروں میں انھوں نے پوری طرح حصہ لیا اور اس طرح ۲۸ ستمبر سے ،

۶۷- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ دوم مرتبہ شیخ محمد عطاء اللہ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۵۱ء ص ۳۳۸ و ۳۳۹ ۔

جب کہ اقلیتوں کی کمیٹی کا پہلا اجلاس ہوا تھا ، اس خط کی تاریخ تحریر یعنی ۳ نومبر تک وہ "بہت مصروف" رہے - پھر ان کی اس تحریر سے یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ گفتگوئے مصالحت سے مایوس ہو چکے تھے - انہیں اس کی ناکامی کا یقین ہو چلا تھا اور اس ناکامی کا ذمہ دار انھوں نے ہندوؤں اور سکھوں کو ٹھیرایا ہے -

علامہ اقبال کا خیال تھا کہ اقلیتوں کی کمیٹی کا چوتھا اجلاس ۱۱ نومبر کو ہو گا - لیکن یہ اجلاس ۱۱ نومبر کو نہ ہوا - البتہ اس دوران اقلیتوں کا وہ میثاق مرتب ہوا جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں - اس میثاق پر سکھوں کے سوائے تمام اقلیتوں کے نمایندوں نے ۱۲ نومبر کو دستخط کیے تھے - علامہ اقبال اس میثاق سے کلیۃ متفق تھے - ۱۳ نومبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کا چوتھا اور آخری اجلاس ہوا اور اس میں یہ میثاق وزیر اعظم برطانیہ کے حوالہ کر دیا گیا - اس کے بعد جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، یہ جلسہ اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی کے اعلان کے ساتھ ختم ہو گیا -

علامہ اقبال نے ۱۸ نومبر کو کیمبرج یونیورسٹی کے ایک جلسہ میں ، جو ان کے اعزاز میں منعقد ہوا تھا ، گول میز کانفرنس میں اپنی ان سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا -

"کانفرنس کے کام میں میری شرکت بلا واسطہ نہیں بالواسطہ ہے(الف) - یہاں ہندوستان کی مختلف قوموں کی تقدیروں کا فیصلہ ہو رہا تھا اور میں نے ضروری سمجھا کہ اس کام میں شریک ہو کر میں بھی اپنے رفقاء کا ہاتھ بٹاؤں - جیسا کہ سب کو معلوم ہے ، میں انتہائی رنج و افسوس کے ساتھ کہتا ہوں کہ باہمی گفتگوؤں میں ، ہم کسی فیصلہ پر نہ پہنچ سکے اور ہم میں اتحاد نہ ہو سکا۶۸"

الف - غالباً مطلب یہ ہے کہ اقلیتوں کی کمیٹی کے رکن کی حیثیت سے گول میز کانفرنس کی کار روائیوں میں انہیں حصہ لینا پڑا -

۶۸- روزنامہ انقلاب ، ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع -

یہ روئیداد علامہ اقبال کی ان سیاسی کارگذاریوں کی ہے جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں انجام دیں ۔ ان کارگذاریوں کے بیان کے بعد یہ روئیداد ختم ہو جانی چاہیے ، لیکن علامہ اقبال کے تعلق سے گول میز کانفرنس کے ایک اور اہم واقعہ کا تذکرہ باقی ہے ۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ گول میز کانفرنس کی اقلیتوں کی کمیٹی کے علاوہ ایک اور کمیٹی تھی ، جس کو وفاقی ہیئت کی کمیٹی (Federal Structure Committee) کہا جاتا تھا ۔ علامہ اقبال اس کمیٹی کے رکن نہیں تھے اس لیے اس کمیٹی کی کارروائیوں سے انہیں براہ راست کوئی تعلق ہی نہیں تھا ۔ لیکن مسلم وفد کے ایک رکن کی حیثیت سے انہیں اس کمیٹی کے کام سے بھی دلچسپی تھی ، اس کے علاوہ اس کمیٹی سے ان کی دلچسپی کی ایک خاص وجہ بھی تھی ۔

گول میز کانفرنس میں ان کی شرکت کا خاص مقصد یہ تھا کہ آئندہ دستور میں مسلمانوں کے سیاسی موقف کا تعین ہو جائے ۔ اس مقصد کو انھوں نے اپنی کیمبرج یونیورسٹی والی تقریر میں جس کا حوالہ اوپر گذر چکا ہے ، بہت واضح طور پر بیان کیا ہے ۔ یہ مقصد دو طرح حاصل ہو سکتا تھا ، ایک تو یہ کہ ہندوستان کی مختلف قوموں میں باہمی مفاہمت ہو جائے یا پھر حکومتِ برطانیہ اس بارے میں کوئی اعلان کر دے ۔ باہمی مفاہمت کے لیئے ہی اقلیتوں کی سیاسی کمیٹی بنائی گئی تھی ، لیکن بدقسمتی سے یہ کمیٹی ناکام ہو گئی اور باہمی مفاہمت کی کوئی صورت نہ نکل سکی ۔ اس طرح آئندہ دستور میں مسلمانوں کے سیاسی موقف کو متعین کروانے کا ایک راستہ تو بند ہو گیا تھا ۔ اب دوسرا راستہ یہی تھا کہ حکومتِ برطانیہ اس بارے میں اعلان کر دے ۔ سو یہ اعلان ابھی نہ ہو پایا تھا ۔ ریمزے میکڈ اللڈ وزیر اعظم برطانیہ نے ، جن کے سر یہ ذمہ داری ڈالی گئی تھی ، ابھی کوئی اعلان نہیں کیا تھا ۔ انھوں نے اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری اجلاس میں جو کچھ کہا تھا اس کا حاصل صرف اتنا تھا کہ اگر فرقہ وارانہ مسائل کا فیصلہ نہ ہوا تو اس کا مطلب یہ نہ سمجھا جائے کہ دستور نہیں بنے گا ۔ گویا ایک در بند ہو گیا تو دوسرا دروازہ وانہ ہوا تھا اور ایک گو مگو کی سی حالت طاری تھی ۔ علامہ اقبال کا

موقف یہ تھا کہ جب تک یہ مقصد اصلی حاصل نہ ہو جائے ، گول میز کانفرنس کی دوسری کمیٹی ، فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی ، کے مباحث میں مسلم اراکین کو شرکت نہیں کرنی چاہیے ۔ یہ موقف مدلل تھا کیونکہ وفاق ہیئت کی اسکیم (Federal Structure Scheme) میں ہندو مسلم اور دیگر اقلیتوں کے مسائل سے واسطہ پڑتا تھا ، مثلاً وفاق مقننہ میں ہندو ، مسلم اور دیگر فرقوں کی نشستوں اور طریقۂ انتخاب وغیرہ کے معاملات کو طے کرنا پڑتا تھا اور یہ مسائل اس وقت تک طے نہیں کیے جا سکتے تھے ، جب تک کہ ان قوموں کے مابین کوئی مفاہمت نہ ہو جائے یا عدم مفاہمت کی صورت میں حکومت ہی کوئی اعلان نہ کر دے ۔ اس موقف سے وفاق کمیٹی کے مسلم اراکین کو بھی اتفاق تھا اور یہی موقف انھوں نے وفاق کمیٹی کے اجلاس منعقدہ ۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع میں اختیار بھی کیا تھا ۔ دوسرے اجلاس منعقدہ ۹ اکتوبر میں بھی ان کا طرز عمل یہی تھا ۔ لیکن اس زمانہ میں اقلیتوں کی کمیٹی ابھی برسر کار تھی اور مفاہمت کی کوششیں جاری تھیں ، اس لیے وہ وفاق کمیٹی میں مالیاتی امور اور وفاق عدالت کے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک حد تک آمادہ ہو گئے تھے ، تاہم اسی دوران انھوں نے یہ طے کر لیا تھا کہ وفاق کمیٹی کے اجلاسوں میں شرکت سے پہلے ہر موقع پر عام مسلم مندوبین سے بھی شرکت یا عدم شرکت کے بارے میں مشورہ کر لیا جائے گا ۔ اس طرح جب ۲ نومبر کو اس کمیٹی کا اجلاس ہوا تو ، مسلم اراکین نے وفاق عدالت کے مسئلہ پر بحث کرنے سے محض اس لیے انکار کر دیا کہ اس وقت تک اقلیتوں کی کمیٹی کا کوئی متفقہ فیصلہ سامنے نہیں آیا تھا ۔ اس کے بعد وفاق کمیٹی کا کوئی اجلاس ۱۶ نومبر تک نہ ہوا ۔ اس دوران اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی کا اعلان ہو گیا ۔ ۱۵ نومبر کو مسلم مندوبین نے یہ طے کیا کہ وہ ۱۶ نومبر کی وفاق کمیٹی کے مباحث میں حصہ نہیں لیں گے[۶۹]۔ یہ فیصلہ ان مسلم مندوبین کے سابقہ موقف کے عین مطابق اور علامہ اقبال کے

۶۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۲۱ ۔

نقطۂ نظر سے بالکل درست تھا ۔ لیکن ہوا کیا ؟

۱۶ نومبر کو جب وفاق کمیٹی کا اجلاس ہوا تو مسلم اراکینِ کمیٹی یہ توقع کر رہے تھے کہ خود برطانوی مندوبین اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی کے پیش نظر وفاق کمیٹی کو بھی توڑ دیں گے ، لیکن ان توقعات کے برعکس برطانوی مندوبین نے اجلاس جاری رکھنے پر زور دیا ۔ اس نئی صورتحال کے پیش آ جانے پر مسلم اراکین نے کمیٹی کے اجلاس کو دو گھنٹے کے لیے ملتوی کروایا ، عام مسلم مندوبین سے مشورہ کیا اور اپنے سابقہ فیصلہ کو الٹ دیا اور وفاق کمیٹی کے مباحث میں شرکت کی اور یہی نہیں بلکہ ۲۶ نومبر کے اجلاس میں مسلم اراکین کے " ترجمانوں نے یہ اعلان کیا کہ وہ صوبائی خود مختاری اور مرکزی ذمہ داری (Central Responsibility) کے بیک وقت نفاذ پر رضامند ہیں[۷۰]''۔

علامہ اقبال مسلم اراکین کمیٹی کے ۱۶ نومبر والے نظرثانی شدہ اس فیصلہ کے انتہائی مخالف تھے ۔ انھوں نے مسلم اراکین کمیٹی سے صاف کہہ دیا تھا کہ وفاق ہئیت کی کمیٹی کے مباحث سے قطعی علیحدگی و بے تعلقی کا اعلان کر دینا چاہیے[۷۱]۔ لیکن جب وفاق کمیٹی کے مباحث میں شرکت کا فیصلہ ہو گیا تو علامہ نے اسی دن سر آغا خان ، صدرِ وفد ، کے نام ایک خط لکھ کر نہ صرف اس فیصلہ سے اپنی ناراضی کا اظہار کیا بلکہ مسلم وفد سے علیحدگی کا اعلان بھی کر دیا ۔ اس خط کا ترجمہ درج ذیل ہے

" سینٹ جیمز پیلیس

ایس ، ڈبلیو ، جے

۱۶ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع

یور ہائی نس !

انتہائی دکھ کے ساتھ میں یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں ۔ ابتداء ہی

۷۰- ایضاً ، ص ۱۴ ۔

۷۱- روزنامہ انقلاب ، لاہور ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

سے مسلم وفد کی کاروائیوں کو بنظر غائر دیکھتا رہا ہوں - ان کی خفیہ رقابتوں اور بعض اراکین کی سازشوں ، بلکہ بے وفائیوں سے مجھے بے انتہا تکلیف پہنچی - اس طرز عمل سے بیزار ہو کر میں نہایت افسوس کے ساتھ آپ کو یہ اطلاع دے رہا ہوں کہ آج کی تاریخ سے مجھے اس سے جس کو مسلم وفد کی ظلّی کابینہ (Shadow Cabinet) کہنا چاہیے کوئی سروکار نہیں رہے گا -

آپ کا مخلص

محمد اقبال۷۲''

اس واقعہ کو گذرے ہوئے دو ہی دن ہوئے تھے کہ مجلس عاملہ کل ہند مسلم کانفرنس کی قرارداد بتاریخ ۱۹ نومبر علامہ اقبال کے نام وصول ہوئی جس میں کہا گیا تھا کہ

'' مجلس عاملہ فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں مسلم مندوبین کی شرکت کو ، اس وقت تک مسلم کانفرنس کی ہدایت کے منافی سمجھتی ہے جب تک کہ فرقہ وارانہ مسئلہ تسلی بخش طور پر حل نہ ہو جائے اور مسلم ارکان کو متنبہ کرتی ہے کہ یہ کمیٹی ایسے فیصلہ کو منظور نہیں کرے گی جو کسی ایسے مسئلہ سے متعلق کیا جائے ، جس پر مسلم کانفرنس نے اپنی قطعی رائے ظاہر کی ہو -

۲- یہ کمیٹی مسلم مندوبین کی مساعی جمیلہ کو بنظر استحسان دیکھتی ہے ، جو انھوں نے غیر مسلم مندوبین کے ساتھ مفاہمت اور سکھوں کے سوا تمام اقلیتوں کے ساتھ تعاون اور اشتراک عمل کے سلسلہ میں کی ہیں - مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ اعلان کرتی ہے کہ پنجاب اور بنگال میں مسلم نیابت کو اکیاون فیصدی تک گھٹانا نہیں چاہیے بلکہ آبادی کے متناسب ہونی چاہیے -

۳- مجلس عاملہ قرار دیتی ہے کہ صوبہ سرحد کی صوبائی مقننہ

۷۲- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ، اے - ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ ص ۸ و ۹ -

تمام تر منتخب ہونی چاہیے اور صوبہ مذکور کو وہی اختیارات ملنے چاہیں جو دیگر صوبوں کی وزارتوں کو حاصل ہیں ،

۴۔ ہندوستان کے مسلمان مطالبہ کرتے ہیں کہ سندھ کو غیر مشروط طور پر علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے ۔ مجلس عاملہ سندھ کی مالی تحقیقاتی کمیٹی کے فیصلوں سے مطمئن نہیں ہے کیونکہ کمیٹی نے سندھ کے مصارف کی تجویز پر غور نہیں کیا ، جو ایک جدید صوبے کی مالی ضروریات کے موافق ہوں[۸۳]''

اس قرارداد ، بالخصوص اس کے فقرہ اول نے علامہ اقبال کے موقف ، توثیق کر دی تھی ۔ اس قرارداد کے پہنچنے کے معاً بعد انھوں نے اریخ ۲۰ نومبر وزیر ہند کو لکھ بھیجا کہ "مسلمانوں کے اس فیصلہ کے د میرا یہاں رہنا قطعاً سود مند معلوم نہیں ہوتا ۔ لہذا میں ۲۱ نومبر کو جا ا رہا ہوں[۸۴]" اور اسی برہمی کے عالم میں انھوں نے گول میز کانفرنس ر لندن دونوں کو خیرباد کہہ دیا ۔

ان تمام تفصیلات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال وفاق کمیٹی ں مسلم اراکین کی شرکت سے اس درجہ ناراض تھے کہ انھوں نے نہ رف مسلم وفد سے علیحدگی کا اعلان کر دیا بلکہ فی الفور لندن سے بھی خصت ہو گئے ۔ پھر اسی پربس نہیں کیا ، ہندوستان واپس آ کر انھوں نے ن مسلم اراکین کی خبر لی ۔ مارچ سنہ ۱۹۳۲ع میں کل ہند مسلم کانفرنس ے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے انھوں نے کھلے بندوں ان پر بڑی تید کی ۔ ایک نظر اس تنقید پر بھی ڈال لیجیے ۔ انھوں نے اپنے خطبہ دارت میں گول میز کانفرنس کی اقلیتوں والی کمیٹی کی مختصر روائید اور ں کمیٹی میں مسلم مندوبین کی کارگذاریوں کو بیان کرنے کے بعد کہا ۔

'' ہمارے مندوبین نے فرقہ وارانہ مفاہمت کی بہتری کوششیں کیں ۔ لیکن ایک بات جو میرے لیے راز سربستہ بنی ہوئی ہے اور جو

۸۳۔ روزنامہ انقلاب ، لاہور ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

۸۴۔ روزنامہ انقلاب ، لاہور ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

شاید ہمیشہ کے لیے راز سربستہ بنی رہے گی - وہ ہمارے ترجمانوں کی جانب سے ۲۶ نومبر سنہ ۱۹۳۱ کا وہ اعلان ہے ، جو انھوں نے وفاقی کمیٹی میں کیا - اس اعلان کے مطابق وہ اس بات پر راضی ہو گئے ہیں کہ صوبوں میں خود مختاری اور مرکز میں ذمہ داری بیک وقت نافذ کر دی جائے - آیا اس اعلان کی وجہ مصالحت اور ملک کی سیاسی ترقی کے لیے ان کی بے چینی تھی یا وہ متصادم اثرات تھے جو ان کے ذہنوں میں کار فرما تھے —، میں اس بارے میں کچھ کہہ نہیں سکتا - ۱۵ نومبر کو ، جبکہ میں ان سے علیحدہ ہو گیا تھا ، مسلم مندوبین نے یہ طے کیا تھا وفاقی کمیٹی کے مباحث میں وہ حصہ نہیں لیں گے - پھر انہوں نے ان مباحث میں ، اپنے ہی فیصلہ کے خلاف کیوں حصہ لیا ؟ کیا وفاقی کمیٹی میں ہمارے ترجمانوں کو ۲۶ نومبر کے اعلان کا مجاز قرار دیا گیا تھا ؟ میں اس موقف میں نہیں ہوں کہ ان سوالات کا جواب دوں - جو کچھ میں کہہ سکتا ہوں ، وہ بس اتنا ہی ہے کہ مسلم جماعت اس اعلان کو بہت بھاری غلطی تصور کرتی ہے . . . . میں نے کل ہند مسلم لیگ کے خطبہ میں ایک کل ہند وفاق کے تصور کے خلاف آواز بلند کی تھی بعد کے واقعات نے ثابت کر دیا کہ یہ تصور ہندوستان کی سیاسی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بن رہا ہے - اگر مرکزی ذمہ داری (Central Responsibility) کے رائج کرنے کا انحصار ایک کل ہند وفاق کی تکمیل پر ہے (جو مجھے ڈر ہے کہ کافی وقت لے گا) تو حکومت کو چاہیے کہ برطانوی ہند کے صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کا فوراً نفاذ کر دے تاکہ وہ بنیاد (جس کا اس طرح نقشہ تیار کیا جا رہا ہے) مرکزی ذمہ داری کی آمد آمد تک ، تجربہ کی روشنی میں تیار ہو جائے جس پر وفاق کی بھاری بھر کم ہئیت کا بوجھ ڈالا جائے گا -

میرے پاس یہ یقین کرنے کی وجہ ہے اور اپنے وفد سے جدا ہونے کے چند دن قبل ، مجھے اس بات کا شبہ ہوا تھا کہ برطانوی

ہند کے صوبہ جات میں فوری ذمہ دارانہ حکومت کے قیام کی تجویز کو ، ہمارے ترجمانوں کی طرف سے رد کر دینے میں ، بعض دیگر انگریز سیاستدانوں کے غلط مشورہ کو دخل ہے ۔ حال ہی میں لفٹننٹ کمانڈر کینورتھی نے بھی اسی خیال کا اظہار کیا ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔ 'میں سمجھتا ہوں کہ لندن میں اعتدال پسند قائدین کو بعض انگریز سیاستدانوں نے اس معاملے کے متعلق غلط مشورہ دیا اور یہ کہ انھوں نے (یعنی اعتدال پسند قائدین نے) ان کے مشورہ کو بہت ہی عجلت پسندی کے ساتھ قبول کر لیا اور صوبائی خود مختاری کی عظیم قسط کا انکار کر دیا اور عجیب و غریب بات یہ ہے کہ مہاتما گاندھی ، اس قسط پر ہمدردی کے ساتھ غور کرنے کے لیے بالکل آمادہ نظر آتے تھے ۔' یہ اعتدال پسند قائدین کون ہیں ، جن کی طرف لفٹننٹ کمانڈر نے اشارہ کیا ہے ؟ سر تیج بہادر نے لندن میں اور اب مشاورتی کمیٹی میں ، صوبائی خود مختاری کے فوری نفاذ کے متعلق جو رویہ اختیار کیا ہے ، اس کے پیش نظر یہ بات واضح ہے کہ مندرجہ بالا اقتباس کے لکھنے والے کے نزدیک اعتدال پسند قائدین سے مراد ، ہندو اعتدال پسند قائدین نہیں ہیں ۔ میرا خیال ہے کہ غالباً اس کی مراد مسلم اعتدال پسند قائدین سے ہے ، جن کا وفاق ہئیت کی کمیٹی میں ۲۶ نومبر والا اعلان ہی ، حقیقتاً برطانوی وزیر اعظم کے اس بیان کا ذمہ دار ہے کہ مرکز اور صوبوں میں ذمہ داری کا نفاذ بیک وقت ہو گا اور چونکہ صوبوں میں ذمہ دارانہ حکومت کے فوری نفاذ سے یہ لازم آتا تھا کہ پنجاب و بنگال میں اکثریت کے حقوق کے تعلق سے ہماری قوم کے مطالبہ کے بارے میں کوئی قطعی اعلان کر دیا جائے ، اس لیے موجودہ صورتحال کا جائزہ لیتے وقت ، ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہمارے اپنے لیڈروں کا رویہ ہی وزیر اعظم کی خاموشی کا خصوصی طور پر ذمہ دار ہے اور اِسی خاموشی کے باعث مسلم قوم کے ذہن میں

ہر قسم کے شکوک و شبہات پیدا ہو رہے ہیں[۷۵]۔"

اقبال کی اس قدر تلخ تنقید اور اتنی سخت برہمی کی آخر وجہ کیا ہے ؟

مندرجہ بالا اقتباس اور گول میز کانفرنس میں اقبال کی عمومی سیاسی روش پر غور کرنے سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ذہن اس دوران کچھ ان خطوط پر کام کر رہا تھا ۔

۱۔ گول میز کانفرنس میں سب سے مقدم کام یہ ہے کہ آئندہ دستور میں مسلمانوں کے سیاسی موقف کا تعین ہو جائے ، خواہ یہ تعین بذریعہ مفاہمت باہمی ہو یا بتوسط اعلان سرکاری ۔

۲۔ اس کے بعد صوبائی خود مختاری اور صوبوں میں مکمل ذمہ دارانہ حکومتوں کے فوری قیام پر زور دیا جائے ۔

۳۔ اس نکتہ پر اصرار کیا جائے کہ صوبوں میں مکمل ذمہ دارانہ خود مختار حکومتوں کا قیام اور مرکز میں وفاقی حکومت کا قیام ساتھ ساتھ نہ ہو ، بلکہ صوبائی خود مختاری کا کامیاب تجربہ ہو جانے کے بعد ، وفاقی حکومت قائم کی جائے بالفاظ دیگر صوبائی خود مختاری مقدم رکھی جائے اور مرکزی اختیارات کی سپردگی مؤخر کر دی جائے ۔

۴۔ اگر مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تعین بطریق مصالحت یا بذریعہ سرکاری اعلان نہ ہو تو صوبائی خود مختاری کے نفاذ پر زور دیا جائے اور وفاقی امور کو طے کرنے میں کوئی حصہ نہ لیا جائے تاکہ حکومت پر ایک طرح کا سیاسی دباؤ پڑے اور وہ صوبائی خود مختاری کے نفاذ کی تیاری کرے ۔ ایسی صورت میں لازماً آسے مسلمانوں کے سیاسی حقوق بالخصوص پنجاب و بنگال میں ان کے سیاسی موقف کے متعلق غور کرنا

۷۵۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۴ تا ۴۳ ۔

پڑے گا ۔

اس کے برعکس ہندوؤں اور گاندھی جی کے ذہن میں یہ بات تھی کہ اقلیتوں یا مسلمانوں کے حقوق اور ان کے سیاسی موقف کی بات ثانوی درجہ کی چیز ہے ، صوبائی خود مختاری بھی کوئی اہمیت نہیں رکھتی ۔ لہذا سب سے پہلے مرکز اور اس کی ذمہ داری (Responsibility) کے مسائل طے کیے جائیں ۔ چنانچہ انھوں نے اپنا یہ ذہن گول میز کانفرنس کے مختلف اجلاسوں میں کھول کر رکھ دیا تھا ۔ ۸ اکتوبر کو اقلیتوں کی کمیٹی کے تیسرے باضابطہ اجلاس میں انھوں نے اس کمیٹی کو غیر معینہ مدت تک ملتوی رکھنے اور دستور کے عام مسائل کو حل کرنے پر جو زور دیا تھا ، وہ اسی ذہن کی عکاسی کر رہا تھا ۔ ۹ اکتوبر کو وفاق کمیٹی کے جلسہ میں بھی انھوں نے یہی بات دھرائی تھی اور اقلیتوں کی کمیٹی کے آخری اجلاس منعقدہ ۱۳ نومبر میں انھوں نے وزیر اعظمِ برطانیہ کو مخاطب کر کے صاف صاف کہا کہ ''یہ کانفرنس اس لیے منعقد نہیں ہوئی تھی کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کریں بلکہ آپ کی غرض یہ تھی کہ ترتیبِ دستور میں ہم سے مشورہ لیں[۷۶]''

یہ دو متوازی خطوط تھے جن پر اقبال اور گاندھی جی کے ذہن دوران گول میز کانفرنس کام کر رہے تھے ۔ ان خطوط کی روشنی میں اقبال کا واضح اور پختہ خیال یہ تھا کہ اقلیتوں کی کمیٹی کی ناکامی کے بعد ، وفاق کمیٹی سے مسلم مندوبین کو تعاون نہیں کرنا چاہیے اور اس کمیٹی کے مباحث میں شرکت کے بجائے انھیں متفقہ طور پر حکومت سے یہ کہنا چاہیے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات کے متعلق واضح فیصلہ کر دے اور صوبوں میں مکمل خود مختار حکومت فوراً نافذ کر دے ۔ اس طرح حکومت پر ایک طرف تو سیاسی دباؤ پڑے گا اور دوسری طرف وفاق اسکیم ایک لمبے عرصہ تک معرض التواء میں پڑ جائے گی ۔ غور سے دیکھیے تو معلوم ہو گا کہ گول میز کانفرنس کے موقع پر اقبال کی یہ سیاسی پالیسی نہایت دور رس نتائج کی حامل تھی ۔ برصغیر میں مسلم مملکت کی تشکیل کا جو

۷۶- سفر نامۂ اقبال از محمد حمزہ فاروقی مطبوط کراچی ۱۹۷۳ع ص ۹۹ ۔

تصور ان کے ذہن میں کار فرما تھا ، اس کو پیچیدہ حالات میں سے
کر آگے کی طرف بڑھانے کے سلسلہ میں یہ ایک طرح کا دانشمندان
تھا ! ـــــــ لیکن ہوا یہ کہ بجائے آگے کی طرف یہ اقدام کر
مسلم مندوبین پیچھے کی طرف دو قدم لوٹ گئے ۔ انھوں نے مسلمان
سیاسی مؤقف کو متعین کروانے کے لیے نہ تو حکومت پر دباؤ ڈ
نہ صوبائی خود مختاری کے فوراً نفاذ کا مطالبہ کیا ۔ یہ دونوں با
اسی وقت ہو سکتی تھیں جب کہ وفاق کمیٹی میں شرکت سے ان
دیا جاتا ۔ انھوں نے اس کے برعکس وفاق کمیٹی میں شرکت کی ،
مباحث میں حصہ لیا اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ صوبائی خود
اور وفاق اسکیم کے بیک وقت نفاذ پر رضا مندی کا اظہار کر دیا !
اس طرح ان کی اس غلط پالیسی کے باعث نہ تو مسلم حقوق کا تعیز
نہ صوبائی خود مختاری کے فوری نفاذ کا اعلان ہوا ، بلکہ اعلان
وزیر اعظم کی طرف سے یہ کہ مرکز اور صوبوں میں بیک وۃ
اختیارات باستثنائے چند ، ہندوستانیوں کے حوالے کر دئے جائیۃ
علامہ اقبال تو کل ہند وفاق اسکیم کو فی الحال مؤخر اور مستقبل ،
کو معطل اور بالآخر ختم کر دینا چاہتے تھے اور مسلمانوں کے سیاسی
کو متعین کرنا اور صوبائی خود مختاری کے نفاذ کو مقدم رکھنا
تھے ۔ گویا جو سیاسی بساط انھوں نے اپنے ذہن میں بچھا رکھی
مسلم اراکینِ وفاق کمیٹی اور ان کے " ترجمانوں " نے اپنی " ز
سے اس کو الٹ کر رکھ دیا تھا ۔ اور یہی اصل وجہ تھی ، علا
اس قدر سخت قدم اٹھانے کی کہ فوراً ہی انھوں نے ان مندوبین ؛
تعلق کر لیا ، لندن میں قیام تک گوارا نہ کیا اور ہندوستان پہنچ
کو سخت ترین تنقید کا نشانہ بنایا ! یہ رہی اقبال کی سیاست دوسر
میز کانفرنس کے دوران ! اس پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا
انھوں نے کانفرنس میں نہایت سنجیدہ ، باوقار اور بہت ہی محتاط ط
حصہ لیا ۔ وہ اس دوران " بہت مصروف رہے " ، اقلیتوں کی کمیٹی
اجلاس میں شریک رہے ، نجی گفتگوؤں اور خانگی صلاح مشوروں ،
پورا حصہ لیا ، لیکن نہ کہیں بڑھ چڑھ کر بولے ، نہ کسی موقع پ

آرائی کی اور نہ کسی پر الزامات و جوابی الزامات کی بوچھاڑ کی ۔ گاندھی جی سے البتہ ان کی کچھ نوک جھونک سی رہی لیکن وہ بھی صرف اہم اور چبھتے ہوئے سوالات کی شکل میں! گول میز کانفرنس میں اقبال کے اس محتاط طرزِ عمل کی بعض وجوہ سمجھ میں آتی ہیں ۔

۱۔ ہنگامہ آرائی ، شور و شغب ، موقع بے موقع قوت گویائی کا مظاہرہ کرنا ، ان کی طبیعت و فطرت کے خلاف تھا ،

۲۔ انھیں اس کا موقع ہی نہیں ملا کہ وہ مفصل اور مدلّل طریقہ پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ۔ وہ اقلیتوں کی کمیٹی کے رکن تھے ۔ اس کمیٹی کے ابتدائی تین جلسے صرف تھوڑی دیر کے لیے منعقد ہوئے اور پھر التواء پر التواء ہوتا رہا ۔ زیادہ وقت نجی گفتگوؤں اور صلاح مشوروں کی نذر ہو گیا ۔ آخری چوتھا جلسہ ہوا ، تو اس میں اقلیتوں کا میثاق پیش کر دیا گیا اور ساتھ ہی ناکامی کا اعلان کر دیا گیا ۔ علامہ تقریر کرتے تو کہاں کرتے؟ مولانا غلام رسول مہر کا بیان ہے کہ

'حضرت علامہ نے احتیاطاً مطالبات کے متعلق اپنی تقریر لکھ بھی لی تھی ، جب وہ دنیا کے سامنے آئے گی تو یقیناً بہت سے ایسے گوشے بے نقاب ہوں گے جو اب تک بے نقاب نہیں ہوئے[77] ' لیکن اس کی نوبت ہی نہ آئی!

۳۔ تدبر اور عملی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ وہ نہایت ہی محتاط روش اختیار کیے رہتے ۔ کانفرنس کے باضابطہ جلسوں ، نجی صحبتوں اور خانگی ملاقاتوں میں بھی انھیں ، اپنی ہر بات کو تولنا اور زبان کھولنا چاہیے تھا اور یہی انھوں نے کیا ۔ تدبر کا یہ تقاضا کیوں تھا؟ اس لیے کہ تمام مسلم مندوبین میں ایک علامہ ہی کی ذات ایسی تھی ، جو اینگلو ہندو پراپیگنڈے

۷۷۔ روز نامہ انقلاب لاہور ۵ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع ۔

کا ہدف بنی ہوئی تھی ۔ ان کے سینہ پر " پان اسلامسٹ " کا تمغہ لٹکا دیا گیا تھا اور ان کے پیش کردہ تصور مسلم مملکت کو " پان اسلامزم " کی ایک کڑی قرار دے دیا گیا تھا ۔ اور اس " پان اسلامزم " سے ان دنوں پوری برطانوی قوم " الرجک " تھی ! ایسی حالت میں اگر علامہ غیر محتاط طرز اختیار کرتے ، تقریروں اور بیان بازیوں کی رو میں بہہ جاتے اور ان کی زبان سے کوئی ایک آدھ فقرہ بھی ایسا ویسا نکل جاتا ، تو برطانوی پریس اور ہندو صحافی اس کو لے اڑتے اور بات کا بتنگڑ بن جاتا ۔ اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ اقبال کے اس قدر محتاط رہنے کے باوجود ایڈورڈ تھامسن نے خواہ مخواہ " پان اسلامی سازش " کی کیچڑ ان پر اچھالی تھی ۔ اگر علامہ محتاط طرزِ عمل اختیار نہ کرتے تو یہی نہیں کہ اس قسم کی سازشوں کے ان پر بے بنیاد الزامات لگائے جاتے بلکہ اس اصلی مقصد کو بھی نقصان پہنچ جاتا ، جس کے حصول کو علامہ نے سب سے مقدم قرار دے رکھا تھا یعنی مسلمانوں کے سیاسی حقوق کا تعین و تحفظ ! !

اقبال مصر میں گول میز کانفرنس کے اجلاس یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء تک ہوتے رہے ، لیکن علامہ اقبال ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء کو لندن چھوڑ چکے تھے ۔ لندن سے پیرس ہوتے ہوئے وہ روم (اٹلی) پہنچے ۔ روم سے علامہ اقبال یکم دسمبر کو مصر پہنچے ، اور قاہرہ میں چار دن قیام کیا ۔ ان کا یہ سفرِ مصر ایک گونا سیاسی اہمیت کا حامل ہے اور اس کا تعلق ہمارے موضوع سے بھی ہے ۔ واضح رہے کہ لندن جاتے ہوئے علامہ عدن اور پورٹ سعید سے گذرے تھے اور ہم بتا چکے ہیں گاندھی جی بھی لندن جاتے ہوئے ، علامہ اقبال سے پہلے ان ہی دونوں بندرگاہوں پر رکے تھے ۔ عدن میں تو گاندھی کا بڑا پر تپاک استقبال ہوا تھا ، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں ۔ اس سواگت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ عرب ممالک بالخصوص مصر میں کانگریسی پراپیگنڈے کا بڑا اثر ہے ۔ یہاں کانگریس کو آزادی خواہ جماعت اور گاندھی جی کو جنگ آزادی کا ہیرو سمجھا جاتا تھا ۔ مسلم لیگ

مسلمانوں کے متعلق تمام تاثر یہ تھا کہ وہ برطانیہ کے ہواہ خواہ ہیں ہندوستان کی آزادی میں خواہ مخواہ روڑے اٹکا رہے ہیں - علامہ اقبال لندن جاتے ہوئے اور پھر واپسی پر مصر میں قیام کرکے بڑی حد تک ن کی ان غلط فہمیوں کا ازالہ کیا - لندن جاتے ہوئے پورٹ سعید پر نے جو بیانات دئے یا تقریریں کیں ، ان کا ذکر ہم نے اس موقع پر ے نہیں کیا تھا کہ اس سے بیان کا تسلسل ٹوٹ جاتا تھا اب یہاں ان ، سیاسی مصروفیتوں کا ذکر کیا جاتا ہے -

لندن جاتے ہوئے ، علامہ اقبال کا جہاز ۲۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو سعید پر رکا تھا - جہاز پر کچھ مصری نوجوان ان سے آ کر ملے - نوجوانوں کے خیالات اور علامہ کے تاثرات خود ان ہی کی زبان ئیے -

" مصر کے مسلمان عام طور پر یہ سمجھتے ہیں کہ مسلمانانِ ہند ، ہندوستان کی آزادی کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں - یہ پراپیگنڈا دیگر اسلامی ممالک میں بھی کیا گیا ہے - پورٹ سعید پر تقریباً ہر مسلمان نوجوان نے مجھ سے یہ سوال کیا ، لیکن معلوم ہوتا ہے کہ اب ان کی آنکھوں سے رفتہ رفتہ حجاب اٹھ رہا ہے - میں نے ان کو طویل لکچر دیا اور بتایا کہ ہندوستان کا پولیٹیکل پر الیم کس طرح مسلمانانِ ہند پر اثر انداز ہوتا ہے - میری گفتگو سننے کے بعد ، ایسا معلوم ہوتا تھا ، کہ ان کی طبیعت سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا ہے - تقریر کے بعض حصے انھوں نے نوٹ بھی کر لیے تھے[۸] "

اوپر جس تقریر کا ذکر علامہ اقبال نے کیا ہے ، اس کے کچھ ت ملاحظہ فرمائیے -

" ہندوؤں کو فکر لگی رہتی ہے کہ مسلمان افغانیوں ، بلوچوں اور سرحد کے مسلمانوں کی مدد سے ہندوستان پر قبضہ کر لیں گے -

---

روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -

لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ اگر مصر آزاد ہو جائے تو مصری اپنا ملک ترکوں کو اس وجہ سے حوالہ کر دیں گے کہ ترک مسلمان ہیں؟ نیز کانگریس کا عدم تشدد محض انگریزی سنگینوں کے سامنے ہے، ورنہ مرزا پور، کانپور اور سری نگر وغیرہ کے حالات سے ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے مقابلہ کے لیے تشدد ہے[۹۷]"

پھر انھوں نے ایک تحریری بیان بھی دیا، جو درج ذیل ہے -

"مصری لوگوں کو شبہ ہے کہ ہندی مسلمان آزادی کے راستے میں کانٹے ہیں - اس میں ذرا صداقت نہیں - اگر مصری اصحاب کے دلوں میں یہ خیال بیٹھ گیا ہے تو اس لیے کہ ان اصحاب نے ہندوستان کی سیاست سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں فرمائی - اس لیے میں چاہتا ہوں کہ مصری اخبارات کے مندوبین، ہندوستان آ کر مطالعہ کریں - ہندوستان میں مصری مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کیا جاتا ہے کہ مصری مسلمانوں نے قرآن اور اسلام کو خیرباد کہہ دیا ہے، حالانکہ یہ شرارت ہے[۹۷]"

"تکلموالناس علیٰ قدرِ عقولِہم" (لوگوں سے ان کی عقل کے مطابق بات کیا کرو) علامہ اقبال نے اس حدیث شریف پر عمل کرتے ہوئے مختصر بات کی لیکن ایسی جو مصریوں کی سمجھ میں فوراً آ جانے والی تھی!

یہ باتیں تو لندن جاتے ہوئے پورٹ سعید پر چند گھنٹوں کے قیام کے دوران کی گئی تھیں، لیکن جب لندن سے واپس ہوتے ہوئے قاہرہ میں انھوں نے چار دن قیام کیا تو مصریوں کی ان غلط فہمیوں کو دور کرنے کا زیادہ موقع ملا - یہاں مصر کی مشہور و معروف شخصیتوں سے ان کی ملاقاتیں رہیں، صحافی انھیں گھیرے رہے، انجمنوں اور دعوتوں میں انھیں تقریریں کرنی پڑیں - مشاہیر میں وفد پارٹی کے صدر مصطفیٰ نحاس پاشا جو بعد میں مصر کے وزیر اعظم بھی رہے، محمود فہمی نقراشی سابق وز

۹۷- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -

ِلات ، محمود پاشا رئیس حزب الاحرار ، محمد علی پاشا ، مشہور صحافی
سین بیکل ، زعیمِ شام ڈاکٹر شہندر وغیرہ نے ان سے ملاقات کی ۔ ان
اتوں میں اقبال نے علمی و اسلامی موضوعات کے علاوہ سیاسی
صوص ہندوستانی سیاست پر سیر حاصل تبصرہ کیا ۔ چونکہ وہ ابھی ابھی
میز کانفرنس سے لوٹ رہے تھے ، لہذا ان مشاہیر کو اس کی کارروائیوں
جاننے کا اشتیاق تھا ۔ علامہ اقبال نے اس کانفرنس کی روئیداد بھی بیان
ور ساتھ ہی ہندوؤں اور گاندھی جی کی پالیسی کو بھی واضح کیا ۔
ملاقاتوں کا بہت اچھا اثر مترتب ہوا ۔ کانگریس کی اصلی تصویر ان کے
ے آ گئی اور مسلمانانِ ہند کا سیاسی مؤقف ان کی سمجھ میں آ گیا ۔
یعۃ الرابطۃ الہندیہ '' کی طرف سے ایک جلسہ میں ان کی خدمت میں
، نامہ پیش کیا گیا اور انجمن '' شبان المسلمین '' کے شدید اصرار پر
نے ایک بڑے جلسہ میں تقریر بھی کی ۔ اس تقریر کا متن تو کہیں نہیں
، البتہ اس کے اشارات (نوٹس) جو علامہ نے اپنے ہاتھ سے لکھے تھے ،
، ہو چکے ہیں۴۸ ۔ ان اشارات کے مطالعہ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ
ریر ہوئی تو تھی اسلام اور عصر حاضر کی تحریکات کے موضوع پر لیکن
کے آخر میں علامہ نے ہندوستان کی تحریک آزادی اور مسلمانانِ ہند
سیاسی موقف اور برصغیر میں ان کے بالخصوص مسلمانانِ شمال مغربی
کے سیاسی مستقبل پر بھی روشنی ڈالی تھی ۔

اس طرح لندن جاتے ہوئے ، پورٹ سعید پر اور وہاں سے واپس ہوتے
، قاہرہ میں مختصر قیام کے دوران ، اقبال مسلمانانِ ہند کے سفیر بن گئے
۔ ان کی یہ سفارت یوں بھی اہم تھی کہ گاندھی جی نے لندن جاتے
، عدن اور پورٹ سعید ٹھہر کر ، جو سیاسی اثرات کانگریسی تحریک
بی میں عرب ممالک ، بالخصوص مصر میں پیدا کیے تھے ، اقبال کی ان
توں اور تقریروں نے ان کا ازالہ کر دیا !

دیکھیے لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ۔ ڈار ناشر اقبال
اکادمی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۰ء ص ۰ تا ۰۲

اقبال موتمر عالم اسلامی فلسطین میں

علامہ اقبال چار دن قاہرہ میں قیام کرنے کے بعد ۵ دسمبر کو فلسطین کے لیے روانہ ہو گئے۔ بیت المقدس میں ان دنوں موتمر عالم اسلامی منعقد ہو رہی تھی، جس میں شرکت کا دعوت نامہ انھیں داعی موتمر کی طرف سے پہلے ہی مل چکا تھا۔ اقبال کا سفر فلسطین اسی سلسلہ میں تھا۔

موتمر عالم اسلامی کے مقاصد حسب ذیل تھے:۔

۱۔ مسلمانوں میں اتحاد و تعاون کے لیے جدوجہد۔

۲۔ صحیح اسلامی اخوت کا نشو و نما۔

۳۔ انھیں اجتماعی اسلامی فرائض کی طرف متوجہ کرنا۔

۴۔ دین اسلام کو عوارض سے بچانا، عقائد کو الحاد سے محفوظ رکھنا اور اسلامی تہذیب کی اشاعت۔

علامہ کو یہ مقاصد دل سے عزیز تھے۔ اس لیے انھوں نے موتمر کے جلسوں میں شرکت کی اور اس کی کارروائیوں میں حصہ لیا۔

موتمر کا افتتاحی اجلاس ۶ دسمبر کو منعقد ہوا، اس میں اقبال نے مختصر تقریر کی اور داعیانِ موتمر کا شکریہ ادا کیا۔ دوسرے دن ۷ دسمبر کو موتمر کے عہدیداروں کا انتخاب عمل میں آیا۔ مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی بالاتفاق صدر اور علامہ اقبال نائب صدر منتخب ہوئے[۸۱]۔ یہ ایک بہت بڑا اعزاز تھا، جو عالم اسلام کے منتخب و معزز مندوبینِ موتمر کی جانب سے علامہ کی خدمت میں پیش کیا گیا تھا۔

موتمر کی مختلف کارروائیوں اور اقبال کی ان میں شرکت کا حال خود ان کی زبان سے سنئے۔

"اس عظیم الشان اجتماع میں اکثر اسلامی ممالک کے نمائندے شریک ہوئے اور اسلامی اخوت اور ممالکِ اسلامیہ کی آزادی کے

۸۱۔ سفر نامہ اقبال از محمد حمزہ فاروقی ناشر مکتبہ معیار کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۷۳ء ص ۱۶۲۔

مسائل پر مندوبین نے بے حد جوش و خروش کا اظہار کیا ۔ ۔ ۔ میں بہت سی سب کمیٹیوں کا رکن تھا ، جو بعض تجاویز پر بحث کرنے کے لیے مقرر کی گئی تھیں ۔ لیکن بدقسمتی سے میں ان سب میں شرکت نہ کر سکا ۔ ایک سب کمیٹی میں میں نے یروشلم میں قدیم جامع از ہر کی طرز پر ایک اسلامی یونیورسٹی کے قیام کی مخالفت کی اور اس بات پر زور دیا کہ مجوزہ یونیورسٹی بالکل جدید طرز پر قائم کی جائے[۸۲] ''

حضرت علامہ کی اس تجویز کو رائیٹر نیوز ایجنسی نے توڑ مروڑ کر اخبارات کے نام روانہ کیا تھا ، جس میں یہ تاثر پیدا ہوتا تھا کہ اقبال یروشلم میں سرے سے کسی یونیورسٹی کے قیام کے حامی نہیں ہیں[۸۳] ۔ واقعہ یہ تھا کہ علامہ چاہتے تھے کہ قدیم طرز کی یونیورسٹی قائم نہ ہو بلکہ ایک ایسی اسلامی یونیورسٹی قائم ہو ، جس میں قدیم و جدید دونوں کا امتزاج پایا جائے ۔ پھر وہ ایسی یونیورسٹی کے قیام کے لیے یروشلم کی بہ نسبت قاہرہ ، طہران اور مدینہ منورہ کو ترجیح دیتے تھے ، کیونکہ ان کی رائے میں یروشلم (بیت المقدس) کو عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل نہیں تھی ۔ پھر اس شہر کو صیہونی خطرہ بھی لاحق تھا !

۱۴ دسمبر کو علامہ اقبال نے موتمر کے کھلے اجلاس میں مختصر لیکن نہایت اہم تقریر کی ۔ یہ تقریر درج ذیل ہے ۔

'' افسوس ، میں موتمر کے اختتام تک نہیں ٹھہر سکتا اور مجھے اس کا بھی افسوس ہے کہ عربی زبان پر پوری قدرت نہ ہونے کے سبب مباحث میں بھی زیادہ حصہ نہ لے سکا ۔ میری آرزو ہے کہ ایک مرتبہ پھر مقامات مقدسہ اسلامیہ فلسطین کی زیارت کروں ، جو انبیاءؑ کی سر زمین ہے ۔ میں آپ لوگوں کو اس اخوت و مودت پر مبارکباد پیش کرتا ہوں ، جس کا مظاہرہ مسلسل ہوتا رہا ۔

۸۲- روز نامہ انقلاب لاہور ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع ۔
۸۳- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع ۔

ہم پر واجب ہے کہ اپنے نوجوانوں کو سلامتی کی راہ پر چلائیں ، اسلام کو اس وقت دو طرف سے خطرہ ہے ایک الحادِ مادی کی طرف سے اور دوسرا وطنی قومیت کی طرف سے - ہمارا فرض ہے کہ ان دونوں خطروں کا مقابلہ کریں اور میرا یقین ہے کہ اسلام کی روح ان دونوں خطروں کو شکست دے سکتی ہے - وطنی قومیت بجائے خود بری چیز نہیں ہے ، لیکن اگر اس میں خاص اعتدال ملحوظ نہ رکھا جائے اور افراط و تفریط ہو جائے تو اس میں بھی دہریت اور مادہ پرستی کے پیدا ہونے کے امکانات موجود ہیں - میں آپ کو نصیحت کرتا ہوں کہ آپ دل سے مسلمان بنیں - مجھے اسلام کے دشمنوں سے اندیشہ نہیں ، لیکن خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے ، آنحضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نہایت پیاری حدیث یاد آئی ہے - آپ فرماتے ہیں انا حظکم من الانبیاء و انتم حظی من الامم - میں تو جب کبھی سوچتا ہوں شرم و ندامت سے میری گردن جھک جاتی ہے کہ کیا ہم مسلمان آج اس قابل ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہم پر فخر کریں؟ ہاں جب ہم اس نور کو اپنے دلوں میں زندہ کر لیں گے ، جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں داخل کیا تھا تو اس وقت اس قابل ہو سکیں گے کہ حضور ہم پر فخر کریں ،

موتمر کی ذمہ داریاں بہت بڑی ہیں - اس کے سامنے اہم کام ہیں - خاص طور پر حجاز ریلوے کی واپسی اور جامعہ اسلامیہ کا قیام ، لیکن اگر ہم اسلام و اخوت کی سچی روح سے معمور ہو کر کام کریں گے تو اپنے مقاصد حاصل کر لیں گے - اپنے وطنوں کو واپس جاؤ تو روحِ اخوت کو ہر جگہ پھیلا دو اور اپنے نوجوانوں پر خاص توجہ دو - ہمارا مستقبل خاص انھی کی مساعی پر موقوف ہے - میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ عرب کے نوجوانوں میں میں نے وہ روح دیکھی ہے ، جو اٹلی کے نوجوانوں کے سوا کہیں نہیں دیکھی - عربی نوجوان بلندیٔ مرتبت کی روح صادق سے معمور ہیں -

میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے مستقبل کے ساتھ وابستہ اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے ۔ جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام کامیاب ہو جائے گا ۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کریں ۔ اللہ تعالیٰ ہمیں کامیابی عطا کرے گا۔[۸۳] ''

اقبال نے اس تقریر کے ذریعہ اسلامی ممالک ، بالخصوص عرب ممالک ، کے سامنے بھی وہی نظریہ پیش کیا ہے ، جو ان کی فکرِ سیاسی کا مرکز اور عملی سیاست کا محور ہے ، یعنی یورپی نظریہ وطنی قومیت کی مخالفت ، اور اس کے مقابلہ میں اسلامی اخوت یا مسلم قومیت کی حمایت ۔ اس نظریہ کو اس وقت عالم اسلام ، بالخصوص دنیائے عرب کے سامنے پیش کرنے کی ضرورت بھی تھی ۔ وطنی قومیت کے بھوت ہی نے تو خلافت ترکیہ کو نگل لیا تھا اور عالمِ عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کر دئے تھے ۔ یہی نہیں بلکہ انھیں ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا تھا اور عالمِ اسلام میں اقبال سے بڑھ کر اس عفریت کی زہر افشانیوں سے کون واقف تھا ؟ اسی لیے انھوں نے اس مختصر سی تقریر میں صرف اسی ایک نکتہ کو پیش کیا اور اسی پر زور دیا ۔ پھر عالمِ اسلام اور عربوں کے نمائندوں کے سامنے ان کا یہ ارشاد کہ '' مجھے اسلام کے دشمنوں سے نہیں ، لیکن خود مسلمانوں سے اندیشہ ہے '' ماضی بعید نہیں ، ماضی قریب کے سیاسی حالات کی روشنی میں کس قدر بلیغ تنبیہ تھی ! عالمِ اسلام کو تتر بتر ہوئے زیادہ عرصہ نہ گذرا تھا ۔ عربوں کو باہم دست و گریباں ہوئے بھی کچھ زیادہ دن نہیں گزرے تھے ۔ دیگر اسلامی ممالک کا مشرقی و مغربی استعمار کی زد میں آ جانا ، ابھی کل ہی کی بات تھی ! ——— اور یہ سب کچھ کیسے ہوا تھا ؟ اور اس گھر کو آگ کس نے لگائی تھی ؟ دشمنوں نے یا خود گھر کے چراغ ہی نے ؟ یہ دلدوز حقیقت سب کے سامنے تھی ، مگر اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لی گئی تھیں ۔ یہ زخم گو ابھی تازہ تھا ، تاہم اس کو

۸۳- سفر نامہ اقبال از محمد حمزہ فاروقی ، ناشر مکتبہ معیار کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۷۳ع ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ ۔

رسنے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا - اقبال نے اسی زخم کو کریدا تھا کہ اس کا اندمال کیا جائے ! !

کل ہند مسلم کانفرنس کی صدارت | بتایا جا چکا ہے کہ دوسری گول میز کانفرنس یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ختم ہوئی ، لیکن اقبال ، اس سے پہلے ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع ہی کو لندن چھوڑ چکے تھے ، پھر اٹلی ، مصر اور فلسطین ہوتے ہوئے ۳۰ دسمبر کو وہ واپس لاہور پہنچے - مارچ میں آپ کو کل ہند مسلم کانفرنس (سابق آل پارٹیز مسلم کانفرنس) کا صدر منتخب کیا گیا - ہم بتا چکے ہیں کہ نہرو رپورٹ کے خلاف مسلمانوں کے تمام مکاتیب خیال کو متحد کرنے کے لیے یہ کانفرنس بتاریخ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع منعقد ہوئی تھی اور اسی کانفرنس میں وہ قرارداد منظور ہوئی تھی جس کی بنیاد پر مسٹر جناح نے بعد میں اپنے مشہور و معروف چودہ نکات مرتب کیے تھے اور یہ بھی ہم بتا چکے ہیں کہ اس قرارداد کے پاس کر دینے یا نہرو رپورٹ کی کامیاب مخالفت کے بعد ، اس کانفرنس کو ایک وقتی اجتماع سمجھ کر ختم نہیں کر دیا گیا تھا بلکہ اس کو ایک مستقل ادارے اور انجمن کی شکل دے دی گئی تھی - مرکز میں اس کا ایک بورڈ اور مجلس عاملہ (ورکنگ کمیٹی) اور اضلاع میں اس کی شاخیں قائم کر دی گئی تھیں اور اس کے بعد سے یہ انجمن برابر کام کرتی رہی تھی - پہلی اور دوسری گول میز کانفرنسوں کے زمانہ میں یہ بہت فعال رہی اور علامہ اقبال اس دوران اس کے سرگرم رکن اور سربرآوردہ لیڈر رہے تھے - اس زمانہ میں انھوں نے جن سیاسی تحریکات میں حصہ لیا ان سب میں اسی کانفرنس کا نقطۂ نظر پیش کیا ، بلکہ اس کی نمایندگی کی - مارچ سنہ ۱۹۳۱ع میں گاندھی جی سے مذاکرات ، مئی سنہ ۱۹۳۱ع میں بھوپال کانفرنس میں مسلم قوم پرستوں سے گفتگو ، پھر دوسری گول میز کانفرنس لندن کی کار روائیوں میں شرکت کرتے ہوئے انھوں نے اس کانفرنس کی پالیسی کو ہمیشہ پیش نظر رکھا - حتٰی کہ اس کے جماعتی نظم و ضبط کی بھی پابندی کی کہ جوں ہی اس کانفرنس کی وہ قرارداد جس میں وفاقی کمیٹی کے مسلم اراکین کی مذمت کی گئی تھی ، انھیں لندن میں وصول ہوئی ، انھوں نے

فوراً لندن کو خیر باد کہہ دیا ۔ علامہ اقبال کی اس کانفرنس سے اس قدر وابستگی کی وجہ صرف ایک ہی تھی کہ ہندوستان کی عملی سیاست میں ان کا جو نقطۂ نظر تھا ، وہی اس کانفرنس کا لائحہ عمل تھا !

سنہ ۱۹۳۱ع میں اس کانفرنس کے صدر نواب محمد اسمعیل خان تھے ، اور اب مارچ سنہ ۱۹۳۲ع میں علامہ اقبال کو ان کی اسی وابستگی اور نمایاں سیاسی کارکردگی کے باعث صدر منتخب کیا گیا تھا ۔

جس زمانہ میں علامہ نے مسلم کانفرنس کی صدارت کی ہے ، وہ زمانہ ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں بڑی اہمیت کا حامل ہے ۔ دوسری گول میز کانفرنس ختم ہو چکی تھی ، ہندوستان کے جدید آئین سے متعلق اس کانفرنس کے دونوں اجلاسوں کی تجاویز پر ملک معظم کی حکومت غور و خوض کر رہی تھی اور ہندوستانی اس انتظار میں تھے کہ دیکھیں اب کی مرتبہ برطانوی حکومت اپنی سیاسی زنبیل میں سے کون سا نیا شعبدہ نکالتی ہے !

" گاندھی جی ارون معاہدہ " ختم ہو چکا تھا ، نہرو ، شروانی اور خان برادران ، گاندھی جی کی مراجعت ہند سے صرف چند دن قبل ، آہنی سلاخوں کے پیچھے پہنچا دئے گئے تھے[۸۵]۔ کانگریس نے پھر اپنا مورچہ سنبھال لیا تھا اور جنوری سنہ ۱۹۳۲ع ہی میں سول نافرمانی کی تحریک از سر نو شروع کی جا چکی تھی اور گاندھی جی " جیل یا ترا " کے لیے یرودا بھیجے جا چکے تھے ۔

یہ زمانہ مسلمانوں کے لیے بڑی تشویش کا تھا ۔ برطانوی وزیر اعظم مسٹر ریمزے میکڈا نلڈ نے دوسری گول میز کانفرنس کے آخری اجلاس میں ایک اہم تقریر کی تھی ۔ اس تقریر میں انھوں نے اعلان کیا تھا کہ

> " برطانوی حکومت مرکز میں ایک ذمہ دار وفاقی حکومت کے اصول کی حامی ہے ۔ صوبہ جات میں بعض تحفظات کے ساتھ ذمہ دارانہ خود مختار حکومت دی جائے گی ۔ سندھ کو اس وقت

۸۵- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتارامیا ص ۷۹۶ ،

ایک علیحدہ صوبہ بنایا جائے گا ، جب کہ اس کی مالی حالت مستحکم رکھنے کے ذرائع کا بندوبست ہو جائے ، شمال مغربی سرحدی صوبے کی بھی دیگر صوبوں کی طرح سیاسی تعمیر کی جائے گی ۔ فرقہ وارانہ گتھی ترقی کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ بن گئی ہے ، ملک معظم کی حکومت یہ طے کر چکی ہے کہ اس نا اہلی کو بھی ترقی کی راہ میں روڑا بننے نہ دیا جائے [۸۶]''

اس تقریر سے مسلمانوں میں بڑی مایوسی پیدا ہو گئی تھی ۔ انھیں یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ ان کے مطالبات ٹھکرا دیے جائیں گے ۔ مسلمانانِ ہند یہ چاہتے تھے کہ پہلے صوبجاتی خود مختاری کا نفاذ ہو اور مرکز میں وفاقی حکومت اس کے بعد قائم کی جائے ۔ لیکن وزیر اعظم برطانیہ نے ان دونوں کا ساتھ ساتھ ذکر کیا تھا ۔ مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ بلا کسی شرط کے سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے ، لیکن وزیر اعظم نے مشروط علیحدگی کا اعلان کیا تھا اور سب سے بڑھ کر ان کا یہ بیان کہ '' فرقہ وارانہ گتھی کو ترقی کی راہ میں روڑا بننے نہیں دیا جائے گا ''، مسلمانوں کے لیے بہت زیادہ تشویش کا باعث تھا ۔ اس پر طرہ یہ کہ وزیر اعظم سے فیصلے کی درخواست خود ہندو نمایندوں نے کی تھی ۔ اس لیے انھیں بجا طور پر یہ اندیشہ تھا کہ وزیر اعظم کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف رہے گا اور اسی اندیشہ کے باعث مسلمان نمایندوں نے اس درخواست پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا ۔ اب ان کے اس اندیشہ کو کانگریس کی تحریک سول نافرمانی نے مزید تقویت پہنچا دی تھی ۔ گول میز کانفرنس کو ختم ہوئے اب تین ماہ سے زائد عرصہ ہو چکا تھا لیکن ہنوز فرقہ وارانہ فیصلہ کا کوئی اعلان نہ ہوا تھا ۔ اس لیے مسلمانوں کا اضطراب بڑھ چلا تھا ۔ الغرض ان تمام اسباب کی بناء پر مسلمانوں میں بڑی ہراسانی اور پریشانی پھیلی ہوئی تھی ۔ یہ مصیبت تو ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی مگر اس پر طرفہ کہ ان کے اندر جماعتی اختلاف موجود تھا ۔ نقاط نظر کے لحاظ سے اب دو ہی مکاتیبِ خیال تھے ۔ ایک تو وہ جو کانگریس کا ہمنوا تھا

۸۶- انڈین اینول رجسٹر جلد دوم ۱۹۳۱ع ص ۳۴۶ ۔

یعنی قوم پرست مسلمان اور دوسرا وہ جو مسلمانوں کو دوسری قوموں سے علیحدہ اور ان کے مخصوص حقوق و مفادات کا تحفظ چاہتا تھا ۔ اس ثانی الذکر مکتبِ خیال کے مسلمانوں کا کوئی ایک ادارہ نہیں تھا بلکہ یہ مختلف جماعتوں ، آل انڈیا مسلم لیگ ، خلافت کمیٹی اور جمعیتہ العلماء کانپور میں منقسم تھے ۔ مسلمانوں کی تقدیر ڈاؤننگ اسٹریٹ کی ترازو میں تل رہی تھی اس ترازو کے تولنے والے ریمزے میکڈ انلڈ وزیر اعظم برطانیہ تھے ، جن کی ہندو دوستی کے باعث رئیس الاحرار مولانا محمد علی نے انھیں "رام جی مکندا مل" کا لقب دیا تھا ۔ کانگریس نے اپنے پلڑے کو وزنی بنانے کی خاطر دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا ۔ ہندو مہاسبھا اپنی کمین گاہ میں بیٹھی اس امر کا انتظار کر رہی تھی کہ جوں ہی مسلمانوں کا پلڑا جھکے گا وہ ایک ہی جھپٹے میں اس کو ہلکا کر دے گی ۔ پھر خود تولنے والا غیر جانبدار نہ تھا ۔ ان حالات میں مسلمانوں کا اضطراب بجا تھا اور حکومت کے خلاف ان کے اندر جذبات پیدا ہو چکے تھے ۔ غرض کہ یہ حالات تھے جب ڈاکٹر اقبال نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی صدارت کے فرائض اپنے ذمہ لیے ۔ ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ کو بمقام لاہور اس کانفرنس کا سالانہ اجلاس منعقد ہوا ، جس کی صدارت کرتے ہوئے ، ڈاکٹر صاحب نے ایک بصیرت افروز خطبہ پڑھا ۔

خطبہ صدارت کل ہند مسلم کانفرنس آپ نے اپنے خطبہ میں برطانوی حکومت کی بالاقساط سیاسی اصلاحات عطا کرنے والی پالیسی اور گاندھی جی کی تحریکِ سول نافرمانی کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ دونوں آپس میں اس لیے ٹکرا رہے ہیں کہ ایک دوسرے کو سمجھ نہیں پائے ہیں ۔ اس کے بعد انھوں نے کہا ۔

" یہ مظاہرے آنے والے طوفان کا پیش خیمہ ہے جو ممکن ہے کہ تمام ہندوستان بلکہ سارے ایشیا پر چھا جائے ۔ یہ اس سیاسی تہذیب کا ناگزیر نتیجہ ہے جو انسان کو محض ایک ایسی شے تصور کرتی ہے ، جس کا استحصال جائز کیا جانا چاہیے اور جس کی نظر میں انسان ایک ایسی شخصیت نہیں جس کو خالص

> تہذیبی طاقتوں کے ذریعہ پروان چڑھایا جائے۔ ایشیا کے عوام لازماً اس خون چوسنے والی معیشت کے خلاف ، جس کو مغرب نے ترقی دی ہے اور اقوام ایشیا پر مسلط کیا ہے ، اٹھ کھڑے ہوں گے ــــ ایشیا موجودہ مغربی سرمایہ دارانہ نظام اور اس کی غیر منضبط (Undiscipliened) انفرادیت کو نہیں سمجھ سکتا<۸۷"

آپ نے گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم سمجھوتے کے متعلق جو کوشش ہوئی ، اس کی تفصیلات کا ذکر کیا ۔ پھر بتلایا کہ کس طرح مسلم مندوبین نے پہلے تو یہ تصفیہ کیا تھا کہ وفاقی ہئیت کی کمیٹی کے مباحث میں حصہ نہ لیا جائے لیکن ڈاکٹر صاحب کے لندن سے روانہ ہو جانے کے بعد ان ہی مندوبین نے اپنے اس فیصلہ کے خلاف وفاقی ہئیت کی کمیٹی میں حصہ لیا ۔ آپ نے مسلم مندوبین کے اس رویہ کے خلاف اس خطبۂ صدارت میں سخت جتاج کیا ، جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں ۔

آپ نے برطانوی وزیر اعظم کے گول میز کانفرنس میں اس اعلان پر اظہار تشویش کیا کہ وہ صوبجاتی خود مختاری اور مرکز میں وفاقی حکومت کو بیک وقت نافذ کرنا چاہتے ہیں ۔ پھر حکومت ، فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کرنے میں جو تساہل برت رہی تھی ، اس پر تنقید کرتے ہوئے کہا

> " مسلمان حکومت کے اس طرز عمل سے مشتبہ ہو گئے ہیں ۔ وہ یہ شبہ کرتے ہیں کہ حکومت کانگریس کے تعاون کو ہر قیمت پر حاصل کرے گی اور مسلم مطالبات کو تسلیم کرنے میں جو تعویق وہ برت رہی ہے ، وہ محض اس لیے ہے کہ وہ اس جماعت (کانگریس) سے گفت و شنید کرنے کے لیے کوئی بنیاد فراہم کرنا چاہتی ہے ۔ اسی لیے سیاسی معاملات میں حکومت پر اعتماد کرنے کی پالیسی اب مسلم جماعت کے ذہن سے نہایت تیزی کے ساتھ محو ہو رہی ہے۸۸"

۸۷۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۳ و ۵۴ ۔

۸۸۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۴۳ ۔

اس سلسلے میں آپ نے نہایت پرزور انداز میں حکومت پر یہ واضح کیا کہ مسلمان حسب ذیل مطالبات سے کم پر کسی طرح رضامند نہ ہوں گے

۱- پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کو اکثریت کے حقوق حاصل رہیں۔

۲- جداگانہ انتخابات بہرحال برقرار رکھے جائیں۔

۳- صوبہ سرحد میں اصلاحات نافذ کی جائیں۔

۴- سندھ کو غیر مشروط طریقہ پر ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے

۵- مکمل صوبہ جاتی خود مختاری دی جائے اور وفاق کے ہر جز کی مساویانہ حیثیت ہو۔

۶- اختیارات کی تقسیم وفاق وحدانی (مرکزی) اور صوبجاتی کے بجائے وفاق اور صوبجاتی ہو۔

۷- مرکز میں مسلمانوں کو ۳۳⅓ فیصد نشستیں دی جائیں۔

آپ نے کہا کہ

" ان تمام امور سے متعلق وزیر اعظم کی خاموشی کا نتیجہ ایک غیر دانشمندانہ حکمتِ عملی کی صورت میں ظاہر ہو رہا ہے، جس کی وجہ سے کانگریس سے جنگ جاری ہے اور ملک کے دیگر طبقوں سے بھی کوئی صلح نہیں ہو سکی ہے[۸۹]"

اس نازک مرحلہ پر مسلمانوں کی رہنمائی کرتے ہوئے آپ نے ارشاد فرمایا۔

" تو کیا ہم کو کانگریس کی موجودہ مہم میں شریک ہو جانا چاہیے؟ نہیں! ایک لمحہ کے تذبذب کے بغیر یہ میرا جواب ہے[۸۹]"

۸۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو شائع کردہ المنار اکادمی ص ۴۴ -

اس کے بعد آپ نے واضح کیا کہ کانگریس کی تحریکِ سول نافرمانی کی اصلی وجہ یہ ہے کہ کانگریس یہ چاہتی ہے کہ حکومت ، مختلف فرقوں کے مسائل کا تصفیہ بھی کانگریس ہی سے مل کر کرے اور اسی طرح کانگریس کو ملک کی واحد نمایندہ جماعت تسلیم کر لے۔ گول میز کانفرنس میں تمام اقلیتوں نے مل کر جو میثاق مرتب کیا تھا ، کانگریس کو یہ ڈر ہے کہ کہیں حکومت اس کے مطابق اقلیتوں کے مطالبات کو تسلیم نہ کر لے۔

ہندوستان کی سیاسی جد و جہد کی اندرونی نفسیات پر بلیغ انداز میں تبصرہ کرتے ہوئے آپ نے بتایا کہ

" ہندوستان کی موجودہ جد و جہد کے متعلق بار بار یہ کہا جاتا ہے کہ یہ مغرب کے خلاف ایک بغاوت نہیں ہے کیونکہ ہندوستانی ان ہی ادارات کا مطالبہ کر رہے ہیں جن کی حمایت مغرب کر رہا ہے۔ یہ ایک جداگانہ سوال ہے کہ آیا انتخاب کی جوے بازی لیڈروں کی فریق بندی اور پارلیمان کا کھوکھلا اجتماعی نظم ، کسانوں کے ملک کے لیے ، جو موجودہ جمہوریت کی زرپاش معیشت سے قطعاً نا آشنا ہے ، موزوں ثابت ہو گا۔ بہرحال تعلیم یافتہ شہری ہندوستان میں جمہوریت کا مطالبہ کر رہا ہے اور اقلیتیں جو اپنے آپ کو جداگانہ تہذیبی وحدتیں سمجھتی ہیں اور ڈرتی ہیں کہ ان کا وجود ہی معرضِ خطر میں ہے ، تحفظات کا مطالبہ کر رہی ہیں ، جس کے دینے سے اکثریتی فرقہ واضح اسباب کی بناء پر انکار کر رہا ہے۔ اکثریتی فرقہ بظاہر قوم پرستی کا اظہار کرتا ہے۔ یہ قوم پرستی نظری طور پر درست ہے اگر ہم اس پر مغربی انداز میں غور کریں ، لیکن جب ہم ہندوستان کے حالات پر نظر ڈالتے ہیں تو واقعات اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس لیے ہندوستان کی موجودہ جدوجہد کے اصل فریق انگلستان و ہند نہیں ہیں بلکہ اس کشمکش کے حقیقی فریقین ایک طرف اکثریتی فرقہ ہے اور دوسری طرف وہ اقلیتیں ہیں جو مغربی جمہوریت کے اصول کو اس وقت تک قبول کرنے پر آمادہ نہیں ہیں جب تک

اس میں ایسی مناسب ترمیمات نہ کر دی جائیں جو ہندوستان کے مناسب حال ہوں۹۰"۔

ہندوستان کی سیاسی جدوجہد کی اس نفسیاتی تشریح اور اس جدوجہد میں مسلمانوں کے حقیقی موقف اور ان کے مطالبات کی وضاحت کے بعد ، ڈاکٹر صاحب نے مسلمانوں کی سابقہ پالیسی پر اس طرح تبصرہ فرمایا ۔

" مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنے طبقہ کی موجودہ ذہنی حالت سے پوری طرح واقفیت ہو گی ۔ مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کرنے میں حکومت کی تعویق اور ہمارے بہادر سرحدی بھائیوں کے ساتھ ان کے صوبہ میں دستوری اصلاحات کے نفاذ کے موقع پر جو برتاؤ کیا جا رہا ہے ، ان وجوہ سے ہندوستانی مسلمانوں کو برطانوی طرزِ عمل کے متعلق شبہات پیدا ہو گئے ہیں اور اکثر لوگ یہ سوال کرنے لگے ہیں کہ آیا ہندوستان میں ایک تیسری جماعت کا اقتدار ، مسلم اقلیت کو ہندوستان کی اس اکثریت سے واقعتاً محفوظ رکھتا ہے جو سیاسی نقطۂ نظر سے ان کی مخالف اور معاشی لحاظ سے ان کا استحصال کرتی ہے ؟ اس سے بھی زیادہ گہری ایک اور وجہ ہے ۔ سیاسی دنیا میں واقعات کی جلد جلد تبدیلی اور صورت حال کا فوری تغیر ، کسی سامراجی جمہوریت کو خصوصاً جب کہ اس کی صورت ایک جماعتی حکومت کی ہو ، کسی ایک خاص حکمت عملی پر ، کسی طویل عرصہ کے لیے قائم رہنے نہیں دیتا ۔ موجودہ ہندوستان جیسے محکوم ملک میں ، وہ جماعتیں جو حکومت سے تعاون کرتی ہیں ، یہ خیال کرنے لگی ہیں کہ حکومت کی مشکلات کے زمانہ میں ان کا حکومت کی تائید میں مضبوط رویہ اختیار کرنا ، انگلستان کی ہر اس جماعت کی نظر میں جو برسرِ اقتدار آتی رہتی ہو ، کچھ زیادہ قدر و قیمت کا باعث نہیں ہو سکتا ۔ انگلستان کی سیاسی جماعتوں کی خصوصیات اور ان کا نصب العین خواہ کچھ ہی ہو ، آپ کو اپنی پالیسی کی بنیاد ،

۹۰۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۲ و ۵۳ ۔

روشن خیال خود افادیت پر رکھنی چاہیے اور اس پالیسی
تشکیل ایسی اسپرٹ میں ہونی چاہیے ، جس سے پوری برطانو
قوم متاثر ہو - یہ ایک غلطی ہو گی ، اگر ایسی جنگ لڑی جا
جس کی کامیابی کے ثمرات ان کو ملیں جو ہمارے سیاسی مقا
کے یا تو خلاف ہیں یا پھر ان سے ہمدردی نہیں رکھتے - موجو
حالات ایسے ہیں کہ اس پالیسی کا تعین کرتے وقت ، جس
جماعت اپنی موجودہ فوری تکالیف پر قابو پائے ، یہ دیکھنا آپ
کام ہے کہ میں نے جس نقصان کا اندیشہ ظاہر کیا ہے ، وہ
ہو جائے ، اور جو طرز عمل آپ بالآخر اختیار کریں اس سے
کی جماعت کو فائدہ پہنچے . . . .
ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کی مسلم اقلیت نے کوشش کی لی
ناکامی ہوئی - اب متبادل صورت یہ تی کہ برطانیہ سے انص
کی توقع کی جائے کیونکہ وہ ایک غیر جانبدار ثالث کی حیثیت
مدعی ہے ، لیکن ہم محسوس کر رہے ہیں کہ برطانیہ ایک اي
لچک دار پالیسی اختیار کر رہا ہے ، جس سے ہم میں اعتماد ن
پیدا ہوتا ، بلکہ جس کی غرض و غائت ، ایسا معلوم ہوتا ہے
کہ خود اپنے موقف کو ہندوستان میں موزوں و مستحکم بنانا
اس طرح اب مسلم جماعت اس مسئلہ سے دو چار ہے کہ آیا ان
موجودہ پالیسی ، جس کی وجہ سے برطانوی مشکلات اب تک
ہوتی گئیں اور جس سے خود جماعت کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ
آئندہ بھی ایک غیر معین مدت تک کے لیے جاری رکھی جائے
یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب اس کانفرنس کا کھلا اجلا
دے گا - میں جو کچھ اس موقع پر کہہ سکتا ہوں ، وہ یہ
کہ اگر آپ اس پالیسی کو ترک کرنا چاہتے ہیں تو آپ کا فو
فریضہ یہ ہے کہ پوری قوم کو اس ایثار کے لیے تیار کری
جس کے بغیر کوئی خود دار جماعت باعزت زندگی نہیں گ
سکتی[۹۱] ۔"

۹۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۴۵ تا ۴۷ -

اس کے بعد آپ نے مسلمانوں کو ان کے آیندہ طرز عمل کے متعلق جو بیش بہا مشورہ دیا ، وہ یہ تھا ۔

" کسی فریق سے توقعات وابستہ نہ کرو ۔ اگر تم اپنی تمناؤں کو بار آور ہوتے دیکھنا چاہتے ہو ، تو اپنی خودی کو اپنے اندر بیدار کرو اور اپنی خاکِ نمناک کو پختہ کر کے اسی سے اپنے میں جوہر مردانگی پیدا کرو ۔ سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو ۔ اجتماعی اور انفرادی زندگی کا یہی اک راز ہے ۔ ہمارے نصب العین کی کافی وضاحت ہو چکی ہے ۔ آیندہ دستور میں اسلام کے لیے ایک ایسے موقف کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنا ، ہمارا مطمحِ نظر ہے ، جس سے ایسے مواقع حاصل ہو جائیں کہ وہ (یعنی اسلام) اپنے مقاصد کو اس ملک میں پھلتا پھولتا دیکھے ۔ یہ ضروری ہے کہ اس نصب العین کی روشنی میں جماعت کی ترقی پسند طاقتوں کو ابھارا جائے اور ان کی موجودہ پژمردہ توانائیوں کو مجتمع کیا جائے ۔ زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا ۔ اس کو اپنی ہی روح کے شوالہ میں فروزاں کرنا چاہیے اس کے لیے سرگرم تیاری اور مقابلتاً ایک مستقل لائحہ عمل کی ضرورت ہے ۔ ہمارے مستقبل کا لائحہ عمل کیا ہو ؟ میں سمجھتا ہوں کہ یہ لائحہ عمل جزواً سیاسی اور جزواً ثقافتی ہونا چاہیے[۹۲]"

پھر آپ نے حسب ذیل لائحہ عمل قوم کے سامنے رکھا ۔

۱۔ مسلمانان ہند کا ایک ہی سیاسی ادارہ ہو ۔

" مسلمان مختلف جماعتوں میں بٹے ہوئے ہیں ۔ اس اختلاف کی ذمہ داری مسلم عوام پر نہیں بلکہ ان کے قائدین پر عائد ہوتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ اہم سیاسی معاملات کے متعلق ہر لیڈر اپنی واحد رائے کو عوام کے سامنے پیش کرتا اور ان کو اس پر چلاتا رہا ہے لیکن یہ صورتِ حال اب خطرناک ہو چکی ہے ۔ اب

۹۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۵ و ۵۶ ۔

تمام مسلمانانِ ہند کا صرف ایک ہی سیاسی ادارہ ہونا چاہیئے ، جس کی شاخیں تمام صوبوں میں ہوں ۔ باہمی اختلافات کو ختم کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس ادارہ کے دستور میں ایسی لچک رکھی جائے کہ اس میں ہر سیاسی مکتبِ خیال کو برسر اقتدار آنے اور اپنی پالیسی کو چلانے کا موقع حاصل رہے[۹۳]"

۲۔ اس مرکزی سیاسی ادارہ کے تحت پچاس لاکھ روپیہ کا ایک قومی فنڈ فراہم کیا جائے[۹۴]۔

۳۔ نوجوانوں کی ایک رضا کار جماعت تیار کی جائے جو دیہات میں معاشرتی و معاشی سدھار کا کام کرے[۹۴]۔

۴۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں ایسے ثقافتی ادارے قائم کیے جائیں ، جو اسلامی تعلیمات کو پھیلائیں ۔ ان اداروں کا سیاسیات سے تعلق نہ ہو[۹۵]۔

۵۔ ایک ایسی جماعت بنائی جائے ، جس میں علماء اور وہ مسلم وکلا ، جنہوں نے جدید اصولِ قانون کی تعلیم پائی ہو ، شامل رہیں ۔ اس جماعت کا مقصد یہ ہو کہ حالاتِ حاضرہ کی روشنی میں ، اسلامی قانون کے بنیادی اصولوں اور اس کے مزاج کو ملحوظ رکھتے ہوئے ، اس کا تحفظ ، اس کی توسیع اور ضرورت ہو تو اس کی از سر نو تعبیر کرے ۔ اس جماعت کو ملک کے دستور میں تسلیم کیا جائے ، تاکہ کوئی مسودۂ قانون جس کا اثر مسلمانوں کے شخصی قانون پر پڑتا ہو ، اس وقت تک کسی مقننہ میں پیش نہ ہو ، جب تک کہ اس مسودہ کو اس جماعت کی منظوری حاصل نہ ہو جائے ۔ اس معینہ عملی مقصد کے علاوہ ، اس جماعت کے قیام کے باعث دنیا کے

۹۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم سنہ ۱۹۴۸ء ص ۵٦ ۔

۹۴۔ ایضاً ، ص ۵۷ ۔ ۹۵۔ ایضاً ، ص ۵۸ ۔

باشندے خواہ مسلم ہوں یا غیر مسلم ، اسلامی قوانین کی وسعت ، سرمایہ دارانہ نظام کے مقابلہ میں اس کی افادیت اور موجودہ بحران میں اس کی قدر و قیمت سے بہتر طریقہ پر واقف اور مستفید ہو سکیں گے[۹۶]۔

آپ نے اس خطبہ میں مسلمانان کشمیر کی بیداری کا ذکر کیا اور ان کے ساتھ حکومت کشمیر کے ظالمانہ رویہ پر احتجاج کیا ۔ کشمیر کی تحریک میں ڈاکٹر صاحب نے جو حصہ لیا ہے ، اس کا ذکر ہم آئندہ کریں گے ، اس لیے ہم یہاں خطبہ صدارت کے اس حصہ کو نظر انداز کرتے ہیں ۔

اس خطبہ صدارت پر ایک غائر نظر ڈالنے کے بعد ہر شخص یہ محسوس کرے گا کہ ہندوستان کی سیاسی کشمکش کے اس نازک موقع پر ڈاکٹر صاحب نے ایک طرف ہندوستان کی تحریک آزادی کی حمایت کی اور دوسری طرف پرزور طریقے پر نہ صرف مسلمانوں کے جذبات کی نمایندگی کی بلکہ نہایت دانائی کے ساتھ ، ان کی رہنمائی کے فرائض بھی انجام دیئے ۔ انھوں نے جہاں کانگریس کی سول نافرمانی پر تنقید کی ، اکثریتی فرقہ کی غیر مفاہمانہ روش پر نکتہ چینی کی ، وہیں حکومت برطانیہ کی متذبذب پالیسی کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ۔ پھر انھوں نے ان مسلم مندوبین کو بھی لتھاڑا ، جنھوں نے وفاق ہئیت کی کمیٹی میں حصہ لیا تھا ۔ انھوں نے ایک طرف مسلمانوں کو سول نافرمانی کی تحریک میں حصہ لینے سے منع کیا تو دوسری طرف برطانیہ پر اعتماد کلی کرنے اور برطانوی حکومت کے "خیمہ بردار" (Camp-followers) بننے سے مسلمانوں کو روکا اور اپنی ایک ایسی آزاد و خود مختار پالیسی وضع کرنے پر زور دیا ، جس سے وہ کسی دوسرے فریق پر بھروسہ کئے بغیر محض اپنی جماعتی جدوجہد کی بناء پر اپنے سیاسی مقاصد کو حاصل کر لیں ۔ پھر انھوں نے وقت کے تمام سیاسی مسائل ، دوسری گول میز کانفرنس میں فرقہ وارانہ مفاہمت کی سعی ، وفاق ہئیت کی کمیٹی کی روئیداد ، کانگریس کی تحریک سول نافرمانی ، وزیر اعظم برطانیہ کی فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کرنے میں تعویق ، صوبہ سرحد

۹۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۶۰ و ۶۱ ۔

اور کشمیر کے مظالم ، ان سب پر روشنی ڈالی ، لیکن ساتھ ہی ملک اور مسلمانوں کے بنیادی مسائل کو بھی نظروں سے اوجھل نہ ہونے دیا۔ انھوں نے ملک کے بنیادی مسئلہ آزادی کی نہایت ہی گہری نفسیاتی تشریح کی اور تجزیہ کر کے بتلایا کہ اس کے حقیقی فریقین کون کون ہیں اور ساتھ ہی ہندوستانی مسلمانوں کے بنیادی مسئلہ کی بھی نہایت غیر مبہم الفاظ میں وضاحت کی اور آخر میں جو پانچ نکاتی پروگرام پیش کیا اس کو وقتی نہیں بلکہ مستقل اہمیت حاصل ہے ۔

اس خطبہ سے متعلق ایک اہم واقعہ کا ذکر کرنا خالی از دلچسپی نہ ہوگا ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس خطبہ میں حکومتِ برطانیہ پر سخت تنقید کی تھی ۔ ایک تو یہ کہ انھوں نے یہ الزام لگایا کہ مسلم وفد نے وفاقی ہیئت کی کمیٹی میں محض اس لئے حصہ لیا کہ انگریز سیاست دانوں نے اس وفد کو غلط مشورہ دیا تھا ۔ دوسرے یہ کہ انھوں نے وزیر اعظم کی گول میز کانفرنس میں اختتامی تقریر پر تنقید کی تھی ۔ تیسرے یہ کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کرنے میں جو تعویق ہو رہی تھی ، اس پر حکومتِ برطانیہ کو موردِ الزام گردانا تھا ۔ چوتھے یہ کہ مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا تھا کہ حکومت پر اعتماد کرنے کی سابقہ پالیسی کو ترک کر کے وہ ایک آزاد اور خود مختار پالیسی وضع کریں ، کیونکہ اس سابقہ پالیسی سے نہ ان کو ماضی میں کوئی فائدہ پہنچا تھا اور نہ آیندہ پہنچنے کی توقع ہے ۔ اقبال کی اس تلخ نوائی سے حکومت کی جبینِ ناز پر شکنیں پڑ گئیں اور بقول عظیم حسین صاحب " اقبال کی تنقید نے سیکرٹری آف اسٹیٹ کو آزردہ کر دیا[۹۷]"۔ اقبال کی ان ہی شعلہ نوائیوں نے ان کو زندگی کے بعض بڑے اچھے مواقع سے محروم کر دیا ۔ سر فضل حسین مرحوم نے اس امر کی کوشش کی تھی کہ ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے مجلسِ اقوام (League of Nations) میں بھیجا جائے لیکن اقبال کی اس تنقید نے مجلسِ اقوام کے دروازوں کو ان پر بند کر دیا

۹۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ جام جمشید پریس بمبئی ستمبر سنہ ۱۹۴۵ع ص ۳۱۹ ۔

اس طرح ایک دوسرے موقع پر سر فضل حسین نے پیہم درخواستیں دیں کہ ڈاکٹر اقبال کو پبلک سروس کمیشن کا رکن بنایا جائے لیکن ان کی اس صاف گوئی نے ان کو اس اعزاز سے بھی محروم کر دیا ۹۸۔

اقبال کی صدارت میں مسلم کانفرنس کی قرار دادیں

آل انڈیا مسلم کانفرنس نے اپنے دو روزہ اجلاس منعقدہ ۲۱ ، ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں زیر صدارت علامہ سر اقبال حسب ذیل قرار دادیں منظور کیں ،

پہلی قرارداد :- مرکزی حکومت کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو ایک تہائی حصہ دیا جائے۔ صوبہ جات کی سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا وہی حصہ ہو ، جو متعلقہ صوبائی دقننہ میں مقرر کیا جائے اور فوج میں مسلمانوں کو ۵۰ فیصد ملازمتیں دی جائیں۔

دوسری قرارداد :- ہرگاہ کہ مسلمان گذشتہ دو کانفرنسوں (یعنی پہلی اور دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن) کے نتائج سے غیر مطمئن ہیں ، کیونکہ ان میں مسلم مطالبات مرتبہ جنوری سنہ ۱۹۲۹ء و ۵ اپریل سنہ ۱۹۳۱ء کو تسلیم نہیں کیا گیا ، اس لیے کانفرنس کی یہ عام رائے ہے کہ ان کی تعاون عمل کی پالیسی کے خاطر خواہ نتائج برآمد نہیں ہوئے اور وہ یہ طے کرتی ہے کہ اس لیے اب یہ ممکن نہیں ہے کہ گول میز کانفرنس یا اس کی ان ذیلی کمیٹیوں سے تعاون عمل کرے ، جو دستور تیار کر رہی ہیں کیونکہ ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کیا گیا ہے کہ جملہ مسلم مطالبات کو دستور میں شامل کیا جائے گا۔ لیکن چونکہ برطانوی حکومت نے یہ تیقن دیا ہے کہ فرقہ وارانہ مسئلہ کے متعلق وہ اپنا فیصلہ بغیر کسی تعویق کے شائع کر دے گی ، اس لیے یہ کانفرنس حکومت برطانیہ پر زور دیتی ہے کہ وہ اپنے فیصلہ کا جلد از جلد اعلان کر دے تاکہ مسلم جماعت کو صاف طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ دستور جدید میں اس کا کیا موقف ہے۔ اگر یہ اعلان اواخر جون سے قبل نہ ہو تو کانفرنس کے اگزیکٹو بورڈ کا ایک

۹۸- ایضاً ، ص ۳۱۹ و ۳۲۰۔

جلسہ ۳ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع کو راست اقدام کا پروگرام طے کرنے کے لیے منعقد ہو -

اس کانفرنس کی یہ رائے ہے کہ اس عرصہ میں جماعت کو حسب ذیل طریقہ پر اس طرح منظم کیا جائے کہ وہ ہر مفاجاتی صورت حال (Emergency) کے لیے تیار ہے ،

۱- تمام ملک میں مسلم کانفرنس کی شاخیں قائم کی جائیں ،

۲- ملک کی تمام مسلم تنظیمات میں باہمی ربط پیدا کیا جائے تاکہ سیاسی نجات ، معاشی فلاح اور جماعتی وحدت حاصل ہو -

۳- مسلم کانفرنس کی شاخوں کے تحت رضا کاروں کی جماعتیں تیار کی جائیں اور ان سے یہ عہد لیا جائے کہ وہ مسلم کانفرنس کے مطالبات کو منوانے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں کریں گے -

۴- مندرجہ بالا مقصد کے لیے چندہ جمع کیا جائے -

یہ کانفرنس مجلس عاملہ کو مجاز گردانتی ہے کہ راست اقدام کا ایک پروگرام تیار کرے اور اس کو ایگزیکٹو بورڈ کے سامنے جون سنہ ۱۹۳۲ع سے پہلے مناسب کاروائی کے لیے پیش کر دے - یہ کانفرنس گول میز کانفرنس کی ذیلی کمیٹیوں میں مسلم مندوبین نے جو حصہ لیا ہے ، اس کی توثیق نہیں کرتی ، کیونکہ یہ ۹ اگست سنہ ۱۹۳۱ع کی قرارداد کی خلاف ورزی ہے - یہ کانفرنس اس امر کو واضح کو دینا چاہتی ہے کہ صوبجاتی خود مختاری کے متعلق جو اعلان لندن میں ۲۶ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع کو کیا گیا ہے یا کوئی دوسری تحریک جو گول میز کانفرنس یا اس کی ذیلی کمیٹیوں کے مندوبین پیش کریں اور وہ تحریک یا بیان مسلم کانفرنس کی قراردادوں یا اس کے مطالبات سے ہم آہنگ نہ ہو ، تو وہ مسلم کانفرنس کے لیے قابلِ قبول نہ ہو گا -

تیسری قرارداد :- ہرگاہ کہ گول میز کانفرنس میں وفاق کی جو اسکیم بنائی گئی ہے اس کی تفصیلات مرتب کرنے میں کافی عرصہ لگے گا اور ہرگاہ کہ برطانوی ہند کے صوبے قانونِ حکومت ہند سنہ ۱۹۱۹ع کے

آغاز ہی سے کامل صوبجاتی خود مختاری کا مطالبہ کر رہے ہیں ، اس لئے یہ کانفرنس مطالبہ کرتی ہے کہ برطانوی ہند کے تمام صوبوں میں یک وقت فوری صوبجاتی خود مختاری کا نفاذ کر دیا جائے اور وفاق اسکیم کی تفصیلات کے متعلق چھان بین اور ان کی ترتیب و تدوین بعد میں ہوتی رہے -

چوتھی قرراداد :- سرحد میں جو آرڈیننس اور ضابطۂ جرائم سرحد (Frontier Crimes Regulation) نافذ ہے ، اس کی تنسیخ کی جائے اور اس صوبے کی حیثیت دوسرے صوبوں کے مانند قرار دی جائے -

پانچویں قرراداد :- برطانوی بلوچستان میں فوراً

۱- سخت قوانین کو ختم کر دیا جائے -

۲- مقامی بلدی مجالس (Local Municipal Boards) قائم کیے جائیں

۳- مدارس فوقانیہ (High Schools) اور کالج قائم کیے جائیں -

۴- طلباء کو وظائف دیئے جائیں -

۵- سرکاری ملازمتوں میں باشندوں کو متناسب حصہ دیا جائے اور اس صوبہ کو دیگر صوبوں کے مماثل حیثیت دی جائے -

چھٹی قرارداد :- بغیر کسی توقف کے سندھ کو ایک علیحدہ صوبہ قرار دیا جائے -

ساتویں قرارداد :- پنجاب کی زرعی قرضداری کافی بھاری ہے اس لئے فوراً حسب ذیل اقدامات کئے جائیں -

۱- خانگی بنک کاری پر مناسب تجدید -

۲- زمین گروی بنکوں (Land Mortgage Banks) کا قیام -

۳- قرضوں کی بالا قساط ادائی کے لیے قانون سازی -

۴- دیوالیہ قرار دینے والے قوانین میں نرمی پیدا کی جائے -

آٹھویں قرارداد :- مسلمانوں کا ایک ہی سیاسی مرکزی ادارہ ہو - اس غرض کے لیے ایگزیکٹو بورڈ کو کانفرنس کا یہ اجلاس ہدایت کرتا ہے کہ وہ کل ہند مسلم لیگ کی کونسل سے مل کر اس مسئلہ کو طے کرے -

مندرجہ بالا قراردادوں(الف) کے علاوہ اس کانفرنس میں کشمیر اور الور کے متعلق بھی دو تحریکیں منظور کی گئیں ۔ کشمیر کے مسائل میں علامہ اقبال نے کافی دلچسپی لی ہے ، اس کا تذکرہ ایک علیحدہ عنوان کے تحت آگے آئے گا ۔

مذکورہ بالا قراردادوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ صاف واضح ہو جاتا ہے کہ ان سب قراردادوں کو ڈاکٹر صاحب کے خطبہ صدارت کی روشنی میں مرتب کیا گیا تھا ۔

بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کا حق اکثریت اقبال کا ایک اہم بیان

ہم دیکھ چکے ہیں کہ علامہ اقبال بنگال و پنجاب میں مسلمانوں کے حقِ اکثریت (Majority Right) کے زبردست حامی تھے ۔ سیاست کے عملی میدان میں قدم رکھنے کے بعد سے انہوں نے ہر موقع پر پریس و پلیٹ فارم سے کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں مسلمانانِ بنگال و پنجاب کے اس حق کی پر زور وکالت کی تھی ، اور کل ہند مسلم کانفرنس کے خطبۂ صدارت میں انہوں نے واضح الفاظ میں پنجاب و بنگال کی مجالس مقننہ میں مسلمانوں کی اکثریت کو دستوری و آئینی ضوابط میں مستحکم و محفوظ کر دینے کا مطالبہ بڑے شد و مد سے پیش کیا تھا ۔ واقعہ یہ تھا کہ برطانوی ہند کے جن صوبوں میں دستوری اصلاحات نافذ ہو چکی تھیں ، ان میں صرف یہی دو صوبے ایسے تھے جہاں آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی اکثریت تھی ۔ بہار و اڑیسہ ، یو ۔ پی و سی ۔ پی ، بمبئی و مدراس اور آسام ہندو اکثریت کے صوبے تھے ۔ سندھ اس وقت بمبئی میں شامل تھا ۔ گو یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ، لیکن یہ مسلم اکثریت صوبہ بمبئی کی ہندو اکثریت میں گم تھی ۔ صوبہ سرحد میں اگرچہ مسلمان اکثریت میں تھے لیکن یہاں دستوری اصلاحات کا نفاذ ہی نہ ہوا تھا ۔ اس لیے یہاں مقننہ

الف ۔ کل ہند مسلم کانفرنس کی یہ اور دیگر قراردادوں (جن کا ذکر آگے آ رہا ہے) کی مطبوعہ کاپی مجھے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے ذاتی کتب خانہ سے دستیاب ہوئی تھی ۔

اور اس کے لیے انتخابات کا سوال ہی نہ تھا ۔ رہا بلوچستان تو وہ مسلم علاقہ ضرور تھا ، لیکن اس کا شمار برطانوی ہند کے صوبوں میں نہ تھا ۔ وہ برٹش بلوچستان کہلاتا تھا اور وہاں راست وائسرائے کے ایجنٹ کی حکومت تھی ۔ وہاں کی مقامی آبادی کو حکومتی ذمہ داری میں کسی نوعیت سے شریک کرنے یا معمولی اختیارات دینے سے بھی انگریزی حکومت کتراتی رہی تھی ۔ الغرض لے دے کے بنگال و پنجاب کے صرف دو صوبے ہی ایسے تھے ، جہاں دستوری اصلاحات نافذ ہوئے تھے اور جہاں مسلمان آبادی کے لحاظ سے اکثریت میں بھی تھے ۔ مگر ان دونوں صوبوں کی بدقسمتی یہ تھی کہ مسلمانوں کا آبادی میں جو تناسب تھا ، اسی تناسب سے انھیں ایوان ہائے مقننہ میں نیابت نہیں ملی تھی ۔ سابقہ دونوں دستوری اصلاحات ـــــ منٹو مارلے اصلاحات اور مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات ـــــ کے تحت انھیں اسی مصیبت کو بھگتنا پڑا تھا ۔ یہ مصیبت دو گونہ تھی ۔ ایک تو یہ کہ ان دونوں صوبوں کی کل آبادی میں مسلمانوں کی اکثریت کا جو تناسب تھا ، اس کا اظہار فہرست رائے دہندگان میں نہیں ہوتا تھا ۔ مثلاً پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی ۵۷ فیصد تھی مگر فہرست رائے دہندگان میں مسلمان ووٹروں کا تناسب ۴۴ فیصد تھا ۔ یہی حالت کم و بیش بنگال کی تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ رائے دہی کے لیے تعلیم ، جائداد ، مالی حیثیت وغیرہ کی شرائط لگائی گئی تھیں اور ان دونوں صوبوں کے مسلمان تعلیمی اور اقتصادی لحاظ سے وہاں کی اقلیتوں بالخصوص ہندوؤں سے بہت پیچھے تھے ۔ دوسرے یہ کہ "پاسنگ" (Weightage) کا اصول ان دونوں صوبوں کی مسلم اکثریت کے لیے وبالِ جان بنا ہوا تھا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ پاسنگ (Weightage) کا اصول یہ تھا کہ اکثریت اپنی نشستیں گھٹا کر اقلیتوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے زیادہ نشستیں دیدے ۔ میثاقِ لکھنؤ (Lucknow Pact) میں اسی اصول پر ہندوؤں اور مسلمانوں (کانگریس و مسلم لیگ) میں اتفاق ہوا تھا اور یہی اصول مانٹیگو چیمسفورڈ اصلاحات میں نافذ کیا گیا تھا ۔ اس اصول کی رو سے بہار و اڑیسہ ، یو ۔ پی ، سی ۔ پی ، مدراس و بمبئی و آسام کی ہندو اکثریت ، ایوان ہائے مقننہ میں اپنی کچھ نشستیں گھٹا کر مسلم اقلیت کو دے دینے کے باوجود ، نقصان

میں نہیں رہتی تھی ۔ وجہ یہ تھی کہ ان صوبوں کی آبادی میں ہندوؤں کو " عظیم " عددی اکثریت حاصل تھی ۔ مجالس مقننہ میں اس عظیم اکثریت کی کچھ نشستیں گھٹا دینے سے ، ان کی حیثیت اور مرتبہ پر کچھ اثر نہیں پڑتا تھا ، ان کی واضح اور مستحکم اکثریت ایوان ہائے مقننہ میں بہرحال برقرار تھی ۔ لیکن پنجاب و بنگال کی یہ صورت نہ تھی ۔ یہاں مسلمانوں کو گو عددی اکثریت حاصل تھی ، تاہم یہ اکثریت " عظیم " نہ تھی ، معمولی سی تھی ۔ پنجاب میں مسلمان ۵۷ فیصد تھے اور بنگال میں صرف ۵۴۰۸ فیصد ان دونوں صوبوں کے ایوان ہائے مقننہ میں " اصول پاسنگ " کے لحاظ سے مسلم اکثریت کی نشستیں گھٹا کر جب اقلیتوں کو دیدی گئیں تو ان مجالس میں مسلم اکثریت عملاً اقلیت میں تبدیل ہو گئی ۔ دیگر فرقوں کے مقابلہ میں فرداً فرداً تو یہ اکثریت تھی مگر پورے ایوان میں ان دیگر فرقوں کی مجموعی نشستوں کے مقابلہ میں یہ اقلیت ہی قرار پاتی تھی ۔ الغرض شرائط رائے دہندگی کے سخت ہونے اور اصول پاسنگ کو نافذ کرنے کی وجہ سے مسلمان ان دونوں صوبوں میں خسارے میں تھے ۔ پھر یہ صوبے آبادی ، رقبہ اور وسائل کے لحاظ سے مسلمانوں کے سب سے بڑے صوبے تھے ، اسی لیے مسلمانانِ ہند کا مطالبہ یہ تھا کہ ان صوبوں کی " عددی اکثریت اور آئینی اکثریت " میں جو فرق رکھا گیا ہے ، اسے ختم کیا جائے اور ان دونوں صوبوں میں مسلم آبادی کا جو تناسب ہے اسی لحاظ سے ان کی مجالسِ مقننہ میں بھی نشستوں کا تعین کیا جائے ۔ بالفاظِ دیگر پنجاب کی مقننہ میں مسلم نشستیں ۵۷ فیصد ہوں اور بنگال میں ۵۴ فیصد ۔

ان دونوں صوبوں میں ایک عجیب و غریب صورت حال یہ تھی کہ یہاں مسلمانوں کی اکثریت کے مقابلہ میں صرف ہندو ہی اقلیت نہ تھے بلکہ دیگر فرقے بھی تھے ۔ پنجاب میں سکھ اور بنگال میں یورپین اور دیسی عیسائی ۔ گویا اصولِ پاسنگ کی رو سے پنجاب میں مسلم اکثریت کے مقابل ایک طرف ہندو اقلیت ہونے کے اعتبار سے اپنے عددی تناسب سے زیادہ نشستوں کا مطالبہ کرتے تھے ، تو دوسری طرف سکھ بھی اپنے آپ کو اس کا حقدار قرار دیتے تھے ۔ اسی طرح بنگال میں ہندو اور یورپین و دیسی

عیسائی اقلیت ہونے کی بناء پر " پاسنگ " پر اپنا حق جتاتے تھے - گویا ان دونوں مسلم صوبوں کی ہر اقلیت چاہے وہ ہندو ہو ، سکھ ہو یا یورپین و عیسائی ہو ، مستقبل کی سیاسی اصلاحات میں معمولی و حقیر مسلم اکثریت کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھی ، بلکہ اس کو اقلیت بنا دینے پر تلی ہوئی تھی - مستقبل کی دستوری اصلاحات کے سلسلہ میں مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ سندھ کو بمبئی سے غیر مشروط طریقہ پر علیحدہ کرکے ایک صوبہ بنایا جائے ، سرحد و بلوچستان میں ایسی ہی سیاسی اصلاحات نافذ ہوں ، جیسی دوسرے صوبوں کو دی جائیں گی اور صوبہ پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی تعداد کا جو تناسب آبادی میں ہے ، اسی تناسب سے ایوانِ ہائے مقننہ میں ان کی نشستیں مقرر کی جائیں ، تاکہ ایک طرف تین مستحکم مسلم اکثریت والے صوبے ـــــ سندھ ، سرحد اور بلوچستان ـــــ قائم ہو جائیں اور دوسری طرف پنجاب و بنگال کی مجالس مقننہ میں واضح مسلم اکثریت آ جائے ، اور اس طرح ہندو اکثریت کے سات صوبوں کے مقابلہ میں مسلم اکثریت کے یہ پانچ صوبے ایک طرح کا توازنِ قوت پیدا کر سکیں - یہ مطالبہ جمہوریت اور سیاسی انصاف (Political Justice) کی رو سے ہر طرح جائز ، معقول اور واجبی تھا ، اور اسی لئے علامہ اقبال نے ہر جگہ اور ہر موقع پر اس کی وکالت کی تھی اور اپنے خطبۂ صدارت کل ہند مسلم کانفرنس میں اس پر بڑا زور دیا تھا - لیکن ہندو اور سکھ اسی مطالبہ کے سخت مخالف تھے - انھیں پنجاب و بنگال میں مسلم اکثریت ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی - علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت میں اس مطالبہ کو دہرایا اور کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں مسلمانوں کے مطالبات کی عدم منظوری کی صورت میں راست اقدام (Direct Action) کی دھمکی دی تو ہندوؤں اور سکھوں نے خصوصیت کے ساتھ اس مطالبہ کے خلاف زبردست شور مچایا اور بڑا زہریلا پراپیگنڈا کیا - مقصد یہ تھا کہ چاہے کچھ ہو ، آنے والے دستور میں ان دونوں مسلم اکثریت کے صوبوں کی مجالسِ مقننہ میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت نہ بننے پائے !

علامہ اقبال نے جو اب صدرِ کل ہند مسلم کانفرنس تھے ، اپنے چار رفقاء کے ساتھ بتاریخ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۲ء ایک مشترکہ بیان جاری کیا ، جس

میں انھوں نے اس پراپیگنڈے کی قلعی کھول دی اور ساتھ ہی کل ہند مسلم کانفرنس کی پالیسی کو واضح کیا ۔ انھوں نے کہا :

"ہم گذشتہ کئی ہفتوں سے نہایت غور کے ساتھ دیکھ رہے ہیں کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی قطعی اکثریت کے اہم اور جائز مطالبہ کے خلاف ایک نہایت زہریلا پراپیگنڈا جاری ہے ۔ ہم متعجب ہیں کہ ایک بوسیدہ استدلال کو تازہ ہمت اور جرأت کے ساتھ بار بار دہرایا جا رہا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ مرکزی مجلس وضع آئین اور دیگر صوبہ جات میں فرقہ وار اکثریت قائم رہنے میں کوئی حرج نہیں ، لیکن ان دو صوبہ جات میں فرقہ وار اکثریت کا وجود ناقابلِ برداشت ہے ، جہاں مسلمانوں کو بہ اعتبار آبادی اکثریت حاصل ہے ۔ اس خلافِ عقل و ہوش نقطۂ نظر کے حامیوں نے اس لفظی شعبدہ گری کو بھی ترک کر دیا ، جو وہ کسی زمانہ میں قانونی و غیر قانونی اکثریت کے فرق و امتیاز کی صورت میں کیا کرتے تھے ۔ یہ امتیاز بھی عملاً بے سود اور نتیجتاً بے معنی تھا ، اس لیے کہ مرکز کے علاوہ باقی چھ صوبہ جات میں بھی ہندوؤں کی اکثریت محض غیر قانونی ہونے کے باوجود مؤثر ، محفوظ اور مستقل تھی ۔

غالباً اس لفظی فریب کاری کے ضعفِ استدلال سے متاثر ہو کر گول میز کانفرنس کے بعض ہندو اور سکھ مندوبین نے اقلیتوں کے مباحث کے وقت یہ چیز اچھی طرح واضح کر دی کہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے مطالبہ اکثریت کے سلسلہ میں ان کا اعتراض اکثریت کی قانونی نوعیت پر نہ تھا ۔ انھیں نفس اکثریت پر ہی اعتراض تھا ، خواہ کسی صورت میں بھی کیوں نہ ہو ۔ مسلم مطالبات کی مخالفت کی یہ نوعیت پنجاب میں ہندوؤں اور سکھوں کے سیاسی اجتماعات کی تقریروں سے اور بھی واضح ہو چکی ہے ۔

ہم اس امر کا فیصلہ دنیا پر چھوڑ دیتے ہیں کہ جس حالت میں

ہندو اور سکھ مسلمانوں سے یہ خواہش رکھتے ہیں کہ وہ چھ صوبہ جات اور مرکز میں اپنے آپ کو عظیم ہندو اکثریت کے حوالہ کر دیں ، وہ پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت کی شدید مخالفت کرکے ، ہندوستان بھر کی ہندو اکثریت کی نیک نیتی کا نقش کس حد تک بٹھا سکیں گے اور مسلمانوں کے قلوب میں ان کی طرف سے کس حد تک اعتماد پیدا ہو گا ۔

بہرحال ہم یہ پھر واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ بحالاتِ موجودہ مسلمانوں کے لیے یہ قطعی طور پر ناممکن ہے کہ وہ کسی ایسے دستور کو تسلیم کر لیں ، جو مرکز اور دیگر صوبہ جات میں انھیں ایک مؤثر اور مستقل ہندو اکثریت کے ماتحت رکھ کر پنجاب اور بنگال کی مسلم اکثریت کو ضروری تحفظات سے محروم کر دے ۔

مسلم مطالبات کی مخالفت میں سکھوں کی روش نہایت ہی عجیب و غریب ہے ۔ وہ پنجاب کی آبادی میں صرف تیرہ فیصد ہیں لیکن ان کا مطالبہ یہ ہے یا انھیں اس مطالبہ پر آمادہ کیا جاتا ہے کہ پنجاب کو سکھوں اور ہندوؤں کی مشترکہ اکثریت پر چھوڑ دیا جائے ۔ ان کی دلچسپ تجویز یہ معلوم ہوتی ہے کہ تیرہ فیصد کی اقلیت اور ستاون فیصد کی اکثریت کے تفاوت کو بالائے طاق رکھ دیا جائے اور ملک بھر کے فرقہ وار مسائل کی اہمیت سے بے نیاز ہو کر مسلمانوں ، ہندوؤں اور سکھوں کو پنجاب کونسل میں یکساں نیابت دی جائے ۔ بالفاظِ دیگر ستاون فیصد کی اکثریت کو چالیس فیصد کی اقلیت میں تبدیل کر دیا جائے اور سکھوں اور ہندوؤں کی انتالیس فیصد مشترکہ اقلیت کو پچپن فیصد کی اکثریت کے برابر کر دیا جائے اور یہ وہ استدلال ہے ، جسے منطق اور عقل و خرد سے کوئی واسطہ نہیں ۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس استدلال کی حمایت میں ہر طرح کی دھمکیاں دی جا رہی ہیں ۔ بہرکیف ہم اپنے مسلمان بھائیوں سے اور بالخصوص پنجابیوں

سے یہ درخواست کرتے ہیں کہ و صبر و استقلال سے کام لیں اور اس پراپیگنڈے سے متاثر نہ ہوں ۔

آل انڈیا مسلم کانفرانس نے واقعات کی رو کے بغور مطالعہ کے بعد بحالاتِ موجودہ صبر و استقلال کی تلقین کی ۔ باوجود اس کے کہ کانگریس کی ایک خاص خبر رساں ایجنسی کانگریس کے مجوزہ اجلاس سے پیشتر نہایت سرگرمی سے یہ پراپیگنڈا کر رہی ہے کہ سر سموئیل ہور اور وزارتِ برطانیہ نے یہ فیصلہ کر لیا ہے کہ مسلمانوں کے مطالبات کو منظور نہیں کیا جائے گا ۔ ہم توقع رکھتے ہیں کہ مسلمان نہایت امن و سکون کے ساتھ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے مجوزہ پروگرام کے مطابق اپنے آپ کو منظم کریں گے اور یہ جماعت حسبِ ضرورت مسلمانوں کے لیے کوئی سیاسی پروگرام تجویز کرے گی " ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس مسئلہ پر (یعنی پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کے تحفظ کے مسئلہ پر) آل انڈیا نقطۂ نظر سے غور کرنا چاہئے ۔ آٹھ صوبوں میں سے دو میں مسلمانوں کی اکثریت کو یقینی بنا دینے سے مسلمانوں کو آل انڈیا اقلیت کی حیثیت میں اپنی مستقل شخصیت کے اظہار کا موقع ملے گا[۹۹] "

مجلس عاملہ کل ہند مسلم کانفرنس

مجلس عاملہ کل ہند مسلم کانفرنس کا ایک جلسہ تاج محل ہوٹل شملہ میں بتاریخ ۸ جون سنہ ۱۹۳۲ع منعقد ہوا ڈاکٹر اقبال نے اس جلسہ کی صدارت کی ۔ اس جلسہ میں دو اہم قراردادیں(الف)

۹۹۔ روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۲ع ۔

الف۔ میں مولانا غلام رسول مہر کا ممنون ہوں کہ ان قراردادوں کی مطبوعہ کاپی مجھے ان کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی ۔ ان قراردادوں کے علاوہ مسلم کانفرنس کی قراردادیں جن کا ذکر آگے آ رہا ہے ، ان کے کتب خانہ میں موجود تھیں ۔ اس کتاب کی تالیف کے سلسلہ میں بعض مسائل سے متعلق مولانا مرحوم کے گراں قدر خیالات سے مستفید ہونے کا موقع بھی ملا ۔

نظور کی گئیں ۔ ایک قرارداد یہ تھی کہ صوبوں کو مکمل مالی خود
ختاری دی جائے اور صوبے مرکز کو متناسب رقومات دیا کریں ۔ اب
ک صورت حال یہ تھی کہ آمدنی کے بڑے اور اہم مدات مثلاً محصولِ
مدنی درآمد و برآمد وغیرہ یہ سب مرکزی حکومت کی تحویل میں تھے اور
وبوں کی آمدنی کے ذرائع غیر لچکدار تھے یعنی ان میں اضافہ ہونے کی بہت
کم توقع تھی مثلاً محصولِ لگان وغیرہ۔ لیکن جہاں تک اخراجات کا تعلق
ہا صوبوں کے سپرد اکثر و بیشتر قومی تعمیر کے کام تھے مثلاً تعلیم ،
حفظانِ صحت ، صنعت وغیرہ اور مرکز کے ذمے زیادہ تر ایسے محکمے تھے
ن کا تعلق ملک کے مشترکہ مفاد یا پھر سامراجی مفاد سے تھا مثلاً حمل
نقل اور دفاع وغیرہ صوبوں کے مدات آمدنی محدود تھے۔ اس لیے وہ
ومی تعمیر پر خاطر خواہ رقومات صرف نہیں کر سکتے تھے اور مرکزی
مدنی کے مدات لچکدار تھے ، اس لیے وہ خرچ زیادہ کر سکتے تھے۔ بالفاظِ
یگر ملک کے عام مالیات کی تقسیم اس انداز کی تھی کہ اس سے ملک کے
ام مفاد اور ٹھوس تعمیری کاموں سے زیادہ سامراجی اغراض و مفادات
کو فائدہ پہنچتا تھا ۔ پھر اس پر طرفہ تماشا یہ تھا کہ صوبہ جات میں دو
ملی حکومت نافذ تھی جس کے تحت محکمہ مالیہ تقریباً امور محفوظ میں
امل تھا یعنی اس کے کاروبار سے متعلق صوبائی مقننہ میں کوئی قراردادِ
م اعتماد نہیں لائی جا سکتی تھی۔ ڈاکٹر اقبال اس کے حامی تھے کہ
وبوں کے مدات آمدنی کو لچکدار بنایا جائے اور محصولِ آمدنی کو بجائے
مرکز کے صوبوں کے سپرد کر دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے یہی تجویز پنجاب
ونسل میں بتاریخ ۴ مارچ سنہ ۱۹۲۹ع پیش کی تھی ۔ اب مجلس عاملہ کل
د مسلم کانفرنس نے ان خیالات کی روشنی میں یہ قرارداد منظور کی تھی ۔
ن جلسہ میں دوسری قرارداد ریاستِ الور کے مسائل سے متعلق تھی ۔ ان
سائل کا تذکرہ ہم آگے کریں گے ۔ اس لیے اس قرارداد کو یہاں نظر انداز
رتے ہیں ۔

ک اہم واقعہ / ڈاکٹر صاحب کی صدارت کل ہند مسلم کانفرنس کا ایک
قعہ قابلِ ذکر ہے ۔ اس زمانہ میں مسلمانوں کو بڑی تشویش اس فرقہ

وارانہ فیصلہ کے متعلق تھی جس کا اعلان وزیر اعظم برطانیہ کرنے والے تھے ۔ چنانچہ کل ہند مسلم کانفرنس کے اجلاس سالانہ نے یہ طے کیا تھا کہ اگر یہ اعلان اواخر جون سے قبل نہ ہو جائے ، تو کانفرنس کے اگزیکٹیو بورڈ کا ایک جلسہ ۳ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع کو راست اقدام طے کرنے کے لئے منعقد کیا جائے ۔

ڈاکٹر صاحب نے بعض اراکین بورڈ کے مشورہ سے اس جلسہ کو جولائی کے آخر تک ملتوی کر دیا ۔ اس پر مختلف حلقوں میں چہ میگوئیاں ہوئیں اور ڈاکٹر صاحب کے اس رویہ کو آمریت سے تعبیر کیا گیا ۔ ۴ جولائی کو الہ آباد میں کل ہند مسلم کانفرنس کے بعض اہم اراکین نے ایک جلسہ عام کیا اور اس جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کے اس طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کیا گیا اور مولانا حسرت موہانی اور بعض دیگر زعماٴ نے اس جلسہ میں کل ہند مسلم کانفرنس کے اندر ایک نئی جماعت بنانے کا فیصلہ کیا ۔ چاہئے تو یہ تھا کہ ڈاکٹر صاحب اس جلسہ کے احتجاج اور اس نئی جماعت سازی سے ناراض ہو جاتے ، لیکن اس کے برعکس اپنے ایک بیان مورخہ ۶ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع میں آپ نے اس جماعت کا خیر مقدم کیا اور بتایا کہ مولانا حسرت موہانی کا یہ اقدام بالکل درست ہے ، کیونکہ یہ طرز خود ان کی (یعنی ڈاکٹر صاحب کی) تجویز کے مطابق ہے ، جس میں انھوں نے یہ رائے پیش کی تھی کہ مسلمانوں کا صرف ایک کل ہند ادارہ ہو اور مسلمانوں کے باہمی اختلافات اور جماعت سازیوں کی وباٴ کو ختم کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ادارہ کا دستور اتنا لچکدار ہو کہ اس میں ہر سیاسی مکتبِ خیال کو برسراقتدار آنے کا موقع حاصل رہے ۔ اسی بیان میں انھوں نے اس امر کی وضاحت کی کہ آمرانہ طور پر جلسہ کو ملتوی نہیں کیا گیا تھا بلکہ مجلس عاملہ کے ایک اجلاس میں ، جس میں خود ڈاکٹر صاحب شریک نہیں تھے ۔ مولانا شفیع داؤدی معتمد عمومی کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ اگر ان کے خیال میں فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان ۳ جولائی تک ہونے کا امکان نہ ہو تو وہ ایگزیکٹیو بورڈ کے جلسہ کو ملتوی کر دیں ۔ اسی بیان کے آخر میں آپ نے کہا ۔

" اس مسئلہ پر پوری طرح غور کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر فرقہ وارانہ فیصلہ مسلمانوں کے موافق نہ ہو تو مسلمانوں کا یہ فرض ہے کہ حکومت سے لڑیں ، لیکن میں یہ مشورہ انھیں نہ دوں گا کہ وہ کسی قسم کا راست اقدام محض اس لئے شروع کر دیں کہ حکومت ایک مقررہ مدت کے اندر فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان نہ کرنے کے جرم کا ارتکاب کر رہی ہے ۔ واقعات کے اس کھلم کھلا اظہار کے بعد مسلمان یہ اندازہ کریں گے کہ ایگزیکٹیو بورڈ کے جلسہ کو ملتوی کرنے کا جو مشورہ میں نے دیا تھا ، وہ کہاں تک شملہ کے چشم و ابرو کے اشاروں سے متاثر تھا ۔ اپنی خانگی اور پبلک زندگی میں میں نے دوسرے شخص کے ضمیر کی پیروی کبھی نہیں کی ، ایسے وقت جب کہ جماعت کے بہت ہی اہم مفادات کی بازی لگی ہوئی ہے ، اس آدمی کو ، جو دوسروں کے ضمیر کی پیروی کرتا ہے ، میں اسلام اور انسانیت کا غدار سمجھتا ہوں ، میں اس امر کو اچھی طرح واضح کر دوں کہ جن لوگوں نے التواء کی خواہش کی تھی ان کے رویہ کی یہ تعبیر نہ کی جانی چاہئیے کہ وہ قرارداد لاہور(الف) پر عمل کرنے کے لیے (اگر اس پر عمل کرنے کی ضرورت لاحق ہو تو) دوسروں سے پیچھے رہیں گے ۔ جب تک یہ ضرورت لاحق نہ ہو جماعت کو چاہئیے کہ اپنی طاقتوں کو محفوظ رکھے ۔ دانائی یہ نہیں ہے کہ اپنی توانائی کو غیر اہم مسائل پر صرف کیا جائے ، بلکہ اس کو ان معاملات پر خرچ کرنے کے لیے محفوظ رکھا جائے ، جو واقعتاً اہمیت رکھتے ہیں "[۱۰۰]

ڈاکٹر صاحب کی شخصیت ہی کا یہ اثر تھا کہ اس نئی جماعت کے

الف۔ قراردادِ لاہور سے مراد ، کل ہند مسلم کانفرنس منعقدہ لاہور کے اجلاس عام کی قرارداد متعلقہ راست اقدام ہے ۔ مصنف

۱۰۰۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۷۴ و ۱۷۵ ۔

زعما نے آپ سے کچھ ہی دنوں بعد ملاقات کی اور ان کے اس خیال کی تائید کی کہ موجودہ حالات میں ایگزیکٹیو بورڈ کا جلسہ ملتوی کرنا مناسب تھا ۔ ان لوگوں کی بھی یہی رائے تھی کہ برطانوی حکومت نے چونکہ ہندوستانی جماعتوں کی درخواست پر فرقہ وارانہ مسئلہ کو حل کرنے کی ذمہ داری لی ہے ، اس لیے ہم کو اس کے فیصلہ تک انتظار کرنا چاہئے ۔ بہرحال ڈاکٹر صاحب کے تدبر نے اس اہم اور نازک موقع پر کل ہند مسلم کانفرنس میں اختلاف کے پودے کو برگ و بار لانے سے پہلے ہی خشک کر دیا ۔

سکھ مسلم مفاہمت کی کوشش | ہم بتا چکے ہیں کہ دوسری گول میز کانفرنس میں اقلیتوں نے ایک میثاق مرتب کیا تھا ، لیکن سکھوں کو اس سے اختلاف تھا ، اس لیے وہ اس میثاق میں شریک نہیں ہوئے تھے ۔ اب جولائی سنہ ۱۹۳۲ع میں سکھ قائدین نے بہت سی یادداشتیں ، منشورات ، بیانات اور قراردادیں مرتب کرکے شائع کرنی شروع کیں ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے اعلان کے موقع پر ایسے مظاہرے کیے جائیں جن سے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے ۔ ان ہی بیانات میں ، سردار اجل سنگھ نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ سکھ ملک کی دستوری ترقی کی بہ نسبت اپنے فرقہ کے مسائل سے زیادہ تعلق رکھتے ہیں[۱۰۱] ۔

ڈاکٹر صاحب نے ان تمام بیانات اور یادداشتوں کی حقیقت کو واضح کرتے ہوئے ، ایک بصیرت افروز بیان ۲۵ جولائی سنہ ۱۹۳۲ع کو شائع کیا ، جس میں آپ نے فرمایا ۔

> ”یہ طرز عمل خواہ اپنے فرقہ کی محبت ہی کا آفریدہ کیوں نہ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ان لوگوں کو اپیل نہیں کر سکتا ، جو ایک خاص جماعت کے جائز مفادات کی حفاظت کے ساتھ ہندوستان کے مجموعی مفادات کو نظر انداز کر دینا نامناسب سمجھتے ہیں[۱۰۲]“

۱۰۱- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۷۶ ۔
۱۰۲- ایضاً ص ۱۷۷ ۔

آگے چل کر آپ نے وضاحت کی کہ پنجابی سکھوں کی پشت پناہی ہندو کر رہے ہیں ۔ پھر آپ نے فرمایا ۔

" مجھے ڈر ہے کہ اس طرزِ عمل کی وجہ سے مسلمانوں اور دوسری اقلیتوں میں اس کا فطری ردِ عمل ہو گا اور وہ سنجیدگی کے ساتھ اکثریتی فرقہ کے غلبہ کو خوف کی نظروں سے دیکھیں گے جو مرکز اور چھ صوبوں میں برسراقتدار آ جائے گا اور اقلیتوں کے بڑھتے ہوئے خوف کا بڑا ہی برا اثر ہندوستان کی آئندہ تاریخ پر پڑے گا ۔

آخر میں آپ نے مسلمانوں کے مؤقف کی ان الفاظ میں وضاحت کی ۔

" مسلمانانِ ہند جس قدر اپنی جماعت کے مفادات کو محفوظ کرنے کے لیے مضطرب ہیں ، اتنے ہی وہ ملک کی دستوری ترقی کے لیے بے چین ہیں ۔ جو تحفظات وہ طلب کر رہے ہیں وہ بحیثیت ایک کل ہند اقلیت کے ان کی حفاظت کے لیے ضروری ہیں ۔

مرکز میں اور ان صوبوں میں جہاں وہ بہت ہی حقیر (hopeless) اقلیت میں ہیں اکثریتی راج کے اصولوں کو وہ تسلیم کرتے ہیں ، بشرطیکہ ان کو اس جائز اور متوازی فائدہ سے محروم نہ کر دیا جائے ، جو انھیں بعض دیگر صوبوں کے اندر اکثریت میں ہونے کی وجہ سے حاصل ہے[۱۰۳] "

اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں سکھ مسلم مفاہمت کی کوششیں شروع ہوئیں ۔ اس سلسلہ کی ابتدا یوں ہوئی کہ ۲۹ جولائی کو سردار جوگیندر سنگھ نے ایک مختصر سا نوٹ ڈاکٹر صاحب کے نام روانہ کیا ۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ اس نوٹ کو مزید گفتگو کے لیے بنیاد بنایا جائے ۔ اس نوٹ کا خلاصہ یہ تھا کہ سردار صاحب پنجاب کی مقننہ میں مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت دینا چاہتے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب کی اس تجویز کو مسترد کر دیا اور واضح کیا کہ ان کی تجویز کے مطابق

۱۰۳- اسپیچیسس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۷۸ ۔

بظاہر تو مسلمانوں کو ایک نشست کی اکثریت حاصل رہے گی ، لیکن درحقیقت ان کا مؤقف مساویانہ بلکہ اقلیت جیسا ہو جائے گا ۔ اپنے جواب میں ڈاکٹر صاحب نے یہ بھی لکھا کہ مسلمانوں کو صرف ایک نشست کی اکثریت نہیں چاہیے بلکہ وہ مقننہ میں کم از کم ۵۱ فیصد نشستیں چاہتے ہیں[۱۰۴] جیسا کہ اقلیتوں کے میثاق میں مطالبہ کیا گیا تھا ۔ سردار جوگیندر سنگھ نے ایک بالکل ہی مختلف اسکیم ڈاکٹر صاحب کے پاس روانہ کی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس کو بھی رد کر دیا ۔ اس کے رد کرنے کی ان کے پاس دلیل یہ تھی کہ پنجابی مقننہ میں مسلمانوں کی واضح اکثریت ہونی چاہیے ۔ ڈاکٹر صاحب کا خیال یہ تھا کہ اس کے بغیر کسی اسکیم پر غور کرنا یا مذاکرات کرنا نہ صرف بے سود بلکہ مضرت رساں ہے ، کیونکہ جب اس قسم کی اطلاعات حکومت کو ملتی ہیں تو وہ اپنے سوعودہ اعلان کو معرضِ التوا میں ڈال دیتی ہے ۔ سردار جوگیندر سنگھ کی ان تجاویز کا حوالہ دیتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے ان خیالات کا اظہار ایک اخباری بیان[۱۰۵] میں کیا ، جو ۴ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو شائع ہوا ، لیکن اس کے باوجود شملہ میں سکھ مسلم مفاہمت کی گفت و شنید شروع ہوئی ۔ بتاریخ ۷ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کل ہند مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کا ایک جلسہ ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں بمقام دہلی منعقد ہوا ، جس میں شملہ کی گفتگوئے مفاہمت کے متعلق حسبِ ذیل قرارداد منظور کی گئی ۔

” مجلس عاملہ سکھوں کی اس خواہش کو پسند کرتی ہے کہ وہ اقلیتوں کے میثاق میں شریک ہونا چاہتے ہیں اور شملہ میں بعض مسلمانوں سے ان کی گفت و شنید کا خیر مقدم کرتی ہے اور اس خیال کی سختی سے حامی ہے کہ اس گفت و شنید کو ممکن ہے اس طرح استعمال کیا جائے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق برطانوی حکومت کا فیصلہ ملتوی کر دیا جائے اس لیے شملہ کے ان مسلمانوں سے درخواست کی جاتی ہے کہ وہ اپنی گفت و شنید

۱۰۴- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۷۸ و ۱۷۹ ۔
۱۰۵- ایضاً ص ۱۷۹ ۔

کو اس وقت تک ملتوی رکھیں جب تک حکومت فیصلہ کا اعلان نہ کر دے (الف)"

ڈاکٹر صاحب نے مجلس عاملہ کے اس فیصلہ کے بموجب اس گفت و شنید میں حصہ لینے سے انکار کر دیا - آپ نے اپنے طرز عمل اور مجلس عاملہ کے فیصلہ کی وضاحت اپنے ایک بیان[۱۰۶] میں کی ، جو ۱۰ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو جاری کیا گیا تھا - اس بیان میں آپ نے بتایا کہ اس گفت و شنید کا مقصد فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق حکومت کے اعلان کو مزید تعویق میں ڈالنا ہے اور اس کی وجہ سے ڈر ہے کہ پنجاب میں سکھ مسلم تعلقات اور زیادہ کشیدہ ہو جائیں گے - مزید یہ کہ یہ گفتگو نتیجہ خیز معلوم نہیں ہوتی ہے ، کیونکہ سکھ مسلمانوں کو پنجاب کی مقننہ میں صرف ایک نشست کی اکثریت دینا چاہتے ہیں اور اس کے معاوضہ میں یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان ان کو مرکزی مقننہ میں ۵ فیصد ، صوبہ سرحد کی مقننہ میں ۲ فیصد نشستیں دیں اور مرکزی حکومت میں ایک نشست دلائیں - بہرحال اس بناء پر کوئی مفاہمت نہیں ہو سکتی تھی ، اس لیے ڈاکٹر صاحب نے اس میں شرکت نہیں کی - واقعات مابعد نے اس اندیشہ کی تائید کی اور یہ گفت و شنید ناکام رہی -

کل ہند مسلم کانفرنس کی مجلس عاملہ کے ۷ اگست کے اجلاس میں ایک قرارداد میں حکومت سے مطالبہ کیا گیا کہ وہ جلد از جلد فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کر دے - اس اجلاس میں ایک اور اہم قرارداد بھی منظور ہوئی ، جو حسب ذیل ہے -

"حکومت اگر مسلمانوں کے کم سے کم مطالبات کو تسلیم نہ کرے تو پھر مجلس عاملہ ایک مکمل قومی پروگرام بنانے کے لیے حسب ذیل اشخاص پر مشتمل ایک کمیٹی تشکیل دیتی ہے -

---

الف اس قرارداد کی مطبوعہ کاپی مجھے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے کتب خانہ سے ملی - مصنف

۱۰۶- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۰ -

۱- سر محمد اقبال (صدر) - ۲- مولانا مظہر الدین - ۳- مولانا حسرت موہانی - ۴- سید حبیب صاحب - ۵- مولانا غلام رسول مہر - ۶- حسن ریاض صاحب - ۷- ڈاکٹر علی صاحب (اراکین)
اس کمیٹی کا یہ فرض ہو گا کہ وہ اس پروگرام کو جلد از جلد مجلس عاملہ کے سامنے پیش کرے(الف)"

اقبال اور فرقہ وارانہ فیصلہ ۱۶ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو وزیر اعظم نے فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کر دیا - اس کے معاً بعد ہندوستان کی صحافتی و سیاسی دنیا میں ایک شور برپا ہو گیا -

مختلف جماعتوں کی قراردادیں اور سربرآوردہ اشخاص کے بیانات شائع ہونے لگے - بتاریخ ۲۳ اگست سنہ ۱۹۳۲ع ڈاکٹر صاحب کی صدارت میں کل ہند مسلم کانفرنس کا ایک جلسہ بمقام دہلی منعقد ہوا - جس میں فرقہ وارانہ فیصلہ پر غور و خوض کرنے کے بعد ایک قرارداد منظور کی گئی -

اسی زمانہ میں بمبئی کے ایک صاحب نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق اخبارات میں ایک بیان شائع کروایا ، جس میں انھوں نے کہا -

"اگر ڈاکٹر محمد اقبال سے فرقہ وارانہ فیصلہ کرنے کو کہا جاتا تو وہ بھی وہی فیصلہ کرتے ، جس کا اعلان برطانوی حکومت نے کیا ہے[۱۰۷]"

اس بیان سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس وقت کی سیاسی دنیا میں کس قدر اہمیت حاصل تھی - گویا عام طور پر اور خصوصاً غیر مسلم حلقوں میں یہ سمجھا جاتا تھا کہ ڈاکٹر صاحب ہی ان مسائل میں مسلم نقطۂ نظر کے صحیح ترجمان ہیں -

ڈاکٹر صاحب نے بتاریخ ۲۴ اگست سنہ ۱۹۳۲ع فرقہ وارانہ فیصلہ

الف- اس قرارداد کی مطبوعہ کاپی مجھے مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی - مصنف

۱۰۷- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۳ -

سے متعلق ایک بہت ہی اہم بیان شائع کیا ، جس میں کل ہند مسلم کانفرنس کی منظورہ قرارداد کی تائید کی گئی تھی ۔ فرقہ وارانہ فیصلہ پر ڈاکٹر صاحب کا ایک اعتراض تو یہ تھا کہ پنجاب کی مقننہ میں مسلمانوں کو واضح اکثریت نہیں ملی تھی ، حالانکہ اس صوبہ میں ان کی ۵۷ فیصد آبادی تھی ۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ سکھوں کو بہت زیادہ پاسنگ دیا گیا تھا ۔ پھر یہ پابندی بھی لگا دی گئی تھی کہ وہ بعض نشستوں کو مشترکہ انتخاب کے ذریعہ حاصل کریں ۔ اس فیصلہ پر ڈاکٹر صاحب کو دوسرا اعتراض یہ تھا کہ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت ہونے کے باوجود مقننہ میں ان کو ۶۱ فیصد نشستیں دینے کی بجائے صرف ۴۸ء۴ فیصد(الف) نشستیں دی گئی تھیں اور مسلمانوں کے اس حق کو مار کر یورپی جماعت کو پاسنگ دیا گیا تھا ۔ آپ کا تیسرا اعتراض یہ تھا کہ بنگال ، پنجاب اور سرحد کی غیر مسلم اقلیتوں کو زیادہ پاسنگ دیا گیا تھا ، حالانکہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلم اقلیت کو اتنا پاسنگ نہیں دیا گیا تھا ۔ مسلمانوں کو جو نقصان ، اس فیصلہ سے پہنچ رہا تھا ، ڈاکٹر صاحب اس کی تلافی دو صورتوں سے کرنا چاہتے تھے ۔ ایک تجویز تو ان کی یہ تھی کہ بنگال ایک بڑا صوبہ ہے اس لیے وہاں دو ایوانی مقننہ ہو اور کابینہ ان دونوں ایوانوں کے مشترکہ اجلاس کے سامنے ذمہ دار ہو ، اور بالائی ایوان میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں دی جائیں ۔ اس طرح بنگال میں ایک مستحکم اکثریت حاصل ہو جائے گی ۔ دوسری تجویز ڈاکٹر صاحب کی یہ تھی کہ صوبہ جات کو زیادہ حقیقی اختیارات دئے جائیں اور مرکز کو صرف چند برائے نام اختیارات حاصل ہوں[۱۰۸] ۔

گاندھی جی کا اعلانِ مرن برت اقبال کی نظر میں

اس باب کے پس منظر میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ اچھوتوں کے جداگانہ حقِ نیابت کے خلاف گاندھی جی نے ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع میں مرن برت رکھا تھا ۔

الف علامہ کو یہاں تسامح ہوا ہے ۔ بنگال میں مسلمانوں کو ۴۸ء۴ فیصد نہیں بلکہ ۴۷ء۶ فیصد نشستیں دی گئی تھیں ۔

۱۰۸- اسپیچیس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۲ تا ۱۸۵ ۔

اس مرن برت سے قبل انھوں نے یرواداجیل میں رہتے ہوئے وزیر ہند اور وزیر اعظم برطانیہ سے خط و کتابت کی تھی۔ علامہ اقبال نے اس خط و کتابت پر نہایت دلچسپ، بصیرت افروز اور حکیمانہ تبصرہ کیا ہے۔ اس تبصرہ سے قبل "گاندھی وزیر اعظم مراسلت" اور اچھوتوں کے حق جداگانہ نیابت کے متعلق فرقہ وارانہ فیصلہ (Communal Award) میں جو کچھ کہا گیا ہے، اس کو ایک نظر دیکھ لیجئے تاکہ اس تبصرہ کی معنویت پوری طرح سمجھ میں آ جائے۔

بتایا جا چکا ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ سے قبل ہی گاندھی جی نے جیل میں بیٹھے بیٹھے یہ تاڑ لیا تھا کہ وزیر اعظم برطانیہ اپنے فرقہ وارانہ فیصلہ میں اچھوتوں کو جداگانہ نیابت کا حق دیں گے۔ اسی لیے انھوں نے ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء کو سر سموئیل ہور وزیر ہند کے نام ایک خط لکھا، جس کے جستہ جستہ حصے درج ذیل کیے جاتے ہیں۔

"شاید آپ کو یاد ہو گا کہ گول میز کانفرنس میں جب اقلیتوں کے دعوے کو پیش کیا گیا تھا، تو میں نے اپنی تقریر کے اختتام پر یہ کہا تھا کہ اگر دلت جاتیوں (یعنی اچھوتوں) کو جداگانہ نیابت دی گئی تو میں اسے اپنی زندگی سے مزاحمت کروں گا، یہ بات نہ تو میں نے فوری جوش و خروش سے متاثر ہو کر کہی تھی اور نہ فصاحت و بلاغت کے لیے کہی تھی۔ میرے اس بیان میں سنجیدگی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی . . . . .
ان کا (یعنی اچھوتوں) کا معاملہ دوسرے فرقوں سے بالکل مختلف ہے۔ میں اس کے خلاف نہیں ہوں کہ ان کو کونسلوں میں نمائندگی دی جائے۔ میں تو اس بات کے حق میں ہوں گا کہ ان کے ہر ایک مرد و زن کو خواہ ان کی تعلیم یا جائیداد کی قابلیت کچھ ہی ہو، ووٹر قرار دیا جائے . . . .
لیکن میری یہ مسلمہ رائے ہے کہ خالص سیاسی نکتہ نگاہ سے، خواہ کچھ بھی ہو، جداگانہ نیابت ان کے لیے اور ہندوؤں کے لیے نقصان دہ ہے۔ جداگانہ نیابت ان کے لیے کس قدر نقصان دہ

ہو گی اس بات کا وہی شخص اندازہ لگا سکتا ہے ، جو یہ جانتا ہو کہ برائے نام اونچی ذات والے ہندوؤں میں وہ کس طرح سے پھیلے ہوئے ہیں اور جو یہ جانتا ہو کہ موخرالذکر لوگوں کا ان کو کتنا بھاری سہارا ہے ۔ جہاں تک ہندو مت کا تعلق ہے ، جداگانہ نیابت (یعنی جداگانہ طریقہ انتخاب) اس کے زندہ جسم کو چیر کر ٹکڑے ٹکڑے کر دے گی ۔ میرے لیے تو ان جماعتوں کا سوال سب سے بڑھ چڑھ کر ایک اخلاقی اور دھارمک سوال ہے ۔ اگرچہ سیاسی پہلو بھی ضروری ہے ، لیکن وہ اخلاقی اور مذہبی سوال کے مقابلہ میں ہیچ ہے . . . . میں محسوس کرتا ہوں کہ ہندو لوگ صدیوں سے دلت جاتیوں (اچھوتوں) کو ، جو جان بوجھ کر ذلیل کرتے آئے ہیں ، اس کے لیے خواہ وہ کتنی ہی تلافی کریں ، تھوڑی ہے ، لیکن مجھے معلوم ہے کہ جداگانہ نیابت نہ تو کوئی پش جاتاب (تزکیہ) ہے اور نہ اس ناقابل برداشت ذلت کا کوئی علاج ، جس کے پاؤں تلے کچلے جا کر وہ گریہ و زاری کرتے چلے آئے ہیں ۔ اس لیے میں ہز مجسٹی کی گورنمنٹ کو مؤدبانہ طور پر بتلا دینا چاہتا ہوں کہ اگر ان کے فیصلے سے دلت جاتیوں (اچھوتوں) کے لیے جداگانہ نیابت پیدا کر دی گئی ، تو میں فاقہ کشی سے جان دے دوں گا . . . .
جس قدم کو میں اٹھانے والا ہوں ، وہ کوئی طریقہ نہیں ہے بلکہ وہ میری زندگی کا ایک اہم جز ہے ۔ میری آتما سے ایک آواز اٹھ رہی ہے جس کی میں حکم عدولی نہیں کر سکتا خواہ اس سے میری فہم و فراست پر بڑا بھاری دھبہ ہی کیوں نہ آئے[۱۰۹] ”

۱۳ اپریل سنہ ۱۹۳۲ع کو سر سموئیل ہور وزیر ہند نے گاندھی جی کے اس خط کا ایک رسمی سا جواب دے دیا کہ وہ چندے انتظار کریں اور عجلت میں کوئی فیصلہ نہ کریں اور یہ کہ اس معاملہ کا فیصلہ کرتے

۱۰۹- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۸۵۹ تا ۸۶۲ -

وقت حکومت گاندھی جی اور ان کے ہم خیال اصحاب کی رائے کو بھی پیش نظر رکھے گی[۱۱۰] ۔

۱۶ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو وزیر اعظم برطانیہ نے فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان کیا ، اس فیصلہ (ایوارڈ) میں اچھوتوں کے تعلق سے جو کچھ کہا گیا تھا ، وہ یہ تھا

" پست اقوام کے وہ افراد جن کو حق رائے دہی حاصل ہو گا ، وہ عام حلقہ انتخاب میں رائے دے سکیں گے ، لیکن چونکہ اس امر کا امکان ہے کہ ایک عرصہ تک اس طریقہ سے مقننہ میں ان کی نمائندگی نہ ہو سکے ، اس لیے ان کو جداگانہ حقِ انتخاب دیا جاتا ہے ، لیکن یہ عام حلقہ انتخاب میں بھی رائے دہی کے مجاز ہوں گے ۔ بنگال میں پست اقوام کو کتنی نشستیں دی جائیں اس کے لیے مزید تحقیق کی ضرورت ہے ، لیکن بہرحال انھیں مقننہ بنگال میں دس نشستوں سے کم نہیں دی جائیں گی ۔ ملکِ معظم کی حکومت کا خیال ہے کہ پست اقوام (اچھوتوں) کے لیے جداگانہ طریقہ انتخاب کی ایک غیر معین مدت تک ضرورت نہ ہو گی ۔ اس لیے دستور میں پست اقوام (اچھوتوں) کے لیے اس طریقہ انتخاب (یعنی جداگانہ طریقہ انتخاب) کو بیس سال تک کے لیے تجویز کیا جائے گا ، جس کے بعد ان کی مرضی سے اس طریقۂ انتخاب کو بدلا جا سکتا ہے[۱۱۱] "

وزیر اعظم کے اس اعلان کی رو سے جو حقوق و تحفظات اچھوتوں کو حاصل ہوئے تھے ، وہ یہ تھے

۱۔ صوبائی مجالس مقننہ میں علیحدہ نشستوں کا تعین ،

۱۱۰۔ ایضاً ص ۸۶۵ تا ۸۶۶ ۔

۱۱۱۔ " پاکستان " (Pakistan or Partition of India) از ڈاکٹر امبیڈکر پاکستانی ایڈیشن مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۷۶ع ص ۳۵۵ کمیونل ایوارڈ کا فقرہ نمبر (۹) ۔

۲- بیس سال کے جداگانہ انتخاب کا حق ،

۳- عام حلقۂ انتخاب (یعنی ہندو حلقۂ انتخاب) سے کھڑے ہونے اور ووٹ دینے کا حق -

پہلی دو شقوں کی رو سے اچھوتوں کے جدا گانہ تشخص کا تعین ہوتا تھا ، لیکن تیسری شق انھیں پھر ہندو قوم سے نہ صرف ملائے رکھتی تھی، بلکہ اس میں ''شامل'' بھی کر دیتی تھی - یہ تیسری شق بطور خاص محض گاندھی جی کی تسلی کے لیے رکھی گئی تھی کیونکہ انھوں نے اچھوتوں کے جداگانہ حق نیابت کو '' ہندو مت کے زندہ جسم کی چیر پھاڑ '' سے تعبیر کیا تھا - تاہم گاندھی جی اس تیسری شق سے مطمئن نہیں ہوئے - وہ پہلی شق یعنی مجالس مقننہ میں اچھوتوں کے لیے نشستوں کے تعین کے خلاف بھی نہ تھے ، البتہ جو چیز انھیں کھل رہی تھی اور جس کے خلاف انھوں نے اپنی جان کی بازی لگا دینے کا عزم کیا تھا ، وہ تھا اچھوتوں کے لیے جداگانہ انتخاب کا حق !

وزیر اعظم کے اعلان کے دوسرے ہی دن یعنی ۱۸ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو انھوں نے وزیر اعظم برطانیہ ریمزے میکڈانلڈ کے نام ایک خط میں لکھا -

'' میں اقلیتوں کی نمائندگی کے بارے میں برطانوی گورنمنٹ کے فیصلہ کو پڑھ کر غور و فکر میں پڑ گیا ہوں . . . . اس کے لیے صرف ایک ہی طریقہ ہو سکتا ہے کہ میں لگا تار فاقہ کشی سے جان دے دوں ، اگر اس دوران برطانوی گورنمنٹ خود بخود رائے عامہ کے دباؤ سے اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کرکے ان دلت جاتیوں (اچھوتوں) کے لیے اپنی فرقہ وارانہ اسکیم کو واپس لے لے جن کے نمائندے عام رائے دہندوں سے عام رائے شماری کے مطابق خواہ کتنی ہی وسیع ہو ، چنے جانے چاہئیں -

اگر مروجہ طریقہ سے اس فیصلہ پر نظر ثانی نہ کی گئی تو فاقہ کشی آئندہ ۲۰ ستمبر سے شروع ہو گی . . . . ''

مجھے افسوس ہے کہ مجھے اس قسم کا فیصلہ کرنا پڑا ہے ، لیکن جس قسم کا دھارمک منش (مذہبی آدمی) میں اپنے آپ کو سمجھتا ہوں اس کے سوا مجھے اور کوئی چارہ بھی نہیں ہے[۱۱۲] "

وزیر اعظم برطانیہ نے گاندھی جی کے مندرجہ بالا خط کا جواب ۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو دیا ، جس میں انھوں نے اپنی حکومت کے فیصلہ کی توضیح و تشریح اس طرح کی -

" گورنمنٹ کی اسکیم کے مطابق دلت جاتیاں (اچھوت) ہندو جاتی کا حصہ ہی بنی رہیں گی لیکن پہلے بیس سالوں کے لیے وہ ہندو جاتی کا نیابتی حصہ ہوتی ہوئی بھی معدودے چند خاص حلقوں کی طرف سے اپنے حقوق اور اپنے مفاد کے تحفظ کے ذرائع بھی ان کو حاصل ہوں گے اور ہمیں اس بات کا یقین ہے کہ موجودہ حالات میں یہ امر ضروری ہے - جہاں کہیں بھی نمائندگی کے لیے اس قسم کے حلقے بنائے جائیں گے ، دلت جاتیوں (اچھوتوں) کے افراد ، عام ہندو حلقوں میں ووٹ دینے سے محروم نہ رہیں گے بلکہ ان کے دو دو ووٹ ہوں گے ، تاکہ ان کے ہندو جاتی کے افراد ہونے میں کوئی فرق نہ آئے -

جن کو آپ دلت جاتیوں کے لیے فرقہ وارانہ حلقے بتلاتے ہیں ، ان کو پیدا کرنے کے ہم ارادتاً خلاف رہے ہیں - ہم نے تمام دلت جاتی ووٹروں کو عام یا ہندو حلقوں میں شامل کر دیا ہے تاکہ اونچی جاتی کے امیدواروں کو ان کے ووٹوں کے لیے ان کا دست نگر نہ ہونا پڑے اور نہ ان کو اونچی ذات والوں کا - پس ہر ایک طریقہ سے ہم نے ہندو سوسائٹی کو قائم و برقرار رکھا ہے[۱۱۳] "

۱۱۲- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا راميا ص ۸٦۷ تا ص ۸٦۸ -

۱۱۳- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا راميا ص ۸۷۰ و ۸۷۱ -

پھر وزیر اعظم نے اپنے خط کے آخر میں لکھا

"گورنمنٹ کا فیصلہ قائم رہے گا اور فرقوں کے لیے جو نیابتی بندوبست گورنمنٹ نے ایک دوسرے کے متضاد مطالبوں کو ان کے حسن و قبح کی کسوٹی پر پرکھتے ہوئے توازن کرنے کی جو صدق دلی سے کوشش کی ہے ان کی جگہ صرف وہی سمجھوتہ لے سکتا ہے ، جو مختلف فرقے اپنے لئے خود بخود تجویز کریں[۱۱۴] "

گاندھی جی نے بتاریخ ۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع وزیر اعظم کو جواب الجواب میں لکھا

"میں اس کو بڑے زور سے کہتا ہوں کہ میرے لیے یہ محض ایک دھارمک (مذہبی) معاملہ ہے . . . , ...
دلت جاتیوں (اچھوتوں) کے لیے جداگانہ نیابت کے تعین ہی سے مجھے یہ خدشہ ہے کہ ایک ایسا زہر بدن کے اندر داخل ہو جائے گا ، جو ہندو جاتی کا ستیاناس کر دے گا لیکن جس سے دلت جاتیوں کو کچھ بھی فائدہ حاصل نہ ہو گا ۔

میں دلت جاتیوں کے لیے تناسب سے زیادہ نمائندگی کے بھی خلاف نہیں ہوں ۔ میں تو اس بات کے خلاف ہوں کہ جب تک یہ لوگ ہندو دائرے کے اندر رہنا چاہتے ہیں انھیں محدود طور پر بھی قانوناً علیحدہ نہ کیا جائے . . . .
اس لیے مجھے چار و ناچار اس فیصلہ پر قائم رہنے کے لیے مجبور ہونا پڑتا ہے[۱۱۵] "

گاندھی جی کا مرن برت ۲۰ ستمبر سے شروع ہوا ، لیکن اس سے پہلے ہی یہ مراسلت اخبارات میں شائع ہو گئی ۔ علامہ اقبال نے اس مراسلت کو

۱۱۴- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا راميا ص ۸۷۳ ۔

۱۱۵- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا راميا ص ۸۷۴ و ۸۷۵ ۔

پڑھنے کے بعد جو تبصرہ کیا ، اب اس کو سنیے - ۱۳ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء کے ایک اخباری بیان میں وہ کہتے ہیں

" مہاتما گاندھی نے جو خطوط وزیرِ ہند اور برطانوی وزیر اعظ کے نام تحریر کیے ہیں وہ میری نظر سے گذرے ہیں یہ خطو شخصی نفسیات کے دلچسپ مظہر ہیں ! . . . .
آپ کے خطوط میں مجھے جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے ، و یہ ہے کہ مسٹر گاندھی کے نزدیک ہندو مذہب کی صداقت ، اخلا اور مذہبی مسائل پر مشتمل ہے - ذاتی طور پر میں ان خیالات ک بے حد مداح ہوں ، لیکن باوجود اس امر کے کہ ہندو اخبارات نے میرے متعلق بدگمانیاں پھیلانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی میرا ہمیشہ یہی خیال رہا ہے کہ سیاسی مسائل بالخصوص ہندوستان میں ، مذہبی اور اخلاقی معاملات کے مقابلے میں بالکل بے حقیقت ہو کر رہ جاتے ہیں -

میرے لیے یہ چیز کوئی تعجب انگیز نہیں کہ ہندوستان کے قومیتِ متحدہ کے تخیل کے علمبردار اور ہندوستانی اقلیتوں میں فرقہ وارانہ بیداری (جو سیاسی طاقت کے انتقال کے لیے لازمی ہے) کے اشد ترین مخالف نے نہایت دلیری سے بالخصوص ہندو قومیت کے تحفظ کے مسئلہ کی حمایت کو نہایت ضروری خیال کیا - یہ صورتِ حالات مسلمانوں کی آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہے کہ وہ مہاتما جو ملک کی تمام اقلیتوں کو قومیتِ متحدہ ہند میں جذب ہو جانے کی تلقین کیا کرتا تھا ، آج اسے ایک ایسے فرقہ وار اعلان میں ہندو قوم کا انتشار نظر آ رہا ہے ، جس کے ذریعہ سے مجالس وضع آئین میں ان لوگوں کو محدود نمائندگی حاصل ہونے کا امکان ہے ، جو خود مہاتما گاندھی کے نزدیک صدیوں تک ہندوؤں کی اونچی جاتیوں کے تختۂ مشق بنے رہے ہیں - اگر اچھوتوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے یہ معنی ہیں کہ ہندو قوم کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے تو مخلوط انتخاب کا یہ مطلب ہو گا کہ جو اقلیتیں اسے

اختیار کریں گی وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گی ! میرے خیال میں مہاتما گاندھی کی روش سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ جس اقلیت کو اپنے جداگانہ وجود کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہو گی ، اسے جداگانہ انتخاب سے دست بردار نہیں ہونا چاہئے[۱۱۶]"

گاندھی جی نے جن مذہبی و اخلاقی خیالات کا اظہار اپنے ان خطوط میں کیا تھا ، اقبال نے صدقِ دل سے ان کی ستائش کی ہے ، مگر ساتھ ہی اچھوتوں کے جداگانہ حقِ انتخاب کی انھوں نے جس بنیاد پر اس قدر شدید مخالفت کی تھی اس سے اقبال نے مسلمانوں کے حقِ جداگانہ انتخاب کی تائید میں استدلال کیا ہے !

گاندھی جی نے اپنی مخالفت کی بنیاد یہ قرار دی تھی

" جہاں تک ہندو مت کا تعلق ہے ، جداگانہ نیابت اس کے زندہ جسم کو چیر کر ٹکڑے کر دے گی[۱۱۷] . . . . . .

دلت جاتیوں کے لیے جداگانہ نیابت کے تعین سے ہی مجھے یہ خدشہ ہے کہ ایک ایسا زہر بدن کے اندر داخل ہو جائے گا ، جو ہندو جاتی کا ستیاناس کر دے گا[۱۱۸] "

علامہ اقبال نے گاندھی جی کی پیش کردہ اس بنیاد پر اپنے استدلال کی عمارت یوں کھڑی کی

" اگر اچھوتوں کے لیے جدا گانہ انتخاب کے یہ معنے ہیں کہ ہندو قوم کے فنا ہونے کا اندیشہ ہے تو مخلوط انتخاب کا یہ مطلب ہوگا کہ جو اقلیتیں اسے اختیار کریں گی ، وہ صفحۂ ہستی سے نابود ہو جائیں گی[۱۱۹] "

۱۱۶- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع -

۱۱۷- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۶۱ -

۱۱۸- ایضاً ص ۸۷۳ -

۱۱۹- روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع

اور پھر اس سے نتیجہ یہ نکالا کہ

"مہاتما گاندھی کی روش سے یہ صاف ظاہر ہو گیا ہے کہ جس اقلیت کو اپنے جداگانہ وجود کے برقرار رکھنے کی ضرورت ہوگی اسے جداگانہ انتخاب سے دستبردار نہیں ہونا چاہئیے[۱۲۰]۔

ذرا دیکھیے تو، یہ طرز استدلال کتنا دل نشیں و عام فہم اور یہ نتیجہ کس قدر واضح و روشن ہے! ـــــ مگر یہ وہ بات ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہوتی ہے، جو عملی سیاست میں بڑی غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

وزیر اعظم برطانیہ نے گاندھی جی کی دھمکی سے متاثر ہوئے بغیر فرقہ وارانہ فیصلہ میں تبدیلی نہ کرنے کا جو اعلان کیا تھا، اس پر علامہ نے اپنے اطمینان کا اظہار ان الفاظ میں کیا

جہاں تک برطانیہ کا تعلق ہے، مجھے اس بات کی مسرت ہے کہ وزیر اعظم کے خط نے فرقہ وار اعلان کے متعلق بالکل وضاحت کر دی ہے، ورنہ اس بات کا اندیشہ تھا کہ اقلیتیں کہیں یہ نہ سمجھنے لگ جائیں کہ گاندھی جی کا اصل مقصد فرقہ وار اعلان کی مخالفت بحیثیت مجموعی ہے اور حکومت برطانیہ کو ان کی بات تسلیم کر لینی چاہیے اور ان کی دھمکی کے باعث تمام اعلان میں ترمیم کر دینی چاہئیے[۱۲۱]"

برطانوی دور میں برصغیر کے اندر جب جمہوری ادارات کا آغاز ہوا تو سر سید وہ پہلے دور اندیش سیاسی مدبر تھے جنھوں نے جداگانہ طریقۂ انتخاب کو مسلمانوں کا واحد ذریعۂ تحفظ قرار دیا تھا۔ ان کے بعد جب ہندوستان کی سیاسی جد و جہد آگے بڑھی اور نتیجۃً جمہوری اداروں کو وسعت عطا کی گئی تو یہ کہنا شاید مبالغہ نہ ہوگا کہ برصغیر میں دو ہی سیاسی لیڈر اور مفکر ایسے تھے جنھوں نے جداگانہ انتخاب کی اہمیت، اس کے مضمرات اور دور رس اثرات کو محسوس کیا ـــــ یہ تھے مسلمانوں میں ڈاکٹر

۱۲۰- ایضاً

۱۲۱- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ء

اقبال اور ہندوؤں میں گاندھی جی ۔ ڈاکٹر اقبال جداگانہ انتخاب کے شدید حامی تھے اور گاندھی جی اس کے اتنے ہی شدید مخالف ۔ ان کی شدت ۔ مخالفت کا اندازہ اس سے کیجئے کہ وہ اپنی جان پر کھیل گئے اور اچھوتوں کو اس سے دستبردار کروا کے ہی دم لیا ! گاندھی جی کی اس قدر شدید مخالفت اور اقبال کی اس قدر شدید موافقت کی وجہ ایک ہی تھی ! ان دونوں کو اس امر کا پختہ یقین تھا کہ جداگانہ انتخاب ، انتخابات کا . ضر ایک طریقہ نہیں ہے ، بلکہ جداگانہ قومیت کے تشخص و تعین کا لازمی و قطعی ذریعہ ہے ۔ بالفاظ دیگر مشترکہ انتخاب سے مشترکہ قومیت کی نشو و نما ہوتی ہے اور جداگانہ انتخاب سے جداگانہ قومیت بالیدگی حاصل کرتی ہے ۔ مشترکہ انتخاب ، جداگانہ قومیت کے لیے زہر ہلاہل ہے تو جداگانہ انتخاب متحدہ قومیت کے لیے سمِّ قاتل !

ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش

اگست سنہ ۱۹۳۲ء میں فرقہ وارانہ فیصلہ ہوا ، اور ۲۶ ستمبر کو میثاقِ پونا (Poona Pact) کے تحت اس فیصلہ میں حکومتِ برطانیہ نے تبدیلی کر دی ۔ فرقہ وارانہ فیصلہ سے ہندو ، مسلمان دونوں ناراض تھے ۔ مولانا شوکت علی کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ اگر اس موقع پر ہندو مسلم مفاہمت کی ایک اور کوشش کی جائے ، تو شاید وہ کامیاب رہے اور اس طرح فرقہ وارانہ فیصلہ میں تبدیلی بھی ہو سکتی ہے اور دونوں فرقوں کی شکایات کا ازالہ بھی ہو جائے گا ۔ چنانچہ انہوں نے مولانا شیخ عبدالمجید سندھی کو (جو اس وقت صدرِ خلافت کمیٹی تھے) ساتھ لے کر ، آغاز اکتوبر ۱۹۳۲ء میں مولانا ابوالکلام آزاد اور پنڈت مدن موہن مالویہ سے بمقام بمبئی ابتدائی گفت و شنید کی ۔ ان مذاکرات کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو علامہ اقبال نے بحیثیت صدر آل انڈیا مسلم کانفرنس ، اپنے بعض رفقاً کے ساتھ حسب ذیل مشترکہ بیان ۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ء کو اخبارات کے نام جاری فرمایا

" ہم نے اخبارات میں اس گفت و شنید کی جو فرقہ وارانہ فیصلہ میں تبدیلی کے لیے بعض مسلمانوں نے شروع کی ، مختلف تفصیلات پڑھی ہیں ۔ معلوم ہوتا ہے کہ گفت و شنید صرف طریقِ انتخاب

تک محدود ہے اور کسی شخص نے بعض دوسرے مسائل پر بحث و تمحیص نہیں کی جو تمام مسلمانوں کے نزدیک انتہائی اہمیت رکھتے ہیں ، مثلاً پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کے لیے مؤثر اکثریت کا حصول ، سندھ کی علیحدگی ، فیڈرل مجلس قانون ساز میں مسلمانوں کی ایک تہائی نمائندگی اور سرکاری ملازمتوں اور وزارت میں مسلمانوں کی مناسب اور مؤثر نیابت ۔

مسلمانانِ ہند اکثریت والی قوم کے ساتھ اتحاد کے لیے ہمیشہ بیتاب رہے ہیں اور اس حقیقت سے ہر وہ شخص باخبر رہا ہے جو گذشتہ دس سال میں ان کوششوں کا مطالعہ کرتا رہا ہے ، جو مستحکم بنیادوں پر فرقہ وار اتحاد و موافقت پیدا کرنے کے لئے کی گئی ہیں ۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کا مسئلہ چھیڑنا قطعی نامناسب ہے کیونکہ ہمیں یقین ہے کہ ہماری قوم اس نازک وقت میں اس تحفظ کو چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ۔ پس محض طریقِ نیابت کے متعلق جو بھی بحث کی جائے گی اس سے کوئی مفید نتائج برآمد نہ ہوں گے ۔

تاہم ہم ان واضح تجاویز پر غور و خوض کرنے کے خلاف نہیں ، جو دوسری قوم کے رہنما ضروری متعلقہ مسائل کو سمجھتے ہوئے پیش کریں ، لیکن ہم اس امر کو اچھی طرح واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ یہ واضح تجاویز اکثریت والی قوم کی طرف سے پیش ہونی ضروری ہیں[۱۲۲] ''

واضح رہے کہ یہ بیان شملہ سے جاری کیا گیا تھا ، کیونکہ علامہ ان دنوں شملہ ہی میں تھے[۱۲۳]۔ اِدھر تو علامہ اقبال نے بمبئی مذاکرات کے متعلق یہ مؤقف اختیار کیا اور اُدھر اس ابتدائی گفتگو سے مولانا شوکت علی

۱۲۲۔ روزنامہ انقلاب لاہور ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع

۱۲۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۵ و روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۳۲ع

کی کچھ اُمید بندھی اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ اس گفتگو کو کامیابی کی منزل تک پہنچانے کے لیے گاندھی جی کی رضامندی یا کم سے کم ان کا عندیہ معلوم کرنا ضروری ہے ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ گاندھی جی اس وقت یرواداجیل میں تھے اور جیل ہی میں ان سے مل کر ، ان کا منشا معلوم کیا جا سکتا تھا ۔ اس لیے بتاریخ ۶ اکتوبر مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے درخواست کی کہ انھیں گاندھی جی سے جیل میں ملنے کی اجازت دی جائے ۔ لیکن وائسرائے نے انکار کر دیا اور وجہ یہ بتائی کہ جو اقدام وہ کر رہے ہیں ، اسے تمام مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہے اور اپنی اس دلیل کی تائید میں اس نے علامہ اقبال کے مذکورہ بالا بیان کا حوالہ دیا ! !

وائسرائے کا جواب تو مولانا شوکت علی کو ۹ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع کو وصول ہوا لیکن اس سے قبل ہی انھوں نے اور مولانا عبدالمجید سندھی نے یہ مناسب سمجھا کہ پہلے مسلمان زعما کی ایک کانفرنس طلب کی جائے ، تاکہ ان مذاکرات سے قبل جو ہندو لیڈروں اور گاندھی جی سے کئے جائیں گے ، مسلمان ایک متفقہ و متحدہ طرز عمل اختیار کر لیں ۔ اس قسم کی کانفرنس کے انعقاد کے سلسلہ میں مولانا سندھی نے بذریعہ تار علامہ اقبال سے مشورہ طلب کیا ۔ علامہ اس وقت شملہ میں تھے ۔ جب وہ لاہور پہنچے تو وہاں مولانا سندھی کا تار آیا ہوا رکھا تھا ، اس کا جواب علامہ نے بتاریخ ۸ اکتوبر فوراً بذریعہ تار یہ دیا

> " شملہ سے ایک مشترکہ بیان شائع ہو چکا ہے ۔ جب تک ہندوؤں کی طرف سے (مفاہمت کی) قطعی تجاویز موصول نہ ہو جائیں لیڈروں کا اجتماع منعقد کرنا غیر مناسب ہوگا ۔ قوم کے فیصلہ پر جمے رہئیے "[۱۲۴]

لیکن علامہ کا یہ تار دیر سے پہنچا ۔ مولانا شوکت علی اور صدر خلافت کمیٹی عبدالمجید سندھی نے علامہ کا تار وصول ہونے سے قبل ہی مسلم زعما کی ایک رسمی کانفرنس کا نہ صرف اعلان کر دیا تھا ، بلکہ اس کے لئے

۱۲۴- روزنامہ انقلاب لاہور ، ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع

انھوں نے دعوت نامے بھی جاری کر دیئے تھے[125]۔ اور اب یہ
لکھنؤ میں بتاریخ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع منعقد ہونے والی تھی
سندھی نے علامہ اقبال کا مندرجہ بالا تار وصول ہوتے ہی ۸ ا
شام کو بذریعہ تار کانفرنس سے متعلق اس تمام صورت حال کی و
اور علامہ سے اس میں شرکت کی درخواست بھی کی[125] ۔ علامہ
وقت بذریعہ ٹیلیگرام جواب دیا -

" باہمی سمجھوتہ کی کوشش قابل ستائش ہے ، لیکن ہن
طرف سے قطعی تجاویز پیش ہوئے بغیر ، مسلمان رہنماؤں کی
منعقد کرنا نقصان رساں ہے - افسوس کہ ان حالات ،
شریک نہیں ہو سکتا - میری درخواست ہے کہ آپ کانف
تجویز پر نظر ثانی فرمائیں[126] -

علامہ نے مولانا سندھی کو تو یہ مشورہ دے دیا کہ وہ
کی تجویز پر نظر ثانی کریں لیکن وہ جانتے تھے کہ اب یہ کانفرنس
منعقد ہوگی ، اس لیے انھوں نے اس سلسلہ میں مسلم عوام کو اپن
سے آگاہ کرنا اور اس مجوزہ کانفرنس کی علی الاعلان مخالفت کرنا
خیال کیا - چنانچہ اسی تاریخ یعنی ۸ اکتوبر کو انھوں نے اخبارا
ایک بیان جاری کیا ، جس میں مسلم زعماء کی کانفرنس کے سلسلہ م
سندھی کے تاروں اور اپنے جوابات کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بع

" ان حالات میں سمجھتا ہوں کہ میرا یہ فریضہ ہے کہ مجو
کانفرنس کے خلاف مسلم جماعت کی طرف سے آواز بلند
ہندو لیڈروں کی طرف سے قطعی تجاویز کی عدم موجودگی م
یہ سمجھنے سے قاصر ہوں کہ ہمیں اس کانفرنس میں ک
پر بحث کرنے کے لئے بلایا جا رہا ہے - مسلمانان ہند نے ا

۱۲۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار
لاہور طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۸۶
۱۲۶- روزنامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع

فرقوں سے مفاہمت کے لیے ہمیشہ اپنی آمادگی کا اظہار کیا ہے ، لیکن جو طریقہ اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے ، وہ ہندوؤں سے معاملات کرنے کا طریقہ تو نہیں ہے ، بلکہ اس سے ہماری اپنی صفوں میں افتراق پیدا ہو جائے گا ، جس کو ہم نے بڑی مشکلوں سے دور کیا ہے ۔

طریقۂ انتخاب کے سوال کو معمولی قرار دینا اور اس کو دوبارہ چھیڑنا باوجودیکہ مسلم جماعت نے اس بارے میں اپنا واضح فیصلہ دے دیا ، جیسا کہ مسلم کانفرنس اور مسلم لیگ کی قراردادوں سے ظاہر ہوتا ہے ، ایک بہت ہی غیر دانش مندانہ طریقہ ہے ، جس سے مسلم جماعت کے حق میں بہت ہی دور رس نتائج مترتب ہوں گے ۔ مسلم جماعت اور ملک کے وسیع تر مفادات کی خاطر اس سوال کو فی الحال طے شدہ سمجھنا چاہیئے ۔ ہمارے سامنے مخلوط انتخاب یا جداگانہ انتخاب سے بھی زیادہ اہم مسائل ہیں ۔ میں سمجھتا ہوں کہ مجوزہ کانفرنس اسلام اور ہندوستان کے مفاد کے لیے مضر اور بالکلیہ تضیع اوقات کا باعث ہے ۔ مجھے امید ہے کہ اس کانفرنس کے داعیان اپنے مؤقف پر نظرثانی کریں گے[۱۲۷] ۔

اس طرح علامہ نے مسلم کانفرنس لکھنؤ کی مخالفت سے نہ صرف بانیانِ کانفرنس کو مطلع کیا ، بلکہ بذریعہ اخباری بیان عوام کو بھی آگاہ کیا ! پھر ایک تار مسلم قوم پرستوں کے دو سرکردہ لیڈروں ، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور تصدق احمد خاں شیروانی کی طرف سے علامہ کے نام پہنچا جس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ ہندوؤں ، مسلمانوں اور سکھوں کی ایک کانفرنس منعقد کی جائے تاکہ جس طرح اچھوتوں کا مسئلہ باہمی مفاہمت سے حل ہو گیا ہے ، اسی طرح یہ مسئلہ بھی حل کر لیا جائے ۔ علامہ اقبال نے اس قسم کی کانفرنس کی بھی مخالفت کی ۔ انھوں نے ۱۰ اکتوبر کو ایک اخباری بیان جاری کیا ، جس میں اس تار کے وصول ہونے کا ذکر کرنے کے بعد کہا ۔

۱۲۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۶ و ۱۸۷

" ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شیروانی یہ چاہتے ہیں کہ ہندوؤں ، سکھوں اور مسلمانوں کی ایک کانفرنس فرقہ وارانہ سوال حل کرنے کے لیے منعقد کی جائے ، نہ کہ مسلمان لیڈروں کی کانفرنس ، جس قسم کی کانفرنس ڈاکٹر انصاری اور مسٹر شیروانی چاہتے ہیں ، اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ اکثریت کی طرف سے ہمارے سامنے مفاہمت کی معین تجاویز پیش کی جائیں ۔ ان حالات کے پیش نظر میں مولانا شوکت علی ، مسٹر عبدالمجید سندھی اور دیگر اصحاب سے ، جو کانفرنس میں آنے والے ہیں دوبارہ یہ درخواست کرتا ہوں کہ وہ کانفرنس کی تجویز اس وقت تک ملتوی کر دیں ، جب تک ہندو رہنماؤں کی طرف سے ہمارے سامنے خاص تجاویز پیش نہ کی جائیں[۱۲۸] "

بہرحال مولانا شوکت علی کی مجوزہ مسلم کانفرنس لکھنؤ اور ڈاکٹر انصاری و شیروانی کی مجوزہ سہ فریقی کانفرنس کی علامہ اقبال نے مخالفت کی اور یہ شرط لگائی کہ ایسی کسی کانفرنس کے انعقاد سے پہلے اکثریتی فرقہ کی جانب سے قطعی تجاویز آنی چاہئیں ۔ لیکن مولانا شوکت علی کی خواہش اتحاد ، علامہ اقبال کی اس مخالفت و مشورہ پر غالب آ گئی اور ۱۶ اکتوبر کو مسلم زعما کی کانفرنس لکھنؤ میں منعقد ہوئی ، جس میں قوم پرست مسلم زعما بھی شریک ہوئے ، لیکن کل ہند مسلم کانفرنس کا کوئی نمائندہ شریک نہ ہوا ۔ اس کانفرنس میں ایک قرارداد منظور ہوئی جس میں کہا گیا کہ مسلمان مسئلہ انتخاب پر اسی صورت میں غور کر سکتے ہیں جبکہ ان کے دیگر تیرہ مطالبات(الف) اکثریتی فرقہ تسلیم کر لے ۔ علامہ اقبال نے اس قرارداد پر ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع کو ایک اخباری بیان میں حسب ذیل تبصرہ کیا ۔

۱۲۸- روزنامہ انقلاب لاہور ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع

الف - تیرہ مطالبات سے مراد وہ مطالبات ہیں ، جو مسٹر جناح کے چودہ نکات کے نام سے مشہور ہوئے ، باستثنائے جداگانہ طریقۂ انتخاب

" یہ قرارداد عملاً اسی موقف کو دہراتی ہے ، جو فرقہ وارانہ گفت و شنید کے متعلق میں نے اختیار کی تھی ، یعنی یہ کہ قطعی تجاویز اکثریتی فرقہ کی جانب سے سامنے آنی چاہئیں ! اس قراردار کی رو سے مسلمان انتخابات کے مسئلہ پر اسی وقت غور کر سکتے ہیں ، جب کہ کل ہند مسلم کانفرنس کے دیگر تیرہ مطالبات قطعی طور پر قبول کر لیے جائیں ۔ اب ہندوؤں کی باری ہے کہ وہ بتائیں کہ آیا وہ گفت و شنید کرنے کے لیے تیار ہیں ۔

میرا خیال ہے کہ اس قرارداد نے قوم پرست مسلم بھائیوں کو عامۃ المسلمین سے قریب تر کر دیا ہے ۔ اب انھوں نے اس امر پر رضامندی کا اظہار کر دیا ہے کہ وہ انتخابات کے مسئلہ پر مسلم جماعت کے فیصلہ کے آگے سر جھکا دیں گے ۔ میں یقین رکھتا ہوں کہ کل ہند مسلم کانفرنس اور کل ہند مسلم لیگ کی قرارداد سے اسی فیصلہ کا اظہار ہوتا ہے ، تاہم اگر پھر ایک اور فیصلہ کی ضرورت ہے تو وہ خوشی کے ساتھ یہ فیصلہ حاصل کر سکتے ہیں ۱۲۹ "

لکھنؤ کانفرنس میں اس قرارداد کے منظور کرنے پر اکتفا نہیں کیا گیا ، بلکہ ہندوؤں اور سکھوں سے گفتگو کرنے کے لیے ایک کمیٹی بھی مقرر کی گئی ۔ اس کمیٹی کے اراکین اور ہندوؤں و سکھوں کی کئی مشترکہ نشستیں الہ آباد میں ہوئیں ۔ ان مذاکرات کو " اتحاد کانفرنس الہ آباد " کا نام دیا گیا ، جن کا مفصل ذکر ، ہم اس باب کے پس منظر میں کر آئے ہیں ۔ بالآخر جو خیال علامہ نے اسی سعیٔ مفاہمت کے متعلق ابتداءً میں ظاہر کیا تھا ، وہ صحیح ثابت ہوا ، اور مولانا شوکت علی و دیگر مسلم زعماء کی یہ کوشش عروس کامیابی سے ہمکنار نہ ہو سکی اور ہندو مسلم مفاہمت ایک خواب بن کر رہ گئی !

ان تمام تفصیلات کا بنظر غائر مطالعہ کرنے سے واضح ہو گا کہ

۱۲۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۷ و ۱۸۸

علامہ اقبال ، ہندو مسلم مفاہمت کی اس کوشش یا مسلم زعماً کی لکھنؤ کانفرنس کے فی نفسہٖ مخالف نہیں تھے وہ اس مفاہمت اور اس کانفرنس کے انعقاد سے پہلے حسب ذیل دو باتوں کا تقین چاہتے تھے

۱۔ جداگانہ انتخاب کو معرض بحث میں نہ لایا جائے بلکہ اس کو امر فیصل شدہ سمجھا جائے ،

۲۔ اکثریتی فرقہ اپنی متعین اور واضح تجاویز مسلمانوں کے سامنے رکھے ۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ان دو تیقنات کے بعد ، مسلم زعماً کی کانفرنس میں ہندوؤں کی پیش کردہ تجاویز پر غور بھی کیا جا سکتا ہے اور پھر ہندوؤں اور سکھوں سے گفتگو بھی کی جا سکتی ہے ۔ ان دونوں باتوں کو نظر انداز کرکے مسلم زعماً کی کانفرنس یا ہندو مسلم اتحاد کانفرنس منعقد کرنا گاڑی کے پیچھے گھوڑا جوتنے کے مترادف تھا ـــــــ یہ تھا علامہ کا مؤقف ، مولانا شوکت علی کی اس سعئی ہندو مسلم مفاہمت کے تعلق سے ! یہ مؤقف نہایت مدلل و معقول تھا ۔ جداگانہ طریقہ انتخاب ان کی نظر میں محض انتخاب کا ایک طریقہ نہ تھا ، بلکہ مسلمانوں کے ”ملی و قومی تشخص“ کا ایک وسیلہ و ذریعہ تھا جس کو جیسا کہ قبل ازیں ہم ان کے عملی سیاست میں داخلہ کے بعد سے برابر دیکھتے چلے آ رہے ہیں ، وہ کسی حالت اور کسی صورت میں بھی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوئے ۔ اب جب کہ بڑی الجھنوں اور دشواریوں کے بعد اس طریقۂ انتخاب کو فرقہ وارانہ فیصلہ میں تسلیم کر لیا گیا تھا ، وہ کسی ایسی کوشش کے آغاز کو بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ تھے ، جس سے مسلمانوں کے اس حق پر ذرا سی بھی آنچ آتی ہو ۔ یہ تو تھا جداگانہ انتخاب کے تعلق سے علامہ کا مؤقف ۔ اب رہا دوسرا تیقن کہ اکثریتی فرقہ اپنی معین تجاویز کو پہلے پیش کرے تو یہ بات بہت ہی واضح اور صاف تھی ۔ مسلمانوں نے ہر سعئی مفاہمت کے وقت اپنے تمام پتّے

اکثریتی فرقہ کی میز پر کھول کر رکھ دئے تھے ۔ ان کے بعض زعما تو ہندو مسلم اتحاد کے اتنے دلدادہ تھے کہ انہوں نے بغیر کسی ہیر پھیر کے اپنا دل کھول کر اکثریتی فرقہ کے سامنے رکھ دیا تھا ، لیکن ہوا کیا ؟ یہی کہ مسلمانوں کو ٹھکرا دیا گیا ، ان کا دل توڑ دیا گیا اور ایک ماہر کھلاڑی کی طرح اکثریتی فرقہ کے سب سے بڑے نیتا نے ترپ کا پتہ ہمیشہ اپنے ہاتھ میں چھپائے رکھا ۔ اسی لیے علامہ اقبال نے اب یہ شرط لگائی تھی کہ ہندو فرقہ اب تاش کا یہ کھیل بند کر دے اور کھلے دل سے سامنے آئے !

علامہ اقبال کے اس مؤقف کی توضیح و تشریح ان کے اس مکتوب سے ہوتی ہے ، جو انہوں نے اخبار ہمدم (لکھنؤ) کے ڈائریکٹر کے نام اسی زمانہ میں روانہ کیا تھا ۔ اس مکتوب کا تعلق بھی مولانا شوکت علی کی اس سعئی مفاہمت سے ہے اور اس سے جداگانہ انتخاب کے بارے میں علامہ کے نقطۂ نظر کی پوری پوری عکاسی ہوتی ہے ۔ عملی سیاست میں ان کی جد و جہد کو سمجھنے کے لیے اس مکتوب کے مندرجات کا مطالعہ از بس ضروری ہے اس لیے اس کو ہم یہاں مِن و عن درج کرتے ہیں

''ہمدم نے مسلمانوں کو ہمیشہ بے لاگ مشورہ دیا ہے ، جس کے لیے تمام ملک آپ کا شکر گذار ہے ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں مفاہمت کرانے کے لیے دوبارہ کوشش کرنے کی تجویز آپ ہی کی تھی ۔ میں نے آپ کی خدمت میں عرض بھی کیا تھا کہ شاید ایسی مفاہمت کا موقع پونا سمجھوتہ کے بعد آ جائے ۔ میرے ذہن میں اس وقت یہ بات تھی کہ شاید اکثریت کچھ تجاویز مسلمانوں کے سامنے پیش کرے ، مگر افسوس کہ ایسا نہ ہوا ۔ پنڈت مدن موہن مالوی صاحب نے بھی وہی طریقہ اختیار کیا ، جو دہلی میں اس سے پہلے مہاتما گاندھی نے اختیار کیا تھا ۔ بہرحال آپ نے مسٹر محمد علی جناح کا تار پڑھ لیا ہو گا ۔ وہ بھی اس بات سے متفق ہیں کہ مفاہمت کی تجاویز ہندوؤں کی

طرف سے پیش ہونی چاہئیں ، خواہ ان کی اساس مخلوط انتخابات کا اصول ہی کیوں نہ ہو - میرا عقیدہ یہ ہے کہ لکھنؤ کانفرنس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمان اپنے مطالبات میں جن کا اعادہ وہ کئی بار کر چکے ہیں ، از خود ترمیم کر دیں اور بالخصوص اصولِ انتخاب میں - موجودہ حالات میں ایسا کرنا انتہا درجہ کی سیاسی کمزوری کی دلیل ہے - اس کے علاوہ ایسا کرنے سے مسلمانوں میں انتشار اور افتراق کا دروازہ کھل جائے گا اور جو اتحاد و خیال انھوں نے بڑی مشکل سے حاصل کیا ہے ، ضائع ہو جائے گا ،

اس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ حکومت کے تصفیہ میں اور کچھ ہو نہ ہو ، پنجاب کے اندر مسلمانوں کی اکثریت پانچ یا سات کی زیادتی کے ساتھ ہو جاتی ہے ، صوبہ سرحد کو آئندہ نظام میں مساوات کا درجہ ملتا ہے ، سندھ کی علیحدگی کے امکانات بھی قریب تر آ گئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی جداگانہ انتخاب بھی قائم رہا ہے ، جو میری ناقص رائے میں مسلمانوں کے تمام مطالبات کی اساس ہے - جداگانہ انتخاب کو غیر مشروط طور پر رکھ کر حکومت نے مسلمانوں کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنا مستقبل آپ منتخب کر لیں - چاہیں تو اکثریت میں جذب ہو جائیں اور چاہیں تو کم از کم بعض حصصِ ملک میں اپنی جداگانہ ہستی کو برقرار رکھ کر اپنے پاؤں پر کھڑے ہو جائیں - اگر آج مسلمانوں نے قبل از وقت جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کر لی تو آئندہ کا مورخ ان کے ہندوستان میں سیاسی اعتبار سے مٹ جانے کے لیے حکومت برطانیہ کو ہرگز مطعون نہ کرے گا ، بلکہ خود مسلمانوں کو اس بات کا مجرم قرار دے گا کہ جمہوری نظام میں بحیثیت اقلیت انھوں نے اپنی بربادی اپنے ہاتھوں مول لی تھی !

تاسف کا مقام ہے کہ ہمارے بعض لیڈر ، جن میں بعض علمائے دین بھی شامل ہیں ، مسئلہ انتخاب کو محض نمائندگی کا طریقۂ کار

تصور کرتے ہیں اور بس ۔ جہاں تک میں نے مسلمانانِ ہند کی گذشتہ تاریخ اور ایشیائی اقوام کے موجودہ امیال و عواطف اور مغربی اقوام کی سیاسی ریشہ دوانیوں پر غور کیا ہے ، مجھے اس بات کا کامل یقین ہے کہ ابھی ایک عرصہ تک مسلمانانِ ہند کا مستقبل جداگانہ انتخاب سے وابستہ ہے ۔ میرے نزدیک جداگانہ انتخاب قومیت کے مغربی تصور سے بھی (قومیت کا مغربی تخیل ایک روحانی بیماری ہے) متناقض نہیں اور اس کے باوجود ، ہندی اقوام میں اتحاد اور یک جہتی پیدا ہو سکتی ہے ۔ خود یورپ میں بھی اس مقصد کا اب خاتمہ سمجھنا چاہئے ۔ لیکن یہ ممکن ہے کہ مشرقی اقوام ، یورپ کا اترا ہوا لباس پہن لیں اور انھیں مصائب سے دوچار ہوں ، جن سے یورپ دوچار ہو چکا ہے اور ہو رہا ہے ۔ خاص اس امر کے متعلق میں اپنے خیالات کا اظہار ذرا تفصیل کے ساتھ عرض کرتا ، مگر کل شام یورپ جا رہا ہوں اور جانے سے پہلے ابھی بہت سے کام باقی ہیں اس واسطے ان چند سطور پر کفایت کرتا ہوں ۔ مختصر یہ کہ مفاہمت کی تجاویز کا مسلمانوں کی طرف سے پیش کرانا ، خصوصاً جب کہ مسلمانوں کے مطالبات ایک مدت سے سب کو معلوم ہیں ، خلوص اور حب الوطنی کے نیک جذبات کا ثبوت نہیں ، بلکہ ایک سیاسی حیلہ ہے ، جس کا مقصود یہ ہے کہ اکثریت (جس کا فرض ہے کہ اقلیتوں کا اعتماد حاصل کرے) بھی اس کے لیے تیار نہیں ۔ موجودہ حالات میں فرقہ وار مسائل کی بحث کو از سر نو چھیڑنا ، نہ مسلمانوں کی خدمت ہے نہ ملک کی۔[۱۳۰] "

تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت | بتاریخ ۱۷ نومبر تیسری گول میز کانفرنس شروع ہوئی اور ڈاکٹر اقبال کو بھی اس میں شرکت کی دعوت دی گئی ، لیکن حکومت نے یہ دعوت کچھ خوش دلی کے ساتھ نہیں ، بلکہ

۱۳۰۔ روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع ۔

سرد مہری کے ساتھ دی ۔ عظیم حسین صاحب سر فضل حسین کے سوانح حیات میں لکھتے ہیں -

" دوسرے سال سر فضل حسین نے (حکومتِ کو) ترغیب دی کہ ڈاکٹر اقبال کو پھر گول میز کانفرنس میں بھیجا جائے یا بصورت دیگر فیڈرل اسٹرکچر کمیٹی میں رکھا جائے یا جمعیت اقوام کے ہندوستانی وفد کا رکن بنایا جائے ۔ اگلے سال کے تجربہ کی بنا پر ڈاکٹر اقبال کو گول میز کانفرنس میں بھیجنے کے لیے سرد مہری کے ساتھ رضا مندی ہو گئی [۱۳۱] "

اس سرد مہری کی وجہ یہ تھی کہ ڈاکٹر صاحب نے دوسری گول میز کانفرنس کی کارروائیوں پر سخت نکتہ چینی کی تھی اور مسلم کانفرنس کے صدر کی حیثیت سے اس نازک دور میں مسلم عوام کی بے لوث رہنمائی اور مختلف مواقع پر حکومت کے رویہ کی مذمت کی تھی ۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کا اعلان ہونے سے قبل ڈاکٹر صاحب کا رویہ حکومت کے مقابلہ میں سخت تھا اور آپ ہی کی قیادت میں مسلم کانفرنس نے راست اقدام کا پروگرام بھی مرتب کر لیا تھا ۔ اسی صورت میں تیسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر صاحب کی نامزدگی ، حکومت کے لیے باعثِ مسرت تو نہیں ہو سکتی تھی ، لیکن اقبال کو ہندوستان کی عام سیاست ، بالخصوص مسلمانوں کے سیاسی معاملات میں جو اہمیت حاصل ہو چکی تھی اس کو نظر انداز کرنا بھی حکومت کے لیے ناممکن تھا ۔ اس لیے بادلِ ناخواستہ ہی سہی ، ڈاکٹر صاحب کو اس کانفرنس کا رکن نامزد کرنا پڑا ۔ چنانچہ انھوں نے اس کانفرنس میں شرکت کی لیکن اس کے مباحث میں سرگرمی سے حصہ نہیں لیا ۔ تعجب ہوتا ہے کہ آپ کو اینگلو انڈین فرقہ کی تعلیمی کمیٹی کا رکن بنایا گیا تھا ۔ گول میز کانفرنسوں کی روئیداد کے مطالعہ سے واضح نہیں ہوتا کہ آپ نے اس کمیٹی میں کبھی شرکت بھی کی ۔ اس روئیداد کے پڑھنے کے بعد کچھ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نے محض ایک

۱۳۱- فضل حسین ایک سیاسی سوانح عمری از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۶ء ص ۳۱۹ -

تماشائی یا ایک خاموش رکن کی حیثیت سے اس کانفرنس میں شرکت کی تھی۔ البتہ صرف ایک واقعہ کی وجہ سے ان کی یہ شرکت بہت معنی خیز ہے۔ اس کانفرنس میں زیادہ تر بلکہ تمام تر مباحثے کل ہند وفاق اور اس کے متعلقہ امور پر ہوتے رہے۔ جب آپ کو ان مباحث میں اظہارِ خیال کا موقع ملا، تو آپ نے سرے سے "وفاق" کے تصور ہی کی مخالفت کی اور یہ رائے ظاہر کی کہ ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت (خواہ وہ وفاقی ہی کیوں نہ ہو) قطعاً قائم نہ کی جائے بلکہ ہر صوبہ کو خود مختار اور آزاد ڈومینین (Autonomous Independent Dominion) بنا دیا جائے۔ اور ان کا تعلق بجائے ہندوستان کی کسی مرکزی حکومت کے راست لندن میں وزیرِ ہند سے ہو۔ تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ کی اس تقریر کا ذکر ڈاکٹر امبیڈکر نے اپنی کتاب "پاکستان یا تقسیم ہند" میں کیا ہے۔ امبیڈکر لکھتا ہے۔

> "اگر ایک مشترکہ مرکزی حکومت کی مخالفت کو پاکستانی اسکیم کا خصوصی و بنیادی پہلو قرار دیا جائے تو گول میز کانفرنس کا ایک ہی رکن ایسا نظر آتا ہے، جس نے اس اسکیم کا نام لئے بغیر اس کی تائید کی اور وہ تھا سر محمد اقبال، جس نے تیسری گول میز کانفرنس میں اس رائے کا اظہار کیا کہ ہندوستان کے لئے کوئی مرکزی حکومت نہ ہو اور یہ کہ صوبے خود مختار اور آزاد ڈومینین ہوں، جن کا راست تعلق وزیر ہند سے لندن میں ہو[۱۳۲]"

ڈاکٹر امبیڈکر خود اس گول میز کانفرنس میں شریک تھے۔ گویا یہ ان کی عینی شہادت ہوئی۔ ان کے اس بیان کی تصدیق و توثیق سید امجد علی سابق وزیر خزانہ پاکستان کے اس انکشاف سے ہوتی ہے، جو فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب "روزگارِ فقیر" جلد اول میں درج کیا ہے، فقیر صاحب لکھتے ہیں

> "تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے واقعات کا اعادہ کرتے ہوئے، سید امجد علی ایک نہایت ہی دلچسپ اور قابلِ ذکر واقعہ کا

۱۳۲۔ پاکستان یا تقسیم ہند (Pakistan or partition of India) از ڈاکٹر امبیڈکر مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۳۲۹۔

انکشاف کرتے ہیں ۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب اور سید امجد پیرس سے بذریعہ ٹرین لندن پہنچے ۔ ریلوے اسٹیشن پر ایک نو مسلم انگریز خالد شیلڈرک ڈاکٹر صاحب کو خوش آمدید کہنے کے لیے موجود تھا ۔ خالد شیلڈرک نے اس موقع پر ڈاکٹر صاحب کو مشہور برطانوی سیاست داں جان برائٹ (John Bright) کی تقریروں کا مجموعہ دیا اور عرض کیا کہ آپ کو راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے اہم سیاسی مباحث میں حصہ لینا ہے ، اس لیے میری درخواست ہے کہ ان تقریروں کو آپ جیسے بھی ممکن ہو وقت نکال کر ضرور پڑھ لیں ۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے اسی رات اس کتاب کا مطالعہ شروع کر دیا اور رات کے دو بجے کتاب کو ختم کر کے دم لیا ۔

اس واقعہ کا سب سے اہم پہلو یہ ہے کہ تیسری راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہندوستان کے سیاسی مستقبل پر جب ڈاکٹر صاحب نے تقریر فرمائی تو جان برائٹ کے خیالات کی جھلک اور تاثر ان کی تقریر میں موجود تھا ۔ ڈاکٹر نے بعض مقامات پر جان برائٹ کے نظریات اپنے موقف کی تائید میں پیش کئے[۱۳۳]"

اب ایک نظر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ جان برائٹ کون تھا اور ہندوستان کے مستقبل سے متعلق اس کے خیالات کیا تھے ۔ جان برائٹ برطانوی پارلیمان کا رکن تھا ۔ سنہ ۱۸۵۷ع کو اس نے دارالعلوم (House of Commons) میں ہندوستان سے متعلق ایک تقریر کی تھی ، جس میں اس نے کہا

" میری تجویز یہ ہے کہ ایک ہندوستانی سلطنت (Indian Empire) قائم کرنے اور اس کے لیے ایک گورنر جنرل مقرر کرنے کے بجائے ہم نہ پہلی صورت اختیار کریں اور نہ دوسری ۔ میں تو یہ

۱۳۳- " روزگار فقیر" جلد اول از فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم مارچ سنہ ۱۹۶۵ع ص ۱۴۲ و ۱۴۳ ۔

تجویز پیش کرنا چاہتا ہوں کہ ہم ہندوستان میں احاطے (Presidencies) قائم کریں۔

میری تجویز یہ ہے کہ ہندوستان میں کم از کم پانچ احاطے (Presidencies) قائم کیے جائیں اور ان کی حکومتیں مرتبے اور تنخواہوں (مالی ذرائع) کے اعتبار سے بالکل مساوی ہوں۔ ان احاطوں کے دارالحکومت کلکتہ، مدارس، بمبئی، آگرہ اور لاہور ہوں۔ میرا خیال ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا محکمہ مالیات، محکمہ محصولات (Taxation)، محکمہ انصاف، پولیس، امور رفاہ عامہ اور محکمہ فوج ایک ہی جیسے ہوں کہ گویا ہر ایک احاطہ (Presidency) ایک جداگانہ مملکت ہے، جس کا ہندوستان کے دوسرے حصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ اس ملک (انگلستان) کا تابع (Dependency) ہے۔ اگر آئندہ کبھی انگلستان کو اپنے اقتدار اعلیٰ سے دستبردار ہونا پڑے تو ہم ایسے احاطے (Presidencies) متحد و مضبوط بنا کر چھوڑ جائیں، جن میں سے ہر احاطہ اپنی آزادی کو برقرار اور اپنی حکومت کو قائم رکھ سکے ۱۳۴"

یہاں اس بات کو ذہن میں رکھیے کہ ہندوستان کے بعض بڑے صوبوں کو احاطے (Presidencies) کہا جاتا تھا مثلاً بمبئی پریسیڈنسی مدراس پریسیڈنسی وغیرہ، یہ اصطلاح برطانوی حکومت کے ابتدائی اور وسطی دور میں رائج تھی۔ بعد میں صوبہ (Province) کی اصطلاح چل پڑی۔

الغرض علامہ اقبال ہندوستان کے لیے ایک ہی مرکز والی حکومت کے مخالف تھے خواہ یہ حکومت وفاق ہی کیوں نہ ہو۔ چنانچہ دوسری گول میز کانفرنس میں، مسلم وفد کے اراکین میں سے، بعض نے وفاق

۱۳۴- اسپیچیس بائی رائٹ آنریبل جان برائٹ ایم پی مرتبہ جیم، الف تھو روالڈ روجرز مطبوعہ میکملن اینڈ کو لندن و نیو یارک ۱۸۹۲ء۔

ہئیت کی کمیٹی میں حصہ لیا ، تو اقبال سخت ناراض ہو گئے اور مسلم وفد سے علیحدگی اختیار کر لی ، جس کا ذکر تفصیل سے ہم کر آئے ہیں - پھر دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں آپ نے کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں گو ذاتی حیثیت سے سہی ، ہندوستان کے شمال مغربی علاقہ میں ایک جداگانہ آزاد مملکت کے قیام کا تصور اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کیا تھا - یہ تصور بھی کل ہند وفاق کے خلاف ہی تھا اور اسی خطبہ صدارت میں انھوں نے "کل ہند وفاق کے خلاف آواز بلند کی تھی[۱۳۵] -" دوسری گول میز کانفرنس سے واپس آ کر کل ہند مسلم کانفرنس کے خطبہ صدارت میں بھی انھوں نے مرکز اور صوبوں میں بہ یک وقت ذمہ داری کے حوالے کر دیئے جانے کی مخالفت کی تھی[۱۳۶]- یہ بھی مرکز گریز رجحان تھی - نو مسلم خالد شیلڈرک ہندوستان بھی آ چکے تھے(الف) - اس کا امکان ہے کہ وہ اقبال سے ملے ہوں اور خانگی صحبتوں میں ہندوستان کی سیاست سے متعلق اقبال کے رجحانات و خیالات سے نہ صرف واقف ، بلکہ متاثر بھی ہوئے ہوں اور یہ بات تو تقریباً یقینی ہے کہ ان کا خطبۂ صدارت مسلم لیگ تو انھوں نے پڑھا ہی ہو گا - علامہ کے ان مرکز گریز رجحانات اور مخالفِ وفاق خیالات کے پیش نظر اس نو مسلم نے جان برائٹ کے مجموعہ تقاریر کو تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے موقع پر ان کے حوالے کرنا مناسب خیال کیا - تاکہ اقبال اپنی تقریر میں اِس پرانے برطانوی سیاستدان کے افکار و خیالات کو اپنی تائید میں پیش کر سکیں - چنانچہ بقول سید امجد علی علامہ اقبال نے " اس کتاب کا مطالعہ اسی رات شروع کر دیا اور رات کے دو بجے اسے ختم کر کے دم لیا "- پھر انھوں نے گول میز کانفرنس میں اپنی مخالفِ وفاق اور ہر صوبہ کو آزاد مختار ڈومینین قرار دینے والی تجویز پیش کی - یہ تجویز برطانوی مدبرین ، اربابِ حکومت اور انگریزی مندوبین

۱۳۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ بمبئی طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۱ -

۱۳۶- ایضاً ، ص ۳۲ -

الف - راقم الحروف ان سے مل چکا ہے -

کانفرنس کے لیے ایک انوکھی تجویز تھی - سنہ ۱۸۵۷ع سے لے کر ، سنہ ۱۹۳۷ع تک برطانوی ارباب سیاست کا نقطۂ نظر یہ رہا کہ ہندوستان ، جغرافیائی لحاظ سے ایک متصلہ (Contiguous) ملک ہے اسی لیے اس کو ایک متحدہ مملکت بھی بننا چاہیے - اپنے دور حکومت میں انھوں نے اس کو متحدہ سلطنت بنائے رکھا اور دستوری سیاسی اصلاحات کے بالاقساط نفاذ کے سلسلہ میں بھی ان کی تمام ترکوششیں اس امر پر مرکوز رہیں کہ برصغیر ہند کو کسی نہ کسی طرح ایک متحدہ مملکت بنائے رکھا جائے - اس طرز فکر و طریقۂ عمل کے خلاف اقبال کا یہ کہنا کہ کوئی مرکز ہی سرے سے نہ ہو ، برطانوی سیاستدانوں کو چیں بہ چیں کرنے والی بات تھی - اسی لیے علامہ اقبال نے جان برائٹ کے اقوال اور نظریات کو اپنی تجویز کی تائید میں پیش کیا کہ برطانوی ارباب سیاست اس تجویز سے بھڑک نہ اٹھیں بلکہ اس کو اپنے ایک ہم وطن سابق سیاستدان برائٹ کی بلند کی ہوئی آواز کی گونج سمجھیں ! !

علامہ مرحوم نے تیسری گول میز کانفرنس میں جو حصہ لیا - اس کے متعلق اب تک جو کچھ معلومات فراہم ہو سکی ہیں ، ان سے بس یہی پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے صرف یہی ایک تقریر کی تھی - افسوس ہے کہ اس تقریر کا پورا متن ابھی تک دستیاب نہیں ہو سکا ہے - البتہ ان کی ایک دوسری تقریر سے ، جو انھوں نے گول میز کانفرنس میں نہیں بلکہ نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے ایک جلسہ میں کی ، یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس تیسری گول میز کانفرنس میں مندرجہ بالا تجویز کو پیش کرنے کے علاوہ انھوں نے بطور خاص مسلمانوں کے حسب ذیل تین مطالبات پر زور دیا -

۱- مرکز کے دونوں ایوانوں میں مسلمانوں کی ۳۰ فیصد نیابت -

۲- بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ -

۳- صوبائی خود مختاری[۱۳۷] -

۱۳۷- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے - ڈار مطبوعہ ۱۹۶۷ع ص ۷۳ -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی "لا مرکز" والی تجویز کو عام طور پر پسند نہیں کیا گیا اور اس کانفرنس میں زیادہ تر "مرکزی وفاقی حکومت" کی تشکیل سے متعلق مسائل پر مباحث ہوتے رہے - چونکہ علامہ کو ان مسائل سے دلچسپی نہ تھی ، اس لیے آپ نے ان میں حصہ نہیں لیا -
اس کانفرنس کی رسمی مصروفیتوں کے علاوہ علامہ کی غیر رسمی سرگرمیاں بھی ، سیاسی نقطۂ نظر سے جاذبِ توجہ ہیں - ان میں سب سے زیادہ اہم ان کی وہ دو تقریریں ہیں جو انھوں نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے دو جلسوں میں کی تھیں - واضح رہے کہ اس لیگ کو مس مارگریٹ فارقو ہرسن نے سنہ ۱۹۱۴ع میں قائم کیا تھا - اس کا مقصد پہلی عالمی جنگ کے دوران برطانیہ کو مساعی جنگ میں امداد دینا تھا - جنگ کے خاتمہ کے بعد اس انجمن نے بالشویزم کے خلاف جدوجہد شروع کی - اس کا دوسرا مقصد نہ صرف برصغیرِ ہند میں بلکہ مشرق وسطی میں مسلمانوں کی حمایت کرنا تھا - اس طرح یہ انجمن مسلمانانِ عالم کے ساتھ برطانیہ کی دوستی کو استوار کرنا چاہتی تھی - اس انجمن کے ان ہی مقاصد کی وجہ سے علامہ اقبال کا مس فارقو ہرسن سے دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ع) کے دوران تعارف ہوا تھا اور موصوفہ نے ان کی ضیافت بھی کی تھی - اس کے بعد سے ان کی آپس میں خط و کتابت بھی ہوتی رہی جس میں اکثر سیاسی مسائل زیرِ بحث آیا کرتے تھے - مس فارقو ہرسن اپنی جماعت کی سرگرمیوں اور برطانوی حکمت عملی سے علامہ کو مطلع کیا کرتی تھیں اور علامہ بھی انھیں ہندوستان کے حالات اور مسلمانوں کی مختلف تحریکات سے آگاہ کیا کرتے تھے - مسئلہ فلسطین سے ان دونوں کو گہری دلچسپی تھی[۱۳۸] - الغرض ڈاکٹر اقبال اور مس فارقو ہرسن میں دوستانہ مراسم تھے اور ان دونوں میں بڑی حد تک سیاسی اتحادِ خیال بھی پایا جاتا تھا - تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لیے جب ڈاکٹر صاحب لندن پہنچے تو مس فارقو ہرسن نے بتاریخ ۲۴ نومبر سنہ ۱۹۳۲ع [illegible] ایک استقبالیہ دیا - اس تقریب میں

۱۳۸- اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ [illegible] ص ۳۵۰ و اقبال نامہ حصہ دوم ص ۲۸۳ [illegible] ص ۲۹۵ -

برطانوی پارلیمان کے کئی اراکین بیرونی ممالک کے سفراء اور دیگر معززین شریک تھے ۔ اس موقع پر مس فارقو ہرسن نے اقبال کا جن الفاظ میں تعارف کرایا ، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ برطانیہ کے اونچے حلقوں میں بحیثیت سیاستدان اقبال کا کیا مقام تھا ، مس فارقو ہرسن نے کہا ۔

" ہم ان میں ایسی خصوصیات پاتے ہیں جو بہت کم کسی انسان کے اندر دیکھنے میں آتی ہیں ۔ ان میں شاعر کی وہ بصارت ہے جس کی مدد سے وہ نہاں خانۂ مستقبل میں جھانک کر دیکھ لیتا ہے فلسفی کی وہ بصیرت و گہرائی ہے جس سے وہ ان اصولوں کو جو انسانی مسائل کی تہہ میں پنہاں ہیں ، برانگندہ نقاب دیکھ لیتا ہے ۔ پھر ان میں ایک عملی انسان کی وہ جولانیاں ہیں ، جنہوں نے ان کو گول میز کانفرنس کا ایک رکن بنایا ہے[۱۳۹]"۔

لارڈ لنگٹن نے بھی اس موقع پر تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال کو خراجِ تحسین ادا کیا ۔ پھر علامہ نے ایک مختصر تقریر کی جس میں انہوں نے کہا

" ہم یہاں اس لیے جمع ہوئے ہیں کہ برطانوی حکومت کے گہرے ربط و تعاون کے ساتھ ہندوستان کے لیے ایک دستور وضع کریں ۔ ہمیں ایک ایسا پائیدار دستور بنانا ہے ، جس کو ناکامی سے دو چار ہونا نہ پڑے ۔ ہندوستان ایک بہت بڑا ملک ہے ، جس میں مختلف مذاہب اور زبانوں کے لوگ ہزاروں سال سے رہتے چلے آئے ہیں ۔

اس امر کی ضرورت ہے کہ کانفرنس کے اغراض و مقاصد کو زیادہ صحیح طریقہ پر متعین کیا جائے ۔ مختلف قوموں کو ایک دوسرے کے قریب لایا جائے اور پھر یہ سب اپنے ملک سے بھی قریب تر رہیں ۔

۱۳۹- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ۔ ڈار مطبوعہ ۱۹۶۷ء ص ۶۹ ۔

باہمی اعتماد ہونا چاہیے کیونکہ اعتماد ہی سے اعتماد پیدا ہوتا ہے ۔ کانفرنس میں خیر سگالی کی فضا پائی جاتی ہے ۔ مسلمانوں میں جرأت ہے اور انھوں نے ہمیشہ برطانیہ عظمیٰ کے متعلق اپنے محبت آمیز و وفا شعارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے ۔ مجھے توقع ہے کہ آخری فیصلہ کرتے وقت مسلمانوں کے واجبی مطالبات اور جائز تمناؤں کا تحفظ کیا جائے گا" [۱۴۰]

اس استقبالیہ میں سید امجد علی صاحب سابق وزیر خزانہ پاکستان بھی شریک تھے ۔ غالباً ان ہی سے سن کر فقیر سید وحید الدین نے اپنی کتاب روزگار فقیر جلد اول میں یہ لکھا ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اس موقع پر جو تقریر کی تھی ، اس میں ایک جملہ یہ تھا ۔

If Britain trusted India,
She would trust Britain.

" ہندوستان برطانیہ پر اسی صورت میں اعتماد کر سکتا ہے ، جب برطانیہ بھی ہندوستان پر اعتماد کرے [۱۴۱]"

کس قدر بلیغ اور کتنی مدبرانہ بات کہی تھی اقبال نے ! ہندوستان کی آزادی کے بڑے سے بڑے دعویدار و علمبردار نے بھی اس سے زیادہ کیا کہا ہے ؟ ایک مختصر سے فقرہ میں ہندوستان کے مطالبۂ آزادی کا عطر کھینچ کر رکھ دیا اور پھر اس انداز سے کہ "برطانوی آبگینوں" کو ٹھیس نہ لگنے پائے ! یہ ہے بات کرنے کا وہ سلیقہ ، جو اقبال جیسے سیاستدان شاعر ہی کو عطا کیا گیا تھا !

اس استقبالیہ کے علاوہ نیشنل لیگ کی طرف سے ۱۵ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ع کو کمیٹی روم نمبر ۱ میں ایک جلسہ منعقد ہوا ۔ اس میں بیرونی

۱۴۰- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار مطبوعہ ۱۹۶۷ع ص ۶۹ و ۷۰ ۔

۱۴۱- روزگار فقیر جلد اول از سید فقیر وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم سنہ ۱۹۶۵ع ص ۱۴۲ ۔

ممالک کے سفراً اور برطانوی پارلیان کے دونوں ایوانوں کے اراکین اور مسلم وفد کے ارکان بھی موجود تھے ۔ اس جلسہ میں علامہ اقبال نے سیاسی نقطہ نظر سے بڑی معرکتہ لاراً تقریر کی ۔ یہ تقریر درج ذیل ہے ۔

" مسلمانانِ ہند کے مطالبات کے پیچھے جو اصول کارفرما ہے ، وہ بہت ہی سیدھا سادھا ہے اور برطانوی عوام اس سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے ۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی آبادی سات کروڑ ہے ۔ اس آبادی کا نصف حصہ پورے ملک میں پھیلا ہوا ہے ، تاہم اس کا بڑا حصہ نسبتاً گتھا ہوا ہے ، خصوصاً ان صوبوں میں جو مغربی ہند کے علاقہ میں واقع ہیں ۔ بنگال میں مسلمانوں کی آبادی تقریباً ۵۷ فیصد ہے ، سندھ میں تقریباً ۷۳ فیصد اور صوبہ سرحد میں تقریباً ۹۵ فیصد ہے ۔

اب مسلمانوں کا کہنا یہ ہے کہ بحیثیت ان لوگوں کے ، جو ایک ایسی ممیز تاریخی روایت اور یگانگت کی نمائندگی کرتے ہیں جو ہندوستان کی کسی دوسری جماعت میں نہیں پائی جاتی ہیں ، وہ اپنی زندگی آپ گزارنا چاہتے ہیں اور اپنے ثقافتی خطوط پر ترقی کرنا چاہتے ہیں ۔ یہی وہ اصول ہے جو ان کے مطالبات کے پسِ پردہ کار فرما ہے ۔ یہ مطالبات کل ہند مسلم کانفرنس اور کل ہند مسلم لیگ کی قراردادوں کی شکل میں پیش کیے گئے ہیں ۔

آپ جانتے ہیں کہ ہندوستان کا فرقہ وارانہ مسئلہ آپ کے لیے بھی اور ہمارے لیے بھی بڑی تشویش و اضطراب کا باعث رہا ہے ۔ گذشتہ دس سال میں ہم نے اپنے ہم وطنوں سے مفاہمت کرنے کی بے انتہا کوشش کی ، لیکن ہم ناکام رہے ۔ نتیجتہ ملکِ معظم کی حکومت کو اس مسئلہ کا فیصلہ کرنا پڑا ۔ اگرچہ بعض نقاط (اس فیصلہ کے) ایسے ہیں ، جن پر ہمیں اعتراض ہے ، تاہم مسلمانوں کی اہم ترین جماعت نے اس کو روبہ عمل لانے اور یہ دیکھنے کا فیصلہ کر لیا ہے کہ اس سے کیا کچھ حاصل ہو سکتا ہے ۔ بعض دوسرے مطالبات ہیں جو گول میز کانفرنس میں

زیر بحث ہیں ۔ ہم نے ان مطالبات کو کانفرنس میں پیش کیا ہے اور ہم آپ کے ممنون ہیں کہ آپ نے ہمیں ان کو یہاں آپ کے سامنے رکھنے کا موقع دیا ہے ۔

ہم نے ان مطالبات کو ہزھائی نس آغا خان کی زیر قیادت کانفرنس میں پیش کر دیا ہے ۔ آغا خان وہ قابل مدبر ہیں جن کو ہم سب قدر و منزلت کی نظر سے دیکھتے ہیں اور جن سے مسلمانان ہند اس خون کی وجہ سے محبت کرتے ہیں جو ان کی رگوں میں رواں دواں ہے ۔

میں سمجھتا ہوں کہ اب آپ اس اصول سے واقف ہو گئے ہیں جو میں نے ابھی بیان کیا ہے اور جس نے معین مطالبات کی شکل اختیار کر لی ہے ۔ یہ معین مطالبات یہ ہیں ۔ اولاً جداگانہ انتخاب ثانیاً کم سے کم ان صوبوں میں جہاں ہم واقعی اکثریت میں ہیں ہم اس مطالبہ کے دعویدار ہیں یعنی یہ کہ یہ ایک قومی مطالبہ ہے کہ فوراً صوبائی خود مختاری دی جائے ۔ پھر ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ سندھ کو علیحدہ کر دیا جائے ۔ ہمارا یہ بھی مطالبہ ہے کہ صوبہ سرحد کو مساوی درجہ دیا جائے اور یہ بھی کہ بلوچستان میں اصلاحات نافذ کی جائیں ۔ ہم یہ بھی مطالبہ کرتے ہیں کہ دونوں ایوانوں یعنی ایوان زیریں و ایوان بالائی میں ۳۳ فیصد نیابت دی جائے تاکہ مرکز میں ہمارے مفادات محفوظ رہیں ۔

اب میں تفصیلات میں نہیں جاؤں گا ۔ میں صرف تین امور — مرکز میں ۳۳ فیصد ، بلوچستان میں اصلاحات کا نفاذ اور خود مختاری — سے متعلق چند باتیں عرض کروں گا ۔

ایوان زیریں اور ایوان بالائی میں ۳۳ فیصد نیابت کے متعلق مجھے کچھ کہنے کی ضرورت یوں محسوس ہوتی ہے کہ میں نے یہاں کے جو چند اخبارات دیکھے اس سے اندازہ ہوا کہ نہ معلوم کیوں اس کے متعلق کچھ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے ۔ ان اخبارات

نے یہ بات گھڑی ہے کہ جہاں تک ۳۳ فیصد والے مطالبہ کا تعلق ہے ، مسلمانانِ ہند نے اس میں ترمیم کر دی ہے ۔ اس نکتہ کے تعلق سے ، جیسا کہ کل ہند مسلم لیگ کی قراردادوں میں اس کا اظہار ہوا ہے ، مسلمانانِ ہند کے جذبات یہ ہیں کہ وہ دونوں ایوانوں میں اس کو اپنا کم سے کم تحفظ تصور کرتے ہیں ۔ یقیناً ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ اس راہ میں کچھ دشواریاں ہیں اور ہم توقع کرتے ہیں کہ ہندوستانی ریاستیں (دیسی ریاستیں) جو اب کل ہند وفاق کا ایک جز بنی ہیں اس امر پر غور کریں گی کہ ہم سے ایسی کوئی مفاہمت ممکن ہو جائے تاکہ ہم اس (تحفظ) کو جو ہم چاہتے ہیں حاصل کر سکیں ۔ ہمیں ان دشواریوں کا بخوبی اندازہ ہے لیکن اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ ہم نے اپنے مطالبات میں ترمیم کر دی ہے ۔ مسلمانانِ ہند کی قرارداد میں اس مطالبہ کا جس طرح اظہار ہوا ہے ، وہ یہ ہے کہ ہم شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے مفادات دونوں ایوانوں میں ۳۳ فیصد نیابت کی صورت میں ہی محفوظ ہو سکتے ہیں ۔

جہاں تک بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ کا تعلق ہے ، میں ایک تجویز اس سلسلہ میں پیش کرنا چاہتا ہوں ۔ وہ تجویز یہ ہے برطانوی بلوچستان ، قلات اور لس بیلہ کی ریاستوں کو باہم ملا دیا جائے یا ان کو ایک قسم کے بلوچستان فیڈریشن میں تبدیل کر دیا جائے اور اس حیثیت سے وہ ہندوستانی وفاق میں مل سکتے ہیں ۔

جہاں تک صوبائی خود مختاری کا تعلق ہے ، مجھے کہنا چاہئے ـــــ اور میں یہ کہہ دینا اپنا فریضہ سمجھتا ہوں کہ ہم اس نکتہ پر بے انتہا زور دیتے ہیں ۔ میں شخصی طور پر یقین کرتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ ہر ایک ہندوستانی مسلمان اس نکتہ پر مجھ سے اتفاق کرے گا کہ یہ (نکتہ) ان مطالبات کی ''روح'' ہے ، جو ہم نے برطانیہ اور خود ہمارے اپنے ملک کے لوگوں کے سامنے

پیش کیے ہیں - ہمارے ہم وطنوں نے اس سے اتفاق نہیں کیا -
گذشتہ روز کانفرنس میں ایک مفاہمتی تجویز پیش کی گئی
لیکن جہاں تک میں جانتا ہوں مسلمانانِ ہند اس نکتہ پر شد
جمے ہوئے ہیں اور ہمارے مدبرین اور اس سب کمیٹی کے ا
جو اس پر بحث کرنے کے لیے بنائی گئی ہے — ، اس نکتہ پر
سخت موقف اختیار کیے ہوئے ہیں اور اس مفاہمتی تجویز سے
نے اتفاق نہیں ہے -

مجھے برطانوی عوام کے نمائندوں سے یہ کہہ دینا چاہ
ہم اس نکتہ پر نہایت شد و مد سے اصرار کرتے ہیں اور مس
نے جو مطالبات پیش کیے ہیں ان کی روح یہی اور صرف
نکتہ ہے -

یہ ان اہم مطالبات میں سے چند ہیں ، جن کو میں نے
میز کانفرنس میں پیش کیا ہے - ان مطالبات کی وجہ سے
ہم وطن کہتے ہیں کہ ہم "پان اسلامی" ہیں ، محبِ وط
ہیں اور وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم فرقہ پرست (munalist
ہیں - اب میں فرقہ پرستی اور پان اسلامزم کے متعلق چند
آپ کے سامنے کہنا چاہتا ہوں - اگر کوئی آدمی کسی
جماعت سے تعلق رکھتا ہے تو وہ یہ محسوس کرتا ہے کہ
یہ فرض ہے کہ وہ اس تہذیب کی حفاظت کرے - ایسی
میں ، میں آپ سے پوچھتا ہوں کہ آیا آپ ایسے آدمی ک
محبِ وطن قرار دیں گے ؟ میرا خیال ہے کہ ہر ایک برطا
یہ فریضہ ہے کہ وہ اپنے ملک کو خطرے میں گھرا ہوا
تو اس کی حفاظت کرے - اسی طرح ہر ایک مسلمان کا یہ فر
کہ وہ اپنی تہذیب و مذہب کی حفاظت کرے ، جب وہ یہ
کہ ان چیزوں کو پا مال کیا جا رہا ہے ، جو اس کا حق
بہر حال یہ انسان کا عقیدہ و مذہب ، اس کی تہذیب و ثقاف
روایات ہی ہیں ، جن کے لیے اس کو جینا اور جن کی خا
کو مرنا چاہیے -

چار یا پانچ سال قبل ، بحیثیت صدر کل ہند مسلم لیگ میں نے ممکنہ حل کے طور پر ایک وسیع مغربی ہندی مسلم سلطنت کی تجویز پیش کی تھی ۔ اگرچہ میری اس تجویز کو مسلمانان ہند کے مطالبات میں شامل نہیں کیا گیا ہے ، تاہم میرا ذاتی خیال اب بھی یہ ہے کہ یہی ایک ممکنہ حل ہے ۔ میں انتظار کروں گا اس وقت کا ، جب کہ تجربہ اس تجویز کی دانشمندی یا غیر دانشمندی کو خود ہی ظاہر کر دے گا ۔ اسلام نسل ، ذات پات یا جنس کے اختلافات کو نہیں مانتا ـــــ وہ زمان و مکان سے ماوریٰ ہے اور ان ہی معنوں میں ان تمام انسانوں کو ایک دوسرے کا بھائی تسلیم کرتا ہے ۔

ہندوستان میں ہم ۸ کروڑ ہیں اور ہم اپنی تہذیب و ثقافت اور اور اپنی تاریخی روایت کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں ۔

لہذا میں ادباً یہ عرض کرتا ہوں کہ مسلمانان ہند کے جو مطالبات آپ کے سامنے پیش کیے گئے ہیں وہ قابل غور و فکر ہیں کیونکہ ایک طاقتور ہندوستان ، ہمیشہ کے لیے اس سوال کو جو اس زمانہ کی سیاسیات میں سب سے زیادہ نمایاں ہے ، حل کر دے گا ۔ یعنی مشرق و مغرب کے باہمی تعاون کا سوال ! ہندوستان مشرق و مغرب کے درمیان واقع ہے اور اگر انگلستان کے تعاون سے مسلمانوں کو ایک موقع دیا جائے تو وہ ایشیا اور انگلستان کے لوگوں کی خدمت بجا لا سکتے ہیں[۱۴۲]"۔

ڈاکٹر اقبال کی اس تقریر کے متعلق یہ نہ سمجھا جائے کہ انھوں نے مسلمانوں کے مذکورہ بالا تین مطالبات کو اہم سمجھا ، اس لیے ان کا ذکر کیا اور باقی کو غیر اہم سمجھ کر نظر انداز کر دیا ۔ واقعہ یہ ہے کہ بقایا دیگر مطالبات مثلاً جداگانہ انتخاب ، نشستوں کا تعین وغیرہ تقریباً

۱۴۲۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۷۰ تا ۷۶ ۔

تسلیم کیے جا چکے تھے اور وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلہ میں جداگ
طریقہ انتخاب اور نشستوں کے تعین کا اعلان کر دیا گیا تھا ۔ اس لیے ا
پر زور دینے کی ضرورت نہ تھی ۔ باقی رہے عقیدہ ، زبان ، تعلیم ، شخص
آزادی ، آزادیٔ اجتماع ، آزادیٔ تحریر و تقریر تو یہ ایسے مطالبات تھے
جن پر کوئی اختلاف نہ تھا ۔ ہندو سیاستین اور برطانوی مدبرین ، سبھ
ان کے قائل تھے اور ہر جمہوری دستور کے یہ لازمی اجزا ہوتے ہیں ۔ ا
لیے اس اجتماع میں ان کی اہمیت جتانے کی چنداں ضرورت نہ تھی ۔ سندھ
بمبئی سے علیحدگی کا اعلان ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، وزیر ہند ۔
تیسری گول میز کانفرنس کے انعقاد سے پہلے ہی کر دیا تھا ۔ صوبہ سرح
میں اصلاحات کے نفاذ سے متعلق بھی کوئی اختلاف باقی نہ رہا تھا
گاندھی جی اور کانگریس دوسری گول میز کانفرنس میں اس کی حمایت ک
چکے تھے اور برطانوی مدبرین کو بھی اس پر کوئی اعتراض نہ تھا ۔ اس
طرح اب یہ تین مطالبات ـــــ (۱) مرکز میں ۳۳ فیصد نیابت (۲) بلوچستا
میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ (۳) صوبائی خود مختاری ـــــ باقی رہ جاتے تھ
ان میں سے بھی پہلے مطالبہ یعنی مرکز میں ۳۳ فیصد نیابت کے مطالبہ ک
جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے حکومتِ برطانیہ نے اس کانفرنس کے افتتا
سے قبل تسلیم کر لیا تھا ۔ یوں اس پر بھی زور دینے کی چنداں ضرورت
نہ تھی ، لیکن برطانوی پریس میں اس مطالبہ کے متعلق یہ غلط فہم
پھیلائی گئی تھی کہ مسلمانوں نے اپنے اس مطالبہ میں تبدیلی کر دی ہے
اس لیے اس غلط فہمی کو رفع کرنے کی خاطر ڈاکٹر اقبال کو اس مطال
کا بطور خاص ذکر کرنا پڑا ۔ اس طرح اصل میں انھوں نے صرف د
مطالبوں ـــــ (۱) بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ (۲) صوبائ
خود مختاری ـــــ پر زور دیا اور اس کی اہمیت واضح کی ۔ بلوچستان می
سیاسی اصلاحات کے نفاذ کے بارے میں حکومت برطانیہ ہچکچا رہی تھی
اس ہچکچاہٹ کی بڑی وجہ وہاں کے جغرافیائی و سماجی حالات تھے ۔ ؛
ایک بڑا وسیع و عریض علاقہ تھا ، پہاڑوں ، دروں اور چٹیل میدانوں ک
وجہ سے عبور کی دقتیں تھیں ۔ پھر اس کی سرحدیں ایران اور بحیرۂ عرب
سے ملتی تھیں ۔ اس طرح دفاعی نقطۂ نظر سے یہ علاقہ انگریزی دور حکومت

میں نزاکت اور اہمیت کا حامل تھا ۔ پھر یہاں قبائلی نظام رائج تھا ۔ ا
قبائل کے آپس میں لڑائی جھگڑے بھی ہوا کرتے تھے اور یہ قبائل حریت
پسند بھی تھے ۔ اس لیے برطانوی حکومت نے بڑی ہوشیاری اور چالاکی سے
انھیں اپنے قابو میں کر رکھا تھا ۔ سیاسی نقطۂ نظر سے بلوچستان دو
حصوں میں تقسیم تھا ۔ ایک برطانوی بلوچستان (British Baluchistan)
اور دوسرا دیسی یا ریاستی بلوچستان ۔ برطانوی بلوچستان بتوسط ایجنٹ
جنرل ، وائسرائے کے ماتحت تھا ۔ گویا یہ علاقہ مرکز کی راست نگرانی
میں تھا ۔ دیسی بلوچستان میں مختلف چھوٹی بڑی ریاستیں مثلاً قلات ، لسبیلہ
خاران و مکران وغیرہ تھیں ۔ ان ریاستوں پر اندرونی معاملات کی حد تک
نوابوں کی حکمرانی تھی ۔ مگر یہ ریاستیں آزاد نہ تھیں ۔ یہ بھی وائسرائے
کے ماتحت تھیں ، پھر یہ پورا علاقہ تعلیمی و معاشی لحاظ سے نہایت
پس ماندہ تھا ۔ ان حالات کے باعث برطانوی حکومت کو یہاں سیاسی
اصلاحات کے نفاذ میں بڑا تذبذب تھا ۔ اسی تذبذب کو رفع کرنے کی
غرض سے علامہ اقبال نے اپنی تقریر میں بلوچستان کا ذکر کیا اور پھر یہ
تجویز بھی پیش کی کہ برطانوی بلوچستان اور ریاستوں کو باہم ملا کر
ایک ہی انتظامی اکائی بنا دیا جائے یا پھر ان کا ایک ذیلی وفاق
(Sub-federation) تشکیل دیا جائے ، تاکہ پورے بلوچستان کے اندر
سیاسی اصلاحات کے نفاذ میں آسانی پیدا ہو جائے ۔ الغرض بلوچستان کے
معاملہ کو یہاں انھوں نے اس غرض سے پیش کیا تھا کہ برطانوی مدبرین
کے تذبذب کو رفع کر کے انھیں اس صوبہ میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ
کے لیے آمادہ کیا جائے ۔ تاکہ سیاسی لحاظ سے یہ صوبہ بھی دوسرے مسلم
صوبوں کی سطح پر آ جائے ۔ اس نقطۂ نظر سے بلوچستان کے مسئلہ کا ذکر
بھی اقبال کی اس تقریر میں کسی خصوصی نوعیت کا حامل نہیں ہے ۔ جو بات
ان کی اس تقریر میں قابل غور ہے ، وہ صوبائی خود مختاری کے متعلق ان
کا اظہار خیال ہے ۔ انھوں نے بڑے پر زور طریقہ پر اس مطالبہ کو پیش
کیا ہے اور مسلمانوں کے تمام مطالبات میں سے صرف اسی ایک مطالبہ کو
دیگر تمام مطالبات کی ''روح'' قرار دیا ہے ! اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا ہے
کہ اس مطالبہ کے منوانے پر مسلم عوام ، مسلم قائدین ، مسلم مدبرین ،

غرضیکہ پوری کی پوری ملت اسلامیۂ ہند ڈٹی ہوئی ہے!! دوسرے لفظوں میں یہ کہنا چاہیے کہ صوبائی خود مختاری پر اصرار ہی ان کی اس تقریر کا حاصل ہے ۔

صوبائی خود مختاری پر اس قدر شدت کے ساتھ زور دینے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے "فرقہ پرستی" (Communalism) اور پان اسلام ازم (Pan Islamism) پر اظہار خیال کیا ہے کیونکہ برطانوی مدبرین کی نظر میں یہ دونوں باتیں قابل اعتراض تھیں ۔ انگریز وطنی قومیت کے قائل ہی نہیں پرستار تھے ۔ ان کی نظر میں قومیت کا انحصار ملک اور وطن پر ہے وہ "ایک ملک ، ایک قوم" کے قائل ہیں ۔ ہندوستان خود چونکہ ان کی نظر میں ایک ہی ملک تھا ، اس لیے اس میں بسنے والے سب لوگ "ہندوستانی قوم" سے تعلق رکھتے تھے ۔ یہ ہندوستانی قومیت (Indian Nationalism) ان کے نزدیک قابل مذمت نہیں ، قابل تعریف و تحسین تھی اور اس قومیت سے ہٹ کر جو آواز بھی بلند ہوتی ، اصولی اعتبار سے وہ ان کی نظروں سے گری ہوئی تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریسی اور گاندھی جی کی ہندوستانی قومیت تو ان کی سمجھ میں آ جاتی تھی اور وہ دل ہی دل میں اس کی ستایش بھی کرتے تھے مگر مسلم لیگ و مسلم کانفرنس اور اقبال کی مسلم قومیت کے تصور کو اولاً تو وہ کچھ سمجھ نہیں پاتے تھے اور کچھ سمجھ بھی لیتے تھے تو یہ ایک ایسا تلخ گھونٹ تھا جو کسی طرح ان کے حلق سے نیچے اترتا ہی نہ تھا ۔ اسی لیے اقبال نے نہایت نرم و شیریں الفاظ میں مسلم قومیت کا مفہوم ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی اور مثال بھی دی تو ان ہی کے وطن کی ۔ اس سلسلہ میں ان کا یہ فقیرہ کہ

> "انسان کا عقیدہ و مذہب ، اس کی تہذیب و ثقافت اور روایات ہی ہیں ، جن کے لیے اس کو جینا اور جن کی خاطر اس کو مرنا چاہیے"

ان کی سیاسی فکر کا عطر ہے ۔ پھر اس ضمن میں انھوں نے اپنی اس تجویز کا ذکر کیا ، جو انھوں نے کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد دسمبر ۱۹۳۰ع میں پیش کی تھی یعنی برصغیر ہند میں ایک متحدہ مسلم

سلطنت کی تشکیل - اس پر انھوں نے زور نہیں دیا اور نہ اس کو مطالبہ کی شکل میں پیش کیا ، بلکہ اس کو ایک " ممکنہ حل " بتایا - پھر بھی ایک ایسے سیاسی مدبر کی طرح جس کو اپنے حل پر پورا اطمینان ہے اور جو مستقبل کو برافگندہ نقاب دیکھ لیتا ہے - انھوں نے اعتماد اور تیقن کے ساتھ کہا کہ

" میں انتظار کروں گا اس وقت کا ، جب کہ تجربہ ، اس تجویز کی دانشمندی یا غیر دانشمندی کو خود ہی ظاہر کر دے گا "

اس کے بعد انھوں نے پان اسلامزم کے تعلق سے بہت ہی واضح لیکن جامع الفاظ میں بتایا کہ اسلام ذات پات ، نسل و رنگ کے امتیازات کا قلع قمع کرتا ہے اور وہ اخوتِ باہمی اور وحدتِ انسانی کا قائل ہے - اپنی تقریر کے اختتام پر انھوں نے ایک عالمی سیاسی مسئلہ کی طرف برطانوی مدبرین کی توجہ مبذول کروائی ، جو یورپ کی نشاۃِ ثانیہ اور برطانوی سامراج کے ابھرنے کے بعد سے یورپی مفکرین کے غور و فکر کا محور بنا ہوا تھا ـــــ یعنی مشرق و مغرب کے باہمی تعاون کا مسئلہ ! یہ مسئلہ وہی تھا ، جس کے بارے میں ایک مشہور یورپی مفکر نے کہا تھا کہ مشرق ، مشرق ہے اور مغرب ، مغرب ، دونوں باہم مل نہیں سکتے ! اقبال نے بتایا کہ یہ خیال غلط ہے ، مشرق و مغرب کی اس خلیج کو اگر پاٹا نہیں جا سکتا ہے تو اس پر ایک مضبوط و مستحکم پل بنایا جا سکتا ہے ـــــ اور ہندوستانی مسلمان اپنے جغرافیائی محل وقوع اور تاریخی عوامل و روایات کی بناء پر یہ "پل" بن سکتے ہیں - صرف شرط یہ ہے کہ برطانوی حکومت انھیں اکثریت کے جبرو ظلم (Tyranny of the Majority) کے حوالہ نہ کرے بلکہ انھیں اپنے بل پر اور اپنے قد و قامت کے لحاظ سے ابھرنے کا موقع دے !

یہ تھے اقبال کی اس تقریر کے چند سنجیدہ پہلو - واضح رہے کہ علامہ نے یہ تقریر ایک ایسے جلسہ خاص میں کی تھی ، جہاں بیرونی سفرا برطانوی مدبرین و اراکینِ پارلیمنٹ اور مسلم وفد کے اراکین موجود تھے ہندوؤں کا کوئی نمائندہ نہ تھا - اس جلسہ میں ان کا تخاطب تمام تر برطانوی

مدبرین و انگریزی اراکینِ پارلیمنٹ و گول میز کانفرنس سے تھا - اسی لیے یہ تقریر ، جہاں الفاظ کے لحاظ سے مختصر اور جامع ہے ، وہاں معنی کے لحاظ سے نہایت بلیغ و فصیح ہے اور اس میں انگریزوں کی نفسیات کا پورا پورا لحاظ رکھا گیا ہے - یہ تقریر تدبر و فراست اور مسلمانوں کے مقدمہ کی کامیاب وکالت کا ایک عمدہ نمونہ ہے !

ڈاکٹر اقبال نے نہ صرف نیشنل لیگ کے ان جلسوں میں تقریریں کیں بلکہ برطانیہ کے بعض ارباب حل و عقد سے ملاقاتیں بھی کیں اور اپنی نجی گفتگو میں انھیں اپنی تجویز ، برصغیر میں اسلامی سلطنت کی تشکیل کی طرف بھی متوجہ کیا ، اس کی معقولیت کا انہیں قائل کیا اور اس کے قابلِ عمل ہونے کے بارے میں انہیں اطمینان دلایا اور اپنی ان کوششوں میں وہ بڑی حد تک کامیاب بھی رہے ، جس کا اظہار وہ اپنے ایک خط میں اس طرح کرتے ہیں

”مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے روانگی سے قبل لارڈ لوتھیاں نے نے مجھ سے کہا تھا کہ تمہاری اسکیم ہی ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل ہے ، لیکن اس بار کے آور ہونے کے لیے ابھی پچیس سال درکار ہوں گے[۱۴۳]“

آئیے علامہ اقبال کی تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت اور کانفرنس کے اندر اور باہر ان کی سرگرمیوں پر ایک نظر ڈال لیں - یہ کانفرنس خصوصی طور پر ہندوستان کے وفاقی ڈھانچہ اور اس سے متعلقہ امور کو طے کرنے کے لیے بلائی گئی تھی اور علامہ کو اس موضوع اور اس کے متعلقہ مباحث سے کوئی دلچسپی نہ تھی ، اس لیے وہ ان میں کیا حصہ لیتے اور ان میں کون سی تجاویز پیش کرتے - وہ تو سرے سے ہندوستانی وفاق کے تصور ہی کے خلاف تھے ، خصوصاً ہندوستانی ریاستوں کی وفاق میں شرکت پر اظہار رضامندی کے بعد تو وہ اس کے سخت خلاف ہو گئے تھے - اس سلسلہ میں علامہ کے خیالات کی توضیح و تشریح آئندہ صفحات میں مناسب

۱۴۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ع ص ۲۱

مقام پر کی جائے گی ۔ بہرحال یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال دل سے ایک کل ہند وفاق کے قائل نہ تھے ۔ اسی لیے انھوں نے اس کانفرنس کے مباحث میں حصہ نہیں لیا اور جب اس کانفرنس کے کھلے اجلاس میں انہیں بولنے کا موقع ملا تو وفاق کے خلاف تقریر کی ، صوبوں کو آزاد و خود مختار مستعمرات (Autonomous, independent Dominions) بنا دینے کی وکالت کی اور ''لامرکز'' (No Center) کی تجویز پیش کی ! غور سے دیکھئے تو یہ دونوں تجاویز پیش خیمہ تھیں ، برصغیر میں مسلم سلطنت کی تشکیل کا ! ایک ایسی کانفرنس میں جہاں مرکزیت اور وفاقی حکومت کی تشکیل کے متعلق گفتگو ہو رہی تھی ، اقبال نے بڑی فراست و ذہانت سے مسلم سلطنت کا نام لیے بغیر لا مرکزیت اور صوبائی آزادی و خود مختاری کی تجویز پیش کی ۔ اس کی طرف اگر معمولی سی پیش قدمی ہی کی جاتی تو اس کا لازمی نتیجہ برصغیر میں مسلم سلطنت کے قیام کی شکل میں رونما ہوتا ! اس طرح کانفرنس کے مخالف ماحول میں بھی انھوں نے در پردہ مسلم سلطنت کے قیام کی تجویز پیش کرنے کی کوشش کی تھی ! !

کانفرنس سے باہر نیشنل لیگ کے جلسہ میں ان کی تقریر ، اسی کوشش کا ایک دوسرا ، لیکن زیادہ واضح روپ تھا ۔ انھوں نے یہاں بھی صوبائی خود مختاری کو مسلم مطالبات کی '' جان '' بتایا ۔ اور صاف الفاظ میں اپنی تجویز یعنی برصغیر میں مسلم سلطنت کے قیام کو ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کا '' حل '' قرار دیا ، پھر نجی ملاقاتوں میں اسی حل پر زور دیا اور برطانیہ کے اصحاب فکر و نظر کو قائل کیا ! تیسری گول میز کانفرنس میں ان کی سیاسی سرگرمیوں کا بس یہی خلاصہ ہے ۔

تیسری گول میز کانفرنس سے واپسی ۲۵ فروری سنہ ۱۹۳۳ع کو علامہ اقبال تیسری گول میز کانفرنس سے وطن واپس لوٹے ۔ لاہور اسٹیشن پر ان کی خدمت میں جمیعتہ الاسلام لاہور کی طرف سے ایک سپاس نامہ پیش کیا گیا ۔ اس کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے کانفرنس میں اپنی مساعی کا مختصر الفاظ میں اس طرح ذکر کیا ۔

'' اول سے لے کر اب تک میری زندگی کا مطمح نظر یہی رہا ہے

کہ مسلمان اپنی موجودہ پستی کی حالت سے نکل کر بلندی پر پہنچ جائیں اور ان میں جو کمزوریاں اور اختلافات رونما ہو گئے ہیں ، وہ دور ہو جائیں - جہاں تک مجھ سے ہو سکا ، میں نے گول میز کانفرنس میں اسلامی حقوق کے تحفظ کی پوری پوری کوشش کی ہے اور کوئی ایسا لفظ نہیں کہا ، جس سے مسلمانوں کے حقوق کو نقصان پہنچنے کا احتمال ہو[۱۴۴] "

پھر بتاریخ ۲۶ فروری سنہ ۱۹۳۳ع انھوں نے ایک بیان جاری کیا ، جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گول میز کانفرنس کے مباحث سے وہ اس نتیجہ پر پہنچ چکے تھے کہ ہندوستان کا جدید دستور چاہے کوئی شکل اختیار کرے ، اس میں اقلیتوں ، بالخصوص مسلمانوں کے علیحدہ مؤقف کا تحفظ کر دیا جائے گا - انھوں نے کہا -

" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ، ان کا فرض ہے کہ وہ آنے والے انتخابات کے لیے اپنے آپ کو منظم کریں اور ایسے تمام اسباب کا سد باب کریں ، جن سے ان کے اندر فرقہ وارانہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں - مجوزہ دستور واضح طور پر اقلیتوں کے تحفظ کے اصول کو تسلیم کرتا ہے[۱۴۵] "

اقبال اور قرطاس ابیض ہم بتا چکے ہیں کہ تیسری گول میز کانفرنس کے ختم ہونے کے دو ماہ بعد یعنی مارچ سنہ ۱۹۳۳ع میں ملکِ معظم کی حکومت نے جدید دستور کا خاکہ ، قرطاس ابیض (White Paper) کے نام سے شائع کر دیا - اس خاکہ پر تقریباً تمام سیاست دانوں نے کڑی نکتہ چینی کی - ڈاکٹر اقبال نے ۳۰ مارچ سنہ ۱۹۳۳ع کو اس خاکہ سے متعلق ایک بیان جاری کیا ، جس میں آپ نے اس پر حسب ذیل اعتراضات کیے :-

---

۱۴۴- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۷ فروری سنہ ۱۹۳۳ع -

۱۴۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور مطبوعہ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۸۸ -

(۱) وفاقی مقننہ کے ایوان زیریں کی ۳۷۵ نشستوں میں سے مسلمانوں کو صرف ۸۲ نشستیں دی گئی ہیں ، گویا ۲۱۰۸ فیصد نشستیں مسلمانوں کو مل رہی ہیں ۔ اس کے برعکس ہندوستانی ریاستوں کو ۳۳۰۳۰ فیصد نشستیں عطا کی گئی ہیں حالانکہ ان کو اصولاً صرف ۲۱۰۸ فیصد نشستیں ملنی چاہئے تھیں ۔ گویا ۸ فیصد کا پاسنگ (Weightage) ریاستوں کو عطا کیا گیا ہے ، انصاف کا تقاضا تو یہ تھا کہ پاسنگ مسلمانوں کو دیا جاتا ۔ مسلمان ایک اہم اقلیت ہیں اور ان کے مفادات اقلیت میں ہونے کے باعث خطرے میں پڑے ہوئے ہیں ۔ اس لیے پاسنگ کے وہ زیادہ مستحق تھے ۔ ریاستیں نہ تو اقلیتیں ہیں اور نہ ان کے مفادات کو کوئی خطرہ لاحق ہے ۔ لیکن قرطاسِ ابیض نے مسلمانوں کی حق تلفی کرکے ریاستوں کو پاسنگ عطا کیا ہے ۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ مسلم اقلیت کو نقصان پہنچا کر مرکزی مقننہ کو نامزد اراکین سے پر کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔

(۲) وفاقی مقننہ میں ۹ نشستیں خواتین کو دی گئی ہیں ۔ خواتین کے ان حلقۂ ہائے انتخابات میں رائے دہندوں کی بڑی اکثریت غیر مسلم رہے گی ۔ اسی لیے کسی مسلم خاتون کا انتخاب عملاً ناممکن ہے ، جس طرح مردوں کے حلقہ ہائے انتخاب میں مسلمانوں کو جداگانہ حق انتخاب دیا گیا ، اسی طرح خواتین کو بھی جداگانہ حق انتخاب دینا چاہئے تھا ، کیونکہ مسلم خواتین بہرحال مسلم جماعت کا جز لاینفک ہیں ،

(۳) وفاق کے ایوانِ بالائی کا انتخاب ذریعہ واحد قابل انتقال رائے دہی (Single transferable vote) صوبہ جاتی مقننہ کے اراکین کریں گے ۔ اس کی وجہ سے مشترکہ انتخاب کا اصول رائج ہو جاتا ہے اور اس طرح مسلمانوں کو وفاق کے ایوان بالا میں اتنی نشستیں بھی نہ مل سکیں گی ، جو ان کا جائز حق ہیں ،

(۴) صوبوں میں وزرأ مقننہ سے زیادہ گورنروں کے سامنے جواب دہ ہیں ۔ گورنروں کے اختیارات بھی زیادہ رکھے گئے ہیں ۔

(۵) مسلمانوں کے شخصی قانون کے لیے مناسب تحفظات نہیں رکھے گئے ہیں ،

(۶) بلوچستان کے لیے جو اسکیم تجویز کی گئی ہے ، اس سے نہ تو بلوچی مطمئن ہوں گے اور نہ عام مسلمان[۱۳۶] ۔

پنجاب کا فرقہ وارانہ فارمولا ہندوستان کا آئندہ دستور ابھی صورت گری کے مراحل طے کر رہا تھا اور فرقہ وارانہ فیصلے میں وزیر اعظم کے اعلان کے بموجب باہمی مفاہمت سے تبدیلی کی جا سکتی تھی ۔ اس لیے فرقہ وارانہ مفاہمت کی کوششیں ابھی جاری تھیں ۔ اگرچہ مولانا شوکت علی کی سعئی مفاہمت کی ناکامی کے بعد کل ہند پیمانہ پر کوئی ایسی کوشش نہیں کی گئی ، تاہم چھوٹے پیمانہ پر مختلف حلقوں میں یہ کوششیں جاری تھیں ۔ ان ہی کوششوں کی ایک کڑی پنجاب کا فرقہ وارانہ فارمولا تھا ، جس پر مئی سنہ ۱۹۳۳ع میں سر فضل حسین ، راجہ نریندر ناتھ (ہندو) اور سر جوگیندر سنگھ (سکھ) نے اتفاق کیا تھا ۔ فارمولا یہ تھا ۔

(۱) تینوں فرقوں (ہندو مسلم اور سکھ) کے شرائط حق رائے دہی میں ایسی ترمیمات کی جائیں جن سے تینوں فرقوں کی آبادی کی پوری پوری نمائندگی رجسٹر رائے دہندگان میں ہو ،

(۲) طریقۂ انتخاب مشترکہ ہو اور پورے صوبہ کو ایک رکنی حلقہ ہائے انتخاب میں تقسیم کیا جائے اور یہ تقسیم علاقہ واری اور آبادی کی بنیاد پر ہو ۔

(۳) ہر فرقہ کو ایسے حلقہ ہائے انتخاب دئے جائیں جہاں اس کے رائے دہندوں کا فیصد سب سے زیادہ ہو ،

۱۳۶۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ لاہور طبع دوم سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۹۱ و ۱۹۲ ۔

(۴) نشستوں کا تعین ، صرف عام حلقہ ہائے انتخاب تک محدود ہو ، جیسا کہ فرقہ وارانہ فیصلہ میں اعلان کیا گیا ہے ، نہ کہ خاص حلقہ ہائے انتخاب میں ، جہاں مشترکہ انتخاب کا طریقہ مقرر کیا گیا ہے ،

(۵) نشستوں کا تعین کسی خاص مدت تک کے لیے نہیں ہوگا[۱۴۷] ۔

فضل حسین کے سوانح نگار عظیم حسین کا بیان ہے کہ یہ فارمولا فضل حسین کا تجویز کردہ تھا ، راجہ نریندر ناتھ اور سر جوگیندر سنگھ نے اس سے اتفاق کیا تھا[۱۴۸] ، لیکن یہ دونوں لیڈر اپنے ہم مذہبوں سے اس فارمولے کو منوانے میں ناکام ہو گئے ۔ سکھوں کے ممتاز لیڈروں نے اس پر اعتراضات کیے[۱۴۸] ۔ ماسٹر تارا سنگھ نے اس کی سخت مخالفت کی[۱۴۹] ۔ اور خالصہ دربار نے تو جوگیندر سنگھ کو سکھ سبھاوں سے خارج کر دینے کی دھمکی دے دی ! اس طرح ہندوؤں نے بھی اس فارمولے کی سخت مخالفت کی ۔ ہندو پریس نے اس پر شدید نکتہ چینی کی اور ہندوؤں کے مشہور لیڈر بھائی پرمانند نے ہندو مہاسبھا کی جانب سے اس فارمولے کے خلاف تحریک چلانے اور ہنگامہ آرائی کرنے کی دھمکی دے دی[۱۵۰] ۔

عظیم حسین کا بیان ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اپنے چند رفقاء کے ساتھ اس فارمولے کے خلاف آواز بلند کی ۔ انھوں نے پنجاب صوبائی مسلم لیگ اور پنجاب صوبائی مسلم کانفرنس کا ایک مشترکہ جلسہ طلب کیا ، جس میں اس فارمولے کی مذمت کی گئی[۱۵۱] ، اور یہ خبر بھی اڑی کہ ڈاکٹر اقبال

۱۴۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۸۰ ۔
۱۴۸- ایضاً ایضاً ص ۲۸۰ ۔
۱۴۹- اسپیچسس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۳ ۔
۱۵۰- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از ڈاکٹر عظیم حسین ص ۲۸۱ ۔
۱۵۱- ایضاً ایضاً مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۸۲ ۔

کو پچھتر ہزار روپیہ بطور عطیہ کہیں سے مل رہا ہے ، جس سے وہ اخبار " ایسٹرن ٹائم " خرید لیں گے اور مشترکہ انتخاب کے اس فارمولے کے خلاف مہم چلائیں گے ۔ ان حالات کو دیکھتے ہوئے اخبار انقلاب نے ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۳ء کی اشاعت میں لکھا کہ اگرچہ مسلمان فضل حسین کے احسانات کے بوجھ تلے دبے ہوئے ہیں ، تاہم وہ اس فارمولے کو ان کے منہ پر پھینک ماریں گے اور فضل حسین کو مسلم لیگ یا مسلم کانفرنس یا کسی دوسری تنظیم کی قیادت نہیں کرنے دیں گے[۱۵۲] ۔ علامہ اقبال نے اس فارمولے کی مخالفت میں اسی پر بس نہیں کیا ، بلکہ انھوں نے لندن میں سر آغا خان اور مسلم وفد کے دیگر اراکین کے نام تار روانہ کیے[۱۵۲] ، جن میں اس کی مخالفت کی گئی تھی ۔ غالباً اسی کا یہ اثر ہوا کہ سر آغا خان نے فضل حسین کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۳۳ء میں اس فارمولے پر شدید تنقید کی اور اس کی مخالفت کی[۱۵۳] ۔

عظیم حسین لکھتے ہیں کہ فضل حسین نے اپنے خط مورخہ ۱۵ جون سنہ ۱۹۳۳ء میں آغا خان کی اس تنقید کا جواب دیا اور اس فارمولے کی تائید میں نہایت مؤثر دلائل پیش کرنے کے بعد لکھا ۔

> " آپ سوال کریں گے کہ اگر معاملہ اتنا صاف اور سیدھا ہے تو لاہور کے بعض حلقوں میں اتنی بے چینی کیوں پائی جاتی ہے اور اور اقبال لندن میں اور اخبارات کو تار کیوں بھیج رہے ہیں ؟ بات یہ ہے کہ ہندوستانی سیاست میں انگریزی کی نقل اُتاری جاتی ہے اور سیاسی جماعتیں کسی نہ کسی سازش کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتیں ۔ آنے والے انتخابات کے پیش نظر لاہور کے بعض لوگوں کے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ سیاسی اصلاحات کے تحت بڑے بڑے زمیندار یا وہ اشخاص جو اپنے پیشوں میں نمایاں حیثیت کے مالک ہیں ، یا ممتاز خاندانوں کے افراد نے فائدے اٹھائے ہیں

۱۵۲- ایضاً ایضاً ص ۲۸۵ ۔

۱۵۳- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " از عظیم حسین (انگریزی) ص ۲۸۳ و ۲۸۴ ۔

اور یہ کہ شہر کے لوگ پیچھے دھکیل دئے گئے ہیں - وہ سمجھتے ہیں کہ ظفراللہ خان جیسے گمنام آدمی کو آگے بڑھا کر ، میں نے اچھا نہیں کیا ہے - اسی لیے ان لوگوں کے احتجاج نے اس مخالفت کی شکل اختیار کی ہے - مجھے کوئی شبہ نہیں ہے کہ یہ لوگ گمراہ ہو گئے ہیں ، اور کچھ زیادہ دن نہیں گذریں گے کہ انھیں پتہ چل جائے گا کہ وہ ان مفادات کی خدمت نہیں کر رہے ہیں ، جو انھیں دل سے عزیز ہیں اور جہاں تک اقبال کا تعلق ہے ، یہ لوگ ان کے نادان دوست ہیں ، جو دانا دشمن سے بدتر ثابت ہوں گے [۱۵۴] "

عظیم حسین نے اپنے والد فضل حسین کے خط کا یہ اقتباس پیش کرکے تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ اقبال نے بعض اپنے شہری دوستوں کے ورغلانے پر اس فارمولے کی مخالفت کی تھی - عظیم حسین نے یہ بھی لکھ دیا ،

" فضل حسین نے جب دیکھا کہ بعض مسلمان اس فارمولے کو سمجھے بغیر اس کی مخالفت کر رہے ہیں تو انھوں نے ڈاکٹر اقبال کو خط لکھا [۱۵۵] "

جس میں اس فارمولے کی وضاحت کی اور اس کی تائید میں دلائل پیش کیے - نتیجہ یہ ہوا کہ ،

" ان دلائل . . . . نے ڈاکٹر اقبال اور ان کے حامیوں کو زیادہ معقولیت پسند بنا دیا اور ان میں سے اکثر ان تجاویز کی حمایت کرنے پر رضا مند ہو گئے [۱۵۶] "

غنیمت ہے کہ عظیم حسین نے یہ نہیں لکھا کہ خود اقبال قائل ہو

- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۸۵ -
- ایضاً ص ۲۸۲ -
- ایضاً ص ۲۸۳ -

گئے تھے ! تاہم مندرجہ بالا اقتباس سے انھوں نے یہی تاثر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ ڈاکٹر اقبال نے اس فارمولے کی مخالفت ترک کر دی تھی اور اس کی معقولیت پر سوچ بچار کرنے لگے تھے ۔ عظیم حسین نے اس کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی بلکہ یہ صرف اُن کا اپنا خیال یا تاثر ہے ۔ ان کے محولہ بالا بیانات سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ سب کچھ مئی و جون سنہ ۱۹۳۳ع میں پیش آیا تھا ، لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے ۱۴ جولائی سنہ ۱۹۳۳ع کو ایک اخباری بیان جاری کیا ، جس میں انھوں نے اس فارمولے کی سخت مخالفت کی ۔ انھوں نے ہندوؤں اور سکھوں کی مخالفت کا ذکر کرنے کے بعد کہا ،

" اب اس امر کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ اس فارمولے پر یا اس کے بنیادی اصول پر تفصیلی تنقید کروں ۔ البتہ اس کے متعلق میں اپنی عام رائے ظاہر کرنا چاہتا ہوں کہ یہ فارمولا پنجاب کے مسئلہ کا کوئی حل نہیں ہے ۔ اس کے برعکس مختلف فرقوں کے مابین اَن دیکھے تنازعات کے سلسلہ کا یہ ایک سر چشمہ بن جائے گا ، وزیر اعظم کے فیصلہ کے اثر کو برقرار رکھنے کی خاطر صوبے کے حلقہ ہائے انتخاب کو چاہے کتنا ہی محفوظ رکھا جائے یہ اسکیم (پنجاب فارمولا) شہری اور دیہاتی آبادیوں کے نقطۂ نظر سے نہایت قابلِ اعتراض ہے ۔ جب اس کو روبہ عمل لایا جائے گا تو اس سے وہ دیہاتی طبقے بھی واجبی نمائندگی سے محروم ہو جائیں گے ، جن کی اپنے حلقہ ہائے انتخاب میں اکثریت ہے ۔ اس کے مختلف پہلوؤں پر غور کرنے اور ان تمام ممکنہ تنازعات کا جو اس کی وجہ سے پیدا ہوں گے ، اندازہ لگانے کے بعد ، میرا یہ پختہ خیال ہے کہ یہ اسکیم ہر فرقہ کے بہترین مفادات کے لیے نقصان رساں ہے اور کسی بھی فرقہ کے نقطۂ نظر سے وزیر اعظم کے فیصلہ کے مماثل بھی نہیں ہے[۱۵۷] "

۱۵۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع ثانی ص ۲۰۳ -

آخر میں میں انھوں سے اس فارمولے کے مرتبین سے اپیل کی کہ وہ اس فارمولے سے دستبردار ہو جائیں ۔

اس بیان سے یہ بات بہت واضح طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ ڈاکٹر اقبال شروع سے آخر وقت تک فضل حسین کے مجوزہ فارمولے کے خلاف تھے۔ اس فارمولے سے متعلق اقبال کا یہ ردِ عمل ان کے سابقہ طرزِ عمل بلکہ ان کے پورے سیاسی رول کے عین مطابق ہے۔ ہم برابر یہی دیکھتے آ رہے ہیں کہ انھوں نے ہر موقع پر مشترکہ انتخاب کی مخالفت کی اور جداگانہ انتخاب کی ہر مرحلہ پر حمایت کی اور اس کو مسلمانانِ ہند کے مطالبات کی "اساس" قرار دیا ۔ ان کے نزدیک یہ محض نمائندگی کا ایک طریقۂ کار نہ تھا ، بلکہ مسلمانوں کے "جداگانہ" "قومی وجود" کو برقرار رکھنے کا واحد وسیلہ تھا !

فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق کانگریس کی روش پر اعتراضات

جون سنہ ۱۹۳۴ع میں کانگریس کی مجلس عاملہ نے فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق ایک قرارداد منظور کی ، جس میں اس فیصلہ پر تنقید کی گئی تھی ، لیکن بالآخر اس نے اپنی اس رائے کا اظہار کیا تھا ، کہ وہ اس فیصلہ کو نہ تو منظور کرتی ہے ، نہ مسترد کرتی ہے۔ علامہ اقبال کانگریس کے اس فیصلہ پر چین بہ جبین ہو گئے اور حسب ذیل بیان ۱۹ جون سنہ ۱۹۳۴ع کو اخبارات کے نام جاری کیا ۔

"کانگریس ہندوستان کے فرقوں کی مساوی نمائندگی کا اِدعا کرتی ہے اور یہ اعلان کرتی ہے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ کے متعلق ، جن شدید اختلافات کا اظہار ہندوستان میں ہو رہا ہے اُس کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے وہ اس کو (فرقہ وارانہ فیصلہ کو) نہ قبول کرتی ہے اور نہ مسترد۔ تاہم فرقہ وارانہ فیصلہ پر جو تنقید اس نے کی ہے ، اس سے عملاً فرقہ وارانہ فیصلہ کا استرداد ہی ہوتا ہے ۔ اس کو اپنے دعوے کے مطابق اس فیصلہ کے بارے میں بھی کسی قسم کی رائے زنی نہیں کرنی چاہیئے تھی ۔ مجلس عاملہ کانگریس نے عمداً اس اہم واقعہ کو نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے کہ اس فیصلہ کو

اگرچہ قرطاس ابیض میں شامل کیا گیا ہے ، تاہم اس کی حیثیت قرطاس ابیض جیسی نہیں ہے بلکہ وہ ایک بالکل جداگانہ چیز ہے - قرطاس ابیض کے دیگر اجزاء تجاویز ہیں ، لیکن فرقہ وارانہ فیصلہ برطانوی وزیر اعظم کا وہ تصفیہ ہے ، جو انھوں نے ان لوگوں کی درخواست پر کیا تھا ، جو آج اس کی مخالفت کر رہے ہیں - کانگریس کی مجلس عاملہ نے اس قرارداد کے ذریعہ اپنی اندرونی فرقہ پرستی کو چھپانے کی کوشش کی ہے ، لیکن اس کوشش میں اس نے اپنے مقاصد (designs) کو اس حد تک بے نقاب کر دیا ہے کہ کوئی مسلمان اب اس شعبدہ بازی سے متاثر نہیں ہو سکتا - اس نازک مرحلہ پر میں مسلمانانِ ہند کو مشورہ دیتا ہوں کہ وہ جرأت کے ساتھ فرقہ وارانہ فیصلہ کی حمایت کریں - اگرچہ اس میں ان کے تمام مطالبات کو تسلیم نہیں کیا گیا ہے ، تاہم بھی ایک راہِ عمل ہے جس پر وہ ایک باعمل جماعت کی حیثیت سے گامزن ہو سکتے ہیں[۱۵۸] "

یہاں ہم یہ واضح کر دیں کہ جب فرقہ وارانہ فیصلہ شائع ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اس پر سخت تنقید کی تھی ، جس کا ذکر ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے - اس کے بعد ہندو مسلم مفاہمت کی کوشش ہوئی ، لیکن اکثریتی فرقہ نے واضح تجاویز اقلیتوں کے سامنے نہیں رکھیں اور مولانا شوکت علی کی سعئ مفاہمت نا کام ہو گئی - یہاں تک کہ مسلم قوم پرست زعماء کی تجاویز لکھنؤ بھی سرد خانہ میں بند پڑی رہ گئیں اور اب کانگریس نے بھی فرقہ وارانہ فیصلہ کو ہدفِ ملامت بنایا تھا ، گو کہ اس نے اس کو بالکلیہ مسترد بھی نہیں کیا تھا - ڈاکٹر اقبال اس صورت حال سے تنگ آ چکے تھے کہ اکثریتی فرقہ ، نہ تو وسعتِ قلب کے ساتھ مسلمانوں سے مفاہمت کرتا ہے اور نہ فرقہ وارانہ فیصلہ کو قبول کرتا ہے - پھر کانگریس جیسی متحدہ قومیت کی علمبردار جماعت اس کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتی ہے - کانگریس اس گومگو یا حالتِ تذبذب کا شکار اس لیے بن

۱۵۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع دوم ص ۲۱۳ -

گئی تھی کہ ایک طرف اس پر قوم پرست مسلم زعماء کا دباؤ تھا تو دوسری طرف ہندو فرقہ پرست لیڈروں کا ، اور یہ دونوں ہی کانگریس میں شریک تھے - قوم پرست مسلم زعماء یہ چاہتے تھے کہ ہندو مسلم مفاہمت یا راضی نامہ کی عدم موجودگی میں اس ایوارڈ کو قبول کر لیا جائے - ہم بتا چکے ہیں کہ ڈاکٹر انصاری نے ، جن کا کانگریس اور خصوصاً گاندھی جی پر بڑا اثر تھا ، واٹنا سے گاندھی جی کے نام اسی مضمون کا تار دیا تھا اور یہ دھمکی دی تھی کہ اگر کانگریس نے فرقہ وارانہ فیصلہ کو مسترد کر دیا تو وہ کانگریس سے مستعفی ہو جائیں گے - اس کے برعکس فرقہ پرست ہندو لیڈر کا کہنا یہ تھا کہ اس فیصلہ کو رد کر دیا جائے - اسی لیے کانگریس نے بین بین راہ اختیار کی کہ اس فیصلہ کو نہ قبول کیا اور نہ مسترد ، لیکن اس پر شدید تنقید کی ، جس سے اس کے فرقہ پرستانہ بلکہ ہندوانہ جھکاؤ کا اظہار ہوتا تھا - ان حالات میں ڈاکٹر اقبال نے یہ سمجھتے ہوئے بھی کہ مسلمانوں کے تمام مطالبات کو فرقہ وارانہ فیصلہ میں شامل نہیں کیا گیا ہے ، مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس کو قبول کر لیں -

انڈیا بل میں ترمیم کا مطالبہ بیان کیا جا چکا ہے کہ مارچ سنہ ۱۹۳۳ء میں قرطاس ابیض (white paper) کی اشاعت کے بعد ، حکومت برطانیہ نے مشترکہ پارلیمانی کمیٹی (Joint Parliamentary Committee) مقرر کی تھی ، تاکہ وہ قرطاس ابیض کی روشنی میں ہندوستانی نمائندوں کے بیانات قلم بند کرے اور ان پر غور و خوض کرنے کے بعد ، ہندوستان کے آئندہ دستور سے متعلق تجاویز پیش کرے - عام طور پر یہ خیال کیا جا رہا تھا کہ علامہ اقبال کو بھی لندن طلب کیا جائے گا ، لیکن ایسا نہ ہوا - اس کی وجہ خود علامہ کی زبان سے سنیے - وہ مس فارقوہرسن کو اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ،

" اگر لندن آنے کا اتفاق ہوا تو آپ سے مفصل گفتگو ہو گی ، نہ آ سکا تو آپ کو لکھوں گا - میرا آنا یقینی نہیں کیونکہ جائنٹ سلیکٹ کمیٹی کے رو برو پیش ہونے والے مندوبین کی تعداد غالباً کم کر دی جائے گی اور میں خواہ مخواہ دوسروں کے پیچھے

بھاگے پھرنے کا عادی نہیں[159] ''

جائنٹ سلیکٹ کمیٹی میں ڈاکٹر اقبال کو نہ طلب کرنے کی ایک اور وجہ یہ بھی سمجھ میں آتی ہے کہ انھوں نے دوسری گول میز کانفرنس کے بعد ارباب اقتدار پر سخت تنقید کی تھی ، پھر تیسری گول میز کانفرنس میں '' لامرکز '' اور '' مکمل صوبائی خود مختاری '' کی تجاویز پیش کرکے برطانیہ کے کل ہند وفاق والے منصوبہ کی مخالفت کی تھی - ممکن ہے کہ ان دو تلخ تجربوں کے بعد برطانوی حکومت نے انھیں ناپسندیدہ قرار دے دیا ہو ! !

بہرحال ڈاکٹر صاحب مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کے سامنے پیش نہ ہو سکے - اسی کمیٹی کی پیش کردہ رپورٹ کی بناء پر ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، دستور جدید کا مسودہ ، جون سنہ ۱۹۳۵ع میں مرتب اور شائع ہوا ، جس کو مسودۂ دستور حکومتِ ہند سنہ ۱۹۳۵ع (گورنمنٹ آف انڈیا بل سنہ ۱۹۳۵ع) کہا جاتا ہے -

اس مسودۂ قانون (Bill) میں ڈاکٹر صاحب کے نقطۂ نظر سے ایک اہم فرو گذاشت رہ گئی تھی - ہم بیان کر چکے ہیں کہ وزیر اعظم کے فرقہ وارانہ فیصلہ میں مسلمانوں اور دیگر اقلیتوں کو جداگانہ انتخاب کا حق دیا گیا تھا ، مگر اس کے ساتھ دو شرطیں لگائی گئی تھیں ،

۱- یہ کہ یہ حق صرف دس سال کے لیے ہو گا ،

۲- یہ کہ دس سال کے بعد اس میں ترمیم و تبدیلی ، متعلقہ فرقہ کی رضا مندی سے ہو سکے گی -

فرقہ وارانہ فیصلہ کو جزوِ دستور بنایا جانا چاہیے تھا ، اور اب جو مسودۂ دستور (گورنمنٹ آف انڈیا بل) پیش ہوا تھا ، وہی پارلیمنٹ اور ملکِ معظم کی منظوری کے بعد دستورِ جدید بننے والا تھا ، لیکن اس میں مندرجہ بالا دوسری شرط کو شامل نہیں کیا گیا تھا - فرقہ وارانہ فیصلہ

۱۵۹- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ سنہ ۱۹۵۱ع ص ۲۸۹ -

تو ایک اعلان تھا ، جس میں وعدہ کیا گیا تھا کہ دس سال کے بعد جداگانہ طریقہ انتخاب کو متعلقہ فرقہ کی رضا مندی سے تبدیل کیا جا سکے گا ، اب جب کہ اس اعلان کو قانونی اور دستوری شکل دی جا رہی تھی تو محض یہ کہہ دینا کافی نہ تھا کہ متعلقہ فرقہ کی رضا مندی سے دس سال کے بعد طریقہ انتخاب میں تبدیلی کی جا سکے گی بلکہ واضح طور پر یہ بتانا چاہئیے تھا کہ متعلقہ فرقہ کی رضا مندی معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہو گا ۔ لیکن یہ سب کچھ کرنے کے بجائے اس مسودۂ قانون میں اس شرط کو تقریباً نظر انداز کر دیا گیا تھا ، اور ساتھ ہی وفاقی مقننہ (Federal Legislature) کو دستور میں ترمیم کے بعض اہم اختیارات بھی دے دئے گئے تھے اور طریقہ انتخاب میں ترمیم کے تعلق سے متعلقہ فرقہ کی مرضی معلوم کرنے کا ، جو وعدہ فرقہ وارانہ اعلان میں کیا گیا تھا ، اس کو گورنر ، گورنر جنرل یا وزیر ہند کے بیانات پر منحصر کر دیا گیا تھا ۔ گویا طریقہ انتخاب میں وفاقی مجالس اگر کسی ترمیم کی سفارش کرتیں تو اس کے متعلق گورنر صوبہ یا گورنر جنرل یا وزیر ہند کے بیان کو متعلقہ فرقہ کی مرضی سمجھا جاتا اور اسی کے مطابق برطانوی حکومت اس ترمیم کو رد یا قبول کرتی !

جب جون سنہ ۱۹۳۵ع میں مسودۂ قانون حکومت ہند شائع ہوا تو جداگانہ انتخاب میں ترمیم و تبدیلی کے تعلق سے اس سقم پر علامہ اقبال کو سخت تشویش ہوئی اور انھوں نے بل کی ان دفعات پر شدید احتجاج کیا اور ان کو تبدیل کرنے کے لیے بعض نہایت معقول تجاویز پیش کیں اس سلسلہ میں انھوں نے مسلسل دو بیانات اخبارات میں شائع کرائے ۔ پہلا بیان تو انھوں نے سیٹھ عبداللہ ہارون اور مولانا شفیع داؤدی کے ساتھ مل کر دیا ، جو ۳ جولائی کو شائع ہوا ، یہ بیان مجمل ہے ۔ دوسرا بیان انھوں نے ۱۸ جولائی کو دیا ، یہ بیان بھی مشترکہ ہے ، تاہم ذرا مفصل ہے ۔ ہم یہاں اس دوسرے بیان کے جستہ ، جستہ حصے درج کرتے ہیں ، جس سے علامہ کا اس سلسلہ میں جو نقطہ نظر تھا ، وہ واضح طور پر سامنے آ جائے گا ،

" انڈیا بل کی دفعہ ۳۰۴ کے خلاف جو شورش پیدا ہو رہی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس کی غرض و غایت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ بین المّلی راضی نامہ پیدا کرنے کی مستند کانسٹی ٹیوشنل راہ متعین صاف اور ہموار ہو جائے کیونکہ یہ تو بالکل ظاہر ہے کہ صرف فرقہ وارانہ راضی نامہ ہی فرقہ وارانہ فیصلہ کی جگہ لے سکتا ہے ، ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ مسلمان اپنے مطالبات کی بنیاد ، کمیونل اوارڈ کی شرائط اور دفعات کی ٹھوس اساس پر رکھتے ہیں ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ملک معظم کی حکومت نے "کمیونل اوارڈ" کی دفعہ ۶ پارہ ۲ میں حسب ذیل تصریحات کی ہیں :

' خود دستور اساسی کے اندر ہی ، اس انتخابی انتظام کی ایسی صورت پیدا کی جائے گی ، جس کی رو سے ،

۱۔ دس سال کے انقضاء کے بعد ،

۲۔ متعلقہ ملتّوں کی رضا مندی سے ترمیم جائز ہو گی اور ،

۳۔ متعلقہ ملتّوں کی رضا مندی کو اس معاملہ میں دریافت کرنے کے لیے خاص ذرائع وضع کیے جائیں گے '

۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (انڈیا بل) کی دفعہ ۳۰۴ وفاقی مجالس آئین ساز کو دستور سازی کے کئی اہم اختیارات منتقل کرتی ہے ۔ ہم اس تفویض اختیار کی پوری طرح قدر کرتے ہیں ۔ ہمارے خیال میں ہندوستانی مجالس آئین ساز کو دستور سازی اور ترمیم کے مناسب اختیارات ، مناسب طریقوں کے ساتھ تفویض ہونا چاہئیں ، لیکن دو چیزیں بالکل علیحدہ ، جداگانہ اور مستقل وجود رکھتی ہیں اور ہمیں اس بنیادی حقیقت کو کبھی نہیں بھولنا چاہئیے ۔ ایک چیز مجالس آئین ساز ہے اور دوسری چیز اقوام ہند ہیں ۔ دونوں باہم مترادف نہیں ہیں ۔ ہم نے بار بار انڈیا بل کی ایک ایک دفعہ ، گوشہ اور پہلو کو دیکھا جانچا اور تولا لیکن کہیں بھی ہمیں اقوام متعلقہ کی سرخی کے متعلق مذکورہ تین وعدوں کا ذکر نہیں ملا ، جن کی تصریح اس شد و مد کے ساتھ

محولہ بالا الفاظ میں "کمیونل اوارڈ" کے دفعہ ۶ پارہ ۲ کے اندر کی گئی ہے ،

ہمارا خیال ہے کہ یہ ایک نہایت اہم اور سنگین فرو گذاشت ہے -

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اخبار سٹیٹس مین کے اداریہ کا حوالہ دیا ہے ، جس میں اس نے حکومت کی اس فرو گذاشت کو کمیونل اوارڈ میں دئے گئے وعدہ سے رو گردانی قرار دیا تھا اور آخر میں اس کا بدل یہ تجویز کیا تھا کہ اگر ہندو اپنے اکثریتی صوبوں میں مسلمانوں کی جداگانہ نمائندگی کو ختم کرنے کے درپے ہو جائیں تو مسلمان بھی اپنے اکثریتی صوبوں میں ہندو اقلیت کی جداگانہ نمائندگی کو ختم کر دیں - یہ ایک انتقامی چارہ جوئی تھی ، علامہ نے اس تجویز کی مخالفت کی اور کہا -

" اقلیّات (Minorities) کو انتقاماً نیابت کے حقوق سے محروم کر دینے کی پالیسی خواہ اس پر بہار اور یو - پی کی ہندو اکثریت عمل پیرا ہو یا پنجاب اور سرحد کی مسلم اکثریت ہندوستان کو ایک سول وار (خانہ جنگی) کے جہنم زار میں تبدیل کرنے والی پالیسی ہو گی - کسی صحیح الخیال ہندوستانی کا یہ مطمح نظر نہیں ہو سکتا - - - - - - ہم مخلصانہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ آئندہ دس سال کے اندر دستور اساسی کا صوبہ جات میں تعمیری عمل و دخل ، لوگوں میں اشتراکِ مفاد اور اتحادِ جذبات کی کافی مقدار پیدا کر دے گا ، جو ایک خالص ، حقیقی اور مستند راضی نامہ کی پیدائش کو آسان بنا دے گا اور یہ صرف فرقہ وارانہ راضی نامہ ہی ہے ، جو فرقہ وار فیصلہ کا بدل ہو سکتا ہے -

اقوام متعلقہ کے درمیان ایک خاص ، حقیقی اور مستند راضی نامہ کے دریافت کرنے کی کون سی عملی کسوٹی ہو سکتی ہے ؟ انڈیا بل سے یہ پایا جاتا ہے کہ گورنر جنرل اور وزیر ہند مجوزہ ترمیمات کے لیے اقلیّات (Minorities) کے مفاد پر اثر کے تعلق میں ، جو بیان اپنی ذاتی رائے کا دیا کریں گے وہ اقلیات کی مرضی دریافت کرنے کے لیے کافی و شافی ذریعہ تصور کیا جائے گا - ہم یہ تسلیم

کرتے ہیں کہ یہ افسرانِ حکومت ، اقلیات کی فیصل شدہ رائے اور مرضی کے مستند '' ذرائع ترسیل '' ہو سکتے ہیں ، لیکن ہم یہ ماننے سے قطعی انکار کرتے ہیں کہ یہ دفتری مشینری کبھی تن تنہا اقوام کی جمہوری رائے کی '' حقیقی ترجمان اور وکیل '' ہو سکتی ہے - گورنر ، گورنر جنرل اور سیکریٹریز آف اسٹیٹ (وزرائے سلطنت) خاص مقصد رکھنے والی پارٹیوں کی مخلوق ہوں گے خاص وزارتوں کے بنائے ہوئے ہوں گے - وقتی مصالح کے آوردہ اور سرکاری مفاد کے گماشتہ و کارندہ ہوں گے ۔ علاوہ بریں وہ کامل صوبائی سوراج کے نظامِ حکومت کے ماتحت ہمیشہ اکثریت کے زیر اثر رہنے پر مجبور ہوں گے - آٹھ کروڑ کی ایک عظیم الشان قوم کی سیاسی تقدیر کو سلطنت کے چند ایسے حکامِ بالا کی من مانی مرضی یا ذاتی وہم و خیال پر موقوف و منحصر بنا کر چھوڑ دینا ، جن کی سیاست ، رنگت اور حالت ہر وقت متغیر رہتی ہے ، ایک نامعقول حرکت ہو گی - - - - - - مسلم قوم اپنے سیاسی مقدمہ کی خود اپنے منتخب شدہ نمائندوں کے مستند واسطہ سے ترجمانی کے حق کی طالب ہے -

آئندہ دستورِ ہند کے نظام جدید کے ماتحت مسلم رائے عامہ کے نمائندگان کے تین منظم طبقات ہوں گے -

۱- وہ حلقہ رائے دہندگان ، جن کا نام ووٹرز رول (Voters Roll) پر درج ہوتا ہے اور جو مقامی اور مرکزی انتخابات میں حصہ لینے کا مجاز اور مختار ہوتا ہے ،

۲- صوبائی و مرکزی مجالس آئین ساز کے مسلم ممبروں کی جماعتیں اس حد تک مسلم رائے عامہ کی ترجمان ہوں گی کہ وہ مسلم رائے دہندگان کی منتخب کردہ ہوں گی - لیکن واضح رہے کہ ہر معاملہ میں ان کی رائے بھی مستند نہیں ہو گی اور اہم اور نئے معاملات میں تازہ الیکشن کے ذریعہ قوم کی رائے دریافت کرنا ضروری ہو گا -

۳- صوبائی یا مرکزی کابینہ ہائے حکومت کے ذمہ دار مسلم وزراء کی جماعت ، بشرطیکہ وہ مسلم ارکان مجلس آئین ساز کے معتمد علیہ ہوں اور محض ہندو اکثریت کی مخلوق نہ ہوں - مسلم رائے عامہ کے یہ تین معین مظہر کم و بیش اہم ہیں - سب سے زیادہ اہم مسلم رائے دہندگان کی منظم جماعت ہے - اس کے بعد مسلم ارکان مجالس آئین ساز کی منظم جماعت ہے اور سب سے آخری درجہ اہمیت اور سند کا مسلم ارکان کی کابینہ کا ہے - مسلم رائے دہندگان کی جماعت ، مسلم پالیسی اور قومی فیصلہ کی اصلی مالک و مختار ہے -

ہماری یہ قطعی رائے ہے کہ "کمیونل اوارڈ" کی آئندہ ترمیمات کے اہم ترین سوالات کے تعلق میں مسلم رائے عامہ کے اظہار اور فیصلہ کا اختیار صرف مسلم حلقہ رائے دہندگان کی منظم و متعین جماعت ہی کے ہاتھ میں ہو سکتا ہے اور مجالس آئین ساز کے مسلم ارکان کی جماعت یا کابینوں کے مسلم وزراء کی جماعت اسی حد اور اسی زمانہ تک مسلم رائے عامہ کی مستند مظہر مانی جائے گی ، جب تک مسلم رائے دہندگان کی بنیادی اور اصلی جماعت کی رائے ، ترجمان اور اعتماد کی حامل رہے گی -

اس ابتدائی اصلی اور بنیادی اصول کی اساس پر - - - - - مسلمان اس سے زیادہ اور اس سے کم کوئی چیز نہیں چاہتے کہ کمیونل اوارڈ ، دفعہ ۹ پیرا (۲) کے مذکورہ تین وعدوں کو انڈیا بل میں بالتصریح درج کر دیا جائے -

۱- اول یہ کہ کمیونل اوارڈ کو حسبِ قرارداد دس سال کی مدت کے لیے بعینہ برقرار رکھا جائے - یعنی یہ کہ کم سے کم آئندہ دس سال تک دستور ہند کی تمام اصلاحات (ترمیمات) کی بنیاد کمیونل اوارڈ کے اصول پر رکھی جائے -

۲- فرقہ وار فیصلہ ، جداگانہ نیابت اور جداگانہ انتخاب مسلم قوم کے مطالبات کا نتیجہ ہیں - مسلم قوم ان تحفظات کی طالب اور محتاج رہی ہے اور وہی بتلا سکتی ہے کہ کب اس کو

ان کی ضرورت باقی نہیں رہی -

۳- مسلم قوم اس کی بھی طالب ہے کہ دستور اساسی کے اندر اقوام متعلقہ کی باہمی رضا مندی کو دریافت کرنے کے لیے خاص ذرائع کی تصریح اور تعریف کر دی جائے تاکہ شک و شبہ اور ابہام کا کوئی موقع باقی نہ رہے مثلاً مندرجہ ذیل تین طریقہ ہائے عمل کو کمیونل اوارڈ کی ترمیم کے لیے ضروری قرار دیا جائے -

۱- اول یہ کہ دس سال کے زمانۂ ضمانت کے ختم ہونے کے بعد جو صوبہ کمیونل اوارڈ کی ترمیم کا طالب ہو ، وہ جداگانہ انتخاب اور مخلوط انتخاب کے سوال پر ایک انتخاب عام کرا لے -

۲- دوم یہ کہ جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے سوال پر عام الیکشن کے بعد ، جو نئی مجلس آئین ساز مرتب ہو ، اس کے اندر اسی سوال کا دوبارہ فیصلہ رائے شماری کے ذریعہ کیا جائے اور مسلم قوم کی تین چوتھائی اکثریت کی حمایت ترمیم کے حق میں حاصل کرنا ، تبدیلی کے لیے ضروری اور لازمی تصور کیا جائے -

۳- سوم یہ کہ اقوام متعلقہ (ہندو اور مسلم) کے مستند نمائندگان کے درمیان ایک باہمی راضی نامہ طے کیا جائے ، جس کے اندر مسلم نمائندگان مجلس آئین ساز کی تین چوتھائی حمایت کا ریزوایوشن اور آئندہ ہندو مسلم نیابت اور حقوق کے متعلق ضروری بندوبست کی شرائط درج ہوں - - - - - - خود انڈین نیشنل کانگریس لکھنؤ کے " لیگ کانگریس پیکٹ " دسمبر سنہ ۱۹۱۶ع کی رو سے اقوام متعلقہ کے تین چوتھائی ووٹ کو بین المللی معاملات کی ترمیم و تبدیلی کی لازمی شرط کے طور پر تسلیم کر چکی ہے ، ہم نہیں دیکھتے کہ اس معقول اور مستند ذریعۂ ترمیم کے تسلیم کرنے میں کون سی رکاوٹ ہو سکتی ہے[160] "

۱۶۰- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۳۵ع -

یہاں علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کا دوسرا دور ختم ہوتا ہے ۔ اس دور میں کل ہند سیاسیات میں ڈاکٹر صاحب نے جو حصہ لیا اس کو ہم نے تاریخ وار بیان کر دیا ہے ، اسی زمانہ میں ڈاکٹر صاحب نے کشمیر والوں کے معاملات میں بھی دلچسپی لی ، لیکن ہم نے سلسلہ بیان کو قائم رکھنے کے لیے ان کا ذکر نہیں کیا ۔ ذیل میں ان واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے ۔

اقبال اور قضیۂ کشمیر | کشمیر میں سنہ ۱۹۳۱ء میں کافی بے چینی پھیل گئی تھی ۔ ویسے تو کشمیر میں ریاستی نظم و نسق کی خرابی اور مسلمانوں کی زبوں حالی کے باعث پہلے ہی سے ہیجان موجود تھا ۔ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں آل انڈیا کشمیر مسلم کانفرنس کا ایک اجلاس لاہور میں منعقد ہوا تھا ، جس میں حکومتِ کشمیر کے نظم و نسق پر شدید نکتہ چینی کی گئی تھی ۔ اخبار انقلاب لاہور نے کشمیر سے متعلق درد ناک خبریں شائع کیں ، اسی لیے اس زمانے میں حکومت کشمیر نے انقلاب کے داخلہ پر امتناع عائد کر دیا ۔ اس کے کچھ دنوں بعد دو اہم واقعات پیش آئے ۔ ایک واقعہ تو یہ تھا کہ مسلمان ایک جگہ نماز کے لیے جمع ہوئے تھے اور امام خطبہ پڑھنے والا تھا کہ ایک سب انسپکٹر پولیس نے ، جو ہندو تھا ، امام کو خطبہ پڑھنے سے روک دیا ۔ اس پر مسلمانوں نے سخت احتجاج کیا ۔

دوسرا واقعہ یہ پیش آیا کہ جموں سنٹرل جیل میں ایک ہندو کانسٹیبل نے قرآن مجید کی بے حرمتی کی ۔ اس پر ایک شخص عبدالعزیز نامی نے اشتعال انگیز تقریر کی ۔ پولیس نے عبدالعزیز کو گرفتار کر لیا اور عدالت میں پیش کیا ، مقدمہ کی سماعت ہوئی ، لیکن وہاں بھی مسلمانوں کا ایک کثیر مجمع جمع ہو گیا ۔ اس ہجوم کو منتشر کرنے کے لیے پولیس نے فائرنگ کی ، جس میں دس اشخاص ہلاک ہوئے ۔ یہ واقعہ ۱۲ جولائی سنہ ۱۹۳۱ء کو پیش آیا ۔ ان واقعات کے بعد کشمیر کے مختلف مقامات پر مسلمانوں نے مظاہرے کرنے شروع کیے اور پولیس نے ان مظاہروں کو سختی سے دبانا چاہا ۔ ان مظاہروں نے فرقہ وارانہ فسادات کی شکل اختیار کر لی ۔ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء میں پوری وادیٔ کشمیر میں سخت فسادات

ہوئے - نومبر میں فسادات کی یہ آگ جموں تک پہنچ گئی - اب حالات حکومت کشمیر کے قابو سے باہر ہو چلے تھے - اس لیے اس نے برطانوی فوج کی مدد طلب کی[۱۶۱] -

اب کشمیر میں تشدد اور سخت گیری کا دور تھا - حکومت مسلمانوں کو پکڑ پکڑ کر جیلوں میں ٹھونس رہی تھی - ان کے زعماء نظر بند کیے جا چکے تھے اور عوام کو حکومت نے اپنی آہنی گرفت میں لے لیا تھا - یہ تو ایک آتش فشاں پہاڑ تھا ، جو پھٹ پڑا ، لیکن اس کا مادہ پہلے ہی سے پک رہا تھا - کشمیر کے مسلمانوں کی حالت ابتدا سے بہت خراب تھی ، افلاس نے اس خوبصورت خطۂ زمین کے باشندوں کو اپنے پنجوں میں جکڑ رکھا تھا ، مسلمانوں پر سرکاری ملازمتوں کے دروازے تقریباً بند تھے ، تعلیمی حالت ان کی بہت پست تھی ، مذہبی آزادی تقریباً نہ ہونے کے برابر تھی ، کئی عبادت گاہیں حکومت کے قبضہ میں تھیں الغرض افلاس و جہالت کا دور دورہ تھا ، مذہبی اور سماجی آزادی کا فقدان تھا - ان حالات کو دیکھ کر بعض بلند عزائم افراد نے عوام کو بیدار کرنا شروع کیا - کشمیر مسلم کانفرنس کا قیام عمل میں آیا - لیکن یہ ادارہ حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگا - حکومت نے اس پر پابندیاں عائد کر دیں - یہ تھا پس منظر کشمیر کی سیاسی بے چینی کا - کشمیریوں کی کسمپرسی سے شمالی ہند کے مسلمان بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے - چنانچہ مجلس احرار نے حکومت کشمیر کے ان مظالم کے خلاف عملی مظاہرے شروع کر دئے اور حکومت کے امتناعی احکام کے باوجود ہزاروں کی تعداد میں اپنے جتھے روانہ کیے ، کشمیر کی جیلیں بھر دیں - یہاں تک کہ حکومت کشمیر نے تنگ آ کر حکومت پنجاب سے اس مہم کو روکنے کی درخواست کی - اب حکومت پنجاب نے احراری جتھوں کو اپنی سرحد پر ہی روکنا شروع کر دیا - کشمیریوں کی تائید میں برطانوی ہند کے مسلمانوں کی یہ ایک انقلابی تحریک تھی - اہل کشمیر کی ہمدردی میں برطانوی ہند کے مسلمانوں نے ایک

۱۶۱- ماخوذ از رپورٹ بریف نوٹ آن ایڈمنسٹریشن آف جموں و کشمیر بابتہ سنہ ۱۹۳۱ع -

دستوری پر امن تحریک شروع کر رکھی تھی اور کل ہند کشمیر کمیٹی اس تحریک کا مرکز تھی ۔

ڈاکٹر اقبال کو خاکِ کشمیر سے خاندانی تعلق تھا ، کیونکہ ان کے بزرگ اس جنتِ نظیر کے رہنے والے تھے ۔ ویسے خود ڈاکٹر صاحب کو اس خطۂ اراضی سے خاص تعلق خاطر رہا ہے ، انھوں نے ہی تو کہا تھا کہ ،

ع تنم گلے از جنتِ کشمیر

اب جب کہ کشمیریوں پر یہ زمین تنگ کی جانے لگی تو بھلا ڈاکٹر صاحب خاموش کیونکر بیٹھ سکتے تھے ۔ چنانچہ انھوں نے کشمیر کمیٹی میں سرگرمی کے ساتھ حصہ لیا ۔ جیسا کہ بیان کیا گیا ہے کشمیر کمیٹی کا مقصد یہ تھا کہ آئینی ذرائع سے مسلمانانِ کشمیر کو ان کے واجبی حقوق دلائے جائیں ۔ کشمیر کمیٹی نے پہلا کام یہ کیا کہ جو مسلمان کشمیر میں قید و بند کی مصیبتیں جھیل رہے تھے ، ان کو ممکنہ قانونی امداد دی ۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر صاحب نے بڑی دلچسپی سے کام لیا اور اپنے ذاتی اثر اور تعلق سے بعض نامی گرامی وکلاء کو کشمیر روانہ کیا ۔ پٹنہ کے مولوی نعیم الحق ایڈوکیٹ محض ڈاکٹر صاحب سے تعلق خاطر ہونے کے باعث کشمیریوں کی مدد کو پہنچ گئے[۱۶۲] ۔ اسی طرح لاہور سے بھی ڈاکٹر صاحب نے بعض وکلاء کو روانہ کیا ۔ علامہ مرحوم سے نواب سر حمید اللہ خان والی بھوپال کے نہایت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور اِدھر مہاراجہ کشمیر کے بھی والی بھوپال سے دوستانہ مراسم تھے ۔ ڈاکٹر صاحب نے والی بھوپال کے ذریعہ مہاراجہ کشمیر کو اس امر پر آمادہ کیا کہ وہ مسلمانانِ کشمیر کے جائز مطالبات کی تحقیق کے لیے ایک کمیٹی مقرر کریں ۔ چنانچہ اقبال کی مساعی کامیاب ہوئیں اور حکومت کشمیر نے گلانسی کمیشن کا تقرر کر دیا(الف) ۔ جس زمانہ میں

۱۶۲- اقبال نامہ حصہ اول مرتبہ شیخ عطا اللہ خطوط بنام مسٹر نعیم الحق ایڈوکیٹ ص ۲۹م تا ۳۴۴ ۔

(الف) یہ بیان مولانا غلام رسول مہر کا ہے ۔

گلانسی کمیشن کا تقرر ہوا ، اس وقت علامہ مرحوم آل انڈیا مسلم کانفرنس کے صدر تھے - کانفرنس کو گلانسی کمیشن کی تشکیل پر اعتراض تھا ، چنانچہ اس نے اپنے اجلاس عام منعقدہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ء میں کشمیر سے متعلق حسب ذیل قرارداد منظور کی -

" گلانسی کمیشن میں جو مسلمان اراکین لیے گئے ہیں ، انھیں مسلم جماعت سے مشورہ کیے بغیر نامزد کیا گیا ہے ، اس لیے گلانسی کمیشن کی موجودہ حیثیت اس کانفرنس کے لیے ناقابلِ قبول ہے - یہ کانفرنس حکومتِ کشمیر سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ مسلم جماعت سے مشورہ کرکے مسلمان اراکین کو مقرر کرے -

گلانسی کمیشن جو دستور مرتب کرے گا ، وہ اس کانفرنس کی رائے میں اس وقت تک ناقابل قبول رہے گا جب تک شیخ عبداللہ اور قاضی گوہر کو جیل سے نہ رہا کیا جائے اور ان کو اس بات کا موقع نہ دیا جائے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات کو کمیشن کے سامنے پیش کریں -

یہ کانفرنس کشمیر جیل میں مسلمان سیاسی قیدیوں کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے ، اس پر سخت احتجاج کرتی ہے - حکومت کشمیر نے شیخ عبدالقیوم کو کشمیر کا وزیر داخلہ مقرر کیا ہے - یہ کانفرنس اس تقرر کو ناپسند کرتی ہے کیونکہ انھیں مسلمانوں کی حمایت حاصل نہیں ہے -

یہ کانفرنس حکومتِ کشمیر کے اس طرزِ عمل پر احتجاج کرتی ہے کہ اس نے بعض مسلم وکلاء کو حدودِ ریاست سے خارج کر دیا ہے اور بعض کے داخلہ پر امتناع عائد کر دیا ہے - حکومت کشمیر کے اس طرزِ عمل سے مسلمان سیاسی قیدیوں کے حقِ مدافعت پر برا اثر پڑ رہا ہے اور وہ انصاف حاصل کرنے سے محروم ہو رہے ہیں(الف) "

(الف) یہ قرارداد کل ہند مسلم کانفرنس کی ان قراردادوں میں شامل ہے جس کی مطبوعہ کاپی مجھے مولانا غلام رسول مہر کے کتب خانہ سے دستیاب ہوئی تھی -

ڈاکٹر صاحب نے کشمیر کے مسئلہ کو مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے بھی پیش کیا ۔ آپ نے اپنے خطبۂ صدارت میں بڑے پر زور الفاظ میں مسلمانانِ کشمیر کے مطالبات کی تائید کی اور وزیر اعظم کشمیر کو توجہ دلائی کہ جلد از جلد وہاں ایک دستوری حکومت قائم کریں ۔ آپ نے کہا ۔

" جہاں تک کشمیر کا تعلق ہے میرے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس ملک میں جو واقعات ابھی حال ہی میں رونما ہوئے ہیں ، ان کا تاریخی پس منظر بیان کروں ۔ ایسے لوگوں کی بظاہر یکایک بیداری ، جن کی خودی کا شعلہ تقریباً بجھ چکا تھا ، ان تمام اشخاص کے لیے ، جنھیں موجودہ ایشیائی عوام کی اندرونی کشمکش کے متعلق بصیرت حاصل ہے ، ایک مژدۂ جاں فزا ہونا چاہیے ۔ کشمیر کے عوام کے مقاصد بالکل درست ہیں اور مجھے اس معاملہ میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ اس ذہین اور ہوشیار قوم میں اپنی شخصیت کے احساس کا احیا نہ صرف ریاست کی تقویت کا باعث ہو گا بلکہ پورے ہندوستان کے عوام کے لیے ایک ذریعۂ قوت بنے گا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تمام دنیا میں عوام کے اندر جو احساس خود آگہی پیدا ہو گیا ہے ، وہ اپنے آپ کو تسلیم کروانا چاہتا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ اس نظم و نسق میں جو ان پر حکمرانی کر رہا ہے ، اُسے حصہ دیا جائے ۔ سیاسی تربیت غیر ترقی یافتہ عوام کے لیے مناسب ہے لیکن جب عوام کا بدلا ہوا نقطۂ نظر نظم و نسق میں انقلاب آفریں اصلاح کا طالب ہو تو نظم و نسق کا مفاد یہ ہے کہ اس سے انکار نہ کیا جائے ۔ کشمیر کے خاص حالات کے باعث دیگر امور کے علاوہ اس ملک کے عوام ایک قسم کی عوامی مقننہ کا مطالبہ کر رہے ہیں ۔ ہمیں توقع ہے کہ ریاست کے والی اور حکومتِ ہند دونوں عوام کے اس مطالبہ پر غورِ مناسب کریں گے ۔ مجھے اس میں شبہ نہیں ہے کہ نئے وزیر اعظم اپنی برطانوی نظم و نسق کی ماہرانہ خصوصیات کے ساتھ معاملات کی کنہ تک پہنچ جائیں گے اور خوش مزاج لیکن روندے ہوئے عوام ــــــ ایسے عوام ، جنھوں نے قدیم ہندوستان کی

بعض بہترین دماغ عطا کیے تھے اور بعد میں مغل ثقافت کو حقیقی دلکشی بخشی تھی ـــــــ کی کارفرمائی کے لیے کوئی نہ کوئی دائرۂ عمل متعین کر دیں گے - ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک کی طرح کشمیر میں دستوری اصلاحات کی راہ میں دشواریاں ہوں ، لیکن دیرپا امن اور نظم و ضبط کا تقاضہ یہ ہے کہ ان دشواریوں پر جلد از جلد قابو پا لیا جائے - اگر موجودہ بحران کے مضمرات کو پوری طرح نہیں سمجھا گیا اور اس کے اسباب کا ان گوشوں میں پتہ چلانے کی کوشش کی گئی ، جہاں وہ نہیں پائے جاتے ، تو مجھے ڈر ہے کہ حکومتِ کشمیر اپنے مسئلہ کو اور زیادہ پیچیدہ بنا لے گی[۱۶۳] "

۱۷ اگست سنہ ۱۹۳۲ع کو مجلس عاملہ کل ہند مسلم کانفرنس نے جو علامہ مرحوم کی صدارت میں منعقد ہوئی تھی ، ایک قرارداد منظور کی ، جس میں مجاہرہ کشمیر (Kashmir agitation) کے سلسلہ میں احرار کی قید و بند پر سخت احتجاج کیا اور ان کی رہائی کے لیے حکومت پر زور دیا ـــ کشمیر میں مجاہرہ (agitation) برابر جاری رہا اور حکومت بھی سختی کے ساتھ اس کو دباتی رہی - کشمیر میں اس وقت دو سیاسی جماعتیں قائم ہو گئی تھیں - ایک تو میر محمد واعظ یوسف کی جماعت کشمیر مسلم کانفرنس تھی اور دوسری شیخ عبداللہ صاحب کی کشمیر نیشنل کانفرنس - حکومت نے ان دونوں جماعتوں کے قائدین کو گرفتار کر لیا ، جس سے ملک میں اور زیادہ بے چینی پھیل گئی - ڈاکٹر صاحب نے ۷ جون سنہ ۱۹۳۳ع کو اپنے بیان کے ذریعہ حکومتِ کشمیر کی توجہ اس طرف مبذول کروائی اور مسلمانانِ کشمیر کو مشورہ دیا کہ وہ آپس میں متحد رہیں اور صرف ایک ہی سیاسی ادارہ قائم رکھیں[۱۶۴] -

ادہر کشمیر کمیٹی اپنا کام برابر کیے جا رہی تھی - یہ کمیٹی جب قائم ہوئی تھی تو اس وقت خیال یہ تھا کہ یہ ایک عارضی کمیٹی ہو گی -

---

۱۶۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۰ تا ۵۲ -

۱۶۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۹۶ و ۱۹۷ -

ے اس کا کوئی دستور مدون نہیں کیا گیا تھا اور صدر کو غیر معمولی ات دئے گئے تھے - اس وقت کمیٹی کے صدر امیر جماعت احمدیہ بشیر الدین محمود تھے ، لیکن کشمیر کے قضیہ نے طول کھینچا اور ، خیال پیدا ہوا کہ اس کمیٹی کا ایک باضابطہ دستور تیار کیا جائے ے عہدہ دار منتخب کیے جائیں - قادیانی حضرات نے اس خیال کی ، کی ، کیونکہ انھوں نے یہ سمجھا کہ اس طرح ان کو کشمیر کمیٹی بعدہ کر دینا مقصود ہے - اس لیے کہ اس وقت عام طور پر یہ خیال گیا تھا کہ قادیانی کشمیر کمیٹی کے توسط سے اور کشمیریوں کی ی کے نام سے دراصل اپنے عقائد کی تبلیغ کر رہے ہیں - بہرحال اس ۔ کا نتیجہ یہ ہوا کہ مرزا بشیر الدین محمود نے صدارت سے استعفاء دیا اور علامہ اقبال کو ان کی جگہ عارضی مدت کے لیے صدر منتخب گیا -

کمیٹی کے ایک دوسرے جلسے میں دستور کا مسودہ بغرض منظوری ہوا - اس وقت قادیانی حضرات نے اس کی مخالفت کی - ان لوگوں کی ہ تھی کہ کمیٹی کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے - لیکن وہ ایک ہی جماعت رہے - پھر یہ حضرات کمیٹی سے زیادہ اپنے امیر یع اور فرمانبردار تھے اور کشمیر کے معاملات میں بھی اپنے امیر شورہ کے بغیر کوئی کام انجام نہیں دیتے تھے - چونکہ کشمیر کمیٹی لی کام کرنے والے حضرات یہی تھے اور انھوں نے مرزا بشیر الدین کے استعفاء کے بعد دلچسپی لینی کم کر دی تھی ، اس لیے . کمیٹی کا کام سست پڑ گیا تھا - ان حالات میں ڈاکٹر صاحب نے یہ سمجھا کہ اس کمیٹی کی صدارت سے مستعفی ہو جائیں ، چنانچہ ن سنہ ۱۹۳۳ع کو آپ نے اس کمیٹی سے استعفاء دے دیا اور اس کی تحلیل کا اعلان کر دیا [۱۶۵]-

کشمیر کمیٹی کی تحلیل کے بعد قادیانی حضرات نے "تحریک کشمیر"

اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۹۷ تا ۲۰۰

کے نام سے ایک ادارہ قائم کرنا چاہا اور اس کی صدارت کے لیے ڈاکٹر صاحب سے خواہش کی ، لیکن ڈاکٹر صاحب اب قادیانی تحریک کے سخت مخالف بن چکے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ کشمیر کے نام سے قادیانی حضرات اپنے عقائد کی نشر و اشاعت کرنا چاہتے ہیں اس لیے انھوں نے اس پیش کش کو قبول کرنے سے انکار کر دیا [۱۶۶]۔ کشمیر کمیٹی کے یہ واقعات اس لحاظ سے بھی اہم ہیں کہ ان ہی واقعات کے بعد ڈاکٹر صاحب نے قادیانی تحریک کی سختی کے ساتھ مخالفت کرنی شروع کی ۔

کشمیر کمیٹی تحلیل ہو گئی ، لیکن ڈاکٹر صاحب کی دلچسپی اور ہمدردی مسائلِ کشمیر اور مسلمانانِ کشمیر سے ہمیشہ کی طرح باقی رہی گلانسی کمیشن نے اب رپورٹ شائع کر دی تھی ۔ اس کمیشن نے سفارش کی تھی کہ کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی ہو ، مذہبی عبادت گاہوں سے سرکاری قبضے کو برخواست کر کے انھیں عوام کے سپرد کر دیا جائے ، تعلیم کی عام اشاعت ہو ، ابتدائی مدارس زیادہ تعداد میں کھولے جائیں ، مسلم اساتذہ کی تعداد میں اضافہ کیا جائے ، ایک خاص عہدہ دار مسلمانوں کی تعلیم کے انتظام کے لیے مقرر کیا جائے ، تمام ملازمتوں کی باقاعدہ تشہیر ہو اور ہر فرقہ کو متناسب حصہ دیا جائے [۱۶۷]۔

گلانسی کمیشن کی اس رپورٹ کی بناء پر حکومت کشمیر نے اپنے ایک اعلامیہ کے ذریعہ کشمیر میں مکمل مذہبی آزادی کا اعلان کیا اور جن جن مساجد پر سرکاری قبضہ تھا ، ان کو واگذاشت کرنے کے احکامات دیئے ، اذان میں مداخلت کو جرم قرار دیا اور گلانسی کمیشن کی دیگر تمام سفارشات کو روبہ عمل لانے کا وعدہ کیا ۔

ڈاکٹر صاحب نے ۳ اگست سنہ ۱۹۳۳ع کو حکومت کے اس اعلان کا خیر مقدم کیا اور وزیر اعظم کشمیر کو توجہ دلائی کہ وہ سیاسی قیدیوں کو رہا کو دیں میر پور اور بار امولا میں جو مقدمات مسلمانوں کے

۱۶۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۰ تا ۲۰۱

۱۶۷- ملخص از رپورٹ گلانسی کمیشن ص ۵۱ ۔

خلاف دائر ہیں ، ان کو اٹھا لیا جائے تاکہ حکومت اور عوام کے مابین خوشگوار تعلقات پیدا ہو سکیں[۱۶۸] اس طرح کشمیر کا یہ قضیہ ختم ہو گیا ۔

اقبال اور قضیۂ الور علامہ اقبال کے مسلم کانفرنس کی صدارت کے دور میں الور کا قضیہ بھی پیش آیا ، جس کے سلجھانے میں مسلم کانفرنس نے ڈاکٹر صاحب کی زیر قیادت حصہ لیا تھا ۔ اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس کا مختصر سا تذکرہ کر دیا جائے ۔

سنہ ۱۹۳۲ء میں مسلمانان الور پر مظالم ڈھائے گئے ۔ انھوں نے ایک جماعت انجمن خادم الاسلام کے نام سے بنائی تھی ۔ حکومت نے اس ادارہ پر سختیاں کرنی شروع کیں اور بالآخر اس پر امتناع عاید کر دیا ۔ حکومت کے اس طرزِ عمل کے خلاف مسلمانوں نے احتجاج کیا اور جلوس نکالے ۔ حکومت نے ان پر فائرنگ کی ۔ اس کے بعد سے الور میں تشدد کا دور دورہ رہا ۔ ان مظالم سے تنگ آ کر مسلمانوں نے ہجرت کرنی شروع کی ۔ حکومت نے ان مہاجرین کی جائدادوں کو ضبط کر لیا ۔ اس واقعہ کے علاوہ مسلمانوں کو بعض دیرینہ شکایتیں تھیں مثلاً یہ کہ مساجد پر حکومت نے قبضہ کر رکھا تھا ۔ سنہ ۱۹۱۰ء سے اردو فارسی کی تعلیم مدارس میں بند تھی ، مذہبی تعلیم پر پابندیاں عائد تھیں ، ملازمتوں میں مسلمانوں کو بہت کم حصہ دیا جاتا تھا ۔

کل ہند مسلم کانفرنس کے عام اجلاس منعقدہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء میں ، جس کی صدارت علامہ اقبال نے کی تھی ، یہ طے پایا تھا مسلمانانِ الور کی شکایات کو دربار الور میں پیش کرنے کے لیے ایک وفد مولانا شفیع داؤدی، معتمد کانفرنس کی قیادت میں روانہ کیا جائے ، لیکن جب مولانا نے دربار الور میں ان شکایات کو پیش کرنے کی اجازت چاہی ، تو وفد کو ملاقات کی اجازت دینے سے انکار کر دیا گیا ۔ مجلس عاملہ مسلم کانفرنس نے بتاریخ ۸ جون سنہ ۱۹۳۲ء حکومتِ الور کے اس طرزِ عمل کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی اور مطالبہ کیا کہ حالات کی تحقیقات کے لیے

۱۶۸۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۱ و ۲۰۲ ۔

ایک غیر جانبدار کمیٹی مقرر کی جائے ، لیکن دربار الور نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی ۔ اب مسلم کانفرنس نے وائسرائے ہند لارڈ ولنگڈن کی خدمت میں ایک یاد داشت پیش کی ، جس میں الور کے ان مظالم کو گنایا گیا تھا اور ان کے انسداد کی طرف توجہ دلائی گئی تھی (الف) ۔

نظر باز پسیں گذشتہ صفحات میں علامہ اقبال کی سیاسی زندگی کے دوسرے دور کے واقعات تفصیل سے تاریخ وار پیش کیے گئے ہیں ۔ ان واقعات پر سرسری نظر ڈالنے ہی سے یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ اس دور میں بھی علامہ مرحوم نے ہر سیاسی تحریک میں حصہ لیا ، خواہ وہ تحریک چھوٹی ہو یا بڑی ، مقامی ہو یا ہند گیر ! انھوں نے دہلی میں گاندھی جی سے ہندو مسلم مفاہمت پر مذاکرات کیے ۔ مسلم قوم پرستوں پر تنقید بھی کی اور بھوپال کانفرنس میں ان سے اتحاد کی گفتگو بھی کی ۔ فسادات کانپور ، بنارس و آگرہ پر خون کے آنسو بہائے اور مسلمانوں کو اپنے تباہ حال بھائیوں کی مدد پر آمادہ کیا ۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور شرکت سے قبل ، حکومت برطانیہ کو کانگریس کی طرف جھکنے اور مسلمانوں کی حق تلفی کرنے کے خلاف متنبہ کیا ۔ اسی گول میز کانفرنس کی اقلیتوں والی کمیٹی کے تمام جلسوں میں پابندی سے شریک ہوئے —— یہاں پھر گاندھی جی سے ہند و مسلم مفاہمت کی کوشش کی اور ناکامی کی صورت میں اقلیتوں کے میثاق (Minorities Pact) کی تدوین و ترتیب میں حصہ لیا ۔ کانفرنس کے جلسوں سے باہر سر سموئیل ہور وزیر ہند اور دیگر عمائدین سلطنت برطانیہ سے مذاکرات کیے ۔ مسلمانوں کے حقوق کی ان کے سامنے وکالت کی اور انہیں متاثر کیا ۔ پان اسلامزم کی سازش کے بے بنیاد الزام کی قلعی کھولی ۔ وفاقی ہیئت کی کمیٹی کا بائیکاٹ کیا اور مسلم اراکین کمیٹی کے رویہ پر احتجاجاً لندن کو خیر باد کہہ دیا ! لوٹتے ہوئے مصر میں عربوں کی

الف ۔ قضیۂ الور سے متعلق یہ معلومات ان مطبوعہ قراردادوں سے یکجا کی گئی ہیں ، جو مجھے مولانا غلام رسول مہر مرحوم کے ذاتی کتب خانہ سے دستیاب ہوئی تھیں ۔

غلط فہمی کو دور کیا ، کانگریس کے زہر کا ازالہ اور گاندھی جی کے جادو کا توڑ کیا ، پھر فلسطین کی موتمر عالم اسلامی میں حصہ لیا ۔ مراجعت ہندوستان کے چند ماہ بعد ہی کل ہند مسلم کانفرنس کی صدارت کی ۔ اپنے خطبۂ صدارت میں مسلمانوں کے تعلق سے حکومت برطانیہ کی پالیسی پر شدید تنقید کی اور ان کے حقوق کی حفاظت کا واضح مطالبہ کیا پھر تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن گئے اور اس کے کھلے اجلاس میں کل ہند وفاق کی مخالفت کی ، صوبائی خود مختاری اور " لامرکز " (No Centre) کی تجاویز پیش کیں ۔ برطانوی ارباب حل و عقد کے سامنے اپنی اسلامی مملکت والی تجویز کو رکھا اور اس کی معقولیت کو منوایا ۔ دستور جدید نے اپنی صورت گری کے سلسلہ میں ، جو مراحل اس دور میں طے کیے ، ان میں سے ہر ایک پر کڑی نظر رکھی ۔ وزیر اعظم کا فرقہ وارانہ فیصلہ ، قرطاس ابیض اور پھر انڈیا بل ، ان میں سے ہر ایک کا انھوں نے نہایت گہرا مطالعہ کیا ، ان کے مضمرات پر غور کیا اور ان پر نہایت معقول و مدلل تنقید کی ۔ اسی دستور سازی کے ضمن میں ، جو مختلف سیاسی تحریکیں (مثلاً سکھ مسلم مفاہمت کی جوگیندر سنگھ والی تحریک ، ہند و مسلم مفاہمت کی مولانا شوکت علی والی تحریک اور پنجاب میں ہندو ، مسلم ، سکھ مفاہمت کی فضل حسین والی تحریک) رونما ہوئیں ، ان کے تعلق سے مدبرانہ رویہ اختیار کیا اور مسلمانوں کی برمحل اور صحیح رہنمائی کی ۔ الغرض اس زمانہ میں کوئی نمایاں یا قابل ذکر سیاسی تحریک ایسی نظر نہیں آتی ، جس کا بالواسطہ یا بلا واسطہ علامہ سے تعلق نہ رہا ہو ۔

ان کی سیاسی زندگی کا یہ دور اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ سیاسی میدان میں عملاً وہ بہت فعال نظر آتے ہیں ۔ اس زمانہ میں انھوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کی صدارت کی ۔ اس صدارت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ صرف اس کے جلسۂ سالانہ منعقدہ ۲۱ مارچ سنہ ۱۹۳۲ع کے صدر تھے، بلکہ اس پورے دور میں انھوں نے اس کی صدارت و قیادت کے فرائض انجام دئے ہیں ، اس کی مجلس عاملہ اور ایگزیکٹیو بورڈ کے جلسوں کی صدارت کی ہے اور اپنی اسی حیثیت میں اور اسی کی نمائندگی کرتے ہوئے ، تمام سیاسی

تحریکات میں حصہ لیا ہے -

ہم بتا چکے ہیں کہ اس زمانہ میں کل ہند مسلم کانفرنس ہی ایک واحد فعال سیاسی جماعت تھی - مسلمانوں کی دوسری سیاسی جماعتوں کی حالت دگرگوں تھی - مجلس خلافت ، ہر چند کہیں کہ ہے ، نہیں ہے کا مصداق بن گئی تھی - خلافت ترکیہ کے خاتمہ اور مولانا محمد علی کی رحلت کے بعد ہی وہ آخری ہچکیاں لینے لگی تھی - مولانا شوکت علی کی بھاری بھر کم شخصیت اور ان کے نفس گرم سے متاثر ہو کر وہ کبھی کبھی سانس لینے لگتی تھی ، لیکن حقیقتاً یہ اس کا دم واپسیں تھا ! کل ہند مسلم لیگ ، مسلمانان ہند کی قدیم ترین انجمن تھی ، لیکن یہ اپنے اندرونی اختلافات اور دھڑے بندیوں کے باعث ، جن کا ذکر ایک گونہ تفصیل سے ہم اس باب کے سیاسی پس منظر میں کر آئے ہیں ، بے حال و نڈھال تھی - بات یہ تھی کہ اس بزم کی رونق جناح سے تھی اور جناح نے تقریباً اس پورے دور (یعنی سنہ ۱۹۳۱ع تا ۱۹۳۴ع) میں نہ صرف اس سے مفارقت اختیار کر لی تھی بلکہ وہ اس جماعت کی افراتفری اور ملک کے سیاسی حالات سے دل برداشتہ ہو کر ہندوستان چھوڑ لندن میں رہنے لگے تھے اور وہاں سے لوٹے بھی تو سنہ ۱۹۳۴ع میں اور اس وقت بھی انھوں نے اس سونی بزم کو جگانے کی بس کچھ یونہی سی کوشش کی تھی - ان کی بھر پور کوششوں کا آغاز تو سنہ ۱۹۳۶ع سے ہوا ، جب کہ اس بزم میں پھر اجالا ہوا اور جناح شمع محفل بن گئے ! ! اب رہ گئیں مسلم نیشنلسٹ (قوم پرست) کانفرنس اور جمیعة العلماء ہند تو جیسا کہ ہم اس باب کے آغاز میں بیان کر چکے ہیں کہ یہ دونوں جماعتیں مسلمانوں کی ترجمان نہ تھیں ، بلکہ کانگریس کی ہمنوا تھیں - اس طرح جب ہم اس دور میں مسلمانوں کی سیاسی جماعتوں پر نظر ڈالتے ہیں تو کل ہند مسلم کانفرنس ہی ایک واحد ، فعال جماعت نظر آتی ہے - اس کا ایک باضابطہ ایگزیکٹیو بورڈ اور ایک مجلس عاملہ تھی اور اس کی شاخیں بھی مختلف صوبوں میں پھیلی ہوئی تھیں - پھر اس نے اس دور میں علامہ اقبال کی قیادت و صدارت میں مسلمانوں کی ہر مرحلہ پر رہنمائی کی - واضح رہے کہ یہی زمانہ ہندوستانی سیاست کی تاریخ میں اس لحاظ سے بہت اہم اور نازک تھا کہ دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع

یعنی برطانوی راج کے آخری دستور نے اسی زمانہ میں تکمیل کے مراحل طے کیے گئے تھے۔ دوسری گول میز کانفرنس اسی دستور کے ابتدائی خطوط کو متعین کرنے کے لیے منعقد ہوئی تھی۔ فرقہ وارانہ فیصلہ، جس نے اس دستور میں مسلمانوں کے مؤقف کو متعین کر دیا، اسی زمانہ میں صادر ہوا، اسی کے بعد قرطاس ابیض، مشترکہ پارلیمانی کمیٹی کی رپورٹ اور پھر انڈیا بل ——— یہ سب وہ مراحل تھے، جن سے برطانیۂ عظمیٰ کا عطا کردہ یہ آخری دستور گذرا تھا اور یہ سارے کے سارے مراحل اسی دور میں پیش آئے تھے۔ ان میں سے ہر مرحلہ پر مسلم قائدین کو مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت اور ان کے سیاسی مؤقف کے تعین کے لیے مستعد، چوکنا اور ہوشیار رہنا چاہیے تھا۔ ان تمام حالات و واقعات کے پیش نظر ڈاکٹر صاحب کا یہ دور صدارت بہت ہی نازک اور اہم ذمہ داریوں کا حامل تھا اور یہ دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ اقبال جیسے طبعاً عزلت پسند شخص نے بڑی عملی کارکردگی اور فعالیت کا ثبوت دیا۔ انھوں نے نہ صرف اپنے صدارتی فرائض بطریق احسن انجام دئے، بلکہ مسلمانان ہند کی صحیح قیادت و رہنمائی کی!!

ڈاکٹر صاحب کی ساری سیاسی جد و جہد، اس دوران اس نقطہ پر مرکوز رہی کہ مسلمانوں کو متحدہ قومیت میں ضم ہونے سے بچایا جائے، ان کے لیے ایک جداگانہ قومی مؤقف کا تعین اور ان کے خصوصی حقوق کا تحفظ کیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کی خاطر وہ راست اقدام (Direct Action) کے لیے بھی آمادہ و تیار تھے، جس کا اظہار مسلم کانفرنس کے اجلاس منعقدہ ۲۲ مارچ سنہ ۱۹۳۲ع کی منظوری قرارداد نمبر ۲ سے ہوتا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ راست اقدام کے بغیر ہی ڈاکٹر صاحب کا یہ مقصد حاصل ہو گیا!

علامہ اقبال اور ان کے رفقائے سیاسی نے مسلمانوں کے لیے جداگانہ حق انتخاب، سندھ کی علیحدگی، صوبہ سرحد میں سیاسی اصلاحات کے نفاذ کا مطالبہ کیا تھا۔ سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور میں ان مطالبات کو تسلیم کر لیا گیا۔ مسلم کانفرنس اور ڈاکٹر صاحب کا ایک مطالبہ یہ تھا کہ

مرکزی مقننہ میں مسلمانوں کو ایک تہائی نشستیں حاصل ہوں ، چنانچہ اس مطالبہ کو بھی بڑی حد تک جزو دستور بنایا گیا تھا ۔ مسلم کانفرنس اور ڈاکٹر اقبال کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مرکزی اور صوبائی کابینہ میں مسلمانوں کو ان کا جائز حصہ دیا جائے ۔ دستور ہند سنہ ۱۹۳۵ع میں اس کی گنجائش اس طرح رکھی گئی تھی کہ گورنروں کے نام ، جو دستاویز ہدایات (Instrument of Instructions) جاری کی گئی تھیں ، ان میں یہ درج تھا کہ گورنر وزرا کا تقرر کرتے وقت ، جہاں تک ممکن ہو سکے ، اقلیتی فرقوں کے اراکین کو بھی شامل کرے گا[۱۶۹] ۔

علامہ اقبال اور ان کے ہم خیال اصحاب کی رائے یہ تھی کہ صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے اور اختیارات کی تقسیم اس طرح ہو کہ مرکز کو معدودے چند اور صوبوں کو مابقی اختیارات (Residuary Powers) ملیں ۔ اس کے برعکس ہندو نیتاؤں کا مطالبہ یہ تھا کہ مابقی اختیارات مرکز کو اور معینہ اختیارات صوبوں کو دیے جائیں ۔ قانون حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع میں ان دونوں نقاط نظر کو سمونے کی کوشش کی گئی تھی ۔ اس دستور میں اختیارات کی تین فہرستیں مرتب کی گئیں ، ایک صوبائی اختیارات کی ، دوسری مرکزی اختیارات کی اور تیسری ان اختیارات کی جو مشترکہ ہوں گے اور مابقی اختیارات گورنر جنرل کے سپرد کئے گئے تھے ۔

علامہ مرحوم کی غور کردہ رائے یہ تھی کہ پہلے صوبہ جاتی خود مختاری کا نفاذ کیا جائے اور کل ہند وفاق کی تجویز کو ختم کر دیا جائے اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر اس پر غور و خوض اس وقت تک ملتوی کر دیا جائے ، جب تک صوبوں میں مکمل صوبائی خود مختاری کا کامیاب تجربہ نہ ہو جائے ۔ لیکن برطانوی حکومت نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا ۔ صوبائی خود مختاری اور کل ہند وفاق کے منصوبوں کو ایک ساتھ مرتب و

---

۱۶۹ - قانون دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع ضمیمہ نمبر ۱ برائے باب چہارم دفعہ نمبر ۷ ۔

مدون کیا گیا اور ان دونوں کو بیک قوت دستور ہند سنہ ۱۹۳۵ء میں شامل بھی کیا گیا ۔ لیکن واقعتاً اور عملاً صرف صوبائی خود مختاری کا نفاذ ہو سکا ۔ بعد میں کچھ ایسے حالات رونما ہوئے کہ وفاقی اسکیم کو عملاً نافذ کرنے کی نوبت ہی نہ آئی ۔ اس کی حیثیت محض ایک تاریخی دستاویز (Historical Document) کی ہو کر رہ گئی اور علامہ مرحوم کا خیال ایک حقیقت بن گیا !

ڈاکٹر اقبال اور ان کے رفقائے سیاسی کے دو مطالبات کو دستور جدید میں رد کر دیا گیا تھا ۔ ایک تو یہ کہ برطانوی بلوچستان کو دیگر صوبوں کی سطح پر نہیں لایا گیا اور دوسرے یہ کہ پنجاب و بنگال کی مجالس قانون ساز میں مسلمانوں کو ان کی آبادی کے تناسب سے نشستیں نہیں دی گئیں ۔

اس تجزیہ کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال نے دستور کے سلسلہ میں مسلمانوں کے تعلق سے جس نقطۂ نظر کی وکالت کی تھی ۔ اس کو بڑی حد تک تسلیم کر لیا گیا اور جن مطالبات کو انھوں نے پیش کیا تھا ، ان میں سے بیشتر کو قبول کر لیا گیا ، بعض کو خفیف سی ترمیم کے ساتھ جزو دستور بنایا گیا اور صرف دو کو رد کر دیا گیا ۔ مسلمانوں کے جماعتی انتشار و افراتفری کے پس منظر میں ، جب ہم ان کامیابیوں و کامرانیوں پر نظر ڈالتے ہیں تو ہمیں حیرت ہوتی ہے ، لیکن یہ حیرت و استعجاب رفع ہو جاتا ہے ، جب ہم مسلم کانفرنس کی اجتماعی قوت اور علامہ اقبال کی فراست و تدبر ، سیاسی بصیرت و قیادت کو ان کے پس پشت کار فرما دیکھتے ہیں ۔

ڈاکٹر اقبال کے اس دور سیاست کا درد انگیز پہلو بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں میں کامل اتحاد ، نظم و ضبط پیدا نہ کر سکے ۔

یہ دور ، یوں تو ان کی دستوری جدوجہد و سیاسی کشمکش کا نہایت مصروف دور ہے اور اس دور میں وہ ہمیں سیاسی میدان کے اندر کافی فعال و متحرک نظر آتے ہیں ، تاہم ملت بیضا کے جماعتی انتشار و افتراق کے

اس حزنیہ نے انھیں دل شکستہ کر رکھا تھا - ۱۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۳ء کو مولانا سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں وہ لکھتے ہیں ،

" میں خود مسلمانوں کے انتشار سے بے حد درد مند ہوں اور گذشتہ پانچ چار سال کے تجربہ نے مجھے سخت افسردہ کر دیا ہے[۱۷۰] "

غالباً ملت کے اس انتشار ، اپنے دلی تکدر اور زیادہ تر اپنی گرتی ہوئی صحت اور خانگی مصائب کے باعث انھوں نے سنہ ۱۹۳۵ء کے آخر آخر میں پھر ایک مرتبہ سیاسی مشاغل سے بے تعلقی سی پیدا کر لی تھی ، لیکن بے تعلقی کا یہ دور کچھ زیادہ طویل نہ رہا ، صرف کم و بیش ایک سال ہی یہ بے اعتنائی رہی - اس کے بعد ، خانگی افکار و مصائب میں مبتلا رہنے اور پیری و بیماری کا شکار بن جانے کے باوجود ، وہ ملتِ بیضا کی نشاۃ ثانیہ کی خاطر پھر کمر کس لیتے ہیں اور سیاسی میدان میں جس طرح بھی بن پڑا اور جس حیثیت سے بھی ممکن ہو سکا ، سرگرمِ کار نظر آتے ہیں ، تا آنکہ دستِ قضا ان کو سیاسی تگ و تاز سے ہٹا کر اعلیٰ علیین میں پہنچا دیتا ہے !! ان کی اس آخری سیاسی جدوجہد کی داستان اگلے صفحات کی زینت بنے گی !

حوالہ جات باب ۵

۱- "کانگریس کی تواریخ" (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پٹابھی سیتا رامیا ص ۶۹۲ -

۲- ایضاً ص ۷۰۸ -

۳- ایضاً ص ۷۳۶ -

۴- ایضاً ص ۷۶۳ -

۵- ایضاً ص ۷۶۸ -

۶- ایضاً ص ۷۷۰ -

۷- ایضاً ص ۷۷۰ -

۸- ایضاً ص ۷۷۱ -

۹- ایضاً ص ۷۷۶ -

۱۷۰- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۶۹ -

۱۰- ایضاً ص ۷۷۶- ۱۱- ایضاً ص ۷۴۹-
۱۲- " میری کہانی " حصہ اول از جواہر لال نہرو مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ص ۳۶۰-
۱۳- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۷۴۹-
۱۴- "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح " عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۵۸ -
۱۵- ایضاً ص ۲۵۸ -
۱۶- "سیاست ملیہ" از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۲۵۱ -
۱۷- ایضاً ص ۲۵۲ -
۱۸- "فضل حسین": ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۵۸ -
۱۹- " ہندوستان کا مستقبل " از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲۲۶ -
۲۰- " سیاست ملیہ " از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ء ص ۲۵۳ -
۲۱- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۷۶۴ تا ۷۶۶ -
۲۲- اخبار " لیڈر " الہ آباد مورخہ ۳۰ اگست سنہ ۱۹۳۴ء -
۲۳- روزنامہ "انقلاب" لاہور مورخہ یکم نومبر سنہ ۱۹۳۱ء -
۲۴- اخبار " لیڈر " الہ آباد مورخہ ۳۰ اگست سنہ ۱۹۳۴ء -
۲۵- "اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال" مرتبہ شاملو مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ء ص ۴۱ -
۲۶- انڈین اینول رجسٹر جلد دوم سنہ ۱۹۳۱ء ص ۳۴۶ -
۲۷- "کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۷۹۵ و کانگریس بلیٹن نمبر ۴ مورخہ ۲۱ اگست سنہ ۱۹۳۰ء -
۲۸- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۰۹ تا ۸۱۵ -
۲۹- ایضاً ص ۸۲۲ تا ۸۲۳ -

۳۰- "کانگریس کی تواریخ" (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۵۰ -
۳۱- سیاستِ ملیہ از محمد امین زبیری مطبوعہ سنہ ۱۹۴۱ع ص ۳۰۳ -
۳۲- "پاکستان ناگزیر تھا" از حسن ریاض اشاعت دوم اگست سنہ ۱۹۷۰ع مطبوعہ کراچی ص ۱۶۷ -
۳۳- "شاہراہِ پاکستان" از چوہدری خلیق الزماں اشاعت اول اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ع مطبوعہ کراچی ص ۵۳۹ -
۳۴- ایضاً ص ۵۸۸ -
۳۵- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۳۶- ایضاً مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۳۷- ایضاً مورخہ ۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۳۸- "پاکستان" از ڈاکٹر امبیڈکر ص ۳۲۸ تا ۳۲۹ -
۳۹- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۵ مئی ۱۹۳۱ع -
۴۰- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۵۸ -
۴۱- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۲- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۳- ایضاً مورخہ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۴- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۵۶ و ۲۵۷ -
۴۵- ایضاً ص ۲۵۸ -
۴۶- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۷ مئی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۷- ایضاً مورخہ ۴ جولائی سنہ ۱۹۳۱ع -
۴۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۶۶ و ۱۶۷ -
۴۹- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۹ -
۵۰- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۰ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۵۱- ایضاً مورخہ ۸ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع -

۵۲- ایضاً مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۵۳- اقبال اور قرآن از ابو محمد مصلح ص ۱۸ -
۵۴- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۵۵ تا ۶۰ -
۵۵- سفر نامۂ اقبال مرتبہ محمد حمزہ فاروقی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۷۳ع ص ۳۱ -
۵۶- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۵۷- ایضاً مورخہ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۵۸- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۱۹۰ -
۵۹- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۷ و ۱۱۸ -
۶۰- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۱۱۹ و ۱۲۰ -
۶۱- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۴ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۶۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۸ و ۲۰۹ -
۶۳- اخبار انقلاب لاہور مورخہ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۶۴- ایضاً مورخہ ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۶۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۹ -
۶۶- ایضاً ص ۴۰ -
۶۷- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ دوم مرتبہ شیخ محمد عطاءاللہ مطبوعہ سنہ ۱۹۵۱ع ص ۳۳۸ و ۳۳۹ -
۶۸- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۰ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۶۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۴ -
۷۰- ایضاً ص ۱۴ -
۷۱- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۷۲- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، بی - اے ڈار ناشر اقبال اکادمی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۸ و ۹ -
۷۳- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۱ دسمبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۷۴- ایضاً -

۷۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۴ تا ۴۳ -
۷۶- سفر نامۂ اقبال از محمد حمزہ فاروقی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۷۳ع ص ۹۹ -
۷۷- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۱۵ نومبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۷۸- ایضاً مورخہ ۱۵ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۷۹- ایضاً مورخہ ۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع -
۸۰- ایٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی۔ اے ڈار مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۸۰ تا ۸۲ -
۸۱- سفر نامۂ اقبال از محمد حمزہ فاروقی ص ۱۶۲ -
۸۲- روز نامہ انقلاب لاہور مورخہ ۳ جنوری سنہ ۱۹۳۲ع -
۸۳- ایضاً
۸۴- سفر نامۂ اقبال از محمد حمزہ فاروقی ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ -
۸۵- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۶۹۷ -
۸۶- انڈین اینول رجسٹر جلد دوم سنہ ۱۹۳۱ع ص ۴۴۶ -
۸۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۳ و ۵۴ -
۸۸- ایضاً ص ۴۳ -
۸۹- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۴۴ -
۹۰- ایضاً ص ۵۲ و ۵۳ - ۹۱- ایضاً ص ۴۵ تا ۴۷ -
۹۲- ایضاً ص ۵۵ و ۵۶ - ۹۳- ایضاً ص ۵۶ -
۹۴- ایضاً ص ۵۷ - ۹۵- ایضاً ص ۵۸ -
۹۶- ایضاً ص ۶۰ و ۶۱ -
۹۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۹ -
۹۸- ایضاً ص ۳۱۹ و ۳۲۰ -
۹۹- روز نامہ "انقلاب" لاہور مورخہ ۲۰ اپریل سنہ ۱۹۳۲ع -

۱۰۰- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۷۴ و ص ۱۷۵ -
۱۰۱- ایضاً ص ۱۷۶ - ۱۰۲- ایضاً ص ۱۷۷ -
۱۰۳- ایضاً ص ۱۷۸ - ۱۰۴- ایضاً ص ۱۷۸ و ۱۷۹ -
۱۰۵- ایضاً ص ۱۷۹ - ۱۰۶- ایضاً ص ۱۸۰ -
۱۰۷- ایضاً ص ۱۸۳ - ۱۰۸- ایضاً ص ۱۸۲ تا ۱۸۵
۱۰۹- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۵۹ تا ۸۶۲ -
۱۱۰- ایضاً ص ۸۶۵ تا ۸۶۶ -
۱۱۱- "پاکستان" (Pakistan or Partition of India) از ڈاکٹر امبیڈکر پاکستانی ایڈیشن مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۷۶ع ص ۴۵۵ کمیونل اوارڈ کا فقرہ نمبر (۹) -
۱۱۲- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتاپھی سیتا رامیا ص ۸۶۷ تا ۸۶۸ -
۱۱۳- ایضاً ص ۸۷۰ و ۸۷۱ - ۱۱۴- ایضاً ص ۸۷۳ -
۱۱۵- ایضاً ص ۸۷۴ و ۸۷۵ -
۱۱۶- اخبار " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۱۷- " کانگریس کی تواریخ " (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا رامیا ص ۸۶۱ -
۱۱۸- ایضاً ص ۸۷۴ -
۱۱۹- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۲۰- ایضاً
۱۲۱- اخبار " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۵ ستمبر سنہ ۱۹۳۲ع ،
۱۲۲- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۲۳- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۵ و روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۲۴- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -

۱۲۵- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۶ -
۱۲۶- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۲۷- "اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۶ و ۱۸۷ -
۱۲۸- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۲۹- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۸۷ و ۱۸۸ -
۱۳۰- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۲۶ اکتوبر سنہ ۱۹۳۲ع -
۱۳۱- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۹ -
۱۳۲- پاکستان یا تقسیم ہند (Pakistan or Partion of India) از ڈاکٹر امبیڈکر مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۳۲۹ -
۱۳۳- " روز گار فقیر " جلد اول از فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم مارچ سنہ ۱۹۶۵ع ص ۱۴۲ و ۱۴۳ -
۱۳۴- " اسپیچس بائی رائٹ آنریبل جان برائٹ " ایم - پی مرتبہ جیم 'الف' تھو رولڈ روجرز مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لندن و نیو یارک سنہ ۱۸۹۲ع -
۱۳۵- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۴۱ -
۱۳۶- ایضاً ص ۴۲ -
۱۳۷- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۷۴ -
۱۳۸- " اقبال نامہ " (مکاتیب اقبال) مرتبہ شیخ عطاء اللہ حصہ اول ص ۴۴۵ تا ۴۵۰ ، حصہ دوم ص ۲۸۳ تا ۲۹۵ -
۱۳۹- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۶۹ -
۱۴۰- ایضاً ص ۶۹ و ۷۰ -
۱۴۱- " روز گار فقیر " جلد اول از فقیر سید وحید الدین مطبوعہ کراچی بار پنجم سنہ ۱۹۶۵ع ص ۱۴۲ -

۱۴۲- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی۔ اے ڈار مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۷۰ تا ۷۶ -
۱۴۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۱ -
۱۴۴- روز نامہ " انقلاب " لاہور مورخہ ۲۷ فروری سنہ ۱۹۳۳ع -
۱۴۵- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو مطبوعہ ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۸۸ -
۱۴۶- ایضاً ص ۱۹۱ و ۱۹۲ -
۱۴۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۸۰ -
۱۴۸- ایضاً ص ۲۸۰ -
۱۴۹- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۳ -
۱۵۰- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۲۸۱ -
۱۵۱- ایضاً ص ۲۸۲ - ۱۵۲- ایضاً ص ۲۸۵ -
۱۵۳- ایضاً ص ۲۸۳ و ۲۸۴ - ۱۵۴- ایضاً ص ۲۸۵ -
۱۵۵- ایضاً ص ۲۸۲ - ۱۵۶- ایضاً ص ۲۸۳ -
۱۵۷- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۳ -
۱۵۸- ایضاً ص ۲۱۳ -
۱۵۹- " اقبال نامہ " (مکاتیب اقبال) حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ سنہ ۱۹۵۱ع ص ۲۸۹ -
۱۶۰- اخبار " انقلاب " لاہور مورخہ ۱۸ جولائی سنہ ۱۹۳۵ع -
۱۶۱- رپورٹ : بریف نوٹ آن ایڈمنسٹریشن آف جموں اینڈ کشمیر بابتہ ۱۹۳۱ع -
۱۶۲- " اقبال نامہ " (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاءاللہ خطوط بنام نعیم الحق ایڈوکیٹ ص ۲۹۴ تا ۲۴۲ -
۱۶۳- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس" آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۰ تا ۵۲ -
۱۶۴- ایضاً ص ۱۹۶ و ۱۹۷ - ۱۶۵- ایضاً ص ۱۹۷ تا ۲۰۰ -

۱۶۶- ایضاً ص ۲۰۰ تا ۲۰۱ -

۱۶۷- گلانسی کمیشن کی رپورٹ ص ۵۱ -

۱۶۸- " اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس " آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۰۱ و ۲۰۲ -

۱۶۹- قانون دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء ضمیمہ نمبر (۱) برائے باب چہارم دفعہ نمبر (۷) -

۱۷۰- " اقبال نامہ " (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۶۹ -

باب ٦

سیاست کی تنگنائیوں میں اقبال کی بانگ درا

پس منظر | اس باب میں اقبال کی سیاسی زندگی کے تیسرے اور آخری دور یعنی ۱۹۳۶ع تا اپریل ۱۹۳۸ع کے حالات بیان کرنے ہیں ۔ گذشتہ باب میں ہم بتا چکے ہیں کہ ۱۹۳۵ع میں مسلم کانفرنس سیاسی منظر سے غائب ہو چکی تھی اور اس سے قبل ہی مجلس خلافت کا خاتمہ ہو چکا تھا ۔ تاہم مسلمانوں کی مختلف جماعتیں موجود تھیں ۔ یہ بھی بیان کیا جا چکا ہے کہ مارچ ۱۹۳۴ع میں مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے دونوں گروہوں کو ملا دیا تھا اور اس کے بعد سے وہ اس کے احیاء کی کوشش کرتے رہے ۔ اس طرح ان کی مسیحا نفسی سے بیمار لیگ نے پھر سنبھالا لیا تھا ۔ گویا اس دور کے آغاز میں مسلم لیگ پھر سیاسی منظر پر ابھر رہی تھی اور مسلمانوں کی دیگر جماعتیں مثلاً مسلم یونٹی بورڈ ، جمعیۃ العلماء ہند (جن کا تذکرہ گذشتہ باب میں آ چکا ہے) مجلس احرار ، اتحاد ملت وغیرہ (جن کا تعارف آئندہ صفحات میں کرایا جائے گا) موجود تھیں ۔

۱۹۳۶ع میں جدید دستور کے تحت ، عام انتخابات کا زمانہ قریب آ رہا تھا ۔ اس زمانہ میں مسٹر جناح نے بحیثیت صدر مسلم لیگ اس امر کی کوشش کی کہ ان انتخابات میں مسلمان ایک متحدہ جماعت کی حیثیت سے حصہ لیں ۔ چنانچہ فروری ۱۹۳۶ع میں انھوں نے دہلی میں مسلم یونٹی بورڈ سے مصالحت کی کوشش کی اور یہ کوشش کامیاب رہی[1] ۔ جس کے بعد

---

۱ ۔ "شاہراہ پاکستان" از چودھری خلیق الزمان ۔ اشاعت اول ۔ اکتوبر ۱۹۶۷ع مطبوعہ کراچی ۔ ص ۶۰۱ و ۶۰۲ ۔

مسلم یونٹی بورڈ عملاً ختم ہو گیا - اپریل ۱۹۳۶ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد ہوا ، جس میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے نمائندے شریک ہوئے - اس اجلاس میں یہ طے پایا کہ جدید دستور کی صوبجاتی اسکیم سے جتنا زیادہ فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے ، اٹھایا جائے - صوبائی انتخابات میں حصہ لیا جائے اور اس غرض کے پیش نظر مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کیا جائے - مسٹر جناح کو اس بورڈ کا صدر منتخب کیا گیا اور انہیں اختیار دیا گیا کہ مختلف جماعتوں کے سرکردہ لیڈروں سے صلاح مشورہ کے بعد وہ اس بورڈ کے اراکین نامزد کریں اور مختلف صوبوں میں اس کی شاخیں قائم کریں -

اس زمانہ میں ابھی تک مسلمانوں کے تمام مکاتیبِ خیال اور مختلف جماعتوں میں پوری طرح اتفاق پیدا نہیں ہوا تھا - چنانچہ ان سب کو ایک ہی نقطۂ نظر پر جمع کرنے کے لئے ، مسٹر جناح نے پورے ملک میں دورے کئے ، مگر انہیں ناکامی ہوئی ، پھر بھی مسٹر جناح نے ہمت نہیں ہاری - وہ مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کی طرف سے انتخابات لڑنے کے فیصلے پر قائم رہے ، اپنا ایک انتخابی منشور شائع کیا اور ہر صوبہ میں مسلم نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کئے ، لیکن انتخابات کے نتائج مسلم لیگ کے لیے کچھ زیادہ حوصلہ افزا نہیں رہے - بعض مسلم اقلیتی صوبوں مثلاً بمبئی ، مدراس اور یو پی میں تو اس کو اچھی خاصی کامیابی حاصل ہوئی ، لیکن مسلم اکثریت کے صوبوں یعنی بنگال ، پنجاب ، سندھ اور سرحد میں مسلم لیگ کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا - بنگال میں کل مسلم نشستوں کی تعداد (۱۱۷) تھی ، جس میں سے مسلم لیگ کے ٹکٹ پر چالیس (۴۰) امیدوار کامیاب ہوئے - پنجاب میں چھیاسی مسلم نشستیں تھیں ، لیکن مسلم لیگ کے صرف دو امیداور کامیاب ہوئے - صوبہ سرحد اور سندھ کی تمام مسلم نشستیں غیر لیگیوں کے قبضہ میں چلی گئیں - بہار ، صوبہ متوسط (سی پی) آسام اور اڑیسہ جیسے مسلم اقلیتی ، صوبوں میں لیگ کا ایک بھی امیدوار کامیاب نہ ہوا -

کانگریس کے بھی ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں حصہ لینے کا فیصلہ کیا اور غیر مسلم نشستوں اور مسلم نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کیے - کانگریس کو

سات صوبوں یعنی مدراس ، یو پی ، سی پی ، بہار ، اڑیسہ ، آسام اور بمبئی میں اکثریت حاصل ہوئی ۔ واضح رہے کہ یہ سات صوبے ہندو اکثریت کے صوبے تھے اور مسلمان یہاں اقلیت میں تھے ۔ مسلم لیگ کے مقابلہ میں کانگریس کی یہ کامیابی واقعی شاندار تھی ، لیکن جہاں تک مسلم نشستوں کا تعلق تھا ، کانگریس کو بھی سخت مایوسی سے دو چار ہونا پڑا ۔ مسلم اکثریت کے صوبے چار تھے ۔ (۱) پنجاب (۲) بنگال (۳) سندھ اور (۴) سرحد پنجاب میں کانگریس کے اٹھارہ امیدوار منتخب ہوئے ۔ جن میں سے صرف دو مسلمان تھے ۔ بنگال کی مقننہ میں (۵۴) کانگریسی منتخب ہوئے ، لیکن ان میں کوئی مسلمان نہ تھا ۔ سندھ کی تیرہ نشستوں پر کانگریسیوں نے قبضہ کیا ، ان میں بھی کوئی مسلمان نہ تھا ۔ سرحد کی صورت حال کانگریسی نقطۂ نظر سے قدرے بہتر تھی ۔ یہاں کے ایوان مقننہ میں کل پچاس نشستیں تھیں ، جن میں سے انیس (۱۹) پر کانگریسیوں نے قبضہ کیا ۔ ان انیس کانگریسیوں میں سے البتہ (۱۵) مسلمان تھے ۔ پھر بھی یہاں کانگریس اقلیت میں تھی ۔ یہ تو تھا مسلم اکثریتی صوبوں میں کانگریس کا حال ۔ اب ذرا مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلم نشستوں کے تعلق سے کانگریس کی کیفیت ملاحظہ کیجئے ۔ مسلم اقلیت کے صوبے سات تھے ۔

(۱) مدراس ۔ یہاں مسلمانوں کی نشستیں انتیس (۲۹) تھیں ۔ جن میں سے صرف چار کانگریس کے حصہ میں آئیں ۔

(۲) بہار ۔ یہاں کل مسلم نشستیں چالیس (۴۰) تھیں ، جن میں سے صرف چار پر کانگریس کا قبضہ ہو سکا ۔

(۳) صوبہ متوسط (سی پی) ۔ مسلم نشستوں کی تعداد چودہ (۱۴) تھی ، لیکن کانگریس کو ایک نشست بھی نہیں ملی ۔

(۴) صوبہ جات متحدہ (یو پی) ۔ یہاں مسلمانوں کی نشستیں چھیاسٹھ (۶۶) تھیں ، مگر کانگریس ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکی ۔

(۵) بمبئی ۔ یہاں کل مسلم نشستیں تیس (۳۰) تھیں مگر کوئی نشست کانگریس کے ہاتھ نہ لگی ۔

(۶) آسام - یہاں کی مقننہ میں مسلمانوں کی چونتیس (۳۴) نشستیں تھیں لیکن کانگریس ایک نشست بھی حاصل نہ کر سکی -

(۷) اڑیسہ - یہاں مسلم نشستوں کی تعداد چار (۴) تھی ، مگر کانگریس کو ان چاروں نشستوں سے ہاتھ دھونا پڑا -

اس طرح کانگریس بحیثیت مجموعی مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام رہی - اس کو مسلم اکثریت کے صوبوں (باستثنائے سرحد) اور مسلم اقلیت کے صوبوں میں مسلمانوں کی نمائندگی کے تعلق سے کھلی ہوئی شکست ہوئی ! ! برطانوی ہند کے تمام صوبوں کی مسلم نشستوں کو شمار کیا جائے تو ان کی تعداد پانچ سو بتی تھی ، ان میں سے صرف پچیس نشستوں پر کانگریس قبضہ کر سکی تھی - پھر ان پچیس نشستوں میں سے بھی پندرہ نشستیں تو اکیلے صرف صوبہ سرحد کی تھیں - گویا باستثناء صوبہ سرحد پورے برصغیر میں صرف دس مسلم اراکین مقننہ کانگریس کے حامی تھے ! ! اس طرح کانگریس کا یہ دعویٰ کہ وہ ہندو اور مسلمان دونوں کی نمائندہ ایک " قومی جماعت" ہے باطل ثابت ہوا - سات صوبوں میں اس نے جو اکثریت حاصل کی تھی ، وہ ہندوؤں کے بل بوتے پر تھی ، کیونکہ یہ سات صوبے ہندو اکثریت کے صوبے تھے - اس کی یہ جیت اس لحاظ سے تو یقیناً شاندار تھی کہ وہ ان صوبوں میں مضبوط وزارتیں قائم کر سکتی تھی اور صوبائی خود مختاری کے تحت دیئے گئے اختیارات سے پورا پورا فائدہ اٹھا سکتی تھی ، تاہم اس کی یہ جیت اس کے قومی جماعت ہونے کے بلند بانگ دعووں کی آئینہ دار نہ تھی - مسلم نشستوں کے تعلق سے ، انتخابات کے نتائج نے اس کے اس بھرم کی قلعی کھول دی تھی - واضح رہے کہ مسلمانوں کے اندر کانگریس کی مقبولیت کا یہ عالم اس وقت تھا جب کہ ملت کی صفوں میں انتشار تھا اور مسلم لیگ کو مرکزیت حاصل نہیں ہوئی تھی - یہ صورت حال کانگریس کے نیتاؤں کے لیے فکر و تردد کا باعث بن گئی - پنڈت جواہر لال نہرو اس زمانہ میں کانگریس کے صدر تھے ، انہوں نے بتاریخ ۱۹ مارچ ۱۹۳۷ء دہلی میں ایک کل ہند قومی کنونشن (All India National Convention) طلب کیا ، جس میں کانگریس کے

ٹکٹ پر منتخب شدہ صوبائی اسمبلیوں کے آٹھ سو اراکین مدعو کیے گئے تھے۔ اس کنونشن میں پنڈت جی نے ایک طویل تقریر کی۔ مسلمانوں کی نمائندگی سے کانگریس کو جو دھچکا لگا تھا اس کا بطور خاص ذکر کرتے ہوئے انھوں نے اعتراف کیا کہ

"الیکشن میں ہمیں (یعنی کانگریس کو) ناکامی کا سامنا ہوا ہے اور ہم (یعنی کانگریسی) مسلمانوں کے حلقوں میں سے اپنے امیدوار منتخب نہیں کرا سکے ہیں[۲]۔

اس ناکامی کی وجہ ان کے اپنے الفاظ میں یہ تھی

"ہم لوگ (یعنی کانگریسی) مدت تک اس وہم میں مبتلا رہے کہ "فرقہ پرست لیڈروں" سے مفاہمت یا سمجھوتہ کرنے سے مسائل کا تصفیہ ہو جائے گا۔ اس چکر میں پڑ کر ہم نے "عوام" کو نظر انداز کیے رکھا[۳]"۔

پھر انھوں نے اعلان کیا کہ

"یہ طرز عمل غلط اور یہ پالیسی بے کار تھی۔ آئندہ ہم کبھی اس طرف رجوع نہیں کریں گے۔ تعجب ہے کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمانوں کو ایک الگ گروہ تصور کر کے ہندوؤں سے سمجھوتہ کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ یہ انداز فکر قرون وسطیٰ میں رائج ہو تو ہو، موجودہ زمانہ میں اسے کوئی نہیں پوچھتا[۴]"۔

پھر انھوں نے اپنے مخصوص اشترا کی نقطۂ نظر سے ہندو، مسلم، سکھ عیسائی عوام کی حالت کا تجزیہ کرتے ہوئے بتایا کہ ان کا اصلی مسئلہ روٹی کا ہے اور آخر میں مسلمانوں کے تعلق سے کانگریس کی انتخابات میں ناکامی کا علاج یہ تجویز کیا کہ

۲۔ "انڈین اینویل" رجسٹر۔ ۱۹۳۷ء۔ جلد اول۔
۳۔ "انڈین اینویل" رجسٹر۔ ۱۹۳۷ء۔ جلد اول۔
۴۔ "انڈین اینویل" رجسٹر۔ ۱۹۳۷ء۔ جلد اول۔

" لیڈروں (یعنی مسلم لیڈروں) کو نظر انداز کر کے براہ راست عوام سے ربط ضبط پیدا کیا جائے .... اب ہمارا کام یہ ہے کہ مسلم عوام اور ان کے پڑھے لکھے لوگوں کو اپنی جماعت میں شامل کر کے ملک کو ہر نوع کی فرقہ پرستی سے پاک کر دیں[۵]"۔

پنڈت جی نے نہ صرف یہ تجویز کل ہند قومی کنونشن میں پیش کی ، بلکہ اس پر عمل درآمد کے لیے کانگریس کی طرف سے ایک باضابطہ مہم شروع کی اور اس مہم کو تحریک رابطۂ مسلم عوام (Muslim Mass Contact Movement) کا نام دیا ۔ کانگریس سکرٹریٹ میں شعبۂ اسلام کے نام سے ایک علیحدہ محکمہ قائم کیا اور ایک مسلمان کانگریسی ڈاکٹر اشرف کو اس کا انچارج بنایا ، کانگریس ہائی کمان اور پنڈت جواہر لال نہرو کی زیر ہدایت ، اس محکمہ نے ایک " مسلمان " کی سرکردگی میں بڑے زور و شور سے کام شروع کیا اور مسلم عوام کو کانگریس کی طرف مائل کرنے کے لیے معاشی مسائل کو بڑی بلند آہنگی سے پیش کیا اور خود پنڈت جی بھی اس زمانہ میں اپنی تقریروں میں اشتراکی پروگرام پر بے حد زور دینے لگے کیونکہ ان کے نقطۂ نظر سے "مسلم عوام" کو کانگریس کی طرف راغب کرنے کا یہی ایک پر کشش طریقہ تھا یوں جواہر لال کے زرخیز دماغ نے " مسلمان فرقہ پرست لیڈروں " کے "چکر" سے کانگریس کو نکالنے اور مسلم عوام کو اس کا ترنوالہ بنانے کا ایک کارگر حربہ دریافت کر لیا اور بڑے جوش و خروش سے انھوں نے اس کو استعمال بھی کرنا شروع کر دیا ! " رابطہ مسلم عوام " کی یہ مہم کوئی معمولی تحریک نہ تھی بلکہ اپنے عواقب و نتائج اور مضمرات کے اعتبار سے برصغیر کی ملتِ اسلامیہ کے سیاسی وجود کو نیست و نابود کرنے کا یہ "جواہری" نسخہ تھا ! !

قانونِ حکومتِ ہند ۱۹۳۵ء کے تحت پہلے انتخابات کے بعد مسلمانوں کی صفوں میں در آنے اور انہیں ہضم کر جانے کی کانگریس نے ایک طرف

۵- "انڈین اینویل" رجسٹر - ۱۹۳۷ء - جلد اول ۔

تو یہ کوشش کی اور دوسری طرف سات صوبوں میں اپنی اکثریت سے فائدہ اٹھا کر وائسرائے اور انگریزی حکومت پر پورا پورا دباؤ ڈالنے میں اس نے کوئی کسر اٹھا نہ رکھی۔ کانگریس نے یہ اعلان کر دیا کہ صوبوں میں اس وقت وزارتیں بنائے گی، جب کہ گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو عملاً استعمال میں نہیں لائیں گے۔ واضح رہے کہ مسٹر جناح کے چودہ نکات میں ایک نکتہ یہ تھا کہ صوبوں کی کابینہ میں مسلمانوں کو مناسب نمائندگی دی جائے۔ یہ گویا مسلمانوں کا متفقہ مطالبہ تھا اور اس کی معقولیت سے برطانوی حکومت نے انکار نہیں کیا تھا، لیکن اس نے اس معقول اور متفقہ مطالبہ کو تسلیم کرنے اور واضح طور پر اس کو دستور کا جزو بنانے کی بجائے اس کی گنجائش اس طرح نکالی تھی کہ اس کو گورنروں کے نام دستاویز ہدایات (Instrument of Instruction) میں شامل کر دیا تھا [۶]۔ اس کی وضاحت ہم سابقہ صفحات میں کر آئے ہیں۔ گویا صوبائی کابینہ میں مسلم نمائندگی کا مسئلہ گورنروں کے اختیارات خصوصی میں داخل تھا اور اب کانگریس کی بالک ہٹ یہ تھی کہ وہ سات صوبوں میں وزارت کی گدی اسی صورت میں سنبھالے گی، جب گورنر اپنے اختیارات خصوصی سے دستبردار ہو جائیں گے۔ بالفاظ دیگر کانگریس کی اس ضد کا اثر براہ راست مسلمانوں کے اس متفقہ اور معقول مطالبہ پر پڑ رہا تھا۔ یوں تو یہ کانگریس کی سراسر ہٹ دھرمی تھی، مگر اسی ہٹ دھرمی کو کامیابی حاصل ہوئی۔ وائسرائے لارڈ لن لتھگو اور کانگریس کے درمیان اس مسئلہ پر طول طویل مذاکرات ہوئے۔ بالآخر مہاتما گاندھی، کانگریس اور وائسرائے کے مابین ایک "شریفانہ معاہدہ" (Gentleman's Agreement) طے پا گیا۔ وائسرائے نے کانگریس کو یقین دلا دیا کہ صوبوں کے گورنر اپنے اختیارات خصوصی کو سوائے خاص، خاص صورتوں کے عملاً استعمال نہیں کریں گے۔ اس طرح بالک ہٹ نے راج ہٹ کو اور ہٹ دھرمی نے معقولیت کو نیچا دکھایا! اس "شریفانہ معاہدہ" کے بعد جولائی ۱۹۳۷ء

۶۔ "قانون دستور حکومت ہند" بابتہ ۱۹۳۵ء۔ ضمیمہ نمبر ۱ برائے باب چہارم دفعہ نمبر ۷۔

میں عارضی وزارتیں جو کانگریس کی طرف سے وزارتیں بنانے سے انکار کرنے پر بنائی گئی تھیں ، ہٹا دی گئیں اور ان کی جگہ کانگریسی وزارتوں نے لے لی - ان وزارتوں میں مسلم لیگ کے کسی نمائندے کو نہیں لیا گیا ، حالانکہ کانگریسی اکثریت کے بیشتر صوبوں میں مسلم لیگ ہی مسلم اقلیت کی نمائندہ جماعت تھی اور از روئے دستاویز ہدایات کابینہ میں اقلیت کی نمائندگی لازمی تھی ! مگر گورنر تو " شریفانہ معاہدہ" میں جکڑا ہوا تھا اور کانگریس کی بالک ہٹ اب راج ہٹ میں تبدیل ہو چکی تھی ! کانگریس نے اقتدار کے نشہ میں چور ہو کر یہ اعلان کر دیا کہ وہ کسی دوسری جماعت کو ساتھ لے کر مخلوط وزارتیں نہیں بنائے گی اور یہ بھی کہ اقلیتوں کے نمائندے تو صرف اسی صورت میں اس کی وزارتوں میں بار پا سکیں گے جب کہ وہ اس کے عہد نامے (Pledge) پر دستخط کر کے اپنے ذہن و دماغ کو اس کے ہاتھ گروی کر دیں ! چنانچہ ہوا بھی یہی ! ! کانگریس کی فرعونیت سے مسلمانوں کو بڑا دہچکا لگا - تاہم اس طرح چھ صوبوں میں کانگریسی وزارتیں بڑے طمطراق کے ساتھ قائم ہوئیں اس کے بعد کانگریس ہائی کمان ہی نے یہ مہم شروع کی کہ بقیہ پانچ صوبوں میں مخلوط وزارتیں بنائی جائیں - کانگریس کی یہ پالیسی دو عملی کا شاہکار تھی ! مسلم اقلیتی صوبوں میں تو مسلم لیگ کے نمائندوں کو وزارت میں شامل کرنے سے اس بنا پر انکار کر دیا گیا تھا کہ کانگریس مخلوط وزارتوں کی اصولاً مخالف ہے اور مسلم اکثریت کے صوبوں میں اس اصول کو بالائے طاق رکھ کر ، جوڑ توڑ کے ذریعہ مخلوط وزارتوں کے قیام کے لیے دوڑ دھوپ کی جانے لگی اور یہ "نیک کام" مولانا آزاد کے سپرد کیا گیا ! اس دوڑ دھوپ کا نتیجہ یہ نکلا کہ آسام میں ہندو وزارت برسر اقتدار آ گئی ، سرحد میں کانگریسی وزارت قائم ہو گئی اور سندھ کی وزارت بھی کانگریس کے زیر اثر آ گئی البتہ پنجاب میں سر سکندر اور بنگال میں فضل الحق نے اپنی مشترکہ وزارتوں کو برقرار رکھا -

کانگریس کی اس ہٹ دھرمی اور " رابطۂ مسلم عوام " کی نہروانی تحریک نے جہاں عامۃ المسلمین کے سیاسی شعور پر تازیانہ کا کام کیا ، وہاں ان کے قائدین کی آنکھوں پر پڑے ہوئے پردوں کو بھی چاک کر

دیا ۔ عام مسلمانوں نے یہ محسوس کیا کہ اگر وہ ایک مرکز پر جمع نہ ہوئے تو کانگریسی سیلاب انہیں تنکوں کی طرح بہا کر لے جائے گا اور مسلم قائدین خصوصاً مسلم اکثریتی صوبوں کے قائدین ، جو اب تک اپنے اپنے صوبوں میں الگ الگ قلعہ بندیاں کیے بیٹھے تھے ، یہ سمجھنے لگے کہ کانگریس کا یہ طوفان ان کے قلعوں کی اینٹ سے اینٹ بجا دے گا ۔ وہ جناح کی سیاست کے دل ہی دل میں قائل ہو گئے ، جو انتخابات سے پہلے تمام مسلمانوں کو ایک جھنڈے تلے جمع کرنے کے لیے ، باوجود پیرانہ سالی کے شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک بھاگا بھاگا پھر رہا تھا ! یہ حالات اور یہ فضا تھی جب اکتوبر ۱۹۳۷ء میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمقام لکھنؤ مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس کی تین باتیں اہم تھیں ۔ ایک تو یہ کہ "ہندوستان میں آزاد وفاقی جمہوری ریاستوں کا قیام" اس کا نصب العین قرار پایا ۔ دوسرے یہ کہ اسی اجلاس میں وہ تمام جماعتیں جو پارلیمانی بورڈ کے قیام کے وقت لیگ کی مخالف تھیں ، اب لیگ میں شامل ہو گئیں ۔ تیسرے یہ کہ اسی اجلاس میں سر سکندر نے اپنی جانب سے وہ اعلان کیا جو آئندہ چل کر "سکندر جناح میثاق" کے نام سے مشہور ہوا ، گو اس میثاق کی بعض شقیں ما بہ النزاع بنیں لیکن اس میثاق یا اعلان کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ سر سکندر نے جناح کو اپنا قائد اور مسلم لیگ کو مسلمانانِ ہند کی قومی جماعت تسلیم کر لیا ۔ یوں اب مسلمان ایک مرکز پر جمع ہوئے اور ایک قیادت کے ماتحت آ گئے ، البتہ نیشنلسٹ مسلمان اور اہل جمعیۃ العلماء دہلی ، ملت سے کٹ کر کانگریس کا ساتھ اب بھی دیتے رہے !

مسٹر جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں جو خطبہ دیا تھا ، اس کو پڑھ کر گاندھی جی نے ان سے مراسلت کی ۔ پھر اسی زمانہ میں صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی مسٹر جناح سے فرقہ وارانہ مسائل پر خط و کتابت شروع کی ، حالانکہ ابھی کچھ عرصہ قبل دہلی کے نام نہاد کل ہند قومی کنونشن میں انہوں نے "فرقہ پرست لیڈروں" سے بات چیت کرنے کو ایک قسم کا "وہمی چکر" اور ان سے "مفاہمت یا سمجھوتہ" کر کے "فرقہ وارانہ مسائل" کا تصفیہ کرنے کو "غلط طرز عمل"

اور "فرسودہ پالیسی" قرار دیا تھا! نشۂ اقتدار سے بدمست ہو جانے کے باوجود، کانگریس کے کرتا دھرتا مہاتما اور جوشیلے نیتا جواہر لال کا اس طرح اپنے بلند بانگ دعوؤں کے علی الرغم مسٹر جناح جیسے "فرقہ پرست لیڈر" سے رجوع کرنا، بظاہر بو العجبی سی معلوم ہوتی ہے، لیکن حقیقت میں یہ کرشمہ تھا مسلمانوں کی مرکزیت، اتحاد اور نظم و ضبط کا! اسی اتحاد اور نظم و ضبط نے گاندھی جی کی "روحانیت" کو بے قرار اور نہرو کے "جوش" کو ٹھنڈا اور ان کی "تحریک رابطۂ مسلم عوام" کو نڈھال اور بالآخر ناکام بنا دیا تھا! جبھی تو انھوں نے مسلم لیگ جیسی فرقہ پرست جماعت کے قائد جناح سے سلسلہ جنبانی کی مگر نتیجہ؟ وہی ڈھاک کے تین پات! مسلمانوں کی مرکزیت نے کانگریس کو چونکا تو ضرور دیا تھا مگر اس کا نشہ ابھی ہرن نہ ہو پایا تھا۔ قومی جماعت ہونے کا جھوٹا وقار اس کے آڑے آیا اور اس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ گویا وہ اپنے مقام سے واقعتاً نیچے تو آ گری مگر اس نے اپنی ٹانگ پھر بھی اوپر ہی رکھی! ! ۔ یوں ہندو مسلم قضیہ کا پرنالہ جہاں گرتا تھا کانگریسی ضد کے باعث بدستور وہیں گرتا رہا!!

۱۹۳۶ء سے مئی ۱۹۳۸ء تک برصغیر ہند کے اندر یہ سیاسی حالات رونما ہوئے۔ آئیے اب ہم یہ دیکھیں کہ علامہ اقبال نے یہ شب و روز کن سیاسی گتھیوں کو سلجھانے میں بسر کیے۔

علامہ اقبال کی علالت

جنوری ۱۹۳۴ء ہی سے علامہ اقبال کی علالت کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ ڈاکٹروں کی تشخیص یہ تھی کہ ان کے قلب پر رسولی بن رہی ہے۔ حکیم نابینا صاحب کا علاج کیا گیا اور اس سے فائدہ بھی ہوا لیکن ان کی آواز بیٹھ گئی۔ مئی ۱۹۳۵ء میں علامہ کی رفیقۂ حیات والدۂ جاوید کا انتقال ہو گیا[۷]۔ اس سال انھوں نے بھوپال میں اپنی آواز کا بنفشی شعاعوں کے ذریعہ علاج کروایا لیکن اس سے فائدہ نہیں

۷۔ "اقبال نامہ" حصہ اول (مکاتیب اقبال)۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور، ص ۳۶۱۔

ہوا ۔ اس زمانہ میں ان کی عام صحت اچھی رہی لیکن کمزوری بڑھ گئی ۔ ۱۹۳۶ء کی گرمیوں میں ان کی صحت گرنے لگی یہاں تک کہ ان سے دو چار قدم چلنا بھی دشوار ہو گیا ۔ ۱۹۳۷ء کے اختتام تک ان کی یہی حالت رہی ۔ ۱۹۳۸ء کے آغاز میں ان پر ضیق النفس کے دورے پڑنے لگے بے خوابی شروع ہو گئی اور قلب کمزور ہو گیا بالآخر ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء شاعر اعظم ، رب اعلیٰ کے حضور پہنچ گیا ۔ انا للہ و انا الیہ راجعون

زیر تبصرہ دور (یعنی ۱۹۳۶ء تا اپریل ۱۹۳۸ء) ان کی علالت اور ضعیفی کا دور ہے لیکن اس کے باوجود وفات تک سیاسیات سے ان کا شغف باقی رہتا ہے ۔ چونکہ یہ دور بڑھاپے ، مصائب اور علالت کا دور ہے اس لیے اس زمانہ میں علامہ کی سیاسی جدوجہد نمایاں ہو کر عوام کے سامنے نہیں آئی لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ نے اپنی کبر سنی اور طویل علالت کے باوجود بستر بیماری پر لیٹے لیٹے ہی اس ملک اور مسلمانوں کے مستقبل کی تاریخ سازی میں جو کام انجام دیا ہے اس کو اس برصغیر کے مسلمانوں کی تاریخ کا لکھنے والا نظر انداز نہیں کر سکتا ۔ اس دور میں علامہ اقبال کی سیاسی سرگزشت کے دو پہلو ہیں ۔ ایک کا تعلق کل ہند سیاست سے ہے اور دوسرے کا صرف صوبہ پنجاب سے ۔ پہلے ہم کل ہند سیاست سے متعلق ان کی سرگرمیوں کو بیان کریں گے ، بعد میں پنجابی سیاست کا ذکر کیا جائے گا ۔

اتحاد ملی کی کوشش !
کل ہند مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ میں علامہ کی شرکت

۱۹۳۵ء میں جدید دستور نافذ ہو چکا تھا اور اس کے تحت ۱۹۳۶ء میں صوبائی انتخابات ہونے والے تھے ۔ مگر اس زمانہ میں مسلمانوں کے اندر عجیب و غریب قسم کی افراتفری پھیلی ہوئی تھی ۔ اول تو ان کی کوئی واحد نمائندہ کل ہند سیاسی تنظیم نہیں تھی ۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا جا چکا ہے ، مسلم لیگ ، مسلم نیشنلسٹ پارٹی ، مسلم یونٹی بورڈ ، جمیعۃ العلماء ، مجلس اتحاد ملت ، احرار پارٹی وغیرہ ـــــ ان مختلف سیاسی ٹولیوں اور گروہوں میں مسلمان بٹے ہوئے تھے ۔ اس کے علاوہ اس زمانے میں عوام کے اندر تو نہیں ، البتہ مسلم قائدین میں بد بختی سے

صوبائیت یا علاقہ واریت کا رجحان نمودار ہوا ـــــ یوں تو یہ افسوس ناک رجحان سبھی صوبوں میں پیدا ہوا ، لیکن مسلم اکثریتی صوبوں کے قائدین اس رجحان کو پیدا کرنے اور اس کو ترقی دینے میں آگے آگے تھے ۔ اس رجحان کا خطرناک پہلو یہ تھا کہ اس پر فرقہ وارانہ یا نیشنلزم (قوم پرستی) کا نقاب ڈالنے کی کوشش کی گئی تھی ! دراصل اس خطرناک رحجان کی جڑ صوبائی خود مختاری کا وہ ڈھانچہ تھا ، جو ۱۹۳۵ع کے دستور کے تحت بنایا گیا تھا ۔ اس دستور کے تحت جو اختیارات صوبوں کو دئیے گئے تھے ، وہ کافی اہم اور سابقہ دستور ۱۹۱۹ع کے مقابلہ میں نسبةً زیادہ تھے ۔ پھر ایک یا دو وزیروں کو ، گورنر مقرر کرنے والا نہ تھا بلکہ صوبائی مقننہ کی اکثریتی جماعت کے قائد کو اپنی پوری وزارت ترتیب دینے کا اختیار تھا اور یہ وزارت صوبائی مقننہ کے سامنے جواب دہ تھی ۔ وزارتی امور کی انجام دہی کے سلسلہ میں گورنر سوائے دستاویز ہدایت میں درج شدہ معاملات کے کسی قسم کی مداخلت نہیں کر سکتا تھا ۔ گویا وزارت کو بڑی حد تک آزادی حاصل تھی کہ وہ اکثریت کے اعتماد کو بحال رکھتے ہوئے اپنے صوابدید کے مطابق کام کرے اور ادہر مرکز یعنی وائسرائے و گورنر جنرل بھی ان کے کاموں میں مداخلت نہیں کر سکتا تھا ۔ الغرض صوبائی خود مختاری کی یہ وہ چند اہم اور نمایاں خصوصیات تھیں ، جن میں صوبوں کے سیاسی قائدین کشش محسوس کرتے تھے ، لیکن ان قائدین کے لیے بعض دشواریاں بھی تھیں جن میں سب سے بڑی دشواری صوبائی مقننہ کے اعتماد کو بحال رکھنا تھا ۔ مسلم اکثریت کے چار صوبے ، پنجاب ، بنگال ، سندھ اور سرحد تھے ۔ بلوچستان میں ابھی اصلاحات کا نفاذ نہیں ہوا تھا ۔ ان چار صوبوں میں سے دو صوبے بڑے تھے یعنی پنجاب اور بنگال ، اور یہاں صورت حال یہ تھی کہ مسلمان اپنی اکثریت کے بل بوتے پر وزارت نہیں بنا سکتے تھے ۔ بنگال کی صوبائی مقننہ میں کل نشستیں دو سو پچاس (۲۵۰) تھیں جن میں مسلمانوں کو ایک سو انیس (۱۱۹) نشستیں ملی تھیں ۔ اسی (۸۰) نشستیں ہندوؤں کی تھیں ۔ مابقی اکیاون نشستیں اینگلو انڈین یوروپین اور دیگر مفادات مثلاً اہل صنعت و حرفت ، زمینداروں وغیرہ میں تقسیم کر دی گئی تھیں ۔ اس طرح دو سو پچاس کے ایوان میں ایک

سو الیس مسلمانوں کی ، ہندوؤں کے مقابلہ میں تو اکثریت بن جاتی تھی ، لیکن یہ اکثریت ایسی نہ تھی کہ صرف مسلمانوں کی عددی قوت کے بل پر وزارت بنائی جا سکتی ، کیونکہ ان کے مقابلہ میں ہندو ، یورپین ، اینگلو انڈین اور دیگر مفادات کے ساتھ مل کر مشترکہ محاذ بناتے تو یہ تعداد ایک سو اکتیس ہو جاتی تھی ۔ ایسی صورت میں خالص مسلم وزارت کا ٹوٹ جانا لازمی تھا ۔ قریب قریب یہی صورت حال پنجاب کی تھی ۔ یہاں مقننہ کی کل نشستیں ایک سو پچھتر (۱۷۵) تھیں ، جن میں سے مسلمانوں کو چھیاسی (۸۵) اور ہندوؤں کو تینتالیس (۴۳) نشستیں ملی تھیں ۔ سکھوں کی بتیس (۳۲) نشستیں تھیں ۔ باقی ۱۴ نشستیں عیسائیوں ، اینگلو انڈین و دیگر مفادات مثلاً صنعت کاروں اور مزدوروں وغیرہ میں تقسیم کی گئی تھیں ۔ اس طرح مسلمانوں کو ہندوؤں یا سکھوں کے مقابلہ میں عددی برتری تو حاصل تھی لیکن یہ برتری ایسی نہ تھی کہ اگر صرف مسلم اراکین کی تعداد کو پیش نظر رکھ کر وزارت بنائی جاتی تو وہ مستحکم ثابت ہوتی کیونکہ اگر ان ۸۶ مسلم اراکین کے مقابلہ میں ما بقی ۸۹ اراکین مشترکہ محاذ بنا لیتے تو وہ اس مسلم وزارت کے خلاف عدم اعتماد کا ووٹ پاس کر سکتے تھے ۔

سندھ کی صورت حال یہ تھی کہ یہاں کا ایوان ساٹھ (۶۰) اراکین پر مشتمل تھا ، جن میں سے مسلمان چونتیس (۳۴) تھے ۔ وزارت سازی کے نقطۂ نظر سے یہاں صورت حال نسبتہً بہتر تھی ۔ چونتیس مسلمان بمقابلہ چھبیس غیر مسلم کے وزارت بنا سکتے تھے ، کیونکہ مسلمانوں کو آٹھ نشستوں کی برتری حاصل تھی ، لیکن یہاں خطرہ یہ تھا کہ اگر یہ مسلمان متحد نہ رہ سکیں اور صرف چار یا پانچ مسلم اراکین ہی ٹوٹ جائیں تو وزارت ختم ہو سکتی تھی ۔ البتہ سرحد کی صورت حال نسبتہً مستحکم تھی ۔ یہاں کی مقننہ میں کل پچاس (۵۰) نشستیں تھیں جن میں سے چھتیس (۳۶) نشستیں مسلمانوں کی تھیں اس طرح انہیں ۱۴ غیر مسلم نشستوں کے مقابلہ میں بائیس (۲۲) کی برتری حاصل تھی ۔ یہاں اگر مسلمان چاہتے تو خالص مسلم وزارت بنا سکتے تھے اور وہ مستحکم بھی ہوتی ۔ اس تجزیہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت بحیثیت مجموعی مسلم

اکثریت کے صوبوں میں صوبائی مجالس قانون ساز کی جو تشکیل ہونے و
تھی اس میں مسلمانوں کی اتنی مستحکم اکثریت نہ تھی کہ اس کی بنا
مضبوط مسلم وزارتیں بنائی جا سکتیں ۔ وزارت سازی کے نقطہ نظر
پنجاب و بنگال کی حالت بہتر تھی ۔ سندھ کی نسبۃً غنیمت تھی ، البتہ سر
کی سب سے بہتر تھی ۔ یہی وجہ تھی کہ ان دو بڑے مسلم اکثریتی صو
(پنجاب و بنگال) کے مسلم قائدین نے اس نہج پر سوچنا شروع کر دیا
کہ اپنے اپنے صوبوں میں ایسی جماعتیں بنائی جائیں جن میں ہندو س
اور دیگر فرقے شامل ہوں اور ان کے ٹکٹ پر انتخابات لڑے جائیں ،
مقننہ میں اس غیر فرقہ وارانہ جماعت کی اکثریت کے بل پر وزارتیں تشک
دی جائیں تاکہ مقننہ کے اندر غیر مسلموں کا مشترکہ محاذ بننے نہ پائے
ان کی وزارتوں کو دستوری بحران سے دو چار ہونا نہ پڑے ۔ پنجاب و بنٔ
کے مسلم قائدین نے جب اس انداز فکر کو اپنایا تو اس کا لازمی اثر س
صوبہ سندھ پر بھی پڑنا ضروری تھا کیونکہ یہاں بھی صرف مسلم اکثر
کے بل پر وزارت کی پوزیشن کچھ ڈانواں ڈول ہی تھی ۔ جہاں تک ص
سرحد کا تعلق تھا وہاں صورت حال کچھ اور ہی تھی ۔ یہاں دراصل خد
خدمت گار تحریک کا اثر تھا ۔ یہ سماجی اصلاح کی ایک تحریک تھی ،
کا آغاز ۱۹۲۹ء میں ہوا تھا ۔ اپریل ۱۹۳۰ء میں اس تحریک کے کارک
نے شراب خانوں پر پکٹنگ کی تو حکومت نے ان پر سخت مظالم ڈھ
اور پورے صوبہ میں مارشل لا نافذ کر دیا ۔ بد قسمتی سے اس زمانہ
مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں نے بے معنی خاموشی اختیار کر لی تو
کانگریس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور خدائی خدمت گاروں کی حم
کی ۔ اس وقت سے خان عبدالغفار خان جو اس تحریک کے سربراہ تھ
کانگریس کے زیر اثر آ گئے ۔ با لفاظ دیگر خدائی خدمت گار یا سرخ پ
تحریک دراصل کانگریس ہی کا ایک دوسرا روپ تھا ۔ اس لیے وہاں وزا
سازی کے لیے غیر فرقہ وارانہ جماعت بنانے کا کوئی سوال ہی نہ تھا ۔

مختصر یہ کہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں سے تقریباً ہر ایک ص
میں علیحدہ علیحدہ غیر فرقہ وارانہ جماعت بنانے کا فتنہ پیدا ہوا ، اور
فتنہ کی جڑ ۱۹۳۵ء کی عطا کردہ صوبائی خود مختاری تھی ، اور امر

واحد مقصد وزارت کے سنگھاسن پر براجمان ہونا تھا! واضح رہے کہ یہ تحریک مسلم اکثریت کے ہر صوبے میں علیحدہ علیحدہ نمودار ہوئی۔ یہ تمام صوبوں کی مشترکہ تحریک نہ تھی اور نہ اس کا کوئی مشترکہ مرکز تھا اور نہ کوئی ایک لیڈر، بلکہ ہر صوبہ میں علیحدہ علیحدہ نام سے، الگ الگ پروگرام بنا کر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنائی گئیں اور ان کی قیادت بھی ہر صوبہ میں جداگانہ تھی، مگر اندازِ فکر وہی تھا جو اوپر بیان کیا گیا ہے۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ مسلم اقلیت کے بعض صوبوں مثلاً، یو۔ پی میں بھی یہ رجحان پیدا ہوا۔ مسلم اکثریتی صوبوں کی حد تک تو یہ کہا جا سکتا تھا کہ وزارت سازی میں حائل ہونے والی دستوری رکاوٹوں کو دور کرنے کی خاطر یہ رجحان پیدا ہوا تھا۔ ان صوبوں میں چونکہ مقننہ کے اندر اکثریت مسلمانوں کی تھی اس لیے وزارت اعلیٰ اور دیگر وزارتوں پر مسلمان بھی قابض ہوتے اور ان غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کے ذریعہ غیر مسلموں کا تعاون حاصل کرکے اپنی وزارتوں کو ٹوٹنے سے بچا سکتے تھے۔ اس لیے یہ رجحان کسی حد تک بظاہر قابلِ فہم تھا۔ لیکن اقلیتی صوبوں میں اس طرح کی غیر فرقہ وارانہ صوبائی جماعتیں بنانے میں تو مسلمانوں کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ اگر یہ خیال تھا کہ اس طرح سے کانگریس کا زور توڑا جا سکتا تھا تو یہ محض خام خیالی تھی۔ کانگریس ایک بہت ہی قدیم سیاسی جماعت تھی جس کی پشت پر سارے ہندو تھے۔ پھر اس کے ساتھ جدوجہد اور کشمکش کی ایک طویل اور کامیاب داستان وابستہ تھی۔ علاوہ ازیں اس کا ایک کل ہند نظام تھا۔ اس کے مقابلہ میں چھوٹی چھوٹی، ہر صوبہ میں علیحدہ غیر فرقہ وارانہ نوزائیدہ جماعتوں کی کیا حیثیت ہو سکتی تھی اور وہ اس کے مقابلہ میں کہاں ٹھہر سکتی تھیں۔ ہاں اگر کہیں بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹتا تو شاید کسی اقلیتی صوبہ کے مسلمان کو ایک آدھ وزارت کی موہوم سی امید ہو سکتی تھی۔

بہرحال سنہ ۱۹۳۶ء میں مسلم اکثریت کے صوبوں میں بالخصوص اور بعض مسلم اقلیتی صوبوں میں بھی صوبائی دائرہ کے اندر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنانے کا رجحان پیدا ہوا۔ یہ اندازِ فکر و نظر افسوسناک بھی تھا اور خطرناک بھی!

تین باتیں تو بالکل واضح تھیں -

ایک تو یہ کہ مسلمانوں نے اب تک جو کچھ حاصل کیا تھا وہ بحیثیت " ایک ملت " کیا تھا - چودہ نکات والے تحفظات اور سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور والی صوبائی خود مختاری کے لیے مسلمانوں نے بحیثیت "ملتِ واحد" مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے ذریعہ مطالبہ کیا اور ان کے حصول کے لیے مہم چلائی نہ کہ بحیثیت صوبائی مسلمان —— گول میز کانفرنس میں صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو تمام مسلمان نمائندوں نے بڑے پُر زور طریقہ پر پیش کیا تھا - اگر صرف مسلم اکثریت کے صوبوں کے مسلمان ، صوبائی سطح پر علیحدہ علیحدہ یہ مطالبہ کرتے تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا حصول ناممکن تھا ، کیونکہ کانگریس ، اس قسم کی صوبائی خود مختاری کے خلاف تھی - وہ تو وحدانی حکومت کی حامی تھی - بہرحال سنہ ۱۹۳۵ع کے دستوری تحفظات بالخصوص صوبائی خود مختاری پوری ملتِ اسلامیۂ برصغیر ہند کے متحدہ مطالبہ اور مشترکہ جدوجہد کا نتیجہ تھی - اس کے بعد اگر مسلمانوں کی صفوں میں اتحاد باقی نہ رہے اور وہ صوبوں میں تقسیم ہو کر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنا لیں تو ظاہر ہے کہ ، جو کچھ انھوں نے حاصل کیا تھا ، اس کے ضائع ہو جانے کا خطرہ تھا - خصوصاً اس لیے بھی کہ کانگریس صوبائی خود مختاری اور فرقہ وارانہ فیصلہ دونوں کے خلاف تھی - فرقہ وارانہ فیصلہ کو اس نے محض ڈاکٹر انصاری جیسے قوم پرست لیڈر کے دباؤ کی بناء پر نامنظور کرنے سے اجتناب کیا تھا اور صوبائی خود مختاری کو بھی اس نے بادل ناخواستہ ہی قبول کیا تھا - ہندو مہاسبھا تو شروع ہی سے مسلمانوں کے تمام مطالبات کے خلاف تھی اور اب تو اس کے مخالفانہ رویہ میں شدت پیدا ہو گئی تھی ، جس کا اظہار ، اسی زمانہ میں پنڈت مالویہ اور بھائی پرمانندکی کی تقریروں سے ہو رہا تھا - الغرض مخالفت کے اس ماحول میں صوبائیت یا علاقائیت میں مبتلا ہو کر مسلمانوں کے مختلف ٹکڑیوں میں بٹ جانے اور اپنا متحدہ محاذ نہ بنانے سے یہ خطرہ یقیناً پیدا ہو گیا تھا کہ سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور کی رو سے حاصل شدہ فوائد ضائع ہو جائیں گے - علاوہ ازیں اس سے کانگریس کے مؤقف کی حمایت ہوتی تھی کہ وہ خود بھی ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت

ہونے کی دعویدار تھی -

دوسری واضح بات یہ تھی کہ سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور میں مسلمانوں کو نہ تو پورے تحفظات ملے تھے اور نہ مکمل صوبائی خود مختاری دی گئی تھی - بنگال اور پنجاب میں مسلمانوں کو جو نشستیں دی گئی تھیں - وہ ان کی آبادی کے تناسب سے کم تھیں - اسی طرح کے بعض اور بھی تحفظات منظور نہیں کیے گئے تھے - مثلاً بلوچستان کو دستوری اصلاحات سے محروم رکھا گیا تھا - مسلمانوں نے مکمل صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا - مکمل صوبائی خود مختاری سے ان کی مراد یہ تھی کہ مرکز کو صرف گنے چنے اختیارات دئے جائیں اور صوبوں کے حوالے مابقی اختیارات (Residuary Powers) کیے جائیں - ہندو اور کانگریس مسلمانوں کے اس مطالبہ کے خلاف تھے - وہ تو وفاقی حکومت کے بجائے وحدانی طرز حکومت کے حامی تھے - وفاقی طرز حکومت کے لیے بدرجۂ مجبوری اور بادل ناخواستہ وہ تیار بھی ہوئے تھے ، تو اس شرط کے ساتھ کہ وفاقی مرکز طاقتور ہو اور صوبے اس کے مقابلے میں کمزور رہیں - مرکز کو مابقی اختیارات (Residuary Powers) دئے جائیں اور صوبوں کو گنے چنے اختیارات - سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے ان متضاد مطالبات کے پیش نظر بین بین صورت اختیار کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ مابقی اختیارات (Residuary Powers) کا اس میں ذکر ہی نہ تھا - صوبوں اور مرکز کے اختیارات کی دو علیحدہ فہرستیں تیار کی گئی تھیں اور ایک تیسری فہرست ایسے اختیارات کی تھی ، جو صوبوں اور مرکز دونوں کے لیے مشترکہ تھی - بادی النظر میں تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ نہ مرکز طاقتور ہے اور نہ صوبے - لیکن حقیقت یہ تھی کہ مرکز اب بھی صوبوں پر حاوی تھا - فہرست اختیارات پر ایک نظر ڈالنے ہی سے یہ بات واضح ہو جاتی تھی - الغرض سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور سے مسلمانوں کو نہ تو پورے تحفظات ملے تھے اور نہ کامل صوبائی خود مختاری - پھر یہ بات بھی ذہن میں رہنی چاہیے کہ سنہ ۱۹۳۵ع کا یہ دستور حرف آخر نہ تھا - آزادی کی منزل ابھی دور تھی - اگر ستمبر سنہ ۱۹۳۹ع میں دوسری عالمی جنگ نہ چھڑ جاتی تو یقین کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ سنہ ۱۹۴۷ع میں آزادی

نہ ملتی ۔ اور ایسی صورت میں برطانوی حکومت سنہ ۱۹۳۵ع کے دستور کے بعد نہ معلوم کتنی مزید دستوری اصلاحات نافذ کرتی اور نہ جانے کتنے مرحلوں کے بعد برصغیر ہند کے باشندے آزادی کی نعمت سے متمتع ہوتے ـــــ ان حالات میں اس بات کی شدید ضرورت تھی کہ مسلمانوں کا ایک ہی کل ہند متحدہ محاذ ہوتا کہ وہ دستوری اصلاحات کی اگلی قسط میں اپنے لیے پورے تحفظات اور کامل صوبائی خود مختاری حاصل کر سکیں اور بالآخر انگریز اور ہندو دونوں کے چنگل سے آزاد ہو جائیں !! صوبوں میں تقسیم ہو کر اور غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنا کر وہ کس طرح ان مقاصد کو حاصل کر سکتے تھے؟ ان انتشار پسند ، صوبائی مسلم قائدین کو یہ تو معلوم تھا کہ انھیں مطلوبہ صوبائی خود مختاری نہیں ملی تھی ، پھر جو کچھ خود مختاری ملی تھی ، وہ معرض خطر میں تھی ۔ ہندو مہاسبھا کو یہ ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی اور کانگریس کے لیے یہ بار خاطر تھی ۔ ایسی صورت میں وہ موجودہ محدود صوبائی خود مختاری کا تحفظ کیسے کر سکتے تھے اور اپنی مطلوبہ مکمل صوبائی خود مختاری کو کس طرح حاصل کر سکتے تھے ؟

تیسری بات یہ تھی کہ ازروئے دستور سنہ ۱۹۳۵ع وفاقی مقننہ کا انتخاب بالراست نہیں بالواسطہ تھا یعنی وفاقی مقننہ کے اراکین کا انتخاب عوام نہیں ، بلکہ صوبائی مقننہ کے اراکین کے ووٹوں سے ہوتا تھا ۔ اگر مسلمانوں کی کوئی ایک کل ہند جماعت نہ ہو بلکہ مسلمان اپنے اپنے صوبوں میں غیر مسلموں کو ساتھ لے کر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنائیں اور اس کے ٹکٹ پر صوبائی مقننہ کا انتخاب لڑ کر منتخب ہو جائیں ، تو پھر مرکزی یا وفاقی مقننہ میں وہ ایسے مسلمانوں کو کس طرح بھیج سکتے تھے جو صوبائی اثرات اور نام نہاد غیر فرقہ وارانہ رحجانات سے آزاد خالص مسلم نقطۂ نظر کا اظہار کرتے اور ملت اسلامیہ کی خواہشات اور تمناؤں کی نمائندگی کر سکتے۔ مرکز میں تو ان مسلم نمائندوں کا مقابلہ ہندو اکثریت کے نمائندوں ہی سے ہوتا ۔ پھر ہندو اکثریت کے نمائندوں کی ذہنیت تو ہندوستان گیر ہوتی اور مسلم اقلیت کے نمائندوں کے ذہن پر صوبائیت کا کابوس سوار رہتا ۔ ایسی صورت میں صوبائی سطح پر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنانے کا جو

رجحان صوبوں کے مسلم قائدین میں پیدا ہوا تھا ، وہ ان کی دوغلی ذہنیت کی غمازی کرتا تھا ۔

پھر عجیب و غریب بات یہ تھی کہ یہ رجحان صوبوں کے ہندوؤں میں پیدا نہ ہوا تھا ۔ انھوں نے اس امر کی کوشش نہیں کی تھی کہ صوبائی سطح پر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنائیں اور ان ذریعہ انتخاب لڑیں ۔ ان کی دو ہی جماعتیں تھیں ۔ ہندو مہاسبھا اور کانگریس ۔ ہندو مہاسبھا تو خالص فرقہ وارانہ تھی اور اس کو اپنے فرقہ وارانہ کردار پر عار نہ تھا ، ناز تھا ۔ کانگریس کا اصل روپ بھی فرقہ وارانہ تھا لیکن اس نے غیر فرقہ وارانہ یا قومی (National) بہروپ اختیار کر رکھا تھا ۔ بقول قائد اعظم یہ ایک ہی سکے کے دو رخ تھے یا ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ! ! بہرحال یہ ہندوں کے دو سیاسی ادارے تھے اور یہ دونوں کے دونوں صوبہ گیر نہیں بلکہ ملک گیر تھے ۔ ان کا ایک کل ہند سیاسی نظام تھا اور کانگریس نے تو اپنی جد و جہد اور قربانیوں کی بدولت پورے ہندوستان میں ایک خاص مقام حاصل کر لیا تھا ۔ وہ ایک نہایت باثر اور فعال جماعت تھی اور ہم بتا چکے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے مطلوبہ تحفظات اور مکمل صوبائی خود مختاری کی مخالف تھی ۔ وہ تو پورے ہندوستان کی واحد نمائندہ سیاسی جماعت ہونے کی دعویدار تھی اور انا ولاغیری کا نعرہ لگا رہی تھی ۔ کیا مرکز اور کیا صوبے ، ہر جگہ وہ اپنا سکہ چلانا اور اپنی حکومت کا ڈنکا بجانا چاہتی تھی ۔ صوبائی مسلم قائدین کے سامنے کانگریس کی یہ روش واضح تھی ۔ ان کی غیر فرقہ وارانہ ٹولیوں کا آئندہ چل کر اسی جماعت سے ٹکرا جانا ناگزیر تھا ۔ اب یہ معمولی سوجھ بوجھ کی بات تھی کہ ایسی فعال جارحانہ کل ہند جماعت کا مقابلہ مختلف ٹولیوں اور ٹکڑیوں میں بٹ کر کیسے کیا جا سکتا تھا ؟ ——— لیکن ان مسلم قائدین کی عقلوں پر پتھر اور آنکھوں پر پردے پڑ گئے تھے ! انھیں نہ تو ہندو مہاسبھا کے مخالفانہ نعرے سنائی دے رہے تھے نہ کانگریس کی شاطرانہ چالیں ہی ان کی سمجھ میں آ رہی تھیں اور نہ اپنے افتراق و انتشار کے مناظر ہی انھیں دکھائی دے رہے تھے ! ان کے سر میں تو بس ایک ہی سودا سمایا ہوا تھا کہ چاہے کچھ ہو جائے لیلائے وزارت ہاتھ سے جانے نہ پائے ! ! ظاہر ہے

کہ صوبائیت یا علاقہ واریت کی یہ تحریک ، فتنہ پرور ، تنگ نظر اور خود غرض تحریک تھی ! ! !

اس پس منظر اور ایسے سیاسی ماحول میں ایک آواز اٹھی ۔ برصغیر کے مسلمانو ! ایک ہو جاؤ ، تمھاری ایک ہی کل ہند سیاسی تنظیم ہونی چاہیے اور ایک ہی سب کا متفقہ لائحہ عمل ! پھر اس تنظیم کے تحت اور اس لائحہ عمل کی بنیاد پر سنہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات کی جنگ لڑو ، ساری دنیا ، بالخصوص برطانوی حکومت اور ہندو کانگریس کو بتا دو کہ تم "ملت واحدہ" ہو ۔ تمھارا ایک جداگانہ قومی وجود ہے اور تم بھی اس سر زمین پر ایک قوت و طاقت ہو ، جس کو کسی صورت میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ! یہ آواز تھی قائد اعظم محمد علی جناح کی ! !

یہ آواز انھوں نے اپریل سنہ ۱۹۳۶ء میں بلند کی ۔ ۱۰ اپریل کو انھوں نے بمبئی میں مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس طلب کیا ، اور اس میں صرف اراکین مسلم لیگ ہی کو نہیں ، بلکہ مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو شرکت کی دعوت دی ۔ اسی اجلاس میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، متفقہ طور پر یہ طے کیا گیا کہ مسلم لیگ ، ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ بنائے ، جس میں مختلف جماعتوں کی نمائندگی ہو اور اس بورڈ کے ٹکٹ پر صوبائی انتخابات لڑے جائیں ۔ اس بورڈ کا صدر مسٹر جناح کو منتخب کیا گیا اور انھیں ہی بورڈ کے اراکین نامزد کرنے کا اختیار بھی دیا گیا ۔ اب قائد اعظم نے مختلف صوبوں کے دورے شروع کیے ۔ لیکن مسلم اکثریت کے تمام صوبوں اور بعض اقلیتی صوبوں میں بھی ان کی سخت مخالفت ہوئی ۔ سندھ میں سر عبداللہ ہارون نے مخالفت کی ۔ بنگال میں مولوی فضل الحق نے مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر ایک نئی غیر فرقہ وارانہ جماعت کرشک پارٹی بنائی ۔ یہی حالت آسام کی تھی ، صوبہ سرحد میں سر عبدالقیوم کی قیادت میں ایک جداگانہ جماعت عالم وجود میں آ چکی تھی ۔ پنجاب میں سر فضل حسین نے جناح کی سخت مخالفت کی اور اپنی غیر فرقہ وارانہ جماعت یونینسٹ پارٹی کی از سر نو تشکیل کی ۔ اقلیتی صوبوں میں یو ۔ پی کو سیاسیات میں ہمیشہ سے ایک امتیازی مقام حاصل رہا ہے ۔ یہاں

سے سر احمد سعید خان چھتاری مسلم لیگ کے اجلاس بمبئی میں شریک ہوئے تھے اور انھوں نے پارلیمانی بورڈ کے قیام کی تائید بھی کی تھی - نواب زادہ لیاقت علی خان کل ہند مسلم لیگ کے معتمد منتخب ہوئے تھے ، لیکن بعد میں ان دونوں حضرات نے پارلیمانی بورڈ کی نہ صرف مخالفت کی اور اس سے استعفیٰ دے دئے بلکہ غیر فرقہ وارانہ جماعت (زراعت پیشہ یا زمیندار جماعت) بنا لی ! مختصر یہ کہ عام طور پر قائد اعظم اور ان کے پارلیمانی بورڈ کی سخت مخالفت ہوئی اور بالخصوص اکثریتی صوبوں کے مسلم قائدین اس مخالفت میں پیش پیش رہے - انھوں نے جناح پر برسرِ عام پھبتیاں کسیں اور پارلیمانی بورڈ کا مذاق اڑایا -

ایسے سخت مخالفانہ ماحول اور ایسے شدید انتشار انگیز و فتنہ پرور زمانہ میں ہمیں ایک ہی قد آور شخصیت ایسی نظر آتی ہے ، جس نے بلا کسی پس و پیش کے فوراً قائد اعظم کی آواز پر لبیک کہا - یہ شخصیت تھی علامہ اقبال کی !

مسلم لیگ کی قرارداد کی متابعت میں مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے کی غرض سے مختلف صوبوں کا دورہ کرتے ہوئے ، مسٹر جناح ۲۹ اپریل سنہ ۱۹۳۶ء کو لاہور پہنچے - پہلے فضل حسین سے ملے لیکن انھوں نے ٹکا سا جواب دے دیا - پھر علامہ اقبال سے ان کے مکان پر ملے اور انھیں مرکزی پارلیمانی بورڈ میں شرکت کی دعوت دی - علامہ گو اس وقت علیل اور خانگی مصائب و مشکلات میں گرفتار تھے ، مگر بغیر کسی پس و پیش اور بحث و تمحیص کے انھوں نے فوراً یہ دعوت قبول کر لی اور جناح کی قیادت میں قائم ہونے والے مسلم لیگ کی مرکزی پارلیمانی بورڈ کے رکن بن گئے !

علامہ کا یہ پختہ ایقان تھا کہ مسلمانوں کی سیاسی وحدت کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کا ایک ہی سیاسی ادارہ ہو ، جس کا اظہار انھوں نے پوری شرح و بسط کے ساتھ اپنے خطبہ صدارت مسلم کانفرنس میں کیا تھا اور اب بھی ان کی سوچی سمجھی ہوئی رائے یہی تھی کہ

" اگر انھوں نے (مسلمانوں نے) مسلم لیگ کی موجودہ اسکیم

(پارلیمانی بورڈ والی اسکیم) کو منظور نہ کیا تو گذشتہ پندرہ
میں مسلمانوں نے جو کچھ حاصل کیا ہے وہ کھو بیٹھیں گے
اپنے قومی وجود کو نہ صرف نقصان پہنچائیں گے بلکہ اس
اپنے ہاتھوں پارہ پارہ کر دیں گے[8] "

مسلم لیگ کی مرکزی پارلیمانی بورڈ کی رکنیت کی قبولیت علامہ کے اسی پختہ ایقان ، محکم رائے اور دور اندیشانہ بصیرت کی آئینہ دار

اس دور خلفشار اور انتشار میں ہمیں یہ دو ہستیاں ——— جناح اور اقبال ——— ہی ایسی دکھائی دیتی ہیں - جن کی نظر زمانہ کی رفتار پر اور انگلیاں ملت کی نبض پر تھیں ! حقیقتاً یہ دو تھے ، جنھوں نے ماضی کو پہچانا ، حال کو جانچا اور مستقبل کو تاڑ انہوں نے مسلمانوں کو اکٹھا کیا - مخالفین و معاندین کو راستہ سے اور سنت کو سیدھی راہ پر ڈال دیا - یہی تھے ، جنھوں نے ان نازک میں برصغیر کی بساط سیاست پر ایسی گہری اور دور رس چال چلی میں ابتداً کچھ مہرے ضرور پٹے ، کامیابی خاطر خواہ نہیں ہوئی ، بالآخر کانگریس اور ہندوؤں کو شہ مات ہوئی اور مسلمان ایک مقتدر بن کر ابھرے ! !

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ دونوں ——— جناح اور ——— صوبائی خود مختاری کے بڑے زبردست حامی اور وکیل مسٹر جناح نے کلکتہ کنونشن دسمبر سنہ ۱۹۲۸ع کے موقع پر نہرو میں جو تین ترمیمات پیش کی تھیں ، ان میں ایک یہ تھی کہ صوبہ مابقی اختیارات (Residuary Power) دئے جائیں - صوبوں کو اختیارات دئے جانے کے معنی ہی مکمل صوبائی خود مختاری کے سنہ ۱۹۲۹ع میں جو چودہ نکات انہوں نے مرتب کیے تھے ، ان میں ایک نکتہ یہی صوبائی خود مختاری کا تھا - اس کے بعد سے ہر موقع

۸- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۷ -

اس کی حمایت کرتے رہے ، اور کسی وقت بھی اس کی تائید سے گریز نہیں کیا ۔ عملی سیاست میں علامہ اقبال کی فکر سیاسی کا ایک اہم نکتہ مکمل صوبائی خود مختاری تھی ۔ مسلم لیگ کی طرف سے جو یادداشت سائمن کمیشن کے سامنے پیش کرنے کے لیے مرتب کی گئی تھی ، اس میں مکمل صوبائی خود مختاری کا ذکر نہ ہونے کے باعث انھوں نے مسلم لیگ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا تھا ۔ ان کی اسی سخت روش کے باعث مکمل صوبائی خود مختاری کے مطالبہ کو اس یادداشت کا جزو بنانا پڑا تھا ۔ تیسری گول میز کانفرنس میں تو وہ صوبائی خود مختاری کے مسئلہ پر اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ ہر صوبہ کو آزاد ڈومینین قرار دینے اور مرکز کو اڑا دینے کی تجویز پیش کی تھی ! غرض کہ اقبال اور جناح دونوں صوبائی خود مختاری کے سبب سے بڑے موئید تھے اور جو صوبائی خود مختاری سنہ ۱۹۳۵ء کے دستور میں دی گئی تھی ، اس کو نا کافی اور نامکمل تصور کرتے تھے ۔ اس کے باوجود ، ان دونوں نے ان صوبہ واری و علاقہ واری تحریکوں کی سخت مخالفت کی جو دوسرے مسلم قائدین اپنے اپنے صوبوں میں چلا رہے تھے ۔ یہ صوبائی یا علاقہ واری تحریکیں ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، اسی صوبائی خود مختاری[۱] کا شاخسانہ تھیں ۔ تاہم اقبال اور جناح نے مکمل صوبائی خود مختاری کے حامی و وکیل ہونے کے باوجود ، ان تحریکوں کی نہ صرف مخالفت کی بلکہ ان کا مقابلہ کیا ۔ کیا یہ تضاد عمل تھا ؟ نہیں ! تو پھر ان کے اس رویہ کی توجیہہ کیا ہے ؟ بات دراصل یہ ہے کہ قوم کے دونوں مخلص و بے لوث قائدین کی نظر صرف ملت کے مفاد پر تھی اور ان کے برعکس صوبائی قائدین کی نظریں کرسئی اقتدار پر ! ان دونوں نے صوبائی خود مختاری کی پر زور تائید اس لیے کی تھی کہ یہ ایک ذریعہ تھا ، ملت اسلامیۂ برصغیر کو ہندو اقتدار کے چنگل سے بچانے کا ! پورے برصغیر میں ہندوؤں کی اکثریت تھی ۔ موجودہ مغربی جمہوریت کے معنی اکثریت کی حکومت کے ہیں ۔ اب اگر برصغیر میں ایک وحدانی حکومت بن جاتی اور انگریز کے زیر سایہ یا اس کے بغیر جمہوریت نافذ ہو جاتی تو اس کے معنی یہ تھے کہ مرکز میں ہندو اکثریت کی حکمرانی ہوتی اور اگر وحدانی حکومت نہ ہوتی بلکہ وفاقی حکومت ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ صوبوں

کو کچھ اختیارات ضرور مل جاتے ، لیکن وفاقی مرکز پر ہندو اکثریت ہی کا تسلط قائم ہو جاتا ! اب برصغیر کی صورت حال یہ تھی کہ مسلمان بحیثیت مجموعی پورے ملک میں تو " اقلیت " تھے لیکن پانچ صوبوں —— بنگال ، پنجاب ، سندھ ، سرحد ، بلوچستان —— میں ان کی اکثریت تھی اگر برصغیر میں وحدانی حکومت قائم ہو تو یہ پانچ مسلم صوبے ، مرکز کی ہندو اکثریت کے بالکلیہ ماتحت اور تابع ہو جاتے تھے - اسی لیے مسلمانوں نے وحدانی حکومت کی سختی کے ساتھ مخالفت کی تھی اور اس کے مقابلے میں وفاقی حکومت کو ترجیح دی تھی کیونکہ وفاقی طرز حکومت میں صوبوں اور مرکز کے درمیان اختیارات کی تقسیم ہوا کرتی ہے - پھر اگر مرکز کو زیادہ اختیارات دئے جائیں تو مرکز قوی اور صوبے کمزور ہو جاتے ہیں اور اس کے برعکس صوبوں کو جس تناسب سے زیادہ اختیارات اور مرکز کو کم دئے جائیں گے اسی تناسب سے مرکز کی گرفت صوبوں پر کمزور رہتی ہے - اسی لیے مسلمانوں نے سنہ ۱۹۳۵ء کے دستور کی صورت گری کے ہر مرحلہ پر صوبوں کو زیادہ سے زیادہ اختیارات اور مرکز کو کم سے کم اختیارات دینے کا مطالبہ کیا تھا - اس مطالبہ میں ایک نکتہ یہی تھا کہ مسلم اکثریت کے صوبے ، ہندو اکثریت والے مرکز کی گرفت سے ممکنہ حد تک آزاد رہیں - پھر اس میں ایک دوسرا نکتہ یہ تھا کہ یہ پانچ مسلم اکثریت والے صوبے ، ہندو اکثریت والے صوبوں کے مقابلے میں ایک قسم کا توازن پیدا کریں گے اور اس طرح برصغیر میں ان دونوں قوموں —— ہندو اور مسلم —— میں سیاسی توازن قائم ہو جائے گا - یہی وہ سیاسی فلسفہ تھا ، جس کے پیش نظر ملت اسلامیہ برصغیر کے ان دونوں قائدین —— جناح اور اقبال —— نے صوبائی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا - ظاہر ہے کہ یہ مطالبہ کل ہند وفاق کے سیاق و سباق (Context) میں تھا نہ کہ علی الاطلاق - واضح الفاظ میں یہ صوبائی خود مختاری کل ہند وفاق کے مقابلہ میں تھی ، ورنہ مسلم مملکت کے اس تصور سے ، جو اقبال نے اپنے خطبۂ صدارت الہ آباد میں پیش کیا تھا ، اس صوبائی خود مختاری کا کوئی تعلق نہ تھا - وہاں تو اقبال نے واضح طور پر مضبوط و مستحکم مملکت (Consolidated State) کے الفاظ استعمال کیے ہیں ، جس سے یہ

مترشح ہوتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر ، اس مملکت میں وحدانی طرزِ حکومت تھی ۔ الغرض '' صوبائی خود مختاری '' سے ان دونوں قائدین کا مقصد کل ہند مسلم اقلیت کو بحیثیت ملتِ واحدہ ہندو اکثریت کے مقابلہ میں قوت کا ایک توازن مہیا کرنا اور مسلم اکثریت والے صوبوں کو وفاقی مرکز میں ہندو اکثریت کی گرفت سے بیش از بیش تحفظ فراہم کرنا تھا ۔ بالفاظ دیگر یہ پوری ملتِ اسلامیہ کے سیاسی تحفظ اور بچاؤ (Protection) کا ایک دستوری ذریعہ تھا نہ کہ ملتِ واحدہ کو صوبوں اور علاقوں میں منقسم و منتشر کر دینے کا ایک طریقہ ! یہ سیاسی تحفظ اسی صورت میں حاصل ہو سکتا تھا کہ پورے مسلمان ملتِ واحدہ بن کر سنہ ۱۹۳۵ع کی حاصل شدہ صوبائی خود مختاری سے ممکنہ حد تک زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھاتے ! گویا صوبائی خود مختاری کے بعد ، مسلمانوں کا شیرازہ زیادہ متحد مجتمع اور زیادہ منظم ہو جانا چاہیے تھا ۔ لیکن اس کے برعکس صوبائی قائدین نے صوبائی خود مختاری سے استفادہ کی یہ صورت سمجھی کہ مسلمانوں کے شیرازہ کو علاقوں میں بکھیر دیا جائے اور ان کی تنظیم کو صوبوں میں منتشر کر دیا جائے ! واقعہ یہ ہے کہ صوبائی خود مختاری سے استفادہ کی یہ ایک صورت ضرور تھی لیکن یہ صورت جیسا کہ اوپر وضاحت کی جا چکی ہے ، بحیثیت مجموعی ملت کے مفاد کی نہیں ، ذاتی اقتدار کی تھی !—— یہ تھا صوبائی " لال بجھکڑوں " کا مقصودِ نظر ، اور وہ تھا ملت کے دو مخلص و غمخوار داناؤں کا مطمح نگاہ !

علامہ اقبال کی مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ میں شرکت اور قائد اعظم جناح کی رفاقت ، اس لحاظ سے اہم نہیں ہے کہ انھوں نے اس زمانہ میں بھاگ دوڑ اور تگ و دو کی ہے ، بلکہ اس کی اہمیت یہ ہے کہ ایسے انتشار انگیز ، فتنہ پرور اور خود غرضانہ ماحول میں ، جب کہ ہر سمت سے اور ہر قدم پر قائد اعظم کی مخالفت کی جا رہی تھی ، اقبال نے پورے خلوص سے ان کا آخر وقت تک ساتھ دیا ۔ ان کی رفاقت ہی نہیں کی بلکہ ان کی قیادت کو قبول کیا ۔ اس کا اخلاقی اثر عامتہ المسلمین پر بھی پڑا اور قائدین پر بھی ! مسلمانانِ ہند کے قلوب میں اس زمانہ میں جو مقام اپنے وجد آفرین کلام اور ولولہ انگیز پیام کی بدولت اقبال نے حاصل کر

لیا تھا وہ صفِ اول کے کسی مسلم لیڈر کو بھی حاصل نہ تھا - پھر جب اقبال نے جناح کی پارلیمانی بورڈ والی اسکیم ہی کو نہیں ، خود جناح کو قائد تسلیم کر لیا تھا تو " جنوٹ بھیئے " لاکھ مخالفت کریں یہ قیادت واقعی قیادت عظمیٰ بن چکی تھی - اور صوبائی قائدین کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود مسلمانوں کا سوادِ اعظم اسی طرف مائل ہونے لگا تھا ! !

قائد اعظم کا مخلص سیاسی مشیر و ندیم واضح رہے کہ علامہ اقبال اس زمانہ میں شدید علیل تھے - آنکھوں کی بینائی نے جواب دے دیا تھا اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے کہ آخری زمانہ میں یہ حالت ہو گئی تھی کہ بستر سے اٹھنا محال تھا - گو انھوں نے بڑی خوش دلی سے مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کی رکنیت قبول کر لی تھی ، تاہم سیاسی دوڑ دھوپ ، اب ان کے بس کی بات نہ رہی تھی - اسی لیے اس زمانہ میں ان کا سیاسی رول (Political Role) قائد اعظم کے سیاسی مشیر و ندیم اور مخلص رفیق و ہمدم کا سا تھا - وہ جناح کو کل ہند سیاسی معاملات میں مختلف مشورے دیتے - بعض دفعہ راز دارانہ انداز میں سرگوشیاں کرتے اور کبھی کبھی جرأت مندانہ سیاسی اقدامات کے لیے انھیں آمادہ و تیار کرتے دکھائی دیتے ہیں - آئیے دیکھیں ، وہ جناح سے کیا کہتے ہیں -

۱- **مسلم کنونشن کی تجویز** : اس باب کے پس منظر میں ہم بیان کر آئے ہیں کہ صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے دہلی میں کل ہند قومی کنونشن طلب کیا تھا - جس میں صوبائی اسمبلیوں کے آٹھ سو کانگریسی ارکان نے شرکت کی تھی - اس کنونشن میں پنڈت جی نے بتاریخ ۱۹ مارچ سنہ ۱۹۳۷ء ایک خطبہ دیا ، جس میں مسلمانوں کے تعلق سے انتخابات میں کانگریس کی ناکامی کا اعتراف کیا - پھر اس ناکامی کی وجہ یہ بتائی کہ کانگریس اب تک مسلم عوام کو نظر انداز کرکے فرقہ پرست مسلم قائدین سے سمجھوتہ کرنے کے " چکر " میں پڑی رہی اور علاج یہ تجویز کیا کہ ان فرقہ پرست قائدین کو نظر انداز کرکے مسلم عوام سے رابطہ پیدا کیا جائے اور اس رابطہ کا سہل ، آسان اور پر کشش طریقہ یہ بتایا کہ ان کی توجہ تہذیبی و ثقافتی مسائل سے ہٹا کر ، اقتصادی معاملات کی

طرف منعطف کرائی جائے کیونکہ یہی اقتصادی مسئلہ ، ہندوستانی عوام (خواہ ہندو ہوں ، مسلمان ہوں یا سکھ اور عیسائی ہوں) کا حقیقی اور اصلی مسئلہ ہے ۔ پنڈت جی کی اس طویل تقریر کا ایک مختصر سا اقتباس ملاحظہ کیجیے ۔

" تعجب ہے کہ ابھی تک ایسے لوگ موجود ہیں جو مسلمانوں کو ایک الگ گروہ تصور کرکے ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کا خواب دیکھ رہے ہیں ۔ یہ اندازِ فکر قرونِ وسطیٰ میں رائج ہو تو ہو ، موجودہ زمانہ میں اسے کوئی نہیں پوچھتا ۔ آج کل ہر چیز پر اقتصادی نقطۂ نظر سے غور کیا جاتا ہے ۔ جہاں تک افلاس ، بے کاری اور قومی آزادی کا سوال ہے ، ہندوؤں ، مسلمانوں ، سکھوں اور مسیحیوں میں کوئی فرق نہیں ہے ۔ چوٹی کے فرقہ پرست لیڈر ہر وقت حصے ، بخرے اور بٹوارے کی باتیں کرتے رہتے ہیں کہ ان کی قوم کو ملازمتوں میں کتنا حصہ ملے گا اور اسمبلی میں کتنی نشستیں حاصل ہوں گی ۔ ان لیڈروں کو چھوڑ کر جب ہم براہ راست عوام سے ملتے ہیں تو ہمیں وہی مشترکہ مسائل کار فرما نظر آتے ہیں ، جن کا ذکر میں نے ابھی کیا ہے ، یعنی افلاس ، بے کاری اور قومی آزادی کی لگن[۹] "

علامہ اقبال نے اخبارات میں جواہر لال نہرو کی اس تقریر کو پڑھنے کے فوراً بعد قائد اعظم کو ایک خط لکھا ، جس میں یہ خواہش کی کہ کل ہند قومی کنونشن کے جواب میں ایک کل ہند مسلم کنونشن طلب کیا جائے جس میں مسلمانانِ ہند کی پالیسی اور ان کے زاویہ نگاہ کا اعلان کیا جائے اور یہ بتایا جائے کہ مسلمانوں کی نظر میں تہذیب و ثقافت کا مسئلہ زیادہ اہمیت رکھتا ہے ۔ چنانچہ ۲۰ مارچ سنہ ۱۹۳۷ع کے خط میں وہ قائد اعظم کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں

" مائی ڈیر مسٹر جناح !

میں سمجھتا ہوں کہ آپ نے پنڈت جواہر لال نہرو کے اس خطبہ

۹- " انڈین اینول " رجسٹر سنہ ۱۹۳۷ع جلد اول ۔

کو پڑھا ہو گا ، جو انھوں نے آل انڈیا نیشنل کنونشن میں
تھا اور یہ کہ آپ نے اس پالیسی کا پوری طرح اندازہ کر
ہو گا ، جو مسلمانوں کے تعلق سے اس خطبہ میں بیان کی گئی ۔
مجھے یقین ہے کہ آپ اس امر سے پوری طرح باخبر ہیں کہ
دستور نے کم از کم مسلمانان ہند کو ان سیاسی تغیرات
پیش نظر ، جو مستقبل میں ہندوستان اور مسلم ایشیا میں ر
ہونے والے ہیں ، اپنے آپ کو منظم کرنے کا ایک انوکھا مو
فراہم کیا ہے ۔ ہم ملک کی دوسری ترقی پسند جماعتوں سے بے ش
تعاون کرنے کے لیے تیار ہیں ، تاہم ہمیں یہ حقیقت نظر انداز نہ
کرنی چاہیے کہ ایک اخلاقی اور سیاسی طاقت کی حیثیت سے اس
کے پورے مستقبل کا انحصار بہت بڑی حد تک مسلمانان ہند
مکمل تنظیم پر ہے ! لہذا میں تجویز پیش کرتا ہوں کہ آل از
نیشنل کنونشن کا ایک مؤثر جواب دیا جائے ۔ آپ کو چاہیے
دہلی میں جلد از جلد ایک آل انڈیا مسلم کنونشن منعقد کریں
جس میں نئی صوبائی اسمبلیوں کے ارکان کے علاوہ دوسرے م
مسلم رہنماؤں کو بھی شرکت کی دعوت دی جائے ۔ آپ کو چاہ
کہ اس اسلامی مؤتمر کی طرف سے پوری قوت اور قطعی وضاح
کے ساتھ ہندوستان میں مسلمانوں کی ایک ممیز جداگانہ سیاسی وحد
کا بطور نصب العین اعلان کر دیں ۔ یہ امر قطعاً لابدی ہے
ہندوستان اور بیرون ہندوستان کی دنیا کو صاف صاف بتا دیا جا
کہ ہندوستان کا حل طلب مسئلہ صرف معاشی مسئلہ ہی نہیں ہے
بلکہ مسلم نقطۂ نظر سے ثقافت و تہذیب کا مسئلہ نسبتاً زیاد
دور رس نتائج کا حامل اور بہر نوع کسی طرح معاشی مسئلہ سے
کم اہم نہیں ہے ۔ اگر آپ ایسا کنونشن منعقد کر سکیں تو ان
مسلم ارکان مجالس قانون ساز کی حیثیت کا پول کھل جائے
جنھوں نے مسلمانان ہند کی خواہشوں اور تمناؤں کے خلاف اپنی
اپنی جداگانہ جماعتیں قائم کر لی ہیں ۔ مزید برآں اس کنونشن سے
ہندوؤں پر بھی یہ عیاں ہو جائے گا کہ کوئی سیاسی چال ، خواہ

وہ کتنی ہی گہری کیوں نہ ہو ، ہندی مسلمانوں کو اپنی ثقافتی
وحدت سے غافل نہیں کر سکتی[۱۰] "

علامہ اقبال کے اس خط سے تین باتیں نہایت واضح طور پر سامنے آتی ہیں ۔ ایک تو یہ کہ معاشی مسئلہ کو اہمیت دیتے ہیں لیکن اس سے اہم تر وہ مسلمانوں کے تہذیبی و ثقافتی مسئلہ کو قرار دیتے ہیں ، اور اسی نکتہ کی وضاحت اور اس کا بطور نصب‌العین اعلان کرنے کی خاطر وہ مسلم کنونشن کے انعقاد کی تجویز پیش کرتے ہیں ، دوسرے یہ کہ وہ اسلام کو بحیثیت ایک اخلاقی و سیاسی قوت کے نہ صرف ہندوستان بلکہ ایشیا میں ابھرتا ہوا دیکھنے کی دلی آرزو و تمنا رکھتے ہیں اور یہی ان کے افکار و اعمالِ سیاسی کا محور و مرکز ہے ، اور اسی غرض سے وہ مسلمانانِ ہند کو ایک واحد ملی تنظیم میں پرونا چاہتے ہیں ۔ تیسرے یہ کہ مسلم کنونشن ، ان کے نقطۂ نظر سے اسی تنظیم کا ایک عملی مظاہرہ تھا ، جس سے وہ فوری طور پر دو مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ ایک تو یہ کہ ہندوؤں اور ان کی چالاک قیادت پر یہ واضح کر دیا جائے کہ مسلمان ، معاشی مسئلہ کی کشش سے دھوکہ کھا کر اپنی تہذیب و ثقافت سے دست بردار نہیں ہو سکتے اور دوسرے یہ کہ اس مظاہرہ سے علاقائیت کی تنگنائیوں میں محصور انِ تنگ نظر اور جاہ پسند مسلم قائدین کی آنکھیں کھل جائیں ، جنھوں نے مختلف صوبوں میں اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجدیں الگ الگ بنا رکھی تھیں ۔

۲۔ **مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنایا جائے** :۔ پنڈت جواہر لال نہرو نے مسلمانوں کو بحیثیت جماعت سیاسی طور پر فنا کرنے کے لیے کل ہند قومی کنونشن میں " رابطۂ مسلم عوام " کا نسخہ تجویز کیا تھا ۔ اس کا جواب عملی طور پر یہی ہو سکتا تھا کہ مسلم لیگ کو بھی عوامی جماعت بنایا جائے ۔ مسلم لیگ اب تک ان مسلمانوں کی جماعت تھی ، جن کا تعلق اونچے اور خاصے مرفہ الحال طبقہ سے تھا ۔ اگر عام مسلمان پنڈت نہرو کی تحریک

۱۰۔ " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۱ و ۱۲ ۔

کا شکار ہو جاتے تو پھر مسلم لیگ میں رہ کیا جاتا تھا اور وہ مسلمانانِ ہند کی نمائندہ جماعت ہونے کا دعویٰ کیسے کر سکتی تھی اور ان مقاصد کو کس طرح حاصل کر سکتی تھی ، جو قائد اعظم اور علامہ اقبال کے پیش نظر تھے ۔ اسی لیے ڈاکٹر اقبال نے مسٹر جناح کو ایک دوسرے خط میں اس امر کی طرف توجہ دلائی کہ لیگ کو مضبوط بنانا ہے تو اس کے دستور میں ایسی تبدیلیاں کی جائیں جن سے وہ ایک عوامی جماعت بن جائے ۔ ڈاکٹر صاحب اس بات کے قطعی خلاف تھے کہ لیگ صرف اونچے طبقے کے مسلمانوں کی جماعت بن کر رہ جائے ۔ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ء کے خط میں وہ مسٹر جناح کو لکھتے ہیں

" لیگ کو بالآخر یہ فیصلہ کرنا ہی پڑے گا کہ آیا وہ صرف ہندوستانی مسلمانوں کے اونچے طبقے کی نمائندہ جماعت بن کر رہے گی یا ایسے عام مسلمانوں کی جماعت بنے گی جنھوں نے اب تک معقول وجوہ کی بنا پر اس میں کوئی دلچسپی نہیں لی ۔ شخصی طور پر میں یقین کرتا ہوں کہ وہ سیاسی تنظیم جو عام مسلمانوں کی بہتری کی کوشش نہ کرے ، ہمارے عوام کو اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی[۱۱] "

ہو سکتا ہے کہ اس خط میں علامہ اقبال نے جو مشورہ دیا ہے ، اس کا فوری اور وقتی محرک پنڈت جواہر لال نہرو کی " رابطۂ مسلم عوام " والی تحریک ہی ہو ، تاہم ان کی پوری سیاسی فکر اور عام سیاسی جدوجہد کو سامنے رکھا جائے تو یہ واضح ہوتا ہے کہ ان کا بنیادی عقیدہ یہی تھا کہ موجودہ زمانہ میں کوئی سیاسی جماعت عوامی تائید حاصل کیے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی !

۳۔ مسلمانوں کے معاشی مسائل کو حل کیا جائے :۔ ڈاکٹر صاحب نے اس زمانہ میں اس امر پر بہت زور دیا کہ لیگ مسلمانوں کے معاشی مسئلہ کو حل کرے ۔ چنانچہ اپنے ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ء کے خط میں ہی اس

۱۱۔ " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " مطبوعہ لاہور ، سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۵ ۔

مسئلہ پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" نئے دستور کے تحت بڑی بڑی آسامیاں تو اعلیٰ طبقات کے بچوں کے لیے اور چھوٹی چھوٹی وزراءٔ کے دوستوں اور رشتہ داروں کی نذر ہو جاتی ہیں ۔ دوسرے معاملات میں بھی ہمارے سیاسی ادارات نے عام مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے کی طرف قطعاً کوئی توجہ نہیں کی ۔ روٹی کا مسئلہ روز بروز شدید تر ہوتا چلا جا رہا ہے ۔ مسلمان محسوس کر رہے ہیں کہ گذشتہ دو سال سے ان کی حالت مسلسل گرتی جا رہی ہے ۔ مسلمان سمجھتے ہیں کہ ان کے افلاس کی ذمہ داری ہندو ساہو کاروں اور نظام سرمایہ داری پر عائد ہوتی ہے ۔ یہ احساس کہ ان کے افلاس میں غیر ملکی حکومت بھی برابر کی حصہ دار ہے ، اگرچہ ابھی ان میں پوری طرح بیدار نہیں ہوا ہے ، تاہم یہ احساس ابھر کر رہے گا ۔ اس کا امکان تو نہیں ہے کہ جواہر لال نہرو کی منکرِ خدا اشتراکیت کی دعوت کو مسلمان لبیک کہیں گے ۔ لہٰذا سوال پیدا ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے افلاس کے مسئلہ کو کیوں کر حل کیا جائے اور لیگ کا سارا مستقبل اس امر پر منحصر ہے کہ وہ اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے کیا کوشش کرتی ہے ۔ اگر لیگ مسلمانوں کو افلاس کی اس مصیبت سے نجات دلانے کی توقعات نہ دلا سکی تو مجھے یقین ہے کہ عام مسلمان ، پہلے کی طرح اب بھی اس سے بے تعلق رہیں گے ۔ خوش قسمتی سے اسلامی قانون کے نفاذ اور جدید تصورات کے پیش نظر اس کے (یعنی فقہ اسلامی کے) مزید ارتقا میں اس مسئلہ کا حل موجود ہے ! اسلامی قوانین کا طویل اور محتاط طریقہ پر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو پوری طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو کم سے کم ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے حق کی طمانیت حاصل ہو جاتی ہے[۱۲] "

۱۲- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۶ -

۴۔ مسلم اکثریت والے صوبوں کی جداگانہ وفاق کی تجویز :- علامہ اقبال نے اسی زمانہ میں مسٹر محمد علی جناح کے سامنے مسلم اکثریت رکھنے والے صوبوں کو برصغیر ہند کے دیگر صوبوں سے علیحدہ کرکے ایک جداگانہ وفاق کی شکل میں مربوط کرکے اسلامی مملکت کے قیام کی تاریخ ساز تجویز رکھی ۔ وہ خط جس میں انہوں نے مسٹر جناح کو یہ مشورہ دیا ہے ان واقعات کے لحاظ سے جو آگے چل کر ملک میں رونما ہوئے ، ایک خاص تاریخی اہمیت کا حامل ہے ۔ اس خط میں انہوں نے اپنے اس بنیادی اور مرکزی تصور کو جو ایک عرصہ سے ان کے قلب و ذہن پر چھایا ہوا تھا ، بلا کم و کاست دو ٹوک طریقہ پر بیان کر دیا ہے ۔ پھر یہ خط انہوں نے راز دارانہ انداز میں ایک ایسے شخص کو لکھا ہے ، جس کی سیاسی بصیرت ، مومنانہ فراست اور ملی اخلاص پر انہیں بے پناہ اعتماد ہے ۔ اسی لیے انہوں نے ڈپلومیسی کی زبان استعمال نہیں کی ہے ۔ اس میں نہ کوئی گنجلک ہے نہ ابہام ، نہ کوئی ذومعنی فقرہ اور نہ کوئی پیچ دار بات ! جو کچھ ہے ، صاف ، واضح اور غیر مبہم ! ! ــــــــــ اس خط میں انہوں نے اپنے ذہن و دماغ اور قلب و روح کو ، طوفان بلاخیز میں مسلمانوں کی ناؤ کے کھیون ہار ، مستقبل کے قائد اعظم ، محمد علی جناح کے سامنے بے نقاب کر دیا ہے ۔ اس خط کی اس اہمیت کے باعث اس کے پورے متن کا ترجمہ یہاں درج کیا جاتا ہے ۔

لاہور ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ع   بصیغہ راز

مائی ڈیر مسٹر جناح !

نوازش نامہ کل موصول ہوا ۔ جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ آپ ایک بہت ہی مصروف انسان ہیں لیکن ساتھ ہی یہ توقع رکھتا ہوں کہ آپ کو میری بار بار کی مراسلت ناگوار خاطر نہیں ہو گی کیونکہ آج ہندوستان میں ، آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں ، جس کی طرف مسلم جماعت ، نظریں اٹھا کر یہ دیکھنے کا حق رکھتی ہے کہ اس طوفان بلا میں ، جو شمال مغربی ہندوستان اور شاید پورے ملک میں آ رہا ہے ، آپ ہی اس کی

قیادت فرماتے ہوئے ، بحفاظت تمام اس کو ساحلِ مراد تک پہنچائیں گے ۔

میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم فی الحقیقت خانہ جنگی میں مبتلا ہو چکے ہیں ، فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں عام ہو جائے ۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ سا قائم ہو چکا ہے ۔ صرف شمال مغربی ہند میں ان تین مہینوں کے دوران کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں ۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہینِ رسول اکرمؐ کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں ۔ توہینِ رسولؐ کی ان چار وارداتوں میں مجرم فی النار کر دیا گیا ۔ سندھ میں قرآن کریم کو نذر آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں ۔ پوری صورت حال کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد ، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ ان حالات کا حقیقی سبب نہ مذہبی ہے اور نہ معاشی ۔ اس کا خالص سبب سیاسی ہے ۔ مسلم اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں اور سکھوں کا مقصد ، مسلمانوں پر خوف و ہراس طاری کر دینا ہے ۔ آئین کی کیفیت کچھ ایسی ہے کہ اپنی اکثریت کے صوبوں میں بھی مسلمانوں کا دارومدار تمام تر غیر مسلموں پر ہے ۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلم وزارت نہ صرف یہ کہ کوئی مناسب کارروائی نہیں کر سکتی بلکہ اس کو خود مسلمانوں سے ناانصافی برتنی پڑتی ہے تاکہ ان لوگوں کو ، جن کی امداد پر وزارت قائم ہے ، خوش کیا جا سکے ، اور دوسروں پر یہ ظاہر کیا جا سکے کہ وزارت قطعی طور پر غیر متعصب ہے ۔ لہذا یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے پاس اس آئین کو رد کرنے کے خاص وجوہ موجود ہیں ۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ دستورِ جدید ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے وضع کیا گیا ہے ۔ ہندو اکثریت کے صوبوں میں ہندوؤں کو قطعی اکثریت حاصل ہے اور وہ وہاں مسلمانوں کو بالکلیہ نظر انداز کر سکتے ہیں ۔ برخلاف اس کے مسلم اکثریت کے

صوبوں میں مسلمانوں کو ہندوؤں کا دستِ نگر رکھا گیا ہے۔ مجھے اس امر میں قطعاً ذرہ برابر شک و شبہ کی گنجائش نظر نہیں آتی کہ موجودہ دستور ہندی مسلمانوں کے لیے زہر قاتل کا حکم رکھتا ہے۔ مزید براں یہ دستور تو اس معاشی تنگدستی کا جو مسلمانوں میں شدید تر ہوتی جا رہی ہے، کوئی علاج ہی نہیں ہے۔ فرقہ وارانہ فیصلہ ہندوستان میں مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو تسلیم تو کرتا ہے لیکن کسی قوم کی سیاسی ہستی کا ایسا اعتراف، جو اس کی معاشی پس ماندگی کا کوئی حل نہ تجویز کرتا ہو اور نہ کر سکے، اس کے لیے بے سود ہے۔ کانگریس کے صدر نے تو غیر مبہم الفاظ میں مسلمانوں کی جداگانہ سیاسی حیثیت ہی سے انکار کر دیا ہے۔ ہندوؤں کی دوسری سیاسی جماعت ہندو سہاسبھا نے، جسے میں ہندو عوام کی حقیقی نمائندہ جماعت سمجھتا ہوں، بارہا اعلان کیا ہے کہ ہندو اور مسلمانوں کی متحدہ قومیت کا وجود ہندوستان میں ناممکن ہے۔ ان حالات میں یہ ظاہر ہے کہ ایک پر امن ہندوستان حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ لسانی، مذہبی اور نسلی میلانات کی بناء پر ملک کو از سر نو تقسیم کر دیا جائے۔ اکثر برطانوی مدبرین اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں اور ہندو مسلم فسادات جو اس دستور (جدید) کے جلو میں پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں، یقین ہے کہ ملک کی صحیح صورتِ حال کو ان پر واضح کر دیں گے۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے میری روانگی سے قبل لارڈ لوتھیان نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری اسکیم ہی ہندوستان کی مشکلات کی واحد ممکنہ حل ہے، لیکن اس کے بارآور ہونے کے لیے پچیس سال درکار ہوں گے۔ پنجاب کے بعض مسلمان تو پہلے ہی سے شمال مغربی ہند مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پر غور کر رہے ہیں اور یہ خیال عام ہوتا جا رہا ہے۔ اس امر میں، میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ ہماری قوم ابھی تک نظم و ضبط سے محروم ہے اور شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں ہے لیکن

میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقۂ کار کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے ، جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار لازماً اختیار کرنا ہی پڑے گا ۔

میرے خیال میں تو جدید دستور سارے ہندوستان کو ایک ہی وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بناء پر بالکلیہ یاس انگیز ہے ۔ ان خطوط (Lines) پر جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ۔ مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق کی تشکیل ہی وہ واحد طریقہ عمل ہے ، جس کے ذریعہ ہم ایک پر امن ہندوستان حاصل کر سکتے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے بچا سکتے ہیں ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قوم قرار دیا جائے ، جنھیں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر رہنے والی دوسری قوموں کے مانند خود اختیاری کا استحقاق ہے ؟

ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیتی صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑے گا ۔ مسلم اکثریت اور مسلم اقلیت کے صوبوں کا مفاد اسی طریقۂ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے ۔ اسی لیے لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبے میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہو گا ۔ لاہور میں اگست تکلیف دہ ہوتا ہے ، میری رائے میں آپ کو لاہور میں ، وسط اکتوبر میں ، جب کہ موسم خوشگوار ہو جاتا ہے لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیے ۔ پنجاب میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ساتھ دلچسپی بڑی تیزی سے بڑھ رہی ہے اور لیگ کے آئندہ اجلاس کا لاہور میں انعقاد ، پنجابی مسلمانوں کی سیاسی بیداری کے لیے از حد مفید ہو گا ۔

آپ کا مخلص محمد اقبال ۔ بار ایٹ لا[۱۳] "

۱۳۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۸ تا ۲۳

یہ خط بصیغہ راز ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا ، لیکن اس سے تقریباً ایک ماہ قبل یعنی ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب نے مسٹر جناح کی توجہ مسلمانوں کی معاشی حالت اور اس کی اصلاح کی طرف منعطف کراتے ہوئے تقسیم ملک کی تجویز کا ذکر کیا ہے ۔ مناسب ہے کہ اس خط کا اقتباس بھی یہاں پیش نظر رہے ۔

" اسلامی قوانین کا طویل اور محتاط طریقہ پر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو پوری طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے حق کی طمانیت تو حاصل ہو جاتی ہے ، لیکن اس ملک میں شریعتِ اسلامیہ کے نفاذ اور اس کا ارتقا ، ایک یا ایک سے زائد آزادانہ مسلم مملکتوں کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ۔ کئی سال سے یہ میرا ایماندارانہ ایقان رہا ہے اورمیں اب بھی مسلمانوں کی روٹی کے مسئلہ کو حل کرنے کا اور ساتھ ہی ایک پر امن ہندوستان حاصل کرنے کا اسی کو واحد طریقہ سمجھتا ہوں ۔ اگر ہندوستان میں یہ چیز ناممکن ہے تو دوسری متبادل صورت خانہ جنگی کی ہے جو واقعتاً کچھ عرصہ سے ہندو مسلم فسادات کی صورت میں جاری ہے ۔ مجھے ڈر ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کو دہرایا جائے گا ۔ پھر ہندو مت کی ہیئت سیاسی میں جواہر لال کی اشتراکیت کے داخلہ سے خود ہندوؤں میں کافی کشت و خون ہونے کا امکان ہے ۔ معاشری جمہوریت اور برہمنیت میں جو وجہ نزاع ہے وہ برہمنیت اور بدھ مت کی وجہ نزاع سے مختلف نہیں ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اشتراکیت کا بھی ہندوستان میں وہی حشر ہوگا جو بدھ مت کا ہو چکا ہے ۔ لیکن میرے ذہن میں یہ بات بالکل صاف ہے کہ اگر ہندو مت نے معاشری جمہوریت (Social Democracy) کو قبول کر لیا تو لازماً ہندو مت کا خاتمہ ہو جائے گا ۔ اسلام کا معاشری جمہوریت کو کسی موزوں شکل میں اور اسلامی اصولِ قانون کی تائید و ہم آہنگی کے ساتھ قبول کرنا ، حقیقت میں کوئی

انقلاب نہیں ہے بلکہ اسلام کی ابتدائی اور حقیقی پاکیزگی کی طرف رجوع کرنا ہوگا ۔ موجودہ مسائل کا حل مسلمانوں کے لیے ہندوؤں سے کہیں زیادہ آسان ہے لیکن جیسا کہ میں اوپر کہہ چکا ہوں ، ان مسائل کو مسلم ہندوستان میں حل کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ملک کو از سرِ نو تقسیم کیا جائے اور ایک یا ایک سے زاید ایسی مسلم مملکتیں قائم کی جائیں ، جہاں (مسلمانوں کی) اکثریت قطعی ہو ۔ کیا آپ کی رائے میں اس مطالبہ کا وقت نہیں آن پہنچا ہے ؟ شاید جواہر لال کی منکرِ خدا اشتراکیت کا یہی وہ بہترین جواب ہے جو آپ دے سکتے ہیں [۱۴] ''

یہ خط بھی بصیغہ راز لکھا گیا ۔ اس خط میں ایک تحریر مابعد بھی ہے جس میں ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں ۔

'' اس نیاز نامہ کے موضوع پر میرا ارادہ تھا کہ آپ کے نام اخبارات میں ایک کھلا خط شائع کراؤں لیکن مزید غور کرنے پر میں نے موجودہ وقت کو اس کے لیے مناسب نہ پایا[۱۵] ''

ان دونوں خطوط کو تاریخی اہمیت حاصل ہے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ فرقہ وارانہ فسادات اور پنڈت جواہر لال نہرو کی منکرِ خدا اشتراکیت کا پرچار اور مسلمانوں کے سیاسی وجود کو تسلیم کرنے سے انکار ——— یہ وہ فوری محرکات ہیں جو ان خطوط کے لکھنے کا باعث ہوئے ۔ وہ جانتے تھے کہ ان کی اس اسکیم کو اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ ملک کے سامنے پیش کرنے کا وقت نہیں آیا ہے ، اس لیے انھوں نے ان خیالات کو رازدارانہ انداز میں مسٹر جناح پر واضح کیا لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ مسٹر جناح ان ہی خیالات کو اپنے طور پر موقع و محل کی مناسبت کا لحاظ کرتے ہوئے عوام کے سامنے ضرور پیش کریں ۔ چنانچہ ۲۸ مئی والے خط کے آخری حصہ میں لکھتے ہیں ۔

۱۴- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۶ تا ۱۸

۱۵- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۸

"بہرحال میں نے اپنے خیالات آپ کی خدمت میں اس اُمید پر پیش کر دیئے ہیں کہ آپ ان پر اپنے خطبہ یا لیگ کے آئندہ اجلاس کے مباحث میں پوری پوری توجہ مبذول کریں گے - مسلم ہندوستان توقع کرتا ہے کہ اس نازک موقع پر آپ کی ذہانت ، ہماری موجودہ مشکلات کے درمیان کوئی نہ کوئی راستہ دریافت کر ہی لے گی[۱۶] "

پھر ۲۱ جون کے خط میں تقسیم ہند کی تجویز کے متعلق اپنے خیالات کو پیش کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں -

"میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریق عمل کی طرف ضرور اشارہ کر دینا چاہیے ، جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا[۱۷] "

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ دل سے یہ چاہتے تھے کہ ان کی اس تجویز کو مسلمانان ہند اپنا نصب العین بنا لیں لیکن وقت کی نزاکت اور حالات کی پیچیدگی سدِ راہ تھی - اسی لیے وہ چاہتے تھے کہ یہ خیالات کسی نہ کسی صورت میں مسلمانوں تک پہنچ جائیں تاکہ جب وہ وقت آئے ، جو مسلمانانِ ہند کے لیے مقدر ہو چکا ہے اور حال کی پیچیدگی اور ماضی کی کوتاہ نظری کے پردے مستقبل کے چہرے پر سے ایک ایک کر کے اُٹھتے جائیں اور مسلمان ایک برافگندہ نقاب حقیقت سے دوچار ہوں تو اس وقت یہ خیالات ان کے لیے دلیلِ راہ ثابت ہوں اور وہ اپنی منزلِ مقصود کو بیک نظر پہچان لیں - یہ تو تھی ان کی سیاسی بصیرت ، لیکن شاید شاعر کے اندرونی وجدان نے ان سے کہہ دیا تھا کہ مسلمانوں کی منزلِ مقصود کے متعین ہونے سے قبل وہ خود اس کاروان سے چھوٹ کر اپنی منزلِ اعلیٰ تک پہنچ جائیں گے - اسی لیے انھوں نے یہ مناسب سمجھا کہ

۱۶- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۸

۱۷- ایضاً ص ۲۲

اس وقت کے آنے سے پہلے ہی میرِ کاروان کو منزلِ مقصود کا پتہ بتا دیا ہے۔

۵۔ شمال مغربی ہند کے مسئلہ کی اہمیت :۔ تقسیم ملک یا شمال مغربی ہند اور بنگال میں ایک علیحدہ مسلم وفاق مملکت کے نصب العین کو پھیلانے اور مقبول بنانے کے لیے انھوں نے مسٹر جناح کے سامنے ایک تجویز یہ رکھی کہ شمال مغربی ہند میں ایک مسلم کانفرنس منعقد کی جائے ، چنانچہ وہ ۲۱ جون والے خط میں مسٹر جناح کو لکھتے ہیں ۔

" پنجاب کے بعض مسلمان تو پہلے ہی سے شمال مغربی ہند مسلم کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پر غور کر رہے ہیں اور یہ خیال پھیلتا جا رہا ہے ۔ اس امر میں میں آپ کا ہم خیال ہوں کہ ہماری قوم ابھی تک نظم و ضبط سے محروم ہے ۔ شاید ایسی کانفرنس کے انعقاد کے لیے ابھی وقت سازگار نہیں ہے[۱۸] "

اس اقتباس کے پڑھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس سے قبل ڈاکٹر صاحب نے اپنی کسی گفتگو یا خط میں مسٹر جناح کے سامنے شمال مغربی ہند میں کانفرنس منعقد کرنے کی تجویز پیش کی تھی اور جناح صاحب نے مسلمانوں کی تنظیمی حالت اور اس وقت کی سیاسی فضا کے پیشِ نظر اس تجویز سے اتفاق نہیں کیا ۔ اس کے بعد ڈاکٹر صاحب نے اس تجویز پر پھر زور نہیں دیا لیکن وہ بار بار اس امر کی طرف توجہ دلاتے ہیں کہ مسلم لیگ اور مسٹر جناح کو شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے مسائل کی طرف زیادہ توجہ کرنی چاہیے ۔ چنانچہ اپنے اسی خط میں لکھتے ہیں ۔

" میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقِ عمل کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار اختیار کرنا ہی پڑے گا[۱۹] "

۱۸۔ ایضاً ص ۲۲

۱۹۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۲

پھر ۱۱ اگست کو لکھتے ہیں۔

"واقعات نے بالکل واضح کر دیا ہے کہ لیگ کو اپنی تمام تر مساعی کو شمالی مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے لیے مرکوز کر دینا چاہیے[۲۰]"

جب مسٹر جناح نے شمال مغربی ہند میں مسلم کانفرنس کے انعقاد کی تجویز سے اتفاق نہیں کیا، تو انھوں نے شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے مسائل کو لیگ کی توجہ کا مرکز بنانے کے لیے یہ تجویز پیش کی کہ لیگ کا سالانہ اجلاس کسی اقلیتی صوبے میں ہونے کی بجائے کسی اکثریتی مسلم صوبے یا لاہور میں منعقد ہو۔ چنانچہ اپنے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

"لیگ کا آئندہ اجلاس کسی مسلم اقلیت کے صوبہ میں منعقد کرنے کے بجائے پنجاب میں منعقد کرنا بہتر ہوگا۔ لاہور میں اگست تکلیف دہ ہوتا ہے۔ میری رائے میں آپ کو لاہور میں وسط اکتوبر میں جب موسم خوشگوار ہو جاتا ہے، لیگ کے اجلاس کے انعقاد کے امکان پر غور کرنا چاہیے[۲۱]"

۱۱ اگست کو پھر لکھتے ہیں۔

"میں مکرر درخواست کرتا ہوں کہ لیگ کا اجلاس اکتوبر کے وسط یا آخر میں لاہور میں منعقد کیا جائے۔ پنجاب میں لیگ کے لیے روز افزوں سرگرمی کا اظہار کیا جا رہا ہے اور مجھے اس بارے میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ لاہور میں لیگ کا اجلاس، لیگ کی تاریخ میں ایک انقلاب آفریں باب اور عوام کو لیگ سے مربوط کرنے کا ایک اہم ذریعہ ثابت ہوگا[۲۲]"

۲۰- ایضاً ص ۲۳

۲۱- ایضاً ص ۲۳

۲۲- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۲۴

۶- اکثریتی صوبوں اور اقلیتی صوبوں کی سیاسی پالیسی جداگانہ ہو :- شمال مغربی ہند اور بنگال میں ایک علیحدہ مسلم وفاقی مملکت کے نصب العین کو مقبول بنانے اور اس کو حاصل کرنے کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ اکثریتی اور اقلیتی صوبوں کے مسائل کو باہم غلط ملط نہ کیا جائے - ان کی یہ غور کردہ رائے تھی کہ شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کے مسئلہ کی نوعیت ، اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے مسئلہ سے بالکل جداگانہ ہے - ان دونوں خطوں کے مسلمانوں کے لیے ایک ہی قسم کی سیاسی پالیسی اختیار کرنے سے دونوں کو نقصان ہوگا اور دونوں کے مفاد کا اقتضاء یہ ہے کہ ان کے سیاسی راستے بڑی جدا جدا ہوں - چنانچہ وہ ۲۱ جون کے خط میں لکھتے ہیں -

> " ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیتوں کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑے گا - مسلم اکثریت و مسلم اقلیت کے صوبوں کا مفاد اسی طریقہ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے[۲۳]"

ان خطوط میں انہوں نے مسلم اکثریتی صوبوں کے طریقہ کار کے بعض خد و خال کا ذکر تو کیا ہے لیکن اقلیتی صوبوں کے لیے کوئی لائحہ عمل تجویز نہیں کیا !

۷- اکثریتی صوبوں میں مسلم حکومت کے قیام کی تجویز :- بیان کیا جا چکا ہے کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں مسلم لیگی وزارتیں قائم نہ ہو سکی تھیں - سرحد میں کانگریسی وزارت برسر اقتدار تھی - سندھ کی وزارت نیم کانگریسی تھی ، البتہ پنجاب اور بنگال کی وزارتیں کانگریس کے اثر و نفوذ سے باہر تھیں - لیکن یہاں بھی نہ تو خالص مسلم لیگی وزارتیں تھیں اور نہ وہ ہندو اثرات سے آزاد تھیں - ڈاکٹر صاحب کی خواہش یہ تھی کہ مسلم اکثریتی صوبوں میں ایسی وزارتیں قائم ہوں جو ایک آزاد مسلم پالیسی اختیار کر سکیں - اس کے لیے وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمانوں کی

۲۳- ایضاً ص ۲۲

مکمل تنظیم کی جائے ۔ ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء کو مسٹر جناح کی توجہ اس طرف مبذول کراتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

" ہمیں مسلمانوں کی تنظیم کے لیے اپنی تمام قوتیں ہمیشہ سے زیادہ گرم جوشی کے ساتھ وقف کر دینی چاہئیں اور اس وقت تک دم نہ لینا چاہیے ، جب تک پانچ صوبوں میں مسلمانوں کی حکومت قائم نہیں ہو جاتی اور بلوچستان کو اصلاحات نہیں ملتیں[۲۳] "

۸- **فرقہ وارانہ فیصلہ کی تائید :-** فرقہ وارانہ فیصلہ کے اعلان سے قبل ڈاکٹر صاحب کی سیاسی مساعی اور اس اعلان کے بعد ان کے طرز عمل پر گذشتہ صفحات میں روشنی ڈالی گئی ہے ۔ فرقہ وارانہ فیصلہ کی سب سے بڑی خوبی ڈاکٹر صاحب کی نظر میں یہ تھی کہ اس کی وجہ سے جدید دستور میں مسلمانوں کے جداگانہ سیاسی وجود کو تسلیم کر لیا گیا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب نے اس فیصلہ کی دیگر خرابیوں کے علی الرغم محض اس خوبی کی وجہ سے تائید کی تھی اور مسلمانوں کو مشورہ دیا تھا کہ گوناگوں نقائص کے باوجود اس فیصلہ کو قبول کر لیں ۔ پھر انھوں نے کسی ایسی فرقہ وارانہ مفاہمت کی تائید نہیں کی تھی ، جس سے مسلمانوں کی وہ حیثیت متاثر ہوتی ہو جو انھیں فرقہ وارانہ فیصلہ کے ذریعہ حاصل ہوئی تھی ۔ انھوں نے جب سنا کہ پنجاب اور سندھ میں ایسی کوششیں ہو رہی ہیں تو فوراً مسٹر جناح کو اس طرف متوجہ کیا ۔ ۱۷ اکتوبر کو وہ لکھتے ہیں ۔

" میری تجویز ہے کہ لیگ کو چاہیے کہ فرقہ وارانہ فیصلہ سے متعلق اپنی پالیسی ایک مناسب قرارداد کی صورت میں واضح کر دے ۔ خود پنجاب میں اور میں نے سنا ہے سندھ میں بھی بعض گمراہ مسلمان اس فیصلہ کو اس طرح بدل دینے کے لیے تیار ہیں کہ یہ ہندوؤں کے حق میں زیادہ مفید ہو جائے ۔ ایسے لوگ

۲۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ ص ۲۷

اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ہندوؤں کی خوشنودی حاصل کر لینے کے بعد وہ اپنا موجودہ اثر و اقتدار بحال رکھ سکیں گے۔ ذاتی طور پر میں یہ سمجھتا ہوں کہ انگریز ہندوؤں کو خوش کرنا چاہتا ہے اور ہندو فرقہ وارانہ فیصلہ کا خاتمہ کرنے والوں کے لیے دیدہ و دل فرش راہ کریں گے۔ اس لیے برطانوی حکومت اپنے مسلمان ایجنٹوں کے کندھوں پر ہی اس کا جنازہ اٹھوانا چاہتی ہے[۲۵]"

پھر اسی خط کی تحریر مابعد کا جزیہ ہے۔

"لیگ کو اس امر کی قرارداد پاس کرنی چاہیے کہ کوئی صوبہ دوسری اقوام کے ساتھ فرقہ وارانہ فیصلہ سے متعلق کوئی سمجھوتہ کرنے کا مجاز نہ ہوگا۔ چونکہ اس مسئلہ کا تعلق تمام ہندوستان سے ہے، لہذا اسے طے کرنے کا حق صرف لیگ ہی کو حاصل ہوگا۔ شاید ایک قدم آگے بڑھا کر آپ کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ فضا کسی فرقہ وارانہ مصالحت کے لیے سازگار ہی نہیں ہے[۲۶]"

۹۔ **تحریک رابطہ مسلم عوام کا جواب :۔** اس زمانہ میں رابطۂ مسلم عوام کی کانگریسی تحریک بڑے زور شور سے چل رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے اس مسئلہ کی طرف قائد اعظم کی توجہ منعطف کراتے ہوئے یہ بتلایا کہ اس تحریک کا صحیح جواب یہی ہو سکتا ہے کہ مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنایا جائے۔ اس کے لیے آپ نے مختلف تجویزیں پیش کیں۔ ایک تو یہ کہ مسلم لیگ کے دستور میں ترمیم کی جائے دوسرے یہ کہ مسلم عوام کے معاشی مسائل کو حل کیا جائے۔ تیسرے یہ کہ فلسطین اور شہید گنج کے مسئلہ میں لیگ مضبوط قدم اٹھائے۔

۱۰۔ **مسئلہ فلسطین :۔** بیرونی ہند کے مسائل میں سے ڈاکٹر صاحب

۲۵۔ ایضاً ص ۲۵

۲۶۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۶

نے مسٹر جناح کو مسئلہ فلسطین کی طرف نہایت پر زور الفاظ میں توجہ دلائی - ۷ اکتوبر کے خط میں لکھتے ہیں -

" مسئلہ فلسطین نے مسلمانوں کو مضطرب کر رکھا ہے - لیگ کے مقاصد کے لیے عام مسلمانوں سے رابطہ پیدا کرنے کا ہمارے لیے یہ عمدہ موقع ہے - مجھے امید ہے کہ لیگ اس مسئلہ پر ایک مناسب قرارداد ہی منظور نہیں کرے گی ، بلکہ لیڈروں کی ایک غیر رسمی کانفرنس میں کوئی ایسی راہ عمل بھی متعین کی جائے گی جس میں عوام بڑی تعداد میں شامل ہو سکیں - اس سے بیک وقت لیگ کو قبولیت عامہ حاصل ہوگی اور فلسطینی عربوں کو مدد بھی ملے گی -

ذاتی طور پر میں کسی ایسے امر کے لیے جس کا اثر ہندوستان اور اسلام دونوں پر پڑتا ہو ، جیل جانے کے لیے تیار ہوں - ایشیا کے دروازہ پر ایک مغربی فوجی اڈے کی تعمیر اسلام اور ہندوستان دونوں کے لیے ایک خطرہ ہے[۲۷] "

نا مناسب نہ ہوگا اگر یہاں ہم ان تاثرات کو نذر قارئین کر دیں جو قائد اعظم نے علامہ مرحوم کی اس دور کی سیاسی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے ، ظاہر کئے تھے - قائد اعظم مسٹر جناح (Letters of Iqbal to Jinnah) " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " کے پیش لفظ میں ارشاد فرماتے ہیں -

" جون ۱۹۳۶ع میں مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ کے قیام سے لے کر اکتوبر ۱۹۳۷ع میں لیگ کے عظیم الشان تاریخی اجلاس لکھنؤ تک کا زمانہ مسلم ہندوستان کی تاریخ کا پر از واقعات زمانہ ہے - اگر مرکزی پارلیمانی بورڈ کا قیام مسلم لیگ کی جانب سے عوام کو ایک پرچم تلے متحد کر کے ۱۹۳۵ع کے دستور کے تحت صوبائی مقننہ کے انتخابات میں مسلم لیگ کے ٹکٹ پر حصہ لینے کی

۲۷- ایضاً ص ۲۶

ایک عظیم کوشش تھی ، تو لکھنؤ کا اجلاس مسلم لیگ کو عوامی بنیادوں پر منظم کر کے مسلمانانِ ہند کا واحد مقتدر نمائندہ ادارہ بنانے کی طرف پہلا قدم تھا ۔ یہ دونوں بلند مقاصد اس وقت حاصل ہوئے جبکہ سر محمد اقبال اور ان ہی جیسے دوستوں کی مخلصانہ کوششوں ، محب وطن اور بے غرض سرگرمیوں کی بدولت مجھے نہایت بیش قیمت امداد حاصل ہوئی[۲۸] "

اس کے بعد قائد اعظم نے اس امر کا ذکر کیا ہے کہ کس طرح ہر صوبہ میں پارلیمانی بورڈ بنائے گئے اور کس طرح مدراس سے لے کر صوبہ سرحد تک ہر صوبہ میں مسلم لیگ کی شاخیں قائم کی گئیں پھر یہ واضح کیا کہ کس طرح مسلم لیگ نے کانگریس کی تحریکِ رابطۂ مسلم عوام کا جواب دیا ، اور اجلاس لکھنؤ کے موقع پر وہ کس طرح ایک عوامی جماعت بن چکی تھی ، اس کے بعد وہ لکھتے ہیں ۔

" مسلم لیگ کی بڑی کامیابی تھی کہ اس کی قیادت کو مسلم اکثریت و اقلیت کے صوبوں نے تسلیم کر لیا تھا ۔ سر محمد اقبال نے لیگ کو اس منزل تک پہنچانے میں بہت ہی نمایاں حصہ لیا تھا ۔ اگرچہ ان کا یہ کارنامہ عوام کے سامنے اس وقت نہ آ سکا تھا[۲۹] "

پھر اس پیش لفظ کے آخر میں ارشاد فرماتے ہیں ۔

" یہ خطوط(الف) بڑی تاریخی اہمیت کے حامل ہیں ۔ خصوصاً وہ ، جن سے مسلم ہندوستان کے مستقبل سے متعلق ان کے نظریات کی صاف اور غیر مبہم الفاظ میں وضاحت ہوتی ہے ۔ ان کے یہ نظریات بنیادی طور پر ، میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان

۲۸۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱ ، ۲

۲۹۔ ایضاً ص ۳

الف یعنی اقبال کے خطوط جناح کے نام

کے دستوری مسائل کا با احتیاط مطالعہ اور ان کی چھان پھٹک کرنے کے بعد ان نظریات نے مجھے ان ہی نتائج تک پہنچایا ، جس پر وہ پہنچ چکے تھے ، اور یہی نظریات کچھ عرصہ بعد ، مسلم ہند کی متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے جس کا اظہار کل ہند مسلم لیگ کی قرارداد لاہور میں ہوا ، جس کو عام طور پر قراردادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ع کو منظور ہوئی[۳۰] "

یوم اقبال منعقدہ لاہور ۹ دسمبر ۱۹۴۴ع کے موقع پر قائد اعظم نے جو پیام دیا ، اس کو بھی سن لیجئے ۔

" وہ پیغمبرِ اسلام کے سچے اور راسخ العقیدہ پیروؤں میں سے تھے ـــــ مسلمان اول اور مسلمان آخر ـــــ وہ اسلام کے ترجمان اور اس کی آواز تھے ۔ ان کی شخصیت میں شاعر کی تصوریت اور ایک ایسے شخص کی حقیقت پسندی (Realism) تھی جو واقعات کا علمی جائزہ لیتا ہے . . . . انھیں اسلامی اصولوں پر غیر متزلزل اعتقاد تھا اور زندگی کی کامیابی ، ان کی نظر میں یہ تھی کہ خودی کو پروان چڑھایا جائے اور اس مقصد کے حصول کا واحد طریقہ یہ تھا کہ اسلامی تعلیمات کی پیروی کی جائے ۔ اگرچہ وہ ایک بڑے شاعر اور فلسفی تھے ۔ تاہم وہ کچھ کم سیاستدان نہ تھے ۔ اسلامی تصورات میں یقین محکم رکھتے ہوئے ، وہ ان چند لوگوں میں سے تھے جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان میں شمال مغرب و شمال مشرقی منطقوں میں جو مسلمانوں کے تاریخی وطن (Historical Home Lands) رہے ہیں ، ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا تخیل پیش کیا[۳۱] "

۳۰۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ع ص ۴ و ۵ ۔

۳۱۔ سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف جناح جلد دوم مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ع ص ۲۳۲

خیر چلئے - اقبال تو شاعر تھے - فلسفی تھے ، مگر جناح ؟ . . . . . جناح تو عملی آدمی تھے - چوٹی کے سیاست داں ! ان کا یہ خراجِ تحسین محض اعتراف خدمات ہے یا اقبال کی سیاست دانی پر قائد اعظم کی مہرِ توثیق و سندِ تصدیق ؟ !

اب یہ بھی سن لیجیے کہ قائد اعظم کے متعلق خود اقبال کی کیا رائے تھی - ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، اپنے ایک مضمون میں لکھتے ہیں -

" ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) لیگ کے حامی اور مسٹر جناح کے بہت بڑے مداح تھے - ایک روز مسٹر جناح کی امانت و دیانت اور قابلیت کا ذکر ہو رہا تھا - ڈاکٹر صاحب نے فرمایا مسٹر جناح کو خدائے تعالیٰ نے ایک ایسی خوبی عطا کی ہے ، جو آج ہندوستان کے کسی مسلمان میں مجھے نظر نہیں آتی - حاضرین میں سے کسی نے پوچھا - وہ خوبی کیا ہے ، تو آپ نے انگریزی میں کہا He is incorruptable and unpurchaseable اس محفل میں ایک شخص نے کہا ، لیکن ڈاکٹر صاحب ,مسٹر جناح تو شیعہ ہیں - ڈاکٹر صاحب نے قدرے گرم ہو کر کہا -

آپ یہاں بھی شیعہ ، سنی کا جھگڑا کھڑا کرنا چاہتے ہیں ؟ جناح نے کب محدث و مفسر یا فقیہہ ہونے کا دعویٰ کیا ہے ؟ اس بیچارے نے کب کہا کہ وہ عالمِ دین یا امامِ وقت ہے - اس نے کہاں لکھا ہے کہ مسلمان اس سے کتاب و سنت کا درس لیں ، بات یہ ہے کہ انگریز نے ہندوستان میں پارلیمنٹری طرزِ حکومت کے نام سے اپنی شہنشاہیت کو مضبوط کرنے کا ایک جال بچھایا ہے - جناح اس جال کی ایک ایک گرہ سے واقف ہے ، وہ انگریزی سلطنت کی چالوں سے اس حد تک آگاہ ہے کہ خود انگریز بھی اس سے خائف ہیں - وہ بیچارہ صرف یہ کہتا ہے کہ مسلمان اس نظامِ حکومت کے تحت کہیں خسارہ نہ اٹھا لیں ، اس لیے وہ اپنی سیاسی بصیرت کی روشنی میں آپ کو ہوشیار ہو جانے

کی تلقین کرتا ہے[۳۲]"

اپنے ایک خط میں جو ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء کو لکھا گیا ۔ وہ مسٹر جناح کو اس طرح مخاطب کرتے ہیں ۔

"آج ہندوستان میں ، آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں ، جس کی طرف مسلم جماعت نظریں اٹھا کر دیکھنے کا حق رکھتی ہے ، کیونکہ اس طوفانِ بلا میں ، جو شمال مغربی ہند اور شاید پورے ملک میں آ رہا ہے ، آپ ہی اس کی قیادت فرماتے ہوئے بحفاظت تمام اس کو ساحل مراد تک پہنچائیں گے[۳۳]"

علامہ اقبال کے ان الفاظ کا مترادف لقب کیا ہو سکتا ہے ؟ " قائد اعظم " ! ! مندرجہ بالا دونوں اقتباسات میں، علامہ مرحوم نے قائد اعظم کے کردار اور شخصیت کی کس قدر صحیح اور مکمل عکس کشی کی ہے ۔ دنیائے تخیل میں کھوئے ہوئے رہنے والے شاعر اقبال کی یہ کوئی خوش فہمی یا مدح سرائی نہیں ہے ، بلکہ خار زار سیاست میں کھرے کھوٹے کو پرکھنے والے مردم شناس اقبال کی یہ جوہر شناسی ہے ! —— پھر یہ بھی نہ سمجھیے کہ یہ صرف کھوکھلی باتیں تھیں ، زبان پر یہ اور دل میں کچھ اور ! جنوری سنہ ۱۹۳۸ء یعنی انتقال سے تین یا ساڑھے تین ماہ قبل کی بات ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو لاہور آئے ہوئے تھے ۔ علامہ نے کہلا بھیجا کہ ملتے جائیے ۔ پنڈت جی ان کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ کانگریسی رکن اسمبلی (پنجاب) میاں افتخار الدین بھی ان کے ساتھ تھے ۔ اس زمانہ میں علامہ شدید بیمار تھے ۔ بستر علالت پر دراز، پنڈت جی سے مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی رہی ۔ دوران گفتگو علامہ نے پنڈت نہرو سے پوچھا ۔

۳۲۔ آثارِ اقبال ، مرتبہ غلام دستگیر رشید ، ناشر ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۴۶ء ص ۴۱ و ۴۲ ۔

۳۳۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۹ ۔

" سوشلزم کے بارے میں کانگریس کے کتنے آدمی آپ کے ہم خیال ہیں "

نہرو نے جواب دیا ۔

" نصف درجن کے قریب "

علامہ نے فرمایا ۔

" تعجب ہے ، خود آپ کی جماعت میں آپ کے ہم خیالوں کی تعداد صرف نصف درجن ہے ۔ ادھر آپ مجھ سے کہتے ہیں کہ میں مسلمانوں کو کانگریس میں شامل ہو جانے کا مشورہ دوں ۔ تو کیا میں دس کروڑ مسلمانوں کو چھ آدمیوں کی خاطر آگ میں جھونک دوں ؟ "

پنڈت جی کے پاس اس کا کیا جواب ہو سکتا تھا ۔ خاموش ہو رہے ۔ پھر علامہ نے ہندو مسلم تعلقات کا ذکر چھیڑا اور ان دونوں قوموں کے مابین ، خوشگوار تعلقات قائم کرنے پر زور دیا ۔ ابھی سلسلۂ گفتگو جاری تھا کہ میاں افتخار الدین بیچ میں بول اٹھے ۔

" ڈاکٹر صاحب ! آپ مسلمانوں کے لیڈر کیوں نہیں بن جاتے مسلمان مسٹر جناح سے زیادہ آپ کی عزت کرتے ہیں ۔ اگر آپ مسلمانوں کی طرف سے کانگریس سے بات چیت کریں تو نتیجہ بہتر نکلے گا "

ڈاکٹر صاحب اب تک تو لیٹے ہوئے تھے ۔ یہ سنتے ہی غصہ میں آ گئے اور اٹھ کر بیٹھ گئے اور انگریزی میں کہنے لگے ۔

" اچھا تو یہ چال ہے کہ آپ مجھے بہلا پھسلا کر ، مسٹر جناح کے مقابلہ پر کھڑا کرنا چاہتے ہیں ۔ میں آپ کو بتا دینا چاہتا ہوں کہ مسٹر جناح ہی مسلمانوں کے اصل لیڈر ہیں اور میں تو ان کا ایک معمولی سپاہی ہوں "

اس کے بعد ڈاکٹر صاحب بالکل خاموش ہو گئے اور کمرے میں تکدر آمیز سکوت طاری ہو گیا ، پنڈت نہرو ، اجازت لے کر رخصت

ہو گئے[۳۴] -

یہ تھے جناح اور یہ تھے اقبال -

ع شعلہ‌ٔ عشق سیہ پوش ہوا ، ان کے بعد

اقبال کے انتقال کے بعد ، جناح کھلے دل سے ان کی سیاسی خدمات اور ان کے کارناموں کا اعتراف کرتے ہیں ، پر آشوب سیاسی دور میں ان کی رفاقت کو سراہتے اور مسلم ہندوستان کے مستقبل سے متعلق ان کے نظریات کو اپنے افکار سے ہم آہنگ بلکہ رہبر بتاتے اور صاف لفظوں میں اقرار کرتے ہیں کہ یہی نظریات بالآخر قرارداد پاکستان کی صورت میں جلوہ گر ہوئے -

اقبال جناح کو وہ واحد مسلمان بتاتے ہیں جو طوفان بلاخیز میں مسلمانوں کی ناؤ کا کھیویا ہے - سالار وہی ہے اور یہ خود اس کے محض سپاہی !

یہ باہمی سپاس گذاری و تحسین شناسی اس بات کا بین ثبوت ہے کہ دونوں طرف بے غرضی ہے ، دونوں طرف بے نفسی ہے اور دونوں میں اتحادِ فکر و نظر ہے ! ——— ایک فرد فرید ہے ، تو دوسرا یگانہ‌ٔ روزگار ، ایک فرزانہ‌ٔ سیاست ہے تو دوسرا دیوانہ‌ٔ ملت ، اور ہمارے لیے تو دونوں کے دونوں ہی محبوب و محترم ! وہ قائد اعظم ، یہ شاعرِ اعظم !

یہ تھے تو وہ کارنامے ، جو اقبال نے کل ہند سیاسی مسائل کے تعلق سے اس دور میں انجام دئے تھے - اب یہ دیکھیے کہ انھوں نے پنجاب کی

۳۴- یہ پورا واقعہ " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ناشر اقبال اکیڈیمی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۱ع ص ۵۴۸ تا ۵۵۰ سے ماخوذ ہے - بٹالوی صاحب نے لکھا ہے کہ اس واقعہ کے دو چشم دید گواہ میاں فیروز الدین اور راجہ حسن اختر تھے اور راجہ حسن اختر نے بعد میں اس واقعہ کی لفظ بلفظ تصدیق کی تھی -

صوبائی سیاست میں کیا حصہ لیا ۔ پنجاب کی سیاست میں ، اس دوران اقبال نے جو کچھ کیا ۔ اس کو واضح طور پر سمجھنے کے لیے ہمیں پنجاب کی سیاسی جماعتوں ، ان کی تاریخ ، پھر وہاں کے عام سیاسی حالات پر ایک نظر ڈالنی پڑے گی ۔

پنجاب کی سیاست کا پس منظر | زیرِ تبصرہ دور سنہ ۱۹۳۵ع تا سنہ ۱۹۳۸ع میں پنجاب کے اندر ، مسلمانوں کی چار سیاسی جماعتیں ——— ۱۔ مسلم لیگ ۲۔ مجلس احرار ۳۔ اتحاد ملت اور ۴۔ یونینسٹ پارٹی ——— قابلِ ذکر ہیں ۔ مسلم لیگ کا کچھ تذکرہ تو ہم نے گذشتہ صفحات میں کیا ہے اور آئندہ ذرا تفصیل کے ساتھ ، پنجاب کی صوبائی مسلم لیگ کا ذکر اپنے مقام پر آئے گا ۔ یہاں ہم پہلے مختصراً مجلسِ احرار اور اتحادِ ملت کا تعارف کراتے ہیں اور بعد میں یونینسٹ پارٹی کی تاریخ قدرے تفصیل سے بیان کریں گے کیونکہ اقبال کی معرکہ آرائی اس دور میں اسی پارٹی سے رہی ۔ واضح رہے کہ ان جماعتوں کی تاریخ کو پوری طرح سمجھنے کے لیے ہمیں زیر تبصرہ دور (سنہ ۱۹۳۶ع تا سنہ ۱۹۳۸ع) سے ذرا پیچھے کی طرف جانا پڑے گا ۔

سنہ ۱۹۲۸ع سے پہلے مجلس احرار کا وجود نہ تھا ۔ یہ جماعت سنہ ۱۹۲۹ع میں قائم ہوئی اور اس کا پہلا جلسہ دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع میں بمقام لاہور ، زیرِ صدارت چودھری افضل حق منعقد ہوا ۔ یہ جماعت دراصل ، مجلس خلافت سے ٹوٹ کر بنی تھی ۔ سنہ ۱۹۲۴ع میں خلافت ترکیہ کے ختم ہو جانے کے بعد بھی خلافت کمیٹی کا نظام باقی تھا ۔ سنہ ۱۹۲۶ع میں سلطان ابنِ سعود نے حجاز پر قبضہ کر لیا اور مقابر و مآثر کے انہدام کی خبریں ہندوستان آنے لگیں ، جس سے مسلمانوں کے ایک طبقہ میں بے چینی پھیل گئی ۔ خلافت کمیٹی نے ایک وفد اسی سال بسرکردگی مولانا سید سلیمان ندوی ، حجاز روانہ کیا ۔ اس وفد میں مولانا ظفر علی خاں بھی بحیثیت رکن شریک تھے ۔ وفد نے واپس آ کر جو رپورٹ پیش کی ، اس پر علی برادران (مولانا محمد علی مولانا شوکت علی) اور مولانا ظفر علی خاں میں شدید اختلاف پیدا ہو گیا ۔ پنجاب میں مولانا ظفر علی خاں ،

خلافت کمیٹی کے سرگرم رہنما تھے۔ مولانا شوکت علی نے پنجاب خلافت کمیٹی کو سنہ ۱۹۲۸ع میں کالعدم قرار دے دیا۔ اب مولانا ظفر علی خاں نے چودھری افضل حق، عطاءاللہ شاہ بخاری اور داؤد غزنوی کو ساتھ لے کر مجلس احرار اسلام کے نام سے سنہ ۱۹۲۹ع میں ایک نئی جماعت بنا لی۔ یہ جماعت بڑی فعال تھی۔ بڑی دھوم دھام سے اس کے جلسے ہوتے تھے۔ کانگریس کے ساتھ یہ جماعت نتھی ہو گئی۔ سنہ ۱۹۳۰ع کی تحریک سول نافرمانی میں، کانگریسیوں کے دوش بدوش اس جماعت کے زعماء اور دیگر کارکنوں نے حصہ لیا اور قید و بند کی صعوبتیں اٹھائیں۔ مگر مارچ سنہ ۱۹۳۱ع میں کانگریس کے سالانہ اجلاس کراچی کے موقع پر جب اس جماعت کے سربرآوردہ رہنما چودھری افضل حق کو مجلس عاملہ میں نہیں لیا گیا تو یہ جماعت کانگریس سے روٹھ گئی۔ سنہ ۱۹۳۱ع کی تحریک کشمیر میں اس نے بڑے زور و شور سے حصہ لیا اور قربانیاں دیں۔ اب وہ مسلم لیگ کے قریب آ گئی تھی۔ مگر سنہ ۱۹۳۷ع کے اجلاس میں اس نے مسلم لیگ سے بھی علیحدگی کا اعلان کر دیا اور اس کی تمام توانائیاں قادیانیوں کے خلاف صرف ہونے لگیں۔

جولائی سنہ ۱۹۳۵ع میں سکھ مسجد شہید گنج کو مسمار کرنے لگے تو مسلمانوں میں بڑا ہیجان پیدا ہوا۔ وہ احراریوں سے رہنمائی کی توقع کر رہے تھے لیکن مجلس احرار خاموش تماشائی بنی بیٹھی رہی۔ ایسے موقع پر مولانا ظفر علی خاں، سید حبیب، میاں فیروز الدین احمد، ملک لال دین قیصر وغیرہ آگے بڑھے اور گرفتار ہو گئے۔ مسٹر جناح کی کوششوں سے یہ لوگ رہا ہوئے۔ رہائی کے بعد انھوں نے مجلس اتحاد ملت کی بنیاد رکھی اور مسجد شہید گنج کی بازیابی اس جماعت کا سب سے بڑا مقصد قرار پایا۔

مجلس احرار اور مجلس اتحاد ملت، دونوں تحریکوں کو کھڑا کرنے اور ان کو زور شور کے ساتھ چلانے میں مشہور تھیں۔ ان کے جلسے بڑی دھوم دھام سے ہوا کرتے تھے۔ مگر ان کی سیاست ہنگامہ آرائی کی سیاست تھی۔ انتخابات، کونسلوں، اسمبلیوں سے انھیں کچھ زیادہ دلچسپی نہ تھی۔ اس لیے یہ عوامی جماعتیں تو تھیں، پارلیمانی پارٹیاں نہ تھیں۔ ان کے برعکس یونینسٹ پارٹی کو جلسوں، جلوسوں اور تحریکوں سے کوئی

مطلب ہی نہ تھا ۔ اس کی سیاست کا محور پنجاب کی مقننہ تھی ۔ ان معنوں میں یہ عوامی نہیں بلکہ ایک پارلیمانی جماعت تھی اور اسی حیثیت سے وہ سنہ ۱۹۲۱ع سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ع (الف) بلکہ اس کے بعد بھی سنہ ۱۹۴۴ع تک وہ پنجاب کی سیاست پر چھائی رہی ۔ اس کی وجہ سے پنجاب کی مسلم سیاست میں سخت قسم کی پیچیدگیاں اور تکلیف دہ الجھنیں پیدا ہوئیں ، جن کو رفع کرنے کے لیے علامہ اقبال نے ابتداً اس پر کڑی تنقید کی اور آخر میں اپنی علالت کے باوجود اس سے ٹکر لی اور بالآخر قائد اعظم کو اس جماعت کا تیا پانچہ کرنا پڑا ۔ ہم قدرے تفصیل کے ساتھ اس پارٹی کی تاریخ کا ذکر کریں گے تاکہ اس دور کی اقبالی سیاست کے خد و خال اجاگر ہو کر سامنے آ جائیں ــــــــ لیکن اس سے پہلے یہ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب میں مسلمانوں کی عام حالت اور اس پارٹی کے بانی مبانی کا بھی مختصراً کچھ ذکر کر دیا جائے ۔

پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصد تھی ۔ وہ زیادہ تر زراعت پیشہ اور زمیندار تھے ۔ ان کی کثیر تعداد دیہات میں آباد تھی ۔ ہندوؤں کی بڑی تعداد شہروں میں رہتی تھی ۔ تجارت اور صنعت و حرفت ان کا پیشہ تھا اور ساہو کاری پر تو ان کی اجارہ داری تھی ۔ زراعت پیشہ مسلمانوں کی ایک عظیم اکثریت ، قرضوں کے بوجھ تلے دبی ہوئی اور ہندو ساہو کاروں کے چنگل میں پھنسی ہوئی تھی ۔ ہندو بنیا سود در سود کے چکر اور حسابی گورکھ دھندوں میں سادہ لوح دیہاتی مسلمانوں کو الجھا کر من مانی رقمیں وصول کرتا اور نادھندگی کی صورت میں ان کی زمینات اور مال و اسباب ہتھیا لیا کرتا تھا ۔ قانون اس کا ہمنوا تھا اور عدالتیں بھی اسی کی پشت پناہی کیا کرتی تھیں ۔

مذہبی گروہ بندی کے علاوہ مسلمانوں میں دیہاتی اور شہری کی تفریق بھی موجود تھی ۔ یہ تفریق دراصل جلیانوالہ باغ کے شہرت یافتہ گورنر

الف۔ سنہ ۱۹۳۸ع کا ذکر بطور خاص ہم نے اس لیے کیا ہے کہ یہی علامہ اقبال کا سن وفات ہے ۔

سرمائیکل اڈوائر کی پیدا کردہ تھی -

مسلمان تعلیم میں بہت پیچھے تھے - سرکاری ملازمتوں میں ان کا حصہ اپنی آبادی کے تناسب سے بہت کم تھا اور اس لحاظ سے ان میں سیاسی شعور کی بھی کمی تھی - ہندو ان کے برعکس تعلیم میں بہت آگے تھے - سرکاری ملازمتوں پر زیادہ تر وہی قابض تھے اور سیاسی شعور بھی ان کا بہت بڑھا ہوا تھا -

اب ذرا یونینسٹ پارٹی کے بانی مبانی اور اس کے کرتا دھرتا سر فضل حسین کے متعلق بھی کچھ سن لیجیے - یہ بٹالہ ضلع گورداسپور کے رہنے والے تھے - گورنمنٹ کالج لاہور میں اقبال کے ہم سبق و ہم جماعت رہے - سنہ ۱۸۹۷ء میں ان کے ساتھ ہی بی - اے کیا ، پھر انگلستان چلے گئے اور وہاں سے سنہ ۱۹۰۱ء میں بیرسٹر ہو کر پنجاب واپس آ گئے ، اور لاہور میں وکالت کرنے لگے - کچھ عرصہ بعد انھوں نے سیاست میں حصہ لینا شروع کیا - صوبائی کانگریس کے صدر اور پنجاب مسلم لیگ کے معتمد بن گئے اور ان دونوں جماعتوں کی سیاسی سرگرمیوں میں بڑی دلچسپی سے حصہ لینے لگے - سنہ ۱۹۱۶ء میں وہ یونیورسٹی کے حلقہ انتخاب سے پنجاب لیجسلیٹیو کونسل (مقننہ) کے رکن منتخب ہوئے - سنہ ۱۹۲۰ء میں جب کانگریس نے اپنے اجلاس کلکتہ میں ترک تعاون کی قرارداد منظور کی اور مسلم لیگ نے اس کی تائید کی تو فضل حسین نے ان دونوں سیاسی جماعتوں سے علیحدگی اختیار کر لی - اب وہ ملک کی دستوری اور آئینی ترقی کے حامی اور مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کے پر زور موئید بن گئے تھے -

اب لیجئیے ، یونینسٹ پارٹی کی کہانی سنئیے !

مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات یعنی قانونِ حکومتِ ہند سنہ ۱۹۱۹ء کا نفاذ پنجاب میں بھی ہوا - اس کے تحت یہاں انتخابات ہوئے اور سنہ ۱۹۲۱ء میں صوبائی مقننہ ، جس کو اس وقت پنجاب کونسل کہا جاتا تھا ، تشکیل پائی - اس کی ہئیت ترکیبی یہ تھی -

"تئیس سرکاری و غیر سرکاری نامزد ارکان ۔ (کیونکہ سنہ ۱۹۱۹ء کے قانون کے تحت حکومت کچھ ارکانِ مقننہ کو نامزد بھی کرتی تھی ، ان میں سرکاری عہدہ دار بھی ہوتے تھے اور غیر سرکاری افراد بھی) ۔

اکہتر منتخبہ اراکین ۔

اس طرح یہ ایوان (۹۴) اراکین پر مشتمل تھا ۔ اکہتر منتخبہ اراکین کی تفصیل حسبِ ذیل تھی ۔

پینتیس (۳۵) مسلمان
پندرہ (۱۵) سکھ
اکیس (۲۱) ہندو

ان پینتیس (۳۵) منتخبہ مسلمان اراکین میں سے تیس (۳۰) دیہاتی حلقوں سے آئے تھے اور پانچ (۵) شہری حلقوں سے ۔

پنجاب میں مسلمانوں کی آبادی پچپن فیصد تھی ۔ لیکن میثاقِ لکھنؤ کے طے شدہ اصول کے مطابق مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات (قانونِ حکومت ہند ۱۹۱۹ع) کی رو سے انھیں مقننہ میں منتخبہ نشستوں میں سے صرف پینتیس (۳۵) نشستیں دی گئی تھیں ، جو منتخبہ نشستوں کا ۴۹ء۲۹ فیصد ہوتی تھیں ۔ (الف) ۱۹۱۹ع کے دستور میں یہ درج تھا کہ منتخبہ اراکین میں سے وزراء کا تقرر کیا جائے گا اور یہ بھی کہ جو وزراء مقرر کیے جائیں انھیں منتخبہ اراکین کا اعتماد حاصل ہونا ضروری ہے ، پھر یہ بھی کہ وہ مقننہ کے سامنے جواب دہ ہوں گے ۔

پنجاب کی مقننہ میں اس وقت ایک لحاظ سے سب سے بڑی پارٹی مسلمانوں کی تھی کیونکہ ان کی تعداد ۳۵ تھی ۔ لیکن سکھوں اور ہندوؤں کو ملا کر دیکھا جائے تو منتخبہ غیر مسلم اراکین مقننہ کی تعداد ۳۶ ہو جاتی تھی ۔ اس لیے اگر مسلمانوں میں سے کسی کو وزیر مقرر کیا جاتا

الف ۔ میثاقِ لکھنؤ کی رو سے پنجاب کے مسلمانوں کی نشستیں ، جملہ منتخبہ نشستوں کی نصف ہونی چاہیے تھیں ۔ مصنف

تو یہ بات دستور کے تقاضے کے مطابق ہوتی - لیکن اگر غیر مسلم منتخبہ اراکین اس کے خلاف ہو جاتے تو وہ وزارت کی گدی پر برقرار نہیں رہ سکتا تھا -

بتایا جا چکا ہے کہ اس زمانہ میں تحریکِ ترکِ تعاون (Non-Co-operation) کا زور تھا - کانگریس ، مسلم لیگ اور خلافت کمیٹی نے حکومت اور انتخابات کا بائیکاٹ کر رکھا تھا - اس لیے اس صوبائی مقننہ میں جو اراکین منتخب ہو کر آئے تھے ، ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت سے نہ تھا بلکہ یہ لوگ اپنی ذاتی حیثیت سے منتخب ہو کر آئے تھے -

تحریکِ ترکِ تعاون کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کو ناکام بنایا جائے لیکن اس تحریک کے زور و شور کے باوجود ان اصلاحات کے تحت انتخابات ہوئے اور ان انتخابات کے ذریعہ قانون ساز اسمبلیوں کی نشستیں پُر کی گئیں - ان انتخابات میں بعض ایسے افراد نے بھی حصہ لیا جو پہلے کانگریسی یا مسلم لیگی رہ چکے تھے اور جنھوں نے تحریکِ ترکِ تعاون سے اختلاف کے باعث اب ان سیاسی جماعتوں سے علیحدگی اختیار کر لی تھی - اس طرح بجائے اس کے کہ یہ اصلاحات ناکام ہو جاتیں ان کی کامیابی کے امکانات پیدا ہو گئے -

اس صورت حال سے وزیر ہند مسٹر مانٹیگو اور وائسرائے ہند لارڈ چمسفورڈ خوش تھے ، کیونکہ یہی دو ان اصلاحات کے مصنفین تھے - اس زمانے میں پنجاب کے گورنر سر ایڈورڈ میکلیگن تھے - انھوں نے وزیر ہند اور وائسرائے کی ہدایات کے مطابق اس امر کی کوشش کی کہ اصلاحات کی کامیابی کے ان امکانات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا جائے تاکہ عدم تعاونیوں (Non-Cooperators) پر ان اصلاحات کی افادیت اور اہمیت واضح ہو جائے - تشکیل مقننہ کے بعد ، ان کے سامنے سب سے اہم سوال وزراء کے تقرر کا تھا - انھوں نے سب سے پہلے سر فضل حسین کو وزیر تعلیم مقرر کر دیا اور پھر ان کی خواہش پر لالہ ہرکشن لال کو وزیر زراعت بنا دیا -

اب صورت حال یہ تھی کہ فضل حسین مشرقی پنجاب کے شہری مسلمان تھے اور مقننہ میں سب سے بڑا گروپ مسلمانوں ہی کا تھا ، لیکن

حقیقت یہ ہے کہ یہ گروپ کوئی سیاسی پارٹی نہ تھی ۔ اس گروپ میں شامل افراد کا نہ تو کوئی مشترکہ سیاسی لائحہ عمل تھا اور نہ ان کے سیاسی تصورات و خیالات میں کوئی ہم آہنگی تھی ، بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ صحیح ہو کہ ان میں سے بیشتر افراد کے سیاسی تصورات سرے سے کچھ تھے ہی نہیں ۔ تیس تو دیہات کے رہنے والے تھے ۔ ان کی اکثریت انگریزی سے نابلد اور دستوری قاعدے قانون سے ناواقف تھی ۔ ان کا مبلغ علم صرف اپنے گاؤں ، زمینات اور زمینداری اور اپنے قبیلہ و ذات کے مفادات کی حد تک ہی تھا ۔ سر فضل حسین کا انتخاب گورنر نے اس لیے نہیں کیا تھا کہ ان کی پشت پر یہ ۳۵ مسلمان تھے ، بلکہ اس انتخاب کی وجہ ان کی دو خوبیاں تھیں ، جو دیگر منتخبہ مسلمانوں میں ناپید تھیں ۔ ایک تو یہ کہ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ اور صوبہ کے کامیاب بیرسٹر تھے اور دوسرے یہ کہ وہ کانگریس و مسلم لیگ سے کٹ کر مقننہ میں آئے تھے ۔ وہ اصولاً عدم تعاون کے قائل نہیں تھے اور ۱۹۱۹ء کی دستوری اصلاحات کو کامیاب بنانا چاہتے تھے ۔ ان کی اسی خوبی کے باعث گورنر نے انہیں وزارت کے لیے موزوں ترین شخصیت قرار دیا ۔ اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ۱۹۲۱ء کی منتخبہ پنجاب کونسل میں ایک سر فضل ہی قد آور سیاسی شخصیت کے مالک تھے ۔

فضل حسین وزیر تو بن گئے ، لیکن انہوں نے دیکھا کہ ازروئے دستور وہ مقننہ کے سامنے جواب دہ بھی ہیں اور ساتھ ہی منتخبہ اراکین کے اعتماد کو بحال رکھنا بھی ان کے لیے ضروری ہے ۔ اب اگر وہ صرف ۳۵ منتخبہ مسلم اراکین پر ہی تکیہ کیے رہیں (سر فضل حسین کے وزیر مقرر ہو جانے کے بعد ان اراکین کی تعداد صرف ۳۴ ہی رہ جاتی تھی) تو یہ خطرہ تھا کہ اگر ۳۶ غیر مسلم اراکین ان کے خلاف متحد ہو جائیں تو وہ برسر اقتدار نہیں رہ سکتے تھے ۔ اس لیے یہ ضروری تھا کہ غیر مسلم اراکین میں سے بھی کچھ اراکین وہ اپنے ساتھ ملائے رکھیں ۔ پھر ایک اور بات بھی تھی ۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے ان ۳۵ مسلم اراکین میں سے بھی ضروری نہ تھا کہ سب کے سب سر فضل کی تائید و حمایت کریں کیونکہ ان میں بھی دیہاتی و شہری کی تفریق موجود تھی ۔ اگر شہری منتخبہ مسلم اراکین ہی کسی موقع پر ان کی حامی نہ بھریں تو ایسی

صورت میں بھی ان کی وزارت خطرے میں پڑ سکتی تھی ۔ سر فضل حسین نے اس تمام صورتِ حال کا تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچے کہ مقننہ میں سب سے بڑا گروپ دیہاتی مسلمانوں کا ہے اور اسی کے ہاتھوں میں حقیقی سیاسی طاقت ہے ۔ لیکن یہ طاقت اتنی مؤثر نہیں ہے کہ غیر مسلم اراکین کے متحدہ محاذ کا مقابلہ کر سکے ۔ اس کو مؤثر بنانے کا طریقہ ان کی نظر میں یہی تھا کہ غیر مسلم اراکین میں سے بھی کچھ اراکین کو توڑ کر اس گروپ میں شامل کر لیا جائے ۔ اس کے لیے انھوں نے پہلا اقدام یہ کیا کہ گورنر سے اصرار کرکے لالہ ہرکشن کو وزیر بنوایا اور اس طرح انھیں لالہ ہرکشن اور اس کے ساتھیوں کی حمایت حاصل ہو گئی ۔ اب انھوں نے "رورل بلاک" (Rural Block) کے نام سے مقننہ کے اندر ایک پارٹی بنائی جس کو عام طور پر دیہاتی پارٹی کہا جانے لگا[۳۵]۔ اس پارٹی میں سبھی منتخبہ مسلمان تو تھے ہی لیکن ساتھ ہی چند دیہاتی ہندو اور سکھ بھی وقتاً فوقتاً اس کی تائید کرنے لگے ، خصوصاً ان مواقع پر جب کہ دیہاتی مفادات کے سوالات پیدا ہوا کرتے تھے ۔ اس طرح پنجاب کونسل میں پہلی مرتبہ ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کی داغ بیل پڑی ۔

۱۹۲۳ع میں پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لیے دوسری بار انتخابات ہوئے ۔ فضل حسین کو سابقہ مقننہ میں اس امر کا کافی تجربہ ہو چکا تھا کہ وزارت کے کام کو کامیابی سے چلانے کے لیے اس امر کی ضرورت ہے کہ مقننہ کے اندر ایک ایسی جماعت ہونی چاہیئے، جس میں مسلم اور غیر مسلم دونوں شریک ہوں ، کیونکہ ایسی ہی جماعت اکثریتی جماعت بن سکتی تھی ۔ پھر انھیں اس امر کا بھی تجربہ ہو چکا تھا کہ دیہاتی مفادات کی بنیاد پر وہ مسلمانوں کے ایک بہت بڑے گروپ کو ہندوؤں کے ساتھ ملا سکتے ہیں اور اس مخلوط جماعت سے مقننہ کے اندر کام لے سکتے ہیں ۔ چنانچہ ۱۹۲۳ع کے انتخابات سے پہلے انھوں نے مقننہ سے باہر ایک ایسی ہی غیر فرقہ وارانہ جماعت بنانے کی کوشش کی اور اس کا نام پنجاب نیشنل

۳۵- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۱۵۲

یونینسٹ پارٹی رکھا اور اس کی طرف سے انتخابات کے زمانے میں ایک انتخابی منشور (Election Manifesto) بھی شائع کیا[36]۔

اب ملک میں حالات بھی بدل گئے تھے ، تحریک عدم تعاون کا زور ٹوٹ چکا تھا ۔ بیان کیا جا چکا ہے کہ اس زمانہ میں کانگریسیوں کے ایک بڑے حلقہ میں داخلہ کونسل کا رجحان پیدا ہوا ۔ گو کانگریس نے بحیثیت جماعت ان انتخابات میں حصہ تو نہیں لیا تاہم اپنے اراکین پر انتخابات میں حصہ لینے اور اسمبلیوں یا کونسلوں میں داخل ہونے پر جو پابندی اس نے لگا رکھی تھی ، ستمبر ۱۹۲۳ع کے اجلاس خاص منعقدہ دہلی میں وہ پابندی اس نے اٹھا لی ۔ خلافت کمیٹی کا رویہ بھی اب نرم پڑ چکا تھا ، اگرچہ مولانا محمد علی ، اب بھی داخلہ کونسل کے خلاف تھے ۔ الغرض کانگریسیوں کی ایک بڑی تعداد نے سوراج پارٹی کے ٹکٹ پر پنڈت موتی لال نہرو اور سی آر داس کی قیادت میں ۱۹۲۳ع کے انتخابات میں حصہ لیا اور خلافت کمیٹی کے بعض مسلم اراکین بھی ، مولانا شوکت علی کی پالیسی کے علی الرغم اسمبلیوں کے انتخابات میں کود پڑے ۔ اس طرح ۱۹۲۳ع میں مقننہ پنجاب کے لیے جو انتخابات منعقد ہوئے ۔ وہ ۱۹۲۱ع کے انتخابات کے برعکس سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر لڑے گئے اور جب جنوری ۱۹۲۴ع میں ان انتخابات کے نتائج نکلے اور مقننہ کی تشکیل ہوئی تو اس کی کیفیت کچھ عجیب و غریب تھی ۔ منتخبہ مسلمان اراکین کی کل تعداد تو ۳۵ ہی تھی مگر ان میں سے ۲۴ دیہاتی مسلمانوں کا ایک علیحدہ گروپ تھا ۔ سات مسلمان اپنے آپ کو مسلم لیگی کہتے تھے حالانکہ مسلم لیگ نے انتخابات میں حصہ نہیں لیا تھا ۔ تین خلافتی تھے اور ایک آزاد ۔ دیہاتی اور شہری لحاظ سے تیس مسلمان دیہاتی تھے اور پانچ شہری ۔

ہندوؤں کی منتخبہ تعداد اکیس (۲۱) تھی ، جن میں سے نو (۹) سوراجی ، پانچ (۵) ہندو سبھائی اور چھ (۶) زراعت پارٹی والے تھے اور ایک (۱) آزاد ۔

۳۶۔ "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۱۵۳

اس مرتبہ بھی میکلیگن گورنر پنجاب نے محکمہ تعلیم کا قلمدان وز
فضل حسین کے سپرد کیا اور انھوں نے اس کو اس شرط کے ساتھ
کیا کہ ہندوؤں میں سے چودھری لال چند کو وزارت کا منصب دیا جا
چنانچہ گورنر نے لال چند کو وزیر زراعت بنا دیا ۔ لال چند رہتک کے ا
جاٹ اور اسمبلی میں چھ زراعت پیشہ ہندوؤں کے لیڈر تھے ۔ وہ دیہاتی
شہری تفریق کے بڑے پر جوش حامی تھے اور ان ہی کی کوششوں سے
نئی اسمبلی کے لیے شہری و دیہاتی آبادی کے الگ الگ انتخابی حلقے
کیے گئے تھے ـــــ چودھری لال چند کو اپنے ساتھ وزیر مقرر کرانے
فضل حسین کی مصلحت یہی تھی کہ زراعت پیشہ ہندوؤں کے گروپ
اپنے ساتھ ملا لیا جائے ۔ چنانچہ ہوا بھی یہی ۔ فضل حسین کے ساتھ
(۳۰) دیہاتی مسلمان تو تھے ہی ، اب لال چند کا یہ گروپ بھی ان کا ہم
ہو گیا ۔ اس طرح ایک مشترکہ ہندو مسلم مخلوط پارٹی مقننہ کے اندر بن گ
اور اسی پارٹی کو نیشنلسٹ یونینسٹ پارٹی کہا جانے لگا ۔ پھر اس میں
مسلم اراکین بھی، جو شہری حلقوں سے منتخب ہوئے تھے، شریک ہو گ
اس طرح اس پارٹی کے اراکین کی کل تعداد انچالیس (۳۹) ہو گئی ۔ یہ پا
گویا حزبِ اقتدار تھی اور اس کے مقابلہ میں حزبِ اختلاف کے اراک
کی تعداد بتیس (۳۲) تھی جس میں خلافتی مسلمان ، سوراجی ہندو اور دیہ
ہندو سکھ شامل تھے ۔

چودھری لال چند دیہاتی ہندو تھے ، اس لیے شہری ہندوؤں نے
کے خلاف انتخابی عذرداری دائر کر دی اور یہ عذرداری تسلیم کر
گئی اور لال چند کو استعفٰی دینا پڑا ۔ اب فضل حسین نے رہتک ہی ـ
ایک دوسرے ہندو جاٹ چودھری چھوٹو رام کو گورنر سے کہہ سن
وزیر بنوا دیا ۔ یہ ایک معمولی وکیل تھے ۔ جاٹ ایسو سی ایشن رہتک
کے سکرٹری اور جاٹ گزٹ کے ایڈیٹر رہ چکے تھے ۔ انھوں نے ۱۹۲۳ء
میں فضل حسین کے ساتھ یونینسٹ پارٹی کے قیام میں سرگرم حصہ لیا تھا
یہ بھی شہری اور دیہاتی تفریق کے بڑے جوشیلے حامی تھے ۔ چھوٹو ر
کے وزیر بن جانے کے بعد ۱۹۲۴ء تا ۱۹۲۶ء پنجاب کی وزارت بالکل
یونینسٹ وزارت ہو گئی کیونکہ دونوں عوامی وزیر ، فضل حسین او

چھوٹو رام یونینسٹ پارٹی ہی کے اراکین تھے -

جون ۱۹۲۴ء میں میکلیگن گئے تو ان کی جگہ سر میلکم ہیلی گورنر بن کر آ گئے - یہ اپنے پیشرو کے برعکس بساطِ سیاست کے ماہر تھے اور سیاسی مہروں کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا چاہتے تھے - گورنری کا چارج لینے کے بعد ڈیڑھ سال تک تو وہ خاموشی سے حالات کا جائزہ لیتے رہے - پھر جب ۱۹۲۶ء میں اسمبلی کے انتخابات کا زمانہ آیا تو انھوں نے بڑی شاطرانہ چال چلی کہ فضل حسین کو وزیرِ مال (ریونیو ممبر) بنا دیا - واضح رہے کہ ۱۹۱۹ء کے دستور کے تحت جو دو عملی (Diarchy) کا اصول نافذ تھا ، اس کی رو سے محکمہ مال (ریونیو) امور محفوظہ میں تھا اور یہ محکمہ جس وزیر کے سپرد کیا جاتا ، وہ عوامی منتخبہ وزیر نہیں بلکہ سرکاری نامزد شدہ وزیر ہوتا تھا - صوبہ کی ریونیو ممبری اس زمانے میں ایک ہندوستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا - سر فضل حسین نے یہ اعزاز قبول کر لیا اور ۱۹۳۰ء تک وہ اس عہدہ پر فائز رہے - ۱۹۲۶ء میں پنجاب کی مقننہ کے انتخابات ہوئے - اب فضل حسین نہ تو عوامی نمائندے کی حیثیت سے صوبائی اسمبلی کے رکن تھے اور نہ عوامی وزیر - اس طرح سر میلکم نے یونینسٹ پارٹی کو ان کی رہبری سے محروم کر کے اس پر ایک ضرب کاری لگائی - پھر اس نے ایک دوسری چال یہ چلی کہ یونینسٹ پارٹی کے مخالف ایک شہری ہندو ، منوہر لال کو وزیر بنا دیا اور اسی طرح ہندو مہاسبھا کو خوش کیا - منوہر لال کو نیشنل ریفارم پارٹی کی تائید حاصل تھی ، تاہم اس پارٹی کے صرف نو اراکین تھے - سر میلکم نے منوہر لال کی امداد اس طرح کی کہ نامزد سرکاری اراکین کا وزن اس کے پلڑے میں ڈال دیا - پھر اس نے سکھوں میں سے سر جوگندر سنگھ کو وزیر زراعت بنا دیا اور اس طرح سکھوں کو خوش کیا - صوبائی اسمبلی میں اب بھی یونینسٹ پارٹی موجود تھی اور اس کے لیڈر فضل حسین کے بجائے چودھری چھوٹو رام تھے لیکن گورنر نے انھیں وزارت کی پیش کش نہیں کی بلکہ کچھ عرصہ تک کسی یونینسٹ کو وزیر ہی مقرر نہیں کیا - یونینسٹ پارٹی میں تقریباً سب ہی مسلمان منتخبہ اراکین شامل تھے مگر اس پارٹی میں سے کسی مسلمان کو وزارت نہیں ملی - فضل حسین نے اس موقع

پر بڑا زور لگایا اور مسلمان اراکین نے بھی احتجاج کیا ۔ ابتداء میں میلکم ٹس سے مس نہ ہوا ، لیکن بالآخر اس نے یونینسٹ پارٹی کے ایک دیہاتی مسلمان رکنِ مقننہ فیروز خان نون کو وزارت بخش دی ۔ اس طرح اب دو وزیر یونینسٹ پارٹی سے باہر تھے تو صرف ایک وزیر یونینسٹ تھا ۔ لیکن لطف کی بات یہ تھی کہ چودھری چھوٹو رام ، جو اس پارٹی کے بانیوں میں سے تھے ، صوبائی مقننہ میں اس کے لیڈر اور فضل حسین کے جانشین تھے ، وہ وزارت سے محروم ہی رہے ! سر میلکم ہیلی کی اس سوچی سمجھی اسکیم یا دانستہ شرارت کا بہت برا اثر یونینسٹ پارٹی پر پڑا ۔ ابتداً جب اس پارٹی سے کوئی وزیر مقرر ہی نہ ہوا تو پھر یہ پارٹی حزبِ اقتدار کہاں باقی رہی تھی ، اور اقتدار ہی تو اس پارٹی کی قوت جاذبہ تھی ! پھر جب بڑی تاخیر اور کد و کاوش کے بعد اس پارٹی کا ایک رکن وزیر بنایا گیا تو وہ بھی ہندو نہیں ، مسلمان تھا ۔ اس بناء پر اس پارٹی کے ہندو اراکین میں بے دلی پیدا ہوئی اور وہ اس سے ٹوٹ کر راجہ نریندر ناتھ کی ہندو پارٹی میں ، جس نے اب نیشنل پروگریسو پارٹی کا بھاری بھرکم نام اختیار کر لیا تھا ، شریک ہوگئے ۔ خود یونینسٹ پارٹی کے لیڈر سر چھوٹو رام میں احساسِ محرومی پیدا ہوا اور انھوں نے اپنے دل کا بخار شہری مسلمانوں کو گالیاں دے کر نکالنا شروع کیا ! اس طرح سر میلکم کی پالیسی کی بدولت مسلمانوں میں بھی یونینسٹ پارٹی سے بد دلی پیدا ہوگئی اور ہندو بھی اس پارٹی سے ناراض ہوگئے ۔ یوں فضل حسین کی آنکھوں کے سامنے ان کا بنا بنایا کھیل بگڑنے لگا اور اس پارٹی میں اضمحلال کے آثار پیدا ہوگئے ۔ اس مقننہ کی میعاد حسب دستور ۱۹۳۰ء میں ختم ہوگئی ۔

مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات (دستور ۱۹۱۹ء) کے تحت پنجابی مقننہ کے آخری انتخابات ۱۹۳۰ء میں ہوئے ۔ سرمیلکم ہیلی کی پالیسی کا جو اثر یونینسٹ پارٹی پر پڑا ، وہ ان انتخابات میں ظاہر ہوا ۔ اب یونینسٹ پارٹی کے منتخبہ اراکینِ مقننہ کی تعداد گھٹ کر ۳۶ ہوگئی ، جس میں صرف تین غیر مسلم تھے ۔ اس طرح جو غیر فرقہ وارانہ نقاب فضل حسین نے اس پارٹی کے چہرہ پر ڈالا تھا وہ چاک ہونے لگا ۔ پھر اس پر طرفہ تماشا یہ ہوا کہ فضل حسین ، جنھوں نے اس پارٹی کی مشاطگی میں نہایت مہارت و مشاق کا مظاہرہ

کیا تھا ، اب پنجاب سے دور ، دہلی میں وائسرائے کی ایگزیکٹیو کونسل کے ممبر بنے بیٹھے تھے - ۱۹۳۰ء سے ۱۹۳۵ء تک وہ اسی عہدہ پر متمکن رہے اور وہیں سے اس پارٹی کے چہرہ پر سے ، اپنے چڑھائے ہوئے رنگ و غازہ کو اترتا دیکھتے رہے !

۱۹۳۰ء میں جب پنجابی مقننہ کی تشکیل ہوئی تو یہی نہیں کہ اس کے اراکین کی تعداد گھٹ کر چھتیس رہ گئی تھی بلکہ یہ بھی ہوا کہ راجہ نریندر ناتھ کی نیشنل پروگریسیو پارٹی کی تعداد بڑھ کر بیس تک پہنچ گئی - اب میلکم ہیلی کی جگہ گورنر جیفری ڈی مانٹمورنسی (Geoffray De Montmorency) کا دور حکومت تھا - اس نے ڈاکٹر گوکل چند نارنگ کو وزیر بنا دیا - ان کا تعلق نیشنل ریفارم پارٹی سے تھا - لیکن حقیقتاً وہ مہاسبھائی تھے - سکھوں میں سے سرجوگیندر سنگھ وزیر بنے - اگرچہ اب بھی منتخبہ مسلمان اراکین مقننہ یونینسٹ پارٹی میں شریک تھے لیکن خود ان اراکین میں وزارت کے لئے زبردست رسہ کشی ہونے لگی - اس رسہ کشی میں گو انفرادی رقابت کار فرما تھی ، مگر اس کا بدترین پہلو یہ تھا کہ مقننہ کے دیہاتی اور شہری مسلمانوں میں جو خلیج پہلے سے حائل تھی وہ اور بڑھ گئی - پھر دیہاتی مسلم اراکینِ مقننہ میں بھی پھوٹ پڑ گئی - یہ رسہ کشی چودھری شہاب الدین ، سر ظفر اللہ خان ، سر سکندر حیات خان اور ملک فیروز خان نون کے مابین تھی اور یہ سب کے سب یونینسٹ تھے - نون نے انتخابات کے دوران شہری امید وار مسلمان کے مقابلے میں دیہاتی مسلمان امید واروں کی تائید کی تھی - اس لئے شہری مسلمان ان سے شاکی تھے - پھر نون کا تعلق شاہ پور کی ملک برادری سے تھا اسی لئے اٹک و ملتان کے زمیندار ان کے خلاف تھے - اس طرح دیہاتی مسلمان اراکینِ مقننہ کے درمیان اختلاف پیدا ہوگیا - سر سکندر بھی نون کے خلاف درون خانہ سازشوں میں شریک تھے - اور وہ خود ریونیو ممبر بننا چاہتے تھے - ادھر اس عہدہ کے لئے ان کے حریف چودھری شہاب الدین تھے - بالآخر اس ڈرامہ کا ڈراپ سین اس طرح ہوا کہ وزارت کا قلمدان گورنر نے ملک فیروز خان نون کے حوالے کیا اور ریونیو ممبری کے عہدہ پر سر سکندر کو فائز کیا - اس طرح یونینسٹ پارٹی کے دو ارکان مناصب جلیلہ پر پہنچ تو گئے ، مگر اس سے

پارٹی کا انتشار ختم تو کیا ہوتا کچھ بڑھ ہی گیا۔ ہندوؤں کو اس امر کا شدید احساس ہوا کہ اس پارٹی سے ان کی وابستگی کا انھیں کوئی پھل نہیں ملتا ہے اور مسلمان یونینسٹوں میں شہری و دیہاتی کی تفریق اور زیادہ گہری ہو گئی۔ پھر دیہاتی مسلمان اراکین بھی دو دھڑوں میں بٹ گئے۔ اس انتشار کا یہ نتیجہ نکلا کہ یونینسٹ پارٹی کے اراکین کی تعداد ایک سال کے اندر اندر چھتیس (۳۶) سے گھٹ کر چونتیس (۳۴) ہو گئی جس میں صرف دو ہندو تھے۔ پھر ان اراکین کی حالت بھی یہ تھی کہ ان میں سے کئی افراد نے اکثر مرتبہ اپنی پارٹی کے وزیر فیروز خاں نون کے خلاف ووٹ دیئے !!

اسی زمانے میں یعنی ۱۹۳۰ء سے لے کر ۱۹۳۵ء تک یونینسٹ پارٹی کی حالت دگرگوں ہوتی رہی۔ رشک و رقابت اس پارٹی کو گھن کی طرح کھائے جا رہے تھے اور پھر جلد ہی اس رشک و رقابت کا انجام ایک المیہ کی صورت میں سامنے آ گیا۔ سر سکندر، خود فضل حسین کے مد مقابل بن گئے اور پارٹی کی قیادت کو در پردہ ان سے چھین لینے کی کوشش کرنے لگے۔ وہ پانچ سال تک پنجاب کے ریونیو ممبر رہے۔ اس دوران دو مرتبہ قائم مقام گورنر بنائے گئے۔ سر فضل جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے اس سارے عرصہ میں پنجاب سے باہر رہے۔ اس دوران سر سکندر نے ان کے خلاف پروپاگنڈا کیا کہ وہ دیہاتی نہیں شہری ہیں۔ زراعت پیشہ نہیں بلکہ وکیل ہیں۔ اب تک سر فضل کی ایک ذات ایسی تھی، جو اس جماعت کو باندھے ہوئی تھی۔ چاہے وہ پنجاب میں ہوں یا پنجاب سے باہر دہلی میں، مقننہ کے اندر ہوں یا مقننہ کے باہر، وہی اس پارٹی کے حقیقی لیڈر سمجھے اور تسلیم کئے جاتے تھے لیکن اب ان کی ذات بھی معرض بحث میں آنے لگی اور ان کی قیادت بھی متنازعہ فیہ بن گئی۔

فضل حسین اپریل ۱۹۳۵ء میں وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل سے سبکدوش ہو کر دہلی سے لاہور آئے اور آتے ہی یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کی طرف متوجہ ہو گئے۔ سر سکندر اب ریزرو بنک آف انڈیا کے ڈپٹی گورنر کی حیثیت سے کبھی کلکتہ اور کبھی بمبئی رہنے لگے تھے۔ لیکن ان کی خواہش و تمنا یہ تھی کہ ۱۹۳۵ء کی صوبائی خود مختاری کے تحت قائم ہونے

والی پہلی پنجابی حکومت کے وزیر اعلیٰ وہی ہوں - سر فضل کی بھاری بھر کم شخصیت ان کی راہ میں کانٹا بنی ہوئی تھی - اس شخصیت کا کھلے بندوں مقابلہ کرتے ہوئے بھی وہ ہچکچاتے تھے کہ اگر کل کو سر فضل ہی یونینسٹ پارٹی کے سر براہ بن جائیں تو یہ کہیں کے نہیں رہیں گے - اسی لئے وہ ایک طرف ان کو اپنی وفاداری کا یقین بھی دلاتے رہے اور دوسری طرف در پردہ ان کے خلاف جوڑ توڑ بھی کرتے رہے - وہ بمبئی میں مسٹر جناح سے بھی ملتے اور لاہور جب کبھی آتے تو شہری ہندوؤں کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ سے ملاقات کرتے تھے - مقصد ان کا یہ تھا کہ اگر جناح کی قیادت میں مسلم لیگ کا احیاء ہو جائے تو اس کی مدد سے اپنی جماعت کو پنجاب میں منظم کرکے سر فضل کا مقابلہ کریں ، یا پھر اپنے گروپ کو ساتھ لے کر راجہ نریندر ناتھ کے شہری ہندوؤں سے ہاتھ ملائیں اور اس طرح سر فضل کو نیچا دکھائیں - فضل حسین دائم المریض تو تھے ہی اب ان کی صحت اور گرنے لگی تھی - سکندر کی تمنائے وزارت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ وہ ان کی زندگی کے دن گننے لگے ! فضل حسین سکندر کی ان حرکتوں سے اتنے دل گرفتہ ہو گئے تھے کہ انھوں نے سیاست سے کنارہ کشی اور ایک مرتبہ تو زندگی سے ہاتھ دھو لینے کا ارادہ کر لیا تھا[۳۷] ——— لیکن بہر حال کچھ دوستوں کے کہنے سننے اور سکندر کی معذرت خواہی پر انھوں نے پھر سیاست میں دلچسپی لینی شروع کر دی ، اور اس دلچسپی کا مرکز و محور وہی یونینسٹ پارٹی تھی -

اب ۱۹۳۵ع ختم ہو چکا تھا - بتایا جا چکا ہے کہ اپریل ۱۹۳۶ع میں مسٹر جناح نے کل ہند مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس بمبئی میں منعقد کرنے کا اعلان کیا تھا اور اس میں مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کے نمائندوں کو بھی شرکت کی دعوت دی تھی تاکہ جدید دستور کے تحت ہونے والے انتخابات کے سلسلے میں ایک متفقہ لائحہ عمل تیار کیا جائے اور مسلمان متحد ہو کر ان انتخابات میں حصہ لیں اور اپنی جداگانہ منفرد سیاسی حیثیت کو منوائیں - حالات کی نزاکت اور ملت کے انتشار کو دیکھتے ہوئے اس اجلاس

۳۷- سر فضل حسین ، ایک سیاسی سوانح عمری - از عظیم حسین ص ۳۲۴

کی بڑی اہمیت تھی ، اور شاید اسی اہمیت کے پیش نظر اس اجلاس کی صدارت کے لئے مسٹر جناح کی نظر انتخاب سر فضل پر پڑی ۔ انھوں نے ایک خط[۳۸] مورخہ ۵ جنوری ۱۹۳۶ع کے ذریعہ نہایت محبت آمیز پیرایہ اور ملتجیانہ انداز میں فضل حسین کو آل انڈیا مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کی صدارت کے لیے مدعو کیا ۔ لیکن سر فضل نے اس دعوت کو ٹھکرا دیا ! ! ان کے انکار کے بعد اپریل ۱۹۳۶ع میں مسلم لیگ کا یہ اجلاس سر وزیر حسین کی صدارت میں منعقد ہوا ۔ اس اجلاس کی سب سے اہم قرار داد جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ تھی کہ ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ مسٹر جناح کی صدارت میں بنایا جائے اور اس کی شاخیں تمام صوبوں میں قائم کی جائیں تاکہ اس بورڈ کے جاری کردہ ٹکٹ پر مسلمان ۱۹۳۶ع کے انتخابات میں حصہ لیں ۔

ادھر تو جناح یہ کچھ کر رہے تھے اور ادھر عین اسی زمانے میں بلکہ اسی مہینے میں سر فضل حسین نے اپنی وہی پرانی ڈفلی از سر نو بجانی شروع کر دی ۔ ان کے ذہن میں یہی تھا کہ ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت (جس میں ہندو مسلم دونوں شامل ہوں) کے ٹکٹ پر انتخابات لڑے جائیں ۔ یونینسٹ پارٹی تو ان کی جیب میں تھی ہی ، جس میں چودھری چھوٹو رام اور ان کے دیہاتی ہندو شریک تھے اب ان کی خواہش یہ تھی کہ شہری ہندوؤں کو بھی اس میں شریک کیا جائے ۔ اس کے لیے انھوں نے ۹ اپریل ۱۹۳۶ع کو راجہ نریندر ناتھ سے ، جو شہری ہندوؤں کے لیڈر تھے ، ملاقات کی اور اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ بعض شرائط کے ساتھ جداگانہ انتخابات کو ترک کر دینے پر بھی رضا مندی کا اظہار کر دیا ——— لیکن[۳۹] یہ گفتگو ناکام رہی ۔ بہر حال فضل حسین نے ۱۹ اپریل ۱۹۳۶ع کو

۳۸۔ فضل حسین کے صاحبزادے عظیم حسین نے اپنی کتاب "فضل حسین کی سوانح عمری" کے ص ۳۰۶ ، ۳۰۷ پر اس خط کا پورا متن درج کیا ہے ۔

۳۹۔ "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری"۔ از عظیم حسین ص ۲۷۹ و ص ۲۸۰

لاہور میں اپنی پارٹی کا ایک جلسہ منعقد کیا ، جس میں اکابرین شہر کو مدعو کیا گیا تھا ۔ اسی جلسہ میں عہدہ داروں کا انتخاب ہوا اور ساتھ ہی پچاس ہزار روپیہ کا چندہ بھی اسی وقت جمع ہو گیا ۔ لاہور میں صدر دفتر قائم کر دیا گیا ۔ اسکیم یہ تھی کہ یونینسٹ پارٹی کو ، جس کا وجود اب تک صرف صوبائی مقننہ کی چار دیواری کے اندر دکھائی دیتا تھا ، اب پورے صوبے میں پھیلا دیا جائے اور عوام کو بھی اس کی رکنیت کے شرف سے نوازا جائے تاکہ آنے والے انتخابات میں اس پارٹی کے امید وار صوبائی مقننہ میں پہنچ سکیں ! ! ـــــ چنانچہ سر فضل کی زیر ہدایت کام شروع ہو گیا ، مرکزی دفتر کی تنظیم کی گئی اور اخبارات میں مضامین کا سلسلہ چل نکلا ـــــــ مگر سر سکندر اب بھی جوڑ توڑ میں لگے ہوئے اپنا کھیل کھیل رہے تھے ! ادھر سر فضل الیکشن کی تیاریاں کر رہے تھے اور اُدھر قدرت کچھ اور بندوبست کر رہی تھی ۔ ۹ جولائی ۱۹۳۶ء کو فرشتۂ اجل نے پنجاب کے سیاسی منظر کو ان سے خالی کروا کر سر سکندر کے حوالے کر دیا اور ۲۲ جولائی ۱۹۳۶ء کو سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے !! ۳ ستمبر ۱۹۳۶ء کو ریزرو بنک سے استعفیٰ دیکر وہ لاہور پہنچ گئے ! اور کچھ ہی دنوں کے بعد پنجاب کے ، پھر ایک مرتبہ ریونیو ممبر بن گئے ۔ اب وہ یونینسٹ پارٹی کے لیڈر بھی تھے اور پنجاب کے سب سے بڑے حاکم بھی ۔ جب ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں یونینسٹ پارٹی نے حصہ لیا تو ان کی اس مقتدر حیثیت سے اس پارٹی کو بڑا فائدہ پہنچا اور اس کی ایک بڑی اکثریت مقننہ میں پہنچ گئی ، جس کے بل بوتہ پر سر سکندر نے پنجاب میں اپنی حکومت قائم کر لی اور اس طرح صوبائی خود مختاری کے تحت قائم ہونے والی پہلی پنجابی وزارت کی سر براہی کی دیرینہ تمنا ، جو ان کے دل میں مچل رہی تھی ، پوری ہو گئی ۔

یہ ہے مختصر تاریخ ، یونینسٹ پارٹی کی !

اب ذرا یہ بھی دیکھ لیجیئے کہ وہ فلسفہ یا اصول کیا تھا ، جس پر اس پارٹی کی اساس رکھی گئی تھی ۔ اس کو اس کے بانی سر فضل کی زبان ہی سے سنئیے ۔

یہ طے کیا جانا چاہیے کہ کون پارٹی میں رہے اور کون نہ رہے۔ اگر اس اصول کی بنیاد پر پارٹی نہیں بنائی جاتی ہے تو کیا کوئی دوسرا متبادل اصول ایسا ہے ، جس کی بناء پر کونسل میں جماعتیں بنائی جائیں ؟ ایک متبادل صورت یہ ہے کہ نسلی بنیادوں پر جماعتیں بنائی جائیں جیسا کہ ماقبل اصلاحات کی کونسل میں ہوا کرتا تھا ۔ ایسی صورت میں سیاسی پروگرام کا خاص جز برطانیہ کی مخالفت ہوتا ۔ ہم ان خطوط پر موجودہ یا آئیندہ کی مقننہ جات میں جماعت نہیں بنا سکتے ۔ تو پھر دوسری متبادل صورت فرقہ وارانہ جماعت بندی کی ہے ۔ اس پر بھی مجھے بحث کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بالکل واضح بات ہے کہ فرقہ وارانہ خطوط پر جماعتوں کی تشکیل ، انتہا درجہ نا پسندیدہ ہے ۔ اب اگر ہم نسلی بنیاد کو نہیں مانتے اور فرقہ وارانہ بنیاد کو بھی نکال پھینکتے ہیں تو پھر کون سی بنیاد باقی رہ جاتی ہے ؟ ہمیں جماعتوں کی بنیاد ، انقلاب پسندی اور رجعت پسندی کے فرق و امتیاز پر رکھنی چاہیے ۔ ہم میں سے اکثر آگے بڑھنا چاہتے ہیں ، اور کیا کوئی ایسا بھی ہے ، جو ترقی کرنا نہ چاہتا ہو ؟ لہذا حالات کا اقتضا یہ ہے کہ ہمیں اس اصول پر ، جس کو میں نے واضح طور پر بیان کیا ، جماعتوں کی تشکیل کرنی چاہیے یعنی وہ جو کمزوروں ، پست کردہ لوگوں کے حامی ہوں اور وہ جو عدیدیت (Oligarchy) اور پہلے ہی سے آگے بڑھے ہوئے افراد کے حمایتی ہوں ۔ کسی دوسرے سیاسی اختلاف کی عدم موجودگی میں ، یہی ایک بنیاد میرے ذہن میں ہے ۔ جس پر جماعتوں کی تشکیل نو عمل میں لائی جا سکتی ہے ۳۰"

چلتے چلتے یہ بھی سن لیجیے کہ اس پارٹی کے اغراض و مقاصد کیا تھے ۔ فضل حسین کے سوانح نگار نے اس کے حسب ذیل اغراض و مقاصد گنائے ہیں ۔

۳۰۔ "فضل حسین ، ایک سیاسی سوانح عمری" از عظیم حسین ۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ع ، ص ۱۵۴

۱- برطانوی دولت مشترکہ (British Commonwealth of Nations) کے اندر نو آبادیاتی درجہ کا حصول ۔
۲- اصلاحات کو مدبرانہ انداز میں روبہ عمل لا کر یہ ثابت کرنا کہ اگر موزوں مواقع اور مناسب سہولتیں دی جائیں تو ہندوستانی، حکومت خود اختیاری کے اہل ہیں ۔
۳- سرکاری اداروں کے ذریعہ پست کردہ طبقات کو فائدہ پہنچانا ۔
۴- زراعت پیشہ اور دوسرے طبقات کے مابین صوبائی محاصل کے بوجھ کو منصفانہ طریقہ سے تقسیم کرنا ۔
۵- صوبہ کی سرکاری ملازمتوں میں تمام طبقوں اور فرقوں کے لیے منصفانہ نمائندگی حاصل کرنا ۔
۶- بالاتر طبقوں کو نچلے طبقوں کے معاشی استحصال سے روکنا ۔
۷- دیسی صنعتوں کی ہمت افزائی کرنا ۔
۸- صوبہ سے ناخواندگی کا خاتمہ کرنا ۔
۹- مقدمہ بازی کو کم کرنا ۔
۱۰- حکومت خود اختیاری کے اداروں کو توسیع دینا ۔
۱۱- انتظامیہ کے اخراجات میں کفایت شعاری اختیار کرنا ۔
۱۲- رشوت ستانی کا انسداد کرنا ۔
۱۳- ترک مسکرات کی ہمت افزائی کرنا ۔
۱۴- قانون انتقال اراضی پنجاب کو برقرار رکھنا تاکہ پست طبقات کا تحفظ ہو سکے[۴۱] ۔

یونینسٹ پارٹی کی اس تاریخ، اس کے فلسفہ اور اغراض و مقاصد کی روشنی میں اب یہ دیکھیے کہ اس پارٹی کی بدولت پنجاب اور مسلمانوں نے کیا پایا اور کیا کھویا ۔

۱- فضل حسین اس پارٹی کے بانی مبانی اور اس کی روح رواں تھے، اسی لیے انھوں نے جو کچھ کیا، وہ بھی اس پارٹی کے کھاتہ میں لکھا

۴۱- "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ع، ص ۱۵۵

جائے گا ۔ پنجاب کے وزیر تعلیم کی حیثیت سے انہوں نے تعلیمی میدان میں پنجاب اور بالخصوص مسلمانوں کی نمایاں خدمات انجام دیں ۔ انہوں نے کئی انٹرمیڈیٹ کالج کھولے ۔ تعلیم بالغاں کو نافذ کیا ۔ مسلمانوں میں تعلیم پھیلائی ۔ کئی تعلیمی وظائف جاری کیے ۔ جس سے مسلمانوں کو فائدہ پہونچا ۔ میڈیکل کالج کی نشستوں میں اضافہ کیا اور مسلمانوں کو اس طرف راغب کیا ۔ ان کے تحت حکومت خود اختیاری کا محکمہ بھی تھا ۔ اس میں کئی اصلاحات کیں ۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں انتخاب کا اصول رائج کیا ۔ دیہات میں پنچایت سسٹم کو زندہ کیا ۔ ہر گاؤں کو طبی امداد پہنچانے کا بندوبست کیا انڈین میڈیکل سروس میں ہندوستانیوں کا تقرر کیا ۔

۲۔ سر فضل یا یونینسٹ پارٹی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ اس نے قانون انتقال اراضی پنجاب بابتہ ۱۹۰۱ء میں ترمیم کروائی ۔ پنجاب ہائی کورٹ نے یہ فیصلہ دیا تھا کہ اگر زراعت پیشہ افراد مقروض او نادہند ہوں تو ان کی زمینات ، مال و اسباب قرق اور نیلام کیے جا سکتے ہیں ۔ س فیصلے کے بعد مسلمان کاشتکاروں کی زمینات دھڑا دھڑ ضبط اور نیلام ہونے لگیں اور ہندو بنئے انھیں اونے پونے خرید نے لگے تھے سر فضل اور یونینسٹ پارٹی نے اس قانون میں ترمیم کروائی جس کی روح سے کاشتکاروں کو ساہو کاروں کے مقابلہ میں تحفظ دیا گیا اور یوں مسلمانوں کی زمینات ہندوؤں کے ہاتھوں منتقل ہونے سے بڑی حد تک محفوظ ہو گئیں ۔

۳۔ ہندو ساہو کار معمولی سی رقم مسلمان کاشتکار کو قرض دیتا او گر ان شرح سے اس پر سود در سود لگاتا ، پھر من مانے حسابی الٹ پھیر کرکے اس سے کئی گنا زاید رقم وصول کیا کرتا تھا ۔ سر فضل اور یونینسٹ پارٹی نے صوبائی مقننہ میں پنجاب ریگولیشن آف اکاؤنٹس بل (Punjab Regulation of Accounts Bill) منظور کرایا ، جس کی رو سے ساہو کاروں کے لیے سہ ماہی گوشوارہ حسابات کا رکھنا لازمی قرار دیا گیا تھا ۔ اگرچہ سر میلکم نے اس مسودہ قانون کی توثیق نہیں کی بلکہ اس کی بجائے دوسرا قانون پیش کروایا جس میں کئی اسقام تھے ، لیکن یونینسٹ پارٹی نے ان خامیوں کو دور کیا اور اس طرح ساہو کاروں پر روز نامچہ حسابات رکھنا لازم قرار پایا ۔ اس پارٹی نے ساہو کاروں کے رجسٹریشن کا قانون (Money

(Lenders Registration Bill) اور رسوم عدالت کا قانون (Court fees Bill) منظور کروایا ، جس کی وجہ سے ہندو ساہو کاروں کی مسلمان کاشتکاروں پر گرفت ڈھیلی پڑی ۔

یہ تو تھے اس پارٹی کے روشن کارنامے ۔ اب ذرا دوسرا رخ بھی ملاحظہ کیجئیے ۔

۱۔ ہر سیاسی جماعت کا پہلا فرض یہ ہوتا ہے کہ وہ عوام میں سیاسی بیداری پیدا کرے اور ان کی سیاسی تربیت کرے ۔ یونینسٹ پارٹی نے اس طرف مطلق توجہ نہ دی ۔

۲۔ اس جماعت کی تمام تر توجہ سیاسی توڑ جوڑ پر مرکوز رہی ۔ اس کی تاریخ پر غور کیجئے تو صاف طور پر یہ نظر آتا ہے کہ اس کی بنیاد ہی سیاسی گٹھ جوڑ پر رکھی گئی تھی ۔ پھر وہ اسی راستے پر آگے بڑھتی گئی ۔ ظاہر ہے کہ یہ بنیاد ہی سیاسی اور جماعتی نقطۂ نظر سے غلط تھی ۔ جو جماعت بنائی ہی اس غرض سے گئی ہو کہ ایک گروپ (دیہاتی مسلمانوں) کو ایک دوسرے گروپ (دیہاتی ہندوؤں یا شہری ہندوؤں کے گروپ) سے ملایا جائے تا کہ مسند وزارت مستحکم رہے وہ '' دوں نہاد '' ہی قرار دی جائے گی ۔ ظاہر ہے اس کا مقصد وزارت اور دیگر مناصب جلیلہ و سفادات عظیمہ کا حصول ہی تھا اور اس کا طریقہ کار گھناؤنا تھا ۔ نتیجہ یہ کہ اس مقصد اور اس مقصد کے حصول کے طریقوں نے رشک و رقابت کو جنم دیا اور سازشوں کو پروان چڑھایا ۔

۳۔ اس جماعت کی اندرونی جنگ زرگری کا ایک لازمی شاخسانہ یہ تھا کہ صحت مند فضا پیدا نہ ہو سکی اور قیادت کی عمدہ روایات نشو و نما نہ پا سکیں ۔ خود فضل حسین نے ابتدا ہی سے اپنے اطراف ایسے لوگوں کو جمع کیا ، جو ذہنی اعتبار سے پست سطح پر تھے اور جو ان کے ہم پلہ تھے ، ان کو انھوں نے ہمیشہ اپنے سے دور ہی رکھا ۔ اس طرح مستقبل میں مسلمانان پنجاب کی سیاسی قسمت صحیح قیادت کے فقدان کے باعث معلق نظر آنے لگی ۔

۴۔ اس جماعت نے مسلمانان پنجاب کی وحدت ملی پر ضرب کاری لگائی ۔

پہلے تو ان کو شہری و دیہاتی حلقوں میں تقسیم کیا - پھر دیہاتیوں کو بھی مختلف خانوں میں بند کیا ، اس طرح ان میں تقسیم در تقسیم پیدا ہو گئی - ملی نقطۂ نظر سے یہ بڑا پیچیدہ مرض تھا -

۵- یہ پارٹی ابتدا ہی سے فکری تضاد میں مبتلا رہی - سر فضل نے اس پارٹی کے لئے جو فلسفہ گھڑا تھا ، وہ خود فکری تضاد کا ایک شاہ کار ہے - ایسا معلوم ہوتا ہے کہ خود سر فضل کا ذہن سیاست میں ایک سخت قسم کی پیچیدگی اور الجھن کا شکار تھا - اس پارٹی کا جو اساسی اصول انھوں نے پیش کیا ، اس کا لب لباب یہ تھا کہ پارٹی غیر فرقہ وارانہ ہونی چاہیے - اب رہی یہ بات کہ وہ کمزوروں اور پست طبقوں (Backward-Classes) کی مدد کرے اور اونچے طبقوں کے استحصال سے ان کو بچائے تو یہ یقیناً ایک ترقی پسندانہ اصول ہے - لیکن یونینسٹ پارٹی کی ہئیت ترکیبی اور اس کے کارناموں پر جب ہم غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے ، کہ یہ صرف بلند بانگ دعوے تھے - پارٹی میں بڑے بڑے زمیندار موجود تھے- پھر پارٹی کے اراکین نے حکومت وقت کی نظر عنایت سے فائدہ اٹھا کر "مال غنیمت" کے حصول میں بھی کوئی دقیقہ فرو گذاشت نہیں کیا تھا - ہاں یہ ضرور ہوا کہ ہندو بنئیے کی دستبرد سے غریب کسان بڑی حد تک محفوظ ہو گئے- بہرحال اس پارٹی کی بنیاد غیر فرقہ وارانہ تھی - بالفاظ دیگر یہ پارٹی بنائی ہی اس لئے گئی تھی کہ اس میں ہندو اور مسلمان دونوں شریک ہوں - اب ایک طرف تو یہ پارٹی غیر فرقہ وارانہ (Non-Communal) تھی اور دوسری طرف انتخابات فرقہ وارانہ تھے- پھر اس پارٹی کا مقصد یہ تھا کہ انتخابات کے ذریعہ جو مقننہ تشکیل پائے ، اس میں یہ حزب اقتدار کی حیثیت سے ابھرے - بالفاظ دیگر ایک غیر فرقہ وارانہ (Non Communal) پارٹی کے ٹکٹ پر فرقہ وارانہ انتخاب لڑ کر غیر فرقہ وارانہ حزب اقتدار تشکیل دی جا رہی تھی - یہ ایک نہایت واضح اور کھلا ہوا فکری تضاد تھا - پارٹی اور پارٹی کے بانی سر فضل فرقہ وارانہ یا جداگانہ انتخاب کے پر زور حامی تھے- ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور فضل حسین کے فرزند سوانح نگار نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ سر فضل حسین نے تجاویز دہلی (جس میں مسلمانوں کے چالیس سربرآوردہ لیڈروں نے بعض شرائط پر جداگانہ

تخاب سے دستبردار ہونا قبول کر لیا تھا اور جس کا ذکر ہم گذشتہ فحات میں کر آئے ہیں) کی مخالفت اور جداگانہ انتخاب کی حمایت میں مسلم نفرنس کو کھڑا کیا تھا اور گول میز کانفرنس کے دوران انھوں نے داگانہ انتخاب کے اصول کو منوانے میں وائسرائے کی کونسل کے رکن ، حیثیت سے ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا (الف) - سر فضل کا جداگانہ انتخاب ے اصول کی اتنی پرزور حمایت کرنا سمجھ میں آتا ہے - اس لیے کہ مخلوط نتخابات کا انھیں ۱۹۱۶ع میں تلخ تجربہ ہو چکا تھا - ۱۹۱۶ع میں ۔ فضل پنجاب کونسل کی رکنیت کے لیے یونیورسٹی کے حلقہ سے کھڑے ہے تھے - طریقہ انتخاب مخلوط تھا - اور رائے دہندگان کی اکثریت ہندو ی - مگر ہندوؤں نے وعدے مواعید کے باوجود ان کا ساتھ نہیں دیا - ۔ فضل اس انتخاب میں شکست سے بال بال اس طرح بچ گئے کہ مقابل یدوار کے کاغذات نامزدگی درست نہیں تھے - اس طرح سر فضل کو لوط انتخاب کا ذاتی طور پر تجربہ ہو چکا تھا - اسی لیے وہ جداگانہ انتخاب ، حامی تھے - مگر جداگانہ انتخاب کے حامی ہونے کے باوجود وہ ایک ر فرقہ وارانہ جماعت یونینسٹ پارٹی کے بانی تھے - اب یہ تضادِ فکر نہیں . اور کیا ہے کہ فرقہ وارانہ (جداگانہ) انتخاب لڑنے کے لیے ایک غیر نہ وارانہ جماعت بنائی جائے اور ایک ایسی اسمبلی میں ، جو فرقہ وارانہ اد پر منتخب ہوئی ہو ، ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کے بل پر غیر فرقہ رانہ پالیسی چلائی جائے اور ایک غیر فرقہ وارانہ وزارت ترتیب ، جائے !

ف) ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی اور عظیم حسین ، دونوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کے حقیقی بانی سر فضل حسین تھے - یہ بات راقم الحروف کے نزدیک محل نظر ہے کیونکہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کا ذکر ہمیں ۱۹۲۹ع سے پہلے بھی ملتا ہے ، اور جداگانہ انتخاب کی حمایت میں دیگر مسلم زعماء بھی پیش پیش رہے ہیں - پھر خود فضل حسین نے راجہ نریندر ناتھ سے

۲۔ یونینسٹ پارٹی کے اس تضادِ فکر نے خود اس کو اس تضادِ عمل کا شکار بنایا اور ساتھ ہی مسلمانانِ ہند کی وحدتِ ملی پر ایک ضرب لگائی ــــــ اب تک مسلمانانِ ہند نے ہندوستان کی سیاست میں جو حصہ لیا اور جو تحریکیں چلائیں ، ان سب میں برابر یہ احساس کار فرما تھا کہ ان کی ایک منفرد ، جداگانہ سیاسی حیثیت ہے ۔ سر سید کا یہی نقطہ نظر تھا ، جس کی بناء پر انھوں نے مسلمانوں کو کانگریس سے علیحدہ رکھا ۔ ان کے جانشین محسن الملک اور وقارالملک نے ۱۹۰۶ء میں اسی نقطہ نظر سے شملہ وفد کی رہنمائی کی اور مسلم لیگ کی نیو رکھی ۔

۱۹۱۶ء میں میثاق لکھنو تو اس نقطہ نظر کا جیتا جاگتا ثبوت تھا ۔ تحریکِ خلافت کے زمانہ میں مسلمان انگریزی حکومت کی دشمنی کی رو میں اتنے بہہ گئے تھے کہ انھوں نے ہندوؤں کو گلے لگا لیا ۔ گاندھی جی کو مہاتما بنا کر اپنے سر پر اٹھا لیا اور شردھانندجی کو جامع مسجد دہلی کے ممبر پر لا بٹھایا ، تاہم تحریکِ خلافت کی اولین بنیاد مذہبی تھی اور مسلمانوں کے اندر اس زمانہ میں اپنے مذہب کا شعور بہت گہرا تھا ، جو اس ہنگامی دور میں بھی انھیں ہندوؤں کے اندر مدغم ہونے سے باز رکھا ۔ تجاویزِ دہلی میں جداگانہ انتخاب سے دستبرداری کے باعث بظاہر متحدہ قومیت کی تشکیل کی طرف ایک پیشقدمی سی نظر آتی ہے لیکن اس کے پس پردہ جو روح کارفرما تھی وہ مسلمانوں کی جداگانہ ، منفرد ، سیاسی حیثیت ہی کی طرف اشارہ کر رہی تھی کہ سات صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں تو کیا ہوا مسلمان اس پوزیشن میں ہیں کہ اس اکثریت کے مقابلہ میں پانچ صوبوں میں اپنی اکثریت سے ہندوستان کی سیاست میں توازن پیدا کریں ۔ بہر حال مسلمانوں کی سیاسی تحریکات کا اگر بنظرِ غائر مطالعہ کیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آ جاتی ہے کہ مسلمانوں میں اپنی جداگانہ سیاسی ''ہستی'' کا شعور ہمیشہ موجود رہا ۔ یہ اور بات ہے کہ یہ شعور کبھی زیادہ روشن اور کبھی مدہم پڑتا رہا ہے ۔ اسی شعور کے باعث پورے برصغیر کے مسلمان اپنے آپ کو ایک ملت محسوس کرتے رہے تھے اور ہندوؤں کے مقابلے میں ان کی عظیم اکثریت کا رویہ بھی اس امر کی غمازی کرتا رہا ہے کہ ان کا ''سیاسی تشخص'' منفرد اور علیحدہ ہے اور جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ،

اب تک انھوں نے سیاستِ ہند میں جو کچھ حاصل کیا تھا وہ ایک "ملتِ واحد" بن کر ہی حاصل کیا تھا ۔ اب ۱۹۳۵ء کا دستور نافذ ہو چکا تھا ایسے موقع پر ان حاصل شدہ ثمرات سے بیش از بیش فائدہ اٹھانے کے لیے از بس ضروری تھا کہ مسلمان من حیثیت القوم متحد ہو کر انتخابات کی جنگ لڑتے مگر اس موقع پر یونینسٹ پارٹی نے عملاً وہی پالیسی اختیار کی جو تضادِ فکر کا نتیجہ تھی ۔ سر فضل تو اس پالیسی میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے ۱۹۳۶ء کے اجلاس مسلم لیگ کی صدارت کے اعزاز کو بھی ٹھکرا دیا ——— گویا ان کا ذہن اس نہج پر کام کر رہا تھا کہ اب نہ تو مسلمانانِ ہند کے لیے کسی علیحدہ سیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت ہے اور نہ بحیثیت ملت علیحدہ سیاسی جدو جہد کی ۔ اب تو ہندوؤں اور مسلمانوں کی مشترکہ جماعت ہونی چاہیے اور وہ بھی کل ہندوستان کے لیے نہیں بلکہ ہر صوبہ کے لیے علیحدہ علیحدہ ۔ گویا جو ثمرات مسلمانوں نے مشترکہ جدوجہد کے ذریعہ بحیثیت ملت واحدہ حاصل کیے تھے ، وہ چاہتے تھے کہ مسلمان علیحدہ علیحدہ علاقوں اور صوبوں میں تقسیم ہو کر ، ان سے متمتع ہوں ۔ چنانچہ انھوں نے سندھ ، سرحد ، بنگال اور یو۔پی میں پنجاب کی یونینسٹ پارٹی کی طرح ، مسلمانوں اور ہندوؤں کی مشترکہ صوبہ واری جماعتیں بنتے دیکھ کر خوشی کا اظہار کیا[۴۳] ۔ الغرض سر فضل اور ان کی جماعت کے سیاسی فلسفہ نے مسلمانانِ ہند میں ملی انتشار کی بنیاد رکھ دی اور برصغیر کی ملت اسلامیہ کو علاقوں اور صوبوں میں سیاسی طور پر تقسیم کرنے کی کوشش کی مگر جب بعد میں حالات ، سر فضل کے ذہنی نقشہ کے مطابق رونما نہ ہوئے اور کانگریس برانڈ متحدہ قومیت کی جارحیت صوبوں کی حد بندیوں کو توڑتی ہوئی آگے بڑھی اور پنجاب بھی اس کی زد میں آ گیا تو پھر یونینسٹ پارٹی اور اس کے لیڈروں کو ملت اسلامیہ کی فصیل ہی کا سہارا لینا پڑا ۔ لیکن اس وقت بھی فضل حسین کے پیدا کردہ فکری تضاد نے ان کا پیچھا نہ چھوڑا ۔ نتیجتہً انھوں نے دو کشتیوں میں سوار ہونے

۴۳۔ "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ۔ ص ۳۱۲

کی کوشش کی ۔ ایک کشتی صوبہ پنجاب کی یونینسٹ پارٹی تھی تو دوسری کل ہندوستان کی مسلم لیگ ۔ صوبہ کے اندر اسمبلی اور وزارت میں بحیثیت یونینسٹ ان کی پالیسی غیر فرقہ وارانہ تھی اور صوبہ سے باہر مسلم لیگ کے پلیٹ فارم پر فرقہ وارانہ ! گویا وہ اپنے صوبہ میں قوم پرست (Nationalist) تھے تو صوبہ سے باہر مسلمان فرقہ پرست ! ! یہ کھلا ہوا تضاد عمل یا دوغلا پن تھا ! ! ! ـــــ یہ صورت فضل حسین کے بعد سر سکندر کے زمانہ یعنی ۱۹۳۷ع و ۱۹۳۸ع میں پیدا ہوئی ۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت حال مسلمانان پنجاب کے لیے بالخصوص اور مسلمانانِ ہند کے لیے بالعموم خوش آئندہ نہ تھی ۔ پنجاب کی لیڈر شپ نے مسلمانانِ پنجاب کو ایسی صورت حال سے دو چار کر دیا تھا ۔ جو بے حد الجھی ہوئی اور نہایت خطرناک تھی ۔ ان کے دل تو ملتِ ہند کے ساتھ دھڑکتے تھے ۔ مگر گردن پر یونینسٹ پارٹی کا پیرِ تسمہ پا سوار تھا !

۷۔ صاف اور سیدھی بات یہ تھی کہ قانونِ حکومتِ ہند سنہ ۱۹۳۵ع کے نفاذ کے وقت مسلمانوں کے لیے ایک ہی راستہ کھلا ہوا تھا کہ وہ متحد ہو کر ایک ہی جماعت کے پرچم تلے صوبائی انتخابات کی جنگ لڑیں اور جن صوبوں میں وہ اکثریت میں تھے ، وہاں اپنے بل بوتے پر وزارت بنائیں اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو پھر کسی ایسی پارٹی سے ، جو ان کے بنیادی اصولوں سے متصادم نہ ہو ، سمجھوتہ کریں اور اس کو ساتھ لے کر مخلوط وزارت (Coalition Ministry) بنائیں ۔ ایسا کرنے میں کوئی امر مانع نہ تھا ۔ اس سے فائدہ ہی پہنچتا ، نقصان کچھ بھی نہ ہوتا اس طریقہ کار کے اختیار کرنے سے کل ہند سیاست میں ان کے سیاسی تشخص کا نقش بیٹھ جاتا ، قومی وحدت برقرار رہتی اور صوبائی خود مختاری سے بھی انھیں پورا پورا فائدہ پہنچتا ! سر فضل حسین کے ذہن میں صوبائی خود مختاری کا غلط تصور قائم تھا ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اب جبکہ پنجاب کو صوبائی خود مختاری مل چکی ہے اور صوبہ میں مسلمانوں کی اکثریت بھی ہے ، تو پھر پنجاب کے معاملات ، خود پنجابی مسلمانوں کو حل کرنے چاہئیں ۔ مسلمانوں کی کل ہند مرکزی تنظیم کا وجود ہی ، ان کی نظروں میں سرے سے بے معنی ہو چکا تھا اور ایسی تنظیم کے لیے کسی

قسم کی کوشش کرنا ، ان کے نزدیک صوبہ میں بیرونی مداخلت کو دعوت دینے کے مترادف تھا ۔

یہ ہے یونینسٹ پارٹی کا سیاسی کچا چٹھا (Political Balance Sheet) جس سے اس پارٹی کے نفع اور نقصان کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے ۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ پنجاب کی اس سیاسی فضا میں علامہ اقبال نے کیا کیا ؟

یونینسٹ پارٹی اور اقبال کی محاذ آرائی | یونینسٹ پارٹی اور اقبال کی محاذ آرائی کو سمجھنے کے لیے ہمیں زیر تبصرہ دور (سنہ ۱۹۳۵ع تا سنہ ۱۹۳۸ع) سے ذرا پیچھے کی طرف رجوع کرنا اور سلسلۂ واقعات کو پچھلی تاریخوں کے ساتھ جوڑنا پڑے گا ۔

سر فضل حسین کے فرزند و سوانح نگار عظیم حسین نے دیہاتی و شہری تفریق کے مسئلہ پر یونینسٹ پارٹی کی پالیسی کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے :

" دیہاتی اور شہری کا فرق و امتیاز پارٹی کے قواعد رکنیت میں داخل نہ تھا بلکہ اس کے پروگرام میں شامل تھا ۔ کئی شہری اور غیر زراعت پیشہ اس پارٹی کے ممتاز رکن تھے . . . . . . ان اراکین میں ڈاکٹر اقبال ، میر مقبول محمود ، شیخ عبدالغنی شیخ محمد صادق . . . . تھے ، جو سب کے سب شہری مسلمان تھے[۴۳] "

اس اقتباس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے ۔ ہمارے خیال میں عظیم حسین صاحب کا یہ بیان کئی وجوہ سے محل نظر ہے ۔

اولاً یہ کہ اقبال کے دوست احباب اور ساتھیوں میں سے کسی کا

۴۳۔ فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۱۷۵ ۔

کوئی ایسا بیان نہیں ملتا جس سے اشارۃً یا کنایتہً یہ نتیجہ نکالا جا سکے کہ اقبال کبھی یونینسٹ پارٹی میں شریک یا اس کے ہمنوا رہے۔

ثانیاً یہ کہ عظیم حسین نے اپنے بیان کی تائید میں کوئی ثبوت پیش نہیں کیا، درآں حالیکہ ایسا کرنا ان کے لیے ضروری تھا۔ خود انھوں نے اپنی کتاب کے آخری باب میں پرزور طریقہ پر یہ بات بیان کی ہے کہ اقبال اور فضل حسین میں سیاسی لحاظ سے بعدالمشرقین تھا[۴۴]۔ اپنی کتاب کے ابتدائی حصہ میں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ اقبال یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے! ایسی صورت میں ان کے لیے لازمی تھا کہ اس رکنیت کی (خواہ یہ رکنیت ابتدائی زمانہ ہی کی کیوں نہ ہو) کوئی شہادت پیش کرتے، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا، تو پھر مجرد ان کے بیان پر کیسے بھروسہ کیا جا سکتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ ان کے اس بیان سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ وہ کس زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ سیاق و سباق سے قرینہ اسی بات کا ہے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے ابتدائی زمانہ کا ذکر کر رہے ہیں۔ غالباً یہ سنہ ۱۹۲۳ع تا ۱۹۲۶ع کا دور ہے۔ سنہ ۱۹۲۳ع میں جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے، سر فضل نے پنجاب اسمبلی سے باہر، یونینسٹ پارٹی کا ڈھانچہ کھڑا کرنے کی کوشش کی تھی اور سنہ ۱۹۲۴ع میں اسمبلی کے اندر انھوں نے زراعت پیشہ ہندو جاٹوں کو مسلمانوں کے ساتھ ملا کر نیشنلسٹ یونینسٹ پارٹی قائم کی تھی۔ اگر عظیم حسین کے اس بیان کا یہ مطلب لیا جائے کہ اس زمانہ میں اقبال یونینسٹ پارٹی کے رکن تھے تو اس کے صحیح تسلیم کیے جانے میں بھی تردد و تامل ہوتا ہے۔ سبھی جانتے ہیں کہ سنہ ۱۹۲۶ع تک اقبال نے عملی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ پھر وہ ایک ایسی پارٹی میں جو مقننہ کے اندر خالصتاً ایک دستوری و سیاسی ضرورت کے تحت، محض تشکیل وزارت کے لیے بنائی گئی تھی، کیسے شریک ہو سکتے تھے؟ ایسی جماعت کی طرف کشش کے عموماً دو ہی اسباب ہوتے ہیں۔ ایک، مسلکِ جماعت سے نظری اتفاق اور دوسرا جلبِ منفعت! مسلک کے اعتبار سے

۴۴۔ ایضاً ص ۳۸۳۔

یونینسٹ پارٹی غیر فرقہ وارانہ تھی یعنی اس میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے لیکن ساتھ ہی وہ شہری ، دیہاتی تفریق کی نہ صرف قائل تھی ، بلکہ اس نے اس تفریق کی تخم ریزی کی تھی بلکہ اس کو پروان چڑھایا تھا ۔ بالفاظ دیگر وہ ایک طرف تو ہندوؤں اور مسلمانوں کو باہم جوڑ رہی تھی، مگر ساتھ ہی خود مسلمانوں کے ایک گروہ کو دوسرے گروہ سے محض سکونت اور پیشہ کی بناء پر توڑ رہی تھی ! کیا اقبال سنہ ۱۹۲۳ع و سنہ ۱۹۲۴ع میں اس وصل ، اور اس فصل کے قائل و حامی تھے ؟ ہم نے نہایت تفصیل اور وضاحت سے یہ بتایا ہے کہ سنہ ۱۹۰۸ع کے بعد ان کا رجحان وطنیت سے ملیت کی طرف ہو گیا تھا ۔ پھر وہ مسلسل وحدت ملی کا نعرہ لگاتے ، اور مسلمانوں کو باہمی اتحاد و اتفاق پر ابھارتے رہے ۔ انھوں نے سنہ ۱۹۲۳ع و سنہ ۱۹۲۴ع سے بہت پہلے سنہ ۱۹۱۲ع میں کہا تھا ۔

" منفعت ایک ہے اس قوم کی ، نقصان بھی ایک ،
ایک ہی سب کا نبی ، دین بھی ، ایمان بھی ایک ،
حرم پاک بھی ، اللہ بھی ، قرآن بھی ایک ،
کچھ بڑی بات تھی ، ہوتے جو مسلمان بھی ایک

فرقہ بندی ہے کہیں اور کہیں ذاتیں ہیں
کیا زمانے میں پنپنے کی یہی باتیں ہیں "

پھر یہ بھی کہ

یوں تو سیّد بھی ہو ، مرزا بھی ہو ، افغان بھی ہو
تم سبھی کچھ ہو ، بتاؤ تو مسلمان بھی ہو ؟

ذات پات ، گروہ و فرقہ ، رنگ و نسل کے امتیازات اور پیشہ وارانہ و علاقائی حد بندیوں و تفریقوں کو مٹانے والا اقبال کس طرح باور کیا جا سکتا ہے کہ دیہاتی و شہری ، زراعت و غیر زراعت پیشہ کی بنیاد پر مسلمانوں میں افتراق پیدا کرنے والی ، اور ہندوؤں کو مسلمانوں سے ملانے والی جماعت کا حامی و مؤید بن گیا ہو گا ؟ گویا یونینسٹ پارٹی اور اقبال میں نظری اعتبار سے بھی مسلک کا اتفاق نہیں بلکہ اختلاف شروع ہی سے

موجود تھا ! اب رہی جانبِ منفعت کی بات تو یہ ظاہر ہے کہ اس پارٹی سے اقبال نے کبھی کوئی دنیوی فائدہ نہیں اٹھایا ۔ سنہ ۱۹۲۳ع سے لیکر سنہ ۱۹۲٦ع تک وہ پنجاب کونسل کے رکن نہیں تھے ۔ لہذا وزارت یا صدارت کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ شاید کونسل سے باہر کسی دینوی فائدہ کی خاطر انھوں نے یونینسٹ پارٹی میں شرکت کی ہو ۔ اس کا تذکرہ بھی ، ان کے دوستوں یا مخالفوں ، مداحوں یا نقادوں نے کہیں نہیں کیا ہے ۔ عظیم حسین نے لکھا ہے کہ ، سر فضل پر یہ الزام بڑی شدت سے بار بار لگایا جاتا رہا ہے کہ انھوں نے قابل اور باصلاحیت افراد کو صوبہ کی اجتماعی زندگی میں ابھرنے نہیں دیا ۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہ الزام زیادہ تر اقبال کی وجہ سے ان پر لگایا جاتا رہا ہے[۴۵] ۔ پھر انھوں نے تفصیل کے ساتھ ان کوششوں کا ذکر کیا ہے ، جو سر فضل نے اقبال کو دنیوی فوائد سے متمتع کرنے کے لیے کی نہیں ۔ سب سے پہلے وہ سنہ ۱۹۲۴ع کے ایک واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ

” فضل حسین نے سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) کو ترغیب دی کہ اقبال کو بار سے اٹھا کر بنچ تک پہنچایا جائے ۔ (یعنی پنجاب کورٹ کا جج بنا دیا جائے) لیکن ابھی یہ مسئلہ زیر غور تھا کہ ڈاکٹر اقبال نے حکومت پر بے لگام (بے لگام ؟ نہیں بے باکانہ) تنقید کرکے سرکاری احکام کی ہمدردیاں کھو دیں[۴٦] “

اس کے بعد انھوں نے اس قسم کے اور واقعات کا بھی ذکر کیا ہے مگر ان کا تعلق سنہ ۱۹۲۴ع و سنہ ۱۹۲٦ع سے نہیں بلکہ بعد کے سنین سے ہے اور ان تمام واقعات کا یکے بعد دیگرے ذکر کرنے کے بعد انھوں نے یہی لکھا ہے کہ سر فضل نے تو اپنی والی بہتیری کوشش اقبال کو فائدہ پہنچانے کی کی لیکن اقبال نے ان کی کسی کوشش سے فائدہ نہیں

۴۵- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۳۱۷ ۔

۴٦- ایضاً ص ۳۱۸ و ۳۱۹ ۔

اٹھایا ۔ بلکہ الٹے ان پر پانی پھیر دیا اور اس کی وجہ بھی عظیم حسین کی نظر میں یہ تھی کہ

" اقبال سیاست دان نہ تھے ۔ وہ سیاسی فلسفی تھے ، ایک تخیلی السان Idealist تھے اور یہ سمجھ نہیں سکتے تھے کہ سیاست مصالحت کا ایک کھیل ہے ۔[۲۷] وہ عہدہ کے حصول میں ناکام رہے ، یا لیڈر نہ بن سکے ، اس لیے کہ وہ معاملات کے آدمی (Man of affairs) سے زیادہ ایک شاعر اور مفکر تھے[۲۷] "

غرض کہ خود عظیم حسین کی یہ شہادت ریکارڈ پر ہے کہ سر فضل حسین یا یونینسٹ پارٹی کی بدولت اقبال نے سنہ ۱۹۲۳ع یا اس کے بعد کبھی کوئی دنیاوی فائدہ حاصل نہیں کیا ۔ ایسی صورت میں سنہ ۱۹۲۳ع تا سنہ ۱۹۲۶ع کے دوران ان کی ، یونینسٹ پارٹی میں شرکت کا امکان بھی بعید از قیاس نظر آتا ہے ۔

اب رہ جاتی ہے سنہ ۱۹۲۶ع کی بات ، تو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اس سنہ میں انھوں نے شاید یونینسٹ پارٹی کی رکنیت قبول کر لی ہو ۔ کیونکہ اسی سال انھوں نے سیاست کے میدان میں عملی قدم رکھا اور پنجاب اسمبلی کے انتخابات میں حصہ لیا اور پھر اس کے رکن بھی منتخب ہوئے ۔ یہ خیال ہو سکتا ہے کہ انتخاب جیتنے اور اسمبلی میں پہنچ کر مناصب و فوائد کو حاصل کرنے کی خاطر انھوں نے یونینسٹ پارٹی کا دامن تھاما ہو گا ۔ لیکن حقیقت کیا ہے ؟ حقیقت یہ ہے کہ انتخابات کے دوران انھوں نے یہ اعلان کیا کہ

" ممبر کا سب سے بڑا وصف یہ ہونا چاہیے کہ ذاتی اور قومی منفعت کی ٹکر کے وقت اپنے شخصی مفاد کو مقاصدِ قوم پر قربان کر دے ۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں کبھی اپنے مفاد کو قوم کے مصالح کے مقابلہ میں ترجیح نہیں دوں گا . . . میں اغراض ملی کے مقابلہ میں ذاتی خواہشوں پر مر مٹنے کو

۲۷- ایضاً ص ۳۲۱ -

موت سے بدتر خیال کرتا ہوں[۴۸] "

پھر منتخب ہو جانے کے فوراً بعد اپنے اعزاز میں دی گئی ایک دعوت میں بتاریخ ۲۶ دسمبر سنہ ۱۹۲۶ء ایک تقریر کی ، جس میں انھوں نے

" مسلم ارکانِ کونسل سے پر زور استدعا کی کہ وہ دیہاتی و غیر دیہاتی وغیرہ کے امتیازوں سے یکسر کنارہ کش ہو کر متحدہ طور پر اسلام اور وطن کی خدمت انجام دیں[۴۹] "

یہ نرے دعوے ہی دعوے ، یا محض دکھاوے کے اعلانات نہ تھے بلکہ جو کچھ انھوں نے انتخابات کے وقت اسمبلی کے باہر کہا تھا ، اسمبلی کے اندر پہنچ کر اسے سچ کر دکھایا ۔ خود عظیم حسین کی گواہی موجود ہے کہ

" سنہ ۱۹۲۷ء میں ایک تجویز یہ تھی کہ مستقبل کی اصلاحات کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مطالبات وزیر ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک مسلم وفد انگلستان روانہ کیا جائے ۔ فضل حسین نے ڈاکٹر اقبال سے اس وفد کی قیادت کے لیے کہا اور اس مقصد کے لیے تین ہزار روپیہ اکٹھا کیا ۔ یہ تجویز ڈاکٹر اقبال کے لیے درجہ اول کی سیاسی زندگی کو یقینی بنا دیتی ، لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ مزید چند ہزار روپوں کا خرچہ لاحق ہوتا تھا ۔ ان کے بجائے چودھری ظفر اللہ خان جانے کے لئے راضی ہو گئے اور انھوں نے اپنے لیے روشن مستقبل متیقن کر لیا ۔ اس واقعہ نے فضل حسین کو ڈاکٹر اقبال کی امداد کے سلسلہ میں مزید کوشش کرنے سے باز نہیں رکھا اور انھوں نے تجویز پیش کی کہ بحیثیت صدر مقننہ پنجاب ، چودھری شہاب الدین کی میعاد ختم ہونے کے بعد ڈاکٹر اقبال کو یونینسٹ پارٹی کی

۴۸- اخبار زمیندار لاہور ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء -

۴۹- ایضاً ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ء -

حمایت کے ذریعہ صدر منتخب کیا جائے ۔ ڈاکٹر اقبال نے پارٹی کی پالیسی پر تنقید اور اخبارات میں اس پر سخت حملے کرکے اس کی ہمدردیاں کھو دیں ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یونینسٹوں کی اکثریت نے ان کو امیدوار بنانے سے انکار کر دیا اور چودھری شہاب الدین دوبارہ صدر منتخب ہو گئے۔[۵۰] "

یہ تمام واقعات اور حقائق خود اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ یونینسٹ پارٹی کا رکن ہونا تو کجا ، اقبال نے کبھی اس کی طرف التفات ہی نہیں کیا ، نہ سنہ ۱۹۲۴ع میں اور نہ سنہ ۱۹۲۴ع کے بعد ، نہ رکن اسمبلی بننے سے پہلے اور نہ رکن اسمبلی بننے کے بعد ! ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی میں اقبال کی شرکت کا تذکرہ ، محض ایک افسانہ ہے جو فضل حسین کی سوانح حیات میں عظیم حسین نے بڑھا دیا ہے ، فقط زیبِ داستاں کے لیے ! !

حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ع تا سنہ ۱۹۲۶ع اقبال نے اس پارٹی کو باہر سے دیکھا تھا ، لیکن سنہ ۱۹۲۶ع تا سنہ ۱۹۳۰ع انھیں اس پارٹی کو قریب سے دیکھنے اور اس کے مسلک ، پالیسی اور طریقہ کار کو پنجاب اسمبلی کے اندر بیٹھ کر بہت نزدیک سے مشاہدہ کرنے کا موقع ملا ۔ ہم قدرے تفصیل سے بتا چکے ہیں کہ اس دور میں یونینسٹ پارٹی کے اندر اضمحلال اور انتشار کے آثار پیدا ہونے لگے تھے ۔ وزارت اور عہدوں کے لیے باہمی رشک و رقابت نے سازشوں کو جنم دیا تھا اور جس " لیلائے وزارت " کے لیے یہ " محمل " تیار کیا گیا تھا ، وہ اس میں جلوہ فگن ہونے کے بجائے دوسروں کی گود میں جا بیٹھی تھی ! پھر بہت کچھ آہ وفغاں کرنے کے بعد اس کی صرف ایک جھلک یونینسٹ پارٹی کے صرف ایک رکن سر فیروز خاں نون کے نصیب میں آئی تھی اور پارٹی لیڈر چودھری چھوٹو رام تو ہاتھ ملتے اور شہری مسلمانوں کو کوستے ہی رہ گئے تھے ! اکثریت میں ہونے کے باوجود اسمبلی کے اندر مسلمانوں کی یہ

۵۰۔ فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۹ ۔

درگت بن رہی تھی - اقبال اسی اسمبلی میں بیٹھے " یہ نظارے " دیکھتے رہے اور غیروں کی گالیاں اور اپنوں کی تالیاں سنتے رہے !! یوں اقبال نے یونینسٹ پارٹی کو بہت قریب سے بے نقاب دیکھ لیا تھا ایسی صورت میں وہ اس کی زلفِ گرہ گیر کے اسیر کیسے ہو سکتے تھے !! انھوں نے تو اسی زمانہ میں بقول عظیم حسین ، اس پارٹی کی اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر شدید مخالفت کی -

یونینسٹ پارٹی کی یہ مخالفت ، اقبال کی رکنیت مقننہ کے زمانہ (سنہ ۱۹۲٦ع تا سنہ ۱۹۳۰ع) تک ہی محدود نہ رہی - ہم بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۰ع تا سنہ ۱۹۳۵ع یونینسٹ پارٹی میں مزید انتشار و افتراق پیدا ہوا ، وزارتوں اور عہدوں کے لیے باہمی رسہ کشی شدید تر ہو گئی اور سازشوں کا ایک جال پھیل گیا ، جس کا شکار خود فضل حسین بنتے بنتے رہ گئے تھے - یوں یونینسٹ پارٹی کا المیہ رفتہ رفتہ اپنے نقطۂ عروج پر پہنچنے لگا تھا - اس المیہ کے دو بہت ہی تباہ کن نتائج برآمد ہوئے تھے ، ایک تو یہ کہ مسلمانوں میں شہری اور دیہاتی کی تفریق مکروہ صورت اختیار کر گئی تھی یعنی دیہاتی و شہری کی جو تقسیم شروع ہی سے چلی آ رہی تھی ، اس میں نہ صرف یہ کہ شدت پیدا ہوئی بلکہ خود دیہاتی مسلمان بھی علاقوں اور برادریوں کی بنیاد پر گروہ در گروہ بٹ گئے اور ان کے مابین شدید کشمکش برپا ہوئی جس کی وضاحت ہم کر آئے ہیں - دوسرے یہ کہ مسلمانانِ پنجاب حقیقی رہنماؤں سے محروم ہو گئے ، طالع آزماؤں اور سیاسی قابو چیوں . . . . (Political opporturnits) کو ان کی قسمت سے کھیلنے کا موقع مل گیا ! اس کی تشریح بھی ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں - اقبال اس صورتِ حال اور اس سے پیدا شدہ نتائج کو خاموشی سے برداشت کرنے والے کب تھے- انھوں نے فضل حسین کی دوستی کو بالائے طاق رکھ کر ، ان پر اور یونینسٹ پارٹی پر سخت تنقید کی - فضل حسین کے فرزند اور سوانح نگار راوی ہیں کہ اقبال نے سنہ ۱۹۳۵ع میں انجمن حمایت اسلام کے سالانہ جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا -

"یہ حقیقتاً المناک ہے کہ شہری بمقابلہ دیہاتی کے سوال کو سر فضل حسین کی حمایت حاصل ہو ، جنھوں نے پہلی مرتبہ صوبہ کے دیہاتی رہنما کی حیثیت سے نہیں بلکہ مسلم رہنما کی حیثیت سے اقتدار حاصل کیا تھا[۵۱] ۔ لیکن اقتدار سے پیوستہ ہونے کے بعد انھوں نے تیسرے درجے کے بعض ایسے شرکاء حاصل کر لیے جو حکومتی اقتدار کے نہ تو مستحق تھے اور نہ جن میں وزارت جیسے مناصب پر متصرف رہنے کا وہ شکوہ و دبدبہ ہی تھا ، جو اس کے لیے ضروری ہے ، لیکن جو محض اسی وجہ سے یعنی اپنی معمولی قابلیت کے باعث ان کو ایک مافوق البشر کی حیثیت سے دیکھتے ہیں ۔ بعض ارباب اقتدار نے بھی اس پالیسی کی ہمت افزائی کی ، کیونکہ اس صورت سے وہ لوگ سنہ ۱۹۱۹ع کی اصلاحات کا زور توڑ سکتے تھے ۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ، ان رجحانات کا نتیجہ یہ ہوا کہ حقیقی رہنمائی کا منصب بہت دور چلا گیا اور اس کے برعکس قطعاً نا اہل سیاسی طالع آزما انتہائی روشنی میں آ گیا[۵۲] "

ان تمام تفصیلات اور تاریخی حقائق سے یہ واضح ہوتا ہے کہ علامہ اقبال اور یونینسٹ پارٹی کے کرتا دھرتا فضل حسین کے سیاسی نظریات میں گو اختلاف شروع ہی سے چلا آ رہا تھا لیکن سنہ ۱۹۳۵ع کے اختتام پر یہ اختلاف بہت ہی نمایاں ہو کر سامنے آ گیا ۔ اس اختلاف کی نوعیت ،

۵۱- یہ اشارہ ہے اس واقعہ کی طرف کہ سر فضل حسین پیشہ کے لحاظ سے ایک وکیل اور شہری باشندے تھے ۔ دیہات اور زراعت سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا ۔ پنجاب اسمبلی میں پہلی بار ان کا انتخاب پنجاب یونیورسٹی کے حلقہ سے ہوا تھا ، نہ کہ کسی دیہاتی حلقہ سے " دیکھئے فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع ص ۸۰ و ۸۱ ۔

۵۲- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ستمبر سنہ ۱۹۴۵ع ص ۳۱۵ ۔

اہمیت اور نزاکت بھی عظیم حسین کی زبانی سنئے ، وہ لکھتے ہیں -

" سنہ ۱۹۳۶ء میں مسلم سیاست میں ایک بالکلیہ مختلف نقطۂ نظر کی وکالت ہونے لگی - اس نقطۂ نظر نے ڈاکٹر اقبال کے فلسفیانہ تخیلات میں جنم لیا تھا - ان کی اساس یہ تھی کہ اپنے مذہب و ثقافت کی وجہ سے مسلمان ، ہندوؤں سے یکسر مختلف ہیں اور یہ دونوں معاشی یا سیاسی لحاظ سے ایک دوسرے کے ساتھ تعاون نہیں کر سکتے لہذا ہندو مملکت سے ممیز ایک مسلم مملکت کا قیام ہی واحد حل ہے - ہو سکتا ہے کہ یہ بات اپنی جگہ درست ہو کہ ہندوستان کے کئی علاقوں میں ہندو اور مسلمان ایک ہی زبان بولتے ہیں ، ایک جیسے سماجی رسوم و رواج کی پابندی کرتے ہیں - مشترکہ معاشی کاروبار میں حصہ لیتے ہیں اور ایک ہی نسل یا نسلوں کے مخلوط مجموعہ سے تعلق رکھتے ہیں ، تاہم مذہبی عقیدہ کا اختلاف ، ایک ایسا اختلاف ہے جو ہر حد کو پار کر جاتا ہے اور ان تمام مشترکہ امور کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اسی کو انسانوں کے ہر دائرہ عمل میں فیصلہ کن عنصر کی حیثیت حاصل ہونی چاہیے - ڈاکٹر اقبال اس علاقائی قومیت کے جو مغرب میں رائج تھی ، سخت مخالف تھے اور ایسی قومیت کی وکالت کرتے تھے ، جو اول و آخر مذہب پر مبنی تھی - فضل حسین نے اس پالیسی میں سنگین خطرات دیکھے اور پنجاب میں ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت کی تشکیل کے ذریعہ اس کی سخت مزاحمت کی اور آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ذریعہ انھوں نے ان ہی خطوط پر سارے ہندوستان میں غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کے بنانے کی وکالت کی[۵۳] "

اس بیان سے چند باتیں بہت واضح طور پر سامنے آ جاتی ہیں :

۱- یہ کہ سیاستِ ہند میں سنہ ۱۹۳۶ء کے آغاز پر ہی علامہ اقبال

۵۳- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " از عظیم حسین ص ۳۸۳-

اور سر فضل حسین ایک دوسرے کے مدمقابل ہو گئے تھے -

۲- اقبال مذہب کی بنیاد پر مسلمانوں کی ہندوؤں سے بالکل جداگانہ قومیت اور اس کے نتیجہ میں ایک جداگانہ مسلم مملکت کی تشکیل کے داعی اور محرک تھے اور ان کی یہ دعوت و تحریک مسلمانوں کو اپنی طرف مائل کرنے لگی تھی -

۳- ان کی اس دعوت و تحریک میں فضل حسین کو "سنگین خطرات" نظر آنے لگے جس کے سد باب کے لیے انھوں نے پنجاب میں اپنی غیر فرقہ وارانہ یونینسٹ پارٹی کی از سر نو تشکیل کی اور ہندوستان کے دیگر صوبوں میں اسی طرز کی غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنانے کی حمایت کی - اب رہی یہ بات کہ آل انڈیا مسلم کانفرنس کے ذریعہ انھوں نے ایسی جماعتیں بنانے کی حمایت کی ، تو اس زمانے میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا وجود کہیں نظر نہیں آتا ، البتہ فضل حسین ان مسلمان لیڈروں کی پیٹھ تھپکتے ضرور دکھائی دیتے ہیں ، جو اپنے اپنے صوبوں میں غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنا رہے تھے -

ان امور کی روشنی میں غور کیجیے کہ اگر فضل حسین کی پالیسی کامیاب ہو جاتی تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے !

ایک تو یہ کہ برصغیر ہند میں جداگانہ مسلم مملکت کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوتا کیونکہ یونینسٹ پارٹی اور اس جیسی دوسری جماعتوں کا مقصد اس قسم کی مملکت کی بنیاد کو مسمار کرنا تھا -

دوسرے یہ کہ برصغیر کی ملت اسلامیہ کی وحدت تحلیل ہو جاتی -

تیسرے یہ کہ جب یہ ملت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر صوبوں کی تنگنائی میں محصور ہو جاتی اور ہر صوبہ میں وہاں کی غیر فرقہ وارانہ جماعت میں ضم ہو جاتی تو ہندوستانی قومیت کا عفریت اس کو آسانی کے ہضم کر جاتا -

حقیقت یہ ہے کہ ملت کے لیے سنگین خطرات سر فضل حسین کی پالیسی میں تھے نہ کہ اقبال کی سیاست میں ! سر پر یہ خطرات منڈ لا رہے تھے ،

مگر مسلمانوں کی حالت کیا تھی ؟ ان کا شیرازہ بکھرا ہوا تھا ۔ مرکزیت نام کو نہ تھی ، وہ مختلف جماعتوں میں بٹے ہوئے تھے اور ہر جماعت چند قائدین کے ہاتھوں میں کھلونا بنی ہوئی تھی ! ان نازک اور خطرناک حالات میں ہم دیکھتے ہیں کہ ایک ساٹھ سالہ پیر مرد ، مجاہدانہ شان سے کھڑا ہوا ہے ۔ وہ دائیں بائیں آگے پیچھے پکار رہا ہے ملت کو آواز دے رہا ہے ۔ واعتصمو بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقو! مسلمانوں سب ملکر اللہ کی رسی کو تھام لو، ایک مرکز پر جمع ہو جاؤ، ٹولیوں اور ٹکڑیوں میں منتشر اور متفرق مت ہو جاؤ ! ـــــــ یہ مرد مجاہد تھا ، جناح جس نے اپریل ۱۹۳۶ع میں مسلمانوں کی تمام سیاسی جماعتوں کو مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع کرنے کی کوشش کی تھی ! ظاہر ہے کہ فضل حسین اور جناح کے نقاط نظر ایک دوسرے سے مختلف ہی نہیں ، متضاد و مقابل تھے۔ فضل کی پالیسی ملت کی وحدت کو شکست ور یخت سے دو چار کرنے والی تھی اور جناح کی پالیسی میں ملت کی مرکزیت مضمر تھی ۔ فضل کی سیاست پر غیر فرقہ واریت کی چھاپ تھی تو جناح کی سیاست کی اساس مسلم قومیت پر تھی ۔ یوں فضل اور جناح ایک دوسرے سے بہت دور ، دو بدو کھڑے تھے ۔ مگر جناح اور اقبال دوش بدوش اور یک سو نظر آتے ہیں ! ! اب ذرا اس اجمال کی تفصیل سن لیجئے۔

بیان کیا جا چکا ہے کہ اپریل ۱۹۳۶ع میں کل ہند مسلم لیگ کا اجلاس ہوا تھا، جس میں مسٹر جناح کی دعوت پر مسلمانوں کی مختلف سیاسی جماعتوں کے قائدین نے شرکت کی تھی اور بالاتفاق ایک مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کے تحت صوبائی شاخوں کی تشکیل کا اختیار مسٹر جناح کو دیا گیا تھا ۔ اس اسکیم کو روبہ عمل لانے کے لیے مسٹر جناح نے مختلف صوبوں کا دورہ شروع کیا ۔ پھرتے پھراتے ۲۹ اپریل ۱۹۳۶ع کو وہ لاہور پہنچے تاکہ یہاں کے اکابرین سے ملکر پنجاب صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کریں ۔ یکم مئی کو انھوں نے سر فضل حسین کے مکان پر جا کر ملاقات کی اور انھیں مسلم لیگ میں شرکت اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کے قیام کی ترغیب دی ، لیکن فضل حسین ماننے والے کب تھے ۔ انھوں نے تو مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس بمبئی کی صدارت سے انکار کر دیا تھا ۔ پھر اس ملاقات سے صرف گیارہ دن قبل یعنی ۱۹ اپریل کو انھوں نے یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو

کا بیڑہ اٹھایا تھا ، جس کا ذکر ہم کر آئے ہیں ۔ اس طرح وہ تو اپنے نظریات کو جامۂ عمل پہنانے کے لیے تلے بیٹھے تھے ، چنانچہ یہ ملاقات ناکام رہی ۔ فضل حسین نے مسٹر جناح کو ٹکا سا جواب دے دیا ۔ ادھر سے مایوس ہو جانے کے بعد قائداعظم علامہ اقبال کے گھر گئے ۔ واضح رہے کہ علامہ اس زمانہ میں سخت علیل اور چلنے پھرنے سے مجبور تھے ۔ گو وہ پنجاب صوبائی مسلم لیگ کے صدر تھے ، لیکن اپنی علالت کے باعث فعال نہ تھے ۔ جب مسٹر جناح نے ان سے ان کے گھر پر ملاقات کرکے انھیں مسلم لیگ کے احیاء اور صوبہ میں پارلیمانی بورڈ کے قیام کی دعوت دی تو باوجود بیماری ، کمزوری اور خانگی پریشانیوں کے ، انھوں نے کسی بحث و تمحیص ، حیل و حجت کے بغیر ، اس دعوت کو قبول کر لیا اور ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ

"میں صرف ، عوام کی مدد کا وعدہ کر سکتا ہوں ۔ مالداروں اور زمینداروں کی مدد کا نہیں [۵۴]"

اس ملاقات کے چشم دید گواہ کا بیان ہے کہ مسٹر جناح جیسے غیر جذباتی انسان ، اقبال کی اس گفتگو سے اتنے متاثر ہوئے کہ وہ اپنی کرسی سے دو انچ اوپر اٹھ گئے اور بڑے جوش سے کہا

"مجھے صرف عوام کی مدد درکار ہے [۵۴]"

اقبال سے ملاقات کے بعد مسٹر جناح اتحاد ملت اور مجلس احرار کے لیڈروں سے ملے ۔ انھوں نے بھی کچھ ردوکد اور حیص بیص کے بعد پارلیمانی بورڈ میں شرکت پر رضا مندی کا اظہار کر دیا ۔ فضل حسین اور ان کے ساتھیوں کو مسٹر جناح کی یہ تگ ودو خصوصاً علامہ اقبال کی یہ حمایت و رفاقت ایک آنکھ نہ بھائی ۔ سر فضل نے ٦ مئی ١٩٣٦ع کو اپنے لفٹنٹ سر سکندر حیات خاں کے نام ایک خط میں اس معاملہ سے متعلق ، اپنے اندرونی احساسات کا اس طرح اظہار کیا ۔

۵۴- "اقبال کے آخری دو سال" از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۔ مطبوعہ کراچی ١٩٦١ع ، ص ٣٠٧

"جناح نے مرکزی پارلیمانی بورڈ قائم کرنے میں سخت غلطی کی ہے۔ اس سے ہندوستان کے مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچے گا - ہم نے جو فیصلہ کیا ہے ؟ وہ بالکل درست ہے ۔ جناح نے ہمارے متعلق غلط فہمیاں پھیلائیں ۔ اخبارات میں ، جو پروپاگنڈا ان کی تائید میں ہوا ہے ، اسی کے باعث ان کی ناکامی کی تشہیر نہ ہوگی ہم نے انھیں ٹھکرا دیا ، اتحاد ملت نے ان کا ساتھ دینے سے انکار کیا ۔ احرار ان سے بات چیت کر رہے ہیں - چاہے وہ ان کا ساتھ دیں یا نہ دیں ، ان کا رویہ ہمارے تعلق سے ویسا ہی رہے گا جیسا کہ پہلے تھا ۔ البتہ اقبال ، شجاع ، تاج الدین ، برکت علی جیسے چند متفرق شہری باشندے ، جناح کی اس تحریک سے کچھ حاصل کرنے کی تمنا میں دوڑ دھوپ کر رہے ہیں[۵۵]"

سر سکندر نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی اور اسی دن جواب میں لکھا ۔

"جناح نے یہ اعلان کیا تھا کہ وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان متحد ہو کر ایک جسد واحد بن جائیں اور اسی حیثیت سے یک آواز ہو کر کانگریس اور حکومت سے معاملات طے کریں ۔ میں نے احمدیار (الف) سے کہہ دیا ہے کہ رہ جناح کو یہ پیغام پہنچا دیں کہ وہ اپنے آپ کو اپنے معانہ خیالات تک ہی محدود رکھیں ۔ لیکن گذشتہ چند ہفتوں کی اخباری رپورٹوں سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی مصروفیتیں

۵۵- "فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری" از عظیم حسین ۔ مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ع - ص ۳۰۹

الف ۔ احمد یار سے مراد احمد یار خاں دولتانہ ہیں جو پنجاب کے بہت بڑے زمیندار سر سکندر حیات کے بڑے گہرے دوست اور فضل حسین کے معتمد علیہ ساتھی تھے - اپریل ۱۹۳۶ع میں یونینسٹ پارٹی کی تنظیم نو کے بعد وہ اس کے چیف سکرٹری بنائے گئے تھے ۔ مسٹر جناح سے بھی ان کے گہرے مراسم تھے - مئی ۱۹۳۶ع میں جب مسٹر جناح لاہور تشریف لائے تھے تو ابتداً ان کے یہاں ٹھہرے تھے ۔ مصنف

ان امور کے مغایر ہیں ۔ میں نے احمد یار سے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ جناح پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دیں کہ وہ پنجاب کے پھٹیے میں اپنی ٹانگ نہ اڑائیں اور اگر وہ ایسا کریں گے تو خود ہی نقصان اٹھائیں گے ۔ کسی صورت میں بھی ، ہم اس امر کی اجازت نہیں دے سکتے کہ صوبائی خود مختاری میں کوئی شخص دخل انداز ہو ، چاہے یہ شخص اُس طاقت کا نمائندہ ہو ، جس نے ہمیں یہ خود مختاری عطا کی ہے ـــــــ یا وہ مسلم لیگ کا صدر ہو ، یا کوئی انجمن یا ادارہ ہی کیوں نہ ہو [۵۶]"

فضل حسین اور سر سکندر کی اس باہمی مراسلت سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ دونوں ، پنجاب میں مسٹر جناح کی سیاسی مہم اور علامہ اقبال کی اس سلسلہ میں اعانت سے بوکھلا اٹھے تھے ۔ فضل نے علامہ اقبال اور ان کے ساتھیوں کو "چند متفرق شہری" قرار دے کر اپنے دل کے جلیے پھپھولے پھوڑے تھے اور سکندر نے مسٹر جناح کے متعلق اپنی دھونس و دھمکی کا ذکر کرکے فضل حسین کے سُر میں سُر ملایا تھا ۔ دونوں کے نزدیک مسلم لیگ کا احیاء اور مسلمانوں کی مرکزیت ، پنجاب کی سیاست اور صوبہ کی خود مختاری میں مداخلتِ غیر کے مترادف تھی ! ! یہ تو فضل حسین اور سکندر کی باہمی خط و کتابت تھی ۔ جس میں انھوں نے مسٹر جناح اور پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالا تھا ۔ جب یونینسٹ پارٹی کے سالار اعلیٰ اور ان کے لفٹنٹ کا یہ حال تھا تو اس پارٹی کے رسالہ دار ، سوار اور پیادے کب خاموش بیٹھنے والے تھے ۔ انھوں نے اپنی توپوں کے دہانے مرد مجاہد کے مقابلے میں کھول دیئے ـــــــ اخبارات میں بیان بازیوں اور مضامین کا ایک طومار غریب جناح کے خلاف بندھ گیا ۔ گویا وہ مخلص سپاہی ، جو ملت کی صفوں کو درست کرنے اور ان میں نظم و ضبط پیدا کرنے کے لیے تنِ تنہا نکلا تھا ، راوی کے کنارے ،

۵۶- "فضل حسین ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۰

دشمنوں کے نہیں ، اپنوں ہی کے نرغہ میں گھیر گیا تھا ۔ اس وقت بھی اس کا دفاع ، ملت کے نقیب اقبال اور ان کے چند مخلص ساتھیوں نے کیا ۔ ۸ مئی ۱۹۳۶ع کو علامہ اقبال اور ان کے ساتھی ملک برکت علی وغیرہ نے ایک اخباری بیان جاری کیا ، جس میں انھوں نے نہ صرف مسٹر جناح کی مدافعت کی بلکہ ان کی مخلصانہ قیادت اور دور اندیشانہ سیاست کی تعریف کی، موقع پرستوں اور سیاسی قابوچیوں (Political opportunrists) کی مذمت کی اور آخر میں یہ اعلان کیا کہ

"ہماری قوم کو مسٹر جناح کی دیانت اور امانت اور سیاسی بصیرت پر ایسا پختہ اعتماد ہے کہ مسلمانان پنجاب کے تمام طبقوں نے بیک آواز مسٹر جناح کی تجویز پر لبیک کہنے سے دریغ نہیں کیا ۔ پنجاب کے مسلمان مسٹر جناح کی اس تجویز کے دل سے حامی ہیں کہ آئندہ صوبے کی اسمبلی میں ایسے خود دار ، خود اعتماد اور محب وطن نمائندوں کو بھیجا جائے ، جو اگر ایک طرف مسلمان قوم کا خاطر خواہ تحفظ کریں تو دوسری طرف ایوان کے دیگر ترقی پسند ممبروں کے ساتھ ملکر رائے عامہ کا وقار بھی قائم کریں ۔

ہمیں اس امر کا پورا احساس ہے کہ مسٹر جناح کی یہ تجویز جداگانہ انتخاب کا لازمی نتیجہ اور تتمہ ہے ۔ اس لیے ہم ان کو یقین دلاتے ہیں کہ جس اہم کام کی ابتدا انھوں نے کی ہے ، ہم اس کو تکمیل تک پہنچانے میں دل و جان سے ان کے حامی ہیں"[۵۷]

لاہور میں تقریباً ایک ہفتہ کے قیام کے بعد آدھر مسٹر جناح تو واپس چلے گئے ، اور ادھر علامہ اقبال صوبہ میں مسلم لیگ کے احیاء اور پارلیمانی بورڈ کی تشکیل میں مصروف ہو گئے - ۱۲ مئی ۱۹۳۶ع کو انھوں نے مسلم لیگ کا ایک جلسہ طلب کیا ، جس میں صوبہ مسلم لیگ کے حسب ذیل عہدہ داروں کا انتخاب عمل میں آیا ۔

۵۷- روز نامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۹ مئی ۱۹۳۶ع

صدر ــ علامہ اقبال

نائب صدر ــ ملک برکت علی بیرسٹر اور خلیفہ شجاع الدین بیرسٹر

سکرٹری ــ غلام رسول خاں بیرسٹر

جائنٹ سکرٹری ــ میاں عبدالمجید بیرسٹر اور ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی

نئے عزم و ولولہ کے ساتھ علامہ اقبال کی زیر سرکردگی ، صوبہ میں مسلم لیگ کی تنظیم نو اور انتخابات کے لیے تیاری کا کام شروع ہو گیا ۔

۲۱ مئی کو مسٹر جناح نے مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اراکین کے ناموں کا اعلان کر دیا ۔ اس میں صوبہ پنجاب کے گیارہ نمائندے تھے ، جن میں علامہ اقبال کے علاوہ مجلس احرار کے چار اور اتحاد و ملت کے تین افراد اور باقی تین دوسرے افراد شامل تھے ۔ احرار کے لیڈر چودھری افضل حق اور اتحاد و ملت کے سر براہ مولانا ظفر علی خاں کے نام بھی اس فہرست میں موجود تھے لیکن مولانا اس اعلان سے کچھ زیادہ خوش نہ ہوئے ۔ علامہ اقبال نے اس اعلان پر پنجاب کی مختلف جماعتوں کے رد عمل سے مسٹر جناح کو آگاہ کرتے ہوئے لکھا

"مجھے خوشی ہے کہ آپ کا کام آگے بڑھ رہا ہے ، مجھے امید ہے کہ پنجاب کی تمام جماعتیں ، خصوصاً احرار اور اتحاد ملت کسی قدر غم و غصہ کا اظہار کرنے کے بعد آپ کے ساتھ ہو جائیں گی ۔ اتحاد کے ایک بڑے پرجوش و سرگرم رکن نے چند روز ہوئے مجھے یہی بتایا ہے ۔ مولانا ظفر علی خاں کے متعلق خود اتحاد ملت والے وثوق سے کچھ نہیں کہہ سکتے ۔ بہر حال ابھی بہت وقت ہے اور ہمیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ اتحاد والوں کو اسمبلی میں بھیجنے کے تعلق سے رائے دہندگان کے احساسات کیا ہیں[۵۸]"

مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اعلان کے بعد ۲۸ مئی ۱۹۳۶ء کو پنجاب

۵۸۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف ۔ لاہور ۱۹۴۳ء ۔ ص ۶

مسلم لیگ کا ایک جلسہ علامہ اقبال کی صدارت میں منعقد ہوا۔ اور اس میں صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی گئی اور اس کی طرف سے انتخابی مہم کی تشہیر کا آغاز کر دیا گیا۔ چنانچہ چودہ سربر آوردہ حضرات کے دستخط سے ایک اپیل شائع کی گئی، جس میں مسٹر جناح کی قومی خدمات کو گنانے کے بعد کہا گیا کہ

"مسٹر جناح کی سب سے آخری خدمت جو ان کی سیاسی بصیرت پر دال ہے، اس اسکیم کی صورت میں جلوہ گر ہوئی ہے، جس کے تحت تمام صوبوں میں انتخاباتِ مسلم لیگ کے جھنڈے تلے لڑے جائیں گے اور اسی طرح مسلمان ان کھرے اور قابل اعتماد ارکان کو اسمبلی میں بھیجنے کے قابل ہوسکیں گے جو قوم اور وطن کے مفاد عالیہ کے لئے ہر ممکن قربانی اور ایثار کرنے کو تیار ہوں گے۔ چنانچہ پنجاب پراونشل پارلیمنٹری بورڈ کی تشکیل اسی منشا کے مطابق کی گئی ہے، جس کی صدارت کی باگ ڈور دنیا نے اسلام کے سب سے بڑے جلیل القدر فرزند حضرت علامہ محمد اقبال مدظلہ کے ہاتھ میں ہے۔

حضرات: آپ لوگوں پر مخفی نہ رہے کہ اس صوبے میں نام نہاد یونینسٹ پارٹی بھی انتخابات میں حصہ لیے رہی ہے۔ آپ لوگوں کو معلوم ہونا چاہیئے کہ یہ لوگ مسلمانانِ پنجاب کی وحدت کو دیہاتی اور قصباتی تقسیم کے ناپاک اور غیر اسلامی حربے سے پارہ پارہ کرنے کے ذمہ دار ہیں اور یہی لوگ ہیں، جنہوں نے اسلام کی عالمگیر اخوت کو اقتصادی مفاد کی قربان گاہ پر بھینٹ چڑھانے سے بھی دریغ نہ کیا افسوس کہ یہ لوگ اس حقیقت سے بے خبر ہیں کہ اسلام دنیا میں مادی بنیادوں پر انسانیت کے بکھرے ٹکڑوں کو جوڑنے نہیں آیا بلکہ آراء اور افکار کی یک جہتی پر انسانیت کے قصر رفیع کو استوار کرنے کے لیے آیا تھا۔ ہم تسلیم کرتے ہیں کہ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کا باہمی اتفاق ہندوستان کے قصرِ آزادی کی پہلی اینٹ ہے اور اسمبلی کے اندر جا کر ہمارا بھی مسلک آزاد خیال اور محب وطن ہندوؤں، سکھوں اور

عیسائیوں کے ساتھ سیاسی تعاون ہوگا لیکن ہم ایک لمحے کے لیے
بھی اسلام کے بلند ترین مقاصد کو پس پشت ڈال کر اپنی خود
غرضیوں اور جاہ پرستیوں کے خواب کو شرمندہ تعبیر کرنے کے لیے
غیر مسلموں کے ہاتھ اپنے اصولوں کو فروخت کرنے کے لیے تیار
نہیں - سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ کا منشا صرف یہ ہے کہ قابل مسلمان
صوبائی اسمبلیوں میں بھیجے جائیں[۵۹]"

۸ جون ۱۹۳۶ء کوکل ہند مسلم لیگ کونسل اور مرکزی پارلیمانی بورڈ کے اجلاس لاہور میں ہونے والے تھے ، جس کے انتظامات صوبہ مسلم لیگ کے سپرد تھے ان انتظامات کی جزوی تفصیلات کی نگرانی ، باوجود علالت اور کمزوری کے خود علامہ اقبال نے کی - مسٹر جناح ۶ جون کو ان جلسوں کی صدارت کرنے کے لیے لاہور آنے والے تھے - ان ہی دنوں یہ خبر شہر میں گشت کرنے لگی کہ یونینسٹ پارٹی والے مسٹر جناح کے خلاف سیاہ جھنڈیوں کا مظاہرہ کریں گے - علامہ کو اس خبر پر بڑی تشویش ہوئی - انھوں نے فوراً یونینسٹوں کو متنبہ کیا - نتیجتہً ان لوگوں کو ایسا اقدام کرنے کی جرات نہیں ہوئی اور وہ سیاہ جھنڈیاں جو تیار کی گئی تھیں ، انھیں ایک صندوق میں بند کرکے علامہ کی کوٹھی پر پہنچا دیا گیا ، جس کو بعد میں راوی کی لہروں کے سپرد کر دیا گیا[۶۰]- بہر کیف تاریخ مقررہ پر مسٹر جناح تشریف لائے اور ان کی صدارت میں مسلم لیگ کونسل اور پارلیمانی بورڈ کے اجلاس لاہور میں ہوئے - ان ہی جلسوں میں مسلم لیگ کا انتخابی منشور (Election menifesto) منظور کیا گیا - اس موقع پر مولانا ظفر علی خاں نے مرکزی پارلیمانی بورڈ سے یہ کہہ کر استعفیٰ دیدیا کہ مجلس اتحاد ملت کا نصب العین آزادیٔ کامل ہے اور مسلم لیگ کا درجہ نو آبادیت ! مولانا کے اس استعفیٰ سے یونینسٹ پارٹی میں مسرت کی لہر دوڑ گئی - فضل حسین نے آغا خاں کے نام اپنے ایک خط مورخہ ۲۲ جون

۵۹- گفتار اقبال - مرتبہ محمد رفیق افضل - ناشر ادارہ تحقیقات پاکستان - دانش گاہ پنجاب - لاہور ص ۲۰۴ و ۲۰۵

۶۰- روز نامہ امروز کراچی کا اقبال نمبر - مورخہ ۲۲ اپریل - ۱۹۵۰ء

میں لکھا۔

"جناح کو یونینسٹوں کے کسی حلقہ سے مدد نہیں ملی۔ مجلس اتحاد ملت نے بھی ان کے ساتھ تعاون کرنے سے انکار کر دیا اور ان کے مرکزی پارلیمانی بورڈ سے، جس میں انھوں نے انھیں نمائندگی دی تھی، دست کش ہو گئی ہے۔ اب ان کے ساتھ صرف احرار اور مانٹیگو چمسفورڈ اصلاحات کے زمانہ کے چند اعتدال پسند، ناکام اور زخم خوردہ لیڈر رہ گئے ہیں[۶۱]"

اور یہ "اعتدال پسند، ناکام اور زخم خوردہ لیڈروں" کا اشارہ اقبال اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے! پھر انھوں نے ایک اور جگہ لکھا

"جناح کے مرکزی پارلیمانی بورڈ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور توقع بھی یہی تھی۔ پنجاب میں یونینسٹ پارٹی نے انھیں آگاہ کر دیا تھا کہ ان کا یہ اقدام غلط ہے اور اس سے مسلم صوبوں کے مفادات کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہے۔ مولانا ظفر علی خاں اور اتحاد ملت کے فیصلہ کے بعد تو اب صرف احرار باقی رہ گئے ہیں، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا احرار لیگ میں شامل ہو کر اپنی جداگانہ ہستی کو معدوم کر ڈالیں گے؟ غالباً نہیں! بہر حال جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے، مرکزی پارلیمانی بورڈ کا وجود باقی نہیں رہا[۶۲]"

ادھر تو فضل حسین، مولانا ظفر علی خاں کے استعفے پر بغلیں بجا رہے تھے اور ادھر سر سکندر اپنی شاطرانہ چالیں چل رہے تھے۔ ایک طرف وہ خود ہندوؤں کے لیڈر راجہ نریندر ناتھ سے ۲۲ جون ۱۹۳۶ء کو ملے اور دوسری طرف اپنے عزیز دوست احمد یار خاں دولتانہ کو علامہ اقبال کی خدمت میں روانہ کیا۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ راجہ نریندر ناتھ سے

۶۱- فضل حسین: ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ء - ص ۳۲۱

۶۲- فضل حسین: ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ بمبئی ۱۹۴۵ء - ص ۳۱۲

گفتگوئے مفاہمت کرکے ، ان کے ساتھی ہندوؤں کو اپنے گروپ کے ساتھ ملا لیا جائے ۔ اگر یہ نہ ہو سکے تو مسلم لیگ کی ہمدردیاں حاصل کی جائیں ، کیونکہ اب علامہ اقبال کی زیر نگرانی مسلم لیگ کی تنظیم اور پارلیانی بورڈ کا کام پوری سرگرمی سے جاری تھا اور مولانا ظفر علی خاں کے استعفوں سے اس پر کوئی اثر نہیں پڑا تھا ۔ بہر کیف دولتانہ ۲۴ جون ۱۹۳۶ء کو علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور انہیں بتایا کہ سر سکندر عنقریب بمبئی میں مسٹر جناح سے ملنے والے ہیں ۔ پھر انھوں نے حضرت علامہ کے سامنے یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کے مابین مفاہمت کا ایک فارمولا پیش کیا ۔ یہ فارمولا حسب ذیل تھا ۔

"یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین حسب ذیل اعلان کریں گے ۔

یہ کہ وہ ان تمام امور میں جو مسلمانوں سے بحیثیت ایک کل ہند اقلیت کے متعلق ہیں ، وہ لیگ کے فیصلہ کے پابند رہیں گے ۔ اور صوبائی اسمبلی میں کسی غیر مسلم گروپ کے ساتھ کوئی معاہدہ ہرگز نہیں کریں گے ۔

بشرطیکہ صوبائی مسلم لیگ بھی حسب ذیل اعلان کرے ۔

یہ کہ وہ مسلم ارکان اسمبلی جو لیگ کے ٹکٹ پر صوبائی اسمبلی میں پہنچیں ، اس پارٹی یا گروپ سے تعاون کریں گے ، جس میں مسلمانوں کی تعداد سب سے زیادہ ہوگی[۶۳]"

علامہ اقبال نے دوسرے ہی دن (۲۵ جون ۱۹۳۶ء) مسٹر جناح کو ایک خط کے ذریعے اس ملاقات کی اطلاع دی ۔ فارمولا کے الفاظ سے آگاہ کیا اور آخر میں لکھا

"براہ مہربانی آپ اپنی اولین فرصت میں مجھے اس تجویز کے بارے میں اپنی رائے سے مطلع فرمائیے اور اس سے بھی کہ سر سکندر حیات سے آپ کی گفتگو کا کیا نتیجہ نکلا ۔ اگر آپ انہیں قائل

۶۳۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ء ۔ ص ۹

کرنے میں کامیاب ہوگئے تو ہو سکتا ہے کہ وہ ہماری طرف آ جائیں[۶۴]"

خط کے ان الفاظ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ علامہ پر امید تھے کہ یونینسٹ پارٹی کے سکندر گروپ اور مسلم لیگ کے مابین مفاہمت ہو جائے گی لیکن حالات نے ایک اور کروٹ لی ۹ جولائی ۱۹۳۶ع کو فضل حسین کا انتقال ہو گیا اور ۲۲ جولائی کو سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے لیڈر منتخب ہو گئے ۔ اب ان کا کوئی مد مقابل نہ تھا اور نہ یونینسٹ پارٹی کے کسی گروپ سے انھیں بغاوت کا خطرہ تھا ۔ ان کے ہاتھ مضبوط ہو گئے تھے ۔ اس لیے علامہ اقبال سے مفاہمت و مصالحت کا جو سلسلہ انھوں نے احمد یار خاں دولتانہ کے ذریعہ شروع کیا تھا اس کو مزید آگے بڑھانے یا نتیجہ خیز بنانے کی انہیں چنداں ضرورت باقی نہیں رہی تھی ۔ تاہم علامہ اس گفتگوئے مفاہمت کو جاری رکھنا اور بار آور بنانا چاہتے تھے ، چنانچہ انھوں نے ۲۳ اگست ۱۹۳۶ع کو مسٹر جناح کے نام حسب ذیل خط لکھا ۔

"میرے پیارے جناح !

مجھے امید ہے کہ میرا خط بروقت پہنچ چکا ہوگا ۔ پنجاب پارلیمانی بورڈ اور یونینسٹ پارٹی میں سمجھوتہ کی کچھ بات چیت ہو رہی ہے ۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ مجھے بتائیں کہ اس مفاہمت کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے اور یہ بھی کہ اس کی کیا شرائط ہونی چاہئیں ۔ میں نے اخبارات میں پڑھا ہے کہ آپ نے بنگال پرجا پارٹی اور پارلیمانی بورڈ میں مصالحت کرا دی ہے ۔ میں اس مصالحت کی شرائط معلوم کرنا چاہتا ہوں ، چونکہ پرجا پارٹی بھی یونینسٹ پارٹی کی طرح غیر فرقہ وارانہ جماعت ہے ۔ آپ کا بنگال کے ساتھ یہ سمجھوتہ کارآمد ہو سکتا ہے[۶۵]"

۶۴۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ع ۔ ص ۹ و ۱۰

۶۵۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف لاہور۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ع ، ص ۱۰

حال احمد یار خاں سے ملاقات کے بعد کچھ دنوں تک (ستمبر تک) علامہ پر امید تھے کہ یونینسٹ پارٹی سے مفاہمت ہو جائیگی۔ ںکہ فضل حسین کے انتقال اور سرسکندر کے برسر قیادت آ جانے سے ں تبدیلی پیدا ہو چکی تھی ، اس لیے مفاہمت کی یہ کوشش نا کام ۔

مل حسین کے انتقال کے بعد ، یونینسٹ پارٹی کے ایک سرگرم رکن ن مہدی خاں مستعفی ہوکر مسلم لیگ میں شریک ہو گئے ۔ علامہ کے خلوص اور جذبہ عمل کے بڑے قائل تھےاور وہ خود علیل تھے انھیں یہ خیال ہوا کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ کی صدارت سے وہ خود ہوکر ملک زماں مہدی کو صدر بنا دیں ۔ بورڈ کے اراکین کی کے باوجود انھوں نے استعفیٰ لکھ کر دے دیا ۔ البتہ اس بات پر ، کا اظہار کیا کہ وہ بدستور بورڈ کے رکن رہیں گے ۔ ابھی استعفیٰ منظور نہیں ہوا تھا کہ یہ خبر یونینسٹ پارٹی کے حلقوں میں پہنچ ۔ وہاں خوشی کے شادیانے بجائے جانے لگے کہ مسلم لیگ تو اب ں ختم ہو گئی ۔ جب علامہ کو یہ معلوم ہوا تو انھوں نے استعفیٰ ے لیا ۔ البتہ ملک زماں مہدی کو نائب صدر بنا دیا گیا[۶۶]۔

ب یونینسٹ پارٹی یا اس کے سربرآوردہ لیڈروں سے مفاہمت کی کوئی اق نہیں رہی تھی اور انتخابات بھی سر پر آ رہے تھے ۔ اس لیے نے مسلم لیگ کی تنظیم نو کی طرف پوری طرح توجہ دینی شروع کی ۔ یر ہدایت مختلف ذیلی کمیٹیاں بنائی گئیں ۔ پراپیگنڈے کا کام شروع گیا اور تنظیمی دوروں پر مختلف ٹولیاں روانہ ہوئیں ۔

سی زمانہ میں ایک افسوسناک بات یہ ہوئی کہ احراری بھی پارلیمانی ے علیحدہ ہو گئے ۔ پارلیمانی بورڈ نے انتخابات میں حصہ لینے والے وں کے لیے ایک حلف نامہ تیار کیا تھا ، اس کی بعض شقوں پر

اقبال کے آخری دو سال ، از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ص ۳۳۱ تا ۳۳۳ ۔

انہیں اعتراضات تھے ، لیکن جب یہ اعتراضات رفع کر دیئے گئے تو اس شق کو بڑھانے پر اصرار کیا گیا کہ منتخب شدہ اُمیدوار اسمبلی میں جا کر مرزائیوں کو مسلمانوں سے علیحدہ ایک اقلیت قرار دینے کی کوشش کرے گا ۔ ان کا یہ مطالبہ بھی مان لیا گیا اور اس شق کا حلف نامہ میں اضافہ کیا گیا ۔ علامہ اقبال نے بھی اس اضافہ کو قبول کر لیا اور بحیثیت صدر اس حلف نامہ کی توثیق کی ۔ لیکن اس کے باوجود احراری دل سے مسلم لیگ کے ساتھ نہ ہوئے ۔ پارلیمانی بورڈ نے ہر امیدوار انتخاب کے لیے ایک شرط یہ بھی رکھی تھی کہ وہ پانچ سو روپے بورڈ کے فنڈ میں جمع کرائے تو احراریوں نے اس شرط کو بہانہ بنا کر بورڈ سے علیحدگی اختیار کر لی[۶۷] ۔ گویا اس طرح اتحاد ملت والے تو پہلے علیحدہ ہو چکے تھے ۔ اب احرار بھی رخصت ہو گئے اور یونینسٹ پارٹی یا اس کے گروپ سے مصالحت کی جو توقع تھی وہ پہلے ہی ختم ہو چکی تھی ۔ اب پنجاب مسلم لیگ کو اپنے پاؤں پر آپ کھڑا ہونا اور صوبائی پارلیمانی بورڈ کو اپنے ہی بل بوتے پر انتخابات کی جنگ لڑنا تھا ۔ اب لیگ کا کھلم کھلا مقابلہ یونینسٹ پارٹی سے تھا ۔ اِدھر تنظیمی نقطۂ نظر سے مسلم لیگ ابھی ابتدائی منازل طے کر رہی تھی ۔ اس کے پاس ہمہ وقتی کارکنوں کی بھی کمی تھی اور روپیہ پیسہ کی بھی اور اُدھر یونینسٹ پارٹی کے پاس ہر چیز کی فراوانی تھی ۔ پنجاب کے بڑے ذی اثر زمیندار اس کے لیے بھاگ دوڑ کر رہے تھے اور تھیلیوں کے تو منہ کھلے ہوئے تھے ۔ یہاں صوبائی لیگ میں چند مخلص ایثار پیشہ سر پھرے جمع تھے ، جن کی قیادت ایک فقیر بے نوا اقبال کر رہا تھا اور وہاں یونینسٹ پارٹی میں ذی حیثیت اور مقتدر حضرات شریک تھے اور ان کا لیڈر صوبہ کا سب سے بڑا حاکم ، حکومت کا ریونیو ممبر سر سکندر تھا ! ـــــــــ لیکن بہرحال علامہ اقبال اور ان کے رفقاء کار نے طے یہی کیا کہ ہرچہ بادا باد ، ما کشتی در آب انداختیم ۔

اب پنجاب صوبائی پارلیمانی بورڈ کی جانب سے انتخابی منشور (Election Menifests) جاری کر دیا گیا ، جو ہمہ گیر اور ترقی پسندانہ

۶۷۔ ایضاً ص ۳۴۲ ۔

تھا - اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں صوبائی پارلیمانی بورڈ نے انتخابی مہم شروع کی - اس مہم کا افتتاح کرنے کے لیے علامہ اقبال نے پھر ایک مرتبہ مسٹر جناح کو لاہور آنے کی دعوت دی چنانچہ مسٹر جناح ۹ اکتوبر کو لاہور تشریف لائے - ۱۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۶ء کو ایک جلسہ عام میں اس انتخابی مہم کا انھوں نے افتتاح کیا - علامہ اقبال کا قطعی ارادہ تھا کہ اس جلسہ کی صدارت وہ خود کریں گے لیکن عین وقت پر ان کی طبیعت خراب ہو گئی ، اس لیے جلسہ کی صدارت ملک زمان مہدی نے کی[۶۸] - مسٹر جناح نے اس جلسہ میں بڑی پر زور تقریر کی - یونینسٹ پارٹی اور سر سکندر کی خوب خبر لی -

الغرض اس طرح صوبائی مسلم لیگ نے علامہ اقبال کی سرکردگی اور مسٹر جناح کی رہنمائی میں انتخابی مہم کا آغاز کیا - اور اس کے بعد یہ مہم زور شور سے چلنے لگی - اسی دوران ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا - ہوا یہ کہ سر سکندر کے ایک قریبی عزیز احمد بخش خان صوبائی مسلم لیگ پنجاب کے سیکرٹری غلام رسول خان کے پاس سر سکندر کا ایک عجیب و غریب پیغام لیکر آئے - پیغام یہ تھا کہ اگر صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ ، انتخابات سے دست کش ہو جائے اور اپنے کسی امیدوار کو کھڑا نہ کرے تو سر سکندر ان چار لیگی افراد کو جنھیں علامہ اقبال نامزد کریں ، بلا مقابلہ منتخب کروا دیں گے - لیگ کے معتمد نے یہ تجویز جب علامہ کے سامنے پیش کی تو وہ جھلا اٹھے اور کہا -

”کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ ہم نے اسمبلی کی سیٹوں کی بھیک مانگنے کے لیے مسلم لیگ کا ڈھونگ رچایا ہے ؟

ہمارا مقصد یہ ہے کہ لیگ کے ذریعہ سے مسلمان عوام میں سیاسی شعور پیدا کیا جائے - اگر سارے امیدوار ہار جائیں تو مجھے افسوس نہ ہوگا لیکن یہ ہم کیونکر گوارا کر سکتے ہیں کہ اپنا نصب‌العین ترک کرکے محض چار سیٹوں کے لیے مخالف فریق

۶۸- اقبال کے آخری دو سال ، از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۳۵۳ -

سے سمجھوتہ کر لیا جائے ۶۹ ''

ہم دیکھ چکے ہیں کہ جون سنہ ۱۹۳۶ء میں جب احمد یار دولتانہ نے یونینسٹ پارٹی کی طرف سے مفاہمت کی کوشش کی تھی تو ا نے انکار نہیں کیا تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ اس وقت مفاہمت کی کوئی صو نکل آئے ۔ لیکن اب اکتوبر میں وہ صلح کی یونینسٹ پیشکش کو ٹھ رہے تھے، وجہ کیا تھی ؟ کیا یہ وجہ تھی کہ وہ چار ماہ قبل یونینسٹ ! کو طاقتور اور مسلم لیگ کو کمزور سمجھ رہے تھے اور اب یونین پارٹی کے مقابلہ میں انھیں اپنی پارٹی کی طاقت کا اندازہ ہو گیا تھا ؟ نہ وہ جانتے تھے کہ یونینسٹ پارٹی کی پشت پر دولت و اقتدار جب بھی اور اب بھی ہیں ۔ پھر وہ یہ بھی سمجھتے تھے کہ یہ پارٹی انتخابات ج کے لیے ہر قسم کے ہتھکنڈے اختیار کرے گی ، تو پھر اس وقت مفا پر رضا مندی اور اِس وقت اس سے انکار کی وجہ کیا تھی ؟ وجہ صرف تھی کہ وہ مفاہمت اصولوں کو برقرار رکھتے ہوئے صرف اس مقصد کی جا رہی تھی کہ مسلمانوں کا ایک متحدہ محاذ بن جائے اور صلح کی پیشکش نصب العین کو ترک کرنے کی دعوت تھی ۔ واقعہ یہ ہے کہ مفاہمت و مصالحت نہ تھی '' سودے بازی '' (Bargaining) تھی ۔ ا نے اس سکندرانہ پیشکش کو ٹھکرا کر درحقیقت اپنے قلندرانہ عزم کا ثـ دیا تھا ۔

بہرحال اقبال نے سکندر کی اس پیشکش کو ٹھکرا دیا اور نومبر ۱۹۳۶ء کے پہلے ہفتہ میں صوبائی مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ نے امیدواروں کا اعلان کر دیا ۔ اب ان امیدواروں کی تائید میں صوبائی کی طرف سے پراپیگنڈا شروع ہوا ۔ اقبال نے ان کی حمایت میں بیانات ، کیونکہ وہ انتخابی جلسوں میں جانے اور تقریریں کرنے سے اپنی علا کے باعث معذور تھے ۔

ان امیدواروں میں سب سے اہم ملک برکت علی تھے ، جو ع

۶۹- روز نامہ امروز کراچی ، اقبال نمبر ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ء -

کے دست راست صوبائی لیگ اور پارلیمانی بورڈ کی روح رواں تھے اور یونینسٹ پارٹی نے بھی اپنا پورا زور ان ہی کو ناکام بنانے میں لگا دیا تھا - سر سکندر کو تو ان سے ذاتی عناد تھا - سر سکندر نے ان کے مقابلہ میں مرزا حمید اللہ بیگ کو کھڑا کیا تھا - علامہ اقبال ، حمید اللہ بیگ سے واقف تھے - چنانچہ علامہ نے ان سے بذات خود درخواست کی کہ وہ ملک برکت علی کا مقابلہ نہ کریں - لیکن سکندر نے ان سے قرآن پر حلف لیا تھا کہ وہ ملک برکت علی کے مقابلہ سے پیچھے نہ ہٹیں گے - چنانچہ وہ مقابلے میں ڈٹے رہے -

فروری سنہ ۱۹۳۷ء کے دوسرے ہفتہ میں انتخابات کا نتیجہ نکلا - مسلم لیگ کے صرف دو امیدوار کامیاب ہوئے تھے - ایک ملک برکت علی اور دوسرے راجہ غضنفر علی خان - جب علامہ اقبال کو ملک برکت علی کی کامیابی کی خبر سنائی گئی ، تو وفور مسرت سے ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے [۷۰] !

انتخابات کا نتیجہ نکلنے کے بعد پنجاب میں سر سکندر نے وزیر اعلیٰ کا حلف اٹھایا ، کیونکہ وہی مقننہ کے اندر اکثریتی جماعت (یونینسٹ پارٹی) کے لیڈر تھے - انھوں نے پانچ افراد پر مشتمل اپنی کابینہ ترتیب دی ، جس میں دو مسلمان (یونینسٹ) تھے ، دو ہندو تھے - (ایک چودھری چھوٹو رام یونینسٹ تھے اور دوسرا ہندو الیکشن بورڈ پارٹی یعنی راجہ نریندر ناتھ کی پارٹی کا رکن) ایک سکھ (خالصہ نیشنل پارٹی) - گویا یہ خالص یونینسٹ وزارت نہ تھی ، بلکہ مخلوط وزارت (Coalition Ministry) تھی ، جو ہندو الیکشن بورڈ پارٹی ، خالصہ نیشنل پارٹی کے ایک ایک نمائندے اور یونینسٹ پارٹی کے چار نمائندوں پر مشتمل تھی - پھر یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مقننہ کے اندر یونینسٹ پارٹی میں صرف دس ہندو اراکین تھے ، جو سب کے سب چھوٹو رام کے ذات بھائی یعنی جاٹ تھے -

---

۷۰- " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، ناشر اقبال اکادمی ص ۳۶۸ -

انتخابات کے نتائج ، پنجاب مسلم لیگ کے لیے کچھ حوصلہ افزا نہ تھے ، تاہم انتخابی مہم کے دوران ، مسلم لیگ کا پیغام پنجاب کے دور دراز علاقوں میں پہنچ گیا اور علامہ اقبال کی قیادت و رہنمائی کی وجہ سے عوام کے کان اس کے نام سے آشنا ہو گئے ۔ اقبال انتخابات کے ان نتائج سے مطلق دل شکستہ نہیں ہوئے ۔ انھوں نے اپنے رفقا کو ہدایت کی کہ تنظیمی دوروں کا سلسلہ برابر جاری رکھیں اور اضلاع میں مقامی شاخیں قائم کریں ۔ چنانچہ ان کے رفقا نے ان کی ہدایات پر پوری طرح عمل کیا ، یوں انتخابات میں شکست کے باوجود مسلم لیگ کی تنظیم کا کام جاری رہا ، اس کی آواز مسلم عوام تک پہنچتی رہی اور اس کا پیغام دلوں میں گھر کرتا گیا ۔ یہ بات یونینسٹوں کے لیے ناقابل برداشت تھی ۔ سر سکندر اور ان کے ساتھی لیگ کی اس تنظیمی مہم سے بوکھلا گئے ۔ اس کے علاوہ یونینسٹ پارٹی اور سر سکندر کی قسمت میں اور بھی دھماکے لکھے ہوئے تھے !

اس باب کے سیاسی پس منظر میں ہم بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۶ع کے انتخابات میں کانگریس کو سات صوبوں میں اکثریت حاصل ہوئی تھی ۔ تاہم وہ مسلمانوں کا اعتماد حاصل کرنے میں ناکام ہو چکی تھی ۔ یہ سات صوبے ہندو اکثریت کے صوبے تھے اور ان ہی کے بل بوتے پر اس کو اکثریت حاصل ہوئی تھی ۔ مسلم اقلیت اور مسلم اکثریت کے صوبوں (باستثنائے صوبہ سرحد) میں اس نے مسلمانوں کی صرف اتنی نشستوں پر قبضہ کیا تھا جنھیں انگلیوں پر گنا جا سکتا تھا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ اس ناکامی کا علاج صدر کانگریس پنڈت جواہر لال نہرو نے یہ تجویز کیا تھا کہ مسلم عوام سے راست رابطہ قائم کیا جائے ۔ چنانچہ " رابطۂ مسلم عوام " کی یہ کانگریسی تحریک زور شور سے شروع ہوئی ۔ یہ تحریک یونینسٹ پارٹی کے لیے خطرہ تھی ۔ اس کی پشت پر کانگریس کی کل ہند طاقتور تنظیم تھی ، جس کے ہاتھ میں سات صوبوں کی عنانِ حکومت تھی اور " صاحب بہادر " بھی اس کے اشارہ چشم و ابرو پر ناچنے کے لیے تیار تھے ! ایسی صورت میں اگر اس خطرناک تحریک رابطہ مسلم عوام نے پنجاب کا رخ کیا تو کیا ہو گا ؟ کانگریس ایک غیر فرقہ وارانہ جماعت تھی اور اس کا پروگرام بھی

اقتصادی لحاظ سے ترقی پسندانہ تھا ۔ پھر اس کا لیڈر اور اس تحریک کا بانی جواہر لال نہرو تھا ، جس کے ایثار و قربانی ، جوش اور اخلاص کے سبھی قائل تھے ۔ اگر اپنے اس ترقی پسندانہ اقتصادی پروگرام اور اس جوشیلے رہبر کی قیادت میں اس خطرہ نے پنجاب میں سر نکالا تو یونینسٹ پارٹی اپنے غیر فرقہ وارانہ بھروپ اور رجعت پسندانہ معاشی لائحہ عمل کا بھرم کیسے برقرار رکھ سکے گی ؟ کانگریس کے فولادی قلعہ اور تحریکِ رابطہ عوام کے طوفانی ریلے کے سامنے تو وہ مٹی کا ایک گھروندا تھی ! اگر اس کے مٹھی بھر ہندو جاٹ اپنے ہم مذہبوں کا ساتھ دیتے ہوئے کانگریس میں شامل ہو گئے تو پھر اس گھروندے کا کیا بنے گا ؟ یا اگر کچھ یونینسٹ مسلمانوں نے یونینسٹ پارٹی جیسی غیر فرقہ وارانہ صوبائی جماعت کو کانگریس جیسی " قومی " فعال ، باثر اور ملک گیر جماعت پر ترجیح دی اور نہرو کے اقتصادی پروگرام میں کشش محسوس کی ، تو پھر یونینسٹ پارٹی اور سکندری وزارت کی ناؤ کیسے پار لگے گی ؟ یہ وہ سوالات تھے جو سر سکندر کو پریشان کیے ہوئے تھے ۔ پنڈت جواہر لال نہرو کو رابطۂ مسلم عوام کی تحریک شروع کیے ہوئے کچھ ہی عرصہ گذرا تھا کہ کانگریس کا یہ سیلاب پنجاب کی حدود میں داخل ہو گیا ۔ اب ذرا اس اجمال کی تفصیل سن لیجئے ۔

مرکزی اسمبلی میں پنجاب کی ایک نشست خالی ہوئی اور مئی سنہ ۱۹۳۷ع میں اس نشست کے لیے ضمنی انتخاب کا اعلان کیا گیا ۔ اس نشست کے لیے مولانا ظفر علی خان کھڑے ہوئے ، جو سنہ ۱۹۳۱ع کی کانگریسی تحریکِ سول نافرمانی میں " جیل یا ترا " کر آئے تھے ۔ کانگریس سے ان کی سابقہ وابستگی اور ملک کی آزادی کے لیے ان کی قربانیوں کو نظر انداز کرکے کانگریس نے ان کے مقابلے میں ایک گمنام لیکن مالدار شخص عبدالعزیز کو کھڑا کر دیا ۔ علامہ اقبال کو جب یہ اطلاع ملی تو انھوں نے عبدالعزیز کے والد کو سمجھایا کہ وہ اپنے بیٹے کو مولانا کے مقابلے میں دستبردار کرا دے ۔ علامہ کی یہ ترغیب کارگر ہوئی اور اس معاملہ کا تصفیہ ایک ثالثی بورڈ کے سپرد ہوا ، جس میں علامہ خود بھی شریک تھے ۔ نتیجتاً عبدالعزیز نے دستبرداری کر لی اور

یوں مولانا ظفر علی خان بلامقابلہ منتخب ہو گئے! کانگریس کی اس حرکت کو دیکھ کر یونینسٹ پارٹی کے سرکردہ لیڈروں ؛ خصوصاً سر سکندر کے کان کھڑے ہوئے - انھیں اس خطرہ کا احساس ہو گیا ، جو کانگریسی تحریک اپنے جلو میں لیے ہوئے آ رہی تھی اور جس سے بچ نکلنا یونینسٹ پارٹی کے بس کا روگ نہ تھا !

اس واقعہ کے بعد ایک دوسرا اس سے بھی اہم تر واقعہ پیش آیا - اس باب کے پس منظر میں ہم بتا چکے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۶ع کے انتخابات کے بعد سر عبدالقیوم نے صوبہ سرحد میں وزارت بنائی تھی - ستمبر سنہ ۱۹۳۷ع میں اس وزارت کو شکست ہو گئی - یہاں کانگریس اس قابل نہ تھی کہ تنہا وزارت تشکیل دے سکتی کیونکہ پچاس نشستوں کے ایوان میں کانگریسی اراکین مقننہ کی تعداد صرف انیس تھی ، لیکن کانگریس ہائی کمان کی ہدایت اور مولانا آزاد کے حکم سے ان انیس کانگریسیوں کے ساتھ غیر کانگریسی اراکین کو ملا کر ایک مخلوط جماعت بنائی گئی اور اس کے بل بوتے پر ڈاکٹر خان صاحب کی سرکردگی میں ایک کانگریسی وزارت ترتیب دی گئی ، جس میں ڈیمو کریٹ پارٹی کا ایک غیر کانگریسی وزیر بھی شامل تھا - اس طرح درحقیقت یہ ایک مخلوط وزارت تھی - ہم بتا چکے ہیں کہ مسلم اقلیت کے سات صوبوں میں تختِ اقتدار پر متمکن ہوتے وقت کانگریس نے یہ اصول بنایا تھا کہ وہ کسی غیر کانگریسی کو اپنی وزارت میں نہیں لے گی ، لیکن ان صوبوں میں اپنے پاؤں مضبوطی سے جما لینے کے بعد ، اس نے مسلم اکثریت کے صوبوں کی طرف بھی دستِ آز دراز کیا تھا ، اور اس دراز دستی میں اس نے خود ہی اپنے پاؤں سے اپنے بنائے ہوئے اصولوں کو روندا تھا ، بلکہ اب تو وہ اس سطح پر آئی تھی کہ عشق اور جنگ میں سب کچھ جائز ہے ! اسے ہند گیر اقتدار سے عشق تھا - اور اسی عشق کی خاطر وہ ہر جماعت سے جنگ کرنے اور مسلمانوں کی سیاسی ہستی کو فنا کرنے پر تل گئی تھی ! ! سرحد کے اس واقعہ سے سر سکندر اور یونینسٹ پارٹی کے لیڈروں کے دل دہل گئے - انھیں یہ خدشہ تھا کہ اسی طرح کی کانگریسی ریشہ دوانیاں اور سازشیں پنجاب میں ہوئیں تو سکندر وزارت کا کیا بنے گا ؟ کیونکہ یہ وزارت تو بھان متی کا

ایک کنبہ تھا ، جس میں نریندر ناتھ پارٹی کی اینٹ بھی تھی اور خالصہ نیشنل پارٹی کا روڑا بھی تھا - آخر چودھری چھوٹو رام کے جاٹوں پر کب تک تکیہ کیا جا سکتا تھا ؟ !

مسلم اقلیتی صوبوں میں کانگریس کے متکبرانہ طرز عمل اور مسلم اکثریتی صوبوں میں اس کی ریشہ دوانیوں اور مسلمانوں کو ہڑپ کر جانے والی تحریک ، رابطہ مسلم عوام نے یونینسٹ پارٹی کے مسلمان لیڈروں کی آنکھیں کھول دیں اور انہیں وہ خطرہ بچشم سر نظر آنے لگا ، جس کی نشان دہی مسٹر جناح نے سنہ ۱۹۳۶ع کے آغاز ہی میں کر دی تھی ! اس وقت مسلمان لیڈروں نے پنجاب میں ، بنگال میں ، سندھ اور سرحد میں ، اس خطرہ کو موہوم اور خیالی قرار دیا تھا لیکن یہ خطرہ اب واقعی سر پر منڈلا رہا تھا - یہ سب لیڈر لال بجھکڑ تھے - اپنی ناک سے آگے نہیں دیکھ سکتے تھے ، مگر جناح وہ زیرک سیاستدان تھا ، جس کی نگاہیں حال کے پردوں کو چاک کرکے مستقبل کو بے نقاب دیکھ لیا کرتی تھیں - سنہ ۱۹۳۶ع میں اس آواز پر کہ مسلمانو ایک ہو جاؤ ، بعضوں نے ناک بھوؤں چڑھائی ، اس کا مذاق اڑایا ، اس پر فقرے کسے بلکہ دھمکیاں تک دیں ! ہاں صرف ایک نے اس کی آواز کو آواز رحیل کارواں سمجھا اور وہ تھا اقبال ! اس نے اس کو اس وقت ہی پہچان لیا تھا کیونکہ وہ مردم شناس ہی نہیں جوہر شناس بھی تھا ! !

ان حالات اور ایسی سیاسی فضاء میں (۱۵ ، ۱۶ ، ۱۷ ، ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع) مسلم لیگ کا پچیسواں سالانہ اجلاس بمقام لکھنؤ مسٹر جناح کی صدارت میں منعقد ہوا ، اور یہی اجلاس مسلم لیگ کی نشاۃ ثانیہ کا نقطہ آغاز ثابت ہوا - اس میں ہندوستان کے تمام صوبوں سے مسلم نمائندے اور سربرآوردہ زعما شریک ہوئے - پنجاب سے سر سکندر اپنے حامیوں اور مددگاروں کی پوری ایک جمیعت کے ساتھ اس میں موجود تھے - علامہ اقبال اپنی علالت کے باعث اس میں شریک نہیں ہو سکتے تھے لیکن انھوں نے اپنے رفقاء کو روانہ کیا تھا - اسی اجلاس میں جیسا کہ ہم اس باب کے پس منظر میں بیان کر چکے ہیں کہ وہ تمام مسلم جماعتیں ، جو مسلم لیگ

پارلیمانی بورڈ کے خلاف تھیں ، مسلم لیگ میں شامل ہو گئیں ۔ سر سکندر اور ان کے رفقاء کے لیے بھی یہی راستہ کھلا ہوا تھا کہ وہ یونینسٹ پارٹی کے سوانگ کو ترک کرکے مسلم لیگ میں غیر مشروط طریقہ سے شریک ہو جاتے ۔ یہ راستہ ان کی اپنی وزارت کی سلامتی ، مسلمانانِ پنجاب کی فلاح و بہبود اور ملتِ اسلامیہ کی یکجہتی و عظمت کا راستہ تھا ، لیکن انھوں نے یہ راستہ اختیار نہیں کیا ۔ اس اجلاس میں انھوں نے ایک بیان پڑھا ، جس کو عام طور پر ” سکندر جناح میثاق “ کہا جاتا ہے ۔ اس بیان کا خلاصہ درج ذیل ہے ۔

الف۔ سر سکندر حیات خاں پنجاب واپس جا کر اپنی پارٹی کا ایک خاص اجلاس منعقد کریں گے ، جس میں پارٹی کے ان تمام مسلمان ممبروں کو جو ابھی تک مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں ، ہدایت کریں گے کہ وہ سب مسلم لیگ کے حلف نامہ پر دستخط کرکے لیگ میں شامل ہو جائیں ۔ اس کے بعد ان تمام قواعد و ضوابط پر جو کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے مرکزی و صوبائی بورڈ کے ہیں ، عمل کرنے پر مجبور ہوں گے ۔ لیکن یہ معاہدہ یونینسٹ پارٹی کی موجودہ کولیشن پر اثر انداز نہیں ہو گا ۔

ب ۔ اس معاہدے کے بعد آئندہ مجلس قانون ساز کے عام اور ضمنی انتخابات میں وہ متعدد فریق ، جو یونینسٹ پارٹی کے اجزائے ترکیبی ہیں ، متحدہ طور پر ایک دوسرے کے امیدواروں کی حمایت کریں گے ۔

ج ۔ یہ کہ مجلس قانونِ ساز کے وہ مسلم ارکان ، جو مسلم لیگ کے ٹکٹ پر منتخب ہوئے ہیں ، یا اب لیگ کی رکنیت قبول کرتے ہیں ، اسمبلی میں مسلم لیگ پارٹی متصور ہوں گے ۔ ایسی مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی کہ وہ آل انڈیا مسلم لیگ کی سیاسی پالیسی اور پروگرام کے بنیادی اصولوں کو مد نظر رکھتے ہوئے کسی دوسری پارٹی سے تعاون یا اتحاد

کرے ۔ اس قسم کا تعاون انتخابات کے ما قبل یا ما بعد ہر دو صورتوں میں کیا جا سکتا ہے ۔ نیز پنجاب کی موجودہ متحدہ جماعت اپنا موجودہ نام یونینسٹ پارٹی برقرار رکھے گی ۔

د ۔ مذکورہ بالا معاہدے کو مد نظر رکھتے ہوئے پراونشل پارلیمانی بورڈ کی تشکیل از سر نو عمل میں لائی جائے گی[۱] ۔

سر سکندر کی جانب سے یہ اعلان دراصل ایک دہری چال تھی کہ کانگریس کی ضرب کو تو مسلم لیگ کی ڈھال پر روک لیا جائے اور ساتھ ہی یونینسٹ پارٹی کا غیر فرقہ وارانہ سوانگ بھی باقی رہے ۔ ان کی یہ شاطرانہ دو رخی چال ان کے اس بیان سے ظاہر ہوتی ہے جو انھوں نے لکھنؤ سے واپس آ کر ۱۷ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع کو جاری کیا تھا ۔ اس بیان میں انھوں نے کہا ۔

" جہاں تک پنجاب کا تعلق ہے ، سابقہ صورت حال بنوز قائم و بحال ہے ۔ البتہ اس میں صرف یہ ترمیم کر دی گئی ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے ان مسلم ارکان کو ، جو مسلم لیگ کے ممبر نہیں ہیں ، یہ مشورہ دیا جائے گا کہ اگر وہ پسند کریں تو لیگ میں شامل ہو جائیں ، اس کے علاوہ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ آئندہ ضمنی انتخابات میں جو مسلم ارکان ، مسلم لیگ کے ٹکٹ پر کھڑے ہوں گے ، انھیں یہ عہد کرنا ہو گا کہ کامیابی پر یونینسٹ پارٹی میں شامل ہو جائیں گے ۔ اس کے عوض انتخابات کی جنگ میں انھیں یونینسٹ پارٹی کی امداد حاصل ہو گی[۲] "

---

۱ ۔ " سیاست ملیہ " از محمد امین زبیری ، مطبوعہ آگرہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ع ص ۳۳۲ و ص ۳۳۳ اور " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ، مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۱ع ص ۴۸۷ و ص ۴۸۸ ۔

۲ ۔ سول اینڈ ملٹری گزٹ ، مورخہ ۱۷ اکتوبر و لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ۔ ڈار ، مطبوعہ اقبال اکادمی سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۰۵ و ۱۰۶ ۔

سکندر کی تائید میں ان کے رفقا نے بیانات دئے ۔ چودھری چھوٹو رام نے ، جس کے دم سے یونینسٹ پارٹی کا غیر فرقہ وارانہ بھرم قائم تھا ، اس میثاق کی یہ تعبیر کی کہ پنجاب مسلم لیگ پارلیمانی بورڈ یونینسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلا جائے گا اور اس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہے گی ، بجز اس کے کہ وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن جائے گی[۴۳] ۔

لطف کی بات یہ تھی کہ سر سکندر جناح میثاق کا اصلی متن شائع نہیں کیا گیا تھا ، اور اس میثاق کا ایک فریق من مانی تاویلات کر رہا تھا ۔ علامہ اقبال ، سر سکندر کے اس بیان اور پھر ان کے رفقا کی تعبیرات سے برہم ہو گئے ، کیونکہ ان کے بیانات کا مطلب تو یہی نکلتا تھا کہ پنجاب میں مسلم لیگ کی کوئی آزادانہ حیثیت باقی نہیں رہی تھی بلکہ وہ یونینسٹ پارٹی کا ایک ماتحت ادارہ بن گئی تھی ! ڈاکٹر صاحب ، سکندر جناح میثاق کی اس تعبیر کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھے ۔ چنانچہ ان کے مشورہ اور ایماء سے غلام رسول خان معتمد پنجاب مسلم لیگ اور ملک برکت علی نے جوابی بیانات شائع کیے جس میں سکندر اور ان کے ساتھیوں کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کیا گیا تھا ۔

اس میثاق کی پہلی اور اہم شرط یہ تھی کہ سر سکندر یونینسٹ پارٹی کے ان اراکین کو جو مسلم لیگ کے رکن نہیں تھے ، یہ مشورہ دیں گے کہ وہ مسلم لیگ میں شریک ہو جائیں اس لیے ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ء کو ڈاکٹر صاحب کے حسب الحکم معتمد مسلم لیگ نے سر سکندر کی خدمت میں ترانوے فارم بھیج دئے اور ساتھ ہی یہ درخواست بھی کی کہ یونینسٹ پارٹی کے مسلمان اراکین سے ان پر دستخط کروا لیے جائیں ۔ اس زمانے میں وائسرائے کی آمد کے سلسلہ میں یونینسٹ پارٹی کے تقریباً تمام اراکین لاہور ہی میں موجود تھے ۔ اس لیے یہ بات سر سکندر کے لیے آسان تھی کہ ان سے ان فارموں پر دستخط کرائے جاتے ، لیکن سکندر نے اس

۴۳۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ۔ ڈار ص ۱۰۶ ۔

طرف کوئی توجہ نہیں کی ۔ اور جب مسلم لیگ کے معتمد نے شخصی طور پر بعض اراکین یونینسٹ پارٹی سے مسلم لیگ کے فارموں پر دستخط لینے شروع کیے تو سکندر نے ان اراکین کے نام یہ پیغام بھیجا کہ ان فارموں پر دستخط نہ کیے جائیں[۷۴] ۔ علامہ اقبال نے بتاریخ ۳۰ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع سر سکندر کے اس طرز عمل کی طرف مسٹر جناح کو توجہ دلاتے ہوئے لکھا ۔

" ابھی تک سر سکندر اور ان کی پارٹی نے اس پر (لیگ کے مسلک پر) دستخط نہیں کیے اور میں نے آج ہی صبح یہ سنا کہ وہ لیگ کے دوسرے سالانہ اجلاس تک انتظار کرتے رہیں گے ۔ مقصد یہ ہے کہ صوبائی لیگ کی سرگرمیوں کو ٹھنڈا کر دیا جائے یہ بات ان ہی میں سے ایک نے مجھ سے کہی تھی[۷۵] "

بتاریخ ۳۱ اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع سر سکندر نے اپنے چند ساتھیوں کے ہمراہ علامہ اقبال سے سکندر جناح میثاق کے اس تنازعہ کے سلسلہ میں پہلی ملاقات کی ۔ اس ملاقات میں لیگ اور یونینسٹ پارٹی کے باہمی اختلافات پر بھی گفت و شنید ہوئی ۔ سکندر جناح میثاق کے متعلق سر سکندر کی تعبیر یہ تھی کہ اس معاہدہ کی رو سے مسلم لیگ پر یونینسٹ پارٹی کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے ۔ ان کا ایک ادعا یہ بھی تھا کہ مسٹر جناح نے اس اصول کو تسلیم کر لیا ہے کہ صوبائی پارلیمانی بورڈ یونینسٹ پارٹی کی نگرانی میں ہو ۔ اس لیے ان کا مطالبہ یہ تھا کہ صوبائی بورڈ میں یونینسٹ پارٹی کی اکثریت ہونی چاہیے ۔ علاوہ ازیں سر سکندر یہ بھی چاہتے تھے کہ مسلم لیگ کے تمام عہدہ داروں کو بدل دیا جائے ، خصوصاً معتمد کو برطرف کر دیا جائے اور لیگ کی آمدنی و خرچ پر بھی یونینسٹ پارٹی کے

۷۴- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ۔ ڈار ، مطبوعہ اقبال اکادمی کراچی سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۰۷ تا ۱۰۸ ۔

۷۵- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر محمد اشرف لاہور ستمبر سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۷ ۔

اراکین قابض رہیں ۔ ڈاکٹر صاحب جناح سکندر میثاق کی اس تعبیر کو غلط سمجھتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ پارلیمانی بورڈ یونینسٹ پارٹی کے قبضہ میں چلا جائے ۔ بہرکیف سر سکندر نے ان مسائل پر علامہ اقبال سے کئی مرتبہ گفتگو کی ، لیکن علامہ مرحوم نے سر سکندر کی ان تجاویز سے اختلاف کیا اور باہمی مصالحت کی کوئی صورت نہ نکل سکی ۔ اس تمام گفتگو کے بعد ڈاکٹر صاحب اس قطعی نتیجہ پر پہنچے کہ سر سکندر مسلم لیگ پر قابض ہو کر اس کو ختم کر دینا چاہتے ہیں ۔ چنانچہ مسٹر جناح کے نام انہوں نے اپنے ایک خط مورخہ ۱۰ نومبر سنہ ۱۹۳۷ع میں لکھا ۔

" سر سکندر اور ان کے احباب سے کئی مرتبہ گفت و شنید کرنے کے بعد میری ، اب قطعاً یہ رائے ہے کہ سر سکندر ، لیگ اور صوبائی پارلیمانی بورڈ پر قبضہ کرنے کے علاوہ کچھ اور نہیں چاہتے ہیں "

پھر انھوں نے سکندر کی مذکورہ بالا تجاویز کو گنانے کے بعد اسی خط میں لکھا ۔

" میرے خیال میں ان کی ان تمام تجاویز کا مقصد یہ ہے کہ لیگ پر قابض ہو کر اس کا گلا گھونٹ دیا جائے ۔ صوبہ کی رائے عامہ کو جانتے ہوئے ، میں یہ ذمہ داری نہیں لے سکتا کہ لیگ کو سر سکندر اور ان کے دوستوں کے حوالے کر دوں ۔ میثاق نے پہلے ہی صوبہ میں لیگ کے وقار کو دھچکا پہنچایا ہے ، اور یونینسٹوں کی چال بازیوں سے مزید نقصان پہنچے گا ۔ انھوں نے اب تک لیگ کے مسلک پر دستخط نہیں کیے ہیں اور میں جانتا ہوں کہ وہ دستخط کرنا بھی نہیں چاہتے[۷۶] "

الغرض اختتام سنہ ۱۹۳۷ع تک سر سکندر اور یونینسٹ پارٹی کے اراکین کو مسلم لیگ میں شریک کرنے کی کوششیں ہوتی رہیں ۔ لیکن جب ڈاکٹر صاحب نے یہ محسوس کیا کہ جناح سکندر میثاق کے باوجود ،

۷۶- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع ص ۳۰ و ۳۱ ۔

یہ لوگ لیگ میں شریک نہیں ہوں گے تو انہوں نے تہیہ کر لیا کہ اس میثاق ہی کو ختم کر دیا جائے اور اس طرح لیگ کو یونینسٹ پارٹی کے اثرات سے بچا کر ایک زندہ عوامی ادارہ بنا دیا جائے۔ چنانچہ آپ نے ۴ اپریل سنہ ۱۹۳۸ع کو اس مسئلہ پر ایک نہایت اہم اور معرکۃ الآرا بیان غلام رسول خان معتمد مسلم لیگ کو لکھوایا۔ اس بیان کا متن حسب ذیل ہے۔

" ۱۴ اکتوبر کو آنریبل سر سکندر حیات خان نے یونینسٹ پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس لکھنؤ میں یہ اعلان کیا تھا کہ پنجاب جانے کے بعد اس جماعت کا ایک اجلاس منعقد کروں گا اور اس میں اپنی جماعت کے ان مسلمان ارکان کو، جو اس وقت مسلم لیگ کے رکن نہیں ہیں، لیگ کے دستور پر دستخط کرنے اور اس کا رکن بننے کی تلقین کروں گا۔ یہ ارکان کل ہند مسلم لیگ کے مرکزی و صوبائی بورڈوں کے قواعد و ضوابط کے ماتحت رہیں گے اور اسمبلی کے وہ ارکان، جو مسلم لیگ کا ٹکٹ قبول کریں گے، اسمبلی کے اندر مسلم لیگ پارٹی تشکیل دیں گے اور اس طرح تشکیل شدہ مسلم لیگ پارٹی کو اجازت ہو گی کہ لیگ کی حکمت عملی اور اس کے لائحہ عمل کے بنیادی اصول کو پیش نظر رکھتے ہوئے کسی اور پارٹی سے اتحاد کرے یا موجودہ اتحاد کو برقرار رکھے۔ نام نہاد جناح سکندر پیکٹ کا اہم حصہ صرف یہی ہے اور معاہدہ کی باقی شقوں سے، ہمیں کوئی واسطہ نہیں۔ جب مذکورہ صدر اعلان اخبارات میں شائع ہوا، تو مجھے حقیقتاً بڑی مسرت ہوئی، کیونکہ میں محسوس کرتا تھا کہ یونینسٹ پارٹی کے قیام سے مسلمانوں میں جو انتشار پیدا ہو گیا ہے، وہ دور ہو جائے گا اور مسلم قوم اپنا وزن محسوس کرا سکے گی لہٰذا میں نے مسٹر غلام رسول خان معتمد پنجاب صوبائی مسلم لیگ کو ہدایت کی کہ وہ درخواستِ رکنیت پر یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان سے دستخط کرا لیں، چنانچہ یہ درخواستیں اکتوبر سنہ ۱۹۳۷ع کے تیسرے ہفتے میں

سر سکندر حیات خاں کے پاس بھیج دی گئیں ، لیکن ہمیں ان کے متعلق کوئی جواب وصول نہیں ہوا ۔ اس لیے یاددہانی کرائی گئی۔ مگر پھر بھی مہر سکوت نہ ٹوٹی اور تا حال سر سکندر نے ایک درخواست بھی دستخط کروا کے واپس نہیں بھیجی ۔ مجھے ملک برکت علی صاحب رکن اسمبلی نے اطلاع دی ہے کہ ۳۰ جنوری سنہ ۱۹۳۸ع کو لیگ کونسل کے اجلاس دہلی میں یہ مسئلہ بھی زیر بحث آیا تھا اور وہاں یونینسٹ پارٹی کے ایک ذمہ دار رکن نے بیان کیا کہ رکنیت کی درخواستوں پر مسلم ارکان یونینسٹ پارٹی کے دستخط حاصل کر لیے گئے ہیں اور دستخط کرنے والوں نے اس خواہش کا اظہار کیا ہے کہ وہ جناح سکندر میثاق کی شرائط کے مطابق لیگ کے رکن بننے پر آمادہ ہیں ۔ اس موقع پر یہ امر اشد ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اصلی صورت حالات کو واضح کر دیا جائے ۔ سر سکندر کا دعویٰ ہے کہ تحریری معاہدہ کے علاوہ ، جس کا اہم ترین حصہ اوپر نقل کیا جا چکا ہے ، ان کے اور مسٹر جناح کے درمیان زبانی افہام و تفہیم بھی ہوئی ہے ۔ اس معاملہ کو مسٹر جناح کے علم میں لایا گیا جب کہ مسلم لیگ کونسل کے جلسہ میں اس پر بحث ہو رہی تھی ۔ ملک برکت علی رکن اسمبلی (پنجاب) نے مجھے بتایا کہ مسٹر جناح نے سکندر جناح میثاق کی شرائط کے علاوہ کسی زبانی افہام و تفہیم کا سرے سے انکار کیا ۔ مجھے معلوم ہے کہ اس میثاق کی مختلف تشریحیں کی گئی ہیں اور اسی وجہ سے عوام کے ذہنوں میں مسلم لیگ کے تعلق سے یونینسٹ پارٹی کے رویہ کے خلاف سخت ہیجان پیدا ہو گیا ہے ۔ تقریباً چار مہینے گذر چکے ہیں مگر یہ ہیجان اور اضطراب کم ہونے کے بجائے روز بروز بڑھتا ہی چلا جا رہا ہے ۔ اب وقت آ گیا ہے کہ مسلم عوام کو صحیح صورت حالات سے آگاہ کر دیا جائے ۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ معاہدہ لکھنؤ کو بالائے طاق رکھ دیا گیا ہے اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا گیا ۔ اس لیے میں یہ بیان شائع کر رہا

ہوں تاکہ مسلمانانِ پنجاب کو معلوم ہو جائے کہ یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ ایک دوسرے سے علیحدہ ہو چکے ہیں اور اب یہ توقع کہ جناح سکندر میثاق کے بعد یونینسٹ پارٹی کے مسلمان ارکان اپنے آپ کو مسلم لیگ میں مدغم کر دیں گے ، ایک امید موہوم ثابت ہو رہی ہے - یہاں مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ مسلم لیگ کا دروازہ ہر مسلمان کے لیے کھلا ہوا ہے ، جو لیگ کے دستور پر دستخط کرنے کو تیار ہو اور میں نہایت خوشی کے ساتھ اعلان کرتا ہوں کہ اس وقت تک اسمبلی کے کئی مسلم ارکان نے لیگ کے دستور پر دستخط کر دئے ہیں>> "

اخبارات میں اس بیان کو شائع کرنے سے پہلے ، اس کی ایک نقل مسٹر جناح کی خدمت میں روانہ کی گئی لیکن دوسرے ہی دن مسٹر جناح نے بذریعہ تار یہ خواہش کی کہ فی الحال اس بیان کی اشاعت ملتوی کر دی جائے - حسبہٗ یہ بیان اخبارات میں شائع نہ ہو سکا - ڈاکٹر صاحب کے اس بیان کو ایک تاریخی حیثیت حاصل ہے ، کیونکہ مرحوم کی یہ آخری سیاسی تحریر ہے - ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی جو (مئی ۱۹۳۶ع تا اپریل ۱۹۳۸ع) علامہ اقبال کی صدارت کے زمانہ میں پنجاب مسلم لیگ کے شریک معتمد کی حیثیت سے کام کر چکے ہیں ، اس بیان کے متعلق لکھتے ہیں

"۲۱ اپریل ۱۹۳۸ع کو ان کا (اقبال کا) انتقال ہوا اور یہ بیان ۴ اپریل کو لکھا گیا - ممکن ہے ان درمیانی ۱۷ ایام میں انھوں نے کوئی ذاتی اور نجی خط لکھوایا ہو ، لیکن جہاں تک سیاسیات کا تعلق ہے میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہ بیان ان کی آخری تحریر ہے[۷۸]"

۷۷- روز نامہ امروز کراچی اقبال نمبر ، ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع ص ۱۰ تا ۱۹ اور لیٹرز اینڈ رائیٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی - اے - ڈار ناشر اقبال اکادمی پاکستان مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۲ تا ۱۱۴-

۷۸- روز نامہ امروز کراچی - اقبال نمبر - ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ع - ص ۱۰ و ۱۹

اس بیان کی اہمیت یوں بھی بڑھ جاتی ہے کہ جس زمانہ میں علامہ مرحوم نے یہ بیان لکھوایا ہے اس وقت مرض الموت کا آغاز ہو چکا تھا اور بستر سے اٹھنا محال تھا لیکن بقول سید نذیر نیازی صاحب

''صحت کی اس گئی گزری حالت میں بھی وہ اگر کسی کے کام آ سکے تو اس سے انکار نہیں کیا اور اپنی قوم کے معاملات میں جہاں تک ممکن تھا ، حصہ لیا[79]''

الغرض علامہ اقبال بستر مرگ پر لیٹے ہوئے ، مسلمانوں کی فلاح و بہبود اور ان میں سیاسی و اجتماعی وحدت پیدا کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ علامہ مرحوم کی سیاسی بصیرت و دوربینی کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کے متعلق جو فیصلہ انھوں نے اپنی زندگی کے آخری ایام میں فرما دیا تھا ، وہی فیصلہ آپ کے انتقال کے چھ سال بعد مئی ۱۹۴۴ع میں قائداعظم جناح کو کرنا پڑا !

گذشتہ صفحات میں ہم نے یونینسٹ پارٹی سے علامہ اقبال اور مسلم لیگ کی جنگ کا تاریخ وار تذکرہ کیا ہے - بیان کا تسلسل قائم رکھنے کے لیے ہم نے مسجد شہید گنج کے اس قضیہ کا ذکر نہیں کیا ، جو اسی دوران رونما ہوا تھا - یہ قضیہ بھی بالآخر یونینسٹ پارٹی اور مسلم لیگ کی کشمکش کا ایک عبرت انگیز جز بن گیا تھا اور علامہ اقبال نے بھی اس میں نمایاں حصہ لیا تھا - اس کے تذکرہ کے بغیر ان کے حیات سیاسی کی یہ داستان نامکمل رہے گی - اس لیے اس واقع کو بھی یہاں مختصراً درج کیا جاتا ہے -

مسجد شہید گنج کا قضیہ | شہید گنج لاہور کی یہ مسجد شاہ جہاں کے زمانہ میں تعمیر ہوئی تھی لیکن پنجاب میں جب سکھوں کا راج ہوا تو ، انھوں نے اس مسجد پر قبضہ کر لیا ، کیونکہ اس کے قریب ان کی ایک محترم بزرگ ہستی قتل کی گئی تھی - پھر سکھوں نے اس مسجد کے متولی سے اس قسم کی تحریر بھی لکھوا لی جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس متولی

۷۹- رسالہ اردو اقبال نمبر ۱۹۳۸ع طبع جدید ص ۳۳۱

نے اس مسجد کو ایک خانگی جائداد کی حیثیت سے بیع کر دیا ۔ سکھوں کا راج ختم ہوا تو برطانیہ کی حکومت قائم ہو گئی مگر مسجد پر سکھوں کا قبضہ رہا ۔ ایک عرصہ دراز کے بعد مولانا ظفر علی خاں نے اپنے اخبار زمیندار میں اس مسئلہ کو اٹھایا ۔ سکھوں نے اپنے دعا وی پیش کیے ۔ اخبارات میں گرم گرم بحثیں ہونے لگیں اور سکھ مسلم کشیدگی بڑھتی گئی ۔ جون ۱۹۳۵ع میں یہ افواہ اڑی کہ سکھ مسجد کو مسمار کرنا چاہتے ہیں ۔ مسلمانوں کے ایک وفد نے گورنر سے ملکر درخواست کی کہ مسجد کو محکمہ آثار قدیمہ کے حوالے کر دیا جائے اور مسجد کا انہدام روک دیا جائے ۔ اس وفد نے سکھ لیڈروں سے بھی گفتگو کی ۔ ابھی یہ بات چیت جاری تھی کہ ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب میں سکھوں نے یکایک مسجد کو ڈھانا شروع کر دیا ۔ یہ اطلاع ملتے ہی مسلمانوں کے جتھے مسجد کی طرف چل پڑے ۔ فوج نے ان پر گولی چلائی اور کئی مسلمان شہید ہو گئے ۔ چونکہ مولانا ظفر علی خاں اور ان کے ساتھی اس قضیہ میں پیش پیش تھے اس لیے حکومت نے انھیں گرفتار کرکے نظر بند کر دیا ۔ اب جوشیلے مسلمانوں نے باضابطہ تحریک سول نافرمانی شروع کر دی ۔ روزانہ ان کی ٹولیاں مسجد شہید گنج کی طرف جاتیں اور حکومت انھیں گرفتار کر لیتی ۔ اسی زمانے میں مسلمانوں نے شہید گنج لیگل ڈیفینس کمیٹی قائم کی ۔ اس کمیٹی نے ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں مسجد کی بازیابی کے لیے دعوی کر دیا ۔

مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں یہ سول نافرمانی چل رہی تھی ۔ عدالت میں مقدمہ کی سماعت جاری تھی اور مسلم سکھ کشیدگی انتہا پر پہنچی ہوئی تھی کہ مسلمانوں نے اس قضیہ کو نمٹانے کے لیے قائداعظم جناح کو لاہور آنے کی دعوت دی ، چنانچہ قائداعظم ۲۱ فروری ۱۹۳۶ع کو لاہور پہنچے تحریک شہید گنج کے لیڈروں اور گورنر سے ملے ۔ پھر ان میں مصالحت کرا دی ۔ مسلمان سول نافرمانی بند کرنے اور آئینی طریقہ کار اختیار کرنے پر رضا مند ہو گئے اور گورنر نے تمام نظر بند لیڈروں کو رہا کر دیا ۔ اس کے بعد قائداعظم سکھ لیڈروں سے ملے تاکہ سکھوں اور مسلمانوں میں کوئی معقول سمجھوتہ ہو جائے ۔ اسی سلسلے میں وہ پندرہ دن تک

لاہور میں ٹھہرے رہے اور بالآخر اپنی روانگی سے قبل انھوں نے مسلمانوں اور سکھوں پر مشتمل ایک مصالحتی بورڈ بنا دیا ، جس میں علامہ اقبال کا نام سر فہرست تھا ۔ یہ مصالحتی بورڈ ، اس قضیہ کا ابھی کوئی حل تلاش کرنے نہ پایا تھا کہ ڈسٹرکٹ جج کی عدالت میں جو مقدمہ مسلمانوں نے دائر کیا تھا ، اس کا فیصلہ ہو گیا ۔ فیصلہ یہ تھا کہ مسجد بھی ایک عام جائیداد ہے اور وہ فریق ثانی کے قبضۂ مخالفانہ میں جا کر اپنی اصل حیثیت کھو بیٹھتی ہے !

یہ فیصلہ مسلمانوں کے جذبات واحساسات کے خلاف تھا ۔ علامہ اقبال کے مشورہ سے اس فیصلہ کے خلاف لاہور کی عدالت العالیہ (ہائی کورٹ) میں اپیل دائر کی گئی ، جس کی پیروی علامہ اقبال کے دوست اور رفیق کار ملک برکت علی بیرسٹر ایٹ لاء نے کی ۔ ۲۶ جنوری ۱۹۳۸ء کو اس اپیل کا فیصلہ سنا دیا گیا ۔ فیصلہ مسلمانوں کے خلاف تھا ! گویہ فیصلہ متنفقہ نہ تھا ، جسٹس دین محمد کا اختلافی نوٹ بہت اہمیت رکھتا تھا اور قانون داں حضرات کی یہ رائے تھی کہ اس فیصلہ کے خلاف پریوی کونسل میں اپیل دائر کی جائے ، لیکن مسلم عوام اس تجویز سے مطمئن نہیں ہوئے کیونکہ وہ برطانوی عدالتوں کی انصاف رسانی سے مایوس ہو چکے تھے ۔

اس فیصلہ کے ساتھ ہی مسلمانوں میں سخت اضطراب پھیل گیا اور جلوس جلوس پر نکلنے لگے ۔ غلام رسول خاں معتمد پنجاب مسلم لیگ نے ڈاکٹر صاحب کی خدمت میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ اب کیا کرنا چاہیے تو ڈاکٹر صاحب رو پڑے اور کہنے لگے ۔

> ”مجھ سے کیا پوچھتے ہو ۔ میری چارپائی کو اپنے کندھوں پر اٹھاؤ اور اس طرف لے چلو جدھر مسلمان جا رہے ہیں ۔ اگر گولی چلی تو میں بھی ان کے ساتھ مروں گا۸۰“

سر سکندر وزیر اعلیٰ ان ہنگاموں سے سخت پریشان تھے اور چاہتے

۸۰۔ اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۔ ناشر اقبال اکادمی کراچی ۱۹۶۱ء ۔ ص ۵۵۳

تھے کہ معاملہ کو رفع دفع اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کر دیا جائے ۔ اس لیے اس نازک موقع پر انھوں نے اقبال کا دامن تھامنے کی کوشش کی اور یہ چاہا کہ ان سے ایک بیان دلوا دیا جائے ۔ اس غرض سے انھوں نے اپنے بعض دوستوں کو علامہ کی خدمت میں روانہ کیا ۔ ان میں سے دو حضرات پہلے پہنچ گئے اور ابھی علامہ ان سے مصروف گفتگو ہی تھے کہ سکندر کے فرستادہ ایک اور صاحب نواب مظفر خاں بھی علامہ کی کوٹھی میں داخل ہوئے ۔ اقبال ان کو دیکھتے ہی فوراً اٹھ کر اندر چلے گئے ۔ یہ تینوں اصحاب باہر بیٹھے انتظار کرتے رہے ۔ جب کافی دیر ہو گئی اور علامہ باہر تشریف نہیں لائے تو ان کے عقیدت مند سید نذیر نیازی صاحب اندر گئے اور عرض کی کہ وہ لوگ ابھی تک انتظار کر رہے ہیں ۔ علامہ نے جھنّلا کر جواب دیا ''مظفر خاں بیس سال کے بعد آج میرے مکان پر آیا ہے ۔ مسجد اس نے خود گروائی ہے اور اب بیان دلوانا چاہتا ہے ۔ جب تک یہ شخص بیٹھا ہے میں باہر نہیں جاؤں گا'' [۸۱]۔

ہائیکورٹ کے فیصلہ کے بعد علامہ اقبال کی رائے یہ تھی کہ اس کی اپیل کرنا بے سود ہے ۔ اصل سقم قانون میں ہے ۔ اس لیے اس سقم کو دور کرنا چاہیئے ۔ اور ایک نیا قانون تحفظ مساجد کے لیے بنوانا چاہیئے ۔ چنانچہ انھوں نے ملک برکت علی کو ، جو اس زمانے میں مسلم لیگ کی طرف سے پنجاب اسمبلی کے رکن تھے ، ایک مسودہ قانون مرتب کرنے کی ہدایت کی ۔ ملک صاحب نے علامہ مرحوم کے مشورہ اور ہدایات کے مطابق تحفظ مساجد کا ایک مسودہ قانون (بل) مرتب کیا اور پنجاب اسمبلی میں اس کو پیش کرنے کا نوٹس دیدیا ۔ اس نوٹس کی اطلاع اخبارات میں جوں ہی شائع ہوئی ۔ مسلمانوں میں ایک نیا جوش پیدا ہو گیا اور یونینسٹ پارٹی کے کئی اراکین اسمبلی نے سر سکندر کی ناراضی کے علی الرغم اس بل کی تائید کرنے کا اعلان کر دیا ۔ ادھر مختلف حلقہ ہائے انتخاب میں جلسے ہوئے اور رائے دہندوں نے اپنے نمائندوں سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ مقننہ میں اس بل کی تائید کریں ۔ اس لیے امید ہو چلی تھی کہ یہ مسودہ قانون

۸۱- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۵۸۳

اسمبلی میں منظور ہو جائے گا ۔ کئی اراکین اسمبلی نے ڈاکٹر صاحب
سامنے وعدے کیے اور حلف اٹھائے تھے کہ وہ اس بل کو منظور کرا
ہی دم لیں گے ، لیکن عملاً کیا ہوا ؟ ـــــ ہوا یہ کہ سر سکندر کے مشہ
کی بناء پر گورنر نے اپنے اختیارات خصوصی کو کام میں لا کر بل
اسمبلی میں پیش کرنے کی ممانعت کر دی ! اور جب ۱۶ مارچ کو اسـ
کا اجلاس ہوا تو سر سکندر وزیر اعلیٰ پنجاب نے ایک طویل تقریر فرما
جس میں انھوں نے گورنر کے رویہ کی زبردست حمایت کی ۔ بڑے بڑ
زمیندار و سرمایہ دار، مسلم اراکین اسمبلی سکندر کی یہ تقریر گردن جھکا
سنتے رہے اور کسی گوشہ سے مخالفت یا احتجاج کی ہلکی سی آواز تک
اٹھی ، اور اٹھتی کیسے ؟ انھیں تو خدا کی خوشنودی سے زیادہ حکومت
خوشی کا خیال تھا ۔ وہ اقبال کی آہ وفغاں کو نظر انداز کر سکتے
لیکن سکندر کی بدلتی ہوئی نگاہوں کی تاب کیسے لاتے ! اقبال کا سوز
اسمبلی ہال میں گم ہو کر رہ گیا ۔ مگر سکندر کی نگاہ غلط انداز اپنا
کر گئی ! !

ہائی کورٹ کا فیصلہ مسلمانوں کے خلاف ہو جانے کے بعد نہ صـ
پنجاب بلکہ ہندوستان کے تمام مسلمانوں میں اضطراب کی ایک لہر دوڑ
اور مسجد شہید گنج کا قضیہ کل ہند مسئلہ بن گیا ۔ اس لیے آل انڈیا مـ
لیگ نے بھی اس میں دلچسپی لی اور ۳۰ جنوری کو اس کا ایک جـ
دہلی میں ہوا ۔ جس میں یہ فیصلہ ہوا کہ یکم فروری ۱۹۳۸ء کو
جگہ یوم شہید گنج منایا جائے اور احتجاجی جلسے کیے جائیں اور یہ
طے ہوا کہ اس مسئلہ کا تصفیہ کرنے کی غرض سے ایک خصوصی اجـ
طلب کیا جائے لیکن اس کے لیے وقت اور مقام کا تعین نہیں کیا گیا ۔ عـ
اقبال کی دلی خواہش تھی کہ شہید گنج کے مسئلہ پر غور کرنے کے
مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس لاہور ہی میں ہو ۔ لیکن سر سکندر اور
کے رفقایہ چاہتے تھے کہ یہ اجلاس کسی صورت لاہور میں نہ ہونے پا
علامہ کے پیش نظر دو مقاصد تھے ۔ ایک تو یہ کہ اس خصوصی اجـ
کی وجہ سے مسلم لیگ کی مقبولیت میں اضافہ ہوگا اور اس کا اثر و
پنجاب کے دور دراز علاقوں میں پہنچ جائے گا اور دوسرے یہ کہ اگر مـ

کی بازیابی کے سلسلے میں مسلم لیگ کوئی عملی اقدام کرے تو اس کی اولین ذمہ داری پہلے پنجاب ہی کے مسلمانوں پر پڑے گی اور وہی اس کی ذمہ داری کو پوری ہمت و جرأت سے اٹھا بھی سکیں گے ۔ اس کے برعکس سر سکندر اس امر سے خائف تھے کہ اگر مسلم لیگ کا خصوصی اجلاس لاہور میں ہوا تو تحریک شہید گنج کو مزید تقویت پہنچے گی ، جس کا اثر مسلم اراکین اسمبلی پر بھی پڑے گا اور ان کی وزارت کو خطرہ لا حق ہو جائے گا ۔ علاوہ ازیں وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ اس خصوصی اجلاس کی وجہ سے مسلم لیگ پنجاب میں مقبولیت حاصل کر لے ، کیونکہ مسلم لیگ کے اثر ونفوذ میں اضافہ سے یونینسٹ پارٹی کی ہوا اکھڑ جانے کا خوف تھا ۔ بہر حال مسجد شہید گنج کے سلسلے میں مسلم لیگ "کا جو اجلاس خاص' ہونے والا تھا ، اس کے مقام کے بارے میں اقبال اور سکندر کی آراء میں سخت اختلاف پیدا ہوا ۔

قائداعظم محمد علی جناح نے ۲ مارچ ۱۹۳۸ء کو علامہ اقبال کے نام ایک خط لکھا جس میں انھوں نے استفسار کیا کہ آیا مسلم لیگ کا اجلاس خصوصی لاہور میں منعقد کیا جائے اور یہ بھی لکھا کہ اگر وہ لاہور میں اجلاس خصوصی کروانا چاہتے ہیں تو ایک رسمی دعوت نامہ ضرور روانہ کر دیں تاکہ اس دعوت نامہ کو وہ مسلم لیگ کونسل کے اجلاس میں پیش کرکے منظوری لے لیں ۔ علامہ تو دل سے چاہتے تھے کہ یہ خصوصی اجلاس لاہور میں منعقد ہو ۔ چنانچہ انھوں نے ۵ مارچ کو صوبائی مسلم لیگ کا عام اجلاس طلب فرمایا ۔ اس میں قائداعظم کا خط پیش کیا گیا اور طے پایا کہ خصوصی اجلاس لاہور میں منعقد ہو اور اس کے لیے رسمی دعوت نامہ قائداعظم کی خدمت میں روانہ کر دیا جائے ۔ چنانچہ علامہ کی حسب ہدایت معتمد پنجاب لیگ نے قائداعظم کے نام جوابی خط روانہ کیا ، جس میں علامہ اور صوبائی لیگ کی طرف سے یہ درخواست کی گئی تھی کہ اجلاس خصوصی ایسٹر کی چھٹیوں میں لاہور میں منعقد کیا جائے ۔

کل ہند مسلم لیگ کونسل کا اجلاس ۲۰ مارچ کو دہلی میں ہوا ۔ اس میں شرکت کے لیے علامہ کے رفقاء ملک برکت علی ، غلام رسول خاں

وغیرہ دہلی پہنچے ۔ ان لوگوں کا یہ خیال تھا کہ مسلم لیگ یقیناً ان کے دعوت نامہ کو قبول کر لے گی اور اجلاس خصوصی کا انعقاد لاہور ہی میں ہوگا ۔ چنانچہ اسی تمنا و خواہش کو دل میں لیے ہوئے یہ حضرات قائداعظم کی خدمت میں پہنچے اور اجلاس خصوصی کے انتظامات کے بارے میں گفتگو کرنے لگے ۔ لیکن قائداعظم نے ان لوگوں کو یہ کہہ کر حیرت زدہ کر دیا کہ ”پنجاب صوبائی مسلم لیگ کا صدر تو لاہور میں اجلاس خصوصی کے انعقاد کا مخالف ہے“! پھر قائداعظم نے نواب شاہ نواز خان ممدوٹ کا خط ان حضرات کو دکھایا جس میں مسلم لیگ کے اجلاس خصوصی کو لاہور میں منعقد کرنے کی سخت مخالفت کی گئی تھی ! ! ــــــ واضح رہے کہ نواب ممدوٹ اب علامہ اقبال کی جگہ صوبائی لیگ کے صدر منتخب کر لیے گئے تھے ، کیونکہ علامہ کی صحت بالکل جواب دے چکی تھی ۔ اگرچہ صوبائی لیگ کی مجلس عاملہ اور اس کی عہدہ دار ، اب بھی برابر ان کے مشوروں سے مستفید ہوا کرتے تھے ۔ چنانچہ صوبائی لیگ کا اجلاس عام جو ۵ مارچ کو منعقد ہوا تھا ، اس میں علامہ کے مشورہ اور ہدایت کے بموجب اجلاس خصوصی کے لاہور میں منعقد کرنے کے بارے میں قائداعظم کے نام دعوت نامہ روانہ کیا گیا تھا لیکن نواب ممدوٹ نے اس اجلاس میں شرکت ہی نہیں کی کیونکہ انھیں اس فیصلہ کی پابندی کرنی پڑتی تھی ۔ پھر انھوں نے قائداعظم کے نام خط لکھ کر اس کی شدید مخالفت کی ۔ ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی کا بیان ہے کہ یہ سب کچھ انھوں نے سکندر کے ایماء و اشارہ سے کیا تھا کیونکہ وہ وزیر اعلیٰ کے گہرے دوست تھے[۸۲]! ــــ یوں سر سکندر کی شاطرانہ چالوں کے باعث علامہ اقبال کی حین حیات لاہور میں نہ تو مسلم لیگ کا اجلاس عام ہوپایا اور نہ اجلاس خاص ! اس کا انھیں بڑا ملال تھا ! اس روئیداد سے واضح ہوتا ہے کہ یونینسٹ پارٹی کی اخلاقی سطح اتنی پست تھی کہ اس نے ایک خالص دینی و مذہبی مسئلہ کو اپنی بساط سیاست کا ایک مہرہ بنانے سے دریغ نہیں کیا اور گھٹیا سے گھٹیا چالوں

۸۲- اقبال کے آخری دو سال ”از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۔ مطبوعہ کراچی ص ۶۱۳ تا ۶۱۶

کے چلنے میں بھی اس کو کسی قسم کا عار محسوس نہ ہوا ۔ اس طرح اس قضیہ میں بھی علامہ اقبال اور مسلم لیگ کو سر سکندر اور یونینسٹ پارٹی سے ٹکر لینی پڑی اور یہ کشمکش اس مسئلہ میں بھی نمایاں ہو کر رہی ! !

ایک المیہ ! | یہ تھی مسلم لیگ اور یونینسٹ پارٹی کی باہمی آویزش کی داستان ، جس میں اقبال نے اپنی زندگی کے آخری لمحات تک بھرپور حصہ لیا ۔ غور سے دیکھئے تو یہ آویزش دو سیاسی جماعتوں کی لڑائی نہ تھی بلکہ یہ وسیع النظری کا تنگ نظری کے خلاف جہاد تھا ۔ یہ ملت کی وہ جنگ تھی ، جو علاقائیت کے خلاف پنجاب میں لڑی گئی تھی اور جس کی کمان اقبال جیسے بے سرو سامان مرد قلندر نے سر فضل حسین اور سرسکندر حیات خاں جیسے مقتدر چوگان بازانِ سیاست کے مقابلہ میں کی تھی ——— اب یہ بھی سن لیجئے کہ پنجاب میں اس طرح مسلم لیگ کے محاذ کو یونینسٹ پارٹی جیسی با اختیار جماعت کے مقابلہ میں مضبوط اور مستحکم کرنے اور اس مجاہدہ میں اپنی جان لڑا دینے کا ، اقبال کو کیا صلہ ملا !

۸ اپریل کو کل ہند مسلم لیگ کے دفتر سے اچانک پنجاب مسلم لیگ کو یہ اطلاع دی گئی کہ اس کا الحاق کل ہند مسلم لیگ سے نہیں ہو سکتا ۔ باوجود مسلسل علالت ، کمزوری ، ضعیفی اور خانگی مصائب کے متواتر دو سال تک علامہ اقبال نے پنجاب مسلم لیگ کو منظم کرکے سارے صوبے میں اس کی شاخوں کا ایک جال پھیلا دیا تھا ، ان ہی کی رہنمائی اور شخصیت کا اثر تھا کہ پنجاب میں اب مسلم لیگ ، مسلم عوام کی سب سے زیادہ نمائندہ جماعت بن گئی تھی ۔ لیکن علامہ کو ان کی انتھک کوششوں کا یہ ثمر ملا ! اسی صوبائی لیگ کے صدر ، ابھی کچھ ہی دنوں قبل تک خود حضرت علامہ تھے اور اس کے عہدہ دار اور کارکن ان کے وہ معتمد علیہ رفقاء کار تھے جنھوں نے نہایت کٹھن اور صبر آزما حالات میں اس ننھے اور کمزور پودے کو اپنے خون جگر سے سینچا اور اس کو ایک تناور درخت بنا دیا تھا اور اب بھی وہ ان ہی کی سرپرستی ، ہدایات و رہنمائی میں اس کو بار آور بنانے کے لیے اپنا خون پسینہ ایک کر رہے تھے لیکن اسی صوبائی لیگ کو کالعدم قرار دیدیا گیا تھا اور وجہ اس کی یہ بتائی

گئی تھی کہ اس کے اندر چند دستوری اسقام پائے جاتے تھے[۸۳]۔ علامہ مرحوم کو اس اطلاع سے بے حد رنج ہوا ، پھر بھی وہ ہمت ہارنے والوں میں سے نہیں تھے وہ مرض الموت میں مبتلا تھے لیکن بستر مرگ پر لیٹے لیٹے انھوں نے ۱۴ اپریل ۱۹۳۸ء کو اپنے رفقاء کو حکم دیا کہ ''کلکتہ جا کر اپنی جنگ خود لڑو ۔ یہاں گھر میں بیٹھ رہنے سے کچھ نہ ہوگا ۔ ان کے اس حکم کی تعمیل میں ایک وفد کلکتہ جانے کے لیے تیار ہو گیا ، جہاں آل انڈیا مسلم لیگ کا سالانہ اجلاس ۱۸ ، ۱۹ ، ۲۰ اپریل کو ہو رہا تھا ۔ روانگی سے قبل ، اس وفد کے اراکین ایک مرتبہ پھر علامہ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو علامہ نے ان سے فرمایا ''ضرور جاؤ اور اپنے حق کے لیے آخر تک لڑو'' [۸۴]۔ ملک برکت علی رکن وفد نے اپنے اس خدشہ کا اظہار کیا کہ نئی درخواست الحاق بھی نا منظور ہو جائے گی تو علامہ قدرے جوش میں آ گئے اور فرمایا ''کچھ فکر نہیں ، درخواست منظور ہو یا نامنظور ، جس اصول پر ہم نے اب تک کام کیا ، آئندہ بھی جاری رہے گا'' ـــــ الغرض اس طرح ہمت و جرأت دلا کر انھوں نے اس وفد کو کلکتہ روانہ کیا ۔ مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس میں اس وفد نے شرکت کی ، اور وہاں ایک ناکام جنگ لڑنے کے بعد جب ۲۱ اپریل ۱۹۳۸ء کو یہ وفد لاہور لوٹا تو اقبال اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے !!

اقبال کی سیاسی زندگی کی روداد آپ نے سن لی لیکن ابھی ان کے ایک آخری کارنامے اور ایک آخری معرکہ کا ذکر باقی ہے جو اس روداد کے دو زرین اوراق ہیں ۔

آخری کارنامہ | اقبال بنیادی طور پر اسلام کے ایک مایہ ناز مفکر تھے ۔ انھوں نے اپنی عمر عزیز کا بیش قیمت حصہ اسلام اور اس کے حقائق ، اس

۸۳- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۔ مطبوعہ اقبال اکادمی ۔ ص ۶۲۷ و ۶۲۸

۸۴- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ۔ مطبوعہ اقبال اکادمی ۔ ص ۶۳۷

کے نظام قانون ، اس کے فلسفۂ سیاست ، اس کی ثقافت ، تاریخ اور ادبیات کے مطالعہ اور ان پر غورو فکر کرنے میں صرف کیا تھا ۔ وہ خود کہتے ہیں ۔

"اسلام کی روح (جو وقت آنے پر اپنے آپ کو آشکارا کرتی ہے) سے اتصال دائمی نے مجھ میں اسلام کی اہمیت کو ایک عالمی حقیقت کی حیثیت سے سمجھنے کی بصیرت پیدا کر دی ہے[۸۵]"

اسلام کے متعلق ان کا تصور یہ تھا کہ یہ ایک مکمل فلسفہ حیات اور جامع نظام زندگی ہے ۔ اسی تصور کو انھوں نے شاعرانہ تخیل کے رنگ میں رنگ کر پیش کیا ۔ اسلام کے تصور حیات نے ان کی داخلی زندگی ، روح اور متخلیہ پر جو اثر کیا تھا ، اس نے خارج میں شعر و نغمہ کا لباس پہن لیا تھا اور اس اسلامی تصور حیات کے عمرانی ، ساجی اور سیاسی پہلوؤں نے جو تاثرات ان کے قلب و دماغ پر مرتسم کیے تھے ان کو وہ دو کتابوں ، "اسلام میرے نقطہ نظر سے" (Islam as I understand it) اور "اسلامی اصول فقہ کی تشکیل جدید" (Reconstruction of Islamic Juris-prudence) میں قلمبند کرنا چاہتے تھے ۔ ان کتابوں کے موضوعات پر انھوں نے مدتوں غور و فکر کیا تھا ۔ سید نذیر نیازی صاحب لکھتے ہیں ۔ "پہلے تو ان کا خیال تھا کہ قرآن کریم پر عہد حاضر کے افکار کی روشنی میں چند نوٹ تیار کریں ، لیکن سوال یہ تھا کہ یہ کتاب کس رنگ میں لکھی جائے ۔ تفصیل و تشریح یا ابتدائی مطالعہ کے لیے ایک مقدمہ ؟ بالآخر موجودہ زمانے کی اجتماعی تحریکات کو دیکھ ان کے دل میں یہ خیال روز بروز مستحکم ہوتا گیا کہ اس وقت اسلام کے نظام عمرانی کی تشریح و توضیح کی ضرورت ہے ۔ اس لیے وہ چاہتے تھے کہ تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ کی طرح تشکیل جدید فقہ اسلامی پر ، یہ دیکھ کر کہ قرآن پاک نے ان مسائل کی رہنمائی کس انداز میں کی ہے ، قلم اٹھائیں ۔

۸۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ المنار اکادمی طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ۔ ص ۱

اس غرض سے انھوں نے یورپ اور مصر کی بعض نئی مطبوعات بھی فراہم کرنا شروع کر دی تھیں ، لیکن افسوس یہ ہے کہ اس تصنیف کا کام استسقاء مسائل ، ترتیب مقدمات اور تفہیم مباحث سے آگے بڑھ نہ سکا ۔ آگے چل کر جب وہ اپنی صحت سے نا امید ہو گئے تو اس ارادہ کی ناکامی سے اس قدر شکستہ خاطر تھے کہ دو ایک بار فرمایا :

''میں یہ کتاب لکھ سکتا تو اطمینان سے جان دیتا[۸۶]''

اسلام کے نظام عمرانی کی توضیح و تشریح کا یہ احساس ان کو صرف آخری عمر میں پیدا نہ ہوا تھا ، بلکہ ایک عرصہ پہلے ہی سے وہ اس کی اہمیت کو محسوس کرتے تھے ۔ چنانچہ ستمبر ۱۹۳۵ء کے ایک خط میں پروفیسر صوفی غلام مصطفی تبسم کو لکھتے ہیں ۔

"میرا عقیدہ یہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطہ نگاہ سے زمانہ حال کے جورسپروڈنڈس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکام قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرے گا ، وہی اسلام کا مجدد ہوگا اور بنی نو انسان کا سب سے بڑا خادم بھی وہی شخص ہوگا ۔ قریباً تمام ممالک اسلامیہ اس وقت یا تو اپنی آزادی کے لیے لڑ رہے ہیں یا قوانین اسلامیہ پر غور و فکر کر رہے ہیں (سوائے ایران و افغانستان کے) ۔ مگر ان ممالک میں بھی امروز فردا یہ سوال پیدا ہونے والا ہے مگر افسوس ہے کہ زمانۂ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پسندی میں مبتلا ہیں[۸۷]''

اقبال کا یہ مستحکم ایقان تھا کہ دنیا میں جو جدید تحریکات پیدا ہو رہی ہیں اور تمام عالم میں افکار و نظریات کی جو پیکار جاری ہے اور اس کے زیر اثر مختلف قوموں ، ملکوں اور طبقات میں جو کشمکش پیدا ہو رہی

۸۶- رسالہ اردو ۔ اقبال نمبر ۔ بابت اکتوبر ۱۹۳۸ء طبع جدید ص ۳۱۸
۸۷- مکاتیب اقبال ، حصہ اول ۔ مرتبہ شیخ عطاءاللہ ۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ۔ ص ۵۰ و ۵۱

ہے ، ان سب کا حل اسلامی قوانین میں موجود ہے ۔ ضرورت اجتہاد یا بالفاظ دیگر صرف اس امر کی ہے کہ بدلے ہوئے حالات کی روشنی میں اسلام کی روح کو سمجھ کر فقہ اسلامی کی نئے اسلوب سے تدوین اور اگر ضرورت ہو تو اس کی توضیح اور جدید تعبیر کی جائے ۔ ہندوستان کی سیاسی گتھی کو بھی وہ اسلامی قوانین کی تشکیلِ جدید اور ان کے نفاذ سے سلجھانا چاہتے تھے ۔ اور یہی وہ غرض واحد تھی ، جس کے لیے انھوں نے ہندوستان میں اسلامی ہند یا مسلم مملکتوں کے جداگانہ وفاق کا نظریہ پیش کیا تھا ، جیسا کہ مسٹر جناح کے نام ان کے خطوط مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء و ۲۱ جون ۱۹۳۷ء سے ظاہر ہوتا ہے ۔ ان کی سیاسی بصیرت نے یہ دیکھ لیا تھا کہ اس مقصد کے حصول میں ابھی ایک عرصہ لگے گا ، لیکن فقہ اسلامی کی تشکیلِ جدید کا یہ کام ایسا نہ تھا کہ اس کو اس وقت تک کے لیے سرد خانہ میں بند کر دیا جائے ۔ قبل اس کے ایسی مملکت منصۂ شہود پر آئے ، جو اسلامی قانون کو اپنے نظامِ سلطنت کا بنیادی قانون بنائے ، علامہ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسے ادارہ کی بنیاد رکھ دی جائے ، جو اصول فقہ کی تشکیلِ جدید کے کام کو فی الفور شروع کر دے ۔ چنانچہ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت مسلم کانفرنس منعقدہ ۲۲ مارچ ۱۹۳۲ء میں حسب ذیل تجویز پیش کی تھی ۔

”میں علماء کی ایک ایسی جماعت قائم کرنے کی تجویز پیش کرتا ہوں ، جس میں ایسے مسلم قانون داں ضرور شریک کیے جائیں ، جنھوں نے جدید اصول قانون کی تعلیم پائی ہو ، مقصد یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی اصولوں کی روح کو سمجھ کر اسلامی قوانین کا موجودہ حالات کی روشنی میں تحفظ ، توسیع اور اگر ضرورت ہو تو اس کی از سر نو تعبیر کی جائے ۔ اس ادارہ کو ملک کے دستور میں تسلیم کیا جانا چاہیئے تاکہ کوئی مسودہ قانون جس کا تعلق مسلمانوں کے شخصی قانون سے ہو ، اس ادارہ کی جانچ پڑتال کے بغیر قانون سازی کے لیے مقننہ میں پیش نہ ہو ۔ اس تجویز کی مسلمانانِ ہند کے لیے ایک عملی قدر و قیمت ہے ، لیکن اس کے علاوہ ہم کو یہ جاننا چاہیئے کہ جدید دنیا ، مسلم وغیر مسلم ،

دونوں کو ابھی اسلام کے قانونی ادب کی لامحدود قدر و قیمت سے آشنا ہونے کی ضرورت ہے اور سرمایہ دارانہ دنیا کو ، جس کے اخلاقی معیارات انسان کے معاشی طرز عمل کے حدود سے بہت دور جا پڑتے ہیں ، اسلامی قانون کی اہمیت سے روشناس کرانے کی ضرورت ہے[۸۸]"

اسلام کے مزاج سے آشنا اور عصر حاضرہ کی روح سے واقف اقبال کی یہ تعمیری تجویز ہمارے قومی ہنگاموں کے بلند آہنگ نعروں میں گم ہو کر رہ گئی ! ——— لیکن رمز آشنائے دین و دنیا کے ذہن سے یہ تجویز کبھی محو نہ ہوئی ـ مفکر اقبال کی اس تجویز کو حجلۂ تخیل سے نکال کر واقعات کی دنیا میں جلوہ گر کرنے کے لیے جس سرو سامان کی ضرورت تھی ، وہ اس فقیر بے نوا کے پاس تھا ، کہاں ؟ اسی لیے انھوں نے کئی مرتبہ اپنے دوست مرزا جلال الدین بیرسٹر سے فرمایا کہ

"اگر کہیں سے زمین اور اخراجات کا انتظام ہو سکتا تو وہ اپنی دیرینہ آرزو کو عملی شکل دیتے[۸۹]"

مرزا صاحب اسی سلسلے میں آگے چل کر لکھتے ہیں ـ

"آخری دنوں میں انھوں نے اعلیٰ حضرت سرکار بہاولپور کی خدمت میں اسی اسکیم کے بارے میں ایک خط بھی ارسال کیا ـ ان کی اس تجویز نے خود مجھ پر اس قدر اثر کیا کہ میں نے بہاولپور میں اس کی سرپرستی کا انتظام کرنا چاہا ! بلکہ بہاول نگر کے گرد و نواح کو اس کام کے لیے اپنے ذہن میں منتخب بھی کر لیا تھا ـ جن دنوں وہ بیمار تھے میں کرنل مقبول حسین قریشی وزیر

۸۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ـ مرتبہ شاملو ـ المنار اکاڈمی لاہور ، طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۶۰ و ۶۱

۸۹- ملفوظاتِ اقبال ـ مرتبہ محمود نظامی ـ مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ـ ص ۷۵

بھاولپور کے ساتھ ان کی خدمت میں پہنچا اور میں نے انھیں یہ بتلایا کہ میں کرنل موصوف کے توسط سے سرکار بھاولپور کی خدمت میں ان کے ادارہ کی سرپرستی کے لیے درخواست کرنے والا ہوں ، اس خبر سے وہ بہت خوش ہوئے[۹۰]''

لیکن بہر حال ان کی زندگی کی یہ آخری تمنا بھاولپور میں پوری نہیں ہوئی ، بلکہ پٹھان کوٹ کی سر زمین کو یہ فخر حاصل ہوا - چودھری نیاز علی خاں صاحب ایک دیندار اور دین کی ضرورتوں کا احساس رکھنے والے مخیر فرزند اسلام نے پٹھان کوٹ میں اپنی زمین اس غرض کے لیے وقف کر دی اور اس کے اخراجات کی کفالت بھی اپنے ذمہ لے لی ، اور اس طرح ادارہ دارالسلام پٹھان کوٹ کی بنیاد پڑ گئی - اس ادارہ کے اغراض و مقاصد اور طریقہ کار پر اس خط سے روشنی پڑتی ہے ، جو حضرت علامہ نے مصطفی المراغی شیخ جامعہ از ہر کے نام لکھا تھا - ڈاکٹر صاحب تحریر فرماتے ہیں -

''ہم نے ارادہ کیا ہے کہ پنجاب کے ایک گاؤں میں ایسا ادارہ قائم کریں ، جس کی نظیر آج تک یہاں وقوع میں نہیں آئی ، ہماری خواہش ہے کہ اس ادارہ کو وہ شان حاصل ہو ، جو دوسرے دینی اور اسلامی اداروں کی شان سے بہت بڑھ چڑھ کر ہو - ہم نے ارادہ کیا ہے کہ علوم جدیدہ کے چند فارغ التحصیل حضرات اور چند علوم دینیہ کے ماہرین کو یہاں جمع کریں - یہ ایسے حضرات ہوں جن میں اعلی درجہ کی ذہنی صلاحتیں موجود ہوں اور وہ اپنی زندگیاں دین اسلام کی خدمت کے لیے وقف کرنے کے لیے تیار ہوں ، ہم ان کے لیے تہذیب حاضرہ کے شور و شغف سے دور ایک کونہ میں ہوسٹل بنانا چاہتے ہیں ، جو کہ ان کے لیے ایک علمی اسلامی مرکز ہو اور ہم ان کے لیے ایک لائبریری

۹۰- ملفوظات اقبال - مرتبہ محمود نظامی - مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ص ۷۵

قائم کرنا چاہتے ہیں ، جس میں ہر قسم کی نئی اور پرانی کتاب موجود ہو اور ان کی رہنمائی کے لیے ہم ایک ایسا معلم ، جو کامل اور صالح ہو اور وہ قرآن کریم میں بصیرت تامہ رکھتا ہو اور نیز انقلابِ دورِ حاضرہ سے بھی واقف ہو ، مقرر کرنا چاہتے ہیں تاکہ وہ ان کو کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح سے واقف کرے اور تفکر اسلامی کی تجدید یعنی فلسفۂ حکمت ، اقتصادیات اور سیاسیات کے علوم میں ان کی مدد کرے تاکہ وہ اپنے علم اور تحریروں کے ذریعہ تمدنِ اسلامی کے دوبارہ زندہ کرنے میں جہاد کر سکیں[۹۱]"۔

اس ادارہ کے قیام کا ابتدائی مقصد تو علومِ اسلامی پر جدید افکار کی روشنی میں تحقیقات کرنا اور ان کے نتائج کو دنیا کے سامنے پیش کرنا تھا۔ اقبال کے فلسفیانہ سیاسی نظریات کے پس منظر میں اگر اس ادارہ کے اغراض و مقاصد کا مطالعہ کیا جائے تو اس کو ان کی مذہب آمیز سیاسی سرگرمیوں کا ایک لازمی جزو قرار دینا پڑے گا۔ انھوں نے ہندوستان میں جس اسلامی مملکت کا خواب دیکھا تھا اور جس قانون و نظام کو وہ اس مملکت میں حکمران و کارفرما دیکھنا چاہتے تھے ، اس کے لیے یہ ادارہ ایک معمل کی حیثیت رکھتا ہے۔

یہ تو رہا ان کا آخری کارنامہ ، اب ان کے آخری معرکہ کی دلفگار داستان بھی سن لیجئے۔

آخری معرکہ | یہ معرکہ علامہ اقبال کی علالت کے انتہائی نازک اور خطرناک ترین ایام میں شروع ہوا اور تقریباً تین ماہ جاری رہنے کے بعد ، ان کی شمع حیات کے گل ہونے سے صرف ۲۴ دن قبل ختم ہوا۔ یہ معرکہ اپنی نوعیت و اہمیت کے لحاظ سے ان کی پبلک زندگی کا نہایت اہم واقعہ تھا۔ واقعہ کیا تھا ؟ وہی معرکہ دین وطن ، جس کے متعلق خود اقبال

۹۱- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۵۱ تا ۲۵۲

ہی نے کہا تھا :

ع بڑھ کے خیبر سے ہے یہ معرکۂ دین و وطن !

پھر یہ معرکہ آرائی کس سے تھی ؟ کسی غیر سے ؟ ہندو کانگریسی سے ؟ کسی تجدد پرست علیگڈھینے سے ، جی نہیں ! یہ معرکہ آرائی تھی ، اپنے ہی ایک قابل احترام مسلم بھائی سے ! ایک قدامت پسند دیو بندی سے ! عالم دین ہی نہیں ، استاذالعلماء مولانا حسین احمد مدنی سے ! !

ہوا یہ کہ اوائل جنوری ۱۹۳۸ء میں صدر بازار دہلی میں ایک جلسہ عام ہوا ۔ اس جلسہ میں مولانا نے تقریر کی اور دوران تقریر کہا ۔

"موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں ، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں[۹۲]"

مولانا کی اس تقریر کو اخبارات میں پڑھنے کے بعد ، علامہ اقبال اس درجہ متاثر ہوئے کہ انہوں نے حسب ذیل اشعار کہے

عجم ہنوز نہ داند رموز دین ورنہ
ز دیوبند حسین احمد این چہ بوالعجبیست
سرود برسر منبر کہ " ملت از وطن " است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربیست
بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ اونرسیدی تمام بولہبیست

یہ اشعار مختلف اخبارات میں اسی وقت شائع ہو گئے ۔

۹۲- مکتوبات شیخ الاسلام ، جلد سوم ۔ مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ناشر مکتبہ دیوبند مطبوعہ اکتوبر ۱۹۶۴ء ص ۱۲۳ و نظریہ قومیت" مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال ۔ مرتبہ طالوت ناشر کتب خانہ قاسمیہ لدھیانہ ۔ ص ۲۰ ۔ مذکورہ بالا اقتباس کے الفاظ کسی اخباری رپورٹنگ کے نہیں بلکہ مولانا مدنی کے اپنے قلم سے ہیں ۔ مصنف

واضح رہے کہ وطنیت اور قومیت کا یہ مسئلہ ، جیسا کہ گذشتہ صفحات میں ہم دیکھ چکے ہیں ، علامہ اقبال کی تحریر و تقریر اور شاعری کا بہت ہی خاص موضوع رہا ہے اور بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ جس زور شور سے علامہ مرحوم نے وطنی یا ارضی و علاقائی قومیت کی مخالفت کی ہے ، اتنی برصغیر ہند کے کسی مفکر اور مسلمانوں کے کسی لیڈر نے نہیں کی - انگلستان سے واپسی کے بعد ہی انھوں نے اس نظریہ کی بنیاد پر اٹھنے والی ہر تحریک کے خلاف صدائے احتجاج ہی نہیں ، نعرہ جنگ بلند کیا تھا - ان کی نظر میں "وطنی قومیت" اور "دینی قومیت" کا یہ مناقشہ محض ایک لفظی تنازعہ یا نظریاتی اختلاف نہ تھا بلکہ یہ ایک "معرکہ" تھا ، بنیادی اور بے انتہا دور رس نتائج کا حامل ------ ! دور جدید کا معرکۂ خیبر ! ! خیبر کی مہم جہاد بالسیف ، تو یہ معرکہ دین و وطن ان کی نظر میں جہاد بالقلم ! بلکہ جہاد اکبر ! !

مولانا مدنی جیسے ذمہ دار عالم دین کی تقریر پر جو اشعار ان کی زبانِ قلم سے نکل گئے خصوصاً وہ شعر جس میں مولانا کے نام کی تصریح اور دیوبند کے تعلق سے ذکر ہے ، الفاظ کے لحاظ سے یک گونہ جذباتی اور قدرے تند و تلخ سہی ، تاہم اقبال کی طرف سے یہی کہا جا سکتا ہے کہ

حافظ بخود نپوشید ایں خرقۂ مے آلود
اے شیخ پاک دامن معذور دار مارا

اس لیے کہ وطنی یا علاقائی قومیت کی مخالفت اور دینی یا فکری قومیت کی موافقت ان کا بنیادی ، سیاسی و دینی عقیدہ تھا اور یہ عقیدہ ان کی روح پر چھا گیا تھا ، ان کے دماغ سے اتر کر ان کے دل میں گھر کر گیا تھا بلکہ ان کی پوری شخصیت میں پیوست ہو گیا تھا ! !

ان قطعہ بند اشعار میں طنز ضرور ہے ، مگر تضحیک نہیں ہے ، پھر یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ یہی وہ واحد شخصی طنز ہے جو ان کے زبانِ قلم سے نکلی ! ان اشعار میں شاعر اقبال مفکر اقبال پر غالب نظر آتا ہے اور پہلی نظر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ بھی گویا "ذاتیات" پر اتر آئے ہیں ------ لیکن شخصیتوں کو پردہ ذہن سے ہٹا کر ذرا

غور و تعمق سے ان اشعار پر نظر ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے کہ ہماری سب سے بڑی دینی درسگاہ کے ایک متقی اور مستند عالم اور دین کے ترجمان کی تقریر سے درد و کرب کا جو احساس ، شاعر کے وجدان وروح میں پیدا ہوا تھا ، اس نے خارج میں الفاظ کا یہ جامہ پہن لیا ہے ! وہ کس ذہنی و روحانی تڑپ کے ساتھ اپنے مخاطب سے کہہ رہا ہے ،

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نر سیدی تمام بولہبیست

اس شعر میں جو روحانی کسک ہے ، اس کو کچھ اہل دل ہی محسوس کر سکتے ہیں ! !

الفاظ سے قطع نظر ، الفاظ کے پس پردہ ، اقبال کے ذہن کی یہ تصویر اگر سامنے رکھی جائے تو یہ ماننا پڑے گا کہ اقبال کا مقصد ، مولانا کی ذات پر حملہ کرنا اور ان کے تقویٰ یا علم و فضیلت کا مذاق اڑانا نہ تھا۔ بلکہ ناموسِ شریعت کے محافظ اور اسرار دین کے ایک راز دار سے ، جو عقیدت و محبت اس دانائے راز کو تھی ، اس نے اس موقع پر اس طنز کا روپ اختیار کر لیا تھا ـــــــ اقبال کی طنز و تعریض کے اس پس منظر میں در اصل محبت و عقیدت ہی کار فرما تھی - جی ہاں ! چوٹ کھائی ہوئی محبت ! جھنجھلائی ہوئی عقیدت ! !

بہر کیف علامہ کے یہ اشعار ، اسی زمانے میں نہ صرف اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے بلکہ زبان زدِ خاص و عام بھی ہو گئے اور ساتھ ہی اس موضوع پر اخبارات میں مباحثہ و مناظرہ شروع ہو گیا - یہ صورتِ حال ان لوگوں کے لیے جو مولانا مدنی اور علامہ اقبال دونوں کے نیاز مند اور عقیدت کیش تھے ، نہایت تکلیف دہ تھی - ان ہی میں سے ایک صاحب طالوت نامی تھے - انھوں نے مولانا سے محولہ بالا تقریر کی تشریح و توضیح چاہی - مولانا نے طالوت صاحب کو ایک مفصل خط لکھا ، جس میں انھوں نے جلسہ کے پس منظر اور اپنے مؤقف کی وضاحت کی - طالوت صاحب نے یہ درخواست اس لیے کی تھی کہ وہ علامہ اقبال کو مولانا کی تقریر کے حقیقی مفہوم و منشا سے آگاہ کرکے ان کی غلط فہمی رفع کرنا چاہتے تھے۔

خود مولانا نے بھی اپنے خط میں اس خواہش کا اظہار کیا تھا[۹۳] - لیکن اس خط کے مندرجات پر علامہ اقبال کے اظہار تاثرات سے قبل ہی مولانا نے اس کو ایک بیان کی صورت میں اخبارات میں شائع فرما دیا ! طالوت صاحب نے مولانا کے خط کے ضروری اقتباسات علامہ اقبال کی خدمت میں روانہ کیے - مگر اس سے قبل اخبار انصاری میں مولانا مدنی کا یہ پورا خط ایک بیان کی صورت میں علامہ اقبال کی نظر سے گذر چکا تھا - اسی لیے انھوں نے مولانا کے اس بیان کے جواب میں ایک مضبوط ، مدلل اور معرکۃ آلارا مضمون اخبار " احسان " مورخہ ۹ مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں شائع فرما دیا - یہ مضمون اس قابل ہے کہ اقبال کی سیاسی روئیداد زندگی میں اس کو من و عن شامل کر لیا جائے ، لیکن خوفِ طوالت مانع ہے - یہاں ہم مولانا مدنی کے بیان کے اہم اجزاء اور علامہ اقبال کے ان اجزاء سے متعلقہ جوابات درج کرتے ہیں -

مولانا مدنی نے اپنی تقریر کے متعلق اس بیان میں وضاحت کی کہ

" میں نے کہا کہ موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں "

اور

" میں نے یہ ہرگز نہیں کہا کہ مذہب اور ملت کا دارو مدار وطنیت پر ہے - یہ بالکل اِفترا اور دجل ہے "

پھر فرمایا -

" سر اقبال موصوف جیسے عالی خیال ، حوصلہ مند اور مذہب میں ڈوبے ہوئے ، تجربہ کار شخص کو یہ خیال نہ آیا ، نہ تحقیق کرنے کی طرف توجہ فرمائی - آیۃ : اذا جاءکُم فاسقٌ بنباءٍ

۹۳- مکتوباتِ شیخ الاسلام ، جلد سوم ، مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۴ و " نظریہ قومیت " مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ، ص ۲۱ و ۲۲ -

"فتبینوالایۃ گویا ان کی نظر سے نہیں گذری[۹۳]"

گویا مولانا نے "قوم" اور "ملت" کی لفظی بحث چھیڑ دی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ "قوم" تو وطن سے بنتی ہے، البتہ "ملت" وطن سے نہیں بنتی۔ لہٰذا ان کی تقریر کا یہ فقرہ کہ "قومیں اوطان سے بنتی ہیں" قابل اعتراض نہیں ہو سکتا، مگر اقبال نے "قوم" کو "ملت" کا ہم معنی قرار دے لیا اور اخبارات کی غلط رپورٹنگ پر بھروسہ کرتے ہوئے انھیں ملت از وطن کے نظریہ کا حامی سمجھ کر ہدفِ طنز و تنقید بنایا۔ علامہ اقبال نے جواب میں کہا۔

"میں نے اپنے مصرع

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است

میں لفظ "ملت"، قوم کے معنوں میں استعمال کیا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ عربی میں یہ لفظ اور بالخصوص قرآن مجید میں "شرع اور دین" کے معنوں میں استعمال ہوا ہے لیکن حال کی عربی، فارسی اور ترکی زبانوں میں بکثرت سندات موجود ہیں، جن سے معلوم ہوتا ہے کہ ملت قوم کے معنوں میں بھی مستعمل ہے۔ میں اپنی تقریروں میں بالخصوص ملت بمعنی قوم ہی استعمال کیا ہے، لیکن چونکہ لفظ ملت کے معنی زیر بحث مسائل پر چنداں مؤثر نہیں، اس واسطے اس بحث میں پڑے بغیر ہی تسلیم کرتا ہوں کہ مولانا حسین احمد کا ارشاد یہ تھا کہ اقوام اوطان سے بنتی ہیں[۹۵]"

۹۴۔ مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۵ اور "نظریہ قومیت" مولانا حسین احمد مدنی اور اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۱ و ۲۲۔

۹۵۔ مقالاتِ اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی، مطبوعہ اشرف پریس لاہور مئی سنہ ۱۹۶۳ء ص ۲۳۔

یہ کہہ کر علامہ نے " قوم " اور " ملت " کی اس لفظی نزاع کو غیر اہم اور غیر مؤثر قرار دے دیا ، جس کا سہارا لینے کی مولانا مدنی نے کوشش فرمائی تھی ۔ مگر مولانا کا ذہن تو ان الفاظ کے گورکھ دھندے میں الجھا ہوا تھا ۔ انہوں نے نہ صرف ان الفاظ کے محمّل استعمال پر گرفت کی بلکہ ان کے لفظی معنوں کو پیش نظر رکھنے پر اصرار کیا ، اسی لیے انہوں نے آگے چل کر ارشاد فرمایا

" سر اقبال فرماتے ہیں

سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد عربی است

کیا انتہائی تعجب کی بات نہیں ہے کہ ملت اور قوم کو سر اقبال صاحب ایک قرار دے کر ملت کو وطنیت کی بناء پر نہ ہونے کی وجہ سے قومیت کو بھی اس سے منزہ قرار دیتے ہیں ۔ یہ بوالعجبی نہیں ہے تو کیا ہے ۔ زبانِ عربی اور مقامِ محمد عربی علیہ السلام سے کون بے خبر ہے ؟ ذرا غور فرمائیے ۔ میں نے اپنی تقریر میں لفظ " قومیت " کہا ہے ۔ " ملت " نہیں کہا ہے ۔ دونوں لفظوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے ۔ ملت کے معنی " شریعت " یا " دین " کے ہیں اور قوم کے معنی عورتوں اور مردوں کی جماعت کے ہیں ۔ بالکسرِ الشّرعیۃُ اوالدینُ (یہ ملت کی بحث میں ہے) نیز قاموس میں ہے القومُ الجماعۃُ مِنَ الرّجالِ والنسارِ معاً اوالرِ جالُ خاصۃ اوتدخلہ النساء تبعیہ الخ (بحث قوم) مجمعِ البحار میں ملت کے معنی ان الفاظ کے ساتھ ذکر کیے گئے ہیں ۔ ما شرعَ اللہُ بِعبادہِ علی السنۃِ الا نبیاءِ علیہم السلام ویستعمل فی جملۃ الشرائع لافی احادھا ثمر اتبعت فاستعملت فی الملۃ الباطلہ فقیل الکفر ملۃٌ واحدۃٌ الخ ۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ یہ منطق کون سی ہے ۔ لفظ قوم ، ملت ، دین تینوں عربی ہیں ان کے معانی کو لغت عربی سے پوچھیے اور دیکھیے کہ لغت عربی کی معتبر کتاب میں قوم اور ملت کو اور

علیٰ ہذا القیاس قوم اور دین کو مرادف اور ہم معنی قرار دیا ہے یا نہیں ۔ آیات اور روایات کو ٹٹولیے اور سر صاحب کی بوالعجبی کی داد دیجئے . . . . پھر سر موصوف کی یہ نسبت سرود بر سر منبر الخ افترا محض نہیں ہے تو کیا ہے اور ان کا ان تینوں کو ایک قرار دینا عجمیت اور زبانِ عربی سے ناواقفیت نہیں ہے تو کیا ہے[96] ؟ "

علامہ اقبال کا جواب ملاحظہ کیجئے ۔

" مولانا نے یہ فرض کرکے کہ مجھے قوم اور ملت کے معنی میں فرق معلوم نہیں اور شعر لکھنے سے پہلے جہاں میں نے مولانا کی تقریر کی اخباری رپورٹ کی تحقیق نہ کی ، وہاں قاموس کی ورق گردانی بھی نہ کر سکا ، مجھے زبان عربی سے بے بہرہ ہونے کا طعنہ دیا ہے ۔ یہ طعنہ سر آنکھوں پر ، لیکن کیا اچھا ہوتا ، اگر میری خاطر نہیں تو عامۃ المسلمین کی خاطر قاموس سے گذر کر قرآن حکیم کی طرف رجوع کر لیتے اور اس خطرناک اور غیر اسلامی نظریہ کو مسلمانوں کے سامنے رکھنے سے پیشتر خدائے پاک کی نازل کردہ وحی سے بھی استشہاد فرماتے ۔ مجھے تسلیم ہے کہ میں عالمِ دین نہیں ، نہ عربی زبان کا ادیب

قلندر جز دو حرف لاالہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

لیکن آپ کو کون سی چیز مانع آئی کہ آپ نے صرف قاموس پر اکتفا کی ؟ کیا قرآن پاک میں سینکڑوں جگہ لفظ قوم استعمال نہیں ہوا ؟ کیا قرآن میں " ملت " کا لفظ متعدد بار نہیں آیا ؟ آیات قرآن میں قوم و ملت سے کیا مراد ہے ؟ اور کیا جماعت

۹۶- " مکتوبات شیخ الاسلام " جلد سوم مرتبہ نجم الدین ص ۱۲۵ تا ۱۲۶ اور " نظریہ قومیت —— —— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال " مرتبہ طالوت ص ۲۲ و ۲۳ و ۲۴ ۔

محمدیہ کے لیے ان الفاظ کے علاوہ لفظ اُمت بھی آیا ہے یا نہیں ؟
کیا ان الفاظ کے معانی میں اس قدر اختلاف ہے کہ ایک ہی قوم
اس اختلاف معانی کی بناء پر ایسی مختلف حیثیتیں رکھے کہ دینی
یا شرعی اعتبار سے تو وہ نوامیس الہیہ کی پابند ہو ، اور ملکی
و وطنی اعتبار سے کسی ایسے دستور العمل کی پابند ہو جو ملّی
دستور العمل سے مختلف بھی ہو سکتا ہے[۹۷] "

مولانا مدنی نے الفاظ " ملت " اور " قوم " کے لغوی معنی بیان فرمائے تھے ، اور عربی زبان کی مشہور و معروف کتب لغت قاموس ، مجمع البحار سے استناد کیا تھا ، علامہ اقبال نے ان لغوی معانی کو صحیح تسلیم کیا ہے ، لیکن انھوں نے کتنی ننھی لگتی بات کہی کہ جب یہ الفاظ (قوم و ملت) اور ان کے علاوہ لفظ " امت " بھی قرآن مجید میں وارد ہوا ہے تو پھر ان کے معانی کو قاموس سے گذر کر کیوں نہ وحی الٰہی سے پوچھا جائے ! ـــــــ گویا فقیہہ شہر لغت ہائے حجازی کا سہارا لے رہا ہے اور قلندر وقت اس کے مقابلہ میں کلام اللہ کو پیش کر رہا ہے !! یوں اقبال نے ان الفاظ کے الٹ پھیر اور ان کی لغوی موشگافیوں کے جال کو توڑ کر مولانا اور عامۃ المسلمین کی توجہ اصل مسئلہ کی طرف مبذول کرانے کی کوشش کی ! ـــــــ لیکن مولانا نہ صرف لغات کے بکھیڑوں میں الجھے ہوئے تھے بلکہ ان کے ذہن میں لفظ " قوم " کے عرفی معنے بھی گردش کر رہے تھے ۔ انھوں نے ارشاد فرمایا ۔

" قوم کا لفظ ایسی جماعت پر اطلاق کیا جاتا ہے جس میں کوئی وجہ جامعیت کی موجود ہو ، خواہ وہ مذہبیت ہو یا وطنیت یا نسل یا زبان یا پیشہ یا رنگت یا کوئی صفت مادی یا معنوی وغیرہ وغیرہ ۔ کہا جاتا ہے عربی قوم ، عجمی قوم ، ایرانی قوم ، مصری قوم ، پختون قوم ، فارسی بولنے والی قوم ، سیدوں کی قوم وغیرہ

۹۷۔ مقالات اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ، مطبوعہ اشرف پریس لاہور ، ص ۲۲۸ و ۲۲۹ ۔

وغیرہ - یہ محاورات تمام دنیا میں شائع و ذائع ہیں . . . . . . انھیں میں ہندوستانی قوم بھی ہے - موجودہ زمانے میں ہندوستانی قوم سے بیرونی ممالک میں تمام باشندگانِ ہندوستان سمجھے جاتے ہیں خواہ وہ اردو بولنے والے ہوں یا بنگلہ ، خواہ وہ کالے ہوں یا گورے ہندو ہوں یا مسلمان ، پارسی ہوں یا سکھ ، انڈین کا لفظ ہر ہندوستانی پر اطلاق کیا جاتا ہے - - - - - - - - میں نے بیرونی ممالک کے عام لوگوں کو اسی خیال اور عقیدہ پر پایا کہ وہ ہندوستانی لوگوں کو ایک قوم سمجھتے ہیں اور سب کو باوجود مختلف المذاہب اور مختلف السلسان والالوان ہونے کے ایک ہی لڑی میں پروتے ہیں - لغوی معنی اس سے انکاری نہیں - عرف اس کا متقاضی ہے - پھر اس کے انکار کے کیا معنی ہیں[98] ''

مندرجہ بالا اقتباس سے واضح ہوتا ہے کہ مولانا کا ذہن الفاظ " ملت م " میں الجھا ہوا تھا - جب ہی تو وہ ان الفاظ کے لغوی و عرفی کو بیان کرنے پر اپنی ساری توانائی خرچ کر رہے تھے - انھوں نے کہ لغوی اعتبار سے قوم کے معنی ''عورتوں اور مردوں کی جماعت'' ، اور عرفی اعتبار سے اس سے مراد ایسی جماعت یا گروہ ہے جس میں ایک عنصر مشترک ہو - اب رہا لفظِ ''ملت'' تو اس کے معنی ت و دین '' کے ہیں اور یہ لفظ '' قوم '' کا نہ تو مترادف ہے اور معنی[99] - لہذا ہندوستانی قوم کا اطلاق ہندوؤں اور مسلمانوں پر کیا تا ہے ، کیونکہ ان میں نسبتِ ارضی یا عنصر وطنی مشترک ہے - بات سیدھی سادی ، لفظی و لغوی ہے - اس میں نہ کوئی اشکال ہے

مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۶ و ۱۲۷ اور نظریہ قومیت - - - - - مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۴ و ۲۵ -

مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۶ و نظریہ قومیت ، مولانا حسین احمد اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ، ص ۲۳ -

اور نہ الجھاؤ ! اس سے نہ کوئی مسئلہ پیدا ہوتا ہے اور نہ کسی دینی و مذہبی تصور سے اس کا ٹکراؤ ہوتا ہے ۔ اس پر علامہ نے یوں گرفت کی ۔

" مولانا حسین احمد عالم دین ہیں اور جو نظریہ انھوں نے قوم کے سامنے پیش کیا ، امت محمدیہ کے لیے اس کے خطرناک عواقب سے وہ بے خبر نہیں ہو سکتے ۔ انھوں نے لفظ " قوم " استعمال کیا یا لفظ ملت ؟ (یہ امر غیر اہم ہے) بہ اس لفظ سے اس جماعت کو تعبیر کرنا ، جو ان ہی کے تصور کے مطابق پیروان محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر مشتمل ہو ، اور پھر یہ کہنا کہ ارض وطن اس جماعت کی اساس ہے ، ایک نہایت افسوسناک اور بدبختانہ امر ہے ۔ ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی غلطی محسوس تو ضرور کی لیکن اس حد تک نہیں کہ وہ اپنی غلطی کا اعتراف کرتے یا اس کی تلافی و اصلاح کرتے ۔ انھوں نے لفظی اور لغوی تاویل سے کام لیکر ، عذر گناہ بد تر از گناہ کا ارتکاب کیا ہے ۔ ملت اور قوم کے لغوی فرق و امتیاز سے کیا تسلی ہو سکتی ہے؟ ۱۰۰ "

الغرض مولانا مدنی نے " قوم " اور " ملت " کے الفاظ اور ان کے لغوی و عرفی معنوں پر اصرار کیا ۔ اقبال نے ان کے اس اصرار کو عذر گناہ اور مبحث و مسئلہ سے گریز قرار دیا ۔ پھر " اصل مسئلہ " کو واضح اور منقح صورت میں یوں پیش کیا ۔

" سوال ان دونوں لفظوں (قوم و ملت) کے لغوی معانی کے فرق کا نہیں ہے ۔ سوال یہ ہے کہ

کیا مسلمان

اولاً اجتماعی اعتبار سے واحد و متحد اور معروف جماعت ہیں ،

۱۰۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو لاہور سنہ ۱۹۴۸ء ص ۲۲۸ ۔ و مقالات اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۶۳ء ص ۲۲۶ و ۲۲۷ ۔

جس کی اساس توحید اور ختم نبوت پر ہے ، یا کوئی ایسی جماعت ہیں جو نسل و ملک یا رنگ و بستان کے مقتضیات کے ماتحت اپنی ملّی وحدت چھوڑ کر کسی اور نظام قانون کے ماتحت کوئی اور ہئیت اجتماعیہ بھی اختیار کر سکتے ہیں ۔

ثانیاً کیا اس تصور کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن حکیم نے کہیں لفظ قوم استعمال کیا ہے ؟ یا صرف ملت یا امت ہی سے پکارا ہے ۔

ثالثاً اس ضمن میں وحی الٰہی کی دعوت کس لفظ کے ساتھ ہے کیا یہ کسی آیت قرآنی میں آیا ہے کہ اے لوگو ، یا اے مومنو! قوم مسلم میں شامل ہو جاؤ ، یا اس کا اتباع کرو ، یا یہ دعوت صرف امت میں شمولیت کی ہے[۱۰۱] "

اس اصلی و بنیادی سوال کے تعلق سے اقبال نے قرآن کریم کی روشنی میں ملت یا امت کا مفہوم اور " ملت و قوم " کا فرق بیان کیا ہے ۔ انہوں نے کہا ۔

" جہاں تک میں دیکھ سکا ہوں ، قرآن حکیم میں جہاں ، جہاں اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت ہے وہاں صرف لفظ ملت یا امت وارد ہوا ہے ۔ کسی خاص قوم کے اتباع یا اس میں شرکت کی دعوت نہیں ہے ۔ مثلاً ارشاد ہوتا ہے ۔ وَ مَنْ اَحسَنُ دِیناً لِمَنْ اَسلَمَ وَجہہِ اللہ وَ ھُوَ مُحسِنٌ ۔ وَ اتّبعَ مِلّۃَ اِبرَاھِیمَ حنیفاً و اتّبعتُ مِلّتَ ابراھیمَ فیا تتّبعُو مِلۃَ اِبراھیم حنیفاً ۔

اور یہ اتباع و اطاعت کی دعوت اس لیے ہے کہ ملت نام ہے

۱۰۱۔ مقالات اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۹ ۔ اور اسپیچس و اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی ، طبع ثانی ص ۲۳۱ ۔

ایک دین کا ، ایک شرع و منہاج کا !

قوم ، چونکہ کوئی شرع و دین نہیں ہے ،·اس لیے اس کی طرف دعوت اور اس سے تمسک کی ترغیب عبث تھی ۔ کوئی گروہ ہو ، خواہ وہ گروہ کسی قبیلہ کا ہو ، ڈاکوؤں کا ہو ، تاجروں کا ہو، ایک شہر والوں کا ہو ، جغرافیائی اعتبار سے ایک ملک یا وطن والوں کا ہو ، وہ محض گروہ ہے ، رجال کا یا عورت و مرد ، دونوں پر مشتمل انسانوں کا ——— ——— وحی الٰہی یا نبی کے نقطۂ خیال سے یہ گروہ ابھی ہدایت یافتہ نہیں ہوتا ۔ اگر وحی یا نبی اس گروہ میں آ جائے تو اس کا پہلا مخاطب یہی گروہ ہوتا ہے اور اسی لیے یہ گروہ اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے مثلاً قوم نوح قوم موسیٰ ، قوم لوط ، لیکن اگر اسی گروہ کا مقتدا کوئی بادشاہ یا سردار ہو تو پھر یہ گروہ مقتدا کے نام سے بھی منسوب کیا جاتا ہے ۔ مثلاً قومِ عاد ، قومِ فرعون ، اگر ایک ملک میں دو گروہ اتفاقاً اکٹھے ہو جائیں اور پھر وہ دو متضاد رہنماؤں کا اتباع کریں تو وہ دونوں رہنماؤں سے منسوب کیے جا سکتے ہیں مثلاً جہاں قوم موسیٰ تھی ، وہاں قوم فرعون بھی تھی ۔ قال الملاء مِن قومِ فرعون ۔ انتھم موسیٰ و قومہ ۔

لیکن جہاں کہیں لفظ قوم وارد ہوا ہے ، وہاں مراد ، وہ گروہ ہے جو ہدایت یافتہ اور غیر ہدایت یافتہ دونوں قسم کے افراد پر مشتمل تھا ۔ جو افراد پیغمبر کے حلقۂ اطاعت میں آتے گئے اور توحید الٰہی تسلیم کرتے گئے ، وہ اس پیغبر کی ملت کے اجزا بنتے گئے اور اس کے دین میں داخل ہو گئے یا واضح تر الفاظ میں " مسلم " بن گئے ۔ یاد رہے کہ دین اور ملت کفار کی بھی ہوتی ہے اِنّی ترکتُ ملۃَ قومٍ لا یومنون باللہ " قوم کی ایک ملت " تو ہو سکتی ہے یعنی قوم کی زندگی کا ایک " منہاج " تو ہو سکتا ہے لیکن اس کے برعکس " ملت کی قوم " کہیں استعمال نہیں ہوا ہے ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ

نے قرآن میں ایسے افراد کے لیے جو مختلف اقوام اور ملل سے نکل "ملت ابراہیمی" میں داخل ہو گئے۔ لفظ قوم نہیں بلکہ لفظ "ملت یا امت" استعمال کیا ہے[۱۰۲]"

الفاظ "قوم اور ملت" یا "امت" کے قرآنی مفہوم کی، یہ وہ ترضیح و تشریح تھی جو اقبال نے مولانا حسین احمد مدنی کے لغوی و عرفی معانی کے بمقابل بیان کی۔ اس کے بعد انھوں نے اس تمام بحث کا خلاصہ یا نچوڑ مختصر مگر نہایت واضح الفاظ میں اس طرح بیان کیا۔

"قوم رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت با اعتبار قبیلہ، نسل، رنگ، زبان، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی گویا

ملت یا امت جاذب ہے اقوام کی،
خود ان میں جذب نہیں ہو سکتی[۱۰۳]"

اس کے بعد انھوں نے مولانا مدنی اور ان کے ہم خیال علماء کی حمیت دینی کو اس طرح جھنجھوڑا۔

"عہد حاضر کے ہندوستانی علماء کو حالات زمانہ نے وہ باتیں کرنے اور دین کی ایسی تاویلیں کرنے پر مجبور کر دیا ہے جو قرآن یا نبی امی کا منشاء ہرگز نہ ہو سکتی تھیں۔ کون نہیں جانتا کہ حضرت ابراہیم سب سے پہلے پیغمبر تھے، جن کی وحی میں قوموں، نسلوں اور وطنوں کو بالائے طاق رکھا گیا تھا اور بنی آدم کی صرف ایک تقسیم کی گئی تھی۔ موحد و مشرک۔ اس وقت سے لیکر دو ہی ملتیں دنیا میں ہیں۔ تیسری کوئی ملت

۱۰۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال۔ مرتبہ شاملو طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ع ص ۲۳۱ تا ۲۳۳ و مقالات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۰ و ۲۳۱۔

۱۰۳- مقالات اقبال، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۱۔

نہیں ۔ کعبۃ اللہ کے محافظ آج دعوتِ ابراہیمی و دعوتِ اسماعیلی سے غافل ہو گئے ۔ قوم اور قومیت کی ردا اوڑھنے والوں کو اس ملت کے بانیوں کی وہ دعا یاد نہ آئی جو اللہ کے گھر کی بنیاد رکھتے وقت ان دونوں پیغمبروں نے کی تھی ۔ و اِذا یرفعُ ابراھیمُ القواعدَ مِن البیتِ و اسماعیلُ ' ربّنا تقبّل مِنّا اِنکَ انتَ السمیعُ العلیم ۔ ربّنا واجعلنا مسلمینَ لکَ و مِن ذُرّیتنا امۃً مسلمۃً لکَ ' ۱۰۳ "

حمیت دینی و غیرتِ اسلامی کو اس طرح جھنجھوڑنے کے بعد اقبال نے "قوم" اور "ملت" یا "امت" کے قرآنی مفہوم کی روشنی میں مولانا مدنی سے بنیادی سوال یہ کیا ۔

"کیا خدا کی بارگاہ سے امتِ مسلمہ کا نام رکھوانے کے بعد بھی یہ گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ ہماری ہئیتِ اجتماعی کا کوئی جز عربی ، ایرانی ، افغانی ، انگریزی ، مصری یا ہندی قومیت میں جذب ہو سکے ؟ امتِ مسلمہ کے مقابل تو صرف ایک ہی ملت ہے اور وہ الکفرُ ملۃٌ واحدہ کی ہے !!۱۰۴

یہ تلخ نوائی ضرور ہے ، لیکن اقبال تو تلخ نوائی کرتے ہی رہتے تھے اور صرف کرتے ہی نہیں بلکہ اس کو گوارا کرنے کا مطالبہ بھی کرتے تھے ۔

چمن میں تلخ نوائی مری گوارا کر
کہ زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاقی!

——— اور یہاں تو زہر تھا ہی نہیں ، تریاق ہی تریاق تھا گو کڑوا تھا اور قدرے تیز و تند بھی ! اقبال کے لہجہ کی یہ تلخی اور آہنگ کی یہ تیزی خود مولانا مدنی کی آوردہ تھی ۔ مولانا نے فرمایا تھا ۔

۱۰۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۳ و ۲۳۴ اور مقالات اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۱ و ۲۳۲ ۔

" یہ دعویٰ کہ اسلام کی تعلیم ، قومیت کی بناء ، جغرافیائی حدود یا نسلی وحدت یا رنگ کی یکسانی کے بجائے شرفِ انسانی اور اخوت بشری پر رکھتی ہے (جیسا کہ مدیر احسان کا دعویٰ ہے) مجھے نہیں معلوم کہ کس نصِ قطعی یا ظنی سے ثابت ہے ، جس کی بناء پر اختلافِ اوطان وغیرہ پر اطلاق لفظ قوم ممنوع ہو ۱۰۵ "

اقبال کو مولانا کے اس ارشاد سے دکھ ضرور پہنچا ، جس کی کسک لہجہ و آہنگ کی اس تلخی و تندی میں صاف محسوس ہوتی ہے ، تاہم انہیں اس سے تعجب نہیں ہوا ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

" مولانا حسین احمد کے بیان کا وہ حصہ جس میں آپ نے مدیرِ " احسان " سے اس بات کی تائید میں نص طلب کی ہے کہ ملت اسلامیہ شرفِ انسانی اور اخوتِ بشری پر موسس (مبنی) ہے ، بہت سے مسلمانوں کے لیے تعجب خیز ہو گا ، لیکن میرے لیے چنداں تعجب خیز نہیں ہے ۔ اس لیے کہ مصیبت کی طرح گمراہی بھی تنہا نہیں آتی ۔ جب کسی مسلمان کے دل و دماغ پر وطنیت (وطنی قومیت) کا وہ نظریہ غالب آ جائے ، جس کی دعوت مولانا دے رہے ہیں تو اسلام کی اساس میں طرح طرح کے شکوک پیدا ہونا ، ایک لازمی امر ہے ۔

باقی رہا نص کا معاملہ تو میں سمجھتا ہوں کہ تمام قرآن ہی اس کے لیے نص ہے ۔ الفاظ " شرفِ انسانی " سے کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہونی چاہیے ۔ اسلامی فکر میں ان سے مراد وہ حقیقت کبریٰ ہے ، جو حضرت انسان کے قلب و ضمیر میں ودیعت کی گئی ہے یعنی یہ کہ اس کی تقویم فطرۃ اللہ ہے اور اس کا شرف

---

۱۰۵ ۔ مکتوباتِ شیخ الاسلام ، جلد سوم ، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۷ ۔

غیر ممنون یعنی غیر منقطع ہونا منحصر ہے ، اس تڑپ پر ، جو توحید الٰہی کے لیے اس کے رگ و ریشے میں مرکوز ہے -

انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ، ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہمی آویزشوں ، خونریزیوں اور خانہ جنگیوں کا ! ———— کیا ان حالات میں بنی نوع انسان کے درمیان ایک ایسی امت قائم ہو سکتی ہے ، جس کی اجتماعی زندگی امن و سلامتی پر مبنی ہو ؟ قرآن کا جواب ہے کہ ہاں ہو سکتی ہے ، بشرطیکہ توحید الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاء الٰہی مشہود کرنا ، انسان کا نصب العین قرار پائے ! ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام و قرار سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمت اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام عالم کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی امت کی تشکیل کی جائے جس کو امۃً مسلمۃً لک کہہ سکیں اور اس کے فکر و عمل پر شہداءُ علی النّاس کا ربانی ارشاد صادق آ سکے[۱۰۶] ''

———— لیکن مولانا مدنی ان تمام حقائق اسلامی و نکات قرآنی سے صرف نظر کرکے وطنی قومیت کے گن گا رہے تھے۔ انگریزی حکومت کے خلاف " متحدہ قومیت ہندیہ " کا محاذ بنانے پر زور دے رہے تھے اور تمام باشندگان ملک کو منظم کرنے اور ان سب کو (یعنی ہندوؤں اور مسلمانوں کو) " وطنیت کے رشتہ میں منسلک کرنا چاہتے تھے " چنانچہ انھوں نے صاف صاف کہا -

" اگرچہ اس پردیسی خونخوار قوم (انگریز) سے نجات کے اور ذرائع عقلاً ممکن ہیں ، مگر جس قدر قوی اور موثر ذریعہ تمام ہندوستانیوں کا متفق اور متحد ہو جانا ہے اور کوئی ذریعہ نہیں ہے - اس کے

۱۰۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ص ۲۳۷ و ۲۳۸ - اور مقالات اقبال ، مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۵ و ۲۳۶ -

آگے اس حکومت کے جملہ اسلحہ اور تمام قوتیں بے کار ہیں اور بغیر نقصانِ عظیم ہندوستانی اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا اشد ضرورت ہے کہ تمام باشندگانِ ملک کو منظم کیا جائے اور ان کو ایک رشتہ میں منسلک کرکے کامیابی کے میدان میں گامزن بنایا جائے۔ ہندوستان کے مختلف عناصر اور متفرق ملل کے لیے کوئی رشتۂ اتحاد بجز متحدہ قومیت کے نہیں، جس کی اساس محض وطنیت ہی ہو سکتی ہے، اس کے علاوہ اور کوئی دوسری چیز نہیں ہے[۱۰۷]،،

لیجئے، بلی تھیلے میں سے باہر نکل آئی۔ مولانا نے الفاظ ''ملت'' اور ان کے لغوی و عرفی معنوں کا جو سہارا لیا تھا وہ "شاخِ نازک پہ آشیانہ" ثابت ہوا۔ ان کی لفظی موشگافیاں دھری کی دھری رہ گئیں اور ان کا ذہنِ حقیقی بے نقاب ہو کر سامنے آ گیا!! یہ ذہن وہی تھا، جس پر وطنی قومیت یا وطنیت کے نظریہ نے قبضہ کر رکھا تھا — ! اقبال نے اس نظریہ کی اصلیت بیان کی، اس کا پول کھولا اور اس کے مضمرات کو واضح کیا پھر اس نظریہ کو روبہ عمل لانے سے جو خطرناک عواقب و نتائج برآمد ہو سکتے ہیں، ان سے مسلمانوں کو آگاہ کیا۔ انھوں نے لکھا کہ

"یہ قومیت کا جدید فرنگی نظریہ ہے[۱۰۸]''۔ جب "یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار پائے۔ ظاہر ہے کہ مسیحیت ایسی اساس نہ بن سکتی تھی (کیونکہ مسیحیت نے یہ تعلیم دی ہے کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے)[۱۰۹] انھوں نے یہ اساس "وطن'' کے

۱۰۷- مکتوباتِ شیخ الاسلام، مرتبہ نجم الدین اصلاحی، ص ۱۲۷ و ۱۲۸ اور نظریہ قومیتِ مولانا حسین احمد اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۶ و ۲۷۔

۱۰۸- مقالاتِ اقبال۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ ص ۲۲۲

۱۰۹- مقالاتِ اقبال۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی۔ ص ۲۲۴

تصور میں تلاش کی - کیا انجام ہوا اور ہو رہا ہے ، ان کے اس انتخاب کا ؟ لوتھر کی اصلاح ، غیر مسلم عقلیت کا دور ، اصول دین کا اسٹیٹ کے اصولوں سے افتراق بلکہ جنگ ، یہ تمام قوتیں یورپ کو دھکیل کر کس طرف لے گئیں ؟ لا دینی ، دھریت اور اقتصادی جنگوں کی طرف ! کیا مولانا حسین احمد یہ چاہتے ہیں کہ ایشیا میں بھی اسی تجربہ کا اعادہ ہو[۱۱۰]؟"

اسی مغربی نظریہ قومیت کی اشاعت عالم اسلام میں کی گئی تاکہ مسلمانوں کو جغرافیائی حدود ، اوطان اور علاقوں میں بانٹ کر ان کی وحدت دینی اور اخوت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا جائے تاکہ وہ مغربی سامراجی طاقتوں کا "ترنوالہ" بن جائیں - اقبال لکھتے ہیں -

"میں نظریہ وطنیت کی تردید اس زمانے سے کر رہا ہوں جب کہ دنیائے اسلام اور ہندوستان میں اس نظریہ کا کچھ ایسا چرچا بھی نہ تھا - مجھ کو یورپین مصنفوں کی تحریروں سے ابتداء ہی سے یہ بات اچھی طرح معلوم ہو گئی تھی کہ یورپ کی ملوکانہ اغراض اس امر کی متقاضی ہیں کہ اسلام کی وحدت دینی کو پارہ پارہ کرنے کے لیے اس سے بہتر اور کوئی حربہ نہیں کہ اسلامی ممالک میں فرنگی نظریہ وطیت کی اشاعت کی جائے - چنانچہ ان کی یہ تدبیر جنگ عظیم میں کامیاب بھی ہو گئی اور اس کی انتہا یہ ہے کہ ہندوستان میں اب مسلمانوں کے بعض دینی پیشوا بھی اس کے حامی نظر آتے ہیں - زمانے کا الٹ پھیر بھی عجیب ہے - ایک وقت تھا کہ ہم مغرب زدہ پڑھے لکھے مسلمان تفریح گرفتار تھے ، اب علماء اس لعنت میں گرفتار ہیں[۱۱۱]!!

یہ تو تھا اس مغربی نظریہ کے ڈھول کا پول ! اب ذرا اسلام اور

۱۱۰- مقالات اقبال - مرتبہ سید عبدالواحد معینی - ص ۲۲۵

۱۱۱- مقالات اقبال - مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۲ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۴

مسلمانوں کے تعلق سے اس کے مضمرات ، عواقب اور نتائج کو بھی اقبال کی زبان سے سن لیجیئے -

"مولوی (حسین احمد مدنی) صاحب زمانہ حال میں قوم کے لیے "وطن" کی اساس ضروری سمجھتے ہیں . . . .
اگر ایسی قوم میں مختلف ادیان و ملل بھی ہوں تو رفتہ رفتہ وہ تمام ملتیں مٹ جاتی ہیں اور صرف لا دینی اس قوم کے افراد میں وجہ اشتراک رہ جاتی ہے - کوئی دینی پیشوا تو کیا ایک عام آدمی بھی جو دین کو انسانی زندگی کے لیے ضروری سمجھتا ہے ، نہیں چاہتا کہ ہندوستان میں ایسی صورت حال پیدا ہو . . . . . .
. . . .
اگر بعض مسلمان اس فریب میں مبتلا ہیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو میں مسلمانوں کو بروقت انتباہ کرتا ہوں کہ اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لا دینی ہوگا اور اگر لا دینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی[۱۱۲]"

سوال یہ پیدا ہو سکتا تھا کہ آخر آپ ان خرابیوں کو اس نظریہ کے مضمرات کیوں قرار دے رہے ہیں ؟ بالفاظ دیگر جن خطرناک عواقب و نتائج کو اقبال گنا رہے ہیں ، وہ آخر کیوں پیدا ہوں گے ؟ اقبال نے اس "کیوں" کا جو جواب دیا ہے ، اس کے چند مقدمات ہیں - پہلے ان مقدمات کو اقبال کی زبانی سنئے -

"نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہئیت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے ، جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کے تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بار گاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا - بالفاظ دیگر یوں کہیئے کہ بنی نوع انسان کی اقوام کو (شعوب و قبائل اور

۱۱۲- ایضاً ص ۲۲۵ و ص ۲۲۶ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۸

الوان والسنہ کے اختلافات کو تسلیم کرنے کے باوجود) ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے، جو زمان و مکان ، وطن ، قوم ، نسل ، نسب ، ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں اور اس طرح اس پیکر خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کیا جائے ، جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے - یہ ہے مقامِ محمدی ! اور یہ ہے نصب العین ملتِ اسلامیہ کا ! !

اس کی بلندیوں تک پہونچنے کے لیے نہ جانے حضرتِ انسان کو کتنی صدیاں لگیں گی مگر اس امر واقعی میں بھی کچھ شک نہیں ہے کہ اقوام عالم کی باہمی مغائرت دور کرنے اور باوجود شعوری ، قبائلی ، نسلی اور لسانی امتیازات کے ، ان کو یک رنگ کرنے میں ، جو کام اسلام نے تیرہ سو سال میں کیا ہے ، وہ دیگر ادیان سے تین ہزار سال میں بھی نہیں ہو سکا - یقین جانئے کہ دین اسلام ایک پوشیدہ اور غیر محسوس حیاتی و نفسیاتی عمل ہے ، جو بغیر کسی تبلیغی کوششوں کے بھی عالم انسانی کے فکر و عمل کو متاثر کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے[113]''

مختصراً یہ کہ رنگ و نسل ، قبیلہ و خاندان ، زبان ، قوم اور وطن میں بٹے ہوئے انسانوں کو ''ہم خیال'' و ''ہم دل'' بنا کر اسلام ایک معاشرہ یا ایک ہئیتِ اجتماعیۂ انسانیہ قائم کرتا ہے - ان مختلف التلون ، والنسل والسنہ افراد کا نقطۂ اشتراک و اجتماع فکر و نظر کی وحدت و مرکزیت ہے - یہ تو ہوا مقدمۂ اول !

کرہ ارض کے سارے انسانوں کو متحد کرنے کا خیال ، ایک خوش آئندہ خواب تو ہے مگر اس کی تعبیر عملی طور پر کس طرح ممکن ہے ـــــ اس پاکیزہ ، اعلیٰ و ارفع خیال کو روبہ عمل لانے کی صرف ایک ہی صورت ہو سکتی ہے کہ ان مختلف امتیازاتِ نسل ، رنگ و زبان وغیرہ کے

۱۱۳- مقالاتِ اقبال - مرتبہ سید عبدالواحد معینی - ص ۲۳۴ اور اسپیچس و اسٹیٹ منٹس آف اقبال - مرتبہ شاملو - طبع ثانی - ص ۲۳۶ و ۲۳۷

حامل افراد کو ایک واحد جماعتی نظم میں پرویا جائے ۔ اب یہ واحد اجتماعی نظام کیا ہو سکتا ہے ، اس کو اقبال سے سنئے ۔

"اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن ، سلامتی اور ان موجودہ اجتماعی ہئیتوں کو بدل کر ایک واحد جماعتی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا ، کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض فرد کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں ، بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے ، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو ، یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے . . . . قدیم زمانے میں "دین" قومی تھا ۔ جیسے مصریوں ، یونانیوں اور ایرانیوں کا ، بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا ۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے . . . . یہ اسلام ہی تھا ، جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے ، نہ نسلی ہے ، نہ انفرادی ، نہ پرائیویٹ بلکہ خالصتہً "انسانی" ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشیریت کو متحد و منظم کرتا ہے ۔ ایسا دستور العمل قوم اور نسل پر بنایا نہیں جا سکتا ، نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ اس کو صرف عقائد (معتقدات) کی بناء پر بنایا جا سکتا[۱۱۳]"

مختصراً یہ کہ اسلام محض مجموعہ عقائد و عبادات و رسوم نہیں ہے ۔ اس کا ایک اجتماعی دستور العمل اور نظام بھی ہے ۔ وہ دینِ جزوی نہیں ، دینِ کلی ہے ———— یہ ہوا مقدمہ دوم !

۱۱۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ طبع ثانی ص ۲۲۶ اور مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۴ و ص ۲۲۵

چلئے اسلام مختلف امتیازات کے حامل افراد کو جوڑ کر انھیں "ہم خیال" و "ہم دل" بناتا ہے اور اس طرح ایک معاشرہ کی تشکیل کرتا ہے ۔ (مقدمہ اول) پھر اس معاشرہ کے لیے ایک اجتماعی نظام یا دستور العمل تجویز کرتا ہے (مقدمہ دوم) تاہم یہ کیا ضروری ہے کہ ایسا معاشرہ یا ایسی "ملت" اشتراکِ وطن پر مبنی معاشرہ یا وطنی قومیت کے ساتھ مل جل کر نہ رہ سکے ؟ اس میں رکاوٹ کیا ہے ؟ اقبال اس کا دو ٹوک جواب دیتے ہیں ۔

"زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں "وطن" کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں ، بلکہ "وطن" ایک اصول ہے ، ہئیتِ اجتماعیۂ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے ۔ چونکہ اسلام بھی ایک ہئیتِ اجتماعیتِ انسانیہ کا ایک قانون ہے اس لیے جب لفظ وطن کو ایک سیاسی تصور کے طور پر استعمال کیا جائے تو وہ اسلام سے متصادم ہوتا ہے[۱۱۵]"

گویا "اسلام" اور "وطنی قومیت" میں تصادم ہے ، کیونکہ یہ دونوں اجتماعی نظام ہونے کے دعوے دار ہیں ۔ یہ ہوا ، مقدمہ سوم !

مانا کہ ان دونوں میں تصادم ہے ، لیکن اس تصادم کو "کچھ لو اور دو" کے اصول پر عمل کرکے رفع تو کیا جا سکتا ہے ۔ ان میں باہمی مصالحت ، سمجھوتہ یا راضی نامہ تو کرایا جا سکتا ہے ! اقبال کہتے ہیں کہ اسلام کسی دوسرے نظام اجتماعی سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کے لیے تیار نہیں ہے ! ! فرماتے ہیں

"اسلام ہئیتِ اجتماعیۂ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ یا سمجھوتہ کرنے کو تیار نہیں بلکہ اس امر کا اعلان کرتا ہے کہ اسلام کے سوا ہر دستورالعمل نامعقول و مردود ہے[۱۱۶]"

۱۱۵- مقالاتِ اقبال - مرتبہ سید عبدالواحد معینی - ص ۲۲۳

۱۱۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال - مرتبہ شاملو - طبع دوم ص ۲۲۵ و مقالاتِ اقبال - ص ۲۲۳ و ص ۲۲۴

وہ اس بات کو اپنے اسی مضمون میں بار بار دہراتے ہیں۔ ایک اور جگہ کہتے ہیں۔

"امت مسلمہ جس دین فطرت کی حامل ہے اس کا نام "دینِ قیم" ہے۔ دینِ قیم کے الفاظ میں ایک عجیب و غریب لطیفۂ قرانی مخفی ہے ، اور وہ یہ کہ صرف دین ہی مقّوم ہے اس گروہ کے امورِ معاشی و معادی کا جو اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے نظام کے سپرد کر دے۔ بالفاظ دیگر یہ کہ قرآن کی رو سے حقیقی تمدنی یا سیاسی معنوں میں قوم ، دین اسلام سے ہی تقویم پاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن صاف صاف اس حقیقت کا اعلان کرتا ہے کہ اسلام کے سوا ہر دستورالعمل نامقبول اور مردود ہے[۱۱۷]"

مختصراً یہ کہ اسلام کا ایک اجتماعی نظام ہے اور یہ اجتماعی نظام کسی دوسرے اجتماعی نظام کے ساتھ سمجھوتہ یا مصالحت کا روادار نہیں ہے۔ یہ ہے مقدمہ چہارم !

اب اِن چاروں مقدمات کو ملا کر دیکھئے تو متحدہ وطنی قومیت کو قبول کرنے کا لازمی نتیجہ وہی برآمد ہوتا ہے جو اقبال نے بیان کیا ہے۔

مختصراً یہ کہ اسلام امتیازات ، رنگ و نسل ، قبیلہ و خاندان ، زبان و وطن ، وغیرہ کے حامل افراد کو ہم خیال و ہمدل بناتا ہے ، اور اس طرح ان میں وحدتِ فکر و نظر پیدا کرکے ایک معاشرہ یا ہئیت اجتاعیہ انسانیہ قائم کرتا ہے (مقدمہ اول) پھر اس معاشرہ یا ہئیتِ اجتاعیۂ انسانیہ کے لیے ایک اجتاعی نظام یا دستورالعمل تجویز کرتا ہے (مقدمہ دوم) وطنی قومیت بھی ایک ہئیت اجتاعیہ ہے اور اس کا بھی ایک اجتاعی نظام ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے ان دونوں اجتاعی نظاموں (اسلام اور وطنی قومیت)

۱۱۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۵ ۔ و مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۲ و ص ۲۳۳

میں تصادم ہے (مقدمہ سوم) اس تصادم کو رفع نہیں کیا جا سکتا
اسلام کسی دوسرے اجتماعی نظام سے سمجھوتہ کرنے کے لیے تیا
بلکہ وہ اپنے سوا ہر دوسرے نظام اجتماعی کو مردود قرار دیتا ۔
چہارم) اب اگر مسلمان دوسری قوموں کے ساتھ مل کر اشتراک
بنیاد پر متحدہ وطنی قومیت اختیار کر لیں تو اس کے صاف معنی
انھوں نے وطنی قومیت کے اجتماعی نظام کو قبول کر لیا اور
اجتماعی نظام کو پس پشت ڈال دیا ۔ اب اسلام ان کا ایک :
(Private affair) بن جاتا ہے ۔ جس کی زیادہ سے زیادہ حیثیت ایک
دستورالعمل (Ethical Code) کی رہ جاتی ہے اور بس ! ! ———
اقبال نے نظریہ قومیت وطنی کے جو مضمرات بیان کیے ہیں اور اس
کرنے کے بارے میں جن خطرناک عواقب و نتائج سے مسلمانوں ؟
کیا ہے ، وہ صد فی صد صحیح ثابت ہوتے ہیں ! !

مولانا حسین احمد مدنی نے متحدہ قومیت وطنی کی تائید میں
سے زیادہ پرزور دلیل پیش کی تھی ، وہ انگریز کی غلامی سے نجات
کا حصول تھا ۔ اس کا حوالہ سابقہ صفحات میں گذر چکا ہے ، اس
مدلل جواب اقبال نے دیا ۔ فرماتے ہیں ۔

"اگر "وطنیت" کا جذبہ ایسا ہی اہم اور قابل قدر تھا ت
صلی اللہ علیہ وسلم کے بعض اقارب اور ہم نسلوں اور
کو آپ سے پرخاش کیوں ہوئی ؟ کیوں نہ رسو
صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کو محض ایک ہمہ گیر مذ
سمجھ کر بلحاظ قوم یا قومیت ابوجہل اور ابولہب کو
رکھا اور ان کی دلجوئی کرتے رہے ؟ بلکہ کیوں نہ
سیاسی امور میں ان کے ساتھ رشتۂ قومیت وطنی قائم رکھ
اسلام سے مطلق آزادی مراد تھی تو آزادی کا نصب العین
مکہ کا بھی تھا[۱۱۸] !

۱۱۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع ثانی ۔
و مقالات اقبال ۔ مرتبہ سید عبدالواحد معینی ۔ ص ۲۲۳

. . . .

. . . .

حضور رسالتمآب کے لیے یہ راہ بہت آسان تھی کہ آپ ابولہب یا ابوجہل یا کفار مکہ سے یہ فرماتے کہ تم اپنی بت پرستی پر قائم رہو ، مگر اس نسلی اور وطنی اشتراک کی بناء پر جو ہمارے تمہارے درمیان موجود ہے ، ایک ''وحدت عربیہ'' قائم کی جا سکتی ہے ۔ اگر حضور نعوذباللہ یہ راہ اختیار کرتے تو اس میں شک نہیں کہ یہ ایک وطن دوست کی راہ ہوتی لیکن نبی آخرالزماں کی راہ نہ ہوتی[۱۱۹]''

''پیغمبر خدا کا مقصد تو تھا ، دین قیم (اسلام) اور امت مسلمہ کی آزادی ! اس مقصد کو چھوڑنا یا مسلمانوں کو کسی دوسری ہئیت اجتماعیہ کے تابع رکھ کر کوئی اور آزادی چاہنا بے معنی تھا ! ! ابوجہل اور ابولہب اسلام اور امت مسلمہ کو آزادی سے پھولتا پھلتا دیکھ نہیں سکتے تھے ۔ اسی لیے رسول‌اللہ کو بطور دفاع جہاد کرنا پڑا[۱۲۰]''

پھر اسلام کے اس تاریخی اصول اور رسول‌اللہ کی اس بنیادی سنت کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا کہ

''مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں ، بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے ۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مدد گار نہیں ہو سکتا ، جس کی بنیادیں انھیں اصولوں پر ہوں ، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے ۔

۱۱۹- ایضاً ص ۲۳۴

۱۲۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۵ اور مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالوحد ص ۲۳۳

ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد ؟

ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتہً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے ، لیکن اگر آزادی ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدتر بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے ۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا ، بولنا ، روپیہ صرف کرنا ، لاٹھیاں کھانا ، جیل جانا ، گولی کا نشانہ بننا ، سب کچھ حرام اور قطعی حرام سمجھتا ہے [۱۲۱]"

اور ان ہی الفاظ پر انہوں نے اپنے مقالہ کو ختم کیا ۔ ان الفاظ میں حصول آزادی کے لیے کس قدر "جوش" ہے مگر ساتھ ہی ساتھ کتنا "ہوش" ہے پھر یہ جوش و ہوش دونوں کے دونوں اسلامی ہیں ! !

علامہ اقبال کے اس شاہکار مقالہ کی اہمیت و خصوصیت یہی نہیں ہے کہ اس میں وطنی قومیت کے بھیانک چہرے کو بے نقاب اور "اسلامی قومیت" کے خد و خال کو اجاگر کیا گیا ہے بلکہ اس کی حقیقی قدر و قیمت یہ ہے کہ اس کے مطالعہ سے علامہ اقبال کی فکرِ سیاسی کا مرکز اور ان کی عملی سیاست کا محور ابھر کر سامنے آ جاتا ہے ۔

واضح رہے کہ یہ مقالہ ۹ مارچ ۱۹۳۸ء کو یعنی ان کی وفات سے صرف ایک ماہ بارہ دن قبل شائع ہوا ۔ ایک طویل اور فکر انگیز مقالہ کو لکھنے کے لیے جو مشکلات ، مشقت و تعب ایک صحت مند آدمی کو اٹھانی پڑتی ہے ، اس کا اندازہ ہر اہلِ قلم کر سکتا ہے اور یہاں تو حالت یہ تھی کہ علامہ کئی سال سے مسلسل بیمار چلے آ رہے تھے ۔ وہ گوشہ نشین تو ایک عرصہ سے ہو ہی چکے تھے اور اب اس بیان کے لکھواتے وقت تو وہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے اور بقول سید نذیر نیازی ، رہ رہ کر ضعف اور اختلاج قلب کے دورہ ہو رہے تھے اور (حکیم) قرشی صاحب کو خطرہ

۱۲۱- مقالاتِ اقبال - مرتبہ عبدالواحد معینی - ص ۲۳۷

تھا کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پر نہ پڑے[۱۲۲]"

علامہ کے بدترین مخالفوں کو بھی یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اس بیان میں انھوں نے مولانا کی ذات پر حملہ یا ان کی شخصیت پر طنز و تعریض نہیں کی بلکہ اصل موضوع پر نہایت سنجیدہ اور عالمانہ انداز میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ۔ در اصل انھیں عناد ، مولانا کی ذات سے نہیں تھا ۔ ان کی مخالفت تو جدید فرنگی نظریہ وطنیت سے تھی ! !

اقبال نے اپنا یہ طویل اور پر مغز مقالہ ۹ مارچ کو اس لیے شائع کر دیا کہ اس سے قبل مولانا مدنی کا وہ خط ، جو انھوں نے طالوت صاحب کے نام لکھا تھا ، اخبارات میں شائع ہو چکا تھا ۔ پھر جب طالوت صاحب نے علامہ کی خدمت میں مولانا مدنی کے اسی خط کے بعض اقتباسات روانہ کیے اور ان سے درخواست کی کہ "مولانا کی پوزیشن صاف فرمائیں[۱۲۳]" تو ۱۶ فروری ۱۹۳۸ء کو علامہ نے انھیں لکھا کہ جواب انشاءاللہ اخبار احسان میں شائع ہوگا ۔ اس اشاعت کی وجہ یہی تھی کہ مولانا مدنی کا یہ خط اب نجی نہیں رہا تھا بلکہ وہ اخبارات میں چھپ چکا تھا ، تاہم علامہ اقبال کی نیک نیتی اور صاف باطنی کا اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دو دن بعد ہی اور اخبار احسان میں مذکورہ بالا مقالہ کی اشاعت سے قبل یعنی بتاریخ ۱۸ فروری انھوں نے طالوت صاحب کو دوسرا خط لکھا ، جس میں انھوں نے تحریر فرمایا ۔

"میرے ذہن میں ایک بات آئی ، جس کو گوش گذار کر دینا ضروری ہے ۔ امید ہے کہ آپ مولوی صاحب کو خط لکھنے کی زحمت گوارا فرما کر اس بات کو صاف کر دیں گے ۔ جو اقتباسات آپ نے ان کے خط کے درج کیے ہیں ، ان سے یہ معلوم ہوتا ہے

۱۲۲- رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۲۳۵

۱۲۳- مکتوبات شیخ الاسلام ۔ جلد سوم ۔ مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۳۷ اور نظریہ قومیت مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ۔ ص ۳۶

کہ مولوی صاحب نے یہ فرمایا کہ آج کل قومیں اوطان سے ؛
ہیں ۔ اگر ان کا مقصود ان الفاظ سے صرف ایک امر واقعہ
بیان کرنا ہے تو اس پر کسی کو اعتراض نہیں ہو سکتا ۔ کیو
فرنگی سیاست کا نظریہ ایشیا میں بھی مقبول ہو رہا ہے ، البتہ ا
ان کا مقصد یہ تھا کہ ہندی مسلمان بھی اس نظریہ کو قبول کر
تو پھر بحث کی گنجایش باقی رہ جاتی ہے کیونکہ کسی نظریہ
اختیار کرنے سے پہلے یہ دیکھ لینا ضروری ہے کہ آیا وہ اسلام
مطابق ہے یا منافی ۔ اس خیال سے کہ بحث تلخ اور طویل نہ ہو
پائے ، اس بات کا صاف ہو جانا ضروری ہے کہ مولانا کا مقص
ان الفاظ سے کیا تھا ۔ ان کا جو جواب آئے ، وہ آپ مجھے رو
کر دیجئے ۔ مولوی صاحب کو میری طرف سے یقین دلائیے کہ
ان کے احترام میں کسی اور مسلمان سے پیچھے نہیں ہوں ۔ ا
اگر مذکورہ بالا الفاظ سے ان کا مقصود وہی تھا جو میں نے ا
لکھا ہے تو میں ان کے مشورہ کو اپنے ایمان اور دیانت کی رو
اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہو
میرے نزدیک ایسا مشورہ مولوی صاحب کے شایانِ شان ن
اور مسلمانانِ ہند کی گمراہی کا باعث ہوگا ۔ اگر مولوی صا
نے میری تحریروں کو پڑھنے کی کبھی تکلیف گوارا فرمائی ہے
انھیں معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں نے اپنی عمر کا نصف حصہ اسلا
قومیت اور ملت کے اسلامی نقطۂ نظر کی تشریح و توضیح میں گذ
ہے ، محض اس وجہ سے کہ مجھ کو ایشیا کے لیے اور خصو
اسلام کے لیے فرنگی سیاست کا یہ نظریہ ایک خطرۂ عظیم محسو
ہوتا تھا ۔ کسی سیاسی جماعت کا پروپاگنڈا کرنا ، نہ میرا
سے پہلے مقصد تھا ، نہ آج مقصود ہے بلکہ وہ شخص جو دین
سیاسی پروپاگنڈا کا پردہ بناتا ہے ، میرے نزدیک لعنتی ہے[۱۲]

۱۲۔ مکتوبات شیخ الاسلام ، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ، ص ۱۳۹ و ۔
اور '' نظریہ قومیت ۔ ۔ ۔ ۔ مولانا حسین احمد مدنی اور عا
اقبال '' ، مرتبہ طالوت ، ص ۳۸ و ۳۹ ۔

یہ خط حضرت علامہ کی صاف باطنی اور صاف گوئی کی منہ بولتی تصویر ہے ! " قومیں اوطان سے بنتی ہیں " مولانا مدنی کی تقریر کا یہ فقرہ معرض بحث میں تھا ۔ یہ نکتہ کہ اس فقرہ میں مولانا کا مقصود صرف ایک امر واقعی کو " بیان " کرنا ہے یا " مشورہ " دینا ہے ۔ صرف اقبال کے ذہن رسا میں آیا ۔ اس نکتہ کو نہ تو مولانا نے بیان کیا تھا اور نہ جناب طالوت نے ۔ خود علامہ مرحوم کے ذہن میں اس اشکال کا پیدا ہونا اور مولانا سے اس کی وضاحت طلب کرنا ، ساتھ ہی یہ بھی لکھنا کہ " میں ان کے احترام میں کسی سے پیچھے نہیں ہوں " علامہ اقبال کی نیک نیتی اور صاف باطنی کی واضح دلیل ہے ۔

یاد رہے کہ یہ باتیں علامہ نے اس وقت لکھیں جب کہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے اور مولانا مدنی کے معتقدین "پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں" انہیں " گالیاں ۱۲۵ " دے رہے تھے ، لیکن گالیاں کھا کر بھی وہ " بے مزہ " نہ ہوئے بلکہ مولانا کا اکرام و احترام ہی کیا ! ـــــ یہ ان کی اعلیٰ ظرفی تھی ! !

" قومیں اوطان سے بنتی ہیں " مولانا کی تقریر کے اس فقرہ سے یہ بھی مترشح ہوتا تھا کہ وہ وطنی نظریہ کو قبول کرنے کا مشورہ مسلمانان ہند کو دے رہے ہیں ۔ اقبال نے دو ٹوک انداز میں لکھا کہ " اگر ان کا یہ مشوہ ہے تو میں اس مشورہ کو اپنے ایمان و دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف جانتا ہوں " یہ ان کی جرأت ایمانی اور صاف گوئی تھی ! اور ان کا ۹ مارچ کا مقالہ اسی صاف گوئی اور حرارت ایمانی کا مظہر تھا ! !

الغرض جناب طالوت نے حضرت علامہ کی ہدایت کے بموجب مولانا مدنی سے استفسار کیا کہ محولہ بالا فقرہ میں انہوں نے امر واقعہ کو بیان

۱۲۵- مکتوبات شیخ الاسلام ، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۰ اور " نظریہ قومیت ـ ـ ـ ـ مولانا حسین احمد مدنی و علامہ اقبال" ، مرتبہ طالوت ص ۴۸ ـ

کیا ہے یا مشورہ دیا ہے - جواب میں مولانا نے لکھا -

" موجود زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں - یہ اس زمانے کی جاری ہونے والی نظریت اور ذہنیت کی خبر ہے - یہاں یہ نہیں کہا جاتا ہے کہ تم کو ایسا کرنا چاہیے ، خبر ہے - انشا نہیں ہے - - - - - - پھر اس سے مشورہ کو نکال لینا کس قدر غلطی ہے[۱۲۶] "

اس خط کی نقل جناب طالوت نے علامہ مرحوم کے نام روانہ کر دی - اس کو پڑھنے کے بعد ڈاکٹر صاحب نے روز نامہ احسان لاہور ، مورخہ ۲۸ مارچ سنہ ۱۹۳۸ء میں ایک بیان شائع فرمایا ، جس میں آپ نے مولانا کے خط کے مندرجہ بالا اقتباس کا حوالہ دے کر لکھا -

" مولانا اس بات سے صاف انکار کرتے ہیں کہ انہوں نے مسلمانانِ ہند کو جدید نظریۂ قومیت کے اختیار کرنے کا مشورہ دیا - لہذا میں اس بات کا اعلان ضروری سمجھتا ہوں کہ مجھ کو مولانا کے اس اعتراف کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا - میں مولانا کے عقیدت مندوں کے جوشِ عقیدت کی قدر کرتا ہوں ، جنھوں نے ایک امرِ دینی کی توضیح کے صلہ میں پرائیویٹ خطوط اور پبلک تحریروں میں گالیاں دیں - خدائے تعالیٰ ان کو مولانا کی صحبت سے زیادہ مستفید کرے ، میں ان کو یقین دلاتا ہوں کہ مولانا کی حمیت دینی کے احترام میں میں ان کے کسی عقیدت مند سے پیچھے نہیں ہوں[۱۲۷] "

یہ گویا علامہ اقبال کی جانب سے اس بحث کے اختتام کا اعلان تھا - پھر اس کے ۲۳ دن بعد ہی ان کا انتقال ہو گیا ! علامہ کے حینِ حیات ہی بعض لوگوں نے اس مباحثہ کو کتابی شکل میں شائع کر دیا - مولانا مدنی اس پر خاموش نہ رہ سکے اور اپنا جواب الجواب تیار کرنا شروع کر

۱۲۶- مکتوباتِ شیخ الاسلام ، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۳۰ -
۱۲۷- ایضاً ص ۱۳۰ -

د یالیکن عین اس وقت جبکہ وہ اس کا مسودہ تیار کر رہے تھے ، علامہ مرحوم نے انتقال فرمایا ۔ پھر انھوں نے اس کی اشاعت کا خیال ترک کر دیا[۱۲۸] ۔ مگر چند ماہ بعد اس مسودہ کی تکمیل کی اور " متحدہ قومیت اور اسلام " کے نام سے ۹۷ صفحات کا ایک کتابچہ شائع فرمایا ۔ اس کتابچہ میں مولانا نے جو کچھ فرمایا وہ ہمارے موضوع سے خارج ہے ۔ پھر بھی یہ بات قابلِ گرفت ہے کہ .ولانا نے اس مسئلہ کو دوبارہ اس وقت چھیڑا جب کہ علامہ اقبال ، ان کا جواب دینے کے لیے اس دنیا میں موجود نہ تھے ! ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور اس سے زیادہ تکلیف دہ یہ بات ہے کہ ناشر اور خود مولانا نے اس کتابچہ میں علامہ مرحوم پر طنز و تعریض کی ! ناشر صاحب کی طنز کو دیکھئے ، جس کے ڈانڈے تضحیک سے جا ملتے ہیں ۔

" اچھا شاعر یا اچھا سیاس بن کر کوئی مسائلِ دینی میں دخل در معقولات کا اہل نہیں بن جاتا ! اور مسلمانوں کو سوچنا چاہیئے کہ انھیں کس طرح دھوکے میں ڈالا جا رہا ہے اور خالص دینی مسئلہ میں شاعرانہ بلند پروازی اور سیاسی چالوں کو دخل دے کر ان کی دنیا اور آخرت دونوں کو خراب کیا جا رہا ہے[۱۲۹] "

خیر یہ تو ناشر صاحب کی " عرض " تھی ۔ اب ذرا مولانا کا "فرمان" ملاحظہ کیجئے ۔ علامہ مرحوم کے " کمالات علمیہ و عملیہ "[۱۳۰] کی تعریف و توصیف کرنے کے بعد ، ارشادِ گرامی ہوتا ہے ۔

" مگر باوجود کمالاتِ گونا گوں ، ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلطیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے ۔

گاہ باشد کہ کودک نادان

بغلط بر ہدف زند تیرے[۱۳۰] "

---

۱۲۸ ۔ متحدہ قومیت اور اسلام ، مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ، ناشر کتب خانہ عزیزیہ دہلی ، ص ۳ ۔

۱۲۹ ۔ متحدہ قومیت اور اسلام ، مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ص ۵ ۔

۱۳۰ ۔ ایضاً ص ۹ ۔

علامہ اقبال کو " ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا " قرار دینا اور " کودکِ نادان " کے الفاظ کو ان پر چسپاں کرنا، مولانا کے شایانِ شان ہو یا نہ ہو ایک " مرحوم " کے ساتھ انصاف بہرحال نہیں ! ! ----
مولانا نے اس کتابچہ میں جو بحث فرمائی ہے ، اس کے متعلق اہلِ علم اور صاحبانِ فکر و نظر کوئی رائے قائم کر سکتے ہیں لیکن یہ بات قابلِ غور ہے کہ انھوں نے اپنے سابقہ مؤقف سے اس کتابچہ میں انحراف کیا ہے ۔ علامہ مرحوم نے اپنے مقالہ اور پھر اپنے خط مورخہ ۱۸ فروری میں یہ صراحت کر دی تھی کہ ان کا اعتراض متحدہ وطنی قومیت کے بطور امرِ واقعہ " بیان " کرنے پر نہیں بلکہ مسلمانانِ ہند کو اس کے اختیار کرنے کا " مشورہ " دینے پر ہے ۔ اس صراحت کے بعد ہی تو مولانا نے ارشاد فرمایا تھا کہ " یہ خبر ہے ، انشا نہیں ہے " یعنی امرِ واقعی کا اظہار مقصود تھا ، مشورہ دینا نہ تھا ۔ مولانا کی طرف سے اس مؤقف کی وضاحت کے بعد ہی علامہ مرحوم نے اپنے آخری اعلان میں فرمایا تھا کہ " مجھ کو مولانا کے اس " اعتراف " کے بعد کسی قسم کا کوئی حق ان پر اعتراض کرنے کا نہیں رہتا ۔ لیکن اپنے اس " اعتراف " کے باوجود ، علامہ اقبال کی وفات کے بعد اپنے اس کتابچہ کی ابتداء میں مولانا مدنی نے ارشاد فرمایا کہ

> " جناب ڈاکٹر صاحب موصوف مسلمانانِ ہند کو قومیت متحدہ کا مشورہ دینا خلافِ دیانت سمجھتے ہیں اور یہ امر چونکہ میرے نزدیک صحیح نہیں ، اس لیے مجھ کو کچھ عرض کرنا ضروری ہے [۱۳۱] "

یہ مولانا کا اپنے سابقہ مؤقف سے صریح انحراف تھا ! علامہ اقبال نے اپنے مقالہ اور ۱۸ فروری والے خط میں اس امر کی صراحت کر دی تھی کہ متحدہ قومیت کو اختیار کرنے کا مشورہ دینا ، " ان کے ایمان اور دیانت کی رو سے اسلام کی روح اور اس کے اساسی اصولوں کے خلاف ہے " اور مولانا

۱۳۱- " متحدہ قومیت اور اسلام " از مولانا حسین احمد مدنی ص ۱۰ -

نے وہ اعتراف علامہ مرحوم کے اس مقالہ اور خط کے مطالعہ کے بعد ہی کیا تھا۔ اگر ان کے نزدیک "یہ امر صحیح نہ تھا" تو اس کے معنی یہ ہیں کہ متحدہ قومیت کا مشورہ دینا ان کی نظر میں درست تھا۔ ایسی صورت میں اعتراف کی ضرورت ہی نہ تھی یا پھر وہ یہ فرماتے کہ دہلی کی تقریر میں، میں نے مسلمانانِ ہند کو متحدہ قومیت کو اختیار کرنے کا مشورہ نہیں دیا تھا۔ وہاں صرف اظہارِ واقعہ مقصود تھا، تاہم میں ایسے مشورہ کو خلافِ دیانت اور اسلامی تعلیمات کے رو سے ناجائز بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن مولانا نے یہ سب کچھ نہیں کہا بلکہ اس وقت صاف صاف "اعتراف" کر لیا کہ مشورہ نہ تھا۔ لیکن اب علامہ اقبال کے آخری اعلان اور ان کے انتقال کے بعد وہ یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ قومیت متحدہ کا مشورہ دینے کو وہ خلاف دیانت یا ناجائز نہیں سمجھتے! پھر اس مشورہ کو اسلامی تعلیمات کی رو سے جائز ثابت کرنے کے لیے اپنی علمیت کا پورا زور صرف کر دیتے ہیں!! ———— وہ "اعتراف" درست تھا یا یہ "انحراف"؟!

بسوخت عقل ز حیرت کہ ایں چہ بوالعجبیست

کتابچہ "متحدہ قومیت اور اسلام" کی اشاعت کے بعد تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ مولانا کا مؤقف وہی تھا، جس کے خلاف علامہ اقبال سراپا احتجاج بن گئے تھے۔ یعنی یہ کہ مولانا حسین احمد مدنی، متحدہ قومیت وطنی کے علمبردار تھے، وہ اس نظریہ کو اسلامی تعلیمات کے خلاف نہیں سمجھتے تھے اور مسلمانوں کو متحدہ قومیت ہندیہ میں شرکت کا مشورہ دیتے تھے۔ مولانا کے اسی نظریہ پر علامہ مرحوم نے شدید اعتراض کیا تھا اور ان کے اسی مشورہ پر انھوں نے اشعار ع عجم ہنوزنہ داند ـ ـ ـ الخ میں اپنے دلی کرب کا اظہار فرمایا تھا۔ یہ اشعار ان کی وفات کے بعد ان کے آخری مجموعہ کلام ارمغانِ حجاز میں شائع ہوئے اور آج تک شائع ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان کی اشاعت کے بارے میں مولانا مدنی کے معتقدین کو اعتراض رہا کہ۔

" باہمی خط و کتابت(الف) کے بعد ڈاکٹر صاحب نے خود کیوں نہ ہدایت کر دی کہ ارمغانِ حجاز سے یہ خرافات علیحدہ کر دی جائیں[۱۳۲] "

——— اور ایک روایت تو یہ بھی بیان کی جاتی ہے کہ علامہ مرحوم نے ان اشعار کو شائع کرنے کی ممانعت بھی فرمائی تھی ! واللہ اعلم بالصواب ! ! تاہم اگر حضرت علامہ نے ان کے اخراج کی ہدایت نہ فرمائی اور ان کے انتقال کے بعد یہ اشعار شائع ہوتے رہے تو یہ کوئی " غلط کاری " نہ تھی کیونکہ مولانا مدنی آخر دم تک متحدہ قومیت کا دم بھرتے رہے[۱۳۳] ، اور اپنے اسی مؤقف کو صحیح ثابت کرنے کے لیے ہی انھوں نے " متحدہ قومیت اور اسلام " نامی کتابچہ تحریر فرمایا تھا ! اگر علامہ مرحوم زندہ ہوتے اور ان افکار و نظریات کا مطالعہ فرماتے ، جو مولانا نے اپنی خود نوشت سوانح حیات اور اس کتابچہ میں ظاہر کیے ہیں تو یقین سے کہا جا سکتا ہے کہ وہ ان اشعار کو واپس لینا تو کجا ان سے زیادہ سخت الفاظ میں اپنے جذبات و احساسات کا اظہار فرماتے !

اس خالص علمی مباحثہ کے دوران علامہ اقبال کو ان کی زندگی کے آخری ایام میں ، جو ہدفِ تعریض و تضحیک بنایا گیا ، اس کا ذکر ہم کر آئے ہیں اور خود مولانا نے اپنے اسی کتابچہ میں اقبال کی رحلت پر اپنے رنج و ملال کا اظہار کرنے کے باوجود جب طنز کرنے سے اجتناب نہ فرمایا تو ان کے معتقدین خاموش کیسے رہتے - انھوں نے مرنے کے بعد

الف - اشارہ ہے اس خط و کتابت کی طرف ، جو طالوت صاحب کے توسط سے علامہ مرحوم اور مولانا مدنی میں ہوئی تھی جس کا ذکر گذشتہ صفحات میں آ چکا ہے - مصنف

۱۳۲- مکتوبات شیخ الاسلام ، جلد سوم ، مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۳۱ -

۱۳۳- مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح عمری " نقشِ حیات " جلد دوم ص ۱۵ -

ھی علامہ کو نہ بخشا ۔ مولانا مدنی کے مکتوبات کے مرتب مولانا نجم الدین صلاحی نے " مکتوبات شیخ الاسلام " کی تیسری جلد میں علامہ مرحوم کے خلاف اپنے دل کا غبار نکالا ہے اور " اقبال یا اقبال " کے زیر عنوان اقبال حمد صاحب سہیل ایڈوکیٹ کی نظم شائع کی[۱۳۳] ۔ جس میں محولہ بالا شعار کے حوالہ سے علامہ اقبال مرحوم کا مذاق اڑایا گیا ہے ! ۔ ۔ ۔ ۔ ب یہ اور بات ہے کہ سہیل کی یہ " تضحیک " کتابوں میں دفن ہو کر ہ گئی اور اقبال کی وہ " طنز " آج بھی سینوں میں زندہ ہے ۔

سچ ہے : ع قبولِ عام و لطفِ سخن خدا داد است !

لیکن بات اس سے بھی کہیں اونچی ہے ۔ اس طنز کے زندہ جاوید بن جانے کا واحد سبب اس کا آخری شعر ہے :

بمصطفیٰ بر ساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بو لہبیست !

اس شعر کی دینی افکار میں جو مستقل قدر و قیمت ہے ، اس کو صاحبانِ فکر و نظر ہی جانتے ہیں اور اس میں جو سوزِ عشق پنہاں ہے ، اسے کچھ " اہلِ دل " ہی سے پوچھیے ! !

نظر باز پسیں اقبال کی سیاسی زندگی کے تیسرے دور کی روئداد ختم ہو چکی اور اسی کے ساتھ ان کی سیاسی جد و جہد کی داستان کا آخری ورق بھی تمام ہوا ۔ آئیے اس تیسرے دور پر ایک اچٹتی ہوئی نظر ڈال لیں ۔

* ہم دیکھ چکے ہیں ملتِ اسلامیہٗ برصغیر نے گذشتہ ادوار میں صوبائی خود مختاری کے حصول کے لیے بڑی تگ و دو کی تھی ۔ اِس دور میں اسے یہ خود مختاری بڑی حد تک حاصل ہو گئی ۔

۱۳۳۔ مکتوبات شیخ الاسلام ، جلد سوم ، مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۰ تا ۱۴۳ ۔

نوٹ : " مکتوباتِ شیخ الاسلام " دراصل مولانا حسین احمد مدنی کے وہ خطوط ہیں جو انھوں نے مختلف اوقات میں تحریر فرمائے تھے ۔

مگر یہ خود مختاری اپنے جلو میں صوبائیت کی تحریک لیے ہوئے آئی ۔ تحریک یہ تھی کہ ہر صوبہ میں الگ، الگ مسلمان ، ہندو اور دیگر فرقوں کو ملا کر غیر فرقہ وارانہ جماعتیں بنائیں اور ان غیر فرقہ وارانہ جماعتوں کے ٹکٹ پر سنہ ۱۹۳۶ع کے صوبائی انتخابات لڑیں ۔ یہ تحریک بظاہر معصوم سی نظر آتی تھی لیکن اپنے عواقب و نتائج کے اعتبار سے تھی یہ نہایت خطرناک کیونکہ اس کی وجہ سے برصغیر کی ملتِ اسلامیہ صوبوں کی تنگنائیوں میں تقسیم ہو جاتی تھی ۔ پھر جب اس کی اجتماعی قوت اس طرح منتشر ہو جاتی تو وہ متحدہ ہندوستانی قومیت کا آسانی سے نرم نوالہ بن سکتی تھی ۔ مسٹر جناح کی سیاسی بصیرت کی داد دینی پڑتی ہے کہ انھوں نے اس تحریک میں پوشیدہ ، اس فتنہ کا سب سے پہلے ادراک کیا ! اقبال کی فکر بھی وہی تھی ، جو جناح کی تھی ۔ جناح کا تعلق تو کسی مسلم اکثریتی صوبے سے نہ تھا ۔ لہٰذا وہ اس تحریک کی فتنہ سامانیوں کا اندازہ آزادانہ طور پر لگا سکتے تھے ۔ مگر اقبال کا تعلق پنجاب سے تھا ، جو اس تحریک کا گڑھ تھا ۔ تاہم ان کا نقطہ نظر شروع ہی سے مِلّی تھا ۔ صوبائی نہ تھا ! اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ اس دور میں ان دو عظیم شخصیتوں کی فکر ہم آہنگ تھی !

* سنہ ۱۹۳۶ع میں مسٹر جناح ساٹھ سال کے ہو چکے تھے ، لیکن ان کی ہمت جوان تھی ۔ صوبائیت کے اس فتنہ کا قلع قمع کرنے اور ملت کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے انھوں نے کمر کس لی ۔ مسلم لیگ کے احیاء کے لیے انھوں نے برصغیر کے ایک ایک گوشہ کی خاک چھانی اور ہر چھوٹے بڑے کے در پر صدا لگائی ۔ یہ ان کے کردار کی عظمت تھی ، تاہم صدائے برنخواست! ان کی آواز پر لبیک کہی تو صرف ایک مردِ قلندر ، اقبال نے ! وہ بھی ساٹھ کے پیٹے میں تھے اور جان لیوا بیماری سے نحیف و نزار ، تاہم انھوں نے تساہل یا تامل سے کام نہیں لیا ، معاملہ کی نزاکت کا احساس کیا ، قائد اعظم کی قیادت کو تسلیم کیا اور

عملاً ان کی جد و جہد میں شریک ہو گئیے - یہی ان کے کردار کی بلندی تھی ! ـــــــــ گویا اس دور میں ملت کا کاروان ، صوبائی سیاست کی تنگنائیوں میں پھنس چکا تھا اور متحدہ قومیت کے نرغہ میں گھرنے ہی کو تھا کہ سالار کارواں نے ، اس کی عنانِ قیادت سنبھال لی اور ملت کے حدی خوان نے آواز لگائی -

تسبیح کے دانے ہو بکھرنا نہ خبردار !
مسلم لیگ تمہارا مرکز ہے اور جناح تمہارا قائد !

یہ تھی اقبال کی بانگِ درا ، صوبائی سیاست کی تنگنائیوں میں ! !

* وہ اس دور کے نقیب و حدی خواں ہی نہ تھے ، قائد کے مشیر و ندیم بھی بنے اور اسی حیثیت سے انھوں نے بڑے مفید اور تعمیری مشورے دئے - پھر صوبائیت کے خلاف ملت کی اس جنگ میں ، جو قائد اعظم کی قیادت میں لڑی جا رہی تھی - پنجاب کے سیاسی محاذ کی کمان ، انھوں نے خود سنبھال لی - باوجود خرابیٔ صحت ، صوبائی ملسم لیگ کی صدارت کا بارِ گراں اٹھایا ، اس کو اپنی نگرانی و رہنمائی میں فعّال بنایا - صوبائی پارلیمانی بورڈ کی تشکیل کی اور صوبائیت کی علمبردار ، صاحبِ اقتدار جماعت یونینسٹ پارٹی سے ٹکر لی ! مسجدِ شہید گنج کے قضیہ میں پورا انہماک دکھایا اور یونینسٹ پارٹی کی دھاندلیوں کے باوجود اس مسئلہ کو صحیح طریقہ پر حل کرانے کی جدوجہد کی - اقبال نے مسلم لیگ کے محاذ سے یونینسٹ پارٹی کے قلعہ پر اس زمانے میں جو گولہ باری کی ، اس کی وجہ سے اس کی بنیادیں ہل گئیں ، ورنہ غالباً سنہ ۱۹۴۶ء میں قائد اعظم کو اس کے سر کرنے میں بڑی دقتیں پیش آتیں ! ـــــــــ اس طرح اس دور میں ان دونوں کی فکر ہی نہیں ، عمل میں بھی مکمل ہم آہنگی نظر آتی ہے ! !

* اقبال نے اس تیسرے دور میں یہ سب کچھ کیا اور یہ سب کارنامے بجائے خود بہت اہم اور شاندار ہیں - لیکن ان سب سے بڑھ کر یہ کہ انھوں نے اسی دور میں واضح طور پر ، پورے

اعتماد کے ساتھ لیکن چپکے سے میرِ کارواں کو اس قافلہ کی منزلِ مقصود ــــــ مسلم صوبوں کے جداگانہ وفاق یا برصغیر میں ایک " متحدہ آزاد مسلم ممالکت " ــــــ کا پتہ بتا دیا ۔ پھر انھوں نے اس مملکت کو اسلامی خطوط پر چلانے کے لیے ایک منصوبے ــــــ ادارۂ دارالسلام ــــــ کو نہ صرف پیش کیا بلکہ اس کی تشکیل کی طرف عملی قدم اٹھایا ! یوں اقبال کی بانگِ درا اور عملی تگ و تاز نے ملت کو سیاست کی تنگنائیوں سے نکالا ، ایک مرکز پر جمع کیا اور رہبرِ فرزانہ کی قیادت میں اس کو منزل کی طرف جادہ پیما کر دیا !

* یہ ایک عجیب و غریب بات یا حسن اتفاق ہے کہ اقبال کی سیاسی جدوجہد کا آغاز جس نقطہ سے ہوا تھا ، اسی پر اس کا اختتام بھی ہوا ۔ وہ سیاست کے میدان میں کانگریس کی متحدہ وطنی قومیت کے خلاف نعرہ لگاتے ہوئے اور مسلم قومیت کا آوازہ بلند کرتے ہوئے داخل ہوئے اور مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ " ملت از وطن است " کے پرخچے اڑاتے ہوئے اور " قومیت از دین است " کا غلغلہ بلند کرتے ہوئے رخصت ہوئے !!

حوالہ جات باب ۶

۱۔ " شاہراہِ پاکستان " از چودھری خلیق الزماں ، اشاعت اول مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۷ع ص ۶۰۱ و ۶۰۲ ۔

۲۔ انڈین اینول رجسٹر جلد اول سنہ ۱۹۳۷ع ۔

۳۔ ایضاً ۴۔ ایضاً ۵۔ ایضاً

۶۔ قانونِ دستورِ حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع ، ضمیمہ نمبر ۱ برائے باب چہارم دفعہ نمبر ۷

۷- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور ص ۳۶۱
۸- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۷
۹- انڈین اینول رجسٹر جلد اول سنہ ۱۹۳۷ء
۱۰- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۱ و ۱۲
۱۱- ایضاً ص ۱۵
۱۲- ایضاً ص ۱۶
۱۳- ایضاً ص ۱۸ تا ۲۳
۱۴- ایضاً ص ۱۶ تا ۱۸
۱۵- ایضاً ص ۱۸
۱۶- ایضاً ص ۱۸
۱۷- ایضاً ص ۲۲
۱۸- ایضاً ص ۲۲
۱۹- ایضاً ص ۲۲
۲۰- ایضاً ص ۲۳
۲۱- ایضاً ص ۲۳
۲۲- ایضاً ص ۲۴
۲۳- ایضاً ص ۲۲
۲۴- ایضاً ص ۲۷
۲۵- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۲۵
۲۶- ایضاً ص ۲۶
۲۷- ایضاً ص ۲۶
۲۸- ایضاً ص ۱ و ۲
۲۹- ایضاً ص ۳
۳۰- ایضاً ص ۴ و ۵
۳۱- سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، جلد دوم مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ء ص ۲۳۲
۳۲- آثارِ اقبال ، مرتبہ غلام دستگیر رشید مطبوعہ حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۴۶ء ص ۴۱ و ۴۲
۳۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۹
۳۴- " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۶۱ ص ۵۴۸ تا ۵۵۰
۳۵- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۱۵۲
۳۶- ایضاً ص ۱۵۳
۳۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۲۴

۳۸- ایضاً ص ۳۰۶ و ۳۰۷
۳۹- ایضاً ص ۲۷۹ و ۲۸۰
۴۰- ایضاً ص ۱۵۴
۴۱- ایضاً ص ۱۵۵
۴۲- ایضاً ص ۳۱۲
۴۳- ایضاً ص ۱۷۵
۴۴- ایضاً ص ۳۸۳
۴۵- ایضاً ص ۳۱۷
۴۶- ایضاً ص ۳۱۸ و ۳۱۹
۴۷- ایضاً ص ۳۲۱
۴۸- اخبار زمیندار لاہور مورخہ ۲۳ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ع
۴۹- اخبار زمیندار لاہور مورخہ ۲۸ اکتوبر سنہ ۱۹۲۶ع
۵۰- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۹
۵۱- ایضاً ص ۸۰ و ۸۱
۵۲- ایضاً ص ۳۱۵
۵۳- ایضاً ص ۳۸۳
۵۴- " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۳۰۷
۵۵- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۰۹
۵۶- ایضاً ص ۳۱۰
۵۷- روز نامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور مورخہ ۹ مئی سنہ ۱۹۳۶ع
۵۸- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ص ۶
۵۹- گفتارِ اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ناشر ادارۂ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور ص ۲۰۴ و ۲۰۵
۶۰- روز نامہ امروز کراچی کا اقبال نمبر مورخہ ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع
۶۱- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۲۱
۶۲- ایضاً ص ۳۱۲
۶۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ص ۹
۶۴- ایضاً ص ۹ و ۱۰
۶۵- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ص ۱۰
۶۶- " اقبال کے آخری دو سال " از ڈاکٹر حسین عاشق بٹالوی ص ۳۳۱ تا ۳۳۳

۶۷- ایضاً ص ۳۴۲ ۶۸- ایضاً ص ۳۵۳
۶۹- روز نامہ امروز کراچی اقبال نمبر مورخہ ۲۲ اپریل ۱۹۵۰ع
۷۰- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۳۶۸
۷۱- "سیاست ملیہ" از محمد امین زبیری ص ۳۳۲ و ۳۳۳ اور اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۳۸۷ و ۳۸۸
۷۲- سول اینڈ ملٹری گزٹ مورخہ ۱۷ اکتوبر اور لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۱۰۵ و ۱۰۶
۷۳- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۱۰۶
۷۴- ایضاً ص ۱۰۷ و ۱۰۸ ۷۵- ایضاً ص ۲۷
۷۶- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۳۰ و ۳۱
۷۷- روز نامہ امروز کراچی ، اقبال نمبر ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع ص ۱۰ تا ۱۹ اور لیٹرز اینڈ رائٹنگ آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۱۱۲ تا ۱۱۴
۷۸- روز نامہ امروز کراچی ، اقبال نمبر ۲۲ اپریل سنہ ۱۹۵۰ع ص ۱۰ و ۱۹
۷۹- رسالہ اردو اقبال نمبر سنہ ۱۹۳۸ع طبع جدید ص ۳۳۱
۸۰- اقبال کے آخری دو سال از ڈاکٹر عاشق حسین بٹالوی ص ۵۵۳
۸۱- ایضاً ص ۵۸۴ ۸۲- ایضاً ص ۶۱۳ تا ۶۱۶
۸۳- ایضاً ص ۶۲۷ و ۶۲۸ ۸۴- ایضاً ص ۶۳۷
۸۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱
۸۶- رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۳۱۸
۸۷- مکاتیبِ اقبال (اقبال نامہ) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاءاللہ ص ۵۰ و ۵۱
۸۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۶۰ و ۶۱
۸۹- ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور ص ۷۵
۹۰- ایضاً ص ۷۵
۹۱- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۵۱ و ۲۵۲

۹۲- " مکتوبات شیخ الاسلام " جلد سوم مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ناشر مکتبہ دینیہ دیوبند مطبوعہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ء ص ۱۲ اور " نظریہ قومیت —— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال " مرتبہ طالوت ناشر کتب خانہ قاسمیہ لدھیانہ ص ۲۰

۹۳- " مکتوبات شیخ الاسلام " جلد سوم مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۴ اور نظریہ قومیت ——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۱ و ۲۲

۹۴- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۵ اور نظریہ قومیت——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۱ و ۲۲

۹۵- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی مطبوعہ اشرف پریس لاہور مئی سنہ ۱۹۶۳ء ص ۲۳

۹۶- مکتوبات شیخ الاسلام ، جلد سوم مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۵ تا ۱۲۶ و " نظریہ قومیت —— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال " مرتبہ طالوت ص ۲۲ و ۲۳ و ۲۴

۹۷- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۸ و ۲۲۹

۹۸- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ مولانا نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۶ و ۱۲۷ و " نظریہ قومیت —— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال " مرتبہ طالوت ص ۲۴ و ۲۵

۹۹- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۶ اور " نظریہ قومیت —— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۲۳

۱۰۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۸ و مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۶ و ۲۲۷

۱۰۱- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۹ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۱

۱۰۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۱ تا ۲۳۳ و مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۰ و ۲۳۱

۱۰۳- مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۱
۱۰۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۳ و ۲۳۴ اور مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۱ و ۲۳۲
۱۰۵- "مکتوباتِ شیخ الاسلام" جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۷
۱۰۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۷ و ۲۳۸ اور مقالاتِ اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۵ و ۲۳۶
۱۰۷- مکتوباتِ شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۲۷ و ۱۲۸ اور "نظریہ قومیت ——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال" مرتبہ طالوت ص ۲۶ و ۲۷
۱۰۸- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۲
۱۰۹- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۴
۱۱۰- ایضاً ص ۲۲۵
۱۱۱- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۲ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۴
۱۱۲- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۵ و ۲۲۶ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۸
۱۱۳- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۴ اور اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۶ و ۲۳۷
۱۱۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۶ اور مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۴ و ۲۲۵
۱۱۵- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۲۳
۱۱۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲۵ اور مقالاتِ اقبال ص ۲۲۳ و ۲۲۴
۱۱۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۵ اور مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۲ و ۲۳۳
۱۱۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۵ اور مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۳

۱۱۹- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۳
۱۲۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۵ اور مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۳
۱۲۱- مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی ص ۲۳۷
۱۲۲- رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۲۳۵
۱۲۳- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۳۷ و نظریہ قومیت ——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۳۶
۱۲۴- مکتوبات شیخ الاسلام مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۳۹ و ۱۴۰ اور "نظریہ قومیت ——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال" مرتبہ طالوت ص ۳۸ و ۳۹
۱۲۵- مکتوبات شیخ الاسلام مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۰ اور نظریہ قومیت ——— مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال مرتبہ طالوت ص ۳۸
۱۲۶- مکتوبات شیخ الاسلام مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۰
۱۲۷- ایضاً ص ۱۴۰
۱۲۸- متحدہ قومیت اور اسلام مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ناشر کتب خانہ عزیزیہ دہلی ص ۳
۱۲۹- متحدہ قومیت اور اسلام مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ص ۵
۱۳۰- ایضاً ص ۹
۱۳۱- متحدہ قومیت اور اسلام مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ص ۱۰
۱۳۲- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۱
۱۳۳- نقش حیات جلد دوم مصنفہ مولانا حسین احمد مدنی ص ۱۵
۱۳۴- مکتوبات شیخ الاسلام جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ص ۱۴۰ تا ۱۴۳

باب ۷

چند اعتراضات اور ان کے جوابات

خوش نصیب شاعر ، بد نصیب سیاست داں | مشاہیر کو ہمیشہ اپنی زندگی ہی میں مدح و قدح دونوں سے سابقہ رہا ۔ اعتراضات کس پر نہیں کیے گئے؟ الزامات کا ہدف کس کس کو نہیں بنایا گیا ؟ دنیا نے کب متحداللّسان ہو کر کسی کے بارے میں ایک رائے قائم کی ہے؟ معصوموں پیغمبروں اور ولیوں کو اس نے نہ چھوڑا تو اقبال کیسے بچ سکتے تھے؟ پھر وہ زندگی ہی کیا ، جس پر تنقید کی کوئی گنجائش نہ ہو ؟ !

ہو سکتا ہے کہ انسان کی زندگی کے بعض پہلوؤں میں کوئی عیب نہ نکالا جا سکے ، کسی کے اخلاق ، عادات طریق معاشرت ، طرز معیشت کے متعلق ممکن ہے کہ ہر شخص ایک ہی رائے رکھے —— لیکن زندگی کا ایک میدان ایسا بھی ہے جس کے متعلق کبھی دو اشخاص کی رائے میں اتفاق نہ ہو سکا ، اور وہ ہے سیاسیات کی خار زار وادی ! دور سے جس نے اس کا نظارہ کیا ، اس کو ہمیشہ دھوکا جنتِ نظر ہی کا ہوا ، لیکن جب کبھی کسی نے اس وادی کا رخ کیا ، اس کو ہر ہر قدم پر سابقہ کانٹوں ہی سے پڑا !

یہ دور ایک لحاظ سے اقبال ہی کا دور ہے ۔ اقبال نے ہند پر اور خصوصاً ہند کی نوجوان نسل پر جو اثرات چھوڑے ہیں ، ان کا احاطہ ممکن ہی نہیں ۔ اگر موجودہ نوجوان نسل کے ذہن ، دماغ کا کوئی نقشہ تیار کیا جا سکے ، تو اس میں اقبال کے نقش و نگار کو با آسانی دیکھا جا سکتا ہے ۔

ان کی صدائے دلنواز نے لاکھوں کو اپنی طرف کھینچا ، اور ان کی شعلہ نوائی نے کروڑوں کے دلوں میں آگ لگا دی لیکن وہ خود بھی اپنے آپ کو تنقید کی آگ سے بچا نہ سکے۔ اپنی زندگی ہی میں انھوں نے اپنی تعریف بھی سنی اور تنقیص بھی ۔ ان کے سر پر تحسین و آفرین کے پھول بھی برسائے گئے اور ان پر طنز و تعریض کی بوچھاڑ بھی کی گئی اور اس طنز و تعریض کا موضوع ان کی "شاعری" سے زیادہ ان کی "سیاست" رہا ۔ شاعری نے انھیں قبولِ عام کا تاج پہنایا ۔ سیاست نے بعض اشخاص کی نظروں میں انھیں رسوا سرِ بازار کیا ۔ اکثروں نے شاعر اقبال کو ستاروں پر کمند ڈالتے دیکھا ، اور بعضوں نے سیاست داں اقبال کو سنگ ریزے چنتے ہوئے پایا ! ——— خوش نصیب شاعر ، بد نصیب سیاست داں ! !

انگریز کا دوست ، وطن کا دشمن ، سرمایہ داروں کا حامی ، غریبوں کا مخالف ، فرقہ پرست ، ٹو ڈی ، رجعت پسند — — — — یہ ہے وہ فردِ قراردادِ جرم جو اقبال پر اس کی زندگی ہی میں لگ چکی تھی ۔ جذبات کے عالم میں دماغی توازن کا برقرار رکھنا ، اگر محال نہیں تو دشوار ضرور ہے ۔ اقبال نے جس زمانہ میں سیاست کی خار زار وادی میں قدم رکھا ، طوفان کے جھکڑ چل رہے تھے ، جذبات کا تلاطم برپا تھا ——— ایسے وقت میں توازن و عدل کا سوال ہی کیا تھا ؟ عدل و انصاف تو اسی وقت ممکن ہے ، جبکہ ذہن نعرے لگائے بغیر سوچنے پر آمادہ ہو ! آج جب کہ اس زمانے کے واقعات تاریخ کا ایک جزو بن چکے ہیں ، فضا میں ایک سکون سا پیدا ہو چکا ہے ، دلوں میں جذبات کے تلاطم کی بجائے غور و فکر کی سکون آشنا موجیں لہریں لے رہی ہیں ، ذہنوں پر ہیجان خیز نعروں کی بجائے تحقیق و تلاش کی فضاء چھائی ہوئی ہے ، حق و صداقت کی عدالت میں اقبال کی داد رسی ممکن ہے ۔

الزامات کی اس طویل فہرست کے تین ہی جلی عنوانات قرار دئے جا سکتے ہیں ۔

(الف) انگریز دوستی

" یہ امر یقینی اور غیر قابل انکار ہے کہ جناب ڈاکٹر صاحب کی

ہستی کوئی معمولی ہستی نہیں تھی ۔ اور ان کے کمالات بھی غیر معمولی تھے —— وہ آسمانِ حکمت و فلسفہ ، شعر و سخن تحریر و تقریر ، دل و دماغ و دیگر کمالاتِ علمیہ و عملیہ کے درخشاں آفتاب تھے ۔ مگر باوجود کمالاتِ گونا گوں ساحرینِ برطانیہ کے سحر میں مبتلا ہو جانا یا بعض غلط فہمیوں میں پڑ جانا اور کسی ابجد خواں طالب علم کا اس سے محفوظ رہنا کوئی تعجب خیز بات نہیں ہے[۱] "

یہ ایک نمونہ ہے ان الزامات کا جو ڈاکٹر صاحب پر انگریز دوستی کے سلسلے میں لگائے جاتے ہیں ۔ وہ جس نے کہا تھا ،

ع "ساحرِ انگلش" ما را خواجہٴ دیگر تراش

خود ہی "ساحرین برطانیہ کے سحر میں مبتلا" ہو گیا ! جس کے کلام نے ایک عالم کے دل میں آزادی کے شعلے کو فروزاں کر دیا تھا ، وہ خود انگریز کی غلامی پہ رضا مند اور اس کے بتائے ہوئے نظام کو مضبوط کرنے والا بن گیا ۔ اسی نے تو کہا تھا ،

بھروسہ کر نہیں سکتے غلاموں کی بصیرت پر
کہ دنیا میں فقط مردانِ حُر کی آنکھ ہے بینا

اسی کے نغمہ و شعر سے آزادی کے وہ نعرے بلند ہوئے ، جنھوں نے ڈاوننگ اسٹریٹ اور قصر بکنگھم میں زلزلے ڈال دئے تھے ۔ خود اس کو بھی اپنی ان زلزلہ فگن نواؤں کا احساس تھا ، —— تب ہی تو اس نے کہا تھا ،

پردہ اٹھا دوں اگر عالم افکار سے
لا نہ سکے گا فرنگ میری نواؤں کی تاب

اس نے اس فرنگی نظام کے رازہائے دروں کا اس قدر برملا اظہار کیا

۱۔ "متحدہ قومیت اور اسلام" از مولانا حسین احمد مدنی ، ناشر کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار ، جامع مسجد دہلی ص ۹ ۔

تھا کہ یہ اظہار عتابِ ملوک کے لیے بہانہ بن گیا ،

اسی خطا سے عتابِ ملوک ہے مجھ پر
کہ جانتا ہوں مآلِ سکندری کیا ہے

وہ زندگی کے راز ہائے سر بستہ سے واقف تھا ۔ اس کے نزدیک زندگی عبارت تھی آزادی سے ۔ خود کہتا ہے ،

بندگی میں گھٹ کے رہ جاتی ہے ایک جوئے کم آب
اور آزادی میں بحرِ بیکراں ہے زندگی

——— لیکن پھر بھی کہنے والے کہتے ہیں کہ اقبال انگریزوں کی غلامی پر قانع اور ان کی دوستی کا دم بھرا کرتا تھا ! یہ تو استغاثہ کا بیان ابتدائی تھا ۔ اب ذرا دلائل بھی سن لیجئے ۔

(۱) اقبال کی انگریز دوستی اور برطانوی استعمار کی اطاعت کے ثبوت میں جو پہلی دلیل پیش کی جاتی ہے ، وہ ان کی خطاب یابی کا واقعہ ہے ۔ جنوری سنہ ۱۹۲۳ع میں ڈاکٹر صاحب کو انگریزی حکومت کی جانب سے "سر" کا خطاب دیا گیا تھا ۔ اس سے کچھ ہی عرصہ پہلے تحریکِ ترکِ تعاون اپنے شباب پر تھی ، انگریزی مال کا بائیکاٹ کیا جا چکا تھا ۔ سرکاری ملازمتیں چھوڑ دی گئی تھیں ، خطابات واپس کیے جا چکے تھے ۔ اس لیے اس واقعہ خطاب یابی کے بعد ہی اقبال کے خلاف اخبارات میں ایک شور محشر برپا ہو گیا ۔ طنز و تعریض کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا ۔ بعض من چلے شعراء نے ان کی ہجو کہی ۔ ان ہی میں اقبال کے دوست اور ملاقاتی عبدالمجید سالک بھی تھے جنھوں نے ایک پوری نظم لکھ ڈالی ۔ جس کا چبھتا ہوا مصرع تھا "سرکار کی دھلیز پر سر ہو گئے اقبال" ——— بعض مخلص دوستوں کو بھی یہ اندیشہ ہو چلا تھا کہ اقبال نے گویا نائٹ ہڈ کو قبول کر کے اپنی آزادی ، جرأت و بے باکی کا گلا خود اپنے ہی ہاتھوں گھونٹ دیا ہے ! چنانچہ میر غلام بھیک نیرنگ سے رہا نہ گیا اور بالآخر انھوں نے اپنے ایک خط میں اپنے اس اندیشہ کا اظہار کیا ، جواب میں حضرت علامہ نے انھیں حسب ذیل خط لکھا ۔

" آپ کا خط ابھی ملا ، جس کے لیے سراپا سپاس ہوں ۔ میں آپ کو اس اعزاز کی خود اطلاع دیتا ، مگر جس دنیا کے میں اور آپ رہنے والے ہیں ، اس دنیا میں اس قسم کے واقعات احساس سے فروتر ہیں ، سینکڑوں خطوط اور تار آ رہے ہیں اور مجھے تعجب ہو رہا ہے کہ لوگ ان کو کیوں گرانقدر جانتے ہیں ۔ باقی رہا وہ خطرہ جس کا آپ کے قلب کو احساس ہوا ہے ، سو قسم ہے خدائے ذوالجلال کی جس کے قبضہ میں میری جان اور آبرو ہے اور قسم ہے اس بزرگ و برتر وجود کی جس کے ذریعہ سے مجھ کو خدا پر ایمان نصیب ہوا اور مسلمان کہلاتا ہوں ، دنیا کی کوئی طاقت مجھے حق کہنے سے باز نہیں رکھ سکتی ، انشاء اللہ ۔ اقبال کی زندگی مومنانہ نہیں ، اس کا دل مومن ہے[۲] "

اس خط سے دو باتوں پر روشنی پڑتی ہے ۔ ایک تو یہ کہ خود حضرتِ علامہ اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہیں دیتے ہیں ۔ نہ صرف یہ کہ اس واقعہ کی ان کی نظر میں کوئی اہمیت نہیں ہے بلکہ وہ مبارکباد کے تار و خطوط بھیجنے والوں کی ذہنیت پر اظہار تعجب بھی کرتے ہیں ۔ دوسری بات جو اس خط سے ظاہر ہوتی ہے وہ ان کا عزمِ آزادی ہے ۔ اس خط کے آخری فقرہ میں کس قدر درد و تاثر بھرا ہوا ہے اور کتنے بلند عزائم ارادوں کا اظہار ہو رہا ہے ! جتنے شد و مد کے ساتھ انھوں نے اس خط میں اپنی حق گوئی اور آزادی کے عزم کا اظہار کیا ، اسی قدر شدت کے ساتھ وہ اپنی آئندہ زندگی میں اس پر کاربند بھی رہے ۔

یہ واقعہ ہے کہ حکومت نے انھیں سر کا خطاب دیا اور انھوں نے اس کو قبول بھی کر لیا لیکن مجرد اس واقعہ سے یہ بات کیسے ثابت ہو جاتی ہے کہ اقبال نے اپنی آزادی کا اس خطاب سے سودا کیا تھا ؟ کیا خطاب یابی سے قبل ان کی زندگی کے کسی واقعہ سے یہ ثابت کیا جا سکتا

۲۔ مکاتیب اقبال حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص ۲۰۶ و ۲۰۷

ہے کہ انھوں نے حکومت وقت کو خوش کرنے کی کوشش کی اور حکومت نے اس خدمت کے معاوضہ میں انھیں یہ انعام عطا کیا ؟ ان کا بدترین مخالف بھی ان کے سوانح زندگی کو پوری طرح کریدنے کے بعد کسی ایسے واقعہ کی نشاندہی سے قاصر ہے ! ——— پھر یہ بھی تو دیکھئے کہ حکومت نے اس خطاب سے ڈاکٹر صاحب کو سرفراز کیوں کیا تھا ؟ کیا محض اس لیے کہ وہ ان کا منہ بند کرنا چاہتی تھی ؟ انگریز دشمنی ، سامراج بیزاری کے جذباتی دور میں شاید اس بات کو ہر شخص بغیر کسی تحقیق و تفحص کے آنکھ بند کرکے قبول کر لیتا ، لیکن آج تو انگریز جا چکا ہے ، اس کی برائیاں اور بھلائیاں دونوں ہمارے سامنے ہیں اور ایک انصاف پسند قوم کی طرح ہم اپنے اذہان کو تعصب و جانبداری کے جذبات سے متاثر کیے بغیر اس کی پالیسی کے متعلق صحیح رائے قائم کر سکتے ہیں -

برطانوی حکومت نے جس زمانے میں خطاب دیا تھا ، اس سے قبل اقبال کی علمی شہرت یورپ کے دور دراز گوشوں میں پھیل چکی تھی - ان کی قابلیت کا سکہ انگلستان کے علمی اداروں پر بیٹھ چکا تھا - ان کے فلسفہ اور شاعری کا ڈنکا مشرق و مغرب میں بج رہا تھا - سنہ ۱۹۱۹ع میں پروفیسر نکلسن نے اسرار خودی کا ترجمہ شائع کیا اور اس کے بعد ہی یورپ کے مشہور اہل علم ڈاکٹر صاحب کے پیام و کلام کی طرف متوجہ ہو گئے ، چنانچہ مشہور نقاد ادب مسٹر ایم - اے فارسٹر نے انگلستان کے نامور و مقبول ادبی جریدہ ایتھنم میں مثنوی پر ایک مفصل تنقید شائع کی ، پھر کیمبرج کے پروفیسر ڈکنس نے رسالہ نیشن ہفتہ وار میں ایک تبصرہ لکھا - الغرض اسرار خودی کے ترجمے اور اس پر تنقید و تبصرہ کی وجہ سے ممالک اسلامیہ اور یورپ کے علمی ادبی حلقوں میں علامہ اقبال کا نام عزت و احترام سے لیا جانے لگا - ان کی اس عزت و شہرت کا اندازہ حسب ذیل واقعہ سے لگایا جا سکتا ہے جس کو مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر نے ملفوظات اقبال میں قلمبند کیا ہے - وہ لکھتے ہیں -

” خطاب کے ملنے سے کچھ عرصہ پیشتر انگلستان کا ایک مشہور اخبار نویس جو ادبی دنیا میں کافی شہرت رکھتا تھا ، ممالک

اسلامی کی سیر و سیاحت کے بعد افغانستان کی طرف سے ہندوستان میں داخل ہوا اور گورنر پنجاب کا مہمان ہوا۔ اسے ترکی سے لیکر افغانستان تک جس اسلامی قلم رو سے گذرنے کا اتفاق ہوا تھا ، ڈاکٹر صاحب کا نام ہر جگہ آپ سننے میں آیا تھا۔ لاہور پہنچتے ہی اس نے ڈاکٹر صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی ، مگر ارباب حکومت چونکہ ہمارے ادبی مشاہیر سے بے خبر اور ان کے کارناموں سے نا آشنا ہوتے ہیں ، اس لیے کچھ تعجب نہیں کہ اگر گورنر پنجاب اقبال کی عظمت سے ناواقف ہو۔ تاہم اخبار نویس نے انھیں مجبور کیا کہ وہ ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں چائے پر مدعو کرکے اسے ان کی صحبت سے مستفید ہونے کا موقع بہم پہنچائے۔ اس پر ڈاکٹر صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس میں تشریف لانے کی دعوت دی گئی مگر ان کی مثال تو زمین جنبد نہ جنبد گل محمد کی سی تھی۔ کہنے لگے ، کون جائے ، پاؤں کے انگوٹھے میں کئی دن سے درد ہے۔ میں نے اصرار کیا کہ وہ ضرور جائیں۔ پہلے تو اپنی ضد پر اڑے رہے ، مگر بعد میں چلنے کے لیے تیار ہو گئے اور میں انھیں اپنی گاڑی میں سوار کرکے خود گورنمنٹ ہاؤس تک پہنچا کر آیا۔ واپسی پر وہ سیدھے میرے ہاں تشریف لائے اور متذکرہ بالا واقعہ من و عن سنایا[۳]

اس واقعہ کو فقیر سید وحید الدین نے اقبال کی زبانی اس طرح بیان کیا ہے۔

" پنجاب کے چیف جسٹس سر شادی لال نے مجھے بلا کر کہا ، مجھ سے گورنمنٹ نے خطابات کے لیے سفارشیں طلب کی ہیں اور میں تمھارا نام خان صاحب کے خطاب کے لیے تجویز کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے کہا ، اپنے لیے کوئی خطاب نہیں چاہتا آپ زحمت نہ فرمائیے۔ وہ کہنے لگے۔ اس قدر جلد فیصلہ نہ کرو ، بلکہ پہلے

۳۔ ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ لاہور بار اول ص ۹۷۔

اچھی طرح غور کر لو ۔ میں نے کہا ، میں غور کر چکا ۔ مجھے خطاب کی ضرورت نہیں ۔ دو تین دن بعد پھر شادی لال کا پیغام ملا کہ مجھ سے مل جاؤ ۔ میں نے پیغام بر کی زبانی کہلا بھیجا کہ خطاب کے سلسلے میں مجھ سے گفتگو کرنا بے سود ہے ، کیونکہ میں جو فیصلہ ، ایک بار کر چکا ، سو کر چکا ۔ ہاں ، اگر کوئی اور بات ہے تو مجھے آپ سے ملاقات کرنے میں کوئی عذر نہیں ۔ اس واقعہ کو کچھ دن گزرے تھے کہ میکلگن صاحب، گورنر پنجاب نے مجھے بلا بھیجا ۔ بڑے تپاک سے ملے اور کہنے لگے آئیے ، آپ کو اپنے ایک دوست سے ملواؤں ۔ ایک انگریز ان دنوں لاہور آیا ہوا تھا ۔ اس نے میرا نام سن رکھا تھا ۔ انگریزی میں اسرار خودی کا ترجمہ بھی پڑھا تھا ۔ وہ گورنمنٹ ہاؤس میں ٹھہرا تھا اور مجھ سے ملنا چاہتا تھا اس نے ایک کتاب لکھی تھی ۔ اس کے متعلق میری رائے معلوم کرنا چاہتا تھا ۔ غرض کافی دیر تک صحبت رہی ۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو ایک شخص یہ پیغام لیکر آیا کہ گورنر صاحب نے کہا ہے ، مجھ سے ملتے ہوئے جائیں ۔ میں ان کے کمرہ میں گیا تو انہوں نے کہا ، اقبال ! مجھے انتہائی افسوس ہے کہ گورنمنٹ نے تمھاری ادبی خدمات کا اعتراف کرنے میں تساہل روا رکھا ہے ۔ میں اس وقت خطابات کی سفارش کر رہا ہوں اور میری خواہش ہے کہ نائٹ ہڈ کے لیے تمھاری سفارش کی جائے ۔ لیکن اس سے قبل معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ تمھیں اس پر کوئی اعتراض تو نہیں ؟[۴] "

ایک طرف تو اقبال کی شہرت ، عزت و تکریم کا یہ عالم کہ انگریز اخبار نویس و مصنف ان سے ملاقات کا آرزو مند تھا اور دوسری طرف حکومت برطانیہ کی ناواقفیت اور بے قدری کا یہ حال کہ پنجاب کا گورنر

۴۔ روزگار فقیر ، جلد اول از فقیر سید وحید الدین ، مطبوعہ کراچی بار پنجم ، مارچ سنہ ۱۹۶۵ع ص ۳۲ ۔

اقبال کے علمی و ادبی کارناموں سے نا آشنا تھا ! انگریز اپنی تمام کوتاہیوں کے باوجود ، ایک روشن خیال قوم ہے ، اس نے اپنی حکومت کو اس لاعلمی پر متنبہ کیا ، جس سے متاثر ہو کر علامہ اقبال کو سر کا خطاب دینا پڑا ۔

بہرحال مذکورۂ بالا واقعات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اقبال نے حصول خطاب کے لیے ایوانِ حکومت کے سامنے نہ تو کاسۂ گدائی کو پیش کیا اور نہ اس کی بارگاہ میں اپنی جبینِ نیاز کو جھکایا ۔ خطاب وہ قیمت نہ تھی جو انگریزی حکومت نے اقبال کی حق گوئی و بے باکی کو خریدنے کے لیے پیش کی تھی ۔ یہ سودا نہ تھا بلکہ اقبال کی شاعرانہ عظمت اور علمی بزرگی کا اعتراف تھا ، جو ملک معظم کی حکومت نے اپنی قوم کی روشن خیالی اور علمی قدر دانی سے مجبور ہو کر کیا تھا چنانچہ وہ خود مہاراجہ کشن پرشاد بہادر کو اپنے خط مورخہ ۳۰ جنوری میں لکھتے ہیں ۔

”سرکار نے میرے خطاب کے متعلق جو کچھ سنا ، صحیح ہے ۔ یہ اسرار خودی کا انگریزی میں ترجمہ ہونے اور اس پر یورپ اور امریکہ میں متعدد ریویو چھپنے کا نتیجہ ہے[۵] “

انگریز دوستوں اور سامراج پرستوں کے لیے سر کا خطاب تو بڑی چیز ہے ۔ خان بہادر ، رائے بہادر بھی اتنے بڑے اعزاز تھے کہ ان کے لیے وہ برسوں حکومت کی وفاداری کا دم بھرتے ، مہینوں ایوان ہائے حکومت کے چکر کاٹتے تھے پھر جب اتنے پاپڑ بیلنے کے بعد حصول مقصد میں کامیابی ہوتی تو احباب و اعزا کی پرتکلف دعوتیں ہوتیں ، شہر کی گلی گلی میں ڈھنڈورا پیٹا جاتا اور آستانۂ حکومت کی جبین سائیوں میں اضافہ ہی ہو جاتا ۔——— حکومت نے خطاب اقبال کو بھی دیا تھا ۔ انگریز پرست اور سامراج پرست اقبال نے خطاب یابی سے پہلے نہ سہی خطاب یابی کے بعد ہی سہی ، وائسرائیگل ، لاج یا گورنر ہاؤس کی زیارت تو کی ہو گی ! اور کچھ

۵۔ شاد و اقبال ، مرتبہ ڈاکٹر سید محی‌الدین قادری زور ص ۹۷ ۔

نہیں تو اس خطاب کو کم از کم خندہ پیشانی اور خوش دلی کے ساتھ تو قبول کیا ہو گا ! ان کے چہرہ پر مسرت و انبساط کے آثار تو نمایاں ہوئے ہوں گے ! وفور جذبات و جوش آزادی میں اقبال پر تنقید کرنے والے مرزا جلال الدین کے اس بیان کو غور سے پڑھیں ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

" گورنمنٹ کی طرف سے آپ کے روبرو خان بہادر کے خطاب کی تجویز پیش کی گئی جسے آپ نے ٹھکرا دیا ، اس کے بعد شمس العلما کی تجویز ہوئی ۔ اسے بھی آپ نے رد کر دیا ۔ بالآخر نائٹ ہڈ کی تجویز ہوئی ، اس کے قبول کرنے میں بھی آپ کو تامل تھا لیکن نواب سر ذوالفقار علی خان کے اصرار پر وہ اس پر رضا مند ہو گئے[6] "

صرف یہی نہیں کہ خان بہادری کو ٹھکرایا گیا ، شمس العلما سے انکار کیا گیا اور نائٹ ہڈ کو تامل کے بعد قبول کیا بلکہ اس تامل کے ساتھ ایک شرط بھی تھی ۔ پروفیسر محمد طاہر صاحب فاروقی لکھتے ہیں ۔

" جب آپ کو سر کا خطاب پیش کیا گیا تو آپ نے کہا میں خطاب صرف اس صورت میں قبول کر سکتا ہوں جب کہ میرے استاد کو اول شمس العلما کا خطاب دیا جائے ۔ گورنمنٹ کو اس شرط کے ماننے میں تامل تھا ۔ اس لیے کہ علامہ میر حسن مرحوم بایں ہمہ علم و فضل کسی غیر معمولی شہرت کے مالک نہیں تھے ۔ لیکن اقبال نے اپنی شرط پوری کرا ہی لی اور اپنی نائٹ ہڈ کے ساتھ مولوی صاحب کو بھی شمس العلما بنوا دیا[7] "

کتنے دلی تکدر و قلبی تامل کے بعد یہ خطاب قبول کیا گیا تھا ! کہاں حکومت کے کاسہ لیسوں کا خان بہادری و رائے بہادری کے لیے دیدۂ دل فراش راہ ہو جانا اور کہاں اقبال کا تامل ، تکدر اور شرائط کے ساتھ

۶۔ ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ص ۸۰ ۔

۷۔ سیرت اقبال از محمد طاہر فاروقی ص ۱۶ ۔

نائٹ ہڈ قبول کرنا ———— اسی "سر" کے لیے سر کے بل کوئے حکومت میں جاتے ہوئے دیکھا تو بہتوں کو تھا لیکن اسی نائٹ ہڈ کو اتنی شان بے نیازی سے قبول کرتے ہوئے صرف اقبال ہی کو سنا۔ نائٹ ہڈ کی عزت و قدر سرکار برطانیہ کے بعد اب بھی کیا کم ہوئی ہے لیکن "سر" کی یہ بے وقعتی خود " صاحب " کے دور میں یوں کبھی کا ہے کو ہوئی ہو گی۔

خطاب یابی کے بعد اکثر خان بہادر، رائے بہادر اور سر، کیا کیا کرتے تھے۔ عزیز و اقارب دوست احباب ان کی دعوتیں کرتے تھے اور وہ ان کو ڈنر دیتے۔ پھر ان پر تکلف مجالس میں انڈر سیکرٹری صاحب، جائنٹ سیکرٹری صاحب سے لیکر لارڈ صاحب تک مدعو ہوتے۔ کھانے پینے کے بعد وقت کہنے سننے کا آتا۔ طعام کے بعد نوبت کلام کی آتی، اور کلام کیا ہوتا؟ اپنی وفاداری، صاحب کی قصیدہ خوانی، اپنی تعریف، حکومت کی توصیف!! اقبال کو بھی اس اعزاز پر ایک عظیم الشان پارٹی لاہور کے مسلمانوں، سکھوں اور ہندوؤں نے مقبرہ جہانگیر شاہدرہ (لاہور) میں دی۔ مدعو نہ صرف اکابرین شہر، معززین لاہور ہی تھے بلکہ انگریز حکام اور خود گورنر پنجاب بھی تھے۔ اقبال نے اس موقع پر انگریزی میں ایک دلچسپ تقریر بھی کی اور اسی تقریر سے پہلی مرتبہ حاضرین جلسہ اور انگریز گورنر کو یہ معلوم ہوا کہ وہ جرمن شاعر گوئٹے کے "سلام مغرب" کے جواب میں "پیام مشرق" لکھ رہے ہیں۔ پھر اسی اجتماع میں گورنر پنجاب کی موجودگی میں حکومت کے اسی "سر" نے ایک نظم بھی سنائی۔ موقعہ کی مناسبت کا اقتضا کیا تھا؟ دیرینہ تجربہ کار "سروں" کی شاندار روایات اس موقعہ پر کیا رہی ہیں؟ یہی کہ گورنر وقت کی نہ سہی، حکومت برطانیہ کی تعریف و منقبت کی جاتی، اپنی نیاز مندی کا کھلم کھلا اعلان نہ سہی اپنی وفاداری کا دبی زبان ہی سے اظہار کر دیا جاتا! اور اس اظہار کے لیے نثر سے زیادہ نظم ہی موزوں تھی! موقع اور محل کا تقاضہ یہی تھا۔ وقت کی نزاکت اسی کی طالب تھی! لیکن اقبال نے وقت کی نزاکت اور موقع کی موزونیت کا اندازہ کرتے ہوئے، جو نظم سنائی، اس کا عنوان تھا "طلوع اسلام"۔

بارگاہ حکومت سے اقبال کو " سر " کا خطاب عنایت ہوا تھا لیک
اسی کے ایک بااقتدار نمائندے کے سامنے اقبال نے " درگاہ حق " سے اپ
اور " عطا " کی امید ظاہر کی تھی -

عطا مومن کو پھر درگاہِ حق سے ہونے والا ہے
شکوہِ ترکمانی ذہنِ ہندی نطقِ اعرابی

ایسے موقعہ پر خطاب یافتہ حضرات اپنی وفاداری و جانثاری کا اعلا
کیا کرتے تھے، لیکن خطاب یابی کے اس " مسرت آگیں " جلسے میں اقب
نے اپنی نوائے تلخ ہی کو بلند کیا

اگر کچھ خواب کا غنچوں میں باقی ہے تو اے بلبل
نوارا تلخ ترمی زن چو ذوق نغمہ کمیابی

آقائے فرنگ کی موجودگی میں اپنی " وفاداری" " بندگی" و " نیازمندی
کا اظہار ان الفاظ میں کیا -

" غلامی " میں نہ کام آتی ہیں شمشیریں نہ تدبیریں
جو ہو ذوقِ یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں " زنجیریں "

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے " زورِ بازو " کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

تمیزِ " بندہ و آقا " فسادِ آدمیت ہے
حذر اے "چیرہ دستاں" سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

* * * *

ابھی تک آدمی " صید زبونِ شہر یاری " ہے
قیامت ہے کہ انسان نوعِ انسان کا شکاری ہے
وہ حکمت ناز تھا جس پر خرد مندانِ مغرب کو
ہوس کے پنجہ خونی میں تیغ کار زاری ہے
تدبر کی فسوں کاری سے محکم ہو نہیں سکتا
جہاں میں جس تمدن کی بناء سرمایہ داری ہے

پنجاب کے حکمران ، برطانوی تخت و تاج کے نمائندے نے اپنے کسی "نائٹ" کی زبانی اس عجیب و غریب اطاعت کیشی و فرمانبرداری کا اعلان کبھی کیوں سنا ہو گا ؟

اقبال نے دوسروں کی طرح خطاب کی نہ تو تمنا کی اور نہ خواہش ۔ اس نے نہ تو اس کے حصول کے لیے حکومت سے کوئی سودا کیا اور نہ حکومت کا مقصد اس عطا سے اس کو پرچانا تھا ۔ وہ ان کی علمی قابلیت اور ذاتی لیاقت کا اعتراف کرنا چاہتی تھی اور یہ اس اعتراف کو بخشش و عطا کا مترادف نہیں سمجھتے تھے ۔ پھر انھوں نے انکار پر انکار کیا ۔ بالآخر یہ شرط لگائی کہ ان کے استاد علامہ مولوی میر حسن کو شمس العلما کا خطاب دیا جائے ، یہ ایک ایسی شرط تھی ، جس کے متعلق انھیں یقین تھا کہ قبول نہیں کی جائے گی لیکن جب یہ شرط بھی مان لی گئی تو انھوں نے اس خطاب کو قبول کر لیا ۔ پھر قبولیت خطاب کے بعد بھی انھوں نے گورنر پنجاب کی موجودگی میں اپنی حق گوئی اور بے باکی کا پورا پورا مظاہرہ کیا ——— واقعات کے اس پس منظر میں کیا اقبال کا سر ہو جانا ، ان کی انگریز دوستی اور برطانیہ پرستی کا ثبوت ہے ؟

۲۔ اقبال کی سرکار پرستی کے ثبوت میں ان کی رکنیت کونسل کو پیش کیا جاتا ہے ۔ کہا جاتا ہے کہ انھوں نے پنجاب کونسل کی رکنیت کے انتخاب میں کامیابی حاصل کرکے دراصل اس نظام حکومت سے تعاون کیا ، جو انگریز نے ہندوستان کی غلامی کے پھندے کو مضبوط کرنے کے لیے تیار کیا تھا ۔ یہ ایک انتہا پسندانہ نقطۂ نظر ہے ۔ گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ غلامی کے ان بندھنوں کو توڑنے والے ، عدم تعاون کے موئید اور سول نافرمانی کے حامی سوراجیوں نے بھی مجالس مقننہ کے انتخابات میں حصہ لیا لیکن انھیں ٹوڈی اور سرکار پرست کسی نے نہیں کہا ۔ عدمِ تشدد و عدمِ مقاومت ، ترکِ موالات و سول نافرمانی کو محض بطور پالیسی نہیں بلکہ عقیدتاً اختیار کرنے والی جماعت کانگریس نے سنہ ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ وزارتیں تشکیل دیں اور اسی دستور غلامی کو چلایا ، جس کے تباہ و تاراج کرنے کا اس نے

بیڑا اٹھایا تھا ——— پھر بھی انگریز کی دوستی کا الزام اس پر کسی نے نہیں لگایا - کیوں ؟ اس لیے کہ مجالس وضع قوانین اور کونسلوں کی رکنیت ، رجعت پسندی یا ترقی پسندی ، غلامی یا حریت کو جانچنے کا معیار نہیں ہے - یہ تو ایک آلہ تھا جس کے توسط سے غلامی کی بندھنوں کو مضبوط کیا جا سکتا تھا اور کمزور بھی ، اور ہم بتا چکے ہیں کہ کونسل میں جا کر اقبال نے کبھی اپنے ضمیر سے بیوفائی اور سرکار کی ہمنوائی نہیں کی - ہمیشہ جب کبھی موقع آیا - انھوں نے غریبوں کے مفادات کی سب سے بڑھ کر وکالت کی ، تعلیمی اور معاشی نقطۂ نظر سے پس ماندہ طبقات کو ابھارنے میں پیش پیش رہے اور ایسی تجاویز پیش کیں ، جن سے سامراجی مفادات کو ٹھیس لگتی تھی اور صوبہ کی عام فلاح و بہبود میں اضافہ ہوتا تھا - اگر انھوں نے اپنے ضمیر کی آواز کو دبایا ہوتا اور اپنی اصول پرستی کو مصلحت سنجی پر ترجیح نہ دی ہوتی ، تو یقیناً وہ کم از کم کونسل کے صدر بن گئے ہوتے ! لیکن حق گوئی و بے باکی کا جو دیا انھوں نے دوسروں کے دلوں میں روشن کر دیا تھا ، کیسے ممکن تھا کہ ان کے نہاں خانۂ دل میں بجھا بجھا ہی رہتا ! اسی لیے مصلحت سنجی ان کی اصول پرستی پر غالب نہ آ سکی اور وہ کونسل کی برسراقتدار جماعت یونینسٹ پارٹی اور انگریزی حکومت پر تنقید کرنے سے باز نہ رہ سکے - نتیجہ یہ ہوا کہ انگریز تو انھیں بادل نخواستہ برداشت ہی کر رہا تھا لیکن یونینسٹ پارٹی کو بھی وہ اپنا نہ سکے اور ان تمام فوائد و منافع سے وہ آخری دم تک محروم رہے ، جو ایک برسراقتدار جماعت کی ہمنوائی سے انھیں حاصل ہو سکتے تھے -

۳- انگریز دوستی کے ثبوت میں اقبال کی اس تقریر کو پیش کیا جاتا ہے ، جو انھوں نے ۱۹ جولائی سنہ ۱۹۲۷ء کو پنجاب کونسل میں سردار اجل سنگھ کی تحریک کی مخالفت میں کی تھی - سردار صاحب کی تحریک یہ تھی کہ سرکاری عہدوں کو کھلی مسابقت کے ذریعہ پر کیا جائے - ڈاکٹر صاحب کا خیال تھا کہ یہ طریقہ صوبہ کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے زیادہ مناسب نہیں ہے ، اس کے بجائے مسابقت و نامزدگی کا ملا جلا طریقہ اختیار کیا جائے - ڈاکٹر صاحب کی تقریر کے جس جز پر سب سے

زیادہ سخت اعتراض کیا جاتا ہے ، وہ یہ ہے -

" میرے دوست پنڈت نانک چند بدقسمتی سے یہاں نہیں ہیں - انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ حکومت نے رنگ کے امتیاز کو ختم کر دیا ہے - اسی لیے اب وہ عہدے جن پر پہلے برطانوی افراد کا تقرر ہوا کرتا تھا ، اب ہندوؤں اور مسلمانوں کو ملنے لگیں گے - لیکن میں اپنے دوست کو یقین دلاتا ہوں کہ حکومت نے بڑی سخت غلطی کی ہے - اگر زیادہ برطانوی عہدہ دار ہوتے تو میں ان کا خیر مقدم کرتا (آوازیں ، نہیں ، نہیں) میں اپنی ذمہ داری کا پورا احساس رکھتے ہوئے یہ کہہ رہا ہوں اور نہیں نہیں کی ان آوازوں کی معنویت کو بھی بخوبی محسوس کرتا ہوں - میں اس جمہوری اور کھوکھلی قوم پرستی سے مسحور نہیں ہوں (ڈاکٹر شیخ محمد عالم : ہر شخص ایسا نہیں ہے) یہ ہو سکتا ہے لیکن متحدہ قومیت کا نعرہ از کار رفتہ ہے اور شاید ایک عرصہ دراز تک از کار رفتہ ہی رہے گا - یہ لفظ اس ملک کے لوگوں کی زبان پر گذشتہ پچاس سال سے ہے - لیکن وہ اس " کڑک مرغی کی ککڑ کوں ہے جس نے انڈا دینا بند کر دیا ہو - بہرحال میں آپ سے کہتا ہوں کہ اس ملک کے حالات ایسے ہیں کہ ہمارے لیے ناممکن ہے کہ کھلی مسابقت کے سیدھے سادے اصول کو رائج کریں[8] "

یہ ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا ایک درمیانی جز ہے - اس میں آپ نے بے شک یہ کہا ہے کہ اگر برطانوی عہدہ دار زیادہ تعداد میں ہوتے تو بہتر تھا - لیکن تقریر کے پورے سیاق و سباق کو دیکھنے سے بآسانی معلوم ہو سکتا ہے کہ آپ کی تقریر کا یہ موضوع نہیں ہے - ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا اصلی موضوع کھلی مسابقت کی مخالفت ہے - اس سلسلے میں آپ کی سب سے بڑی دلیل یہ تھی کہ صوبے کے حالات ایسے ہیں کہ اگر کھلی مسابقت

٨- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ، ستمبر سنہ ١٩٤٨ع ص ٧١ -

کے ذریعہ عہدے داروں کا انتخاب عمل میں آیا کرے تو صوبے کی مختلف قوموں کی سیاسی و معاشی حالت میں توازن باقی نہیں رہتا ۔ اس زمانے میں پنجاب فرقہ پرستی میں بہت ہی پیش پیش تھا اور اس وباء کا شکار سب سے زیادہ ہندو فرقہ تھا ۔ پھر یہ فرقہ مالدار بھی تھا اور تعلیم یافتہ بھی ۔ مسلمان تعلیمی اور معاشی نقطہ نظر سے بہت پیچھے تھے ۔ ان کی اس پس ماندگی کا علاوہ اور اسباب کے ایک سبب یہ بھی تھا کہ ہندو سرمایہ داروں نے ایک طرف ان کو اپنے قرضوں کی زنجیروں میں جکڑ رکھا تھا اور دوسری طرف تعلیمی میدان میں وہ انہیں آگے بڑھنے نہیں دیتے تھے ۔ یونیورسٹی اور کالجوں میں ہندو اساتذہ ہندو طلبا کو آگے بڑھانے کی فکریں کیا کرتے تھے ۔ ان حالات میں اگر کھلی مسابقت کے ذریعہ عہدہ داروں کے انتخاب کا اصول اختیار کیا جائے ، تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ ہندو عہدہ دار غیر معمولی تعداد میں منتخب ہو جایا کرتے اور اس کی وجہ سے صوبے کے مسلمانوں کے معاشی و سیاسی موقف کو دھکہ لگتا ۔ ڈاکٹر صاحب کا سارا ادعاء یہ تھا کہ حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ ایسے اصول اختیار کرے جن سے صوبہ کے تمام فرقوں کو مستفید ہونے کا موقع ملے ۔ اس کے برعکس اگر ایسے اصول اختیار کیے جائیں جن سے مختلف فرقوں کے معاشی و سیاسی توازن میں فرق پیدا ہو جاتا اور صرف ایک فرقہ کو یہ موقع حاصل ہو جاتا ہے کہ دوسروں کو پیچھے دھکیل کر آگے بڑھے تو یہ اصول بذ اتہٖ غلط ہے ۔ اس سے تو بہتر یہی ہے کہ انگریز عہدہ دار ہی برقرار رہیں تاکہ ایک فرقہ دوسرے فرقہ کا استحصال ناجائز نہ کر سکے ۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا یہ مقصد نہ تھا کہ انگریز عہدہ دار اور انگریزی نظام حکومت یہاں ہمیشہ کے لیے برقرار رہے ، بلکہ یہ رد عمل تھا ایک فرقہ کے استحصال ناجائز کے خلاف ۔ پھر ڈاکٹر صاحب نے سردار صاحب کی تحریک کی مخالفت میں یہ تجویز پیش نہیں کی تھی کہ ہندوستانیوں کو عہدے دینے کے بجائے ، انگریزوں کو عہدہ دیئے جائیں بلکہ ضمناً انھوں نے یہ بات کہہ دی تھی ۔ علاوہ ازیں ان کا یہ بیان غیر مشروط بھی نہیں تھا ۔ ان کے اس بیان کا لب لباب یہ تھا کہ اگر پنجاب میں فرقہ پرستی کا یہی عالم رہے تو کھلی مسابقت کے ذریعہ ہندو عہدہ داروں کے تقرر پر وہ انگریز کے تقرر

کو ترجیح دیں گے - ظاہر ہے کہ وہ انگریز کے وجود کو ایک ناگزیر برائی سمجھ کر بادل ناخواستہ گوارا کر رہے تھے -

ہ- ڈاکٹر اقبال نے سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کیا ، اس کی خدمت میں یاد داشت پیش کی ، اور اس کے سامنے شہادت دی - یہ کمیشن سامراج کا نمائندہ تھا - اس میں کسی ہندوستانی کو جگہ نہیں دی گئی تھی - ایسے کمیشن کو یہ اختیار کیسے دیا جا سکتا تھا کہ وہ ہندوستانیوں کی سیاسی قسمت کا فیصلہ کر دے - اس نقطہ پر ملک کی تمام آزادی خواہ جماعتیں ، چاہے اعتدال پسند ہوں یا انتہا پسند ، متفق تھیں - ۲۳ فروری ۱۹۲۸ء کو کمیشن نے ساحل بمبئی پر قدم رکھا اور اسی دن تمام ملک میں ہڑتال کی گئی - کمیشن کے خلاف مظاہرے ہوئے اور "سائمن کمیشن گو بیک" کے نعرے لگائے گئے ——— لیکن اقبال کی روش ان سب سے جدا گانہ تھی - اگر وہ سرکار پرست نہ ہوتے ، برطانوی حکومت سے ان کا ربط ضبط نہ ہوتا تو اس ایضر المتوں کمیشن کا وہ بھی مقاطعہ کرتے ! یہ ہے چوتھا ثبوت اقبال کی انگریز دوستی کا ! !

بادی النظر میں یہ دلیل بہت ہی قوی معلوم ہوتی ہے لیکن حسنِ اتفاق سے سائمن کمیشن سے تعاون کے مسئلہ میں ایک ایسی شخصیت کا دامن بھی "آلودہ" ہے جس کی حق گوئی و بے باکی ، انگریز دشمنی اور آزاد روش کا دوست دشمن سب ہی کو اعتراف ہے - اور یہ شخصیت رئیس الاحرار مولانا حسرت موہانی کی ہے ، جس سے بڑھ کر آزادی کی راہ میں کسی نے قربانیاں نہیں دیں ، جو جیل اس وقت گیا ، جبکہ وہاں فرسٹ اور سیکنڈ کلاس کی سہولتیں ، دودھ اور اولٹین کی نعمتیں نہیں ملا کرتی تھیں ، جبکہ وہ قید واقعی قیدِ فرنگ تھی تھرڈ کلاس کی تنگ و تاریک کوٹھڑی اور چکی کی مشقت سیاسی و اخلاقی دونوں قسم کے قیدیوں کے لیے عام تھی - لیکن آزادوں کے اس سردار اور احراروں کے اس رئیس کی روش سائمن کمیشن کے سلسلہ میں تعاون ہی کی تھی ! ! حقیقت یہ ہے کہ سائمن کمیشن کے ساتھ تعاون کو آزادی یا غلامی کی کسوٹی قرار دینا ہی سرے سے غلط ہے - علامہ اقبال نے اس کمیشن سے تعاون اس لیے نہیں کیا تھا

کہ یہ انگریزوں کا نمائندہ اور سرکار برطانیہ کا کارندہ تھا بلکہ اس لیے تعاون کیا تھا کہ ان کے خیال میں ملک کے ایک پس ماندہ طبقہ کے مفادات کا اسی طرح تحفظ کیا جا سکتا تھا ۔ ڈاکٹر صاحب میثاقِ لکھنو کے مخالف تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اس میثاق کی وجہ سے مسلمانوں کو عام طور پر اور بالخصوص مسلمانانِ پنجاب و بنگال کو کافی نقصان پہنچا کیونکہ ان صوبوں کے مسلمانوں کی اکثریت کو اس میثاق نے اقلیت میں تبدیل کر دیا تھا ۔ وہ چاہتے تھے کہ جدید دستور میں اس نقصان کی تلافی کی جائے ۔ اس تلافی کی ایک صورت تو یہ تھی کہ کانگریس یا ہندو مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لیں یا پھر دوسری متبادل صورت یہ تھی کہ حکومت سے ان مطالبات کو منوایا جائے چنانچہ جب مولانا محمد علی نے ڈاکٹر صاحب کو سائمن کمیشن سے بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کرنا چاہا تو وہ اس شرط کے ساتھ مقاطعہ پر آمادہ تھے کہ کانگریس مسلمانوں کے مطالبات کو تسلیم کر لے ۔ لیکن اس وقت کانگریس سے کوئی مفاہمت نہ ہو سکی اس لیے لازماً ڈاکٹر صاحب نے دوسری متبادل صورت اختیار کی ۔ اگر تعاون ہی غائتِ اصلی ہوتی اور حکومتِ برطانیہ کی خوشنودی ہی مقصود خاطر تھی تو پھر ڈاکٹر صاحب مولانا محمد علی کے سامنے عدمِ موالات کی یہ مشروط پیش کش نہ کرتے ! !

۵- برطانوی حکومت سے دوستانہ تعلقات کے سلسلے میں ایک ثبوت یہ بھی پیش کیا جاتا ہے کہ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس کے لیے ڈاکٹر اقبال کو حکومت نے نامزد کیا ۔ یہ سرکار برطانیہ کے عواطف شاہانہ ہی تھے ، جس کی وجہ سے انھوں نے دو مرتبہ سرکاری نمائندہ کی حیثیت سے گول میز کانفرنس میں شرکت کی ۔ لیکن یہ دلیل شاید سب سے زیادہ مضحکہ خیز ہے ۔ گول میز کانفرنس میں جن لوگوں نے شرکت کی ہے ، ان سب کو حکومت ہی نے نامزد کیا تھا اگر اس نامزدگی کی وجہ سے خلافت کے رئیس الاحرار مولانا محمد علی ، کانگریس کے کرتا دھرتا مہاتما گاندھی اور مسلم لیگ کے قائد اعظم مسٹر جناح ، انگریزوں کے ہوا خواہ اور ملک و قوم کے بد خواہ قرار دیئے جا سکتے ہیں تو پھر اقبال کا جرم بھی ثابت ہے ۔ اگر یہ نامزدگی سرکار برطانیہ کے لطف و کرم کی ایک نشانی تھی ، تو پھر

ان عواطفِ شاہانہ سے ڈاکٹر انصاری کو بہرہ اندوز کرنے کے لیے مہاتما گاندھی نے ایڑی چوٹی کا زور خود ہی تو لگایا تھا ——— ! اقبال نے اپنی نامزدگی کے لیے سعی و سفارش تو کجا کبھی کوئی سلسلہ جنبانی بھی تو نہ کی ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ دوسری گول میز کانفرنس سے قبل ڈاکٹر صاحب مسلمانوں کے ایک خاص مکتبِ خیال کی ترجمانی کر رہے تھے اور انہیں ہندوستان کے سیاسی قائدین کی صفِ اول میں ایک نمایاں مقام حاصل تھا ۔ پھر انہیں جوبین الاقوامی شہرت حاصل ہو چکی تھی وہ شاید ہی ملک کے کسی دوسرے سیاسی رہنما کو حاصل تھی ۔ حکومت نے کچھ تو ان وجوہ کے پیش نظر اور کچھ مسٹر فضل حسین کے کہنے کی بناء پر انہیں دوسری گول میز کانفرنس کا رکن نامزد کر دیا ، لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس کھلے اجلاس میں حکومت برطانیہ پر جو شدید نکتہ چینی کی ، اس کی وجہ سے سرکارِ انگریزی اور بالخصوص وزیرِ ہند کو اپنی اس نامزدگی پر تاسف ہی ہوا اور تیسری گول میز کانفرنس میں ان کی نامزدگی بادلِ ناخواستہ عمل میں آئی ۔ انصاف کا یہ معیار بھی عجیب ہے کہ ڈاکٹر انصاری کو نامزد کروانے کی سعی بلیغ کے باوجود مہاتما گاندھی سرکار کے دشمن و ملک کے بہی خواہ اور نامزدگی سے قبل حکومت سے کھلی بے اعتنائی ، بے رخی برتنے اور نامزدگی کے بعد سرکار برطانیہ پر کڑی تنقید و شدید نکتہ چینی کرنے کے باوجود ، اقبال ٹوڈی و رجعت پسند ، حکومت کا دوست اور ملک کا دشمن ! !

ع خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد

۹۔ ڈاکٹر صاحب پر ایک الزام یہ بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے سرکار کے اشارۂ چشم و ابرو سے بعض مرتبہ ہندو مسلم مفاہمت میں رخنہ اندازی کی ۔ کھلے الفاظ میں نہ سہی لیکن اشاروں ہی میں یہ الزام "ہندوستان کا مستقبل" کے مصنف نے لگایا ہے ، وہ لکھتے ہیں ۔

> "کمیونل اوارڈ" کے بعد بھی ہندوستان میں فرقہ وارانہ سمجھوتے کی ایک کوشش کی گئی اور یہ کوشش تقریباً کامیاب ہو گئی تھی کہ پھر ایک مرتبہ اسی بے تعلق حکومت برطانیہ نے اس میں ٹانگ اڑا دی جیسا کہ واقعات کے ذکر سے واضح ہو جائے گا ۔

کمیونل اوارڈ کا اعلان ۱۶ اگست ۱۹۳۲ء کو ہوا تھا۔ مہاتما گاندھی کے برت اور معاہدہ پونہ کے مطابق اوارڈ کی ترمیم کے بعد کہ جس کا اثر اچھوتوں پر پڑتا تھا، پنڈت مالویہ و مولانا شوکت علی کے درمیان گفت و شنید جاری ہوئی کہ کمیونل اوارڈ کا بدل پیدا کیا جائے۔ ابتدائی گفت و شنید بہت امید افزا معلوم ہوئی اور مولانا شوکت علی نے وائسرائے سے درخواست کی کہ مہاتما گاندھی کو رہا کر دیا جائے یا کم از کم ایسی آسانیاں مہیا کر دی جائیں کہ جیل میں ان سے ملاقاتیں کی جا سکیں تاکہ اس صلح کی گفت و شنید میں مدد ملے۔ یہ درخواست ۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو کی گئی تھی۔ ۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مسلم آل پارٹیز کے صدر کا یہ اعلان شائع ہوا کہ اب پھر سے جداگانہ اور مشترکہ انتخاب کے سوال کو اٹھانا بہت ہی بے موقع ہوگا اور مسلمان اس کے لیے تیار نہیں ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کو چھوڑ دیں لیکن وہ اس کے لیے تیار ہیں کہ اگر اکثریت والے فرقہ کی جانب سے اس قسم کی تحریک ہو تو وہ ان قطعی تجاویز پر غور کر لیں، جس میں تمام ضروری اور اہم مسائل شامل ہوں۔ یہ اعلان شملہ سے شائع ہوا تھا۔ ۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری نے مولانا شوکت علی کے تار کا یہ جواب دیا کہ آپ کے لیے سب سے پہلا کام یہ ہے کہ اس بات کا یقین حاصل کریں کہ جس کام کا آپ ارادہ کر رہے ہیں اس میں آپ کو تمام مسلمانوں کی حمایت حاصل ہے۔ اس سلسلہ میں آپ کو اس بیان کی طرف توجہ دلائی جاتی ہے، جو کہ ۷ اکتوبر کے اخبارات میں مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے صدر کی جانب سے شائع ہوا، نیز دوسرے بیانات کی طرف بھی ——— اب تو اس بات کی ضرورت باقی نہیں رہتی کہ یہ بتایا جائے کہ مولانا شوکت علی کے ۹ اکتوبر والے تار کا جواب وائسرائے کے پرائیویٹ سکرٹری نے اس وقت تک نہ دیا، جب تک کہ مسلم آل پارٹیز کانفرنس کی طرف سے ۷ اکتوبر کے اخبارات میں بیان شائع نہ ہوگیا اور پھر تار کا جواب جو ۹ اکتوبر کو

بھیجا گیا ، اس میں اسی بیان کی طرف اشارہ بھی کیا گیا ہے[۹]''

ڈاکٹر راجندر پرشاد صاحب ، مصنفِ " ہندوستان کا مستقبل " نے مولانا شوکت علی کی درخواست ، صدر مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے بیان اور وائسرائے کے جواب کا یہ تعین تاریخ اس انداز میں ذکر کیا ہے کہ گویا صدر مسلم کانفرنس کے اس بیان کے پس پردہ وائسرائے کا ہاتھ کام کر رہا تھا اور مولانا شوکت علی کو گاندھی جی سے جیل میں ملنے کی اجازت نہ دینے کے لئے وائسرائے کو کسی نہ کسی وجہ کی تلاش تھی - صدر مسلم کانفرنس کے اس بیان نے یہ وجہ مہیا کر دی اور اس طرح مولانا شوکت علی اور گاندھی جی کی عدم ملاقات کی وجہ سے ہندو مسلم مفاہمت کا مسئلہ کھٹائی میں پڑ گیا ، جس کی بالواسطہ ذمہ داری صدر مسلم کانفرنس پر عائد ہوتی ہے - یہ ہے وہ اثر جو " ہندوستان کا مستقبل " کے مصنف نے مندرجہ بالا اقتباس میں پیدا کرنے کی کوشش کی ہے -

صدر مسلم کانفرنس ، جن کے بیان کا اس اقتباس میں ذکر آیا ہے ، اس زمانے میں ڈاکٹر اقبال ہی تھے - اگر ڈاکٹر صاحب کو یہ علم ہوتا کہ ان کے بیان کے محض ایک خاص تاریخ میں شائع ہونے کی بناء پر ملک کے ایک دوسرے عالم و فاضل ڈاکٹر اس الزام کی عمارت کھڑی کر دیں گے تو شاید وہ اس تاریخ کو بیان جاری ہی نہ کرتے - واقعہ یہ ہے کہ یہ بیان ڈاکٹر صاحب نے نہ تو وائسرائے کے ایماء و اشارہ سے شائع کیا اور نہ کبھی وہ اپنی سیاسی زندگی میں اتنی پست سطح پر اتر آئے تھے - ڈاکٹر صاحب نے ۶ اکتوبر کو اس بیان میں جن خیالات کا پبلک طور پر اظہار کیا ، ان ہی خیالات کو انھوں نے اس کے بعد بذریعہ تار مولانا عبدالمجید سندھی کی خدمت میں روانہ کر دیا تھا - اس واقعہ کی پوری تفصیلات گذشتہ صفحات میں اپنے مقام پر بیان کی جا چکی ہیں - اس الزام کی جواب دہی کے سلسلے میں پھر ایک مرتبہ ذہن میں ان تفصیلات کو مستحضر کرلیجئے - مولانا شوکت علی اور مولانا عبدالمجید سندھی ، پنڈت مدن موہن

۹- "ہندوستان کا مستقبل" مصنفہ ڈاکٹر راجندر پرشاد - ص ۲۷۴ و ۲۷۵

مالویہ سے گفت و شنید کرتے ہیں ، اس گفت و شنید کے بعد ہی مولانا شوکت علی ، گاندھی جی سے جیل میں ملاقات کرنا چاہتے ہیں اور حصولِ اجازت کے لئیے وائسرائے کے پاس بتاریخ ۶ اکتوبر ۱۹۳۲ء درخواست روانہ کرتے ہیں - علامہ اقبال ، مولانا کی اس درخواست سے واقف نہیں ہیں - البتہ پنڈت مالویہ سے ان کے مذاکرات کی خبر وہ اخبارات میں پڑھتے ہیں - اس خبر میں یہ بات درج تھی کہ " یہ مذاکرات طریق انتخاب تک محدود ہیں اور دیگر مسائل ، جو مسلمانوں کے نقطہ نگاہ سے زیادہ اہم ہیں ، ان پر کسی نے گفتگو نہیں کی ہے " خبر کا یہ پہلو علامہ اقبال کے لئے باعثِ تشویش بلکہ وجہ تکلیف تھا - اس لئے انہوں نے فوراً ۷ اکتوبر کو وہ بیان جاری کیا جو ڈاکٹر راجندر پرشاد کے نزدیک قابلِ اعتراض قرار پایا - مولانا شوکت علی کی ۶ اکتوبر والی درخواست کا جواب وائسرائے نے ۹ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو دیا جس میں اس نے مولانا کی درخواست کو رد کرتے ہوئے علامہ اقبال کے مذکورہ بالا بیان کا حوالہ دیا - محض اس حوالہ کی بنیاد پر یہ قیاس قائم کر لینا کہ وائسرائے نے علامہ سے یہ بیان دلوایا تھا ، بدگمانی کی انتہا ہے ! اگر ۹ اکتوبر کو وائسرائے نے مولانا شوکت علی کو جواب دیتے ہوئے ، اس بیان کو استعمال کر لیا تو اس کو سوائے سوئے اتفاق کے اور کیا کہا جا سکتا ہے ؟ اگر واقعات کا یہ سلسلہ قائم نہ ہوا ہوتا بلکہ مجرد اس خبر کی بناء پر کہ مولانا شوکت علی نے ہندو مسلم مسئلہ پر گاندھی جی سے جیل میں تبادلہ خیال کرنے کے لئے وائسرائے سے اجازت طلب کی ہے - علامہ اقبال نے ۷ اکتوبر والا بیان شائع کیا ہوتا ، تو یہ الزام شاید درست ہوتا کہ شملہ اور دہلی کے چشم و ابرو کے اشارے سے یہ بیان جاری کیا گیا تھا - لیکن محض تواریخ کے سوء اتفاق کی بناء پر ڈاکٹر صاحب کو انگریز دوستی کا موردِ الزام قرار دینا درست نہیں ہے - پھر وائسرائے نے محض ڈاکٹر صاحب کے بیان کی بناء پر مولانا شوکت علی کو گاندھی جی سے ملاقات کی اجازت دینے سے انکار نہیں کیا ، بلکہ اس انکار کی اصلی وجہ گاندھی جی کی تحریکِ سول نافرمانی تھی - چنانچہ ڈاکٹر راجندر پرشاد لکھتے ہیں -

" دوبارہ ۲۶ اکتوبر کو مولانا شوکت علی نے جب وہی درخواست

کی اور وائسرائے سے یہ بھی استدعا کی کہ وہ تمام متعلقہ جماعتوں پر اپنا اثر ڈالیں تاکہ امن و صلح ہو سکے ، جس سے سب کو فائدہ پہنچے تو فوراً ۲۷ اکتوبر ہی کو اس کا یہ جواب آ گیا کہ جب تک مسٹر گاندھی سول نافرمانی کو پورے طور پر ترک نہ کریں گے ، اس وقت تک آپ کی درخواست منظور نہیں کی جا سکتی[۱۰] "

اس بیان کے سلسلہ میں اصل تنقیح (Issue) یہ نہیں ہے کہ بیان کب جاری کیا گیا بلکہ یہ ہے کہ اس بیان میں کہا کیا گیا تھا ، کیا ڈاکٹر صاحب نے ہندو مسلم مفاہمت ہی کی مخالفت کی تھی ؟ ڈاکٹر راجندر پرشاد خود ہی ڈاکٹر صاحب کے بیان کے بعض اجزا کو ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں -

" ۷ اکتوبر ۱۹۳۲ء کو مسلم آل پارٹیز کانفرنس کے صدر کا یہ اعلان شائع ہوا کہ اب پھر سے جداگانہ اور مشترک انتخاب کے سوال کو اٹھانا بہت ہی بے موقع ہوگا اور مسلمان اس کے لئے تیار نہیں ہیں کہ اس ذریعہ تحفظ کو چھوڑ دیں ، لیکن وہ اس کے لئے تیار ہیں کہ اگر اکثریت والے فرقے کی جانب سے اس قسم کی تحریک ہو تو ان قطعی تجاویز پر غور کریں ، جن میں تمام ضروری اور اہم مسائل شامل ہوں[۱۱] "

مندرجہ بالا اقتباس کے خط کشیدہ الفاظ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب نفس مفاہمت کے مخالف نہیں تھے بلکہ وہ اس خاص طریقہ مفاہمت کے خلاف تھے جو اس وقت اختیار کیا گیا تھا ۔ ان کے اپنے الفاظ یہ ہیں -

" مسلمانان ہند نے دیگر فرقوں کے ساتھ مفاہمت پر ہمیشہ آمادگی کا اظہار کیا لیکن جو طریقہ کار اس وقت اختیار کیا جا رہا ہے ،

۱۰- " ہندوستان کا مستقبل " مصنفہ ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲۷۵
۱۱- ایضاً ص ۲۷۳

وہ ہندوؤں سے سمجھوتہ کرنے کا طریقہ تو نہیں ہے ، البتہ اس سے ہماری صفوں میں انتشار پیدا ہو جائے گا۱۲۔

جو طریقہ کار اختیار کیا گیا تھا ، اس پر ڈاکٹر صاحب کے دو اہم اعتراضات تھے ۔ ایک تو یہ کہ اکثریتی فرقہ کی جانب سے قطعی تجاویز سامنے آنی چاہئیں تاکہ اکثریتی فرقہ کا رجحان معلوم ہو جائے اور ان کی خلوص نیت کا مسلمانوں کو یقین ہو جائے ۔ ان قطعی تجاویز کی بنیاد پر گفتگوئے مفاہمت شروع بھی ہو سکتی ہے اور نتیجتاً بارآور ہو سکتی ہے لیکن مولانا شوکت علی نے اس بنیاد کے بغیر مفاہمت کرنے کی کوشش کی تھی ۔ ڈاکٹر صاحب اس سعی مفاہمت میں دوسرا نقص یہ دیکھ رہے تھے کہ اس میں جداگانہ حق انتخاب کو بھی معرض بحث لایا جا رہا تھا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ ابتدا ہی سے ڈاکٹر صاحب جداگانہ حق انتخاب کے زبردست حامی رہے ہیں ۔ الغرض یہ وہ دو بنیادی اسباب تھے ، جن کی بناء پر ڈاکٹر صاحب نے اس سعی مفاہمت کی مخالفت کی اور ان ہی اسباب کے پبلک اظہار کے لیے انہوں نے ۷ اکتوبر کا بیان جاری کیا تھا ۔

۷۔ علامہ اقبال نے تحریک ترک سوالات میں حصہ نہیں لیا بلکہ ایک حد تک اس کی مخالفت کی ۔ اس تحریک کے زمانے میں وہ اسلامیہ کالج لاہور کے معتمد تھے ۔ مولانا محمد علی لاہور پہنچے تاکہ اسلامیہ کالج کو بھی اس تحریک میں شامل کریں ۔ اس مسئلہ پر انہوں نے اقبال سے گفتگو شروع کی ۔ پہلے تو ڈاکٹر صاحب نے یہ کہہ کر ٹالا کہ علماء کا فتویٰ حاصل کیا جائے اور جب فیصلہ کر لیا گیا تو انہوں نے یہ رائے دی کہ مہاتما گاندھی نے جو چندہ جمع کیا ہے اس سے صنعتی ادارے قائم کئے جائیں ۔ شروع شروع میں یعنی تحریک کے آغاز میں اسلامیہ کالج تحریک میں شریک ہو گیا تو انہیں اس سے رنج پہنچا ۔ مگر بعد میں انہوں نے اسلامیہ کالج کو اس تحریک میں شامل نہ ہونے دیا ۔ اسی زمانے میں مہاتما گاندھی نے سول نافرمانی کی تحریک شروع کی جس کے تین اہم مقاصد تھے ۔

۱۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ، ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۸۶

(۱) ہندوستان کی آزادی کا حصول ۔

(۲) مسئلہ خلافت یعنی ترکیہ کو اس کے تمام مقبوضات کی واپسی کے لئے انگریزوں پر دباؤ ڈالنا ۔

(۳) مظالم پنجاب کی تلافی ۔

یہ تینوں مقاصد ایسے تھے کہ ڈاکٹر صاحب کو اس تحریک میں شریک ہونا چاہئے تھا ۔ ہندوستان کی آزادی سے انہیں کبھی اختلاف نہیں رہا ۔ ان کے اسلامی تصورات کا اقتضاء یہی تھا کہ مسئلہ خلافت سے انہیں خاص تعلق خاطر ہو ۔ پھر ان کے جنم بھوم پنجاب میں جنرل ڈائر اور حکومت کے مظالم سے ان کی حساس طبیعت کو ضرور متاثر ہونا چاہئے تھا ——— لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ انہوں نے اس تحریک میں کوئی حصہ نہیں لیا ۔ اس کی وجہ صرف یہی تھی کہ وہ برطانیہ کے حق وفاداری کو ادا کر رہے تھے ، یہ ایک مزید ثبوت ہے ان کی سرکار پرستی کا !

بظاہر تو یہ اعتراض بہت قوی معلوم ہوتا ہے لیکن تھوڑی سی تحلیل کے بعد یہ اعتراض ہادر ہوا ہوا جاتا ہے ۔ اقبال کے علاوہ اور بھی ایسی شخصیتیں ملیں گی ، جنھوں نے سیاسی میدان میں کارہائے نمایاں انجام دئے ہیں ، لیکن جنھوں نے تحریک ترک موالات اور تحریک سول نافرمانی میں حصہ نہیں لیا بلکہ اس کی مخالفت کی ۔ پھر بھی ہندوستانی سیاست کا کوئی طالب علم انہیں انگریزوں کا حلیف اور برطانیہ کا دوست نہیں کہہ سکتا ۔ قائد اعظم محمد علی جناح کی ان تحریکات سے مخالفت مشہور ہے ، بلکہ کہا جاتا ہے کہ کانگریس سے انہوں نے ترک تعلق محض ان ہی تحریکات کی وجہ سے کیا ۔ تحریک ترک موالات اپنے شباب پر ہے ۔ بدیسی کپڑوں کی ہولی جلائی جا رہی ہے ، سرکاری ملازمین اپنی ملازمتیں ترک کر رہے ہیں ، وکلا نے عدالتوں کی حاضری ترک کر دی ہے ۔ سرکاری مدارس خالی پڑے ہیں ۔ علی برادران نے علی گڑھ پر دھاوا بول دیا ہے اور مسلم یونیورسٹی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی ہے ——— لیکن پنڈت مدن موہن مالویہ کانگریس کے سرگرم لیتا ، ہندو مہاسبھا کے کرتا دھرتا بنارس یونیورسٹی میں ڈٹے ہوئے ہیں کہ اس تحریک کی ہوا تک بھی یہاں پہنچنے نہ دیں گے

——— تحریکِ ترکِ موالات کا طوفان علی گڑھ کو ایک ذرۂ بے مقدا
کی مانند اپنے ساتھ بہا لے گیا ، مگر بنارس کے آہنی قلعے سے وہ سر ٹکر
کر اُلٹے پاؤں لوٹ گیا - ڈاکٹر ضیاء الدین کو علی برادران کے مقابلہ می
منہ کی کھانی پڑی لیکن مہاتما جی کو پنڈت جی کے سامنے اپنا سا منہ لے
پسپا ہونا پڑا ! !

اقبال اس وقت عملی سیاسیات میں نمایاں حصہ نہیں لیا کرتے تھے
پھر انہیں ان تحریکات سے اصولی اختلاف بھی تھا - وہ یہ سمجھتے تھے
ان تحریکات سے حاصل کچھ نہ ہوگا - انگریز کو جو کچھ کرنا ہے
کرکے رہے گا - ان تحریکات میں پڑنا فضول ، اپنا وقت ضائع کرنا اور ا
سر پھوڑنا ہے - چنانچہ اس زمانہ میں ہندوستانی سیاسیات کے متعلق ان
جو خیالات تھے ، ان کا ذکر مرزا جلال الدین بیرسٹر ان الفاظ میں کر
ہیں -

" ان کا خیال تھا کہ سیاسیاتِ ہندی اپنی نوعیت کے لحاظ
مایوس کن ہیں - غیر ملکی حکومت کے ارباب قضا و قدر سے
سات سمندر پار بیٹھ کر اس ملک کی قسمت کا فیصلہ کرنے
عادی ہو چکے ہیں کسی قسم کے سیاسی ہنگامے سے متاثر ہو
کی اُمید کم ہے اور جب تک ہندوستان کی حکومت کا سرچش
انگریز ہے ، مسلمان اپنے مفاد کے لئے اس سے کچھ نہیں پا س
اور اس کی تمام جد و جہد اپنے مفید جوہر کو رائیگاں کرنے
مترادف ہے - چنانچہ وہ ایسی سیاسی قیادت کو سوائے وقتی شو
شغب کے کچھ اور نہیں سمجھتے تھے[۱۳] "

ایک اور اصولی چیز جو ان کی نظروں میں کھٹکتی تھی ، وہ ان تحری
کی قوم پرستانہ نوعیت تھی - تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ سول نافرم
میں ہندو مسلمان دونوں شریک تھے - ان تحریکات کے مقاصد کتنے ہی شا

۱۳- ملفوظاتِ اقبال : مرتبہ محمود نظامی - مطبوعہ امرت الیکٹرک پر
لاہور - بار اول ص ٦٣ و ٦٥

سہی اور ان دو قوموں کا اتحاد و اتفاق کتنا ہی مبارک سہی ، لیکن اقبال کو یہ گوارا نہ تھا کہ مسلمان اپنی ملی حیثیت کو کھو کر دوسروں میں مدغم ہو جائیں ۔ انہیں یہ اندیشہ تھا کہ یہ اتحاد کچھ زیادہ دیر پا اور اس کے نتائج کوئی زیادہ مفید برآمد نہیں ہوں گے ۔ علاوہ ازیں اگر ان تحریکات کے نتائج موافق مرام حاصل بھی ہو جائیں تو مسلمانوں کے پلے کیا پڑے گا ؟ یہ ابھی تک طے نہیں ہوا تھا کہ حصولِ آزادی کے بعد مسلمانوں کا موقف اس ملک میں کیا ہوگا ۔ گو میثاقِ لکھنؤ نے ایک طرح سے مستقبل کے لئے بھی ایک بنیاد فراہم کر دی تھی لیکن علامہ اقبال اس بنیاد ہی کے خلاف تھے[۱۳] ۔ بہرحال ان کا خیال تھا کہ جب تک ہندو مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا سمجھوتہ نہ ہو جائے ، جس سے مسلمانوں کا آئندہ موقف واضح اور متعین ہو جائے ، اس قسم کی تحریکات میں حصہ لینا محض وقتی شور و شغب کے سوا کچھ بھی نہیں ۔

جہاں تک اسلامیہ کالج کو تحریکِ ترکِ موالات کے سپرد کرنے کی مخالفت کا تعلق ہے ، اقبال اور پنڈت مدن موہن مالویہ دونوں کے طرز عمل کی توجیہہ بھی ایک ہی ہے ۔ اقبال ایک علم دوست انسان تھے ۔ پھر انہیں اپنے صوبے کے مسلمانوں کی تعلیمی پستی کا حد درجہ قلق تھا ۔ وہ جانتے تھے کہ وقتی طوفان کے اس دھارے سے اسلامیہ کالج کو نہ بچایا گیا تو مسلمانوں کی تعلیمی حالت کو بڑا دھکا لگے گا اور یوں بھی وہ اصولی طور پر تحریک کے موافق نہیں تھے ۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامیہ کالج کو انہوں نے اس تحریک میں سرگرمی سے شامل ہونے نہ دیا ۔

بہرحال یہ وہ اصولی اسباب تھے جن کی وجہ سے علامہ اقبال نے ان تحریکات میں حصہ نہیں لیا ۔ اگر محض انگریز کی خوشنودی پیش نظر ہوتی تو اس کے مراحمِ خسروانہ سے وہ کبھی تو سرفراز ہوتے !

۸- سر محمد شفیع کے ساتھ ان کے سیاسی تعلقات کو دیکھ کر بعض

۱۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۲۶

مرتبہ ان کے مخلص دوست اور عقیدت مند بھی ان سے بدظن ہو جایا کرتے تھے اور ان کے مخالفین کی نظروں میں اقبال کی حریت فکر و عمل کے خلاف یہ سب سے بڑی دلیل تھی۔ سر شفیع واقعی انگریزوں کے ہمنوا اور برطانیہ کے حاشیہ بردار تھے یا نہیں ، سیاسیات میں جو روش انھوں نے اختیار کر رکھی تھی اس کا اصلی محرک انگریز کی ہوا خواہی تھا یا اپنے فرقہ کی ہی خواہی ——— یہ اور اسی قسم کے دیگر سوالات کی تحقیق ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ یہ کام سر شفیع کے سوانح نگار کا ہے کہ وہ ان مسائل پر قلم اٹھائے۔ یہاں ہم یہ فرض کیے لیتے ہیں کہ سر شفیع واقعی وہی کچھ تھے جو ان کے مخالفین بیان کرتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر علامہ اقبال نے سیاسی معاملات میں ان کا ساتھ دیا تو کیا اس سے یہ لازم آتا ہے کہ انھیں بھی سر شفیع کی مانند انگریزوں کا آلہ کار قرار دے دیا جائے اور ہم یہ کیوں بھول جائیں کہ "سیاسیات مصالحت کا ایک کھیل ہے" ۔ واقعہ یہ ہے کہ انگریز کی خوشنودی ، سر شفیع کی سیاست کی غائت ہو تو ہو ، لیکن سر اقبال کی سیاست کا یہ مقصد کبھی بھی نہیں رہا ۔ ذیل کے واقعہ کو ہم اپنے اس بیان کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں ۔

سائمن کمیشن کی آمد کے زمانے میں ہی سر شفیع اور سر اقبال کی سیاسی رفاقت منظر عام پر آتی ہے اور یہ رفاقت ان کے دوستوں اور مخلصوں کی نظروں میں کھٹکتی ہے ۔ سر شفیع اس زمانہ میں مسلم لیگ کے صدر تھے اور سر اقبال معتمد ۔ لیکن اسی سائمن کمیٹی کے زمانہ میں وہ سر شفیع سے سخت اختلاف کرتے ہیں ۔ یہاں تک کہ معتمدی سے استعفاد دیتے ہیں اور لطف یہ ہے کہ اس اختلاف کا تعلق بھی اسی انگریز دوستی اور سرکار پرستی کے مسئلہ سے ہے یعنی یہ کہ علامہ اقبال سر شفیع کی اس تجویز کے خلاف تھے کہ قانون ، امن اور انصاف سے متعلق امور کو صوبائی گورنروں کے سپرد کر دیا جائے اور سائمن کمیشن کے سامنے پیش شدنی یادداشت میں صوبائی خود مختاری کا ذکر نہ کیا جائے ۔ اگر اقبال انگریزوں کے حاشیہ بردار اور برطانیہ کے آلۂ کار ہوتے تو سر شفیع کی انگریز گورنروں کے اختیاراتِ خصوصی سے متعلق اس تجویز کی کیا اتنی

شدید مخالفت کرتے ؟ سر اقبال اور سر شفیع کی رفاقت کے قصے تو سب کو یاد ہیں لیکن مخالفت کا یہ واقعہ بھی کسی کے ذہن میں ہے ؟

پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر سر اقبال ، سر شفیع کی مانند انگریزوں کے آلۂ کار نہ تھے تو انہوں نے سیاسی میدان میں ان کے ساتھ تعاون عمل کیوں کیا ؟

واقعہ یہ ہے کہ علامہ اقبال کا سنہ ۱۹۰۸ع ہی سے سیاسی مسائل میں ایک خاص نقطۂ نظر پیدا ہو گیا تھا جو اس وقت کے مقبول عام زاویہ نظر سے ایک حد تک مختلف تھا ۔ علامہ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ اسلامی تعلیمات کا فطری اقتضاء یہ ہے کہ ان اصولوں کی حامی جماعت کا زندگی کے ہر میدان میں ایک خاص زاویہ نظر اور اسی کے مطابق ان کا عمل بھی ہونا چاہیے ۔ مختصر یہ کہ اسلام کا یہ تقاضا ہے کہ مسلم جماعت اپنی اجتماعی خودی اور مشترک انا سے زندگی کے کسی میدان میں دست بردار نہ ہو ، بلکہ اپنے مخصوص طریقہ ہائے فکر و عمل سے اس کو پروان چڑھائے ۔ اس نقطۂ نظر کو وہ ایک اصول کی حیثیت دیتے تھے اور اس کے متعلق انھیں یقین کامل تھا کہ یہی اصول انسانیت کی فلاح عامہ کا اصول ہے ۔ ہندوستان کی سیاسیات میں بھی انہوں نے جو تجاویز پیش کیں اور جو پالیسی اختیار کی ان سب کی بناء اسی اصول پر رکھی ، لیکن جب وہ اس اصول کو لے کر سیاسی میدان میں اترے تو انہیں بڑی مشکل صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ۔ ہندوستان کا سیاسی اقتدار انگریز کے ہاتھوں میں تھا ، ملک کی مختلف جماعتیں اور طبقے اس اقتدار کو اس کے ہاتھ سے چھین لینا چاہتے تھے ۔ اقبال خود بھی دل سے یہی چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سینے کا یہ بوجھ ہلکا کر دیا جائے تاکہ وہ اپنی خودی کے اظہار کی مسرت سے محروم نہ رہے[15] ، لیکن اس کے ساتھ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ انگریز نے جو زنجیریں ہندوستان کو پہنائی ہیں ، انہیں کاٹ تو دیا جائے لیکن ان

۱۵- '' اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال '' مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۳۴ -

ہی زنجیروں کے حلقے میں مسلمانوں کے شانہ و گردن کو کس دیا جائے ۔ جس طرح وہ ہندوستان کی " اجتماعی خودی " کو پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے تھے ، اسی طرح مسلمانوں کی " اجتماعی انا " کو بھی پابندِ طوق و سلاسل دیکھنا نہیں چاہتے تھے ۔ مختصر یہ کہ وہ ہندوستان اور مسلمان دونوں کی آزادی کے خواہاں تھے ، ایک کی آزادی اور دوسرے کی غلامی کے قائل نہ تھے ، لیکن عملی سیاست میں اس اصول کو برتنے وقت انھیں بڑی دشواری پیش آئی ۔ اصول کو روبہ عمل لانے کی ایک صورت تو یہ تھی کہ ملک کی دیگر جماعتوں بالخصوص ہندو جماعت سے مسلمانوں کی اس اجتماعی خودی کو تسلیم کروایا جائے ۔ میثاقِ لکھنؤ کے بعد سے وہ یہ دیکھ چکے تھے کہ ہندو اس کو تسلیم کرنا نہیں چاہتے ۔ نہرو رپورٹ کی ساری عمارت اس حق کے انکار پر کھڑی کی گئی تھی ۔ اقبال کی نظر میں یہ ایک خطرے کی گھنٹی تھی ۔ وہ یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ ملک کے اکثریتی فرقہ کی اگر یہی ذہنیت رہی تو مسلمانوں کی اجتماعی انا کو ابھرنے کا موقعہ ملنا تو کجا ، وہ اس اکثریتی فرقہ کی مشترکہ خودی میں کہیں ضم ہو کر نہ رہ جائے ۔ اقبال کی نظر میں یہ شدھی و سنگھٹن سے بڑی زیادہ بھاری خطرہ تھا"[۱۶] ۔

دوسری طرف ان کا دل جس بات پر سب سے زیادہ کڑھتا تھا وہ مسلمانوں کا انتشار و افتراق تھا ۔ وہ یہ جانتے تھے کہ یہ انتشار مسلمانوں کی اجتماعی خودی کو گھن کی طرح کھائے جا رہا ہے ۔ الغرض صورت حال یہ تھی کہ ملک میں ایک نئے انقلاب کے آثار پیدا ہو چلے تھے ۔ اگر اس انقلاب کو ان ہی طریقوں اور ان ہی راستوں سے آنے کی اجازت دی جاتی ، جو طریقے اور راستے اکثریتی فرقہ نے مقرر کر رکھے تھے تو انھیں اندیشہ تھا کہ مسلمانوں کی اجتماعی خودی اس انقلاب کا شکار ہو کر رہ جائے گی ۔ آراء و افکار کے لحاظ سے اپنے وقت کے وہ سب سے بڑے انقلابی تھے ۔ وہ دل سے چاہتے تھے کہ اس ملک بلکہ پورے ایشیا اور ساری دنیا میں ایک

۱۶- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، ناشر شیخ محمد اشرف ، مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص ۲۰۸ ۔

نیا انقلاب آئے لیکن یہ انقلاب ان راستوں اور ان طریقوں سے آئے کہ مسلمانوں کی اجتماعی خودی کو نہ صرف کوئی گزند نہ پہنچے بلکہ وہ پوری طرح پھلے پھولے اور پروان چڑھے ۔ اس کے لیے ایک طرف تو انھوں نے مسلمانوں میں اپنی شاعری کے ذریعہ خودی کا صور پھونکا اور دوسری طرف اس انقلاب کے رخ کو غلط راستے پر پڑنے سے اس وقت تک روکے رکھنا چاہا ، جب تک کہ اس صور سے مسلمانوں میں حیات تازہ نہ پیدا ہو جائے ۔ سر شفیع کے ساتھ ان کے تعاون عمل کی یہی حقیقی توجیہہ ہے ۔ انگریزی غلامی کے بندھنوں کو مضبوط کرنا نہیں بلکہ انقلاب کے دھارے کو مسلمانوں کی خودی پر حملہ آور ہونے سے باز رکھنا ، سر شفیع کے ساتھ اقبال کی رفاقت کا منشاء حقیقی تھا ۔

مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں ۔

" ان کے قریب جو لوگ رہے ہیں اور جن کو گہرے ربط و ضبط کی بناء پر ان کی اندرونی زندگی اور ان کے اندرونی خیالات کا علم ہے ، وہ جانتے ہیں کہ انگریزی سیاست سے ان کو خیال اور عمل دونوں میں سخت نفرت تھی ۔ بارگاہ حکومت سے وہ کوسوں دور بھاگتے تھے ۔ سرکار اور اس کے پرستار دونوں سے سخت بدگمان تھے اور ان کی ذات کو اپنے مقاصد میں بارج سمجھتے تھے ۔ سیاست میں ان کا نصب العین محض کامل آزادی ہی نہ تھا بلکہ وہ آزاد ہندوستان میں دارالسلام کو اپنا حقیقی مقصود بنائے ہوئے تھے ۔ اس لیے کسی ایسی تحریک کا ساتھ دینے پر آمادہ نہ تھے جو ایک دارالکفر کو دوسرے دارالکفر میں تبدیل کرنے والی ہو ۔ صرف یہی وجہ ہے کہ انھوں نے عملی سیاسیات میں ان لوگوں کے ساتھ مجبوراً تعاون کیا جو برٹش گورنمنٹ کے زیر سایہ ہندو راج کے قیام کی مخالفت کر رہے تھے ۔ گو مقاصد کے اعتبار سے ان میں اور اس طبقہ میں کوئی رابط نہ تھا مگر صرف اس مصلحت نے ان کو اس طبقہ کے ساتھ جوڑ رکھا تھا کہ جب تک مسلمان نوجوانوں میں دارالسلام کا نصب العین ایک آتش فروزاں کی طرح

بیزار نہ اٹھے اور وہ اس کے لیے سرفروشانہ جد و جہد پر آمادہ نہ ہوں ، اس وقت تک کم از کم انقلاب کے رخ کو بالکل دوسری جانب پلٹ جانے سے روکے رکھا جائے۔ اس بناء پر انہوں نے ایک طرف اپنی شاعری سے نوجوانان اسلام کے دلوں میں وہ روح پھونکنے کی کوشش کی ، جس سے سب لوگ واقف ہیں اور دوسری طرف عملی سیاسیات میں وہ روش اختیار کی ، جس کے اصل مقصود سے چند خاص آدمیوں کے سوا کوئی واقف نہیں اور جس کے بعض ظاہری پہلوؤں کی وجہ سے وہ خود اپنے بہترین عقیدت مند معترضین تک کے طعنے سنتے رہے[۱۷] "

یہ ہے ان دلائل کی حقیقت جو اقبال کو برطانیہ کا دوست اور انگریز کا ہوا خواہ ثابت کرنے کے لیے پیش کیے جاتے ہیں - ہمیں یقین ہے کہ گذشتہ صفحات میں اقبال کی سیاسی زندگی کی جو روئیداد پیش کی گئی ہے ، اس کو غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے پڑھنے کے بعد ، ہر شخص ان اعتراضات کی کمزوریوں کو خود ہی محسوس کر لے گا ان اعتراضات کی بنیاد دراصل غلط فہمی اور تعصب پر رکھی گئی ہے - حقیقت یہ ہے کہ اقبال نہ صرف انگریز کی سیاسی بالا دستی کے خلاف تھے بلکہ اس کے نظام تمدن و ثقافت ، طرز معشیت و سیاست ، اصول اخلاق و معاشرت ، غرض کہ مغربی فلسفہ حیات کے سخت دشمن تھے، ان کے کلام و پیام کا ایک بڑا حصہ ، اسی طرز زندگی کی مخالفت سے بھرا پڑا ہے - جتنی شدت کے ساتھ انہوں نے مغربی نظام زندگی اور اس کے مختلف شعبوں پر تنقید کی ہے ، اتنی شاید ہندوستان کے کسی اور سیاسی مفکر نے نہیں کی - ہندوستان کے سیاسی قائدین اور مفکرین کی ایک بڑی تعداد تو ایسی تھی ، جو صرف ہندوستان کو انگریز کی غلامی سے نجات دلانا چاہتی تھی ، لیکن خود ان کے ذہن و دماغ انگریز کی برتری و سیادت سے آزاد نہ تھے - وہ

۱۷- " جوہر اقبال " مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ، ناشر مکتبہ جامعہ ، مطبوعہ محبوب المطابع ، برقی پریس دہلی ، ص ۴۰ و ۴۱ -

انگریز کی معاشرت و معیشت کے دلدادہ تھے - یورپی تہذیب کی چمک نے ان کی آنکھیں خیرہ کر دی تھیں - ان کے فلسفہ، اخلاق و نظامِ تمدن سے ان کے دماغ بے حد متاثر تھے اور ان کے نظامِ سیاست کے تو وہ اتنے گرویدہ تھے کہ وہ ان ہی سیاسی ادارات کو اپنے ملک میں آنکھیں بند کرکے رائج کرنا چاہتے تھے - وہ انگریز قوم کی غلامی سے نجات کے خواہاں ضرور تھے مگر وہ مغربی نظامِ حیات کے گرویدہ تھے - ان کے نزدیک ہندوستان کی آزادی کا مفہوم یہ تھا کہ جو مٹھی بھر انگریز اس وقت ہندوستان پر حکمران تھے ، انھیں فوری یا رفتہ رفتہ ہندوستان سے نکال باہر کیا جائے مگر ہندوستان کی زندگی ——— سیاسی ، معاشی ، معاشرتی ، اخلاق و روحانی زندگی — کا نقشہ ان ہی خطوط پر بنایا جائے جو اس انگریز نے ہندوستان کی تاریخ کے صفحات پر کھینچ دئے ہیں ! ! یہ تھی حقیقت اس بلند آہنگ نعرہ' آزادی اور انگریز دشمنی کی ! ! اقبال کے پاس آزادی کا تصور اس سے بالکل مختلف ہے وہ انگریز اور انگریز کے نظامِ حیات دونوں کا مخالف ہے ——— شاید انگریز کا کم اور انگریز کے نظامِ حیات کا زیادہ ——— وہ ہندوستان کو نہ صرف انگریز قوم کے چنگل سے چھڑانا چاہتا تھا بلکہ مغربی نظامِ حیات ، معاشرت و معیشت ، سیاست و ثقافت کی زنجیروں سے بھی نجات دلانا چاہتا تھا اور اس کی اصلی جنگ انگریز قوم سے نہ تھی بلکہ اس کے لائے ہوئے اور بنائے ہوئے نظامِ زندگی سے تھی - وہ انگریز کا مخالف اور ہندوستان کی آزادی کا خواہاں اسی لیے تھا کہ وہ یہاں اس نظامِ زندگی کو رائج دیکھنا نہیں چاہتا تھا - صحیح معنی میں اس کا ذہن و دماغ آزاد تھا کیونکہ وہ ہندوستان کو انگریز اور انگریز کے نظامِ زندگی دونوں سے آزاد کرانا چاہتا تھا -

یہ خیال غلط ہے کہ اقبال صرف اپنے کلام کے آئینہ میں آزاد نظر آتا ہے اور عملی زندگی میں آزادی کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی تھی - یہاں ہم اقبال کی زندگی کے بعض ایسے واقعات کا ذکر کرنا چاہتے ہیں ، جو نہ صرف اس کی حریت فکر بلکہ آزادیِ عمل کے روشن ثبوت ہیں -

ہم بیان کر چکے ہیں کہ ڈاکٹر صاحب ولایت جانے سے قبل تقریباً چھ سال لکچرار و مددگار پروفیسر رہ چکے تھے اور ولایت سے واپسی کے بعد انہیں گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ کا پروفیسر اعلیٰ مقرر کیا گیا تھا اور ساتھ ہی حکومت نے بیرسٹری کی اجازت بھی دے رکھی تھی۔ اس سہولت سے وہ تقریباً ۱۸ ماہ فائدہ اٹھاتے رہے، لیکن اس کے بعد انھوں نے پروفیسری سے استعفا دے دیا۔ یہاں یہ واضح رہے کہ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا جو پہلو سب سے زیادہ تابناک نظر آتا ہے، وہ ان کی علم دوستی ہے۔ ان کا کلام تو تمام تر عالمانہ ہی ہے، لیکن ان کے خطوط سے جس علمی ذوق و تجسس کا اظہار ہوتا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اس لیے طبعاً ان کے لیے تعلیم و تعلم کا پیشہ نہایت موزوں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے دوست احباب اس امر پر جھنجھلایا کرتے تھے کہ انھوں نے پروفیسری چھوڑ کر بیرسٹری اختیار کر رکھی تھی، لیکن پروفیسری سے مناسبت طبع کے باوجود انھوں نے کیوں استعفا دیا؟ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے ان سے ایک بار یہی سوال کیا۔ جواب میں علامہ اقبال نے فرمایا۔

"میں نے کچھ دنوں پروفیسری کی اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں، البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ دل میں ٹھان لی ہے کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا[18]"

ممکن ہے کہ استعفاء کے اس واقعہ کو محض ذاتی رنجش کا نتیجہ سمجھا

۱۸- آثار اقبال، مرتبہ غلام دستگیر رشید، ناشر ادارہ اشاعت اردو، حیدر آباد دکن، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع ص ۲۲ و ۲۳ -

جائے لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس استعفا کا اصلی محرک پرنسپل کا ایک چھوٹے سے واقعہ پر اقبال سے الجھ جانا نہ تھا کیونکہ استعفا دینے کے بعد خود پرنسپل نے بہت کوشش کی کہ ڈاکٹر صاحب استعفا واپس لے لیں ، مگر انھوں نے انکار کر دیا[۱۹] ۔ ممکن ہے کہ یہ جھگڑا استعفا کا فوری سبب بنا ہو ، لیکن اصلی و بنیادی اسباب تھے ، حریت فکر و عمل اور آزادئ ضمیر ۔ چنانچہ استعفا دے کر گھر آئے تو دوستوں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے ملازمت کیوں چھوڑ دی ؟ انھوں نے جواب دیا کہ ملازم رہ کر میں آزادی سے اپنے خیالات ظاہر نہیں کر سکتا تھا ۔ دوستوں کی محفل میں اس سے زیادہ وضاحت کی ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اقبال کے خیالات کیا ہیں اور دائرۂ ملازمت میں رہ کر ان کے اظہار میں اصلی رکاوٹ کیا تھی ۔ لیکن وہ اپنے خادم علی بخش کو صرف اشاروں اور کنایوں میں استعفا کے وجوہ سمجھا نہیں سکتے تھے ۔ اس لیے بہت ہی صاف صاف انداز میں اسے بتانا پڑا ۔ علی بخش کا بیان ہے کہ جس دن وہ استعفا دے کر واپس آئے ہیں ، میں نے پوچھا کہ شیخ صاحب آپ نے نوکری کیوں چھوڑ دی ، کہنے لگے ۔

"علی بخش ! انگریز کی ملازمت میں بڑی مشکل ہے ۔ سب سے بڑی مشکل یہ ہے کہ میرے دل میں کچھ باتیں ہیں ، جنھیں میں لوگوں تک پہنچانا چاہتا ہوں ، مگر انگریز کا نوکر رہ کر انھیں کھلم کھلا نہیں کہہ سکتا ۔ میں اب بالکل آزاد ہوں ، جو چاہوں کروں ، جو چاہوں کہوں ۔ شاید یہ پھانس جو مدت سے میرے دل میں کھٹکتی ہے اب نکل جائے[۲۰] "

واضح رہے کہ یہ بیان علی بخش کا ہے ، جس کو اقبال کی زندگی کے ان متنازعہ فیہ مسائل سے کوئی تعلق نہیں ۔ وہ ان کا خادم خاص ہے اور

۱۹- حیات اقبال ص ۶۲ ۔

۲۰- اقبال نامہ ، مرتبہ چراغ حسن حسرت صاحب ، مضمون " ڈاکٹر اقبال کی کہانی ، میاں علی بخش کی زبانی " ص ۲۹ ،

خادم ہونے کی حیثیت سے اس نے ان سے یہ بات پوچھی تھی - پھر اقبال نے تعلی و خود ستائی کے طور پر یہ بات بھی اس سے بیان نہیں کی تھی - علی بخش کے بیان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ استعفا کی اصلی وجہ ضمیر کی آزادی اور حریتِ عمل تھی - یہاں یہ واقعہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ علامہ مرحوم کی مالی حالت اس زمانہ میں جبکہ انھوں نے استعفا دیا ، کچھ اچھی نہیں تھی - وہ کسی امیر گھرانے کے فرد نہ تھے - ان کے والد ایک معمولی تاجر تھے - ان کی اعلی تعلیم کے اخراجات ان کے بڑے بھائی نے برداشت کیے تھے اور وہ چاہتے تھے کہ بھائی کے قرض کو جلد از جلد ادا کر دیں - ان حالات میں یہ موقع بہت غنیمت تھا کہ وہ پروفیسری کے ذریعہ ہر ماہ ایک بندھی ہوئی رقم حاصل کرتے اور اپنی آمدنی میں بیرسٹری کے ذریعہ اضافہ کرتے لیکن محض حریتِ خیال اور آزادیٔ ضمیر کی خاطر انھوں نے اپنے ایک ذریعہ معاش کو ترک کر دیا تھا ——— یہ شاعرِ مشرق کی پہلی قربانی تھی جو اس نے آزادی کی راہ میں ادا کی !!

آزادی کی خاطر انھوں نے اس کے بعد بھی انڈین ایجوکیشنل سروس میں اس عہدے کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ، جو خود حکومت نے ان کی خدمت میں پیش کیا تھا[۲۱] - سنہ ۱۹۰۹ع میں انھیں علیگڑھ کے شعبہ فلسفہ کی پروفیسری اور گورنمنٹ کالج لاہور کے شعبہ تاریخ کی پروفیسری پیش کی گئی تھی لیکن اس پروفیسری کو بھی وہ قیدِ ملازمت ہی سمجھتے تھے ، حالانکہ شخصی آزادی کے نقطۂ نظر سے درس و تدریس کا پیشہ ہی ایک ایسا پیشہ ہے جو ملازمت کی ذلتوں سے بڑی حد تک محفوظ ہے - لیکن وہ اپنی طبیعت پر اس ہلکے سے بوجھ کو بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے - چنانچہ انھوں نے ان دونوں خدمتوں سے انکار کر دیا تھا[۲۲] - گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے پنجاب کے لفٹننٹ گورنر ، وزیر

۲۱- اقبال کامل ، از مولانا عبدالسلام ندوی ، ناشر دارالمصنفین اعظم گڈھ مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۳ -

۲۲- مکاتیبِ اقبال ، حصہ دوم ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، ناشر شیخ محمد اشرف ، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور سنہ ۱۹۵۱ع ص ۱۱۸ -

پند سے ان کی سفارش کرنا چاہتے تھے اور انہیں یہ اعتراف بھی تھا کہ یہ پیشہ ان کے میلان طبع کے موافق ہے لیکن وہ ضمیر کی حریت اور عمل کی آزادی کو زیادہ عزیز رکھتے تھے ۔ چنانچہ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" لفٹنٹ گورنر گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری کے لیے سیکرٹری آف اسٹیٹ سے میری سفارش کرنے پر آمادہ تھے لیکن میں نے اپنے میلانِ طبع کے خلاف اس اسامی کی امیدواری سے دست برداری کر لی ہے[۲۳] "

بہرحال خیال کی دنیا ہی میں انہوں نے آزادی کے نغمے نہیں گائے ہیں بلکہ عمل کی فضا میں بھی انہوں نے قیود و پابندیوں کو برداشت نہیں کیا ۔ ذاتی و خاندانی حالات ، مالی مشکلات اور میلانِ طبع کا اقتضاء یہ تھا کہ وہ پروفیسری سے استعفا نہ دیتے اور ان تمام سہولتوں سے فائدہ اٹھاتے جو گورنمنٹ نے انہیں دے رکھی تھیں ۔ پروفیسری جیسے باوقار و معزز منصب کو بھی وہ قیدِ ملازمت اور انگریز کی غلامی کی ہی ایک شکل سمجھتے تھے اور ان کی آزاد طبع پر یہ قید بھی بھاری تھی ۔ اسی لئے انہوں نے اس سے استعفا دے دیا اور اس کے بعد کبھی کوئی سرکاری عہدہ قبول نہیں کیا ۔ پروفیسری سے استعفا دینے کے بعد وہ پیشۂ وکالت کی طرف زیادہ توجہ دینے لگے لیکن معاشی نقطۂ نظر سے یہ پیشہ ان کے لیے کچھ زیادہ فائدہ بخش ثابت نہ ہوا ۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب کا بیان ہے کہ ۔

" بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی ان کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپیہ سے متجاوز نہیں ہوئی[۲۴] "

۲۳۔ ایضاً ص ۱۲۷ ۔

۲۴۔ آثار اقبال ، مرتبہ غلام دستگیر رشید ، ناشر ادارۂ اشاعت اردو ، حیدر آباد دکن ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع ص ۲۵ ۔

ظاہر ہے کہ یہ آمدنی اقبال کے شایانِ شان نہ تھی۔ ان کے سامنے معمولی وکلاء اس سے زیادہ کما لیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ اقبال کی مہارتِ قانونی میں کسی کو شک تھا۔ بنچ اور بار دونوں کو ان کی قانون دانی کا اعتراف تھا۔ ایک سے زائد مرتبہ لاہور کی ججی کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا، لیکن بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ آمدنی کے نقطۂ نظر سے وہ اپنے زمانے کے کامیاب وکلاء میں شمار نہیں کیے جاتے تھے اور ان کی آمدنی بھی بس یوں ہی سی تھی۔ اس کی اصل وجہ بھی اقبال کی آزادیٔ طبع تھی۔ پیشہ وکالت میں کامیابی کا راز قانون سے زیادہ جج کو سمجھنے میں مضمر ہے۔ ایک کامیاب وکیل پہلے جج کو رام کرتا ہے اور قانون کی اپنے موافق تعبیر و توجیہہ بعد میں کرتا ہے۔ اور اس کے لیے اس کو وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کو عام طور پر ذرا شریفانہ انداز میں دنیا سازی کہا جاتا ہے —— تملق و چاپلوسی بھی کرنی پڑتی ہے، ڈنر اور عصرانے بھی دینے پڑتے ہیں —— پھر اگر حاکمِ عدالت واقعی حاکمِ وقت بھی ہو، حاکمِ قوم کا فرد بھی ہو تو نوبت تملق و چاپلوسی، ڈنر اور عصرانوں سے گزر کر محفلِ اکل و شرب نائٹ کلب اور ناچ گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ اقبال کے زمانے میں بھی کامیاب وکالت کی یہی ترکیبیں تھیں۔ لیکن انہیں ان سے کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ نفرت سی تھی۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں۔

"ہم نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کبھی کبھی کھانے پر حکام کو اپنے یہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ اکل و شرب کی دعوت ہے۔ وہ اکثر بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں ان کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہمارے مشورے قابل قبول نہ ہوتے۔ وہ یہی جواب دیتے کہ وہ ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی ان کی دلچسپیوں کے دائرے سے

باہر تھا[۲۵]''

الغرض پیشہ وکالت میں ان کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی انگریز کی غلامی اور خوشامد سے نفرت تھی ۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری عمر ، معاشی سکون اور آسودہ حالی سے نا آشنا رہی ۔

اکثر ٹوڈی و سرکار پرستوں کی معراج یہی تھی کہ کوئی حاکم وقت انگریز کلکٹر ، انگریز کمشنر یا انگریز گورنر ان کو اپنی کسی پارٹی میں یاد فرمائے اور شرفِ تکلم بخشے ۔ اقبال اگر سرکار پرست تھے تو انھیں بھی ایسے مواقع کا متلاشی رہنا چاہیے تھا ۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ سن لیجیئے ۔ ایک دفعہ دلی میں وائسرائے سے ان کی ملاقات ہوئی ۔ وائسرائے نے ان سے کہا کہ کل میرے ساتھ کھانا کھایئے ۔ سرکار پرست اقبال کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا تھا کہ انگریز کمشنر ، کلکٹر اور گورنر ، نہیں بلکہ گورنروں کا گورنر اور تاج کا نمائندہ اقبال کو بطور خاص دعوت اکل و شرب دے رہا ہے ! اقبال پر انگریز کی غلامی کی پھبتیاں کسنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ اقبال نے خندہ پیشانی کے ساتھ وائسرائے کی اس دعوت کو قبول کر لیا ہوگا اور اس کی زبان پر تشکر و امتنان کے الفاظ بے ساختہ آگئے ہوں گے ۔ لیکن واقعہ کیا پیش آیا ؟ ـــــــ واقعہ یہ پیش آیا کہ علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں کل دلی سے لاہور چلا جاؤں گا ، اس لیے آپ کی دعوت قبول نہیں کر سکتا'' وائسرائے کی دعوت اور اس سے انکار ! اور اس انکار کی وجہ نا سازی طبع ، شدید مصروفیات نہیں بلکہ صرف اپنے پروگرام کی پابندی اور محض دلی سے لاہور جانے کا خیال ! وائسرائے کی اس دعوت کی خاطر اپنی اہم ترین مصروفیات کے ترک کرنے والے اور اپنی عزیز و قریب کی میت کو چھوڑ کر اس میں سر کے بل چل کر آنے والے تو ہندوستان کے گورنر جنرل نے بہت دیکھے ہوں گے ، مگر محض لاہور کی واپسی کے خیال سے اس کی دعوت کو ٹھکرانے والے سر پھرے اقبال

۲۵- ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ، بار اول ص ۹۷ ۔

کو اس نے شاید پہلی بار دیکھا ہو ! !

ہندوستان کی ماضی بعید کی نہیں ماضی قریب کی تاریخ میں سرکار پرستوں اور انگریز کے ہوا خواہوں نے کیا کیا نہیں کیا - اپنے نام و نمود اور اپنی جلبِ منفعت اور حصولِ منصب کی خاطر ملک و ملت کے مفادات کو کس کس طرح قربان نہیں کیا ، اپنی تہذیب و تمدن ، اپنی ثقافت و معاشرت کے اصولوں کو کیسے کیسے نہیں توڑا اور اپنے مذہب کے ان عقائد و خصوصیات کو جن کو وہ خود بھی بر حق سمجھتے تھے ، کس کس طرح اپنے ہی ہاتھوں ذبح نہیں کیا ؟

اقبال کے سامنے بھی حکومتِ وقت نے بڑے بڑے مناصب پیش کئے لیکن "سرکار پرست اقبال" نے ان کو محض اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس قبولیت کی وجہ سے اس کے بعض اصولوں پر آنچ آتی تھی - صرف ایک واقعہ سن لیجیے - مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں -

"ایک مرتبہ حکومتِ ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا ، مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے - اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور خود لارڈ و لنگڈن (وائسرائے وقت) سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہ گار آدمی ہوں ، احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوئی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کا حکم توڑ دوں[۲۶]"۔

——— اللہ اللہ ! سرکار پرست اقبال کتنا رجعت پسند اور دقیانوسی ہے ! ! اسی سلسلے میں اقبال کی زندگی کے بعض واقعات پر ایک نظر ڈال

۲۶- جوہر اقبال - مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - مطبوعہ محبوب المطابع دہلی - ص ۳۸ و ۳۹

لیجیئے - "۱۹۲۴ء میں سر فضل حسین نے سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) کو ترغیب دی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو ججی کا عہدہ دیں ، لیکن یہ امر زیر تجویز تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے حکومت پر بے لگام تنقید لکھ کر سرکاری افسران کی ہمدردیاں کھو دیں[۲۷]"

"۱۹۲۷ء میں ایک تجویز یہ تھی کہ آنے والی سیاسی اصلاحات کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مطالبات وزیر ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک مسلم وفد انگلستان روانہ کیا جائے - سر فضل حسین نے ڈاکٹر اقبال سے اس وفد کی رہنمائی کے لیے کہا اور اس غرض کے لیے تین ہزار روپیہ اکٹھا کیے - یہ چیز ڈاکٹر اقبال کے لیے درجہ اول کی سیاسی زندگی کو یقینی بنا دیتی ، لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ مزید چند ہزار روپیوں کا خرچ لا حق ہوتا تھا - ان کے بجائے سر ظفراللہ جانے کے لیے راضی ہو گئے اور انھوں نے اپنے لیے روشن مستقبل متیقن کر لیا[۲۸]"۔

گذشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں حکومتِ برطانیہ اور وزیر اعظم پر سخت تنقید کی تھی جس کی وجہ سے حکومت ان سے سخت ناراض ہو گئی اور اسی لئے اس نے سر فضل حسین کی کوششوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے مجلس اقوام میں بھیجنے سے انکار کر دیا - اس کے بعد بھی سر فضل حسین نے کوشش کی کہ حکومت علامہ اقبال کو پبلک سروس کمیشن کا رکن بنا دے لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ آزاد روش حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی - اسی لیے وہ پبلک سروس کمیشن کے رکن نہیں بنائے گے[۲۹]۔

اپنی آزاد خیالی اور مخالفِ برطانیہ روش کے باعث اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے بعض بڑے اچھے مواقع انھوں نے کھو دیئے اور اس طرح

۲۷- فضل حسین - "ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) مرتبہ عظیم حسین - مطبوعہ جمشید پریس بمبئی - ستمبر ۱۹۴۵ء - ص ۳۱۸ و ۳۱۹

۲۸- ایضاً ص ۳۱۹

۲۹- ایضاً ص ۳۲۰

ظاہر ہے کہ یہ آمدنی اقبال کے شایانِ شان نہ تھی۔ ان کے سامنے معمولی وکلاء اس سے زیادہ کما لیا کرتے تھے۔ یہ بات بھی نہ تھی کہ اقبال کی مہارتِ قانونی میں کسی کو شک تھا۔ بنچ اور بار دونوں کو ان کی قانون دانی کا اعتراف تھا۔ ایک سے زائد مرتبہ لاہور کی ججی کے سلسلے میں ان کا نام لیا گیا، لیکن بہرحال یہ امر واقعہ ہے کہ آمدنی کے نقطۂ نظر سے وہ اپنے زمانے کے کامیاب وکلاء میں شمار نہیں کیے جاتے تھے اور ان کی آمدنی بھی بس یوں ہی سی تھی۔ اس کی اصل وجہ بھی اقبال کی آزادیٔ طبع تھی۔ پیشہ وکالت میں کامیابی کا راز قانون سے زیادہ جج کو سمجھنے میں مضمر ہے۔ ایک کامیاب وکیل پہلے جج کو رام کرتا ہے اور قانون کی اپنے موافق تعبیر و توجیہہ بعد میں کرتا ہے۔ اور اس کے لیے اس کو وہ سب کچھ کرنا پڑتا ہے جس کو عام طور پر ذرا شریفانہ انداز میں دنیا سازی کہا جاتا ہے —— تملق و چاپلو سی بھی کرنی پڑتی ہے، ڈنر اور عصرانے بھی دینے پڑتے ہیں —— پھر اگر حاکمِ عدالت واقعی حاکمِ وقت بھی ہو، حاکمِ قوم کا فرد بھی ہو تو نوبت تملق و چاپلوسی، ڈنر اور عصرانوں سے گزر کر محفلِ اکل و شرب نائٹ کلب اور ناچ گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ اقبال کے زمانے میں بھی کامیاب وکالت کی یہی ترکیبیں تھیں۔ لیکن انہیں ان سے کوئی مناسبت ہی نہیں بلکہ نفرت سی تھی۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں۔

"ہم نے کئی مرتبہ ڈاکٹر صاحب کو مشورہ دیا کہ وہ کبھی کبھی کھانے پر حکام کو اپنے یہاں مدعو کر لیا کریں۔ انگریز کو رام کرنے کا بہترین طریقہ اکل و شرب کی دعوت ہے۔ وہ اکثر بڑے وعدے ایسی ہی صحبتوں میں کیا کرتا ہے اور جو تعلقات کھانے کی میز پر قائم ہوتے ہیں ان کا احترام اسے ہمیشہ ملحوظ خاطر رہتا ہے۔ مگر ڈاکٹر صاحب کے نزدیک ہمارے مشورے قابل قبول نہ ہوتے۔ وہ یہی جواب دیتے کہ وہ ایسی تقریبات پر روپیہ ضائع کرنا پسند نہیں کرتے، کیونکہ انگریز کو رام کرنے کا سوال ہی ان کی دلچسپیوں کے دائرے سے

باہر تھا[۲۵]"

الفرض پیشہ وکالت میں ان کی ناکامی کی بڑی وجہ یہی انگریز کی غلامی اور خوشامد سے نفرت تھی - اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی پوری عمر ، معاشی سکون اور آسودہ حالی سے نا آشنا رہی -

اکثر ٹوڈی و سرکار پرستوں کی معراج یہی تھی کہ کوئی حاکم وقت انگریز کلکٹر ، انگریز کمشنر یا انگریز گورنر ان کو اپنی کسی پارٹی میں یاد فرمائے اور شرفِ تکلم بخشے - اقبال اگر سرکار پرست تھے تو انہیں بھی ایسے مواقع کا متلاشی رہنا چاہیے تھا - اس سلسلہ میں ایک واقعہ سن لیجیئے - ایک دفعہ دلی میں وائسرائے سے ان کی ملاقات ہوئی - وائسرائے نے ان سے کہا کہ کل میرے ساتھ کھانا کھایئے - سرکار پرست اقبال کے لئے اس سے بڑا اعزاز کیا ہو سکتا تھا کہ انگریز کمشنر ، کلکٹر اور گورنر ، نہیں بلکہ گورنروں کا گورنر اور تاج کا نمائندہ اقبال کو بطور خاص دعوت اکل و شرب دے رہا ہے ! اقبال پر انگریز کی غلامی کی پھبتیاں کسنے والے تو یہی سمجھیں گے کہ اقبال نے خندہ پیشانی کے ساتھ وائسرائے کی اس دعوت کو قبول کر لیا ہوگا اور اس کی زبان پر تشکر و امتنان کے الفاظ بے ساختہ آگئے ہوں گے - لیکن واقعہ کیا پیش آیا ؟ ——— واقعہ یہ پیش آیا کہ علامہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ "میں کل دلی سے لاہور چلا جاؤں گا ، اس لیے آپ کی دعوت قبول نہیں کر سکتا" وائسرائے کی دعوت اور اس سے انکار ! اور اس انکار کی وجہ نا سازی طبع ، شدید مصروفیات نہیں بلکہ صرف اپنے پروگرام کی پابندی اور محض دلی سے لاہور جانے کا خیال ! وائسرائے کی اس دعوت کی خاطر اپنی اہم ترین مصروفیات کے ترک کرنے والے اور اپنی عزیز و قریب کی میت کو چھوڑ کر اس میں سر کے بل چل کر آنے والے تو ہندوستان کے گورنر جنرل نے بہت دیکھے ہوں گے ، مگر محض لاہور کی واپسی کے خیال سے اس کی دعوت کو ٹھکرانے والے سر پھرے اقبال

۲۵- ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ، بار اول ص ۹۷ -

کو اس نے شاید پہلی بار دیکھا ہو ! !

ہندوستان کی ماضی بعید کی نہیں ماضی قریب کی تاریخ میں سرکار پرستوں اور انگریز کے ہوا خواہوں نے کیا کیا نہیں کیا - اپنے نام و نمود اور اپنی جلبِ منفعت اور حصولِ منصب کی خاطر ملک و ملت کے مفادات کو کس کس طرح قربان نہیں کیا ، اپنی تہذیب و تمدن ، اپنی ثقافت و معاشرت کے اصولوں کو کیسے کیسے نہیں توڑا اور اپنے مذہب کے ان عقائد و خصوصیات کو جن کو وہ خود بھی بر حق سمجھتے تھے ، کس کس طرح اپنے ہی ہاتھوں ذبح نہیں کیا ؟

اقبال کے سامنے بھی حکومتِ وقت نے بڑے بڑے مناصب پیش کئے لیکن ''سرکار پرست اقبال'' نے ان کو محض اس لیے قبول کرنے سے انکار کر دیا کہ اس قبولیت کی وجہ سے اس کے بعض اصولوں پر آنچ آتی تھی - صرف ایک واقعہ سن لیجیے - مولانا ابوالاعلیٰ مودودی لکھتے ہیں -

> ''ایک مرتبہ حکومتِ ہند نے ان کو جنوبی افریقہ میں اپنا ایجنٹ بنا کر بھیجنا چاہا اور یہ عہدہ ان کے سامنے باقاعدہ پیش کیا ، مگر شرط یہ تھی کہ وہ اپنی بیوی کو پردہ نہ کرائیں گے اور سرکاری تقریبات میں لیڈی اقبال کو ساتھ لے کر شریک ہوا کریں گے - اقبال نے اس شرط کے ساتھ یہ عہدہ قبول کرنے سے صاف انکار کر دیا اور خود لارڈ و لنگڈن (وائسرائے وقت) سے کہا کہ میں بے شک ایک گنہ گار آدمی ہوں ، احکام اسلامی کی پابندی میں بہت کوتاہیاں مجھ سے ہوئی ہیں مگر اتنی ذلت اختیار نہیں کر سکتا کہ محض آپ کا ایک عہدہ حاصل کرنے کے لیے شریعت کا حکم توڑ دوں[۲۶]''۔

——— اللہ اللہ ! سرکار پرست اقبال کتنا رجعت پسند اور د قیانوسی ہے ! ! اسی سلسلے میں اقبال کی زندگی کے بعض واقعات پر ایک نظر ڈال

۲۶- جوہر اقبال - مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی - مطبوعہ محبوب المطابع دہلی - ص ۳۸ و ۳۹

لیجیئے - "۱۹۲۴ع میں سر فضل حسین نے سر میلکم ہیلی (گورنر پنجاب) کو ترغیب دی کہ وہ ڈاکٹر اقبال کو ججی کا عہدہ دیں ، لیکن یہ امر زیر تجویز تھا کہ ڈاکٹر صاحب نے حکومت پر بے لگام تنقید لکھ کر سرکاری افسران کی ہمدردیاں کھو دیں۲۷"

"۱۹۲۷ع میں ایک تجویز یہ تھی کہ آنے والی سیاسی اصلاحات کے سلسلہ میں مسلمانوں کے مطالبات وزیر ہند کے سامنے پیش کرنے کے لیے ایک مسلم وفد انگلستان روانہ کیا جائے - سر فضل حسین نے ڈاکٹر اقبال سے اس وفد کی رہنمائی کے لیے کہا اور اس غرض کے لیے تین ہزار روپیہ اکٹھا کیے - یہ چیز ڈاکٹر اقبال کے لیے درجہ اول کی سیاسی زندگی کو یقینی بنا دیتی ، لیکن انھوں نے جانے سے انکار کر دیا کیونکہ مزید چند ہزار روپیوں کا خرچ لا حق ہوتا تھا - ان کے بجائے سر ظفراللہ جانے کے لیے راضی ہو گئے اور انھوں نے اپنے لیے روشن مستقبل متیقن کر لیا۲۸"۔

گذشتہ صفحات میں ہم بیان کر چکے ہیں کہ علامہ اقبال نے آل انڈیا مسلم کانفرنس کے اجلاس میں حکومتِ برطانیہ اور وزیر اعظم پر سخت تنقید کی تھی جس کی وجہ سے حکومت ان سے سخت ناراض ہو گئی اور اسی لئے اس نے سر فضل حسین کی کوششوں کے باوجود ڈاکٹر صاحب کو ہندوستانی وفد کے رکن کی حیثیت سے مجلس اقوام میں بھیجنے سے انکار کر دیا - اس کے بعد بھی سر فضل حسین نے کوشش کی کہ حکومت علامہ اقبال کو پبلک سروس کمیشن کا رکن بنا دے لیکن ڈاکٹر صاحب کی یہ آزاد روش حکومت کی آنکھوں میں کھٹک رہی تھی - اسی لیے وہ پبلک سروس کمیشن کے رکن نہیں بنائے گئے۲۹۔

اپنی آزاد خیالی اور مخالفِ برطانیہ روش کے باعث اپنی زندگی کو کامیاب بنانے کے بعض بڑے اچھے مواقع انھوں نے کھو دیئے اور اس طرح

۲۷- فضل حسین - "ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) مرتبہ عظیم حسین - مطبوعہ جمشید پریس بمبئی - ستمبر ۱۹۴۵ع - ص ۳۱۸ و ۳۱۹

۲۸- ایضاً ص ۳۱۹

۲۹- ایضاً ص ۳۲۰

ساری عمر معاشی تنگی اور عسرت میں گذار دی ——— اور آخری عمر میں حال کیا تھا ؟ سر فضل حسین نے میاں امیر الدین کو لکھا " اقبال کیسے ہیں ؟ کچھ دن ہوئے میں نے سنا ہے کہ ان کے مزاج ناساز ہیں اور یہ کہ وہ بعض مالی مشکلات میں ہیں ۔ میں خوش ہوں گا اگر تم بہت ہی راز دارانہ طریقہ سے بتاؤ کہ صحیح حالت کیا ہے ۔ میں کالج کے زمانے سے ان کا بڑا مداح رہا ہوں ، ایک بار پھر میں ان کو مدد پہنچانے کی کوشش کرنا چاہتا ہوں مگر مجھے صحیح طور پر معلوم ہو جائے کہ آج کل صحت ، مالیات اور حقیقی مشغلۂ وکالت کے لحاظ سے وہ کیسے ہیں ۔ میاں امیر الدین نے جواب دیا کہ ڈاکٹر اقبال نے ۱۹۳۱ء سے وکالت ترک کر دی ہے ان کی صحت اور اسی طرح ان کی مالی حالت خراب ہے اور ان کی آواز سرعت کے ساتھ بیٹھی جا رہی ہے[۳۰]" ——— کیا انگریز کے ہوا خواہوں اور سرکار کے نیاز مندوں کی زندگی کا بھی یہی حال رہا ہے ؟

اقبال نے گورنمنٹ کالج لاہور کی پروفیسری سے استعفاء دیا ، لفٹنٹ گورنر کی کوششوں کے باوجود گورنمنٹ کالج کے شعبۂ تاریخ کی پروفیسری قبول کرنے پر آمادہ نہ ہوئے ، انڈین ایجوکیشنل سروس میں حکومت کے پیش کردہ عہدے کو مسترد کر دیا ، اپنی وکالت چمکانے کے لیے انگریز عہدہ داروں کی منت خوشامد نہ کی ، وائسرائے کی دعوتوں کو ٹھکرایا ، افریقہ میں حکومت کے ایجنٹ جنرل بننے سے خود وائسرائے ولنگڈن کے منہ پر انکار کر دیا ، جانتے بوجھتے مجلس اقوام کی نمائندگی اور پبلک سروس کمیشن کی رکنیت کے مواقع کھو دیئے ——— اور ساری عمر قلیل ترین آمدنی پر گذار دی ! اس کے باوجود نکتہ چین اور معترضین یہی کہتے رہے کہ اقبال ، برطانیہ کا ہوا خواہ ، انگریز کا نیاز مند اور امپریزم کا ایجنٹ ہے ! ! واہ رے سرکار کے اقبال ! ! !

(ب) فرقہ پرستی ——— اقبال کے فردِ جرم کا یہ جلی عنوان ہے ۔ یہ الزام مساوی شدت کے ساتھ ان کے شاعری اور سیاست دونوں پر لگایا

۳۰۔ فضل حسین "ایک سیاسی سوانح عمری" (انگریزی) مرتبہ عظیم حسین ۔ مطبوعہ جام جمشید پریس ۔ لاہور ستمبر ۱۹۴۵ء ۔ ص ۳۲۰ ۔

جاتا ہے۔ ۱۹۰۵ء تک ان کے سیاسی رجحانات وطن پرستانہ تھے۔ لیکن قیامِ یورپ کے زمانے ہی میں ان کے تصورات میں اک گونہ تبدیلی پیدا ہوئی اور یورپ سے واپسی کے بعد ان کی شاعری نے ایک نیا راستہ اختیار کیا۔ معترضین کہتے ہیں کہ اسی زمانے سے اقبال فرقہ پرست بن گئے۔ چنانچہ اقبال کے بعض بہترین عقید تمندوں کا بھی یہی خیال ہے۔ عبدالمالک آروی صاحب لکھتے ہیں :

"اقبال جب اسلامیاتی شاعری پر اتر آتے ہیں تو بعض اوقات ان میں ایک سخت قسم کا فرقہ وارانہ رجحان (Communalistic tendency) پیدا ہو جاتا ہے[۳۱]"

جب اقبال کی شاعری پر یہ اعتراض کیا جا سکتا ہے تو ان کی سیاست، اس سے کیسے بچ سکتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کی شاعری پر فرقہ پرستی کا الزام محض ان کے سیاسی خیالات و تصورات کی بدولت ہی لگایا جاتا ہے، ہندوستان کی سیاسی لغت میں فرقہ پرستی سے زیادہ بدنام اصطلاح شاید ہی کوئی ہو۔ محدود معنی میں عام طور پر فرقہ پرست اس شخص کو کہا جاتا ہے جس میں نہ صرف اپنے فرقہ کی عصبیت بلکہ دوسرے فرقوں کی طرف سے تعصب پایا جاتا ہو۔ مسلم فرقہ پرستی کے معنٰی یہ ہیں کہ وہ ہندو دشمن ہے۔ اصل میں جو لوگ اس اصطلاح کو استعمال کرتے ہیں وہ تعصب اور عصبیت کے فرق کو نظر انداز کر دیتے ہیں اور دونوں اصطلاحوں کو ہم معنٰی قرار دیتے ہیں۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی فرقہ پرستی کو واضح کرنے سے قبل ان اصطلاحوں کا صحیح مفہوم سمجھ لیا جائے۔ خوش قسمتی سے خود علامہ مرحوم نے اپنے ایک خط میں اس مسئلہ پر بڑے فاضلانہ انداز میں روشنی ڈالی ہے، وہ لکھتے ہیں۔

"عصبیت اور چیز ہے اور تعصب اور چیز۔ عصبیت کی جڑ حیاتی (Biological) ہے اور تعصب کی نفسیاتی ——— (Psychological)

۳۱- اقبال کی شاعری۔ از عبدالمالک آروی صاحب۔ ص ۳۱ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ۱۹۵۱ء۔ ص ۲۴۰

تعصب ایک بیماری ہے ، جس کا علاج اطباء روحانی اور تعلیم سے ہو سکتا ہے ۔ عصبیت زندگی کا ایک خاصہ ہے ، جس کی پرورش اور تربیت ضروری ہے ۔ اسلام میں انفرادی اور اجتماعی عصبیت دونوں کے حدود مقرر ہیں ، ان ہی کا نام شریعت ہے ۔ میرے عقیدے کی رو سے ، بلکہ ہر مسلمان کے عقیدے کی رو سے ان حدود کے اندر رہنا باعث فلاح اور ان سے تجاوز کرنا بربادی ہے[۳۲]۔"

اقبال کو فرقہ پرست کہنے سے اگر معترضین کا مطلب یہ ہے کہ وہ غیر مسلموں یا ہندوؤں کے مخالف اور دشمن ہیں ، تو یہ الزام سراسر بہتان ہے ۔ اقبال کے دوستوں میں جہاں ہم کو مسلمانوں کے نام ملتے ہیں ، وہاں ہندوؤں اور سکھوں کے نام بھی دکھائی دیتے ہیں ۔ سر جوگندر سنگھ سے ان کا گھرایا رانہ تھا ۔ نواب سر ذوالفقار علی خاں کی کوٹھی پر سرجوگندر سنگھ ، اقبال اور دوسرے بے تکلف دوستوں کی محفلیں جمتی تھیں ۔ حیدرآباد کے سابق وزیر اعظم مہاراجہ سر کشن پرشاد سے ان کے مخلصانہ روابط تھے اور اس ہندو رئیس سے ان کو جو خلوص تھا ، اس کا اظہار ، وہ یوں کرتے ہیں ۔

"مجھے جو خلوص سرکار سے ہے ، اس کا راز معلوم کرنا مشکل نہیں ۔ یہ راز مضمر ہے اس دل میں ، جو اللہ تعالی نے آپ کو بخشا ہے ۔ سرکار کی قبائے امارت سے میرے دل کو مسرت ہے ، مگر میری نگاہ اس سے پرے جاتی ہے اور اس خبر پر جا ٹھہرتی ہے جو اس قبا میں پوشیدہ ہے ۔ الحمد اللہ کہ یہ خلوص کسی غرض کا پردہ دار نہیں اور نہ انشاء اللہ ہوگا ۔ انسانی قلب کے لیے اس سے بڑھ کر زبوں بختی اور کیا ہو سکتی ہے کہ اس کا خلوص پر وردۂ اغراض و مقاصد ہو جائے ۔ انشاء اللہ العزیز اقبال کو آپ حاضر و غائب اپنا مخلص پائیں گے ۔ اللہ نے اس کو نگاہ بلند اور دل غیور عطاء کیا ہے ، جو خدمت کا طالب نہیں اور

۳۲۔ مکاتیب اقبال ۔ حصہ دوم ۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ ناشر شیخ محمد اشرف ۔

احباب کی خدمت کے لیے ہمیشہ حاضر ہے[۳۳]"

اور اس ہندو رئیس اعظم کو بھی اقبال جیسے فرقہ پرست پر اتنا بھروسہ ہے کہ وہ اپنی صاحبزادیوں کی شادی بیاہ کے معاملات میں اقبال سے مشورہ کرتا ہے[۳۴]۔

یہی نہیں کہ اقبال کے دوستوں میں ہم کو ہندو اور سکھ حضرات ملتے ہیں بلکہ اقبال کو ہندو فرقہ سے بھی کوئی تعصب، دشمنی اور عناد نہیں ہے۔ وہ ان کی ترقی کے خواہاں اور ان کی کامیابی سے خوش ہوتے ہیں۔ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام وہ ایک خط میں لکھتے ہیں۔

"براہ کرم یہ نہ سمجھئے کہ مجھے ہندوؤں سے کوئی تعصب ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حالیہ سالوں میں ایثار و جرأت کی جو اسپرٹ انہوں نے دکھائی ہے، اس کی میں بڑی قدر کرتا ہوں۔ انہوں نے زندگی کے میدان میں ممتاز افراد پیدا کئے ہیں، اور معاشی و معاشرتی راستوں پر تیزی سے گامزن ہیں[۳۵]"

ہندوؤں کے مذہبی اوتاروں کی بھی ان کے دل میں کافی عزت اور قدر و منزلت ہے۔ رام چندر جی کی مدح میں انہوں نے اس دور میں جب کہ وہ پکے فرقہ پرست قرار دئے جا چکے تھے، ایک پر اثر نظم لکھی جس میں انہوں نے رام چندر جی کو "امامِ ہند" "چراغِ ہدایت" اور "ملک سرشت" کہا ہے۔ علاوہ ازیں ان کا ارادہ راماین کو اردو میں لکھنے کا بھی تھا، جس کا اظہار انہوں نے مہاراجہ سر کشن پرشاد بہادر کے نام ایک خط[۳۶] میں کیا ہے۔ سوامی رام تیرتھ پر انہوں نے ایک دل آویز نظم لکھی۔

۳۳۔ مکاتیب اقبال۔ حصہ دوم۔ مرتبہ شیخ عطاء اللہ۔ ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور ۱۹۵۱ء ص ۲۸۱

۳۴۔ ایضاً، ص ۲۰۱

۳۵۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال۔ مرتبہ شاملو۔ ناشر المنار اکاڈمی لاہور۔ طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۱۶۷

۳۶۔ شاد و اقبال۔ مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۰۲ و ۱۰۳

ہندو قائدین اور رہنماؤں میں پنڈت جواہر لال نہرو ، سر تیج بہادر سپرو کے وہ بے حد مداح رہے ہیں ۔ اس طرح ہندو قوم اور ہندو اعاظم رجال سے انہیں تعصب کی بجائے ایک طرح کی محبت رہی ہے ۔ پھر وہ ہندو مذہب کے بھی دشمن کبھی نہیں رہے ۔ انہوں نے اس مذہب کی مابعد الطبیعات کا بڑی دقت نظر سے مطالعہ کیا تھا ۔ مثنوی اسرار خودی کے پہلے ایڈیشن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں ۔

" ہندو قوم کے دل و دماغ میں عملیات و نظریات کی ایک عجیب طریق سے آمیزش ہوئی ہے ۔ اس قوم کے موشگاف حکماء نے قوت عمل کی حقیقت پر نہایت دقیق بحث کی اور بالآخر اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "انا" کی حیات کا یہ شہودی تسلسل جو تمام آلام و مصائب کی جڑ ہے ، عمل سے متعین ہوتا ہے ۔ یا یوں کہیے کہ انسانی انا کی موجودہ کیفیات اور لوازمات اس کے گذشتہ طریق عمل کالازمی نتیجہ ہیں اور جب تک یہ قانون عمل اپنا کام کرتا رہے کا وہی نتائج پیدا ہوتے رہیں گے ۔

انیسویں صدی کے مشہور شاعر گوئٹے کا ہیرو فوسٹ ، جب انجیل یوحنا کی پہلی آیت میں لفظ کلام کی جگہ لفظ عمل پڑھتا ہے (ابتدا میں کلام تھا ، کلام خدا کے ساتھ اور کلام ہی خدا تھا) تو حقیقت میں اس کی دقیقہ رس نگاہ اسی نکتہ کو دیکھتی ہے ، جس کو ہندو حکما نے صدیوں پہلے دیکھ لیا تھا ۔ اس عجیب و غریب طریق پر ہندو حکما نے تقدیر کی مطلق العنانی اور انسانی حریت اور بالفاظ دیگر جبر و اختیار کی گتھی کو سلجھایا ، اور اس میں کچھ شک نہیں کہ فلسفیانہ لحاظ سے ان کی جدت طرازی داد و تحسین کی مستحق ہے ، اور بالخصوص اس وجہ سے کہ وہ ایک بہت بڑی اخلاقی جرأت کے ساتھ ان تمام فلسفیانہ نتائج کو بھی قبول کرتے ہیں جو اس قضیہ سے پیدا ہوتے ہیں یعنی یہ کہ جب انا کا تعین عمل سے ہے تو انا کے پھندے سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے اور وہ ترک عمل ہے ۔ یہ نتیجہ انفرادی اور ملی پہلو سے نہایت خطرناک

تھا اور اس بات کا مقتضی تھا کہ کوئی مجدّد پیدا ہو، جو ترکِ عمل کے اصلی مفہوم کو واضح کرے۔ نبی نوعِ انسان کی ذہنی تاریخ میں سری کرشن کا نام ہمیشہ ادب و احترام سے لیا جائے گا کہ اس عظیم الشان انسان نے ایک دل فریب پیرایہ میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایات کی تنقید کی اور اس حقیقت کو آشکار کیا کہ ترکِ عمل سے مراد ترکِ کلی نہیں چونکہ عمل اقتضاء فطرت ہے اور اسی سے زندگی کا استحکام ہے بلکہ ترکِ عمل سے مراد یہ ہے کہ عمل اور اس کے نتائج سے مطلق دل بستگی نہ ہو۔ سری کرشن کے بعد سری رام نوج بھی اسی راستے پر چلے۔ مگر افسوس ہے کہ جس عروسِ معنی کو سری کرشن اور سری رام نوج بے نقاب کرنا چاہتے تھے۔ سری شنکر کے منطقی طلسم نے اسے پھر محجوب کر دیا۔ اور سری کرشن کی قوم ان کی تجدید کے ثمر سے محروم رہ گئی۔"[۳۷]

دیکھئے یہاں کتنے بلیغ اور عالمانہ انداز میں ہندو مابعد الطبیعات کے ایک اہم مسئلے پر بحث کی ہے اور کس قدر شاندار الفاظ میں سری کرشن اور سری رام نوج کو خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔

ان کی بے تعصبی کا اندازہ ایک اور واقعہ سے بھی ہوتا ہے۔ جاوید منزل میں منتقل ہونے سے قبل وہ میکلوڈ روڈ والی کوٹھی میں رہتے تھے۔ اس کوٹھی کے قریب ایک سنیما بھی تھا جس کا شور و غوغا اس فلسفی، حکیم، شاعر کے آرام و سکون میں مخل ہوا کرتا تھا۔ پھر یہ کوٹھی بہت بوسیدہ اور پرانی تھی اور کرایہ بھی اس لحاظ سے زیادہ یعنی ایک سو تیس روپے تھا۔ ڈاکٹر صاحب کی افتادِ طبع کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے حیرت ہوتی ہے کہ انھوں نے ایک عرصہ تک اس کوٹھی میں کیسے گذارہ کیا؟ فطرتاً وہ ہنگاموں سے دور بھاگنے والے اور گوشۂ تنہائی کے جویا تھے۔ پھر ان کی کفایت شعاری کا یہ عالم تھا کہ زندگی بھر پائی پائی کے خرچ

۳۷۔ مضامینِ اقبال۔ مرتبہ تصدق حسین تاج۔ مطبوعہ احمدیہ پریس۔ چار مینار۔ حیدر آباد ۱۳۶۲ھ بار اول ص ۴۹ و ۵۰

کا حساب برابر لکھا جاتا تھا[۳۸]۔ اور بے ضرورت خرچ سے ہمیشہ محترز رہتے بلکہ اکثر اوقات اس کے مصرف میں اس قدر خرم و احتیاط سے کام لیتے کہ ان کی احتیاط کنجوسی دکھائی دینے لگتی تھی[۳۹] — لیکن اس کے باوجود ماہانہ ایک سو تیس روپیہ دے کر وہ ایک بوسیدہ پرانی کوٹھی میں مقیم تھے ، جس کی فضا شور و ہنگامے سے معمور رہا کرتی تھی ۔ اتنے گراں کرایہ میں تو انھیں بہت ہی اچھی کوٹھی مل سکتی تھی ۔ یہی سوال ایک دن ان سے کیا گیا ، جواب کیا ملا ؟

" ٹھیک ہے مگر میں یہاں سے جانا نہیں چاہتا ۔ بات دراصل یوں ہے کہ یہ کوٹھی دو ہندو یتیم بچوں کی وراثت ہے ۔ میرے چلے جانے سے ان کو بہت تکلیف ہوگی ۔ اتنا کرایہ شاید اور کوئی نہ دے[۴۰] "

—— یہ تھا سخت متعصب ، پکا ہندو دشمن اور کٹر فرقہ پرست اقبال !

لیکن معترضین اقبال کی زندگی کے ان واقعات کو نظر انداز کر جاتے ہیں اور بعض تو اس کو فرقہ پرست قرار دینے میں اس حد تک آگے بڑھ جاتے ہیں کہ " ہندوستان ہمارا " اور " نیا شوالہ " جیسی قوم پرستانہ نظمیں لکھنے والا اقبال بھی انھیں فرقہ پرست ہی دکھائی دیتا ہے ۔ " ہندوستان ہمارا " والی نظم اس لئے قوم پرستی کے جذبات سے خالی ہے کہ اس میں فارسی کے الفاظ استعمال کئے گئے ہیں اور نیا شوالہ میں اقبال نے برہمن کی بت پرستی پر طنز و تعریض اور ملامت کر کے اپنی فرقہ پرستی کا ثبوت دیا ہے[۴۱] ! لیکن وہ یہ بھول جاتے ہیں کہ فارسی اقبال کی نظر

۳۸- حیات اقبال ۔ ص ۶۲

۳۹- ملفوظات اقبال ۔ مرتبہ محمود نظامی ۔ مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ۔ بار اول ۔ ص ۸۷

۴۰- ایضاً ، ص ۲۰۸

۴۱- یہ اعتراض ڈاکٹر سچدانند صاحب نے اپنی کتاب "Iqbal the poet and his message" میں کیا ہے ۔

میں کوئی مذہبی زبان نہ تھی اور "نیا شوالہ" میں وہ " برہمن کے بت " اور " واعظ کے خدا " دونوں سے بیزار ہے ——— یہاں ہمیں اقبال کی شاعری کے نام نہاد فرقہ پرستانہ پہلو سے بحث نہیں ، اس لئے اس موضوع کو ہم یہیں ختم کرتے ہیں ۔ بتلانا صرف اس قدر تھا کہ جب ہندوستان کے جدید تعلیم یافتہ اور روشن خیال حضرات کے نزدیک اقبال کے خیالات میں فرقہ پرستی کی جھلک اس وقت بھی نظر آتی ہے جبکہ وہ ایک معنی میں قوم پرست تھے تو ان کی بعد کی زندگی اور خصوصاً سیاسی زندگی پر ہمدردانہ اور غیر متعصبانہ نقطۂ نظر سے غور کرنے کے لئے کس کو آمادہ کیا جا سکتا ہے ؟ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ اس قسم کے خیالات کا اظہار کرتے ہیں ، وہ دراصل اپنی بیمار ذہنیت کا ثبوت دیتے ہیں اور جو الزام وہ اقبال پر لگاتے ہیں اس کے مورد وہ خود ہی ہیں !

حقیقت یہ ہے کہ اقبال اس معنٰی میں قطعاً فرقہ پرست نہیں تھے کہ وہ غیر مسلموں سے کوئی بغض و تعصب رکھتے تھے لیکن ان میں مذہبی عصبیت ضرور تھی ۔ وہ اس جماعت سے محبت رکھتے تھے جس کو مسلمان کہا جاتا ہے ۔ اس گروہ کی فلاح و بہبود اور اس کے سیاسی استحکام کے لئے انہوں نے عملاً سیاسیات میں حصہ لیا ، بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ عزلت نشین اور تنہائی پسند اقبال کو میدانِ سیاست میں کھینچ لانے کا اصلی محرک ، اسی گروہ ، جماعت اور فرقہ کی " خودی " اور " انا " کی حفاظت اور اس کے استحکام کا جذبہ تھا ۔ اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو اقبال کے ہر معتقد و مداح کو اس کا اعتراف کرنا پڑے گا اور خود اقبال کو اس سے انکار نہیں تھا ۔ اس مسئلہ پر انہوں نے کل ہند مسلم لیگ کے خطبہ صدارت میں بہت ہی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں اظہارِ خیال کیا ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

" جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ، مجھے یہ اعلان کرنے میں مطلق تامل نہیں کہ اگر فرقہ وارانہ امور کے ایک مستقل اور پائیدار تصفیہ کے لئے اس بنیادی اصول کو تسلیم کر لیا جائے کہ مسلمانانِ ہندوستان کو اپنی روایات و تمدن کے مطابق اس

ملک میں کاملاً آزادانہ نشو و نما کا حق حاصل ہے ، تو وہ اپنی وطن کی آزادی کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کریں گے ۔ یہ اصول کہ ہر گروہ اس امر کا مجاز ہے کہ وہ اپنے طریقہ پر مکمل ترقی کرے ، فرقہ پرستی کے کسی تنگ نظر جذبہ کا آفریدہ نہیں ہے ۔ فرقہ پرستی کی بھی بہت سی صورتیں ہیں ۔ وہ فرقہ جو دوسرے فرقوں کی بدخواہی اور نفرت کے جذبات سے آلودہ ہو ، پست و نیچ ہے ۔ میں دوسرے فرقوں کے رسوم و رواج ، قوانین ، مذہب اور عمرانی ادارات کا بے حد احترام کرتا ہوں ——— یہی نہیں بلکہ قرآنی تعلیمات کے مطابق یہ میرا فرض ہے کہ اگر ضرورت پڑے تو میں ان کی عبادت گاہوں کی مدافعت کروں ۔ تاہم میں فرقہ وارانہ گروہ سے محبت کرتا ہوں جو میری زندگی اور طور طریق کا سرچشمہ ہے اور جس نے مجھے اپنا دین اپنا روپ ، اپنے افکار ، اپنی ثقافت عطا کی اور اس کے ذریعہ اس نے اپنے پورے ماضی کو ایک زندہ برسرکار عامل کی حیثیت سے میرے موجودہ شعور میں از سر نو بیدار کرکے مجھے وہ بنایا ہے جو کچھ میں ہوں[۴۴] "

اپنی جماعت ، گروہ اور فرقہ سے محبت ہے لیکن اوروں سے نفرت نہیں ۔ اقبال کا یہی مسلک تھا اگر یہ فرقہ پرستی ہے تو بے شک اقبال اس کے مجرم ہیں ! لیکن اس جماعت ، گروہ اور فرقہ سے محبت کیوں ہے ؟ کیا محض اس لیے کہ وہ اس جماعت اور گروہ میں پیدا ہوئے تھے ؟ عموماً جب ہم یہ کہتے ہیں کہ انہیں مسلمانوں سے محبت تھی اور ان کی سیاسی ، عمرانی اور معاشی فلاح و بہبود اقبال کے ہمیشہ پیش نظر رہا کرتی تھی ، تو ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ مسلمان جماعت اور فرقے سے ان کی مراد کیا ہے ؟ خود اقبال کو اس کا اندیشہ تھا کہ مسلمان جماعت کا جو تصور ان کے ذہن میں تھا ، اس کو ایسے مواقع پر نظر انداز کر دیا جائے گا اس لیے انہوں

۴۴۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ ناشر المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ، ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۱

نے آہ کا فرمایا تھا کہ ۔

"اسلام اور مسلم میرے لیے خاص اصطلاحات ہیں ۔ جن کو میرے خیالات سمجھنے کے لیے اچھی طرح سمجھ لینا ضروری ہے[۴۳]"

دنیا میں جس طرح اور مذہبی جماعتیں ہیں ، اسی طرح مسلمان بھی ایک جماعت اور فرقہ ہے ، یہ عام تصور ہو تو ہو لیکن اقبال کا یہ تصور نہ تھا ۔ انہوں نے زندگی اور اس کی حقیقتوں کا بہت گہرا مطالعہ کیا تھا وہ جدید اور قدیم طرز فکر دونوں سے واقف تھے ۔ پھر انہوں نے اپنے مطالعہ کی روشنی میں مختلف عمرانی ، معاشی ، سیاسی اور اخلاقی نظاموں پر کئی برس آزادانہ غور و فکر کیا تھا اور بالآخر ایک حکیم ، مفکر اور فلسفی کی حیثیت سے اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ ساری بنی نوع انسان کے لیے اس دنیا میں اگر کوئی نظام زندگی ہے تو وہ اسلام ہے ۔ اسی سے دنیا کی موجودہ مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور انسان کی انفرادی نجات و اجتماعی فلاح کا یہی ایک واحد راستہ ہے ۔ وہ اسلام کو محض ایک مذہب (Religion) یا نظامِ اخلاق (Ethics) نہیں سمجھتے تھے جس کا تعلق صرف اس رشتہ کی حد تک محدود ہو جو خدا اور بندے کے درمیان پایا جاتا ہے ۔ وہ مذہب کو ایک انفرادی یا خانگی مسئلہ نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ مسیحیت نے پیش کیا ہے ۔ پھر مذہب کے متعلق ان کا تصور قومی (National) بھی نہ تھا ، جیسے مصریوں ، یونانیوں اور ہندیوں کا ہے ۔ وہ دین کو نسلی بھی نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ یہودی خیال کرتے ہیں —— ان کی نظر میں دین کو قومی ، نسلی ، انفرادی نہیں بلکہ خالصتاً "انسانی" ہونا چاہیئے اور اس کا مقصد ان کی نظر میں یہ تھا کہ وہ باوجود تمام فطری امتیازات کے عالمِ بشریت کو متحد و منظم کرتا ہے[۴۴] ۔ اور اس معیار پر اگر کوئی نظام زندگی ، خواہ وہ قدیم ہو یا جدید پورا اترتا ہے تو اقبال کے

۴۳۔ رسالہ اردو کا اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۶

۴۴۔ مضامینِ اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد ۱۳۶۲ھ بار اول ص ۱۸۳ ۔

نزدیک وہ اسلام ہی ہے ۔ مختصر یہ کہ اسلام کو وہ ہیئت اجتماعیہ انسانیہ کا ایک اصول اور ایک ایسا مکمل نظام زندگی سمجھتے تھے جو انسانوں کی انفرادی و اجتماعی ضروریات کو پورا کرتا ہے اور ان کی خودی کو پروان چڑھاتا ہے ۔ وہ خود لکھتے ہیں ۔

" اگر عالمِ بشریت کا مقصد اقوامِ انسانی کا امن ، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر ایک واحد اجتماعی نظام قرار دیا جائے تو سوائے نظام اسلام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آ سکتا ۔ کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے ، اس کی رُو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح ہی کا داعی نہیں بلکہ عام بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تدریجی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے ، جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر تخلیق کرے ۵۴ "

مذہب کی غایت ان کی نظر میں انسانوں کو مختلف گروہوں میں تقسیم کرنا نہیں بلکہ ایک رشتۂ وحدت میں پرونا ہے اور مسلمان ان کی نگاہ میں وہ گروہ ہے جو اس اصول اجتماعیہ انسانیہ کا حامی ہے اور جو اس نظامِ زندگی کو دنیا میں عملاً جاری و ساری کرتا ہے ، وہ لکھتے ہیں ۔

" نبوت محمدیہ کی غایت الغایات یہ ہے کہ ایک ہیئت اجتماعیہ انسانیہ قائم کی جائے جس کی تشکیل اس قانون الٰہی کی تابع ہو جو نبوت محمدیہ کو بارگاہ الٰہی سے عطا ہوا تھا ۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ اقوامِ عالم کے اختلافاتِ شعوب و قبائل ، رنگ و زبان کو تسلیم کرنے کے باوجود ان تمام آلودگیوں سے منزہ کرنا ، جو زبان و مکان ، وطن ، قوم ، نسل ، نسب اور ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں ، اس کا مقصد ہے اور اس طرح اس پیکرِ خاکی کو وہ ملکوتی تخیل عطا کرنا ، اس کی

۵۴۔ مضامینِ اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۸۳ ۔

غایت ہے جو اپنے وقت کے ہر لحظہ میں ابدیت سے ہمکنار رہتا ہے - یہ ہے مقامِ محمدی ، یہ ہے نصب العین ملت اسلامیہ (Muslim Community) کا[۳۶] " -

الغرض وہ اسلام کو بحیثیت اجتماعیہ اسلامیہ کا ایک اصول اور مسلمانوں کو وہ جماعت سمجھتے تھے جو اس اصول کی حامی اور علمبردار ہے اور ان کا یہ ایقان تھا کہ اگر یہ جماعت اس اصول کو اپنے پورے مضمرات کے ساتھ اپنی عملی زندگی میں اختیار کر لے اور اس کو پھیلانے کی کوشش کرے تو ایک دن آئے گا ، جب کہ ساری انسانیت ، قوم ، وطن ، نسل ، نسب ، رنگ و زبان کی آلائشوں سے نکل کر اس اصول کی بناء پر ایک نصب العینی معاشرہ بن جائے گی - وہ بڑے پُر زور الفاظ میں کہتے ہیں -

" وحدت ایک ہی معتبر ہے اور وہ وحدت اخوت انسانی ہے - جو نسل، قومیت ، رنگ اور زبان سے ماورا ہے - جب تک اس نام نہاد جمہوریت ، اس بدبخت قومیت اور اس ذلیل شہنشاہیت کے ٹکڑے ٹکڑے نہیں ہو جائیں گے اور جب تک انسان اپنے اعمال سے اس ایقان کا اظہار نہیں کریں گے کہ تمام مخلوق عیال اللہ ہے اور جب تک نسل ، رنگ اور جغرافیائی قومیتوں کے امتیازات بالکلیہ ملیامیٹ نہیں ہو جائیں گے ، اس وقت تک انسان ایک مسرور اور پُر سکون زندگی ہرگز بسر نہیں کر سکیں گے اور حریت ، اخوت و مساوات کا دلفریب نصب العین کبھی حاصل نہ ہو سکے گا[۳۷] "

بہرحال تمام انسانوں کو اخوت انسانی پر جمع کرنا اور ان سب کو عیال اللہ (Family of God) بنا کر ایک نصب العینی معاشرہ (Ideal Society) کی تشکیل کرنا ، ان کا منتہائے نظر تھا اور ان کا ایقان

۳۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۲۳۶ -

۳۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، ص ۲۲۲ -

تھا کہ اس مقصد کو حاصل کرنے کا واحد ذریعہ اسلام اور صرف اسلام ہے۔ لیکن اسلام کوئی شخصیت تو ہے نہیں جو آپ سے آپ تمام انسانوں کی اس نصب العینی کی طرف رہنمائی کرے۔ وہ تو ایک پاک ، برگزیدہ اور مقدس اصول ہے اور اس اصول میں اتنی طاقت اور زندگی ہے کہ وہ ابدالآباد تک نسلِ انسانی کی رہبری کر سکتا ہے ، لیکن اس عالم اسباب اور اس دنیائے رنگ و بو میں کوئی مجرد اصول صرف کتابوں میں بند رہ کر اپنے اثرات کو منصۂ شہود پر جلوہ گر نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے ضرورت ہوتی ہے ایک ایسی انسانی جماعت کی جو اس اصول کو محض ایک پالیسی ، حکمتِ عملی اور رہنمایانہ اصول (Directice) کے طور پر نہیں بلکہ ایک اٹل عقیدہ اور اذعان کی حیثیت سے قبول کرے۔ یہ اصول اس جماعت کے افکار و اذہان پر ہی چھا نہ جائے بلکہ اس کے ضمیر اور قلب کے اندرونی گوشوں اور وجدان و روح کی گہرائیوں میں اتر جائے اور وہ جماعت اس اصول کو ایک عقیدہ کی حیثیت سے لے کر اٹھے۔ پہلے وہ خود اس کو اپنی زندگی کے کلیات و جزئیات میں برتے اور پھر ساری دنیا میں اس کو جاری و ساری کرنے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا دے۔

اقبال کو مسلم جماعت سے محبت اسی لیے تھی کہ وحدت انسانی کا یہ اصول جس کو وہ اسلام کہتے ہیں ، اس جماعت کا عقیدہ اور مسلک تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانی اخوت اور عالمی برادری کی تشکیل ، اسی صورت میں ہو سکتی ہے جبکہ اس اصول کو اپنا کر جس جماعت نے اس کو اپنا عقیدہ بنا لیا ہے ، اس کو ہر اس مقام پر مستحکم و مضبوط کیا جائے ، جہاں وہ رہتی بستی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس کے سامنے اس نصب العین کو پوری طرح اجاگر کرکے پیش کیا جائے ، جس کے لیے اس کی تخلیق ہوئی ہے —— دیگر مسلمانوں کی طرح مسلمانانِ ہند بھی اسی اصولِ حیات سے وابستہ ہیں ، اسی لیے اقبال کو ان کی سیاسی کشمکش سے بھی دلچسپی ہے۔ ان کو دلچسپی اس امر سے نہیں ہے کہ دیگر گروہوں اور فرقوں کی مانند مسلمانانِ ہند بھی اس کشمکش میں کامیابی حاصل کرکے محض مادی اور دنیاوی منافع — دولت و اقتدار — حاصل کر لیں۔ بلکہ ان کی دلچسپی کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ مسلمانوں کی یہ کشمکش اس طرز پر

ہو ، جس سے اسلام کا ، اسلام کے سیاسی مسلک کا — جو بجز انسانی اخوت کے اور کچھ نہیں ہے — اس خطۂ ارض پر بول بالا ہو ۔

اقبال کی فرقہ پرستی کا —— اگر اس کو فرقہ پرستی کہا جا سکے —— یہی ماحصل ہے ۔ اس کی فرقہ پرستی کا تصادم قوم پرستی ، وطن پرستی ، نسل پرستی سے تو یقیناً ہوتا ہے لیکن انسانی وحدت اور عالمی برادری سے ہرگز نہیں ہوتا ۔ بلکہ صحیح معنی میں اقبال کی فرقہ پرستی اور وحدت انسانی میں سرے سے تضاد و تعارض ہے ہی نہیں ۔ یہ دونوں تصورات ایک دوسرے سے ہم آہنگ نہیں ہی بلکہ ایک دوسرے کے ممد و معاون ہیں ۔ دوسرے الفاظ میں اقبال کی " فرقہ پرستی " وہ زینہ ہے جس کے بغیر وحدت انسانی کے بلند نصب العین تک پہنچنا محال ہے ۔ وہ ایک طریق عمل (Process) ہے ، اخوت انسانی کی انتہا تک پہنچنے کا ، اور ایک راستہ ہے عالمی برادری کی منزل مقصود تک رسائی کا ! اس حیثیت سے اقبال کی فرقہ پرستی اور لینن اور اس کے ہم خیال اشتمالیوں کی روسی اشتراکیت میں ایک گونہ مماثلت پائی جاتی ہے ۔ اشتمالی حضرات بھی اشتراکیت کو ایک اصول کی حیثیت سے مانتے اور تسلیم کرتے ہیں ۔ ان کا یہ عقیدہ ہے کہ تمام ناداروں (Have-nots) کو اس اصول پر متحد کرکے اور تمام زرداروں (Haves) سے اس عقیدہ کو منوا کر ، اور اگر وہ نہ مانیں تو ان کو نیست و نابود کرکے ، ایک ہمہ گیر انقلاب ایک عالمی برادری ، انسانی وحدت اور ایک نصب العینی معاشرہ کی تشکیل کی جا سکتی ہے ۔ لیکن اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے ان کی نظر پہلے انسانوں کی اس جماعت کی طرف اٹھتی ہے ، جو اس اصول کے قائل اور معترف ہیں ۔ پھر وہ ان گروہوں اور جماعتوں کو منظم اور مستحکم کرتے اور ان کے ذریعہ یک وقت تمام دنیا میں ایک ہمہ گیر انقلاب برپا نہیں کرتے بلکہ صرف اس مقام اور ملک میں ایک غیر طبقاتی معاشرہ (Class Less Society) کی بنیاد ڈالتے ہیں ، جہاں اصول اشتراکیت کے حامی زیادہ منظم اور اس انقلاب کو برپا کرنے کے زیادہ اہل ہوتے ہیں ۔ ان کی اس کوشش کی وجہ سے کہ انھوں نے صرف ایک خاص ملک یا خاص مقام کے باشندوں کی طرف اپنی تمام توجہ مبذول کی ، کوئی انھیں فرقہ پرست نہیں کہتا ۔ لینن

اور اس کے ہم خیال ساتھیوں پر جو کچھ تنقید کی گئی ہے ، وہ یہ نہ تھی کہ وہ فرقہ پرست تھے یا وہ ایک خاص گروہ اور ملک کی بھلائی چاہتے تھے ، بلکہ یہ تھی کہ انھوں نے روس میں اشتراکی پروگرام کو نافذ اور اشتراکی انقلاب کو برپا کرتے وقت مارکیسیت کے بین الاقوامی نصب العین کو ایک حد تک نظر انداز بلکہ فراموش کر دیا ۔ اقبال کے پاس بھی نصب العینی معاشرہ کے قیام اور وحدت انسانی کی تشکیل کا ایک اصول ہے ، وہ بھی اس اصول پر تمام انسانوں کو متحد کرکے ایک عالمی انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے اور اس مقصد کے حصول کے لیے اس کی نظریں بھی اشتراکیوں کی مانند لازماً اس جماعت کی طرف اٹھتی ہیں جو اس اصول کی قائل اور معتقد ہے ۔ وہ بھی اس جماعت کے افراد کی معاشی ، عمرانی اور سیاسی اصلاح کرکے ان کو منظم و مستحکم کرنا چاہتا ہے ، تاکہ ان کے ذریعہ اور ان کے ہاتھوں وہ انقلاب برپا ہو جائے جس کی غایت الغایات ، وحدتِ انسانی کا قیام اور ایک نصب العینی معاشرہ کی تشکیل ہے ۔ پھر اس خاص جماعت اور طبقہ کو منظم و مستحکم کرتے ہوئے وہ اس نصب العین کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر لیتا ہے بلکہ اپنے خطبات و تقاریر اور اپنے شعر و نغمہ کے ذریعہ اس جماعت میں وہ صور پھونکتا ہے ، جس سے نیند کے ان ماتوں کی آنکھیں بھی اسی نصب العین کو دیکھنے لگتی ہیں ، پھر اپنی آہِ سحر اور سوزِ جگر سے ان کے قلب و ضمیر ، وجدان و روح میں ٹمٹماتے ہوئے دئیے کو اس طرح فروزاں کر دیتا ہے کہ وہ ایک شعلہ جوالہ کی مانند بھڑک اٹھتا ہے اور اس کی روشنی میں وہ اپنی سنہری تقدیر کے ان روشن خطوط کو پوری بصیرت و بصارت کے ساتھ پڑھنے لگتے ہیں !! یہ ہے اقبال کی فرقہ پرستی اور مسلم دوستی کی حقیقت !!!

(ج) بے عملی اقبال کی فہرست الزامات کا یہ تیسرا عنوان ہے ۔ ان کے ایک عقیدت مند لکھتے ہیں ۔

" اقبال جب تک سیاسی اصول پیش کرتے رہے اور خیالی سیاسیات پر تبصرہ کرتے رہے ، دنیا ان کو اپنے تخیل کی متاعِ عزیز

سمجھتی رہی اور اس حقیقت سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ ان کا سیاسی نظریہ اس قدر حوصلہ آزما ، اس قدر حریت پرست اور اتنا قربان نواز ہے کہ کسی قوم کا بڑے سے بڑا مخلص سیاسی رہنما بھی اس سے زیادہ بلند سطح پر نظر نہیں آیا ۔ لیکن وہی شخص جب سیاسیات کی عملی دنیا میں قدم رکھتا ہے ، تو چاروں طرف ایک قیامت برپا ہو جاتی ہے ، وہی شاعر جو حکیم سنائی کے الفاظ ، ـــــ " گرفتہ چینیاں احرام و مکی خفتہ در بطحا " کو قیامت سے تعبیر کرے ۔ عملی دنیا میں اس قدر تن آسان اور عافیت گوش بن جائے کہ اس کو حق و باطل میں کوئی تمیز نہ ہو ! اقبال کی نظم " کلمہ " پڑھیے اور پھر ان کے سیاسی اعمال پر ایک نظر ڈالیے ، آپ کو تعجب ہو گا کہ وہی شاعر ، جو ملکی زبوں حالی ، کسانوں کی تباہی ، غلامی اور غلامانہ زندگی پر اشک فشانیاں کر رہا تھا ، یک بہ یک اس کی ذہنیت اس قدر کیوں بدل گئی ہے ، آخر اس کی کوئی نفسیاتی توجیہہ بھی ہو سکتی ہے ؟ کیا واقعتاً اقبال ایک غیر مخلص انسان ہیں[۳۸] " ۔

گذشتہ صفحات میں ہم نے اقبال کی سیاسی زندگی کی جو روئیداد پیش کی ہے ۔ اس کو بامعان نظر دیکھنے اور ٹھنڈے دل سے پڑھنے کے بعد بھی کیا اقبال اتنا ہی بے عمل نظر آتا ہے جتنا کہ عام طور پر اس کو مشہور کیا گیا ؟ پروفیسری سے استعفٰی ، سرکاری عہدوں کی قبولیت سے انکار ، مسلم لیگ کی شمولیت اور ایک خاص نقطہ نظر کی تبلیغ اور اس سلسلہ میں حکومت کی ترهیبوں اور ترهیبوں سے بلند ہو کر حکومت اور اربابِ حکومت پر سخت تنقیدیں کرنا ، ان کی ناراضی کی پرواہ کیے بغیر اپنے اصولوں پر ڈٹے رہنا اور کلمۂ حق کے اظہار سے باز نہ رہنا اور نتیجتہً باند مناصب و مراتب حاصل کرنے سے محروم رہ جانا اور ساری عمر قناعت اور عسرت کے ساتھ بسر کر دینا ـــــ کیا ان سب واقعات کا تعلق عملی

---

۳۸ - " اقبال کی شاعری " از عبدالملک آروی ، ناشر ادارۂ طاقِ دبستان مطبوعہ سنہ ۱۹۳۶ء ص ۵۸ و ۵۹ ۔

دنیا سے نہیں ہے؟ اور کیا اقبال کو عملی زندگی کے ان تمام کڑے امتحانات میں سے کامیاب و کامران گزر جانے کے بعد بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ عملی سیاسیات میں اس کے قدم لڑکھڑا گئے تھے؟ کیا اس کی زندگی کی یہ تلخ حقیقتیں اس کے ثبات قدم کی ضامن نہیں ہیں؟ کیا دوسری گول میز کانفرنس سے واپسی کے بعد حکومت پر سخت نکتہ چینی کرکے اس کی ناراضی مول لینا، وائسرائے کے عواطف و مہربانیوں سے اغماض برت کر اپنے آپ کو دنیاوی مناصب و منافع سے محروم کر لینا اور علم و تفکر کی اتنی متاع گراں مایہ کو رکھتے ہوئے قلندرانہ زندگی بسر کر دینا، کوئی قربانی اور ایثار ہے ہی نہیں؟ کیا ان تمام سنجیدہ حقائق کے باوجود یہ کہنا درست ہے کہ اقبال سیاسیات کی عملی دنیا میں اس قدر تن آسان اور عافیت کوش تھا کہ اس کو حق و باطل کی کوئی تمیز ہی نہ تھی؟ اقبال کی زندگی ہی میں ان کی اس "بے عملی" کے متعلق سوالات کیے گئے اور انھوں نے معترضین کی حیثیت اور حالات کے لحاظ سے مختلف اوقات میں دلچسپ جوابات دئے۔ ایک نظر انہیں بھی دیکھتے چلئے۔

ڈاکٹر قاضی عبدالحمید صاحب ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی نے ایک دن علامہ اقبال سے سوال کیا کہ "آپ کے اشعار نے تو ہندوستان میں آزادی کی روح پھونک دی ہے لیکن آپ تو اس سلسلہ میں کچھ بھی عملی جدوجہد نہیں فرماتے" علامہ نے بے ساختہ جواب دیا۔ "شعر کا تعلق عالم علوی سے ہے۔ چنانچہ جب میں شعر کہتا ہوں تو عالم علوی میں ہوتا ہوں۔ لیکن یوں تو مرا تعلق عالم اسفل سے ہے۔ اس لیے تم میرے اشعار اور میرے عمل میں کس طرح مطابقت دیکھ سکتے ہو۔

"اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا، کردار کا غازی بن نہ سکا" [۴۹]

خلیفہ عبدالحکیم صاحب لکھتے ہیں۔

"ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال

۴۹۔ رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۵۔

کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس کے اشعار کے پیدا کیے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے۔ ان میں سے بعض لیڈر، جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے، اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ تم نے ہم کو مومن تو بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر رہے۔ ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا ''سنو بھائی، تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے۔ لیکن سننے والے ہُو، حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بیہوش ہو جاتے ہیں، لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جائے۔ میں تو قوم کا قوال ہوں میں گاتا ہوں، تم ناچتے ہو۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟[٥٠]''

حقیقت یہ ہے کہ اقبال پر بے عملی کا اعتراض کرنے والوں میں نفسیاتی نقطۂ نظر سے دو قسم کے گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک تو وہ جن کی نظر میں جلسے و جلوس، تقاریر و بیانات، حکومت کی تنقیص و مخالفت اور پھر تشدد یا بے تشدد مقاومت اور بالآخر گرفتاری، سزا یابی یا نظر بندی ہی حقیقی سیاسی جدو جہد ہے ——— اور دوسرا گروہ وہ ہے جو جلسوں اور جلوسوں میں شریک ہونے، دھواں دھار تقریریں کرنے اور وقت بے وقت بیانات دینے، کبھی حکومت کی تعریف و توصیف اور کبھی اس پر تنقید کرنے، اور روپیہ خرچ کرکے پارٹیاں بنانے، انتخابات میں کامیابی حاصل کرکے اسمبلی کی نشستوں پر قبضہ کرنے اور وہاں کبھی مختلف جماعتوں سے جوڑ توڑ کرکے اور کبھی اربابِ حکومت سے سازش کرکے بالآخر پارلیمانی سکرٹری شپ، سپیکر شپ یا منسٹر شپ حاصل کرنے کو ہی کامیاب عملی سیاست سمجھتا ہے۔ عملی سیاست کی یہی دو تصویریں ہیں، جو بالعموم اس برعظیم کے عوام کے سامنے گذشتہ نصف صدی میں پیش ہوتی رہی ہیں۔ اسی لیے عام

٥٠۔ ''آثار اقبال'' مرتبہ غلام دستگیر رشید ناشر ادارہ اشاعت اردو۔ حیدر آباد دکن۔ مطبوعہ ١٩٤٦ع۔ ص ٢٨

طور پر ان ہی کو عملی سیاست سمجھا جانے لگا ہے ۔ اقبال کی سیاسی زندگی کی عملی تمثیل بڑی حد تک ان مناظر سے خالی ہے یا اگر کچھ ایسے مناظر پائے بھی جاتے ہیں ، تو وہ اتنے جاذبِ نظر نہیں ہیں ۔ اس لیے عام طور پر یہ خیال کیا جانے لگا کہ وہ بے عمل تھے اور بعضوں نے تو اس سے آگے بڑھ کر یہ تک کہہ دیا کہ وہ سرے سے سیاست داں تھے ہی نہیں ۔ ان کی سیاسی جد و جہد اور اس کی خصوصیات پر تو ہم آئندہ صفحات میں روشنی ڈالیں گے اور وہیں اس امر کا جائزہ لیں گے کہ آیا وہ سیاست داں تھے یا نہیں ——— لیکن یہاں ہمیں صرف اس امر پر غور کرنا ہے کہ کیا وہ اتنے ہی بے عمل تھے ، جتنا کہ بیان کیا جاتا ہے ۔

کسی شخص کے اعمال و افعال کی نوعیت پر غور کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ فطرت نے اس کی شخصیت کی تعمیر کن عناصر سے کی ہے ، قدرتاً اس کی افتاد طبع کیا ہے ——— ڈاکٹر سعیداللہ صاحب ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی لکھتے ہیں ۔

"گوشہ نشینی بھی ان کا ایک وصف تھا ، جس کی پابندی نہایت سختی سے کرتے ، اپنے گھر سے باہر شاذ و نادر ہی نکلتے تھے ، جسے ملنا ہوتا ، وہیں آ جاتا ۔ چائے کی دعوت ان کے لیے نہایت تکلیف دہ ہوتی ۔ فرماتے کہ ان پارٹیوں میں کھانے کو تو کچھ مل جاتا ہے مگر روحانی تکلیف ہوتی ہے[۵۱]"

مرزا جلال الدین بیرسٹر تحریر فرماتے ہیں ۔

"اقبال جہاں کہیں بھی رہے ان کا مکان مرجع خاص و عام رہا ۔ کیونکہ ان کی محفل میں ہر ایک کو صلائے عام تھی ۔ صبح سے شام تک ملاقاتیوں کا ایک لامتناہی سلسلہ ان کے مکان پر جاری رہتا ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سارا دن اپنے مکان پر مقیم رہنے کے عادی ہوگئے اور چلنے پھرنے سے گھبرانے لگے ۔ جب وہ

۵۱۔ "ملفوظات اقبال" مرتبہ محمود نظامی ۔ مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور بار اول ۔ ص ۱۰۱

انارکلی میں قیام پذیر تھے تو صبح کے وقت چند دوستوں کی معیت میں وہ بھاٹی دروازہ کی طرف سے راوی کی جانب جایا کرتے۔ جب وہ میکلوڈ پر آئے تو میں نے ان سے کہا کہ وہ صبح کے وقت سیر کو نکلا کریں۔ چند روز تو وہ میرے ساتھ گئے ایک دن تنگ آ کر کہنے لگے کہ یہ روز کا جھنجھٹ کچھ ٹھیک نہیں، کبھی کبھار چلنا ہوا کرے، تو ایک بات بھی ہے۔ ہر روز کون نکلے[۵۲]"

جب علامہ مرحوم کی افتاد طبیعت اور مزاج کا یہ حال ہو کہ گھر سے باہر قدم رکھنا ان کے لیے بار گراں، اور محض سیر و تفریح کی خاطر چہل قدمی بھی ان کی طبیعت کے لیے ناگوار ہو تو ان پر سیاسی ہنگاموں میں نہ کودنے اور شور و شغب میں حصہ نہ لینے کا اعتراض چہ معنی دارد؟ تعجب اس پر کیوں کیجئے کہ انہوں نے دیگر عوامی قائدین اور کارکنوں کی مانند سیاسی میدان میں دوڑ دھوپ اور جد و جہد نہیں کی۔ حیرت اس پر کیوں نہ ہو کہ اپنی افتاد طبع، فطری خاموشی اور گوشہ نشینی کے باوجود مسلم لیگ کی تحریک میں انہوں نے حصہ لیا، ۱۹۳۰ء کے اجلاس عام کی صدارت کی، گول میز کانفرنس میں دو بار شرکت کی، کل ہند مسلم کانفرنس کے اجلاس کی ایسے زمانے میں صدارت کی جبکہ دستور جدید میں مسلمانوں کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا اور اس نازک وقت میں اس عزلت پسند مفکر و شاعر نے اپنے گوشۂ تنہائی کو چھوڑ کر ۱۹۳۲ء میں اس سیاسی جد و جہد کی رہنمائی اور راست اقدام کے عزم کا اظہار کیا، جس کے نتیجہ کے طور مسلمانوں کو فرقہ وارانہ فیصلہ میں ایک خاص مقام حاصل ہوا؟

اقبال کی شخصیت کی تعمیر میں سب سے بڑا حصہ ان کے ذہن و فکر کو تھا، بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ وہ از سر تا پا فکر و تاثر ہی تھے۔ ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب نے بالکل صحیح لکھا ہے کہ۔

۵۲۔ ایضاً ص ۷۷

"افکار و تاثرات نے ان کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمانوں میں چونکہ قحط الرجال ہے ، اس لیے یہ قوم ایک ہی انسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے۔ اور چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو ، فقیر بھی ہو اور پیرو مرشد بھی ہو"[۵۳]

جب اقبال طبعاً عزلت پسند تھے اور قدرت نے انھیں اپنے خزانے سے افکار کے دریائے بے بہا اتنی ان گنت تعداد میں عطا کیے تھے کہ ان کا دامن صرف ان ہی سے بھرپور ہو چکا تھا ، تو پھر یہ شکایت کیسی کہ وہ عمل سے تہی دامن تھے ؟

جناب سید نذیر نیازی صاحب نے بڑے موثر انداز میں حضرت علامہ کی اس نام نہاد بے عملی پر روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"حضرتِ علامہ کا عمل کمزور سہی ، مگر ان کا خلوص و دیانت تو مسلم ہے۔ انھوں نے کبھی اس امر کی کوشش نہیں کی کہ اپنی سرگرمیوں پر نفاق اور ظاہر داری کا پردہ ڈالیں۔ بھلا جس شخص کی نظر خالصتاً قرانی ہو اور جو انسانیت کبریٰ کی اساس نبی امی صلعم کے اسوہ حسنہ پر رکھے اس کے لیے یہ کیونکر ممکن تھا کہ چند علمی (Scientific) اور واقعی (Realistic) بنیادوں کے زیر اثر اخلاق و معاشرت کا کوئی ذاتی اور جماعتی (Private or Public) یا نسلی اور وطنی تصور قبول کرے۔ لہذا جہاں ان کے اہل وطن نے نقطۂ نظر کے اس اختلاف کے باعث اس امر کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا کہ ہمارے ملکی مسائل کا حل ایک دوسری شکل میں بھی ہو سکتا ہے ، وہاں خود مسلمان بھی ان کے خیالات اور ارشادات کی صحیح گہرائیوں کا بہت کم اندازہ کر سکے۔ یوں دیکھنے میں حضرت علامہ کا تعلق ہر اس تحریک سے قائم تھا ، جسے وہ اصولاً اور مصلحتِ وقت یا مجبوریٔ حالات

۵۳۔ "آثار اقبال"۔ مرتبہ غلام دستگیر رشید۔ ناشر ادارہ اشاعت اردو۔ حیدر آباد دکن۔ مطبوعہ ۱۹۴۶ع ص ۲۸

کی بناء پر ملت کے لیے مفید خیال کرتے ، لیکن چونکہ ان کی حیثیت مقدماً ایک مفکر اور مبصر کی تھی ، لہذا ان کی سرگرمیاں ہمیشہ مشورے ، نصیحت ، رائے اور اس کوشش سے آگے نہ بڑھ سکیں کہ ہماری زندگی میں کسی غیر اسلامی عنصر کا امتزاج نہ ہونے پائے۔ بایں ہمہ یہ کبھی نہ ہوا کہ حیاتِ ملیہ اسلامیہ کا جو نصب العین ان کے ذہن میں تھا ، اس کے لیے کوئی عملی جد و جہد شروع ہوتی۔ شائد اس لیے کہ ایسا کرنے میں ابھی ملت کو بہت سے مراحل طے کرنا ہیں اور شائد اس لیے کہ فکر اور قیادت کے درمیان جو فصل ہے وہ محض آرزوؤں سے دور نہیں ہو سکتا۔ وہ خود فرمایا کرتے تھے ،

"I am not everything" ۔ "میں سب کچھ نہیں ہوں"۔ حقیقت میں اپنے وجود کا علم ، جس قدر ان کو تھا ، شائد ہی کسی دوسرے کو ہو۔ انھوں نے اپنی وسعت سے باہر کوئی دعویٰ نہیں کیا۔ اور اس معاملے میں ان کے انکسار اور فروتنی کا یہ عالم تھا کہ ان کا دامنِ عمل تکلف اور تصنع سے ہمیشہ پاک رہا۔ وہ جو کچھ بھی تھے ، اسی حیثیت میں سب کے سامنے آ جاتے۔ جس طرح اپنے افکار کی تبلیغ میں ، انہوں نے ادعا سے کام لیا نہ تحکم سے ، بلکہ ہمیشہ سے اس امر کے منتظر رہے کہ اگر کوئی شخص ان کی غلطیوں کی تصحیح کرے ، تو فوراً اسے قبول کر لیں ، بعینہ انھوں نے اپنی کمزوریوں کو کبھی اس خیال سے چھپانے کی کوشش نہیں کی کہ ایسا نہ ہو کہ ان کی قدر و منزلت یا احترام میں فرق آ جائے۔ یہ ان کی گہری روحانیت کا ایک زبردست ثبوت ہے اور ان کی غیرت و خود داری اور عزتِ نفس کا ایک قابل رشک پہلو کہ انھوں نے اپنی بشریت کے ہر نیک و بد کی ذمہ داری خود اپنی ذات پر لی۔ اس غیر معمولی ہمت و جسارت کا سبب یہ ہے کہ حضرتِ علامہ اپنی شاعری اور فلسفہ کے باوجود اول و آخر انسان تھے اور انسانیت ہی کا شرف ان کے مقصود نظر ——— بایں ہمہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ انھیں اپنی قوم سے بے عملی

کے طعنے سننے پڑتے حالانکہ ان کے نکتہ چین اس امر کو فراموش کر دیتے کہ ان کی فکر بھی ایک طرح کا عمل ہے اور اگر عمل کے معنی ہیں ، نصب العین حیات کے لیے ترغیبات و ترہیبات دینوی کے باوجود ، ایک خاص قسم کی سیرت و کردار کی بالارادہ پرورش ، تو حضرت علامہ کسی صاحب عمل سے پیچھے نہیں تھے - ان کے ابنائے وقت نے کہا کہ وہ فرقہ وار ہیں ، شہنشاہیت کی حمایت کرتے ہیں ، حالانکہ اس ملک کا فرقہ وار اور شہنشاہیت پسند فرقہ ان کے انقلاب انگیز نظریوں سے ہمیشہ خائف رہا - ان حالات سے مجبور ہو کر رفتہ رفتہ حضرت علامہ نے ایک قسم کی خاموش ، الگ تھلگ اور تنہا زندگی بسر کرنی شروع کر دی تھی اور ان کے نیاز مندوں کو یہ دیکھ کر افسوس ہوتا کہ ان کی متاع عزیز قوم کی بے حسی اور بے اعتنائی کے باعث کس طرح ضائع ہو رہی ہے"[۵۳]

بے شک علامہ اقبال کی زندگی سیاسی ہنگامہ آرائی اور شور و شغب سے خالی ہے —— لیکن اپنے افکار و اشعار کے ذریعہ ہندوستانیوں کے سیاسی زاویۂ نظر کو بدلنے اور اپنی تجاویز و آراء کے توسط سے اس برصغیر کے سیاسی دھارے کے رخ کو پلٹنے میں انھوں نے جو حصہ لیا ہے - اس کی اہمیت اور وزن کا اندازہ ان کی زندگی میں ایک حد تک ناممکن تھا ، لیکن آج اس کو برصغیر ہند کی سیاسیات کا ہر غیر جانبدار طالب علم محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا - جناب چراغ حسن حسرت نے بالکل سچ لکھا ہے کہ

"اقبال سیاسی ہنگاموں میں حصہ لینا تو درکنار ، وہ کئی کئی دن گھر سے باہر قدم نہیں رکھتے تھے لیکن انھوں نے زندگی کے متعلق ہندوستان کے مسلمانوں کا زاویۂ نظر بدلنے میں بہت بڑا حصہ لیا ہے اور ان کا یہ کارنامہ عہد حاضر کی بڑی بڑی سیاسی اور علمی

۵۳- رسالہ اردو ، اقبال نمبر طبع جدید ص ۳۱۴ تا ۳۱۶ .

فتحمندی پر بھاری ہے"۵۵

گذشتہ صفحات میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے ، ممکن ہے کہ اس کو خوش عقیدگی اور نیاز مندی سے تعبیر کیا جائے اور علامہ اقبال کی بے عملی کی جو توجیہات پیش کی گئی ہیں ، انہیں تاویلات سمجھا جائے ، لیکن حضرت علامہ کے مجموعی سیاسی تفکر ، ان کے بلند و رفیع سیاسی مقاصد اور ان حالات کا جو اس وقت تک ہندوستان کی سیاسی اور عوامی زندگی میں پیش آئے ، احتیاط اور غیر جانبداری کے ساتھ جائزہ لینے کے بعد ، ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ ان کے حین حیات ہندوستان کی سیاسی زندگی میں ابھی وہ منزل آئی ہی نہ تھی ، جہاں سے ان کو اپنی عملی جد و جہد کا آغاز کرنا چاہئے تھا ۔ اس وقت سیاسی میدان میں تین ہی مکاتیب خیال برسر عمل تھے ۔ ایک مکتب خیال تو وہ تھا جس کے پیش نظر محض آزادیٔ وطن کا مقصد تھا اس کو وہ ہر قیمت پر حاصل کرنا چاہتا تھا اور اس آزادی کو حاصل کرنے کا جو طریقہ اس نے موزوں و مناسب خیال کیا ، وہ یہ تھا کہ مغرب کے سیاسی ادارات اور خصوصاً ان ادارات کی ، جنھیں انگریزوں نے اپنے ملک کی خاص روایات اور معاملات کے پیش نظر بنایا اور پروان چڑھایا تھا ، ہندوستان میں بھی ، بعینہٖ ہو بہو نقل کی جائے ۔ ان میں سے چند افراد ایسے خیال پرست اور آزادیٔ وطن کے دیوانے تھے ، جنھوں نے ہندوستان کے مخصوص حالات کو بالکل ہی قابل اعتناء نہ سمجھا ۔ اور اپنی خیال پرستی سے ، اس درجہ مطمئن تھے کہ انھوں نے یہ فرض کر لیا کہ وطن کے آزاد ہو جانے کے بعد ساری گتھیاں خود بخود سلجھ جائیں گی اور تمام مسائل آپ سے آپ حل ہو جائیں گے ۔ ان ہی میں سے ایک جماعت ایسے فرزانوں کی بھی تھی ، جو آزادیٔ وطن اور جمہوری سیاسی ادارات کو اپنی منزل مقصود اسی لیے بنائے ہوئے تھی کہ ان میں ان کو اپنے مخصوص فرقے کا سیاسی و معاشی مفاد نظر آتا تھا ۔ اسی مکتب خیال میں سادہ لوح حضرات کا ایک طبقہ ایسا بھی تھا ، جو یہ خیال کرتا تھا کہ آزادی کی مقدس جنگ میں حصہ لیکر اس کو کامیاب اختتام تک پہنچانے کے بعد ، ہم

۵۵- اقبال نامہ ۔ مرتبہ چراغ حسن حسرت ۔ ص ۲۱

اپنے مخصوص حقوق و مفادات کا بہتر طریقہ پر تحفظ کر سکیں گے ۔ اقبال کو اس مکتب خیال اور آزادی وطن کے ان دیوانوں ، فرزانوں اور سادہ لوحوں سے بنیادی اختلاف تھا ۔ آزادی کے وہ بھی متوالے تھے ۔ ان کی ساری شاعری آزادیٔ خیال ، آزادی فکر و عمل سے بھری پڑی ہے ۔ آزادی کے لیے ان کی شعلہ بیانی اور آتش فشانی کو دیکھ کر ہی اس مکتب خیال کے بعض افراد کے دلوں میں یہ اعتراض پیدا ہوا کہ "اقبال جب تک سیاسی اصول پیش کرتے رہے اور سیاسیات پر تبصرہ کرتے رہے ، دنیا ان کو اپنے تخیل کی متاع عزیز سمجھتی رہی" اور جب انھوں نے سیاسیات کی عملی دنیا میں قدم رکھا تو اس قدر تن آسان اور عافیت کوش بن گئے کہ ان کو حق و باطل میں کوئی تمیز ہی نہ رہی" اس مکتب خیال کی نظروں میں آزادی کی لڑائی ایک مقدس جنگ اور حق و باطل کی پیکار تھی ، انھیں یہ قلق تھا اور ہے کہ اقبال جیسے حریت نواز ، حق گو اور باطل شکن شاعر اور سیاسی فلسفی نے خود عملاً اس آویزش میں اس جماعت کا ساتھ نہ دیا جو برسر ''حق'' تھی لیکن وہ یہ فراموش کر دیتے ہیں کہ اقبال آزادی کے پیغام بر اور ہندوستان کی حریت کے دل سے حامی ہونے کے باوجود اس جنگِ آزادی کو جو اس وقت ہندوستان میں جاری تھی ، "مقدس" اور "برحق" نہیں سمجھتے تھے ۔ انھوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ببانگ دہل اعلان کیا ۔

"حبِ وطن کاملاً ایک فطری نیکی ہے اور انسان کی اخلاق زندگی میں اس کا ایک مقام ہے ، تاہم جو امور حقیقی اہمیت کے حامل ہیں ، وہ انسان کا ایقان ، اس ثقافت اور اس کی تاریخی روایات ہیں ۔ اور میری نظروں میں یہی وہ حقائق ہیں ، جن کے لیے انسان کو جینا اور مرنا چاہیئے ، نہ کہ زمین کا وہ ٹکڑا جس سے انسان کی روح عارضی طور پر ایک گونہ تعلق پیدا کرتی ہے[٥٦]"

٥٦- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ ناشر ، المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ١٩٤٨ء ص ٣٨

آزادی کے دلدادہ اور شیدائی ہونے کے باوجود وہ ہندوستان کی اس جنگ آزادی کو مقدس اور برحق کیوں نہیں سمجھتے تھے؟ اس سوال کا جواب دینے کے لیے ہمیں اس ''گرہ'' کو کھولنا پڑے گا جو اقبال کے تصور آزادی اور اس مکتب کے ''دیوانوں'' اور ''سادہ لوحوں'' کے تصور آزادی میں پڑی ہوئی ہے۔ جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں کہ آزادی کے ان "دیوانوں" کے نزدیک، آزادیٔ وطن کی دیوی کے سوا، ہندوستان کی دنیا میں کچھ تھا ہی نہیں اور آزادی وطن کی خاطر جدوجہد کرنے والا ''پُر جوش مگر سادہ لوح گروہ'' یہ خیال کرتا تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے بعد جو بھی مسائل اس وقت موجود ہیں یا آئندہ پیدا ہوں گے، ان کی نوعیت گھریلو مسائل کی سی ہے، اور میدان جنگ میں سرفروشی کرنے کے بعد، ہم ان کو بہت آسانی کے ساتھ آپس میں مل بیٹھ کر اور اگر یہ ممکن نہ ہو سکے تو برادرانہ طور پر لڑ جھگڑ کر، نہایت خوش اسلوبی کے ساتھ حل کر سکیں گے۔ اقبال کو دونوں جماعتوں سے بنیادی اختلاف تھا۔ آزادیٔ وطن کے وہ حامی ضرور تھے مگر محض وطن کی آزادی ان کا اصلی اور حقیقی مقصود نہ تھا۔ پھر وہ ضمیر کی پوری صداقت کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ جن ذرائع سے بالاقساط یہ آزادی حاصل کی جا رہی ہے، جن طریقوں سے ان حاصل شدہ اقساطِ آزادی کو اس مکتبِ خیال کے فرزانے اپنی مخصوص جماعت و فرقہ کے استحکام (Consolidation) کے لیے استعمال کر رہے ہیں، اور پھر اس کشمکش آزادی کے کامیاب اختتام کے بعد آزاد ہندوستان کا جو سیاسی نقشہ بنایا جائے گا، اس میں نہ صرف یہ کہ ان کے بنیادی تصورات کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے، بلکہ اس سے ان کے اس نصب العینی معاشرہ —— (Ideal Society) کی تشکیل و تعمیر بھی نہ ہو سکے گی، جو ان کی شاعری کے حقیقی پیغام اور ان کے سیاسی افکار و تاثرات کا منشائے اصلی اور مقصدِ وحید تھا اور اس مقصدِ اولین کے سامنے محض آزادیٔ وطن کا مقصد دراصل ان کے نزدیک مقصدِ ثانوی تھا۔ وہ ضرور یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان آزاد ہو لیکن اس سے زیادہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان اس طرح آزاد ہو کہ یہاں اسلامی انقلاب برپا کرنے کے لیے فضائے سازگار اور ماحول بھی آزاد ہو۔ وہ لکھتے ہیں۔

"مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند کو توڑنا اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ، ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مقصد یہی نہیں کہ ہم آزاد ہو جائیں ۔ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائے ۔ اس لیے مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا ، جس کی بنیادیں ان ہی اصولوں پر ہوں ، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے ۔ ایک باطل کو مٹا کر ، دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد ؟ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے لیکن اگر آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہو کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے یا اس سے بھی بدترین بن جائے تو مسلمان ایسی آزادیٔ وطن پر ہزار مرتبہ لعنت بھیجتا ہے ۔ ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا ، بولنا ، روپیہ صرف کرنا ، لاٹھیاں کھانا ، جیل جانا ، گولی کا نشانہ بننا سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے^{۵۷} "

جب وہ اس جنگ آزادی کے متعلق یہ تصور رکھتے تھے کہ یہ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنے کے مترادف ہے تو پھر ان کی اس جنگ میں عدم شرکت کو ان کی بے عملی سے تعبیر کرنا کہاں تک درست ہے؟ جب وہ غلط یا صحیح مگر پوری دیانت داری اور خلوص کے ساتھ یہ سمجھتے تھے کہ آزادیٔ ہند کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جیسا دارالکفر ہے ویسا ہی رہے گا ، یا اس سے بدتر بن جائے گا اور اپنے نزدیک انھوں نے پورے غور و فکر کے بعد یہ قطعی رائے قائم کر لی تھی کہ "ایسی آزادی کی راہ میں لکھنا ، بولنا ، روپیہ صرف کرنا ، لاٹھیاں کھانا ، جیل جانا ، گولی کا نشانہ بننا ، سب کچھ حرام اور قطعی حرام ہے" تو پھر کوئی ذی ہوش ان سے بے عملی کی شکایت کیسے کر سکتا ہے ۔ جنگ آزادی کے متعلق ان کے اس تصور اور اس کے ان نتائج کے متعلق ان کی آراء سے

۵۷- مضامین اقبال : مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، چار مینار ، حیدر آباد دکن ، بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۱۹۵ و ۱۹۶ ۔

دیانتدارانہ اختلاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ ماننے اور تسلیم کرنے کے بعد کہ ان کے ان تصورات و آراء میں کہیں منافقت اور ظاہر داری نہ تھی اور اپنے نتائجِ فکر کو مرتب کرنے میں وہ پوری طرح مخلص تھے۔ آزادی وطن کے دیوانے اور سادہ لوح ، اپنے نزدیک انہیں ہندوستان کے مسائل کو غلط انداز میں سوچنے والا تو کہہ سکتے ہیں لیکن "تن آسان" "عافیت کوش" اور "حق و باطل میں تمیز نہ کرنے والا" ہرگز نہیں کہہ سکتے۔

دوسرا مکتب خیال ان لوگوں کا تھا ، جن کے پیش نظر اپنی جلبِ منفعت تھی ، جو جلسوں اور جلوسوں ، بیانوں اور تقریروں ، انتخابات کے ہنگاموں اور پارٹی بندیوں ، جوڑ توڑ اور سازشوں میں حصہ محض اس لیے لیا کرتا تھا کہ کسی طرح اپنا اُلّو سیدھا کیا جائے۔ یہی ان کی جدوجہد کا خلاصہ تھا اور اسی کو وہ عملی سیاست سمجھا کرتا تھا۔ یہ دراصل کوئی سیاسی مکتب خیال نہ تھا بلکہ سیاسی "قابو چیوں" ———— (Political Opportunists) کی ایک ٹولی تھی۔ ظاہر ہے کہ اقبال کے سیاسی تفکر کا طائر بلند جن آسمانوں پر اڑ رہا تھا ، وہ اتنی پستی پر کیونکر اتر آتا ؟ ان کی پوری سیاسی زندگی پر غور کیجیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صرف ایک لمحہ کے لیے وہ اپنے مقامِ رفیع سے اتر کر سیاست کی ان بھول بھلیّوں میں پھنس گئے تھے ، جس کی غلام گردشیں انتخابات کے مراحل سے گزر کر اسمبلی ہال کے دروازوں تک پہنچتی ہیں۔ مرزا جلال الدین بیرسٹر فرماتے ہیں کہ

> "حقیقت یہ ہے کہ اس زمانے میں کونسل کی رکنیت کو آئندہ ترقی کے لیے ایک زینہ سمجھا جاتا تھا اور ڈاکٹر صاحب بھی فطری طور پر ترقی کی خواہش سے بے نیاز نہ تھے۔ اس کے علاوہ لوگوں کے اصرار نے بھی انہیں اس کام پر آمادہ کیا[58]"

۵۸۔ ملفوظاتِ اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ، بار اول ص ٦٥۔

بہرحال انسانی زندگی کا یہ ایک کمزور لمحہ تھا ، لیکن اس کے بعد وہ جلد ہی ان بھول بھلیّوں سے نکل آئے اور اسی شاہراہ پر پڑ گئے ، جو ان جیسے رفیع المرتبت سیاست داں اور مفکر کے شایانِ شان تھی - اس لیے اگر اقبال نے سیاسی جوڑ توڑ کے وہ کھیل نہیں کھیلے جو ایک مخصوص سیاسی پوزیشن کے مالک ہونے کی حیثیت سے وہ کھیل سکتے تھے اور اس کے ذریعہ وہ اعلیٰ مراتب و مناصب اور دنیاوی منافع حاصل نہیں کیے ، جو ان کے بعض ہم چشم سیاست دانوں نے حاصل کیے تھے تو اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ وہ "سیاست داں نہ تھے-" بے شک " سیاسیات مصالحت کا ایک کھیل ہے " لیکن اقبال کے پیش نظر جو بلند مقاصد تھے اور جن کو آگے بڑھانے کے لیے دراصل انھوں نے تخیلات کی بلندی سے اتر کر عملی سیاست کی پستی میں قدم رکھا ، وہاں اگر وہ مصالحت کا یہ گھناؤنا کھیل کھیلتے تو یقیناً انھیں وزارت کی کرسی اور گورنر جنرل کی خوشنودی حاصل ہو جاتی لیکن اس کے معاوضے میں وہ ان رفیع الشان مقاصد کو کھو دیتے جو ان کی زندگی اور شخصیت کی متاعِ عزیز تھے - اس کھیل میں اقبال کی زندگی تو بن جاتی لیکن ان کی موت ایک ایسے دیوالیہ زدہ شخص کی موت ہوتی جس نے سیاسیات کے سٹّے میں اپنے گنج ہائے گراں مایہ اور اپنی زندگی کی پوری کمائی ہار دی ہو !

تیسرا مکتبِ خیال ان اشخاص کا تھا ، جو آزادی کی جنگ کے ہر مرحلہ پر اپنے جماعت اور فرقے کے مفادات کا تحفظ کرنا چاہتے تھے - انھوں نے جن گھروں میں جنم لیا ، آنکھیں کھولیں اور پرورش پائی ، ان کی فضا کو خاص روایات ، تعلیمات اور ثقافت سے معمور پایا ، فطرتاً انھیں اس سے انس ہونا چاہیے تھا ، جس معاشرہ اور سوسائٹی میں ان کی تعلیم و تربیت ، پرورش و پرداخت ہوئی - اس سے بھی انھیں خاص لگاؤ ہونا چاہیے تھا ——— پھر جب انھوں نے ملک کے سیاسی حالات اور دستوری ترقی کی رفتار کا جائزہ لیا تو یہ محسوس کیا کہ اس سوسائٹی کے افراد سیاسی ، تعلیمی اور معاشی ترقی کی اس دوڑ میں دوسروں سے بہت پیچھے ہیں - انھوں نے لازماً یہ نتیجہ اخذ کیا کہ ان کی اس پستی کی وجہ سے بحیثیت مجموعی وہ معاشرہ اور سوسائٹی بھی پیچھے رہ جائے گی جس میں انھوں نے پرورش پائی ہے

اور دوسرے جب آگے بڑھ کر اپنی سیاسی منزل مقصود کو حاصل کر لیں گے تو لازماً وہ اپنی خاص روایات ، تعلیمات ، ثقافت اور تصورات زندگی کو پورے ملک پر حاوی کرنے کی کوشش کریں گے ۔ جس کا بالآخر نتیجہ یہ ہوگا کہ ان کی اپنی روایات ، تعلیمات ، ثقافت اور تصورات زندگی مغلوب ہو جائیں گے ۔ اپنی عددی کمتری ، تعلیمی پستی و معاشی پس ماندگی کے باعث ان میں اتنی صلاحیت نہ تھی کہ دستوری ترقی کی رفتار کو اپنے بل بوتے پر روکے رکھیں یا اس کو پیچھے کی طرف گھسیٹ کر لے جائیں ۔ اس لیے انھوں نے اس گتھی کا حل " تحفظات " (Safe-Guards) میں سمجھا ۔ وہ " تحفظات " تو چاہتے تھے ، مسلم جمعیت اور فرقہ کے لیے لیکن سمجھتے یہی تھے کہ ان کی وجہ سے بیک وقت مسلمان اور اسلام دونوں محفوظ ہو جائیں گے ۔ اس لیے انھوں نے بڑے زور شور سے " اسلام خطرے میں ہے " کا نعرہ لگایا اور سنہ ۱۹۰۵ء سے لیکر سنہ ۱۹۳۵ء تک اسلام اور مسلمانوں کو خطرے سے نکالنے کے لیے ان کی ساری مساعی " دستوری تحفظات " کے ارد گرد گھومتی رہیں ۔ اقبال نے عملی سیاست میں مصلحت وقت یا مجبوری حالات کی بناء پر اسی گروہ کا ساتھ دیا ۔ لیکن شخصی طور پر وہ اس مکتب خیال کے ان مقاصد سے مطمئن اور ان پر قانع نہ تھے ۔ ان کو اس مکتب خیال کے مقاصد سے ہمدردی ضرور تھی ، لیکن وہ صرف ان ہی مقاصد پر حصر کرکے بیٹھ جانا نہیں چاہتے تھے ۔ وہ ان تحفظات کے مخالف نہیں تھے ، لیکن ان کو اپنے بلند مقاصد کے پیش نظر ، ناکافی تصور کرتے تھے بلکہ وہ دل ہی دل میں یہ یقین رکھتے تھے کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کے چند معاشی ، سیاسی مفادات کا ایک حد تک تحفظ ہو تو ہو ، لیکن اسلامی روایات ، تعلیمات ، ثقافت اور تصورات زندگی کی حفاظت کرنے میں یہ تحفظات یقیناً ناکام رہیں گے اور وہ اس پر قانع نہ تھے کہ اس ملک کی آئندہ تاریخ میں اسلامی تصور حیات کے بچے کھچے آثار بس مٹنے نہ پائیں ۔ ان مسائل کی حد تک ان کی رسائی (Approach) منفی نہ تھی بلکہ مثبت تھی ۔ وہ اس ملک کے مستقبل میں اسلام ، اسلامی تصور حیات اور اسلامی نظام زندگی کو اس کے پورے مضمرات و مقتضیات کے ساتھ برسر عمل اور اس کی تمام نمایاں و پوشیدہ قوتوں کو پھولتا پھلتا دیکھنا چاہتے تھے ۔

نصب العین کا یہ جیتا جاگتا تصور مسلم قوم اور مسلم قائدین کی اکثریت کے ذہن میں واضح طور پر موجود نہ تھا اور اگر اس تصور کی کچھ جھلکیاں ہمیں گذشتہ نصف صدی کی مسلم سیاست میں کہیں کہیں دکھائی دیتی بھی ہیں تو ان کو عملی شکل دینے کے لیے کوئی واضح لائحہ عمل اور عملی تجویز پیش نہیں کی گئی تھی - اقبال کے ذہن میں نصب العین کا یہ تصور بھی بہت ہی واضح تھا اور اس کو عملی جامہ پہنانے کے لیے ان کے پاس ایک ایسی تجویز بھی تھی ، جو وقت کے تقاضوں اور معاملات کی پیچیدگیوں سے بھی پوری طرح عہدہ برآ ہو سکتی تھی - انھوں نے اس تصور اور اس تجویز کو قوم کے سامنے رکھا ، لیکن حالات کی رفتار اور قوم کی نفسیات نے عوام اور قائدین دونوں کو " تحفظات " کے گورکھ دھندے میں پھنسائے رکھا تھا اور ملت کو تاریخ کے بہت سے مراحل ابھی طے کرنے باقی تھے ، زمانہ کی بہت سی ٹھوکریں ابھی کھانی تھیں اور فکر و قیادت کے درمیان ابھی ایک بہت بڑی فصل حائل تھی —— بہرحال علامہ اقبال نے جس نصب العین کی طرف دعوت دی ، اس کو قوم نے سنا اور ان کے پیام پر لبیک بھی کہا لیکن اس نصب العین کے حصول کے لئے جو عملی تجویز انھوں نے پیش کی تھی ، اس کو ملت نے اقبال کی زندگی میں نہیں اپنایا - سوال یہی ہے کہ جب ملت نے اس عملی تجویز کو اپنایا ہی نہ تھا تو وہ اس کے لئے عملی جدوجہد کیسے کرتے ؟ اگر اس تیسرے مکتبِ خیال نے ، جس کے ساتھ علامہ اقبال نے غالباً مجبورانہ تعاون کیا تھا ، ان کے اس نصب العین کو پوری گرم جوشی کے ساتھ اپنا مطمح نظر بنا لیا ہوتا اور اس کے حصول کے لئے اس عملی تجویز کو ویسی ہی بصیرت اور یقین محکم کے ساتھ آگے بڑھانے کی جدوجہد کی ہوتی ، جس بصیرت و ایقان کے ساتھ اقبال نے اس کو پیش کیا تھا ، اور اس وقت وہ تن آسان و عافیت کوش بن جاتے تو یقیناً ہم کہہ سکتے کہ اقبال ہمارے " سیاسی تخیل کی متاع عزیز " تو تھا لیکن عملی دنیا میں اس کو " حق و باطل میں تمیز " نہ تھی !

غور سے دیکھیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اقبال نے اس تیسرے مکتبِ خیال کے ساتھ ، جو تعاون کیا اس کا ماحصل صرف اتنا ہی تھا

کہ مسلمانوں کی خودی اور شخصیت کو دوسروں میں مدغم ہونے سے بچایا جائے۔ اقبال اور اس مکتب کا یہ ایک مشترکہ مقصد تھا لیکن اقبال کے نزدیک یہی ایک مقصد ، مقصدِ اصلی نہ تھا۔ اقبال نے اس گروہ کے ساتھ مل کر عملی سیاست میں جو کچھ جدوجہد کی ، وہ اس مقصد کے حصول کے لیے کافی تھی ، لیکن اس مکتبِ خیال کے حامی اسی مقصد کو سب کچھ سمجھتے رہے اور اقبال ان کو یہیں پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ گئے۔ انھوں نے انھیں پکارا لیکن کسی نے آواز نہ دی ، پھر وہ کیا کرتے ؟ سوائے اس کے کہ اپنے کنج عزلت میں بیٹھ جاتے لیکن انھوں نے یہ بھی نہیں کیا بلکہ بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے مسلم اربابِ حل و عقد کو اس نصب‌العین اور اس تجویز کو قبول کرنے پر آمادہ کرتے رہے۔

ایک باشعور انسان کی عملی جدوجہد بڑی حد تک ، بلکہ تمام تر ایک معینہ مقصد و نصب‌العین کے حصول کے لیے ہوا کرتی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ وہ کوئی معینہ مقصد یا نصب‌العین رکھتا ہے یا اس کی حیثیت اس مجنوں کی سی ہے جو صحرا میں ہر بگولہ کو اٹھتے دیکھ کر محمل سمجھ لیتا اور اس کے پیچھے دیوانہ وار دوڑنے لگتا ہے۔ اقبال کی سیاسی زندگی میں ہمیں مکمل تعقیل (Rationalization) نظر آتی ہے ، وہ ہر اس تحریک کی مخالفت کرتے ہیں ، جو ان کے مقاصد میں حارج ہے اور ہر اس تحریک کی تائید کرتے ہیں ، جو ان کے معینہ مقصد کے حصول میں ممد و معاون ہے۔ پھر یہ تائید بھی صرف اسی حد تک ہوتی ہے جس حد تک وہ سمجھتے ہیں کہ اس تحریک سے ان کے مقاصد میں امداد ملےگی۔ اس سے آگے وہ ایک انچ بھی نہیں بڑھتے۔ وہ ہندوستان کی قوم پرستانہ تحریک آزادی کو اپنے مقاصد کے خلاف سمجھتے تھے ، اس لیے اس میں شرکت نہ کی۔ تحریکِ خلافت سے ان کو ایک گونہ تعلقِ خاطر اور ہمدردی ضرور تھی اس لیے کہ وہ ان کے اسلامی تصورات سے بڑی حد تک ہم آہنگ تھی ، تاہم جب آگے چل کر یہ تحریک متحدہ قومیت کے کانگریسی طلسم میں پھنس گئی ، تو انھوں نے اس پر سخت تنقید کی[۵۹]۔ وہ " فرقہ پرستوں " کی تحریک

۵۹- اقبال نامہ (مکاتیب اقبال) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاءاللہ مطبوعہ لاہور ص ۱۵۸ -

تحفظات میں شریک ہوئے اور اس میں بڑی حد تک سرگرمی سے حصہ لیا لیکن یہ بھی صرف اس حد تک تھا کہ اس کے ذریعہ وہ اپنے نصب‌العین کے حصول کے لیے ملت اور قائدین کو تیار کر لیں۔

جن سیاسی مقاصد کو وہ حق اور جس نصب‌العین کو وہ اپنی منزل مقصود قرار دے چکے تھے، اس کے لیے وہ قلمے، قدمے تمام زندگی برابر کوشاں رہے۔ ان کی ان مقاصد عالیہ کے لیے جدوجہد کا اندازہ اس سے کیجئے کہ مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ وطنیت کی تردید میں ایسا مضمون انھوں نے اس وقت لکھوایا جبکہ وہ بستر مرگ پر پڑے ہوئے تھے اور بقول نذیر نیازی صاحب "رہ رہ کر ضعف اور اختلاج کے دورے ہو رہے تھے اور (حکیم) قرشی صاحب کو خطرہ تھا کہ اس کا کوئی ناگوار اثر ان کی طبیعت پر نہ پڑے[60]"!

اس کے بعد بھی یہ کہنا کہ وہ اس حد تک بے عمل تھے کہ انھیں حق و باطل میں تمیز نہ تھی، صریحاً زیادتی ہے!!

اقبال کی پُر عظمت اور دلنواز شخصیت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ ایک طرف انھوں نے بے عملی کے طعنے سنے اور دوسری طرف اس طنز و تعریض سے بے پرواہ ہو کر آخر وقت تک وہ کام انجام دیتے رہے جس کے لیے قدرت نے ان کا انتخاب کیا تھا۔ پھر اس خدمت کا کبھی ڈھنڈورا نہیں پیٹا، بلکہ اپنے دوست احباب کی مخصوص محفلوں میں کبھی کہا تو صرف یہی کہ

> "میں نے اسلام کے لیے کیا کیا؟ میری خدمتِ اسلامی تو بس اس قدر ہے جیسے کوئی شخص فرطِ محبت میں سوتے ہوئے بچے کو بوسہ دے[61]"

کتنا عجز، کس قدر انکسار، کتنی معصوم شیفتگی اور کیسی پاکیزہ الفت جھلک رہی ہے، "بے عمل" اقبال کے اس حسین تصور میں!!

۶۰- رسالہ اردو، اقبال نمبر طبع جدید ص ۲۳۵۔

۶۱- ایضاً۔

اقبال کی بے عملی کی حقیقت جو کچھ تھی ، وہ آپ نے گذشتہ اوراق میں دیکھ لی ۔ لیکن یہ ایک امر واقعہ ہے کہ اسی بے عملی کو سب سے زیادہ شہرت دی گئی ۔ اور اس شہرت کے عام کرنے میں غیروں سے زیادہ خود اقبال کا اپنا ہاتھ تھا ان میں ، بقول مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی ، فرقہ ملامتیہ کے میلانات پائے جاتے تھے[۶۲] ۔ اور انھیں اپنی برائیوں کا اشتہار دینے میں مزا آتا تھا ۔ وہ خود فرماتے ہیں ۔

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
من اپنا پرانا پاپی ہے برسوں میں نمازی بن نہ سکا
کیا خوب امیر فیصل کو سنوسی نے پیغام دیا
تو نام و نسب کا حجازی ہے پر دل کا حجازی بن نہ سکا
تر آنکھیں تو ہو جاتی ہیں پر کیا لذت اس رونے میں
جب خون جگر کی آمیزش سے اشک پیازی بن نہ سکا
اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا ، کردار کا غازی بن نہ سکا

اسی قسم کے دیگر اشعار و بیانات کے ذریعہ انھوں نے غیروں سے زیادہ خود ہی اپنی بے عملی کا پرچار کیا ۔ یہ بھی ایک بڑی وجہ ہے کہ ان کی بے عملی زبان زد خاص و عام ہو گئی ۔

تھوڑی دیر کے لئے اگر یہ فرض بھی کر لیجئے کہ وہ واقعی اتنے ہی بے عمل تھے ، جتنا کہ انھیں مشہور کیا گیا تو کیا اس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ انھوں نے ملک و ملت کی بدخدمتی کی ؟ ــــــ ملک کی ترقی کو روکا ؟ ــــــ ملت کے مفاد کو نقصان پہنچایا ؟ عمل خواہ کوئی شکل اختیار کرے ، اسی وقت قابل ستائش ہو سکتا ہے ، جب کہ اس کے نتائج قوم و ملت اور انسانیت کے لئے مفید ثابت ہوں اور بے عملی ، خواہ اس کی نوعیت کچھ ہی ہو ، اسی وقت لائق سرزنش ہے ۔ جب کہ اس کے

۶۲۔ "جوہر اقبال" مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ، مطبوعہ محبوب المطابع برقی پریس دہلی سنہ ۱۹۳۸ع ص ۳۹ ۔

مہلک اثرات افراد قوم و ملک پر پڑتے ہوں ۔ لاٹھیاں کھانا اور جیل جانا قابلِ مبارکباد ہے ، بشرطیکہ اس کے ذریعہ قوم کی گاڑی آگے بڑھے ۔ گھر بیٹھے رہنا اور حقہ نوشی کرنا لائقِ ملامت ہے ، اگر وہ قوم کی گاڑی کو آگے کی طرف کھینچنے کی بجائے پیچھے دھکیلنے کا باعث بن جائے ۔ دیکھنا یہ ہے کہ اقبال کی یہ نام نہاد بے عملی قومی کاروان کی راہ میں سنگِ گراں تو ثابت نہیں ہوئی ؟ " بے عمل " اقبال نے کہیں دوسروں کو بے عمل تو نہیں بنا دیا ؟ ـــــ لیکن اگر واقعہ یہ نہ ہو اور اس کی بے عملی دوسروں کی " آہستہ خرامی " کا باعث نہ بنی ہو ، تو پھر اقبال کی بے عملی مطعون کیوں ٹھہرے ؟ ؟ ـــــ اور حقیقت تو یہ ہے کہ اقبال کی بے عملی نے " یارانِ تیز گام " کو نہ صرف یہ کہ سُست رفتار نہیں بنایا بلکہ انھیں " آتشِ زیرپا " کر دیا ! اس کی بے عملی نے شعر و نغمہ کا وہ قالب اختیار کر لیا تھا ، جس کو عمل کی روح نے زندگی عطا کی تھی اور اس کے اسی ترانہ نے بانگِ درا بن کر قوم کے کاروانِ خفتہ کو جادہ پیما کر دیا ! ـــــ اقبال کی اس بے عملی نے ہمارے قومی مرکب کو جو سہمیز لگائی ہے ، اس کا ایک ہلکا سا اندازہ ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب ایم ۔ اے ۔ ڈی فل (آکسن) ، سابق صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے اس بیان سے کر لیجئے ۔

" ستر اسی برس ہوئے ہندوستان کی اسلامی فضا میں ایک آواز گونجی ، جس سے زمین اور آسمان بھر گئے ۔ اس آواز کا منبع علی گڑھ تھا سر سید نے اس زور شور کے ساتھ مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگایا کہ درودیوار گونج اٹھے اور عالم اسلام میں ایک ہیجان پیدا ہو گیا ۔

مسلمانوں کے ماضی و حال کو دیکھ دیکھ کر سر سید کی آنکھوں سے خون کے آنسو بہتے تھے اور ان کے استقبال پر نظر کرکے سر سید کے زبان اور قلم تنبہ اور تنبیہہ ، تدبر اور تدبیر کا تلاطم پیدا کر رہے تھے ۔

پہلا شخص جس نے سر سید کا پیغام شعر کے سانچے میں ڈھ

وہ حالی تھا - حالی نے مسلمانوں کے ماضی و حال کا ایسا نقشہ کھینچا اور ایسے دردِ دل کے ساتھ اس داستان کو بیان کیا کہ شعر کی تاریخ اس کی نظیر سے خالی ہے - دوست و دشمن سب نے گردن ڈال دی اور حالی اسلام کا سب سے بڑا قومی شاعر مان لیا گیا -

لیکن سر سید کا پیغام ابھی اجمالی تھا - انھوں نے قوم کو اس قابل بنایا کہ اپنی حالت کو سمجھے اور حالات کو سمجھے اور پھر یہ بھی سمجھے کہ اس کا مستقبل کیا ہونا چاہیے - اس مستقبل کی تفصیل ابھی باقی تھی -

وہ شخص جس نے اجمال کی تفصیل کی - جس نے ماضی سے استقبال کی طرف نگاہ کو پھیرا ، وہ اقبال ہے - اقبال نے اس جوش و خروش اور اس ولولہ اور امنگ کے ساتھ زبانِ شعر و ادب میں اس مضمون کو ادا کیا کہ یہ اس کا حصہ ہو گیا - حالی ہمارے حال کا شاعر تھا - اقبال ہمارے استقبال کا شاعر ہے -

. . . .

اقبال کی عظمت کا یہ ثبوت ہے کہ وہ ، جس جس مقام سے گزرتا ہے ایک عالم کے عالم کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے - جب وہ نفی خودی کا راگ گا رہا تھا ، لوگ اسے الاپ رہے تھے - جب اس نے خودی کا ڈنکا بجایا ، ہر ساز سے یہی آواز آنے لگی ، اب جبکہ اس نے بے خودی یعنی للہیت اور قوم پرستی کا آوازہ بلند کیا ، سب اسی میں آواز ملا رہے ہیں - آج مسلمانوں کا تمدن اور ان کی سیاسیات بدرجۂ غایت اقبال کے شرمندہ احسان ہیں -

مسلمان ایک گم کردہ راہ قافلہ کی طرح سیاسیات کے لق و دق بیابان میں بھٹکتے پھر رہے تھے ، مگر اس فلسفۂ حیات اور اسلامیات کے مبصر نے ان کے لئے ایک مطمح پیدا کر دیا ، جس کے صائب ہونے کو لوگ نہایت سرعت کے ساتھ مانتے جا رہے ہیں - وقت آ رہا ہے کہ اس کا جھنڈا عنقریب بلند ہو

جائے گا(الف) ۔

اقبال کہتا ہے کہ

ع من نوائے شاعر فرداستم

لیکن یہ ایک صدائے بازگشت ہے ۔ اے اقبال ! تیری صدا سے عالم اسلام کے دل و دماغ بھر گئے ہیں ۔ وہ تیری ہی تعلیم کی طرف جا رہے ہیں تو شاعر فردا ہی نہیں ، تو شاعر امروز بھی ہے اور تیرا اثر اتنا بڑا ہے کہ شاید ہی کسی اور شاعر کا کبھی ہوا ہو ۔ تو قومی شاعر ہی نہیں شاعر عہد ہے ۔ یہ عہد تیرا عہد ہے ۔ عہدِ اقبال ہے[۶۳] "

یہ ہے بے عمل اقبال کا عہد آفرین اثر ! ! " بے عمل " ہو کر بھی اس نے یہ کچھ کر دکھوایا ، اگر وہ " باعمل " ہوتا تو کیا ہوتا ــــــــ ؟

—:o:—

حوالہ جات باب ۷

۱۔ " متحدہ قومیت اور اسلام " از مولانا حسین احمد مدنی ، ناشر کتب خانہ عزیزیہ ، اردو بازار جامع مسجد دہلی ص ۹

۲۔ مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور ص ۲۰۶ و ۲۰۷

الف۔ یہ جھنڈا قیام پاکستان کے بعد بلند ہو چکا ہے ۔ مؤلف

۶۳۔ " فکرِ اقبال " ، مرتبہ غلام دستگیر رشید ، ناشراں اردو اکیڈمی سندھ کراچی و اردو مرکز لاہور مطبوعہ مشہور آفسٹ پریس کراچی طبع دوم سنہ ۱۹۵۶ع ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ ۔

۳- ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور بار اول ص ۹۷
۴- روزگار فقیر ، جلد اول از فقیر سید وحید الدین مضبوعہ کراچی بار پنجم ص ۳۲
۵- شاد و اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ص ۹۷
۶- ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ص ۸۰
۷- سیرت اقبال ، از محمد طاہر فاروقی ص ۱۶
۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، طبع دوم ص ۱۷
۹- "ہندوستان کا مستقبل" از ڈاکٹر راجندر پرشاد ص ۲۷۴ و ۲۷۵
۱۰- ایضاً ص ۲۷۵ ۱۱- ایضاً ص ۲۷۴
۱۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع دوم ص ۱۸۶
۱۳- ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی مطبوعہ لاہور ، بار اول ص ۶۴ و ۶۵
۱۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع دوم ص ۲۶
۱۵- ایضاً ص ۳۴
۱۶- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ محمد عطاء اللہ ص ۲۰۸
۱۷- "جوہر اقبال" مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی مطبوعہ دہلی ص ۴۰ و ۴۱
۱۸- آثار اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید ناشر ادارہ اشاعت اردو حیدر آباد دکن مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع ص ۲۲ و ۲۳
۱۹- حیات اقبال ص ۶۲
۲۰- اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت ص ۲۹
۲۱- اقبال کامل از مولانا عبدالسلام ندوی مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڈھ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۳
۲۲- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۵۱ع ص ۱۱۸
۲۳- ایضاً ص ۱۲۷
۲۴- آثار اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید ص ۲۵
۲۵- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۹۷

۲۶- جوہر اقبال مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ص ۳۸ و ۳۹
۲۷- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " (انگریزی) مرتبہ عظیم حسین ص ۳۱۸ و ۳۱۹
۲۸- ایضاً ص ۳۱۹ ۲۹- ایضاً ص ۳۲۰
۳۰- ایضاً ص ۳۲۰
۳۱- اقبال کی شاعری از عبدالمالک آروی ص ۳۱
۳۲- مکاتیبِ اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۴۰
۳۳- ایضاً ص ۲۸۱ ۳۴- ایضاً ص ۲۰۱
۳۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۶۷
۳۶- شاد و اقبال مرتبہ ڈاکٹر محی الدین قادری زور ص ۱۰۲ و ۱۰۳
۳۷- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس حیدر آباد دکن بار اول ص ۴۹ و ۵۰
۳۸- حیاتِ اقبال ص ۶۲
۳۹- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۸۷
۴۰- ایضاً ص ۲۰۸
۴۱- اقبال ، دی پوئٹ اینڈ ہز مسیج از ڈاکٹر سچدانند سنہا ۔
۴۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۱
۴۳- رسالہ اردو ، اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۶
۴۴- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۸۳
۴۵- ایضاً ص ۱۸۳
۴۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۳۶
۴۷- ایضاً ص ۲۲۲
۴۸- اقبال کی شاعری از عبدالمالک آروی ، ناشر ادارۂ طاقِ دبستان مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع ص ۵۸ و ۵۹
۴۹- رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۱۹۵
۵۰- آثارِ اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع ص ۲۸
۵۱- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۱۰۱
۵۲- ایضاً ص ۷۷

۵۳- آثارِ اقبال مرتبہ غلام دستگیر رشید ص ۲۸
۵۴- رسالہ اردو ، اقبال نمبر ص ۳۱۴ تا ۳۱۶
۵۵- اقبال نامہ مرتبہ چراغ حسن حسرت ص ۱۱
۵۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳۸
۵۷- مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۹۵ و ۱۹۶
۵۸- ملفوظاتِ اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۶۵
۵۹- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۱۵۸
۶۰- رسالہ اردو ، اقبال نمبر ص ۲۳۵
۶۱- ایضاً ص ۲۳۵
۶۲- جوہر اقبال مرتبہ انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی ص ۳۹
۶۳- "فکرِ اقبال" مرتبہ غلام دستگیر رشید مطبوعہ کراچی طبع دوم سنہ ۱۹۵۶ع ص ۱۷۱ تا ۱۷۳ -

---

باب ۸

اقبال کی سیاسی زندگی پر ایک نظر

اقبال سیاست کے نمایاں خد و خال | علامہ اقبال نے برصغیر کی سیاست میں جن تصورات کو آگے بڑھایا اور اس سلسلہ میں جو عملی حصہ انہوں نے لیا ، اس کی ایک واضح تصویر گذشتہ صفحات میں پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے ۔ اس تصویر کے جو نمایاں خد و خال ہمیں نظر آتے ہیں ، وہ یہ ہیں ۔

(۱) اقبال کی سیاست ہنگامہ آرائی ، شور و شغب اور جوش و خروش سے خالی ہے ۔ یہاں نہ جلسوں کی ہمہ ہمی ہے ، نہ جلوسوں کی فراوانی ۔ نہ دھواں دھار تقریریں ہیں ، نہ وقت بے وقت کی بیان بازیاں ، جماعت سازی ہے نہ انجمن آرائی ، نعرے ہیں نہ جے کارے ۔ وہ مسلم لیگ کے معتمد اور کل ہند مسلم لیگ کے صدر رہے ۔ گول میز کانفرنس میں دو مرتبہ مسلمانوں کی نمائندگی کی اور کل ہند مسلم کانفرنس کی صدارت و قیادت کی ۔ اس طرح اس زمانے میں چوٹی کے مسلم قائدین میں ان کا شمار ہوتا تھا اور مسلم کانفرنس کی صدارت کے زمانے میں تو یوں کہنا چاہیے کہ وہ ایک لحاظ سے صف اول کے مسلم قائدین کی بھی قیادت کر رہے تھے ۔ پھر اس نازک زمانے میں برطانوی حکومت اور کانگریس ، دونوں کے خلاف وہ نبرد آزما تھے ۔ لیکن اس زمانے میں بھی وقتی جوش اور ہنگامی خروش سے ان کا دامن آلودہ نہ ہوا اور " غوغائی سیاست " سے وہ ہمیشہ بے نیاز رہے ۔

(۲) آئے دن بیانات کا اجراء اور تقاریر کی اشاعت سیاسی قائدین کے

یہی دو محبوب مشاغل ہیں - یہی وہ تیر ہیں جن سے وہ عوام اور حکومت دونوں کو بیک وقت شکار کرتے ہیں - اقبال نے بھی تقریریں کیں اور بیانات دلیے لیکن ان کی تعداد بہت زیادہ نہیں ہے - انھیں بے موقع تقریریں کرنے اور بے وقت بیانات دینے کا قطعی شوق نہ تھا - انھوں نے انھی مواقع پر تقریریں کی ہیں ، جہاں انھیں کوئی اہم بات کہنی ہوتی تھی اور اسی وقت اہم بیانات جاری کئے ہیں ، جبکہ کوئی اہم معاملہ درپیش آ گیا ہو - انھیں چھپنے اور اخبارات کے کالموں کے ذریعہ عوام اور حکومت کی توجہ کو ہمیشہ اپنی طرف کھینچے رکھنے کا شوق نہ تھا -

(۳) ان کی سیاست ادنلی طرز کی ڈپلومیسی ، سطحی نوعیت کی چالبازی (Tatics) ذلیل انداز کی سودے بازی (Barga'ning) اور نیچ قسم کی سازشوں سے بلند اور بہت بلند ہے - انھوں نے ذاتی مفاد کی خاطر نہ تو کوئی جماعت بنائی اور نہ کسی جماعت میں شریک ہوئے - مسلم لیگ کے شفیع گروپ میں ان کی شرکت محض مشترکہ قومی مقاصد کے لئے تھی - یہ گروپ اپنی رجعت پسندی اور سرکار نوازی کے لئے بدنام تھا - لیکن ڈاکٹر صاحب کا بدترین مخالف بھی یہ نہیں بتا سکتا کہ انھوں نے اس جماعت کا ساتھ دینے کے باوجود کبھی کوئی ذاتی منفعت حاصل کی ہو - مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ پنجاب کونسل کی رکنیت کے لئے اس لئے آمادہ ہوگئے تھے کہ اس زمانے میں کونسل کی رکنیت کو ذاتی ترقی کا ایک زینہ سمجھا جاتا تھا[۱]- لیکن یہ عجیب بات ہے کہ کونسل میں پہنچنے کے بعد انھوں نے ذاتی ترقی کے لئے کوئی کوشش نہیں کی اور اس کے برعکس جب اسی زمانہ رکنیت میں ذاتی ترقی کا ایک موقع آیا اور میاں سر فضل حسین نے انھیں یونینسٹ پارٹی کی مدد سے کونسل کا اسپیکر بنانا چاہا تو بقول عظیم حسین انھوں نے یونینسٹ پارٹی کی پالیسی پر تنقید اور اخبارات میں اس پر سخت حملے کر کے اس کی ہمدردیاں کھو دیں - نتیجہ یہ ہوا کہ یونینسٹ پارٹی کی اکثریت نے

۱- " ملفوظات اقبال " مرتبہ محمود نظامی - مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ، بار اول ، ص ۶۵

ان کو صدر قبول کرنے سے انکار کر دیا[۲]۔ " اور یہ بھی حقیقت ہے کہ ان کی زندگی میں کسب مال اور حصول منصب کی ہزاروں شکلیں پیدا ہوئیں۔ لیکن ان کی استغنا پسند اور فقیرانہ طبیعت نے اپنی غیرت و خود داری میں کبھی آنکھ اٹھا کر، ان کی طرف نہ دیکھا۔ وہ کسی قسم کے نقصان اور منت پذیری یا غرض جوئی کو تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے[۳]۔"

۱۹۳۱ء میں انہوں نے وکالت ترک کر دی تھی[۴]۔ ۱۹۳۳ء میں نزول الماء کی تکلیف سے ان کے لئے لکھنا پڑھنا تقریباً بند ہو گیا تھا[۵]۔ اسی طرح اب کوئی ذریعہ معاش باقی نہ رہا تھا۔ ان کی صحت اور مالی حالت خراب ہو گئی تھی[۶]۔ پوری عمر میں ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی دفعہ یکمشت پچیس تیس ہزار روپیہ انہیں اپنی تصانیف سے حاصل ہوئے تھے، جس سے انہوں نے جاوید منزل تعمیر کی۔ اس کے سوا ان کے پاس کوئی اندوختہ نہ تھا۔ اب پیری اور علالت دونوں نے مل کر یک وقت ان پر حملہ کر دیا تھا۔ مالی نقطۂ نظر سے یہ زمانہ بڑی تکلیف کا تھا۔ اس زمانے میں نواب صاحب بھوپال نے محض اپنے دیرینہ تعلقات، دوستی و محبت کے تحت اپنی جیب خاص سے پانسو روپے وظیفہ ماہانہ مقرر کر دیا۔ اس کے بعد ہز ہائی نس آغا خاں نے بھی انہیں وظیفہ دینا چاہا[۷] اور دیگر ذرائع سے بھی ان کی مالی امداد کی کوششیں کی گئیں۔ لیکن ان میں سے کسی کو بھی انہوں نے قبول نہیں کیا۔

۲۔ " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " انگریزی ۔ از عظیم حسین ص ۳۱۸

۳۔ رسالہ اُردو ۔ اقبال نمبر ۔ طبع جدید ۔ ص ۳۰۶

۴۔ " اقبال کی شاعری " از عبدالمالک ۔ ص ۳۰۴

۵۔ رسالہ اُردو اقبال نمبر طبع جدید ۔ ص ۲۸۹

۶۔ " اقبال کی شاعری " از عبدالمالک آروی ۔ ص ۳۱۴

۷۔ " مکاتیب اقبال " حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطا اللہ ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ۔ ص ۳۲۵

جب ہم ان کی زندگی کے ان واقعات کو پیش نظر رکھتے ہیں تو مرزا جلال الدین صاحب بیرسٹر کا مندرجہ بالا بیان مشتبہ نظر آتا ہے ۔ معلوم ایسے ہوتا ہے کہ مرزا صاحب کا مندرجہ بالا بیان محض ان کے ذاتی تاثر کا نتیجہ ہے ۔ یا پھر یہ ہو سکتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے دل میں ذاتی خواہشات کی ایک خفیف سی سوچ اس زمانے میں آئی تھی ، لیکن بہت جلد ان کی سلامتیٔ طبع اور فطری استغنا نے اس پر قابو پا لیا ۔ بہرحال جو کچھ بھی ہو ، ڈاکٹر صاحب نے اپنی پوری سیاسی زندگی میں محض اپنی ذاتی منفعت کی خاطر جوڑ توڑ نہیں کیے اور کبھی حصولِ منصب کے لئے اپنے ذاتی خیالات اور اصولوں کا خون نہیں کیا اور مفاد ملت کو پسِ پشت ڈال کر حکومت یا کسی دوسری جماعت سے سودا نہیں کیا ۔

" سیاست مصالحت کا ایک کھیل ہے " اس مقولے کے پس پردہ سازشیں اور جوڑ توڑ ہوتے رہتے ہیں اور ان جوڑ توڑ و سازشوں پر مفادِ ملت کے نقاب ڈالے جاتے ہیں ۔ لیکن ان نقابوں کے پیچھے ذاتی منفعت مقصودِ اصلی ہوتا ہے ۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی اپنی سیاسی زندگی میں مصالحت کی ۔ لیکن یہ مصالحت حالات کی مجبوری اور تقاضائے وقت کا نتیجہ تھی ۔ وہ بھی جانتے تھے کہ سیاست مصالحت کا ایک کھیل ہے ۔ لیکن اس کھیل کو انھوں نے جؤا نہیں بنایا اور سیاست کی گندگی کو چھپانے کے لئے اس پر سنہرا نقاب نہیں ڈالا ۔ مصالحت کا کھیل انھوں نے بھی کھیلا ، لیکن ایک ایسے کھلاڑی کی حیثیت سے جو انصاف و راست بازی (Justice and Fairplay) کو اپنی شکست و کامیابی پر ترجیح دیتا ہو ، اور جو مصالحت کرتے ہوئے بھی اپنی خودی اور خود داری کو برقرار رکھتا ہو ۔ مصالحت کے اس کھیل کا مظاہرہ ، انھوں نے نچلی اور گندی سیاست میں نہیں کیا ، کیونکہ انھیں اس قسم کی سیاست سے ذرہ برابر بھی تعلق نہیں تھا ، بلکہ اس سیاستِ عالیہ میں کیا جو ان کے اس کھیل کا اصلی میدان تھا ۔ سر شفیع مرحوم سے ان کی رفاقت اسی سیاسی مصالحت کا نتیجہ تھی ۔ اس کا مقصد کوئی ذاتی منفعت نہیں تھی بلکہ ملت کا وسیع تر مفاد تھا ——— حالات کی مجبوری اور وقت کی نزاکت کا تقاضا تھا کہ جب تک وہ پیغام جو انھوں نے اپنے اشعار اور اپنی تقاریر میں پیش کیا تھا ، افرادِ اُمت

کے سینوں میں راسخ نہ ہوجائے ، اور جب تک ملت اس پیغام کو نصب العین بنا کر اس منزل کی طرف چل نہ پڑے ، جس کی طرف انھوں نے ۱۹۳۰ء میں اشارہ کیا تھا ، وہ اس جماعت کا ساتھ دیں جو آبنٹ کے معاشی ، سیاسی اور تمدنی مفادات کا دستوری تحفظ چاہتی تھی تاکہ ایک طرف ملت کی اجتماعی خودی کسی میں گم نہ ہونے پائے اور دوسری طرف وہ اس انقلاب کے دھارے کو روکے رکھیں ، جو انگریزوں کی سیاسی حکمت عملی اور برادران وطن کی مساعی کی بدولت ، برطانوی پارلیمانی نظام جمہوریت کے بند سے پھوٹ کر ہندوستان کی وادی میں پورے جوش و خروش کے ساتھ اقلیتوں کو خس و خاشاک کی مانند بہا لے جانے والا تھا ——— اگر یہ ڈپلومیسی تھی تو اس کی نوعیت ادنٰی نہ تھی ، اگر یہ سیاسی چال تھی تو اس کی سطح پست نہ تھی - یہ واقعی مصالحت کا ایک کھیل تھا - جس کو صرف بلند پایہ سیاست داں ہی اپنی قوم کے وسیع مفادات اور اونچے مقاصد کی خاطر میدان سیاست کے نشیب و فراز کو پیش نظر رکھتے ہوئے کھیلا کرتے ہیں -

(۴) اقبال نے سیاسی میدان میں دوسروں کو ہٹا کر ، گرا کر ، اپنے آپ کو آگے بڑھانے کی کوئی کوشش نہیں کی - یہاں قائدین بہت سے تھے لیکن وہ کسی کو اپنا مد مقابل اور فریق مخالف نہیں سمجھتے تھے - انھوں نے بعضوں کی مخالفت بھی کی اور بعضوں کی موافقت بھی - لیکن یہ موافقت اور مخالفت اصولی تھی - اس میں رشک و رقابت کو دخل نہ تھا - حقیقت یہ ہے کہ اس معاملے میں وہ چشمک و حسد کے جذبات سے قطعاً مبرا تھے ، کیونکہ وہ اپنے آپ کو سیاسی لیڈر نہیں سمجھتے تھے اور کسی کو اپنا پیشوا نہیں مانتے تھے - وہ خود کہتے ہیں -

" میں کسی جماعت کا قائد اور کسی قائد کا پیرو نہیں ہوں -"

سچ تو یہ ہے کہ بازار سیاست میں انھوں نے کوئی دوکان نہیں کھولی تھی کہ جس کی شان و شوکت و جگمگاہٹ کو دیکھ کر دوسرے دوکاندار رقابت کی آگ میں جلنے لگتے - انھوں نے جن بلند مقاصد کی خاطر سیاسیات میں حصہ لیا اور جس بے لاگ طریقے سے سیاسی مسائل کا حل پیش

کیا ۔ وہ پیشہ ور سیاست دانوں کے مقاصد کے طریقوں سے کوئی میل نہیں کھاتے ۔

(د) " عوام " لیڈر کی سب سے بڑی " پونجی'' ہے ۔ وہ اپنے اصولوں کا خون کر سکتا ہے ۔ اپنی شرافت کا نیلام کر سکتا ہے اور اپنی زندگی کے بڑے سے بڑے نقصان کو برداشت کر سکتا ہے لیکن کسی قیمت پر یہ گوارا نہیں کر سکتا کہ عوام اس کے ہاتھ سے نکل جائیں ، کیونکہ اگر یہ گئے تو سب کچھ گیا ۔ یہ اس کے پیچھے ہیں تو ملک میں اس کی عزت بھی ہے ۔ دور دور اس کی شہرت بھی ہے ۔ اطراف و اکناف سے کھنچ کر آنے والی دولت بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ سرکار میں اس کا وقار ، دھاک اور آؤ بھگت بھی ہے ۔ سیاست کے کھیل میں وہ اپنی عزت و ثروت ، شہرت و دولت ، اخلاق و شرافت غرض کہ ہر چیز کی بازی لگا سکتا ہے ، لیکن اگر نہیں لگا سکتا تو وہ اس کے " عوام" ہیں ۔ یہی اس کی متاعِ عزیز ہے ۔ یہی اس کا سرمایۂ حیات ہے ۔ یہی اس کے بت ہیں ۔ پیشہ ور لیڈر اصل میں عوام کا رہنما نہیں بلکہ نفسیاتی نقطہ نظر سے ان کا بن داموں غلام ہوتا ہے ۔ عوام پر اس کی گرفت اتنی سخت نہیں ہوتی جتنی سختی کے ساتھ عوام کی خواہشات اور ان کے رجحانات اس کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیتے ہیں ۔ ذہنی حیثیت سے وہ اتنا پست ہوتا ہے کہ عوام اس کے آقا ، رب اور خدا سبھی کچھ ہوتے ہیں ——— لیکن اس کی سیاست کا کمال صرف یہ ہوتا ہے کہ وہ ان بھولے آقاؤں اور ان گونگے و اندھے خداؤں کو اپنے الفاظ کی جادوگری اور اپنی منطق کے پھندوں میں اُلجھائے رکھے ۔ وہ کرتا تو وہی ہے جو اس کے ذاتی مفاد کا اقتضا ہوتا ہے لیکن اس کا ہنر صرف یہی ہے کہ وہ یہ سب کچھ کرتا اس انداز سے ہے کہ اس کا ذاتی مفاد بھی عوام کو قومی مفاد نظر آتا ہے ۔ بک چکنے کے بعد بھی قوم اگر ——— زندہ باد ——— اور پائندہ باد کا نعرہ لگاتی رہے تو یہی لیڈر کی کامیابی ہے ——— قوم فروشی کا یہی وہ ڈھنگ ہے جس کا ماہر صرف پیشہ ور سیاستدان ہوتا ہے ۔ اقبال کی سیاست عالیہ کو بھلا اس پیشہ ور سیاست سے کیا تعلق ؟ ان کا سب سے بڑا سرمایہ عوام اور ان کی خوشنودی نہ تھی بلکہ حق کا اظہار اور خدا کی رضا جوئی تھی ۔ حقائق

اسلامی کے مطالعہ کے بعد جو بصیرت ان کے اندر پیدا ہو چکی تھی اس کی روشنی میں انھوں نے ہندوستان کی سیاست کے لئے چند اصول و نظریات بنائے ——— یہی ان کا سرمایہ تھا، جس کو لے کر وہ بازار سیاست میں آئے تھے اور اس سرمایہ کو کسی قیمت پر بھی انھوں نے ہاتھ سے دینا گوارا نہ کیا ۔ وہ حکومت کی نظر غضب کو برداشت کر سکتے تھے ۔ اکثریت کی طنز و تعریض کو سہہ سکتے تھے ۔ خود اپنی قوم کی لعن طعن کو بھی سہہ سکتے تھے ۔ لیکن حکومت کی خوشی ، اکثریت کی خوشنودی اور اپنی قوم کی رضا جوئی کی خاطر اپنے اصولوں اور اپنے نظریوں کو خیرباد نہیں کہہ سکتے تھے ۔ ان کی آنکھوں کے سامنے تحریک خلافت و ترک موالات کا طوفان اٹھا اور اس طوفان میں بڑے سے بڑا اصول پرست بھی خس و خاشاک کی مانند بہہ کر چلا گیا لیکن اقبال کوہ وقار کی مانند اپنی جگہ ڈٹے رہے ۔ سائمن کمیشن کی مخالفت میں تمام عوامی جماعتوں نے متحدہ محاذ بنا رکھا تھا ۔ لیکن اقبال کا سر اس موقع پر عوام کے سامنے نہ جھکا ۔ وہ اپنی شان میں عوام کی زبان سے ٹوڈی ، رجعت پسند ، برطانوی استعمار کا حامی ، سرکار کا ہوا خواہ اور ملک و قوم کا دشمن ——— یہ سب خطابات سنتے رہے ۔ سنتے رہے اور ہنستے رہے ۔ لیکن عوام کی خاطر انھوں نے اپنے کسی اصول میں لچک پیدا ہونے نہ دی ۔ انھوں نے عوام کو عوام کا مرتبہ دیا ، خداوندوں کی مسند پر نہیں بٹھایا اور ان سادہ لوح خداوندوں کی نظروں کو اپنے الفاظ کی میناکاری سے خیرہ کر کے اپنی لیڈری چمکانے کی کوشش نہیں کی ۔

(٦) ہندوستان کی سیاست میں قائدین کی قلابازیاں ، نفسیاتی مطالعہ کے بڑے ہی دلچسپ موضوع ہیں ۔ بے شک انسان کوئی جامد شے نہیں کہ جس میں کوئی تغیر سرے سے ہو ہی نہیں ۔ پھر ایسے شخص کے خیالات ، افکار و تاثرات میں تو تبدیلی ناگزیر ہے ، جو انسانوں کے ہر آن بدلنے والے اجتماعی مسائل کو حل کرنا چاہتا ہو ۔ بایں ہمہ یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ قوموں کے اجتماعی مسائل میں ہر آن تغیر ہی ہوتا رہتا ہے ۔ ان تغیرات میں بھی ایک گونہ اصولی یکسانیت پائی جاتی ہے اور تغیرات و تبدیلیوں کے باوجود ان مسائل کا ایک مستقل و پائدار حل بھی ہو سکتا ہے ۔ اس

کا ادراک وہی شخص کر سکتا ہے جس کی نظر ایک طرف حالات کی نزاکت، زمانے کی مقتضیات پر بھی ہو اور دوسری طرف وہ مستقبل میں پیش آنے والے تغیرات کو بے نقاب دیکھتا ہو۔ پھر اس میں اتنی بصیرت ہو کہ وہ اپنے علم و وجدان کے ذریعہ قوموں کی نفسیات اور ان مابعد الطبیعی محرکات کو سمجھ سکے، جو اقوام عالم کی موت و زیست کا باعث ہوتے ہیں۔ اس لئے قوم کی حقیقی رہنمائی کا فرض وہی شخص ادا کر سکتا ہے، جو سیاسیات کے نشیب و فراز میں اپنی حکمت و تدبر کا ثبوت دے۔ ایک معنٰی میں اس کو مدبر، فلسفی اور حکیم بھی ہونا چاہیے۔ جس سیاست دان میں اتنی باریک بینی اور ژرف نگاہی ہوتی ہے کہ وہ اس خارزار وادی سے ایسے ہی گزر جاتا ہے جیسے کوئی ہموار راستے سے گذر رہا ہو۔ اس کی راہ میں موڑ تو آتے ہیں لیکن اس کو قلابازیاں نہیں لگانی پڑتیں۔ اس کے مقابل میں ایک سطحی سیاست دان محض ابن الوقت ہوتا ہے —— ہوا کے رخ کو دیکھنے والا، قوم کی کشتی کو سمندر کی ہر موج کے حوالے کر دینے والا! معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں، ان کو سلجھانے کے لئے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے اور چونکہ ان کی تہ میں کوئی پائیدار حقیقت نہیں ہوتی بلکہ صرف وقتی مصلحت سنجی ہوتی ہے اس لئے حالات و واقعات کے الجھاوے خود اس کی زندگی کی قلابازیاں بن جاتے ہیں۔

۱۹۰۵ء تک اقبال کے خیالات وطنیت کی طرف مائل تھے۔ اس کے بعد وہ ملیت کے حامی بن گئے۔ یہی ایک تبدیلی ہے، جو ہم کو ان کی سیاسی زندگی میں نظر آتی ہے۔ اس کے بعد جو مطمحِ نظر انہوں نے اختیار کیا، وہ آخر عمر تک باقی رہا۔ اصولاً اس مطمحِ نظر کے دو ہی نقاط تھے۔ ایک تو یہ کہ مسلم قوم کی خودی اور انفرادیت کسی دوسری جماعت میں مدغم ہو کر فنا نہ ہونے پائے اور دوسرے یہ کہ اس ملک کے مستقبل میں اسلام نہ صرف محفوظ رہے، بلکہ اس کو اپنے پورے مضمرات اور مقتضیات کے ساتھ کارفرما ہونے کا موقع ملے۔ سیاسیات میں یہی دو ان کے اعلیٰ اور آخری مقاصد تھے اور عملی زندگی میں انہوں نے کبھی کوئی ایسی راہ اختیار نہیں کی، جس سے، ان کے خیال میں، ان دو مقاصد پر ادنٰی سی ضرب بھی پڑتی ہو، وہ ہندو اکثریت کے ساتھ مفاہمت کے خواہشمند

ضرور تھی ، لیکن اس کی کوئی ایسی صورت انھیں گوارا نہ تھی ، جس میں مسلم قوم کی "خودی" باقی نہ رہتی ہو - پھر ان میں اتنی دوربینی تھی کہ انھوں نے ۱۹۳۰ء ہی میں ۱۹۳۶ء کے دستوری تغیرات اور ۱۹۴۷ء کے انقلابات کو بے نقاب دیکھ لیا تھا اور اپنے علم و وجدان کی روشنی میں انھوں نے سترہ سال قبل وہ تجویز پیش کی جس کی افادیت پر انھیں یقین کامل تھا اور جس کے ذریعہ وہ چاہتے تھے کہ اس برعظیم میں اسلام ایک مرتبہ پھر اپنی اصلی صورت میں جلوہ گر ہو - اس ژرف نگاہی اور دوربینی کی بدولت وہ برخلاف دوسرے قائدین کے سیاسی قلابازیوں سے بچے رہے اور نہایت متوازن رفتار سے اپنے سفر کو طے کیا ! !

اوپر ہم نے جن اوصاف و خصوصیات کا تذکرہ کیا ہے وہ عموماً اوسط قسم کے سیاسندان اور پیشہ ور لیڈر میں موجود ہوتے ہیں - یہی وہ عناصر ہیں ، جن سے اس کی سیاسی زندگی کی تشکیل ہوتی ہے - چونکہ علامہ مرحوم کی خصوصیات ان سے مبرا تھی ، اس لئے بعضوں نے ان کے سیاست داں ہونے ہی سے انکار کر دیا - خود ڈاکٹر اقبال کو اعتراف تھا کہ وہ اس معنٰی میں سیاستدان نہیں تھے - اس نوعیت کی سیاست سے انھیں گھن آتی تھی - انھوں نے اپنی ایک دلچسپ نظم میں اس قسم کی سیاست و لیڈری کا بڑا اچھا نقشہ کھینچا ہے - فرماتے ہیں -

" میں نے اقبال سے از راہِ نصیحت یہ کہا
عاملِ روزہ ہے تو اور نہ پابندِ نماز

تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل
دل میں لندن کی ہوس لب پہ ترے ذکرِ حجاز

جھوٹ بھی مصلحت آمیز ترا ہوتا ہے
تیرا اندازِ تملق بھی سراپا اعجاز

ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے
فکرِ روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز

اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے
پردۂ خدمتِ دیں میں ہوسِ جاہ کا راز

نظر آتا ہے مسجد میں بھی تو عید کے دن
اثر وعظ سے ہوتی ہے طبیعت بھی گداز

دست پر ورد ترے ملک کے اخبار بھی ہیں
چھیڑنا فرض ہے جن پر تری تشہیر کا ساز

اس پہ طرّہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے
تیری مینائے سخن میں ہے شراب شیراز

جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی
تجھ کو لازم ہے کہ اٹھ کر ہو شریک تگ و تاز

غم صیاد نہیں اور پر و بال بھی ہیں
پھر سبب کیا ہے نہیں تجھ کو دماغ پرواز

سن کر کہنے لگا اقبال ، بجا فرمایا
شک مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز

مجھ میں اوصاف ضروری تو ہیں موجود مگر
ہے کمی ایک کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز

ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی الف

غرض کہ نچلی اور گندہ سیاست سے انھیں سخت نفرت تھی اور پیشہ ور لیڈروں سے انھیں تنفر تھا ۔ مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انھوں نے علی الاعلان صحیح قسم کی قیادت کے فقدان پر اظہار افسوس کیا ۔

" مجھے آپ سے بلا تکلف کہہ دینا چاہیئے کہ ہندوستان کے مسلمان اس وقت دو عوارض کے شکار ہو رہے ہیں ۔ پہلا عارضہ قحط الرجال

الف ۔ یہ پوری نظم کلیات اقبال مرتبہ عبدالرزاق مطبوعہ ستمبر ۱۹۲۳ء حیدر آباد دکن میں ملتی ہے ۔ دیکھئے ص ۵۸ ۔ بانگ درا ص ۱۹۴ پر بھی یہ نظم درج ہے لیکن آخری تین شعر اس میں حذف کر دئیے گئے ہیں ۔ مصنف

کا ہے - سر مالکم ہیلی اور ارون کی تشخیص بالکل صحیح تھی ، جب انھوں نے علی گڑھ یونیورسٹی میں یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ ملتِ اسلامیہ رہنماؤں کو پیدا کرنے میں ناکام رہی - رہنماؤں سے میرا مطلب وہ افراد ہیں جو فضل ایزدی یا اپنے وسیع تجربات کی بدولت اسلام کی روح اور تقدیر سے متعلق گہرا وقوف رکھتے ہوں ، اور ساتھ ہی ساتھ جنہیں جدید تاریخ کے رجحان کا عمق ادراک حاصل ہو[۸] ''

الغرض ، اگر سیاست و قیادت نام ہے ، ہنگامہ آرائی ، محض وقتی مصلحت سنجی ، گندم نمائی و جو فروشی کا تو یقیناً اقبال سیاست داں نہیں تھے اور ان کا سیاست داں نہ ہونا ہی ان کی عظمت اور بڑائی کی دلیل ہے - ان کی سیاست میں یقیناً ہنگامہ آرائی نہ تھی ، تقاریر و بیان بازی کی کثرت نہ تھی ، جوڑ توڑ اور سازشیں نہ تھیں ، رشک و رقابت نہ تھی ، محض وقتی مصلحت سنجی نہ تھی - انھوں نے نہ تو عوام کی پرستش کی اور نہ عوام کو بے وقوف بنایا - انھوں نے کبھی عامیانہ شہرت (Cheap Popularity) حاصل کرنے کی خاطر نہ تو اپنے سیاسی خیالات و عقائد بدلے اور نہ کبھی حکومت کو خوش کرنے کے لئے ان سے دست بردار ہوئے - قوم فروشی اور ریا کاری کے ادنٰی سے شائبہ سے بھی ان کی سیاست کا دامن پاک ہے - یہاں تک تو ہم نے یہ بیان کیا کہ اقبال کی سیاست کیا نہ تھی لیکن ابھی یہ بتانا باقی ہے کہ ان کی سیاست فی الواقعی کیا تھی !

اقبالی سیاست کے عناصر اربعہ

(۱) وطنی قومیت کے مقابلہ میں اسلامی قومیت کی تبلیغ

(۲) مخلوط انتخاب کے مقابلہ میں جدا گانہ انتخاب کی ترویج

(۳) وحدانی حکومت کے مقابلہ میں مکمل صوبائی خود مختاری کی حمایت

(۴) کل ہند وفاق کے مقابلہ میں مسلم صوبوں کے وفاق کی دعوت

۸- اسپیچس اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو - ناشر المنار اکادمی لاہور - طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۳۳

یہ تھے اقبال کی سیاست کے عناصر اربعہ ! ! یہی وہ متاع گراں مایہ تھی ، جس سے برصغیر کے مسلم قافلہ کو بہرہ اندوز کرنے کے لئے یہ فقیر منش سیاست داں اپنی کنج عافیت سے نکل کر میدان تگ و تاز میں آیا تھا اور یہی وہ ساز و سامان تھا ، جس سے لیس ہو کر یہ مرد خود آگاہ حریفوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے سیاست کے اکھاڑہ میں داخل ہوا تھا ! گذشتہ اوراق میں اقبال کی سیاسی سرگرمیوں کی جو تفصیلات پیش کی گئی ہیں ، ان پر اگر آپ گہری نظر ڈالیں اور ان سرگرمیوں کا محتاط طریقہ پر تجزیہ کریں تو آپ کو ان کی سیاست کا خلاصہ ان ہی چار نکات میں نظر آئے گا ۔ یہاں ان نکات کے بارے میں اقبال کے افکار و اعمال کا جائزہ لینے کی چنداں ضرورت نہیں ہے کیونکہ ان میں سے ہر ایک پر اس سے پہلے کافی کچھ کہا جا چکا ہے اور مزید توضیح و تشریح مناسب و موزوں مقام پر آئندہ کی جائے گی ۔ یہاں ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ برصغیر ہند میں ان کی عملی سیاست کی تشکیل ان ہی چار عناصر سے ہوئی تھی ۔ ان عناصر اربعہ میں بھی اصلی اور حقیقی عنصر ، نکتہ اول یعنی اسلامی قومیت ہے ۔ باقی تین نکات اسی کے ماتحت یا اسی کے ذیل میں آتے ہیں ـــــ دوسرا نکتہ یعنی جداگانہ طریقہ انتخاب اسلامی قومیت کے "تشخص" کا ایک ذریعہ ہے تو تیسرا اور چوتھا نکتہ یعنی صوبائی خود مختاری اور مسلم صوبوں کا وفاق اسی اسلامی قومیت کے "تمکن" کے وسائل ! گویا اسلامی قومیت ، اقبالی سیاست کا اصل الاصول ہے اور ان کی تمام سیاسی سرگرمیاں اسی اصول کے ارد گرد گھومتی ہیں ۔ باقی رہے جداگانہ انتخاب، صوبائی خود مختاری اور مسلم صوبوں کا وفاق ، تو یہ اس اصول کے ثبات ، قرار و قیام کے ذرائع و وسائل ہیں ۔ مختصراً اور صرف ایک جملہ میں ان کی عملی سیاست کو اس طرح بیان کیا جا سکتا ہے کہ برصغیر میں اسلامی قومیت کا "تشخص" اور اس کا "تمکن" ہی اقبال کے تمام افکار و اعمال سیاسی کا محور ہے ! ـــــــ لیکن اس کے بعد بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا اقبالی سیاست یہی کچھ تھی ؟ یا اس سے بھی آگے بڑھ کر کچھ اور ہے ؟ اسلامی قومیت کا تشخص ، بجا و درست ۔ اس کا "تمکن" ہمارے سر آنکھوں پر ، لیکن پھر بھی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ "تشخص" و "تمکن" کیوں ؟ اس سوال

کا مفصل و مکمل جواب تو آئندہ باب میں دیا جائے گا ۔ یہاں اس کا مجمل جواب سن لیجئے ۔ یہ مختصر جواب اقبالی سیاست کی دو مثبت خصوصیات پر غور کرنے سے خود بخود سمجھ میں آ جاتا ہے ۔

اقبالی سیاست کی مثبت خصوصیات

(۱) اقبالی سیاست کی ایک بہت ہی نمایاں اور اہم خصوصیت تفکر و تدبر ہے ۔ اقبال کی بنیادی حیثیت مفکر کی ہے ۔ ان کی دیگر حیثیتیں ثانوی ہیں ۔ وہ اولاً مفکر تھے اور بعد میں سیاست داں اور شاعر ۔ بایں ہمہ وہ محض خیال پرست فلسفی نہ تھے ۔ وہ ان لوگوں میں سے نہ تھے ، جو اپنے تصورات کی دنیا میں کھوئے ہوئے رہتے ہیں اور جن کا فکری وجود ہماری دنیائے رنگ و بو سے یکسر بے نیاز رہتا ہے ۔ اقبال اصل میں مفکر ہی تھے لیکن ان کا طائر تفکر خیال و تصور کی بلندیوں سے عمل و واقعات کی اس دنیا کو بغور دیکھا کرتا اور اس سے عملی دلچسپی لیا کرتا تھا ! ان کے نظامِ فکر کو جتنا تعلق مابعدالطبیعاتی، الہیاتی اور کائناتی مسائل سے تھا ، اتنا ہی تعلق اس دنیائے آب و گل کے انفرادی و اجتماعی مسائل سے بھی تھا ۔ وہ مفکر بھی تھے اور شاعر بھی ، لیکن ایسے مفکر جس کے تفکر کا ایک خاص عملی نظام تھا اور ایسے شاعر جس کا پیغام ، پیغامِ عمل تھا ۔ وہ خود فرماتے ہیں ۔

عمل سے زندگی بنتی ہے ، جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

اور فکر و تفکر کے متعلق ان کا خیال تھا ۔

وحدت افکار کی بے وحدت کردار ہے خام

سیاسیات بھی چونکہ تعمیر کردار و اظہارِ عمل کا ایک خاص میدان ہے ، اس لئے اقبال نے اس سے بڑی دلچسپی اور انہماک کا اظہار کیا ۔

الغرض ایک تو وہ طبعاً مفکر تھے ، ان کی تعلیم و تربیت بھی اس نہج پر ہوئی تھی اور دوسرے یہ کہ سیاسیات میں سرگرمی کے ساتھ عملی حصہ جب انہوں نے لینا شروع کیا ، اس وقت ان کی عمر ۵۰ سال سے متجاوز ہو چکی تھی ۔ کبرسنی کی پختہ کاری اور فلسفی کی غور و فکر نے

نوجوانی کی ٹرننگ اور سیاستداں کی ہنگامہ پسندی کی جگہ لے لی تھی۔ عمر کا بھی وہ زمانہ ہوتا ہے ، جبکہ انسان کی نظر میں وسعت اور عقل و فکر میں پختگی آ جاتی ہے۔ وہ مسائل کا جذباتی اور سطحی انداز میں مطالعہ نہیں کرتا بلکہ ان کے ماله و ماعلیہ کو عقل و فکر کی کسوٹی پر گھستا ہے۔ نوجوان سیاست داں صرف نعرے لگاتا ہے۔ پختہ عمر سیاس الجھی ہوئی گتھیوں کو اپنے ناخن تدبیر سے سلجھاتا ہے۔ وہ اپنے پھیپھڑے اور حنجرہ کی قوت پر بھروسہ کرتا ہے اور یہ اپنے قلب و دماغ کی صلاحیتوں کو کام میں لاتا ہے۔ " غوغائی سیاست " اس کا مقصود نظر اور فکری قیادت اس کا حقیقی منصب ! اقبال کے فطری رجحان ، ان کی تعلیم و تربیت اور عمر کا تقاضہ ہی یہ تھا کہ ان کی سیاست کی بنیاد غور و فکر پر ہوتی اور ہوا بھی یہی۔ ان کی تقاریر و بیانات میں سطحی مسائل اور جذباتی اپیلوں کے بجائے غور و فکر کے لئے سامان ہے۔ ان کے جلسوں اور جلوسوں میں نعروں کے بجائے تہذیب و شائستگی پائی جاتی۔ کانفرنسوں اور کمیٹیوں میں ان کی شرکت ، سنجیدگی و وقار کا پہلو لئے ہوئے ہے —— اور ان کی تجاویز و تدابیر میں ایسی گہرائی اور عمق و تدبر پایا جاتا ہے ، جس کے پس پردہ ایک بلند پایہ حکیم ، مفکر اور فلسفی کا ذہن کام کر رہا ہے۔ مختصر یہ کہ ان کی شاعری کی مانند ان کی سیاست و قیادت پر بھی فکر کی حکمرانی ہے ! ! وہ مفکر سیاس ہیں اور ان کی قیادت فکری قیادت ہے ! ! ! ——

۲۔ اقبالی سیاست کی دوسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ خود سیاست ان کا مقصود اصلی نہیں بلکہ ایک ذریعہ ہے ، حقیقی مقصد تک پہنچنے کا۔ وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

" سلطنت ہو ، امارت ہو ، کچھ ہو بجائے خود کوئی مقصد نہیں ، بلکہ یہ ذرائع ہیں اعلیٰ ترین مقاصد کے حصول کے۔ جو شخص ان کو بجائے خود مقصد جانتا ہے وہ رضو بالحیواۃ الدنیا میں داخل ہے[۹] "

۹۔ مکاتیب اقبال ، حصہ دوم ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، ناشر شیخ محمد اشرف ، مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور سنہ ۱۹۵۱ع ص ۶۱ -

لیکن ایک پیشہ ور سیاست داں کا شعار رضوا بالحیواۃ الدنیا ہی میں ہوتا ہے ــــــ سیاست ہی اس کا اوڑھنا بچھونا ہوتی ہے - ذہنی حیثیت سے اگر کوئی تیز نظر اور بیدار مغز سیاس اس سے آگے بڑھتا ہے تو وہ سیاست کو حصول اقتدار کا ایک ذریعہ بناتا ہے - ایک لحاظ سے اس تیز نظر بیدار مغز سیاس اور اقبال میں ایک گونہ مماثلت ہے کہ سیاست دونوں کا مقصود نہیں بلکہ ذریعہ ہے ، لیکن جہاں تک مقاصد کا تعلق ہے ان دونوں میں کوئی مناسبت نہیں ہے - تیز نظر اور بیدار مغز سیاس کا مقصد ذاتی اقتدار کا حصول ہوا کرتا ہے - اور اگر وہ ایثار پیشہ اور سچا بھی خواہ قوم ہو تو سیاست اس کے لئے ذریعہ ہے قومی اقتدار کے حصول کا - اقبال ان دونوں قسم کے سیاست دانوں سے آگے ہیں - سیاست حقیقت میں ان کا مقصد نہیں بلکہ ذریعہ ہے - لیکن یہ مقصد کیا ہے ؟ کیا ذاتی اقتدار ؟ ہرگز نہیں ۔ گذشتہ صفحات میں ہم بتا چکے ہیں کہ حصول جاہ و منصب کے لئے انہوں نے کبھی کوشش نہیں کی اور جب ایسے مواقع ان کی زندگی میں آئے تو ان سے انہوں نے اتنا اغماض برتا بلکہ عمداً ایسا طرز عمل اختیار کیا ، جس سے یہ مواقع ہمیشہ کے لئے ختم ہو گئے تو پھر کیا قومی اقتدار ان کا مقصود نظر تھا ؟ جی ہاں ، لیکن صرف ایک حد تک بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ قومی اقتدار و قومی تحفظ ان کی سیاست کی غایت تھی لیکن یہ غایت بھی غایت الغایات نہیں تھی - پھر سیاست میں ان کی غایت الغایات اور منتہائے اصلی تھا کیا ؟ خود ان ہی کی زبان سے سنئے -

> " اگر ہندوستان میں مسلمانوں کا مقصد سیاسیات سے محض آزادی اور اقتصادی بہبود ہے اور حفاظت اسلام اس مقصد کا عنصر نہیں ہے - - - تو مسلمان اپنے مقاصد میں کامیاب نہ ہوں گے[۱۰] "

لیجئے محض مسلمانوں کی آزادی ، اقتصادی بہبود کافی نہیں ہے ! یہ خیال کوئی تیسرے درجہ کا سیاست داں ظاہر نہیں کر رہا ہے بلکہ اقبال کہہ رہا ہے ، جس کی سیاست کا طغرائے امتیاز تفکر و تدبر ہے - گویا

۱۰- مکاتیب اقبال ، حصہ اول ، مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ مرکنٹائل پریس لاہور ص ۲۰۹ -

محض مسلمانوں کی آزادی و اقتصادی بہبود بالفاظ دیگر قومی تحفظ و اقتدار اقبال کی سیاست کا ایک ضروری عنصر ہونے کے باوجود مقصود اصلی نہیں ہے ، بلکہ یہ بھی حصولِ مقصد کا ایک ذریعہ ہے ۔ پھر وہی سوال پیدا ہوتا ہے کہ مقصودِ اصلی تھا کیا ؟ اپنے اس مقصودِ اصلی کا انھوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کے اجلاس میں علی الاعلان اظہار کیا ۔

" ہمارے نصب العین کی کافی وضاحت ہو چکی ہے ۔ آنے والے دستور میں اسلام کے لئے ایسے مؤقف کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنا ، ہمارا مطمح نظر ہے جس کے باعث ایسے مواقع حاصل ہوں کہ وہ (اسلام) اپنے مقاصد کو اس ملک میں پھولتا پھلتا دیکھے [۱۱] "

پھر انھوں نے بستر مرگ سے اپنی زندگی کے آخری ایام میں اپنی اور ہر ہندی مسلمان کی سیاست کے مقصد اولیٰ کو بہت ہی واضح اور غیر مبہم الفاظ میں یوں ظاہر کیا ۔

" مسلمان ہونے کی حیثیت سے انگریز کی غلامی کے بند کو توڑ اور اس کے اقتدار کا خاتمہ کرنا ہمارا فرض ہے اور اس آزادی سے ہمارا مطلب یہی نہیں ہے کہ ہم آزاد ہو جائیں ۔ بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے اور مسلمان طاقتور بن جائیں —— ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہندوستان کلیتاً نہیں تو ایک بڑی حد تک دارالسلام بن جائے [۱۲] "

اقبال رضو بالحیواۃ الدنیا میں داخل نہیں تھے ، کیونکہ سیاست بجائے خود ان کا مقصد اصلی نہ تھا بلکہ ایک ذریعہ تھا ، اعلیٰ تر مقصد کے حصول کا ۔ اور یہ اعلیٰ تر مقصد بھی نہ شخصی (Personal) حصول اقتدار تھا نہ انفرادی (Individual) حصولِ منصب ، نہ جماعتی

۱۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۵۵ ۔

۱۲۔ مضامین اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ھ ص ۱۹۶ ۔

(Sectional) تسلط تھا ، نہ گروہی (Partial) غلبہ ، بلکہ ایک معنی میں وہ محض قومی (National) اور اقتدار و فرقہ وارانہ (Communal) مفادات کا تحفظ بھی نہ تھا بلکہ یہ بلند ترین نصب‌العین یہ اعلیٰ ترین مقصد تھا ، اسلام کی حفاظت ، اور اس کا اقتدار و سیاسی غلبہ ، اور اس دین حقہ کو اس ملک میں برسراقتدار لا کر ہندوستان کو دارالسّلام بنانا !

وہ خود کہتے ہیں اور کتنے واضح الفاظ میں کہتے ہیں -

" کوئی فعل مسلم کا ایسا نہ ہونا چاہئے جس کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ کے سوا کچھ اور ہو[۱۳] "

اعلائے کلمۃ اللہ ، اللہ کے نام کو سر بلند کرنا اور اس کے دین کو اپنے پورے مقتضیات اور تمام مضمرات کے ساتھ برسر عمل اور کارفرما دیکھنا ـــــ یہی ان کے کلام و پیام ، شعر و شاعری ، فلسفہ و تفکر ، تدبر و سیاست ہیں ـــــ ان کی حیات و موت کا منشائے حقیقی ، غایت الغایات اور مقصدِ اصلی تھا ! !

ایک طرف سیاست ان کا مقصود اصلی نہ تھی اور دوسری طرف انھوں نے محض تفریحِ طبع کی خاطر بھی اس سے دلچسپی نہیں لی بلکہ سیاسیات سے ان کی دلچسپی گہری تھی - مگر اس دلچسپی کی اصلی غایت بھی یہی تھی کہ اسلام کو اس ملک میں پیش آنے والے حوادث سے بچایا جائے اور ایسے مواقع فراہم کئے جائیں کہ وہ پوری آن بان اور اپنی اصلی شوکت و شان اور اپنے حقیقی خدوخال کے ساتھ ایک مرتبہ پھر جلوہ گر ہو سکے - وہ فرماتے ہیں -

" سیاست کی جڑیں انسان کی روحانی زندگی میں پیوست ہوتی ہیں - یہ میرا ایقان ہے کہ اسلام انفرادی خیال آرائی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے وہ ایک معاشرہ ہے یا اگر آپ مناسب سمجھیں تو اس کو ایک معاشری کلیسا کہہ سکتے ہیں - چونکہ جدید سیاسی

۱۳- مکاتیب اقبال ، حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ، مطبوعہ لاہور ، سنہ ۱۹۵۱ع ص ۶۲ -

تصورات جیسا کہ وہ ہندوستان میں تشکیل پاتے ہوئے دکھائی دے رہے ہیں، اسلام کی بنیادی ہئیت اور اس کی خصوصیت خاصہ (Charactor) کو ممکن ہے کہ متاثر کریں اس لئے مجھے سیاست سے دلچسپی ہے[۱۴] "

الغرض تفکر و تدبر اقبالی سیاست کی نمایاں مثبت خصوصیت ہے اور تفکر و تدبر کے ساتھ ہی وہ عملی سیاست میں گہری دلچسپی بھی لیتے ہیں، تاہم خود سیاست ان کا مقصود اصلی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ذریعہ ہے حصول مقصد کا —— اور مقصد اولین و آخرین ہے، اسلام کی " بنیادی ہئیت " کا تحفظ اور اسلام ہی کا تمکن ہے!! مختصر یہ کہ وہ مفکر سیاستداں ہیں ۔ ان کی فکری سیاست کا مرکزی موضوع اسلام کی " بنیادی ہئیت " کی تشریح و توضیح ہے اور اسلام کا " تحفظ و تمکن " ہی ان کی عملی سیاست کی روح ہے!!

وہ محض سیاست دان اور نرے فلسفی نہ تھے۔ پیامِ مشرق میں انھوں نے بڑے دلچسپ انداز میں فلسفی و سیاست دان کے فرق و امتیاز اور ان کی ذہنی خصوصیات کو واضح کیا ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

فلسفی را با سیاست داں بہ یک میزان سنج
چشمِ آں خورشید کورے، دیدۂ ایں بے نمے
آں تراشد قولِ حق را حجتِ نا استوار
ایں تراشد قولِ باطل را دلیلے محکمے

فلسفی اپنے تصورات و خیالات کی دنیا میں اس قدر کھویا ہوا رہتا ہے کہ اس کی آنکھ خورشید عالم تاب کو بھی نہیں دیکھتی اور سیاستداں اپنے گرد و پیش کی دنیا اور ماحول میں اس قدر غرقاب رہتا ہے کہ اس کا سینہ جذبات عالیہ سے خالی اور اس کی آنکھ لذت اشک ریزی سے عاری ہوتی ہے فلسفی حق کی حمایت تو کرتا ہے لیکن چونکہ وہ عملی دنیا کی پیچیدگیوں

۱۴۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال، مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۸ ۔

سے ناواقف ہوتا ہے۔ اس لئے اس کی دلیل بودی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس سیاستداں کا تعلق عملی دنیا سے ہوتا ہے ، اس لئے وہ باطل کی حمایت میں مضبوط دلیل پیش کرتا ہے۔ اقبال فلسفہ و سیاست دونوں سے واقف تھے۔ قدرت نے انھیں فلسفی کے ذہن اور سیاست داں کی نظر سے سرفراز کیا تھا اور ساتھ ہی وہ فلسفی کی نفسیاتی بیماری اور سیاست داں کے اخلاقی مرض دونوں سے آگاہ تھے۔ وہ فلسفی بھی تھے اور سیاست داں بھی۔ لیکن ذہنی اور اخلاقی لحاظ سے ان دونوں سے بلند و برتر تھے۔ بقول قائد اعظم جناح " ان میں صرف فلسفی و شاعر کی تصوریت (Idealism) ہی نہ تھی بلکہ ایک ایسے سیاست داں و مدبر کی حقیقت پسندی (Realism) بھی تھی ، جو واقعات کا عملی جائزہ لیتا ہے "[۱۵]۔

فطرت نے ایک عجیب و غریب انداز سے تصوریت و حقیقت پسندی کو ان کی شخصیت میں سمویا تھا اور قدرت کے اس عطیہ سے بہرہ اندوز ہو کر انھوں نے اپنے تفکر و تدبر کی روشنی میں ایک عملی سیاس کی حیثیت سے مسلمانوں کی حالت کا جائزہ لیا ، ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے عناصر کا تجزیہ کیا اور اسلام کے مقتضیات اور اس کی روح و مزاج کا مطالعہ کیا اور پھر اپنی قدرتی صلاحیتوں کو کام میں لا کر ہندوستان کے پیچیدہ مسئلہ برصغیر میں اسلام کے مستقبل اور مسلمانوں کی گتھی کا ایک ایسا حل پیش کیا جو شاید نرے فلسفی اور محض سیاست داں کے بس کی بات نہ تھی ! ! ان کی عملی سیاست کیا تھی ؟ اس کا مفصل جواب ان ہی مسائل کے مطالعہ و تجزیہ میں مضمر ہے۔ آئیے ، ایک نظر ان مسائل پر بھی ڈال لیں۔

۱۵- سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف مسٹر جناح ، جلد دوم ، ص ۲۲۲ -

حوالہ جات باب ۸

۱- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۶۵
۲- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین ص ۳۱۸
۳- رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۳۰۶
۴- اقبال کی شاعری از عبدالمالک ص ۳۰۴
۵- رسالہ اردو اقبال نمبر ص ۲۸۹
۶- اقبال کی شاعری از عبدالمالک ص ۳۱۴
۷- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۳۷۵
۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳۳
۹- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۶۱
۱۰- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۰۹
۱۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۵
۱۲- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۹
۱۳- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۶۲
۱۴- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳۸
۱۵- سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف مسٹر جناح جلد دوم ص ۲۲۲

باب ۹

اقبال کا شاہ منصوبہ

مسلمانوں کی حالت کا جائزہ

۱- تیاری کا دور :- مغلیہ سلطنت کے زوال اور انگریزوں کے تسلط کے بعد ، مسلمانوں کی حالت نا گفتہ بہ ہو گئی تھی - افلاس ، جہالت اور غلامی نے ان کو اپنا شکار بنا لیا تھا - اس زمانہ میں سر سید نے ان کی خدمت کا بیڑا اٹھایا اور ان کی اصلاح و ترقی کے لیے ایک منظم تحریک جاری کی - اس تحریک کے تین اہم عناصر تھے - (۱) تعلیم جدید کی اشاعت (۲) انگریزی تہذیب و معاشرت اور انگریزوں سے ربط و ضبط (۳) سیاست سے اجتناب - سر سید اور ان کے رفقاء نواب محسن الملک و خواجہ الطاف حسین حالی وغیرہ نے جب اس تحریک کا آغاز کیا تو ابتدا میں ہر طرف سے ان کی مخالفت کی گئی - لیکن کچھ ہی عرصہ بعد قوم کی ایک عظیم اکثریت نے ان کی آواز پر لبیک کہا اور عملاً مسلم قوم نے ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا - سر سید اپنے زمانے کے مخلص ، خیر خواہ اور مسلمہ قائد تھے - ان کی تحریک نے مسلم قوم کے تن مردہ میں از سر نو جان ڈالی - مسلمانوں میں تعلیم پھیلنے لگی - ان کی معاشی حالت بہتر ہونے لگی ، سرکاری ملازمتیں انھیں ملنے لگیں اور انگریزی حکومت اور مسلم قوم میں جو بعد پہلے تھا وہ کم ہونے لگا - اس لحاظ سے اس دور کو تیاری کا دور کہہ سکتے ہیں - اس دور میں مسلم قوم کا رجحان بحیثیت مجموعی دنیوی ترقی کی طرف تھا - انگریزی تعلیم نے ان میں دنیوی ترقی کا شوق پیدا کر دیا ، لیکن انگریزی تہذیب و معاشرت سے مرعوبیت کے باعث نوجوان نسل میں دین کی طرف سے ایک حد تک بے رخی بلکہ بیزاری

کے آثار بھی پیدا ہو گئے اور سیاسی نقطۂ نظر سے ان کی حیثیت اس صغیر سن لڑکے کی مانند تھی ، جو ابھی تک انگریزوں کی انگلی پکڑے اپنا رستہ طے کر رہا ہو ۔

عبوری دور :- ۱۹۰۵ء سے مسلمانوں کے نقطہ نظر میں ایک نئی تبدیلی پیدا ہوتی ہے ۔ وہ اپنی سیاسی حالت کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں اور سر سید کی تحریک کے تیسرے عنصر سیاسیات سے اجتناب کو خیر باد کہہ دیتے ہیں اور اپنی ایک علیحدہ سیاسی تنظیم کی داغ بیل ڈالتے ہیں ۔ لیکن اس سیاسی تحریک پر ابھی سر سید کی اجتماعی تحریک ہی کا اثر غالب رہتا ہے ۔ یہ سیاسی تحریک مسلمانوں کی جدا گانہ حیثیت پر زیادہ زور دیتی ہے لیکن انگریزی حکومت سے اپنے توقعات وابستہ رکھتی ہے ۔ کم از کم برطانوی حکومت کی کھلم کھلا مخالفت اس تحریک کے مسلک میں داخل نہ تھی ۔ یہ دور ۱۹۱۱ء تک قائم رہتا ہے ۔ اس دور کو ہم عبوری دور کہہ سکتے ہیں ۔ محسن الملک اور وقارالملک اس دور کے ممتاز رہنما ہیں ۔

بیداری کا دور :- ۱۹۱۱ء سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے ۔ اسی سال مولانا ابوالکلام آزاد "الہلال" جاری کرتے ہیں اور مولانا محمد علی "کامریڈ" نکالتے ہیں ۔ اسی زمانے میں تنسیخِ تقسیمِ بنگال کا اعلان ہوتا ہے ۔ یہ واقعات تو اندرون ہند رونما ہوتے ہیں ادھر بیرون ہندوستان تمام عالم اسلام پر مصائب کی گھٹا چھا جاتی ہے ۔ انگلستان در پردہ ترکی و ایران کے جدید نظامِ دستوری کی مخالفت کرتا ہے ۔ روس و برطانیہ کے اتحاد سے ترک و ایران کے لیے ایک نیا خطرہ پیدا ہو جاتا ہے ۔ طرابلس کی جنگ اسی زمانہ میں چھڑتی ہے اور بلقان کی عیسائی ریاستیں ، سلطنت ترکیہ کے خلاف جنگ شروع کر دیتی ہیں ۔ جنگ بلقان کے اختتام پر برطانیہ کی مخالفِ ترک روش سے مسلمانانِ ہند خاص طور پر متاثر ہوتے ہیں ۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انگریزوں پر بھروسہ کرنے کی قدیم مسلم پالیسی میں تبدیلی پیدا ہوتی ہے ۔ اسی دوران میں پہلی عالمگیر جنگ چھڑ جاتی ہے اور سلطنت ترکیہ جرمنی کے ساتھ مل کر اتحادئین کا مقابلہ کرتی ہے ۔ مسلمانانِ ہند کی ہمدردیاں فطری طور پر سلطنت ترکی کے ساتھ رہتی ہیں اور وہ انگریزی حکومت کے رویہ کو پسندیدہ

نظروں سے نہیں دیکھتے ہیں ۔ مسلمانوں کے چوٹی کے لیڈر نظر بند کر دیئے جاتے ہیں ، جس کی وجہ سے ان میں اضطراب پیدا ہوتا ہے اور انگریز" حکومت پر رہا سہا اعتماد بھی ختم ہو جاتا ہے ۔ نتیجہ یہ کہ مسلمان او ہندو ایک دوسرے سے سیاسی طور پر بہت قریب آ جاتے ہیں : جنگ عظیم کے اختتام پر برطانوی حکومت نے ترکوں کے ساتھ جو روش اختیار کی اس کو مسلمان ان وعدوں کی خلاف ورزی تصور کرتے ہیں ، جو دوران جنگ ان سے کیے گئے تھے ۔ اسی زمانے میں (Rowlatt act) پاس ہو جاتا ہے ۔ پنجاب میں مظالم ڈھائے جاتے ہیں اور جلیانوالہ باغ کا واقعہ پیش آتا ہے ۔ ان تمام اسباب کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ مسلمان انگریزی حکومت کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے ہیں ۔ تحریکِ خلافت و تحریکِ ترکِ موالات شروع ہوتی ہے ، جس میں ہندو مسلمان دونوں جوش و خروش سے حصہ لیتے ہیں ۔ حکومت ، ہندو مسلم زعماء کو جیلوں میں بند کر دیتی ہے او ہزاروں ہندو مسلم کارکنوں کو سزائیں دیدی جاتی ہیں ۔ اب اس تحریک کا زور ٹوٹنے لگتا ہے ۔ ہندو مسلم اتحاد کا شیرازہ بکھر جاتا ہے ۔ شدھی وسنگھٹن ، تبلیغ و تنظیم کی تحریکیں شروع ہو جاتی ہیں اور ملک میں ہندو مسلم فساد پھوٹ پڑتے ہیں ۔ ان حالات سے متاثر ہو کر ، مسلمانوں کا گروہ جو سیاسی معاملات میں انگریزوں پر بھروسہ کیا کرتا تھا ، پھر میدان میں آ جاتا ہے اور مسلمانوں میں پھر ہندو بیزاری اور انگریز دوستی کی پالیسی آگے بڑھنے لگتی ہے ۔ اس دور کو ہم بیداری کا دور کہہ سکتے ہیں اور اس دور کے یہ چند نمایاں واقعات ہیں ۔ علامہ اقبال کی زندگی کا بڑا حصہ اس دور میں گذرتا ہے ۔ ۱۹۱۱ء سے بیداری کی ایک نئی تحریک شروع ہوتی ہے ۔ "الہلال" والے مولانا ابوالکلام آزاد ، "کامریڈ" والے مولانا محمد علی اور "اسرار خودی اور رموز بے خودی والے" علامہ اقبال اس تحریک کے تین زبردست ستون تھے ۔ اس تحریک کا نفسیاتی تجزیہ ایک علیحدہ مقالہ کا بڑا دلچسپ موضوع بن سکتا ہے ۔ یہاں ہم مختصراً اس تحریک کے بعض اہم پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کریں گے ۔

"اسلام کی طرف واپسی" ''Back to Islam'' اس تحریک کا لب لباب تھا ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ تیاری کے دور میں کچھ تو انگریزی تعلیم کے

زیر اثر اور زیادہ تر انگریزی تہذیب و معاشرت سے مرعوبیت کے باعث مسلمانوں کی نوجوان نسلوں میں مذہب سے ایک گونہ بے رخی ، بلکہ بیزاری کے آثار پیدا ہو چلے تھے ۔ صرف دنیوی ترقی ، ان کا مطمح نظر قرار پا چکی تھی اور یہ خیال عام ہونے لگا تھا کہ مذہبی جکڑ بندیوں سے آزاد ہو کر ہی وہ زمانے کا ساتھ دے سکتے ہیں اور اس طرح پھر دنیا میں مسلمان ترقی کر سکتے ہیں ۔ بیداری کی یہ تحریک اس رجحان کے خلاف ایک ردِ عمل تھا ۔ اس دور میں مغربی تہذیب و تمدن اور نظام معاشرت پر تنقید ہونے لگی اور مغرب کے اجتماعی نظریوں کی جانچ پڑتال کی جانے لگی ۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے "الہلال" کے مضامین اور اپنی تقاریر میں مولانا محمد علی نے "کامریڈ" اور "ہمدرد" کے صفحات پر اور اپنے لکچرز میں اور علامہ اقبال نے اشعار کے ذریعہ مغربی تہذیب و تمدن اور اجتماعی زندگی کے اصولوں پر کڑی تنقیدیں کیں ۔ ان کے کھوکھلے پن کو واضح کیا ، اور بتلایا کہ مغرب کی ترقی کا راز ان کے عمرانی نظریات میں نہیں بلکہ سائنٹفک نظریات میں پوشیدہ ہے ۔ ساتھ ہی ساتھ بڑے موثر انداز میں ان اکابرین نے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی کہ ان کی دینوی پستی اور زوال کا باعث اسلام نہیں بلکہ اسلام سے بُعد و دوری ہے ۔ مولانا آزاد نے اپنی تفسیر قرآن کے ذریعہ ، مولانا محمد علی نے اپنی تقاریر میں اور علامہ اقبال نے اپنے اشعار کے توسط سے اسلامی تعلیمات اور اسلامی حقائق کو ایک نئے مگر موثر انداز میں پیش کرنا شروع کیا ۔ ان اکابر ثلاثہ نے اسلامی تاریخ پر ایک نئے انداز میں روشنی ڈالی اور اسلام کے اجتماعی نظام اور اس کے مختلف خد و خال کو بڑے زور شور سے نمایاں کیا ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند کی اجتماعی زندگی کی تاریخ اور خصوصاً اس دور بیداری میں ان اکابر ثلاثہ نے جو خدمات انجام دی ہیں اس کا احاطہ صرف وہی شخص کر سکتا ہے ، جو اس دور کی تاریخ گہرے نفسیاتی مطالعہ کے بعد کرے گا ۔ بہر حال اس تحریک بیداری کے یہی تین اشخاص روح رواں تھے لیکن ان میں بھی اس تحریک کے پیدا کرنے کے لیے سب سے زیادہ موثر اور کار گر ہتھیار علامہ اقبال ہی کے پاس تھا ۔ شاعری کو انسانی تاریخ کے معلومہ زمانے سے لیکر آج تک قوموں کو بیدار کرنے اور ان کے جذبات کو

اکسانے کا سب سے زیادہ موثر آلہ تسلیم کیا گیا ہے اور قدرت نے اس تحریکِ بیداری کے پیدا کرنے کے لیے دو زبردست مقرروں اور انشاء پردازوں کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کا بھی انتخاب کیا تھا —— !

سر سید کی تحریک تیاری کے شاعر حالی نے قوم کو ترقی کی جو راہ بتلائی تھی وہ یہ تھی۔

ع چلو تم اُدھر کو جدھر کی ہوا ہو
ع زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ بساز سعدیؒ

تحریکِ بیداری کے شاعر اقبال نے قوم کو جس شاہراہ ترقی کی طرف بلایا تھا۔ وہ یہ تھا۔

زمانہ با تو نہ سازد تو با زمانہ ستیز

سر سید اور ان کے ساتھیوں نے اپنے گردو پیش کے حالات کو دیکھتے ہوئے مغربی تہذیب و معاشرت کو قبول کرنے کا مشورہ دیا۔ ان کا نعرہ تھا۔ مغرب کی طرف" (Towards West) ! اقبال اور ان کے ساتھیوں نے مغرب کی تہذیب و شائستگی کا حکمیاتی مطالعہ کیا اور مغرب کی اجتماعی زندگی کی نفسیات کو ٹٹولا ، اس کے بعد مسلمانوں کو از سر نو اسلام کی طرف پکارا۔ اس تحریکِ بیداری میں جدید تعلیم یافتہ اور قدیم علماء دونوں شریک تھے۔ علیگڑھ اور دیو بند دونوں مکاتیب خیال کو اس تحریک نے اپنے اندر سمو لیا تھا۔ دین اور دنیا کی دوئی ختم ہو چکی تھی اور وہ دونوں یکجا آ کر اس تحریک میں مل گئے تھے۔

جہاں تک اس تحریک کے اجتماعی و عمرانی پہلوؤں کا تعلق ہے ، اس کے حامیوں میں گہرا اختلاف نہ تھا۔ اسلام ہی سب کے نزدیک معاشرتی و عمرانی مسائل کا حل تھا ، لیکن جہاں تک اس تحریک کے عملی سیاسی پہلو کا تعلق ہے ، اس کے علمبرداروں کے مابین ایک گہری خلیج حائل تھی۔ ان کا ایک گروہ تو وہ تھا ، جو ہندوؤں کے ساتھ مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکال باہر کرنا چاہتا تھا۔ ۱۹۱۱ع سے لے کر ۱۹۲۳ع تک ملک کے اندر جو واقعات پیش آئے ، ان کی وجہ سے اس گروہ نے مسلمانوں کی سیاست پر قبضہ کر لیا تھا۔ لیکن ۱۹۲۳ع کے بعد

حالات نے پلٹا کھایا ۔ ہندو مسلم اتحاد کی ناؤ شدھی و سنگھٹن اور تبلیغ و تنظیم کی چٹان سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گئی ۔ نہرو رپورٹ کی اشاعت کے بعد ، مسلمانوں نے عام طور پر یہ محسوس کرنا شروع کیا کہ عملی سیاسیات میں ہندو اکثریت پر تکیہ کرنا بے سود بلکہ خطرناک ہے ۔ اس زمانے میں ایک دوسرے مکتبِ خیال کو آگے بڑھنے کا موقع ملا ، جو در اصل سر سید کی تحریک تیاری کے علمبرداروں کا جانشین تھا ۔ حالات کی رفتار سے مجبور اور ہندو اکثریت کے عزائم سے واقف ہو کر اس گروہ نے عملی سیاست میں انگریزی حکومت پر بھروسہ کرنے کی وہی پرانی حکمت عملی پھر اختیار کی ۔ غرض عملی سیاست کے میدان میں اس تحریکِ بیداری کے دور میں مسلمانوں کے اندر یہی دو مکاتیبِ خیال نمایاں تھے ۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے ان دونوں میں ایک قسم کی انفعالی کیفیت (Passive Tendency) پائی جاتی تھی ۔ یہ دونوں گروہ ایک طرح کی مجہولی مفاہمت (Unmanly Compromise) کے قائل تھے ۔ ایک گروہ ہندو اکثریت سے مفاہمت و تعاون ہی کو اپنی راہِ نجات سمجھتا تھا ۔ اور دوسرا گروہ اپنے تحفظ کے لئے انگریزوں کی پشت پناہی پر بھروسہ کرتا تھا ۔ ان دو گروہوں کے ہجوم میں ایک تیسری جماعت آن افراد کی بھی تھی ، جو نہ ہندو کے سامنے سپر انداز ہونا چاہتے تھے اور نہ انگریز کو اپنی مدد کے لئے بلانا چاہتے تھے بلکہ چاہتے تھے کہ مسلمان انگریز کی حکومت سے مرعوب اور ہندو اکثریت سے متاثر نہ ہوں ۔ اور ان دونوں کی طرف سے نظر پھیر کر اپنی پوشیدہ صلاحیتوں کا جائزہ لیں ، اپنے من میں ڈوب کر زندگی کے سراغ کو پا لیں اور اپنی " خودی " میں کھو کر " ضربِ کلیم'' پیدا کر لیں ۔ ان دونوں گروہوں کے مقابلے میں اس تیسرے گروہ کی آواز ابھی نحیف تھی ۔ اقبال دراصل اسی تیسرے گروہ کے ذہنی رہنما تھے اور ان کے کلام و پیام سے اس گروہ کو زندگی کی حرارت ملتی تھی ۔ بظاہر اقبال کا تعلق دوسرے گروہ سے تھا لیکن یہ تعلق کچھ تو حالات کی مجبوری اور وقت کی مصلحت کا نتیجہ تھا ، جس کی تشریح و توضیح ہم کر آئے ہیں اور کچھ مسلم قوم کی تاریخی و نفسیاتی حالت کا اقتضا ہی یہ تھا کہ جب تک اس قوم میں اپنے پاؤں پر کھڑا رہنے کی سکت نہ پیدا ہو جائے ، اس وقت تک اس

کو زمانہ کے آشوب سے بچانے کے لئے عارضی طور پر تحفظ کا کوئی نہ کوئی انتظام کیا جائے - لیکن حقیقت میں ذہنی اور فکری حیثیت سے اقبال کا تعلق اسی تیسرے گروہ سے تھا - انھوں نے کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس مارچ ۱۹۳۲ء میں اسی گروہ کی نمائندگی کی اور بڑے موثر انداز میں مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا -

" مسلمانوں نے ایک عرصہ سے اپنی باطنی زندگی کی گہرائیوں کو تلاش کرنا ترک کر دیا ہے - نتیجہ یہ ہے کہ وہ اپنی حیات کی پوری تابانیوں کے ساتھ زندہ نہیں ہے اور اسی لئے وہ مجہول مفاہمت (Unmanly Compromise) کے خطرے میں مبتلا ہے ——— مفاہمت ان طاقتوں سے جن کی نسبت وہ سمجھتا ہے کہ کھلی آویزش میں ان کو مغلوب نہیں کیا جا سکتا - ہر وہ شخص جو ایک ناموافق ماحول کو بدلنے کی خواہش رکھتا ہے ، اس کے اندرون میں مکمل انقلاب ہونا چاہیئے - خدا لوگوں کی حالت اس وقت تک نہیں بدلتا ، جب تک کہ روزمرہ کے کاروباری دائرے کو ایک معینہ نصب العین کی روشنی سے منور کر کے وہ خود اپنی حالت کو بدلنے کا اقدام نہیں کرتے - اپنی باطنی زندگی کی آزادی پر ایقانِ محکم رکھے بغیر کچھ بھی حاصل نہیں ہو سکتا - یہی ایقان لوگوں کی نظر کو ان کی منزلِ مقصود پر جمائے رکھتا اور ان کو ہمیشہ کے ڈگمگانے جانے سے بچائے رکھتا ہے -

گذشتہ تجربے نے جو سبق تم کو سکھایا ہے اس کو ہمیشہ یاد رکھنا چاہیئے - کسی فریق سے توقعات وابستہ نہ کرو - اگر تم اپنی تمناؤں کو بارآور ہوتے دیکھنا چاہتے ہو تو اپنی خودی کو اپنے اندر بیدار کرو اور اپنی خاکِ نمناک کو پختہ کر کے اسی سے اپنے میں جوہرِ مردانگی پیدا کرو - مسولینی کا مقولہ تھا " جس کے پاس فولاد ہوتا ہے ، اس کے پاس روٹی بھی ہوتی ہے " میں اس میں تھوڑی سی ترمیم کرتا ہوں " جو فولاد ہے وہی سب کچھ ہے " سخت بن جاؤ اور سخت کوشی اختیار کرو -

اجتماعی اور انفرادی زندگی کا یہی ایک راز ہے ۔ ہمارے نصب العین کی کافی وضاحت ہو چکی ہے ۔ آئندہ دستور میں اسلام کے لئے ایک ایسے مؤقف کو کامیابی کے ساتھ حاصل کرنا ہمارا مطمح نظر ہے ۔ جس کے باعث ایسے مواقع حاصل ہو جائیں کہ وہ (اسلام) اپنے مقاصد کو اس ملک میں پھلتا پھولتا دیکھے ۔ یہ ضروری ہے کہ اس نصب العین کی روشنی میں جماعت کی ترقی پسند طاقتوں کو ابھارا جائے اور ان کی موجودہ پژمردہ توانائیوں کو مجتمع کیا جائے زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا ، اس کو اپنی ہی روح کے شوالے میں فروزاں کرنا چاہیئے[۱] "

الغرض علامہ اقبال ہندوستان کی بالعموم اور مسلم قوم کی تحریک بیداری کے بالخصوص ایک زبردست ستون تھے اور وہ اس جماعت کے ہراول و پیش خیمہ تھے ، جس نے سیاسی میدان میں مسلم قوم کو مجہول مفاہمت کی ذلت سے بچایا ، زندگی کے شعلے کو دوسروں سے مستعار لینے کی خواری سے انھیں محفوظ رکھا اور ان کی خودی کے شعلے کو ان ہی کی روح کے شوالے میں فروزاں کیا ! یہ اقبال کا پہلا کارنامہ ہے ! !

یہاں تک ہم نے اس حالت کا سرسری ذکر کیا ، جس میں مسلمان اپنی زندگی گذار رہے تھے اور علامہ اقبال کی ان کوششوں کو گنایا ، جو انھوں نے اس حالت کو بدلنے کے لئے کیں ۔ اب ہم ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے اس خاکہ کو پیش کریں گے جو اس زمانے میں بنایا جا رہا تھا ۔

ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے چار زاویئے

ہندوستان اس زمانے میں تیزی کے ساتھ ترقی کی شاہراہ پر گامزن تھا ۔ معاشی نقطہ نظر سے قدیم دیہی خود اکتفائی کا نظام ختم ہو چکا تھا ۔ رسل و رسائل کی جدید سہولتوں کی بدولت ، دیہات اور شہر ایک دوسرے سے قریب آ گئے تھے ۔ انگریزی مصنوعات نے ہندوستان کے نہ صرف شہری بلکہ دیہی بازاروں پر بھی

۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ۔ ستمبر ۱۹۴۸ع ۔ ص ۵۵

قبضہ کر لیا تھا ۔ لارڈ میکالے کا بنایا ہوا نظام تعلیم اب بڑی حد تک ہندوستان میں مروج ہو چلا تھا ۔ انگریزی تعلیم اور انگریزی مصنوعات کی جلو میں انگریزی تہذیب و معاشرت نے ہندوستان کے شہروں میں گھر کر لیا تھا ۔ اور دیہات بھی ان کے اثر سے یکسر بچے ہوئے نہ تھے ۔ یہ تو تھی ہندوستان کی معاشی ، معاشرتی اور تعلیمی حالت ، سیاسی حیثیت سے بھی اس نے کچھ کم ترقی نہیں کی تھی ۔ عوام میں سیاسی شعور بیدار ہو چکا تھا ، وہ اپنی سیاسی پستی و محکومی سے پوری طرح واقف ہو چکے تھے اور غلامی کے بندھنوں کو توڑ پھینکنا چاہتے تھے ۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کے بہترین دماغوں نے اس زمانہ میں اپنی توجہ زیادہ تر سیاسیات ہی کی طرف مبذول کر رکھی تھی ۔ لیکن جس طرح انھوں نے معاشی ، معاشرتی اور تعلیمی ترقی کے لئے مغربی اصولوں کو اختیار کیا تھا ۔ اسی طرح سیاسی ترقی کے لئے بھی مغربی نظریات کو اپنا لیا تھا ۔ اس زمانے میں ہندوستان کی سیاسی و اجتماعی زندگی کا ایک مربع تھا ، اور ، (۱) وطنی قومیت (۲) لادینیت یا مذہب و سیاست کی تفریق (۳) جمہوری پارلیانی نظام حکومت (۴) سرمایہ و محنت کی کشمکش ، اس کے چار زاوئیے تھے اور ان ہی چار بنیادی تصورات کے سائے میں ہندوستان کی سیاسی و اجتماعی زندگی کو تشکیل دینے کی کوشش کی جا رہی تھی ۔

(۱) **وطنی قومیت :** انگریزوں نے اپنے شہنشاہی نظام کو مضبوط کرنے کی غرض سے اور اپنی انتظامی سہولتوں کے پیش نظر ، ہندوستان کو ایک ملک بنائے رکھا تھا ، پھر رسل و رسائل کے جدید انتظامات اور حمل و نقل کی ترقی یافتہ سہولتوں نے بھی ہندوستان کے برعظیم کو سکیڑ کر ایک واحد معاشی اکائی بنا دیا تھا ۔ اس کے پس پردہ بھی برطانوی سرمایہ داروں کی وہ پالیسی تھی ، جس کے ذریعہ وہ اپنی تیار کردہ مصنوعات کی ایک بہت بڑی تعداد کو ہندوستان کی منڈیوں میں پہنچانا اور اس کے دیہات سے خام پیداوار حاصل کرکے اپنے کارخانوں کو بھیجنا چاہتے تھے ۔ بہرحال انگریزوں کی معاشی ، سیاسی اور انتظامی پالیسی نے ہندوستان کے مختلف جغرافی خطوں اور ان خطوں میں مختلف زبانیں بولنے والوں اور مختلف معاشرتی امتیازات کے حامل رہنے بسنے والوں کو ایک دوسرے سے

فریب کر دیا تھا ۔ ہندوستان کے سیاسی رہناؤں نے ان حالات سے فائدہ اٹھا کر اس وطنی قومیت کا پرچار کرنا شروع کر دیا ، جس کا سبق انھوں نے یورپ اور بالخصوص انگلستان کی جدید تاریخ میں پڑھا تھا ۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ہندوستان ایک ملک ہے اور اس میں بسنے والے تمام افراد ایک قوم ہیں ۔ ان افراد کے مختلف گروہوں ، جاعتوں اور فرقوں کے مابین جو لسانی ، مذہبی ، معاشرتی اور تہذیبی اختلافات پائے جاتے ہیں ، ان کو ان رہناؤں نے یا تو بالکل ہی نظر انداز کر دیا تھا یا پھر ان کی اہمیت کے وہ قائل ہی نہ تھے ۔

(۲) **لادینیت** (Seclarism) : مغربی تہذیب و معاشرت اور انگریزی نظام سیاست کی ایک نمایاں بلکہ بنیادی خصوصیت مذہب و سیاست کی تفریق ہے ۔ مذہب ایک انفرادی معاملہ ہے اور اس کا دائرہ صرف اس تعلق کی حد تک محدود ہے جو خدا اور بندے کے مابین پایا جاتا ہے ۔ اس سے آگے مذہب کو مجالِ دمِ زدن نہیں ۔ انسان آزاد ہے کہ اپنی اجتماعی ، معاشرتی اور سیاسی زندگی کی تشکیل ، مذہب کی قید و بند سے بے نیاز ہو کر اپنی خواہشات و ضروریات کے مطابق کرے ۔ مغرب نے ان تصورات کو بطور اصول موضوعہ کے تسلیم کر لیا تھا ۔ اور اس طرح لادینیت (Secularism) ، نشاۃ ثانیہ (Renaissance) کے بعد والے یورپ کی اجتماعی زندگی اور بالخصوص سیاسی ادارت و نظام حکومت کی خصوصیتِ خاصہ قرار پا چکی تھی ۔ دنیائے مسیحیت کی وحدت کے پارہ پارہ ہو جانے کے بعد اسی کے خاکستر اور مذہب و سیاست کی دوئی یا لادینیت کے بطن ہی سے یورپ میں وطنی قومیت پیدا ہوئی اور نشاۃ ثانیہ کے بعد یورپ میں جو مستحکم مملکتیں وجود میں آئیں ، ان کی روح رواں سیکولرزم کی یہی دختر دوشیزہ وطنی قومیت تھی ۔ ہندوستان کے سیاسی رہناؤں نے جب وطنی قومیت کی بنیاد پر اپنے ملک کی سیاسی تنظیم کرنے کی کوشش کی تو وہ مذہب و سیاست کی دوئی یا (Secularism) کے نظریہ کو کس طرح نظر انداز کر سکتے تھے؟ جب انھوں نے بیٹی کو گود لے لیا تھا تو ماں کو کس طرح نکال باہر کرتے ! مشرق اور بالخصوص ہندوستان کی گذشتہ تاریخ ، اس کے ماحول ، روایات اور اس کے اندرونِ ضمیر میں مذہب ہی

سب سے زیادہ مؤثر اور کارفرما عامل رہا ہے ، لیکن جدید ہندوستان کی صورت گری ، اسی سیکولرزم یا غیر مذہبی نظریہ کے ہیولے سے کی جا رہی تھی ! گویا ہندِ قدیم کا وصف خصوصی مذہبیت اور ہندِ جدید کا نشانِ امتیازی لادینیت ! !

(۳) **جمہوری پارلیمانی نظام حکومت :** فرنگی اصول و نظریات نے جہاں ہندوستان کی معیشت و معاشرت پر اپنا اثر دکھایا وہاں اس کے نظامِ حکومت و دستور پر بھی اپنا ٹھپہ لگانا چاہا ۔ اور یہ بالکل قدرتی بات تھی ۔ انگریزوں کے نزدیک جس طرح اپنی تہذیب و معاشرت کے اصول محترم و معزز تھے ، وہاں حکمرانی و دستور سازی کے متعلق ان کے نظریات ہی انھیں سب سے زیادہ مفید نظر آتے تھے ۔ انھوں نے جو چیز اپنے لئے موزوں سمجھی ، فطرتاً اس کو دوسروں کے لئے بھی اچھا سمجھا ۔ پھر ان کے لئے اس میں اچھائی کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ وہ ہندوستان کو اپنے ہی ملک کے رائجُ شدہ سیاسی ادارات اور دستوری اصلاحات ، وقفہ وقفہ سے بالا قساط اور بہ سہولت تمام دے کر اپنی سلطنت کی عمر کو یہاں طویل سے طویل بنا سکتے تھے ۔ ہندوستان کی بساطِ سیاست کے شاطروں کو بھی اسی کھیل میں اپنا مفاد نظر آیا ۔ وہ بھی اپنے مغربی اُستاد کی چالیں چلکر ہی اپنے ملک کی سیاسی نجات حاصل کرنا چاہتے تھے ۔ انگریز حاکم کی سہولت و مصلحت اسی میں تھی کہ وہ انگلستان کے پارلیمانی جمہوری نظام کو یہاں بالاقساط نافذ کرتا رہے اور ہندوستانی محکوم کا مفاد بھی اسی میں تھا کہ وہ اس کو آنکھ بند کرکے قبول کرتا جائے ۔

(۴) **سرمایہ و محنت کی کشمکش :** ہندوستان ایک زرعی ملک ہے ۔ دیہات اس کے معاشی نظام کی ریڑھ کی ہڈی ہیں ۔ قدیم زمانہ میں یہ دیہات خود مکتفی تھے اور ہر موضع ایک علیحدہ معاشی اکائی تھا ۔ لیکن برطانوی حکومت کے قیام کے بعد ہندوستان کے اس معاشی نظام میں تغیر واقع ہوا ۔ دیہات کی معاشی خود اکتفائی کا نظام ٹوٹ پھوٹ گیا ۔ مشینی نظامِ حمل و نقل نے دیہات کو ایک دوسرے سے قریب اور شہروں سے مربوط کر دیا اور انہی وسائل حمل و نقل کی بدولت یورپ اور بالخصوص

انگریزی مصنوعات دیہات کے گھانس پھوس کے گھروں میں پہنچنے لگیں اور گاؤں کی خام پیداوار انگلستان و یورپ کے کارخانوں کو سہیا کی جانے لگی۔ ہندوستان کے قریوں میں انگریزی لالٹین اور یورپی قمقموں کی روشنی تو پہنچنے لگی لیکن وہ معاشی آسودہ حالی رخصت ہونے لگی ، جو ہندوستان کے قدیم معاشی نظام کی ایک نمایاں خصوصیت تھی۔ اِدھر ملک میں تعلیم کی عام اشاعت اور بیداری کی بدولت ہندوستانیوں کے دل میں بھی معاشی ترقی کی خواہش پیدا ہوئی۔ انھوں نے یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں کی صنعتی ترقی کو دیکھ کر یہ خیال کیا کہ ہندوستان کی معاشی ترقی کا راز بھی اس کو ایک صنعتی ملک بنانے میں مضمر ہے۔ ادھر انگریزی سرمایہ داروں نے اپنے مخصوص مفادات کا تحفظ اسی میں سمجھا کہ ان ہی کے سرمایہ اور انتظام کی سر پرستی میں ہندوستان بھی ایک خاص طرز پر اور ایک خاص حد تک صنعتی میدان میں قدم رکھے۔ اس طرح اب ملک میں صنعتی کارخانے کھلنے لگے۔ شہروں کی تعداد میں اضافہ ہونے لگا ، شہری آبادی بڑھنے لگی۔ ابتداًء تو نہیں ، کچھ ہی عرصہ بعد ہندوستان میں بھی وہی مسائل پیدا ہونے لگے ، جو ایک صنعتی ملک میں لازماً پیدا ہوتے ہیں۔ سرمایہ اور محنت میں کشمکش شروع ہو گئی۔ مزدوروں کی انجمنیں بننے لگیں ، ہڑتالیں اور دربندیاں ہونے لگیں۔ اب ہندوستان کے معاشی میدان میں واضح طور پر دو گروہ بن گئے تھے۔ ایک گروہ تو وہ تھا ، جو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان ، انگلستان اور دیگر یورپی ممالک کی طرح ایک صنعتی ملک بن جائے اسی میں اس کی معاشی نجات ہے ، اسی طریقہ پر وہ ایک مرفہ الحال ملک بن سکتا ہے۔ اس گروہ میں پیش پیش وہ لوگ تھے جن کے ہاتھوں میں سرمایہ تھا اور جن کے دماغ اعلیٰ تعلیم سے روشن تھے۔ غیر ملکی سرمایہ اور غیر ملکی صنّاع نے ہندوستان کے قدرتی وسائل سے انتفاعِ ناجائز کرکے ملک کے اندر جو لوٹ کھسوٹ مچا رکھی تھی ، اس سے یہ گروہ متاثر تھا۔ بالفاظ دیگر ملکی سرمایہ کا غیر ملکی سرمایہ سے مقابلہ تھا اور ملکی صنّاع غیر ملکی صنّاعوں سے نبرد آزما تھے۔ دوسرا گروہ وہ تھا ، جو یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان ایک سرمایہ دارانہ صنعتی ملک بننے کی بجائے ایک اشتراکی مملکت بن جائے کہ اشتراکیت ہی میں

اس کی فلاح ہے - یہ گروہ ان لوگوں کا تھا جو روسی انقلاب سے متاثر تھے - اس طرح خود ہندوستانی سرمایہ و ہندوستانی محنت میں کشمکش شروع ہو گئی تھی اور یوں معاشی نقطۂ نظر سے ہندوستان دہری کشمکش میں مبتلا تھا - ایک کشمکش ملکی سرمایہ اور غیر ملکی سرمایہ ، ملکی صنّاع اور غیر ملکی صنّاع کے درمیان جاری تھی اور دوسری کشمکش خود ملکی سرمایہ اور ملکی محنت کے آپس میں ہو رہی تھی - اب ہندوستان ایک دوراہے پر کھڑا تھا ، جس کا ایک راستہ نظام سرمایہ داری کی طرف جا رہا تھا اور دوسرا نظام اشتراکیت کی طرف اور یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ کون سی راہ بالآخر اختیار کرے گا - ان دونوں راستوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے سے ، بظاہر جو طاقت اس کو روکے ہوئے تھی ، وہ غیر ملکی حکومت کا اقتدار تھا - اس اقتدار کے خلاف کانگریس نے جو محاذ بنایا تھا اس میں یہ دونوں فریق شریک و شامل تھے - پنڈت جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس اور جے پرکاش نرائن اگر اشتراکی گروہ کی نمائندگی کر رہے تھے تو سردار پٹیل اور راج گوپال چاری سرمایہ داروں کے مربی اور سرپرست بنے ہوئے تھے - یہ کہنا تو دشوار ہے کہ ان میں سے کون سا گروہ قوی تھا - لیکن بظاہر پنڈت جواہر لال نہرو اور سوبھاش چندر بوس کے قوی اشتراکی رجحانات اور کانگریس کے اندرونی حلقوں اور عوام دونوں پر ان کے مساوی اثر و نفوذ کو دیکھتے ہوئے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ اشتراکی گروہ ہی کا پلّہ بھاری ہے -

الغرض اقبال نے جب ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے محرکات کا تجزیہ کیا اور ان محرکات کی بنیاد پر مستقبل میں قائم ہونے والے سیاسی نظام کا اندازہ لگایا تو اس کی تہ میں انھوں نے ان ہی چار عناصر (۱) وطنی قومیت (۲) مذہب و سیاست کی تفریق (۳) جمہوری پارلیمانی نظام حکومت (۴) سرمایہ اور محنت کی کشمکش ـــــ کو کارفرما دیکھا - آئیے ایک نظر اقبال کے ان خیالات پر بھی ڈال لیجئیے جو انھوں نے ان تصورات کے متعلق ظاہر کئے ہیں -

وطنی قومیت اور اقبال ! اقبال وطن کے نہیں بلکہ وطنیت کے مخالف ہیں - وطن کی محبت فطرت انسانی کا خاصہ ہے - اقبال اس کے مخالف نہیں

ہیں ۔ وہ کہتے ہیں ۔

" ہر انسان فطری طور پر اپنے جنم بھوم سے محبت رکھتا ہے اور بقدر اپنی بساط کے اس کے لئے قربانی کرنے کو تیار رہتا ہے ۔ بعض نادان لوگ اس کی تائید میں حب الوطن من الایمان کا مقولہ حدیث سمجھ کر پیش کیا کرتے ہیں ۔ حالانکہ اس کی کوئی ضرورت نہیں ، کیونکہ وطن کی محبت انسان کا ایک فطری جذبہ ہے جس کی پرورش کے لئے اثرات کی کچھ ضرورت نہیں[۲] "

وطن کی اصطلاح کو محض جغرافیائی مفہوم میں استعمال کیا جائے یا اس سے انسان کے اس فطری جذبہ کی طرف اشارہ کیا جائے تو اقبال اس کے مخالف نہیں بلکہ موئد ہیں لیکن اس اصطلاح کو جب سیاسی معنی میں استعمال کیا جاتا ہے تو وہ اس کی شدید مخالفت کرتے ہیں ۔ ان کے نزدیک " زمانہ حال کے سیاسی لٹریچر میں وطن کا مفہوم محض جغرافیائی نہیں بلکہ وطن ایک اصول ہے ہئیت اجتماعیہ انسانیہ کا اور اس اعتبار سے ایک سیاسی تصور ہے[۲] "

وطن کا یہ سیاسی تصور یورپ کی نشاۃ ثانیہ کے بعد پیدا ہوا ۔ نشاۃ ثانیہ سے قبل یورپ کی قومی زندگی کی اساس کلیسائی نظام پر تھی اور اس نظام نے اس میں ایک قسم کی اجتماعی وحدت پیدا کر رکھی تھی ۔ نشاۃ ثانیہ کے بعد جب یورپ کی دینی وحدت پارہ پارہ ہو گئی اور یورپ کی اقوام علیحدہ علیحدہ ہو گئیں تو ان کو اس بات کی فکر ہوئی کہ قومی زندگی کی اساس کیا قرار دی جائے ۔ انہوں نے یہ اساس وطن کے تصور میں تلاش کی ۔ وطن کی اساس پر لوگوں کے مجتمع کرنے کے معنی یہ تھے کہ ہر ملک کے رہنے بسنے والے ایک علیحدہ قوم ہیں اور ان کے معاشی ، معاشرتی ، تہذیبی و سیاسی مفادات میں باہم کامل یگانگت ہے ۔ اقبال وطن کے اس سیاسی تصور بالفاظ دیگر وطنیت یاوطنی قومیت کی مخالفت کرتے ہیں ۔ یہاں ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ ان کی اس مخالفت کے دلائل کیا ہیں اور وہ اس تصور میں کیا قباحتیں

۲- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۸۲ ۔

پاتے ہیں۔

(۱) وطنیت کا یہ تصور خالص مادہ پرستانہ ہے۔ نشاۃ ثانیہ سے قبل یورپ کی اجتماعی زندگی نے کلیسا کو محور قرار دے کر جس طرح اپنے آپ کو ایک ایسے مشرب رہبانیت کے حوالے کر دیا تھا "جس نے دلیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جا لی تھی"، اسی طرح نشاۃ ثانیہ کے بعد اس نے وطن کو اپنا مرکز قرار دے کر ایک ایسے مادہ پرستانہ نظام کو قبول کر لیا، جس میں روحانیت کا کوئی شائبہ بھی نہیں ہے یہ گویا کلیسا کے خلاف ایک سخت رد عمل ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ جن ممالک نے اس تصور کی اساس پر اپنی اجتماعی زندگی کی تشکیل کی، وہاں مذہب و خدا سے بعد پیدا ہوا، مادہ پرستی پھیلتی گئی۔ اقبال کی نظر میں خدا بیزاری، مادہ پرستی (دہریت) انسانیت کے سب سے زیادہ خطرناک دشمن ہیں۔ اسی لئے وہ وطنیت کے مخالف ہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

> "میں یورپی تصور قومیت (وطنی قومیت) کا مخالف ہوں —— اس لئے کہ میں اس میں خدا بیزار مادہ پرستی کے جراثیم پاتا ہوں، جن کو موجودہ بنی نوع انسان کے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتا ہوں[۳]"

(۲) یورپ نے کلیسا کو اجتماعی زندگی سے نکال باہر کیا اور اس کی جگہ وطن کو مسند نشین کر دیا۔ اس طرح یورپ کے سیاسی نظام میں وطن نے عملاً خدا کی جگہ لے لی اور انسان اس کا بندہ و غلام بن کر رہ گیا ہے۔ یہ انسانیت کی سب سے بڑی توہین ہے۔ انسان خالص مادی وجود نہیں ہے۔ اس کے اندر ملکوتی جوہر بھی ہیں۔ اس لئے انسانی روح کو خاک کی پستیوں میں اس طرح آلودہ کرنا شرف انسانیت کی مٹی پلید کرنا ہے۔ اقبال کہتے ہیں۔

۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۸۔

" جب وطن کاملاً ایک فطری خاصہ ہے اور انسان کی اخلاقی زندگی میں اس کا ایک مقام ہے - تاہم جو چیزیں حقیقی قدر و قیمت رکھتی ہیں وہ انسان کا ایمان ، اس کی ثقافت اور اس کا تاریخی ورثہ ہے - یہی وہ چیزیں ہیں جن کے لئے انسان کو زندہ رہنا اور مرنا چاہیے نہ کہ زمین کا وہ خطہ جس سے انسان کی روح اتفاقاً ایک عارضی تعلق پیدا کر لیتی ہے[۳] "

تقریباً اسی مفہوم کو انہوں نے شاعرانہ انداز میں اس لطیف طریقہ سے ادا کیا ہے -

فطرت نے مجھے بخشے ہیں جوہر ملکوتی
خاکی ہوں مگر خاک سے رکھتا نہیں پیوند

درویشِ خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی
گھر میرا نہ دلی نہ صفاہاں نہ سمرقند

(۳) وطنیت نے نہ صرف شرفِ انسانیت کی مٹی پلید کی ہے بلکہ خود انسانیت پر بھی کاری ضرب لگائی ہے اور اس کے ٹکڑے پارچہ کر دئے ہیں - اس نے اولادِ آدم کو مختلف جغرافیائی خطوں میں تقسیم کرکے ایک دوسرے کے مقابل کھڑا کر دیا ہے - انسانیت کی تقسیم کا یہ تصور وطنیت کا ایک طبعی شاخسانہ ہے ، اقبال فرماتے ہیں -

" وطنیت سے قدرتاً افکار حرکت کرتے ہیں ، اس خیال کی طرف کہ بنی نوع انسان اقوام میں اس طرح بٹے ہوئے ہیں کہ ان کا نوعی اتحاد امکان سے خارج ہے[۴] "

اور اسی وطنیت کے متعلق ایک دوسری جگہ کہتے ہیں -

ع اقوام میں مخلوق خدا بٹتی ہے اس سے

(۴) وطن کی بنیاد پر انسانیت کی تقسیم کا سب سے زیادہ درد ناک

۳- مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس ، حیدر آباد دکن ۱۹۶۲ء ص ۱۹۳ -

پہلو یہ ہے کہ انسان ، انسان باقی نہیں رہتا ۔ وہ جرمن یا جاپانی ، امریکن یا ہندوستانی بن جاتا ہے اور ایک جرمن کے لئے یہ بالکل جائز ہے کہ وہ جاپانی کے خون سے اپنے ہاتھ رنگین کرے اور ایک امریکن کے لئے یہ بالکل درست ہے کہ وہ معاشی استحصال کے ذریعہ ہندوستانی کا خون چوسے ۔ تاریخ گواہ ہے کہ وطنیت کا جذبہ جو ابتداًء اپنے اہلِ وطن کے مفاد کا معصوم نقاب اوڑھے رہتا ہے ، جلد ہی جارحانہ نوعیت اختیار کر لیتا ہے ۔ اسی جارحانہ وطنیت نے استعماریت (Colonialism) شہنشاہیت (Imperialism) کو جنم دیا ، جس کا مقصد اصلی یہ ہوتا ہے کہ کمزور کے ملبہ پر طاقتور کے لئے قصرِ سفید (White Hall) تعمیر کیا جائے ۔ اقبال اسی لئے کہتے ہیں ۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اِسی سے
تسخیر ہے مقصود تجارت تو اِسی سے

خالی ہے صداقت سے سیاست تو اِسی سے
کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

یہاں تک تو ہم نے بیان کیا کہ وطنیت کا تصور ایک خالص مادہ پرستانہ تصور ہے ۔ اسی سے خدا بیزاری اور دہریت نشو و نما پاتی ہے ۔ یہ تصور انسانیت کے شرف کو خاک آلود اور اس کی کاملیت و وحدت کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیتا ہے اور انتہا یہ ہے کہ انسان کو انسان کا شکاری بنا دیتا ہے ۔ اسی لئے اقبال اس تصور زندگی کے مخالف تھے ——— لیکن سوال یہ ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی کی وہ دوسری عملی اساس کون سی ہے جس میں یہ قباحتیں نہ پائی جاتی ہوں ۔

" بنی آدم اعضائے یک دیگراند " ——— بڑا دلکش تصور ہے ۔ لیکن یہ شاعر کی ایک برگزیدہ تمنا (Poious Wish) ہی تو ہے ——— " دنیا کے انسانو ! ایک ہو جاؤ " ——— بڑا جاذبِ توجہ نعرہ ہے ۔ لیکن یہ ایک فلسفی کی فکری بوالعجبی ہی قرار دی جا سکتی ہے ۔ محض ان نعروں اور مقولوں کی بنیاد پر انسانوں کی اجتماعی زندگی کی تعمیر کیسے کی جا سکتی ہے ؟ اقبال ایک عظیم المرتبت شاعر اور ایک بلند پایہ فلسفی

تھے ، لیکن وہ نہ تو برگزیدہ تمناؤں میں کھوئے رہے اور نہ ہی فکری بھول بھلیوں میں پھنسے رہے ۔ وہ جانتے تھے کہ اگر انسانیت کے شرف اور اس کی کاملیت و وحدت کے اس نصب العین کو جو ہر بڑے شاعر اور تمام بلند پایہ فلسفیوں کی متاع عزیز رہی ہے ، دنیا کے اس اسٹیج پر متمثل کرنا ہے تو اس کے لئے صرف دل خوش کن نعرے اور نظر افروز مقولے بیکار محض ہیں ۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ کوئی عملی اساس فراہم کی جائے ۔ سوال یہ تھا کہ کیا ایسی عملی اساس ممکن بھی ہے ؟

" انسان کی تاریخ پر نظر ڈالو ۔ ایک لامتناہی سلسلہ ہے باہم آویزشوں خونریزیوں کا ، اور خانہ جنگیوں کا ، کیا ان حالات میں عالم بشری میں ایک ایسی اُمت قائم ہو سکتی ہے ، جس کی اجتماعی زندگی امن اور سلامتی پر موسس ہو؟ "

یہ سوال خود انہوں نے کیا ۔ پھر خود ہی جواب دیا ۔

" ہاں ہو سکتی ہے ، بشرطیکہ توحیدِ الٰہی کو انسانی فکر و عمل میں حسب منشاء الٰہی عام کرنا ، انسان کا نصب العین قرار پائے ۔ ایسے نصب العین کی تلاش اور اس کا قیام سیاسی تدبیر کا کرشمہ نہ سمجھئے بلکہ یہ رحمۃ اللعالمین کی ایک شان ہے کہ اقوام عالم کو ان کے تمام خود ساختہ تفوقوں اور فضیلتوں سے پاک کرکے ایک ایسی اُمت کی تخلیق کی گئی جس کو اُمۃً مسلمۃً لک کہا جا سکتا ہے اور اس کے فکر و عمل پر شہداء علی النّاس کا خدائی ارشاد صادق آ سکتا ہے[۵] "

ایک دوسری جگہ وہ واضح طور پر کہتے ہیں ۔

" انسانیت کا نصب العین شعر اور فلسفہ میں عالمگیر حیثیت سے پیش کیا گیا ہے لیکن اگر اسے مؤثر نصب العین بنانا اور عملی زندگی میں بروئے کار لانا چاہیں تو آپ شاعروں اور فلسفیوں کو

۵- مضامینِ اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، چار مینار حیدر آباد دکن بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۱۹۴ ۔

اپنا مخاطب اولین نہیں ٹھہرائیں گے اور ایک ایسی مخصوص سوسائٹی تک اپنا دائرۂ مخاطبت محدود کریں گے جو ایک عقیدہ اور معین راہ عمل رکھتی ہو ، لیکن اپنے عملی نمونے اور ترغیب و تبلیغ سے ہمیشہ اپنا دائرہ وسیع کرتی چلی جائے ۔ میرے نزدیک اس قسم کی سوسائٹی اسلام ہے[6] "

ایک اور جگہ وہ نہایت بلیغ انداز میں وحدت انسانی کی عملی اساس کے متعلق فرماتے ہیں ۔

" اسلام نے وحدت انسانی کا اصول گوشت اور پوست میں نہیں بلکہ روح انسانی میں دریافت کیا ———— انسانی برادری قائم کرنے کے سلسلے میں اسلام نے جو اہم ترین کارنامے ایک ہزار سال میں انجام دئے ہیں ، وہ مسیحیت اور بدھ مت نے دو ہزار سال میں بھی انجام نہیں دئے[7]"

غرض یہ کہ اسلامی سوسائٹی یا اسلامی قومیت ہی اقبال کی نظر میں وہ واحد عملی بنیاد ہے ، جس پر انسانیت کے شرف ، اس کی کاملیت و وحدت کا شاندار قصر تعمیر کیا جا سکتا ہے لیکن یہ اسلامی قومیت ہے کیا ؟ ان ہی کی زبان سے سنئے ۔

" ہماری (اسلامی) قومیت کا اصلِ اصول نہ اشتراکِ زبان ہے نہ اشتراکِ وطن نہ اشتراکِ اغراض اقتصادی ۔ بلکہ ہم لوگ اس برادری میں ، جو جنابِ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمائی تھی ، اس لئے شریک ہیں کہ مظاہرِ کائنات کے متعلق ہم سب کے معتقدات کا سرچشمہ ایک ہے اور جو تاریخی روایات ہم سب کو ترکہ میں پہنچی ہیں ، وہ بھی ہم سب کے لئے یکساں ہیں ۔ اسلام تمام مادی قیود سے بیزاری ظاہر کرتا ہے اور اس کی

۶۔ مضامینِ اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، چار مینار حیدر آباد دکن ، بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۷۰ ۔

۷۔ ایضاً ص ۱۷۳ ۔

قومیت کا دارومدار ایک خاص تنتریہی تصور پر ہے ، جس کی تجسیمی شکل وہ جماعت اشخاص ہے ، جس میں بڑھتے اور پھیلتے رہنے کی قابلیت طبعاً موجود ہے[8] "

ایک اور جگہ لکھتے ہیں ۔

" اسلام میں قومیت کا مفہوم خصوصیت کے ساتھ چھپا ہوا ہے اور ہماری قومی زندگی کا تصور اس وقت تک ہمارے ذہن میں نہیں آ سکتا ، جب تک کہ ہم اصولِ اسلام سے پوری طرح باخبر نہ ہوں ۔ بالفاظ دیگر اسلامی تصور ہمارا وہ ابدی گھر یا وطن ہے ، جس میں ہم اپنی زندگی بسر کرتے ہیں . . . . . جہاں اسلامی اصول یا ہماری مقدس روایات کی اصطلاح میں ' خدا کی رسی ' ہمارے ہاتھ سے چھوٹی اور ہماری جماعت کا شیرازہ بکھرا[9] "

اسی لئے وہ مسلمان سے کہتے ہیں ۔

" اسلام تیرا دیس ہے " تو مصطفوی ہے !

اسلامی قومیت کی ایک بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ وہ تنگ نظر نہیں ہے ، اس میں ایسی وسعت ہے کہ وہ اولادِ آدم کو ، خواہ وہ کسی قبیلہ ، نسل اور وطن سے تعلق رکھتی ہو ، خواہ کوئی سی زبان بولتی ہو ، اپنے اندر جذب کر لیتی ہے ۔ اقبال فرماتے ہیں ۔

" قرآن کریم میں مسلمانوں کے لئے اُمت کے سوا اور کوئی لفظ نہیں آیا ۔ قوم (لغوی معنی میں) رجال کی جماعت کا نام ہے اور یہ جماعت باعتبار قبیلہ ، نسل ، رنگ ، زبان ، وطن اور اخلاق ہزار جگہ اور ہزار رنگ میں پیدا ہو سکتی ہے ، لیکن ملت سب جماعتوں کو تراش کر ایک نیا اور مشترک گروہ بنائے گی ۔ گویا ملت یا اُمت جاذب ہے اقوام کی ، خود ان میں جذب نہیں ہو

۸۔ مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمد پریس ۔ چار مینار حیدر آباد دکن ۔ بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۸۳ ۔

۹ ۔ ایضاً ص ۸۸ ۔

سکتی۱۰ "

بالفاظ دیگر اسلام کی روحانی اساس پر جو ہئیتِ اجتماعیہٴ انسانیہ قائم کی جائے گی ، اس کی غایت الغایات یہ ہو گی کہ ۔

" بنی نوع انسان کی اقوام کو باوجود شعوب و قبائل و الوان و السنہ کے اختلافات کو تسلیم کر لینے کے ، ان کو ان تمام آلودگیوں سے منزہ کیا جائے ، جو زمان و مکان ، وطن ، قوم ، نسل ، نسب اور ملک وغیرہ کے ناموں سے موسوم کی جاتی ہیں۱۱ "

اس ہئیتِ اجتماعیہٴ انسانیہ کا وطنیت سے تصادم ہوتا ہے ۔ کیونکہ یہ خود بھی " اتحاد انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے۱۲ " ، اس لئے اگر مسلمان اس فریب میں مبتلا ہو جائیں کہ دین اور وطن بحیثیت ایک سیاسی تصور کے یکجا رہ سکتے ہیں تو اقبال ان کو متنبہ کرتے ہیں کہ " اس راہ کا آخری مرحلہ اول تو لادینی ہو گا اور اگر لادینی نہیں تو اسلام کو محض ایک اخلاقی نظریہ سمجھ کر اس کے اجتماعی نظام سے بے پروائی۱۳ "

الغرض اقبال کی نظر میں وطنیت ، انسانیت کی دشمن ہے اور اسلامی قومیت ہی وہ واحد عملی طریقہٴ کار ہے ، جس کے ذریعہ انسانیت کے شرف ، اس کی کاملیت و وحدت کے بلند ترین نصب العین کو حاصل کیا جا سکتا ہے اور ہم کہہ سکتے ہیں کہ اقبال ہی ہندوستان کا سب سے پہلا مفکر

۱۰۔ مضامینِ اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، چار مینار حیدر آباد دکن بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۱۹۰ ۔

۱۱۔ ایضاً ص ۱۹۲ ۔

۱۲۔ ایضاً ص ۱۷۶ ۔

۱۳۔ ایضاً ص ۱۸۵ ۔

ہے ، جس نے بڑے زور شور کے ساتھ انسانیت کے وسیع ترین نقطۂ نظر سے وطنی قومیت کی مخالفت کی اور اسلامی قومیت کا آوازہ بلند کیا ۔ سچ تو یہ ہے کہ اس مسئلہ کی توضیح و تشریح انہوں نے جس انداز سے کی اور جس پر زور طریقہ پر انہوں نے اس کو پیش کیا ہے ، اس کو دیکھتے ہوئے بقول مولانا عبدالماجد دریا بادی "وہ بجا طور پر امام العصر تھے[۱۴]"

اقبال صرف نظری طور پر ہی وطنی قومیت کے مخالف نہ تھے بلکہ عملی سیاست میں بھی وہ یہ چاہتے تھے کہ مسلمان وطنی قومیت کا شکار نہ بنیں اور اپنی علیحدہ قومیت کو برقرار رکھیں ۔ اس مسئلہ کو وہ ہندوستانی سیاست کا بہت ہی اہم اور بنیادی مسئلہ سمجھتے تھے ۔ ان کی نظر میں ملتِ اسلامیہ ایک ایسی مستقل قائم بالذات علیحدہ قوم تھی ، جس کا انضمام وطنی قومیت میں نہیں ہو سکتا اور نہ وہ ہندوستانی قوم کا ایک ذیلی یا ضمنی جز بن کر رہ سکتی تھی ۔ اسی لیے ان کی جملہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکزی نقطہ یہ تھا کہ اسلامی قومیت کے شعور کو مسلمانان بر صغیر کے ذہن و دماغ میں جاگزین اور اس کے شعلہ کو ان کی روح میں فروزاں کر دیا جائے ، پھر ہر سیاسی و دستوری آندھی کے مقابلہ میں اس کا اس طرح تحفظ کیا جائے کہ مستقبل میں اس کی ضیاء سے پورا مسلم ہندوستان جگمگا اٹھے !

ہم دیکھ چکے ہیں کہ ۱۹۰۸ع تک وہ وطنی قومیت کے پر زور حامی اور اسی معنی میں وہ پرجوش "قوم پرست" (Nationalist) تھے ۔ وہ اعتراف کرتے ہیں کہ

"میں اپنے کالج کے زمانہ میں ایک جوشیلا قوم پرست (Nationalist) تھا[۱۵]"

۱۴۔ مکاتیب اقبال ۔ حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ۔ ناشر شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ مرکنٹائل پریس ۔ لاہور ۔ ص ۲۴۲

۱۵۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ۔ مرتبہ ۔ بی-اے ۔ ڈار ۔ ناشر اقبال اکادمی ۔ کراچی ۔ مطبوعہ ۱۹۶۷ع ۔ ص ۵۸

لیکن ۱۹۰۸ع میں انھوں نے نعرہ لگایا۔
"بنا ہمارے حصار ملت کی اتحاد وطن نہیں ہے"

اس کے بعد سے مرتے دم تک ، یہی نعرہ ان کا حرز جان بنا رہا انھوں نے اپنے بیانات ، تقاریر ، مضامین میں ہر موقع پر قوم رسول ہاشم کی "ترکیب خاص" کی نہ صرف تشریح و توضیح کی بلکہ اپنے کلام و پیام ذریعہ وطنیت (وطنی قومیت) کے بت کو پاش پاش کرنے اور اسلامی قومی کے جذبہ کو مسلمانوں کے دلوں میں اتار دینے کی کوشش کی - ۱۹۰۸ع لیکن ۱۹۲۶ع تک وہ اسی نظریہ کی تبلیغ بڑے زور شور سے اور بلند آہنگ سے کرتے رہے - پھر کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اسی دوران خصو بیسویں صدی کا ربع حصہ گذر جانے کے بعد انھیں یہ احساس ہوا کہ ان یہ نظریہ سیاسیات کی زد میں ہے اور اب وقت "باتوں" کا نہیں "عمل" کا ہے اسی لیے ۱۹۲۶ع میں وہ اسی نظریہ کے نفوذ کی خاطر سیاست کے ع میدان میں کود پڑے -

۱۹۰۸ع میں انھوں نے وطنی قومیت کے مقابلہ میں اسلامی قومیت تبلیغ شروع کی ، لیکن ۱۹۱۱ع کے بعد سے ۱۹۲۰ع تک برصغیر میں سیاسی حالات رونما ہوئے ، ان کے نتیجے میں ہندو مسلمان سیاسی اعتبار ایک دوسرے سے بہت قریب آگئے تھے اور ۱۹۲۰ع میں تو ایسا معلوم ہ تھا کہ وطنیت کا شعور ہند کے تمام باسیوں میں جاگ اٹھا ہے اور ہندو۔ قومیت سچ مچ عالم وجود میں آ چکی ہے - ان حالات میں اقبال کا یہ ک کہ وطن دور جدید کے انسان کا "تازہ خدا" اور "تہذیب نوی" کا تراش بت ہے ، بادی النظر میں کچھ عجیب سا معلوم ہوتا تھا اور مسلمانوں ان کی یہ تنبیہہ کہ اس "تازہ خدا" کے لباس میں مذہب کی لاش کفنائی ۔ اور اس "بت نو" سے دین نبوی کا کاشانہ غارت ہو جاتا ہے اور اسلا قومیت کی جڑ کٹ جاتی ہے ، بظاہر صدابصحرا نظر آتی تھی ! وہ وطن مقابلہ میں "اسلام" کو مصطفوی کے نام لیواؤں کا "دیس" قرار دے تھے اور انھیں اس "بت نو" کو خاک میں ملا دینے پر اکسا رہے تو لیکن عملاً مسلمان متحدہ قومیت کی رو میں اتنے بہہ گئے تھے کہ انھوں

شردھانند جی کو جامع مسجد کے منبر پر لا بٹھایا تھا اور گاندھی جی کو "مہاتمائیت" کے سنگھاسن پر براجمان کر دیا تھا۔ لیکن جلد ہی یہ بت خود ہندوؤں کی تنگ نظری، تنگ دلی اور خود غرضی کے ہاتھوں پاش پاش ہو گیا۔ ۱۹۲۳ء کے ہندو مسلم فسادات، شردھانند جی کی تحریک شدھی اور لاجپت رائے کی تحریک سنگھٹن نے مسلمانوں کی آنکھوں سے پردے اٹھا دیے اور انھوں نے عملاً اس "تازہ خدا" کو ان کی ملت کا شیرازہ منتشر کرتے ان کی قومیت کی جڑوں کو کاٹتے اور ان کے مذہب کا ستیاناس کرتے دیکھ لیا تھا!

اس دور میں اگرچہ متحدہ ہندی قومیت کی پری کا جلوہ نظر آنے لگا تھا، تاہم یہ امر باعثِ طمانیت تھا کہ اس پری کے "سایہ" کی لپیٹ میں آ کر مسلمان اپنی "علیحدگی" اور "انفرادیت" کا احساس کھو نہ بیٹھے تھے۔ ۱۹۱۶ء کے میثاقِ لکھنو کی رو سے خود کانگریس نے مسلمانوں کی "جداگانہ سیاسی حیثیت" کو تسلیم کر لیا تھا اور مسلمانوں نے اپنی اسی "حیثیت" سے مطمئن ہو کر ہندوؤں کی جانب دوستی اور محبت کا ہاتھ بڑھایا تھا۔ پھر جس چیز نے انھیں، ہندوؤں کو اپنے گلے لگانے بلکہ اپنے سر پر بٹھانے کے لیے آمادہ کیا تھا، وہ ایک منفی جذبہ تھا۔ یعنی انگریز دشمنی۔ اور اس انگریز دشمنی کی بنیاد سراسر "مذہبی" تھی۔ خلافت ترکیہ اور عالمِ اسلام کے تعلق سے برطانوی سامراج کی معاندانہ پالیسی ہی در اصل وہ گھاؤ تھا، جس نے مسلمانوں کے دلوں کو انگریزوں سے متنفر اور ہندوؤں کی طرف مائل کر دیا تھا۔ اس دور میں جو تحریک مسلمانوں کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی، وہ تحریکِ خلافت تھی اور اس تحریک کی روح ہی یہ تھی کہ نہ صرف برصغیر کے مسلمان بلکہ تمام دنیا کے مسلمان "ایک ملت" ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ تحریک اسلامی قومیت کے شعلہ کو بجھانے والی نہیں بلکہ فروزاں کرنے والی ہی تھی۔ اس تحریک کی موجودگی میں، متحدہ قومیت کی بڑھتی ہوئی رو کے باوجود، یہ خطرہ پیدا نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانانِ برصغیر "ہندی قوم" میں مدغم ہو جائیں گے۔ لیکن جب یہ تحریک ختم ہو گئی اور کانگریس نے متحدہ قومیت کا نقاب اوڑھ کر، ۱۹۲۰ء کی تحریکِ ترکِ تعاون و سول نافرمانی کے دوران، جو قوت حاصل کر لی

تھی ، اس کو برطانوی حکومت پر دباؤ ڈالنے کے لیے استعمال کرنا شروع کیا تو اس وقت اسلامی قومیت کے لیے حقیقی اور عملی خطرہ نمودار ہوا کہ کہیں انگریز ، کانگریس کی دلجوئی کی خاطر نیا دستور ، "واحد ہندوستانی قوم" کی بنیاد پر مرتب و نافذ کرنے کے لیے آمادہ نہ ہو جائے ، جس کا خاکہ نہرو رپورٹ میں پیش کیا گیا تھا ۔

ایک طرف مسلمانوں نے بچشمِ خود "وطنی قومیت" کے عفریت کو ان کی "اسلامی قومیت" کا گلا گھونٹتے دیکھ لیا تھا اور دوسری طرف "واحد قوم" اور "واحد ملک" کی بنیاد پر نئے دستور کا خطرہ مسلمانوں کے سر منڈلا رہا تھا ۔ اقبال نے محسوس کیا کہ اب لوہا گرم ہے ۔ ضرب کا یہی وقت ہے ۔ چنانچہ اسی زمانے میں وہ عملی سیاست میں داخل ہوئے ۔ ہندوؤں کی بے وفائی سے دل گیر اور انگریز کی دشمنی سے بوکھلائے ہوئے مسلمانوں کی انھوں نے یہ کہہ کر ڈھارس بندھائی ۔

"زندگی کا شعلہ دوسروں سے مستعار نہیں لیا جا سکتا ، اس کو اپنی ہی روح کے شوالے میں فروزاں کرنا چاہیے[۱۶]"

اس کے بعد سے عملی سیاست کے ہر مرحلہ اور ہر موڑ پر انھوں نے اس کا التزام کیا کہ اسلامی قومیت کا شعلہ ، وطنی قومیت کے مندر میں جا کر بجھنے نہ پائے بلکہ مسلمانوں کی خودی کے شوالے میں فروزاں سے فروزاں تر ہوتا رہے ۔ صوبائی مسلم لیگ پنجاب کے پلیٹ فارم سے ، کل ہند مسلم لیگ ، کل ہند مسلم کانفرنس کے خطبہ ہائے صدارت میں گاندھی جی سے گفتگوئے مفاہمت کے موقع پر اور گول میز کانفرنس کے اجلاس میں ، ان کی مساعی کا لب لباب ، اسی اسلامی قومیت کا تحفظ تھا ۔

اگر ہندوستان کی دوسری جماعتوں اور طبقوں کو وطن کی بنیاد پر متحد کرکے ایک قوم بنا بھی دیا جائے تو مسلمان چونکہ اس بنیاد کی بالکل مخالف ایک دوسری بنیاد (اسلام کے اجتماعی اصول) پر ایک علیحدہ

۱۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹمنٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ ناشر المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ستمبر ۱۹۲۸ع ۔ ص ۵۵

قوم تھے ، اسی لیے ہندوستان کا سیاسی مسئلہ اقبال کی نظر میں ایک قومی (National) یا بین الفرق (Inter communal) نہیں ، بلکہ بین الاقوامی (International) مسئلہ تھا ۔ مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں ، پہلی گول میز کانفرنس کے فرقہ وارانہ مباحث کا ذکر کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں ۔

"لندن میں فرقہ وارانہ مسئلہ پر جو مباحثہ ہوا ، اس نے ہندوستان کی عظیم ثقافتی وحدتوں کے اہم اختلافات کو ہمیشہ سے زیادہ نمایاں کر دیا ۔ تاہم انگلستان کے وزیر اعظم کو اس امر سے انکار ہے کہ ہندوستان کا مسئلہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ——— ظاہر ہے کہ انہوں نے اس امر پر غور نہیں کیا ہے کہ برطانوی جمہوریت کا نمونہ ایک ایسے ملک کے لیے کار آمد و مفید ثابت نہیں ہو سکتا ، جہاں کئی قومیں رہتی ہیں[۱۷]"

پھر اسی سلسلے میں وہ آگے چل کر فرماتے ہیں ۔

مجھے یہ کہتے ہوئے مسرت ہوتی ہے کہ آپ کے مسلم مندوبین پورے طور پر اس مسئلہ کے صحیح حل کی اہمیت کو محسوس کرتے ہیں ۔ جس کو میں ہندوستان کا "بین الاقوامی" مسئلہ کہتا ہوں . . . ہم سات کروڑ ہیں اور ہندوستان کے دوسرے لوگوں کی بہ نسبت بہت زیادہ ہم آہنگ ہیں ۔ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانانِ ہند ہی وہ واحد ہندوستانی جماعت ہے جس کو بجا طور پر اور جدید معنی میں ایک قوم کہا جا سکتا ہے ۔ ہندو اگرچہ ہر لحاظ سے ہم سے آگے بڑھے ہوئے ہیں ، تاہم ابھی تک وہ اس قسم کی ہم آہنگی حاصل کرنے کے قابل نہیں ہوئے ہیں جو ایک قوم کے لیے ناگزیر ہے اور جو اسلام نے آپ کو بغیر مانگے تحفتہً عطا کی ہے[۱۸]"

۱۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ المنار اکادمی ۔ لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ۔ ص ۳۰

۱۸- ایضاً ص ۳۱

اس لیے علامہ اقبال یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو اس بنیاد پر طے کیا جائے کہ یہاں ایک قوم نہیں بلکہ ایک سے زیادہ قومیں بستی ہیں ۔ اس لحاظ سے وہ دو قومی نظریہ ، جس کو بہت بعد میں چلکر مسلمانوں کے سوادِ اعظم نے قبول کر لیا اور جس کی بنیاد پر ہندوستان کے سیاسی و دستوری مسئلہ کو ۱۹۴۰ع سے حل کرنے کی مختلف کوششیں شروع ہوئیں ۔ در اصل علامہ اقبال کی اسی وطنی قومیت کی مخالفت کے بطن سے پیدا ہوا اور اس طرح ہندوستان کی عملی سیاست میں اس نظریہ کی تاریخ اس وقت سے شروع ہوتی ہے ، جس وقت سے کہ علامہ اقبال نے وطنیت کو بت پرستی سے تعبیر کیا ۔

۱۹۳۰ع میں علامہ مرحوم نے عملی سیاست میں اس تصور کو بہت واضح طور پر آگے بڑھانے کی کوشش کی ۔ مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے نہ صرف وطنی قومیت کی مخالفت اور اسلامی قومیت کی حمایت کی بلکہ برطانوی حکومت کے ارباب حل و عقد اور ہندو اکثریت کے اہلِ فکر و نظر سے اپیل کی کہ وہ " واحد ہندوستانی قوم " کی بنیاد پر ہندوستان کے سیاسی مسئلہ کو حل کرنے کی کوشش نہ کریں ۔ مسئلہ قومیت کے ایک مستند عالم رینان کا حوالہ دیتے ہوئے انھوں نے کہا ۔

" رینان کہتا ہے ' آدمی کو تابع فرمان نہ تو نسل بنا سکتی ہے ، نہ مذہب ، نہ دریاؤں کے رخ ، نہ کوہستانی سلسلے۔ انسانوں کے ایک ایسے بڑے اجتماع کو ، جو صحیح الدماغ اور رقیق القلب ہو ، ایک قوم کہا جاتا ہے ، بشرطیکہ اس میں اخلاقی شعور پیدا ہو جائے ، ایسی تشکیل ممکنات میں سے ہے ، اگرچہ اس میں انسانوں کی دوبارہ صورت گری اور انھیں تازہ جذباتی ساز و سامان سے آراستہ کرنے کے طویل اور صبر آزما طریقے سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔ یہ واقعہ ہندوستان میں رونما ہو جاتا ، اگر کبیر کی تعلیمات اور اکبر کے دینِ الٰہی نے اس ملک کے عوام کے تصورات کو اپنی طرف جذب کر لیا ہوتا لیکن بہرحال تجربہ یہ بتلاتا ہے کہ ہندوستان کے مختلف ذات پات اور اس کی مذہبی اکائیوں نے اپنی اپنی انفرادیت کو ایک وسیع تر وحدت میں ضم

کر دینے سے انکار کر دیا - ہر گروہ اپنے اجتماعی وجود کو برقرار رکھنے کے لئے بڑی شدت کے ساتھ تلا ہوا ہے - وہ اخلاقی شعور جس سے رینان کے تصور کے مطابق ایک قوم کی روح تشکیل پاتی ہے ، ایک ایسی قیمت کا مطالبہ کرتا ہے ، جس کو ادا کرنے کے لئے ہندوستان کے باشندے تیار نہیں ہیں ——— صحیح تدبر واقعات کو نظر انداز نہیں کرتا ، خواہ وہ کتنے ہی ناگوار کیوں نہ ہوں ، واحد عملی طریق کار یہ نہیں ہے کہ ایسی صورتِ حال کو موجود فرض کیا جائے ، جس کا واقعتاً وجود نہیں اور انہیں اپنے زیادہ سے زیادہ فائدے کے لئے استعمال کیا جائے ، اور اسی نہج سے ہندوستانی اتحاد کی دریافت پر ، ہندوستان اور ساتھ ہی ساتھ ایشیاء کی قسمت کا حقیقتاً انحصار ہے - ہندوستان چھوٹا سا ایشیا ہے - اس کے ایک حصے کے باشندے مشرقی اقوام سے اور دوسرے حصے کے لوگ وسطی اور مغربی ایشیاء کی قوموں سے تہذیبی یگانگت رکھتے ہیں - اگر ہندوستان میں تعاون و اشتراک کا کوئی مؤثر اصول دریافت ہو جائے تو اس سے اس قدیم ملک میں ، جو محض اپنے تاریخی محل و وقوع کی وجہ سے نہ کہ اپنے باشندوں کی کسی اندرونی کمزوری یا عدم صلاحیت کے باعث ، اتنے طویل عرصے تک مصائب کا نشانہ بنا رہا ، امن و باہمی خوش دلی پیدا ہو جائے گی اور ساتھ ہی ساتھ اس سے ایشیا کا سیاسی مسئلہ بھی تمام تر حل ہو جائے گا[۱۹] -"

یہ سب کچھ علامہ اقبال نے اسلامی قومیت کے نظریہ کو ملک کی سیاست میں عملاً آگے بڑھانے کے لئے مسلم لیگ اور مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے کہا - پھر گول میز کانفرنسوں میں انہوں نے اس نظریہ کے عملاً استحکام و استقرار کے لئے جو کچھ کہا ، اس کو انہی کی زبان سے سنیئے -

---

۱۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال - مرتبہ شاملو - ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۹ و ۱۰

" میں ملک کی سیاسیات میں فرقہ وارانہ مناقشات میں حصہ لینے شامل نہ ہوا تھا ، بلکہ محض اس لئے کہ ہندوستان کے آئندہ سیاسی نظام میں مسلمانوں کو دوسری اقوامِ ہند میں مدغم نہ ہونا چاہیئے ۔ میں نے اس کے سوا گول میز کانفرنس کی کسی کاروائی میں حصہ نہیں لیا[۲۰]۔"

گول میز کانفرنسوں کے اختتام کے بعد سے ۱۹۳۵ء کے دستور کے نفاذ تک ان کی تمام تر تگ و دو اسی ایک نقطہ پر مرکوز تھی اور الحمد اللہ کہ ان کی یہ مساعی کامیاب رہیں ۔ اسلامی قومیت کو دستوری تحفظ مل گیا اور وہ ہندی قومیت میں مدغم ہونے نہ پائی ۔ پھر ۱۹۳۶ء سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ء تک وہ اسی قومیت کے پرچم کو سربلند کرنے کے لئے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت بنانے کی جد و جہد کرتے رہے ۔ حتٰی کہ مرض الموت کے عالم میں بھی اسی پرچم کے اعزاز و وقار کی خاطر انھوں نے آخری جنگ لڑی ۔ مارچ ۱۹۳۸ء میں مولانا حسین احمد مدنی کے نظریہ " ملت از وطن " کی انھوں نے سخت مخالفت کی اور اپنے معرکۃ الآرا بیان کے ذریعہ اس کے پرخچے اُڑا دیئے ۔ اس طرح انھوں نے ۱۹۰۸ء سے لے کر اپریل ۱۹۳۸ء میں آخری سانس لینے تک اسلامی قومیت کے پرچم کو سربلند رکھنے کے لئے لگاتار اور مسلسل جد و جہد کی اور مرنے سے پہلے اس پرچم کو اس کے حوالے کر دیا ، جو اس کی عظمت و وقار ، شان و شکوہ کا صحیح معنوں میں علمبردار ثابت ہوا ! ــــــ ــ اس تمام جد و جہد کو دیکھنے کے بعد ، اقبال کو اسلامی قومیت کا صرف شارح یا نقیب کہنا درست نہ ہوگا ۔ وہ شارح اور نقیب ہونے کے علاوہ اس برصغیر میں اسلامی قومیت کے " سپاہی " اور " مجاہد " بھی تھے !

الغرض علامہ اقبال نے وطنی قومیت کی بڑی شد و مد کے ساتھ مخالفت کی ۔ اسلامی قومیت کی نہ صرف تشریح و توضیح کی بلکہ اس کی پر زور حمایت کی ۔ عملی سیاست میں انھوں نے اس نظریہ کو بڑی جرأت

۲۰- ملفوظاتِ اقبال ۔ مرتبہ محمود نظامی ۔ مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ۔ ص ۱۴۴

سے آگے بڑھایا ۔ آخری دم تک ، اسی کی خاطر وہ اپنوں اور غیروں ، سب ہی سے لڑتے رہے اور اس کے تحفظ و تمکن کے لئیے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا ۔ الحمد اللہ اپنے اس جہاد میں وہ کامیاب رہے ! ——— یہ اقبال کا دوسرا سیاسی کارنامہ ہے ۔

تفریق دین و سیاست اور اقبال علامہ اقبال عمیق مطالعہ اور بڑے غور و فکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے تھے کہ دین و سیاست کی تفریق کا اصول انسانیت کے لئے مہلک ہے ۔ سیاست کی روح قوت و اقتدار ہے ۔ قوموں کی نفسیاتی تاریخ اور انسانی فطرت کے گہرے مطالعہ نے انھیں یہ بتلایا تھا کہ اگر یہ قوت بے قید ہو تو ایک نشہ ہے ، جس کا انجام خطرناک ہوتا ہے اور اگر اس کو "لا دین" بنا دیا جائے تو وہ عالم انسان کے لئے " زہر ہلاہل" ہے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

اسکندر و چنگیز کے ہاتھوں سے جہاں میں
سو بار ہوئی حضرت انسان کی قبا چاک

تاریخ امم کا یہ پیام ازلی ہے
صاحب نظراں ! نشۂ قوت ہے خطرناک

لادیں ہو تو ہے زہر ہلاہل سے بھی بڑھ کر
ہو دیں کی حفاظت میں تو ہر زہر ہے تریاک

اقتدار مختلف روپ اختیار کر سکتا ہے ۔ وہ بادشاہت کی صورت میں جلوہ گر ہو سکتا ہے اور اعیانیت و جمہوریت کے قالب میں بھی داخل ہو سکتا ہے ، لیکن اس کے یہ سب روپ ، یہ سب صورتیں اور یہ سب قالب اس کی فطرت کو بدل نہیں سکتے ۔ وہ ایک ایسا درندہ ہے ، جس کا مزاج خونخواری ہے اور جس کی طبیعت چنگیزی ۔ لیکن اپنی اس چنگیزیت کے باوجود وہ انسانوں کے اجتماعی نظام اور ان کی سیاسی تنظیم کے لئے ناگزیر ہے ۔ اس کے مزاج کو بدلنے کے لئے اس کے قالب کو بدلنا ضروری نہیں بلکہ اس کے اوپر ایک ایسے محافظ و نگران کار کو متعین کرنا چاہیے جو اس کو ہمیشہ اپنے قابو میں رکھے اور اس کو سرکش نہ ہونے دے

اور یہ محافظ و نگران کار ہے "دین"! اگر یہ محافظ اس کے ساتھ نہ رہے تو پھر وہ سرکش، خونخوار اور چنگیز بن جاتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

جلالِ پادشاہی ہو کہ جمہوری تماشہ ہو
جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

مری نگاہ میں ہے یہ سیاستِ لادین
کنیزِ اہر من و دوں نہاد و مردہ ضمیر

ہندوستان کے ایک اور جلیل القدر رہنما مہاتما گاندھی جی بھی اسی نظریہ کے قائل تھے۔ وہ اپنی خود نوشت سوانح عمری "تلاشِ حق" میں لکھتے ہیں۔

"حق وہ روح کلّی ہے، جو ساری کائنات میں جاری و ساری ہے۔ انسان اس کے جلوے کی تاب تب ہی لا سکتا ہے، جب وہ ادنٰی سے ادنٰی مخلوق کو اپنی جان کے برابر عزیز رکھتا ہو۔ جسے اس کا حوصلہ ہو، وہ زندگی کے کسی شعبے سے بے تعلق نہیں رہ سکتا۔

یہی وجہ ہے کہ حق کی جستجو مجھے سیاست کے میدان میں کھینچ لائی ہے۔ میری ناچیز رائے میں، جو لوگ کہتے ہیں کہ مذہب کو سیاست سے کوئی تعلق نہیں، وہ مذہب کے مفہوم سے نا آشنا ہیں[۲۱]"

اقتباس بالا سے واضح ہوتا ہے کہ گاندھی جی سیاست و مذہب میں ایک گہرا تعلق پاتے ہیں لیکن خود مذہب کے متعلق ان کا تصور کیا تھا، اس کے لئے کافی تحقیق و تفحص کی ضرورت ہے اور یہ امر ہمارے موضوع بحث سے خارج ہے۔ البتہ اقبال کے ذہن میں مذہب کا کیا تصور تھا، اس کا جواب دینا ہمارے لئے آسان ہے۔ اقبال کے نزدیک حقیقی اور سچا مذہب اسلام تھا اور اسلام ان کی نظر میں ایک ایسا مذہب نہ تھا جس کا

۲۱۔ تلاشِ حق (گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری) ناشر مکتبہ جامعہ دہلی۔ ص ۳۳۹

تعلق صرف انسان کے تزکیۂ نفس اور تصفیۂ روح سے ہو اور جس کے پیش نظر صرف عاقبت و آخرت ہی ہو - ان کا تصور اسلام محدود نہ تھا ، وہ اس کو " ایک ایسا مشرب رہبانیت نہیں سمجھتے تھے ، جس نے دنیائے مادیت سے منہ موڑ کر اپنی تمام تر توجہ عالم روحانیت پر جالی ہے[۲۲] " بلکہ اسلام ان کے نزدیک ایک ایسا جامع نظام زندگی تھا ، جس کے پیش نظر آخرت و دنیا دونوں ہی تھے - وہ اس کو ایک اخلاق و روحانی نظام ہی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ایک ایسا اجتماعی دنیاوی نظام بھی یقین کرتے تھے ، جس کا ایک باقاعدہ سیاسی و معاشری لائحہ عمل ہے - وہ فرماتے ہیں -

" اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اسلام ایک اخلاقی نصب العین ہی نہیں بلکہ ایک قسم کا سیاسی نظام بھی ہے - اس سے میری مراد یہ ہے کہ وہ ایک ایسی معاشری ہئیت ہے ، جس کو ایک قانونی نظام نے منظم کیا ہے اور جس میں ایک خاص اخلاقی نصب العین نے زندگی کی روح پھونکی ہے[۲۳] "

اسلام کے متعلق ایک دوسری جگہ وہ زیادہ وضاحت سے کہتے ہیں - " سچی بات تو یہ ہے کہ اسلام کوئی کلیسائی نظام نہیں ہے - وہ ایک مملکت ہے جس کی تشکیل ایک ایسے معاہداتی نظام سے ہوئی ، جو روسو کے نظریہ سیاسی سے بہت پہلے عالم وجود میں آ چکا تھا ، اور جس نے ایک ایسے اخلاقی نصب العین سے زندگی کی حرارت پائی ہے جو انسان کو زمین سے وابستہ مخلوق تصور نہیں کرتا بلکہ نظم معاشری کا ایک ایسا انسانی وجود تسلیم کرتا ہے ، جو اس نظم کا زندہ عامل ہے اور جو حقوق و

۲۲- مضامین اقبال - مرتبہ تصدق حسین تاج - مطبوعہ احمدیہ پریس - چار مینار - حیدر آباد دکن - بار اول ۱۳۶۲ھ - ص ۱۱۴

۲۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو - ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۳ و ۴

فرائض بھی رکھتا ہے[24] "

دین و سیاست کی علحدگی ، روح و مادہ کی مابعدالطبعی ثنویت پر مبنی ہے ۔ علامہ اقبال اس ثنویت کو انسانیت کا سب سے بڑا دشمن سمجھتے تھے ۔ اس لئے وہ دین و سیاست کی تفریق کے مخالف تھے ۔ پھر وہ یہ جانتے تھے کہ سیاسی نظم کو ، جو انسانوں کی اجتماعی زندگی کے لئے ناگزیر ہے ، اگر دین کی حفاظت و نگرانی میں نہ رکھا جائے تو انسانیت کے لئے یہ نظم زہر ہلاہل بن جاتا ہے ۔ اس لئے عملاً بھی وہ نہیں چاہتے تھے کہ دین کو چھوڑ کر ہندوستانی سیاست "کنیزِ اہرمن و دوں نہاد مردہ ضمیر" بن جائے لیکن اس سیاسی تنظیم کی حفاظت و نگرانی جس دین کے سپرد کی جا سکتی ہے ، وہ اقبال کی نظر میں صرف اسلام ہی تھا کیوں کہ دیگر تمام ادیان کے برعکس اسلام ہی ایک ایسا مذہب ہے ، جو محض روحانی و اخلاق نظام ہی نہیں بلکہ دین و سیاست دونوں کا جامع ہے[25] "

جمہوری پارلیانی نظامِ حکومت اور اقبال | علامہ اقبال جمہوریت کو اصولاً بھی ایک مثالی (Ideal) طرزِ حکومت نہیں سمجھتے تھے ۔ انھوں نے کہا تھا ۔

جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں
بندوں کو گنا کرتے ہیں ، تولا نہیں کرتے

جمہوریت میں صرف سر شماری ہوتی ہے ۔ انسانی عقل و دماغ کی اعلیٰ صلاحیتوں کو بروئے کار نہیں لایا جاتا ۔ پھر جمہوری حکومت متوسط اور ادنیٰ درجہ کے لوگوں کی حکومت ہوتی ہے ۔ وہ کہتے ہیں ۔

متاعِ معنیٔ بیگانہ از دوں فطرتاں جوئی
ز موراں شوخیٔ طبعِ سلیمانی نمی آید

۲۴- ایضاً ص ۱۳
۲۵- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ ۔ ناشر شیخ محمد اشرف ۔ مطبوعہ دین محمدی پریس لاہور سنہ ۱۹۵۱ع ص ۳۹۳

گریز از طرزِ جمہوری غلامے پختہ کارے شور
کہ از مغز دو صد خر فکرِ انسانی نمی آید

مغرب میں رائج شدہ جمہوری نظام حکومت کو علامہ مرحوم استبداد کی ایک قبا ، ملوکیت کا ایک پردہ اور شہنشاہیت کی ایک بدلی ہوئی صورت قرار دیتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری

دیو اِستبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے یہ آزادی کی ہے نیلم پری

" ابلیس کی مجلسِ شوریٰ" میں انہوں نے بڑے دلچسپ انداز میں مغرب کے جمہوری نظامِ حکومت پر تنقید کی ہے ۔ ابلیس کا پہلا مشیر سوال کرتا ہے ۔

خیر ہے "سلطانیٔ جمہور" کا غوغا کہ شر ؟
تو جہاں کے تازہ فتنوں سے نہیں ہے با خبر

دوسرا مشیر جواب دیتا ہے ۔

ہوں ، مگر میری جہاں بینی بتاتی ہے مجھے
جو ملوکیت کا اک پردہ ہو کیا اس سے خطر

ہم نے خود شاہی کو پہنایا ہے جمہوری لباس
جب ذرا آدم ہوا ہے ، خود شناس و خود نگر

کاروبارِ شہریاری کی حقیقت اور ہے
یہ وجودِ میر و سلطان پر نہیں ہے منحصر

مجلسِ ملت ہو یا پرویز کا دربار ہو
ہے وہ سلطان غیر کی کھیتی پہ ہو جس کی نظر

تو نے کیا دیکھا نہیں مغرب کا جمہوری نظام
چہرہ روشن ، اندرون چنگیز سے تاریک تر

علامہ اقبال عملاً بھی پارلیانی جمہوری نظامِ حکومت کو ہندوستان کے لئے موزوں و مفید خیال نہیں کرتے تھے - اس کے لئے ان کے پاس بعض دلائل بھی تھے ، سرسری طور پر انہیں دیکھتے چلئے - ۔

(۱) انگلستان کا جمہوری نظام اس واقعہ کو پیشِ نظر رکھ کر بنایا گیا تھا کہ وہاں ایک ہی قوم رہتی ہے ، لیکن ہندوستان کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی - یہاں ایک قوم نہیں بلکہ کئی قومیں آباد تھیں - وہ کہتے ہیں -

" ہندوستانی معاشرے کی اکائیاں یورپی ممالک کی مانند علاقہ واری نہیں ہیں - ہندوستان ایسے انسانی گروہوں کا ایک بر اعظم ہے ، جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں ، مختلف زبانیں بولتے ہیں اور مختلف مذاہب کے پیرو ہیں - ان کے طرز عمل کو متعین کرنے والا عنصر مشترک نسلی شعور نہیں ہے - ہندو بھی کوئی ہم آہنگ گروہ نہیں ہے - فرقہ وارانہ گروہوں کے وجود کو تسلیم کئے بغیر ہندوستان پر یورپی جمہوریت کے اصول کو منطبق نہیں کیا جا سکتا[۲۶] "

وہ واضح طور پر کہتے ہیں -

" برطانوی جمہوریت کا نمونہ ایک ایسے ملک کے لئے کارآمد و مفید ثابت نہیں ہو سکتا ، جہاں کئی قومیں رہتی ہیں[۲۷] "

یہ ان کی پہلی دلیل تھی ـــــ

(۲) جمہوریت میں عملاً حکومت اکثریتی فریق (Majority Party) کی ہوا کرتی ہے - سیاسی ، معاشی اور معاشرتی پروگرام کی بناء پر ایک ملک میں ایک سے زیادہ فریق ہو سکتے ہیں اور انتخابات میں آراء کی

۲۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال - مرتبہ شاملو - ناشر المنار اکادمی لاہور - طبع دوم - ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۲

۲۷- ایضاً ص ۳۰

اکثریت حاصل کرنے کے بعد کوئی ایک فریق برسر اقتدار آ سکتا ہے لیکن یہ فریق ہمیشہ کے لئے حکومت پر قابض نہیں رہ سکتا ۔ کوئی دوسرا فریق اپنے معاشی ، سیاسی ، معاشرتی لائحہ عمل کو عوام میں مقبول بنا کر پارلیمان میں اکثریت حاصل کر سکتا ہے ۔ اس طرح حکومت کی ذمہ داریاں ایک فریق سے دوسرے فریق کی جانب آسانی سے منتقل ہوتی رہتی ہیں اور کسی فریق کو بھی اس کا موقع حاصل نہیں رہتا کہ وہ ہمیشہ کے لئے ملک کے اقتدار پر اپنا قبضہ جمائے رکھے ۔ لیکن ہندوستانی فریق بندی کی حالت یہ نہ تھی ۔ یہاں حقیقت میں سیاسی فریق بندی تھی ہی نہیں ۔ مذہبی جماعتیں ہی سیاسی فریق تھے بلکہ صحیح معنی میں مختلف قومیں ایک دوسرے کے مخالف سیاسی فریق تھے ۔ پھر ان سیاسی فریقوں کا عددی تناسب بھی مساوی نہ تھا بلکہ ایک فریق غالب اکثریت میں تھا اور دوسرے فریق اقلیت میں تھے اور یہ ممکن نہ تھا کہ اکثریت والے فریق کو اقلیت میں یا اقلیت والے فریق کو اکثریت میں تبدیل کر دیا جائے ۔ کیونکہ ان کی بنیاد ، بدلنے والے معاشی ، سماجی پروگرام پر نہ تھی ، بلکہ مذہب پر تھی جس کا اساسی تعلق انسان کی روح اور عقائد سے ہے ، ان حالات میں پارلیمانی انگریزی جمہوری نظام کو اس ملک میں رائج کرنے کے معنی یہ تھے کہ عددی اکثریت رکھنے والی قوم کو ہمیشہ کے لئے تخت اقتدار پر متمکن کر دیا جائے اور اقلیت میں رہنے والی قوموں کو ان کا محکوم بنا دیا جائے ۔ یہ جمہوریت نہ ہوتی ، جمہوریت کا مذاق ہوتا ، جمہوریت کے نام پر ایک مخصوص طبقہ و فرقہ کی حکومت ہوتی ! سلطانیٔ جمہور کے پردے میں فرقہ وارانہ مذہبی عدیدیت (Religious Oligarchy) کی حکمرانی ہوتی ! ـــــ علامہ اقبال نے جمہوری حکومت کے تعلق سے مسلمانوں کے مطالبۂ تحفظات کی توضیح کرتے ہوئے اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ۔

" مسلمان تحفظات چاہتا ہے ۔ اس لئے نہیں کہ وہ جمہوریت سے خوف زدہ ہے ، بلکہ اس لئے کہ وہ جمہوریت کے لباس میں فرقہ وارانہ عدیدیت (Oligarchy) سے ہندوستان میں ڈرنے کے وجوہ

رکھتا ہے[۲۸] "

ہندوستان میں جمہوریت کو ناقابل عمل قرار دینے کی ان کے پاس یہ دوسری دلیل تھی -

(۳) انھیں اس میں بھی شک تھا کہ ہندوستان جیسے جاہل مفلس اور دیہاتی ملک میں جمہوریت کامیاب بھی ہو سکے گی ، کیونکہ جمہوریت کی کامیابی کے لئے ایک خاص معیار تعلیم ، ایک خاص طرز زندگی اور ایک خاص سیاسی شعور کی ضرورت ہوتی ہے - وہ لکھتے ہیں -

> "کیا انتخابات کی قمار بازی ، لیڈروں کی فرقہ بندی اور پارلیمان کا کھوکھلا اجتماعی نظم کسانوں کے ملک کے لئے ، جو موجودہ جمہوریت کی زرپاش معشیت سے قطعاً ناآشنا ہے ، موزوں ثابت ہوگا[۲۹] "

یہ تیسری دلیل تھی جس کی بناء پر علامہ اقبال انگریزی پارلیمانی جمہوری حکومت کو ہندوستان کے لئے مفید نہیں سمجھتے تھے -

(۴) جمہوری نظام حکومت سے اختلاف کی ان کے نزدیک سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اسلامی نظام حکومت کو ایک مثالی نظام حکمرانی سمجھتے تھے - جمہوری نظریہء حکومت کا پیغمبر روسو ہے اور اس کی کتاب " معاہدہ عمرانی " مذہب جمہوریت کی انجیل ہے - روسو نے اپنی اس کتاب میں جن خیالات و نظریات کو پیش کیا ، ان سے متاثر ہو کر فرانسیسی قائدین نے انقلاب فرانس برپا کیا - اس انقلاب نے یورپ میں شخصی بادشاہت و ملوکیت کو ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا اور ان کی جگہ جمہوریت کو جنم دیا - روسو نے اپنی کتاب میں اقتدار اعلیٰ سے متعلق جو نظریہ پیش کیا ، وہی اصل میں جمہوری نظام حکومت کی روح ہے -

---

۲۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۲۱۱ -

۲۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۵۲ -

روسو سے قبل یورپ میں جو سیاسی مفکرین گزرے ہیں ، ان میں سے بعض اس کے تو قائل تھے کہ مملکت ایک معاہدہ عمرانی کے ذریعہ وجود میں آتی ہے ، لیکن مملکت کے اقتدار اعلیٰ کا منبع وہ عوام کو قرار نہیں دیتے تھے ۔ بعضوں نے صرف ایک شخص کو اقتدار اعلی کا ماخذ قرار دیا ، اور اس طرح شخصی حکومت یا ملوکیت کو درست قرار دینے کی کوشش کی اور بعضوں نے ایک جماعت یا چند اشخاص کے گروہ کو مملکتی اقتدار کا سرچشمہ قرار دیا اور اپنے اس نظریہ کی بنیاد پر عدیدیت (Oligarchy) اور اشرافیت (Aristocracy) کی حمایت کی ۔ روسو پہلا یورپی مفکر ہے جس نے اپنے پیش روؤں کے برعکس یہ نظریہ پیش کیا کہ اقتدار اعلیٰ کا حقیقی سرچشمہ مشیتِ عامہ (Will of the People) ہے اور عملاً اس مشیتِ عامہ کا تعین کثرت رائے سے ہوتا ہے ۔

اقبال بنیادی طور پر اقتدار اعلی کے ان تمام نظریوں کے سخت مخالف ہیں ، ان کے نزدیک فرد یا چند افراد یا افراد کی اکثریت بلکہ سب کے سب افراد بھی مملکتی اقتدار کے ماخذ و منبع نہیں ہیں ۔ وہ خالق کائنات کو مملکتی اقتدار اعلی کا سرچشمہ قرار دیتے ہیں ۔ ذاتِ باری نہ صرف انسان و کائنات کی خالق و مالک ہے بلکہ انسانی گروہوں اور جماعتوں کی بنانے اور پیدا کرنے والی بھی ہے ۔ خدا نے کائنات اور انسان کو پیدا ہی نہیں کیا بلکہ وہی ان سب پر حکمران بھی ہے ۔

سروری زیبا فقط اس ذات بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے بس وہی باقی بتانِ آذری

پھر وہ اللہ تعالی کو صرف اس معنی میں ہی حکمران نہیں سمجھتے کہ اسی کی مشیت سے کائنات کا یہ مہتم بالشان کارخانہ اور انسانوں کا یہ اندرونی نظم چل رہا ہے ۔ بلکہ وہ کہتے ہیں کہ خدا کی اس حکمرانی کو انسان کے باہمی تعلقات اور اس کے اجتماعی اداروں میں بھی کارفرما ہونا چاہئے ۔ بالفاظ دیگر اللہ تعالی کا اقتدار ، اقبال کی نظر میں صرف تکوینی ہی نہیں ہے بلکہ اس کو تشریعی (Legal) بھی ہونا چاہئے ۔ خالقِ کائنات ہونے کی حیثیت سے اللہ تعالی جہاں تمام کائنات کا حاکمِ حقیقی ہے وہیں مملکتی اقتدار کا بھی وہی اور صرف وہی سرچشمہ ہے ۔ اللہ کی حاکمیتِ

تکوینی ، جس طرح ساری کائنات میں جاری و ساری ہے اسی طرح مملکت میں بھی اس کی حاکمیت تشریعی (Legal Sovereignty) کو کارفرما ہونا چاہئے ——— لیکن اگر ایسا نہ ہو، یعنی کائنات میں تو "حق" کے اقتدار اعلیٰ کی فرما نروائی ہو اور مملکت میں " غیرِ حق " کو مرکز و ماخذ اقتدار تسلیم کیا جائے تو یہ قاہری ہے ، آمری ہے ، کافری ہے ا فرماتے ہیں -

غیرِ حق چوں ناہی و آمر شود
زورور بر ناتواں قاہر شود
زیر گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسواہ اللہ کافری است

" غیرِ حق " کے ہاتھوں میں جب اقتدار کا ہتھیار آ جاتا ہے تو وہ " زور ور " ہو جاتا ہے اور " یہ زور ور " چونکہ " غیرِ حق " ہے اس لئے وہ کمزور اور ناتواں پر ظلم ڈھانے لگتا ہے اور اس طرح " قاہر " بن جاتا ہے - اسی قاہری کا نام سیاسی اصطلاح میں " آمری " ہے - اقبال کہتے ہیں کہ اللہ کے سوا کسی غیر کی آمری (Sovereignty) اصل میں کافری ہے -

آمری از ماسواہ اللہ کافری است

غیر حق میں ، جس کی آمری (Sovereignty) و اقتدار کو اقبال نے کافری قرار دیا ہے ، ایک فرد ، چند افراد اور سب افراد بھی شامل ہیں -

اللہ کی حاکمیتِ تشریعی (Legal Sovereignty) کا یہ تصور ، اقبال کا ایک بنیادی تصور و عقیدہ ہے - وہ کہتا ہے کہ توحید صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات واحد کو اس کائنات کا حاکم تکوینی تسلیم کیا جائے بلکہ اسی کو ملکتی اقتدار کا سرچشمہ بھی مانا جائے - کائنات کا خالق مالک و حاکم تو اللہ کو سمجھا جائے لیکن مملکت کے اقتدار کا ماخذ و منبع غیر اللہ (یعنی ایک یا چند افراد یا افراد کی اکثریت یا سب افراد) کو قرار دیا جائے تو یہ وحدانیت نہیں ثنویت ہو گی اور اس تصور و عقیدہ کی بنیاد پر انفرادی و اجتماعی زندگی کا جو نظام بنے گا ، اس میں یک رنگی

کی بجائے دو رنگی اور یکسوئی کی جگہ انتشار ہوگا۔ فطرت کا ، عقل کا اور انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی فلاح و بہبود کا تقاضہ یہ ہے کہ جس کو کائنات کا حاکم مانا جائے ، اسی کو مملکت کا بھی حکمران قرار دیا جائے، جس کی حاکمیت و اقتدار کو فطرت کے تمام مظاہر اور کائنات کے ہر ذرے میں انسان جاری و ساری دیکھتا ہے ، اسی کو مملکت اور اس کے تمام ادارات میں نافذ و کارفرما سمجھنا چاہئے ۔ جو ہستی تکوینی طور پر کائنات کی حاکم ہے وہی مملکت کی تشریعی حاکمیت کا ماخذ و منبع بھی ہے ۔ یہی توحید کامل ہے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

تا نہ رمز لا الہ آید بدست
بندہ غیر اللہ را نتواں شکست

نقطہ ادوار عالم لا الہ
انتہائے کار عالم لا الہ

اقبال نے اس تشریعی حاکمیت الٰہی (Legal Sovereignty of God) کی تائید اور غیر حق کے اقتدار اعلیٰ کی تردید میں ایک بہت ہی مؤثر دلیل پیش کی ہے اور اس سلسلے میں ایک نہایت ہی لطیف نکتہ پیدا کیا ہے ۔ اقبال کے کلام و پیام کا محور و مرکز خودی کا نظریہ ہے ۔ وہ ہر اس تصور زندگی کو رد کر دیتا ہے جو انسان کی خودی کو کمزور کرتا ہے اور ہر اس نظام فکر و حیات کی تائید کرتا ہے ، جو انسان کی خودی کو قوی کرتا اور پروان چڑھاتا ہو ۔ سیاسیات میں بھی وہ ملوکیت ، عدیدیت اعیانیت اور جمہوریت وغیرہ تمام غیر الٰہی نظاموں کو مردود اسی لئے ٹھہراتا ہے کہ ان میں فرد کی خودی گھٹ کر رہ جاتی ہے ، کیونکہ ان کے اقتدار اعلیٰ کا سرچشمہ ہی گندہ اور ناصاف ہے ۔ اس کے برعکس الٰہی نظام سیاست فرد کی خودی کو قوی اور مضبوط بناتا ہے ، کیونکہ اس کے اقتدار کا سرچشمہ صاف و پاکیزہ ہے ۔ ملوکیت میں ایک فرد کی اطاعت کرنی پڑتی ہے ، جس سے تمام دوسرے افراد کی خودی کمزور پڑ جاتی ہے ۔ عدیدیت و اعیانیت میں چند افراد (اقلیت) کی اطاعت کرنی پڑتی ہے ، جس سے تمام بقیہ افراد (اکثریت) کی ” انا “ لازماً ضعیف ہو جاتی ہے ۔

جمہوریت میں مشیتِ عامہ (عملاً اکثریت) کی اطاعت کرنی پڑتی ہے اور اس سے انسانی ضمیر کی اور خصوصاً اقلیت کی خودی میں اضمحلال پیدا ہو جاتا ہے ـــ لیکن خلافت (الٰہی نظامِ سیاست) میں ذاتِ باری کی حاکمیت تسلیم کرنی پڑتی ہے ، جو دراصل انسان کی خود اپنی " معیاری فطرت " کی اطاعت ہے ، اس لئے اس سے فرد کی خودی مضبوط و مستحکم ہوتی ہے اسلامی الٰہیات کی تشکیل جدید میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

" اسلام بحیثیت ایک نظامِ سیاست کے اصول توحید کو انسانوں کی جذباتی اور ذہنی زندگی میں ایک زندہ عنصر بنانے کا عملی طریقہ ہے ۔ اس لئے اس کا مطالبہ وفاداری خدا کے لئے ہے نہ کہ تخت و تاج کے لئے اور چونکہ ذاتِ باری تمام زندگی کی روحانی اساس سے عبارت ہے اس لئے اس کی اطاعت کیشی کا درحقیقت یہ مطلب ہے کہ انسان خود اپنی معیاری فطرت (Ideal Nature) کی اطاعت کیشی اختیار کرتا ہے[۳۰] "

اقتدار اعلیٰ کے تمام باطل نظریے افراد کے اندر ایک اجتماعی نظم تو ضرور پیدا کر دیتے ہیں ، لیکن فرد کی خودی کے ارتقا کو محدود و مسدود کر دیتے ہیں ۔ پھر ان سے یہ اندیشہ بھی رہتا ہے کہ وہ مذموم افعال کو محمود اور محمود افعال کو مذموم قرار دیں ۔ لیکن اقتدار اعلیٰ کا الٰہی نظریہ فرد کی خودی کو بھی مستحکم کرتا ہے اور انسانی ضمیر کی آزادی کو بھی محفوظ رکھتا ہے ، ان کے اندر اعلیٰ درجہ کا اجتماعی نظم بھی پیدا کر دیتا ہے اور فرد و جماعت کی اس انداز سے سیرت سازی کرتا ہے کہ ان کی اپنی معیاری فطرت اور ان کا اپنا اخلاقی شعور ہی حق کو ناحق سے ، صواب کو ناصواب سے ، محمود کو نامحمود سے تمیز کر لیتے ہیں ۔ اقتدار اعلیٰ کا یہ الٰہی نظریہ اسلامی نظام سیاست کی روح ہے ۔ زمانہ کے مختلف احوال اور مقام کی مختلف کیفیات کے ساتھ ساتھ اس کے قالب بھی مختلف ہو سکتے ہیں ۔ لیکن اسلام نے اس قالب کے بسیط خدوخال

۳۰- ری کنسٹرکشن آف ریلجیس تھاٹ ان اسلام ۔ مصنفہ ڈاکٹر علامہ اقبال ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، اپریل سنہ ۱۹۶۸ع ص ۱۴۷ ۔

(Broad Out-Lines) کو بھی معین کر دیا ہے ۔ الٰہی نظریہ' اقتدار اعلیٰ کی روح اور ان بسیط خدوخال کے ساتھ جو نظام سیاست ترتیب پاتا ہے ، وہی حقیقی اسلامی نظام حکومت ہے ، اور اقبال فرماتے ہیں ۔

" اسلامی نظام حکومت نہ جمہوریت ہے نہ ملوکیت نہ ارسٹا کریسی ہے نہ تھیوکریسی ، بلکہ ایک ایسا مرکب ہے ، جو ان تمام کے محاسن سے متصف اور قبائح سے منزہ[۳۱] "

علامہ اقبال چاہتے تھے کہ برصغیر ہند میں بھی اسی نظام حکومت کو رائج کیا جائے ۔ یہاں سوال پیدا ہو سکتا ہے کہ جب وہ جمہوریت کے اس لئے مخالف تھے کہ اس کی وجہ سے ایک مذہبی اکثریت کو برسر اقتدار آنے کا موقع ملتا تھا تو پھر اسلامی نظام حکومت کو رائج کرنے کے معنی یہ تھے کہ مسلم اقلیت کو برصغیر کا اقتدار سونپ دیا جائے ؟ یہ اعتراض محض ایک غلط فہمی کا نتیجہ ہے ۔ اقبال مسلمانوں کی حکمرانی کے نہیں بلکہ اسلام کی حکمرانی کے قائل تھے اور وہ اقتدار کو مسلمانوں کے سپرد نہیں بلکہ اسلام کے سپرد کرنا چاہتے تھے ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

" آزادی سے ہمارا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم آزاد ہو جائیں ۔ بلکہ ہمارا اول مقصد یہ ہے کہ اسلام قائم رہے ——— مسلمان کسی ایسی حکومت کے قیام میں مددگار نہیں ہو سکتا ، جس کی بنیادیں انہی اصولوں پر ہوں ، جن پر انگریزی حکومت قائم ہے ۔ ایک باطل کو مٹا کر دوسرے باطل کو قائم کرنا چہ معنی دارد[۳۲] ؟ "

اور اسی لئے وہ چاہتے تھے کہ برصغیر " دارالمسلمین " ہی نہیں بلکہ " دارالسلام " بن جائے ۔ بے شک اسلامی حکومت کے کارکن و کارپرداز

۳۱۔ ملفوظات اقبال ، مرتبہ محمود نظامی ، مطبوعہ امرت الیکٹرک پریس لاہور ، بار اول ص ۱۷۲ ۔

۳۲۔ مضامین اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، چار مینار حیدر آباد دکن ، بار اول ۱۳۶۲ھ ص ۱۹۵ و ۱۹۶ ۔

مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ نظام حکومت نہ تو فرقہ وارانہ عدیدیت ہے اور نہ مّلا راج (Theocracy) کیونکہ اس حکومت کے اقتدار کا سرچشمہ نہ تو مسلمانوں کی جماعت ہے اور نہ ان کے مذہبی علماء ہیں، بلکہ اس نظام حکومت کے اقتدار کا ماخذ و منبع ذاتِ باری ہے۔ البتہ اس اقتدار کے عملاً استعمال کرنے اور برتنے والے مسلمان ہی ہوتے ہیں لیکن ان کی حیثیت "حاکم" و "فرمانروا" کی نہیں بلکہ کارکن و کارپرداز، "نائب و خلیفہ" کی ہوتی ہے۔ وہ خود مقتدر نہیں بلکہ اقتدار کو نافذ کرنے والے ہیں، پھر اقتدار کے نفاذ کا یہ اختیار بھی غیر محدود و لامتناہی نہیں ہے بلکہ حاکم حقیقی اور مقتدر اعلیٰ نے اس پر بھی تحدید عائد کر رکھی ہے اور اس کے حدود بھی متعین کر دئے ہیں اور یہ نائبین اس اختیار کو حدود اللہ میں رہ کر ہی رو بعمل لانے کی مجاز ہیں۔ اس طرح مسلمان الٰہی اقتدار کو من مانے استعمال کرنے اور "برتنے والے" نہیں بلکہ اس کو حدود شرعی کے اندر صرف نافذ کرنے اور روبکار لانے والے ہیں۔ ان حدود سے تجاوز کرنے کا انھیں اختیار نہیں ہے اور اگر وہ ان حدود سے متجاز ہو جائیں یا انھیں توڑ دیں تو اس مملکت کے شہریوں پر ان کی اطاعت واجب نہیں۔ مختصر یہ کہ نظری و عملی طور پر یہ حکومت نہ فرقہ وارانہ عدیدیت ہے نہ مّلا راج۔ نظری طور پر یہ الٰہی حکومت ہے، کیونکہ اس کے اقتدار کا سرچشمہ ذاتِ باری ہے اور عملی طور پر یہ ان اصولوں کی حکومت ہے، جو قرآن کریم اور حدیث نبوی میں موجود ہیں۔

الغرض علامہ اقبال برصغیر ہند کے مخصوص حالات اور انسانی خودی کی بہتر نشوونما کے پیش نظر پارلیمانی جمہوری نظام کے مخالف تھے اور چاہتے تھے کہ یہاں اسلامی نظام حکومت قائم ہو تاکہ یہ ہر کوچک "انسانی انا" کے ارتقاء کی ایک واضح شاہراہ تمام دنیا کے سامنے کھول سکے۔

ہندوستان کی معاشی کشمکش اور اقبال | اقبال نہ تو سرمایہ داری کے حامی تھے اور نہ اشتراکیت کے۔ انھوں نے اپنے کلام میں بڑے زور شور

سے سرمایہ داری کی مخالفت کی ہے - " لینن " کی زبان سے " خدا کے حضور میں " وہ کہتے ہیں -

ہے دل کے لئے موت مشینوں کی حکومت
احساس مروت کو کچل دیتے ہیں آلات
تو قادر و عادل ہے مگر تیرے جہاں میں
ہیں تلخ بہت بندہ مزدور کے اوقات
کب ڈوبے گا سرمایہ پرستی کا سفینہ
دنیا ہے تیری منتظر روز مکافات

فرشتے جو گیت گاتے ہوئے انہیں سنائی دیتے ہیں ، اس کا ایک شعر یہ ہے -

تیرے امیر مال مست ، تیرے فقیر حال مست
بندہ ہے کوچہ گرد ابھی خواجہ بلند بام ابھی

" فرمان خدا " میں انہوں نے سرمایہ داری کے خلاف بڑے شدید جذبات کا اظہار کیا ہے ، خصوصاً ان کا یہ شعر -

جس کھیت سے دہقان کو میسر نہ ہو روزی
اس کھیت کے ہر خوشہ گندم کو جلا دو

نظام سرمایہ داری کے خلاف تیر و نشتر سے کم نہیں - سرمایہ داری کے خلاف ان کے ان ہی رجحانات کو دیکھتے ہوئے ، بعض اشخاص نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ وہ اشتراکی تھے ، یہاں ہمیں اقبال کے معاشی رجحانات کا استقصا مقصود نہیں ہے - ورنہ ہم تفصیل سے بتلاتے کہ اقبال کس حد تک اشتراکیت کی تائید کرتے ہیں اور اشتراکیت کے وہ کون سے پہلو ہیں جن کی وجہ سے اقبال کو اشتراکیت سے ایک گونہ ہمدردی ہے - یہاں ہمیں تفصیلات میں گئے بغیر صرف یہ کہنا ہے کہ وہ اشتراکی نظام کے بھی مخالف تھے - اشتراکی حکومت مزدوروں کی حکومت ہے - اقبال مزدوروں کی حکومت کے متعلق فرماتے ہیں -

زمام کار اگر مزدور کے ہاتھوں میں ہو ، پھر کیا
طریق کوہکن میں بھی وہی حیلے ہیں پرویزی

اشتراکیت کا اصل اصول اقتصادی مساوات ہے۔ اقبال اس مساوات کے قائل نہیں ہیں وہ فرماتے ہیں۔

غربیان گم کردہ اند افلاک را
در شکم جوئند جانِ پاک را

دین آں پیغمبرے حق ناشناس
بر مساوات شکم دارد اساس

تا اخوت را مقام اندر دلست
بیخِ او در دل نہ در آب و گل است

ابلیس کی مجلس شوریٰ میں انہوں نے بڑے لطیف انداز میں اشتراکیت کے اچھے اور برے پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے۔ ابلیس کا دربار آراستہ ہے۔ مشیرانِ باتدبیر قرینہ سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ صدرِ بزم خود اپنی مدح و توصیف سے جلسہ شوریٰ کی کاروائی کا آغاز کرتا ہے۔ ہر مشیر باری باری سے اپنے کارنامے بیان کرتا، حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ کرتا اور ان مشکلات کو بتاتا ہے، جو اس کو اپنی خدمات کی انجام دہی کے سلسلے میں پیش آتی ہیں۔ صدرِ بزم نے اپنی کامیابی و کامرانی کا ذکر کیا تھا ـــــ پہلا مشیر اس کی ہاں میں ہاں ملاتا ہے اور اپنے پیر و مرشد کے گُن گاتا ہے۔ دوسرا مشیر معترضانہ انداز میں مشیر اول کو یاد دلاتا ہے کہ ابلیسی کارناموں کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں ایک بڑی رکاوٹ ''سلطانیٔ جمہور'' کی وجہ سے پیش آ رہی ہے۔ مشیرِ اول اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ سلطانیٔ جمہور کا یہ غوغا بھی دراصل حضرتِ ابلیس کا پھونکا ہوا افسوں ہے۔ مشیر اول کے اس جواب سے مشیرِ دوم خاموش ہو جاتا ہے لیکن تیسرا مشیر سوال کرتا ہے کہ اگر جمہوریت کے لباس میں ملوکیت کی وہی قدیم روح کارفرما ہے تو پھر فکر کی کوئی بات نہیں، مگر اب ہم کو ایک اور نئے فتنے سے سابقہ پڑ رہا ہے، اور وہ فتنہ کارل مارکس کا ہے۔ تیسرے مشیر کی زبان سے اقبال اشتراکیت اور بانیٔ اشتراکیت کی یوں تعریف کرتے ہیں۔

روحِ سلطانی رہے باقی تو پھر کیا اضطراب
ہے مگر کیا اس یہودی کی ، شرارت کا جواب

وہ کلیمِ بے تجلی ! وہ مسیحِ بے صلیب
نیست پیغمبر و لیکن در بغل دارد کتاب

کیا بتاؤں کیا ہے ، کافر کی نگاہ پردہ سوز
مشرق و مغرب کی قوموں کے لئے روزِ حساب

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا طبیعت کا فساد
توڑ دی بندوں نے آقاؤں کے خیموں کی طناب

چوتھا مشیر اس کا جواب یہ دیتا ہے کہ کارل مارکس کا توڑ مسولینی ہے ۔ اشتراکیت کے زہر کا تریاق فاسطیت ہے ! تیسرا مشیر ، چوتھے مشیر کی اس رائے کا قائل نہیں وہ مسولینی کی عاقبت بینی پر شک کرتا ہے ۔ اس کو شبہ ہے کہ مسولینی کے پاس کارل مارکس کی اس کاٹ کا کوئی جواب بھی ہے ، کیونکہ اس نے اپنی ناعاقبت اندیشی سے سرمایہ دارانہ نظام کے ان گھناؤنے مناظر پر سے پردہ اٹھا دیا ہے جن کو افرنگی سیاست نے چھپائے رکھا تھا ۔ تیسرے مشیر کی اس رائے سے تمام اہلِ شوریٰ متفق ہو جاتے ہیں کہ ابلیسی نظام کی کامیابی کی راہ میں اگر کوئی روڑا ہے تو وہ اشتراکیت ہے ۔ ابلیس اور اس کے تمام کارندوں اور مشیروں کی مساعی پر اگر کوئی پانی پھیر رہا ہے تو وہ کارل مارکس ہے ۔ ابلیس کا پہلا کارنامہ تو یہ تھا کہ اس نے دین و سیاست میں تفریق پیدا کر دی اور اس طرح ” مُلا “ کے لئے ” خانقاہ “ اور ” مَلک “ کے لئے ” تختِ سلطنت “ کو مختص کر دیا لیکن جب اولاد آدم میں ذرا سی خود شناسی و خود نگری پیدا ہوئی اور انھوں نے ملوکیت کے تخت کو الٹ دینا چاہا تو ابلیس اور اس کے کارندوں نے آگے بڑھ کر شاہی کو جمہوری لباس پہنا دیا ۔ یہ ابلیس کی دوسری کامیابی تھی ۔ اس کے لئے اس نے افرنگ کے ساحروں کو اپنا مرید بنایا اور ان کے توسط سے اولادِ آدم کو جو انقلاب فرانس کے ذریعہ بند ہائے غلامی کو توڑ کر اپنا اصلی مقام حاصل کرنا چاہتے تھے ، ابلیس نے پھر ایک مرتبہ اپنے دامِ تزویر میں پھانس لیا ۔

یہ دو مرحلے تو اس نے اپنی چالاکی اور چابکدستی سے طے کر لئے تھے ، لیکن اب ایک تیسرا مرحلہ درپیش تھا۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ کے تمام مشیر گذشتہ دو کامیابیوں کے قائل تھے ، لیکن سب کو یہ دکھتا تھا کہ اشتراکیت کا یہ تیسرا مرحلہ کیسے طے ہو گا۔ پہلے مرحلے پر " صوفی و ملا " کو اپنے ساتھ ملا کر ابلیس نے کامیابی حاصل کی تھی۔ دوسرا مرحلہ " افرنگ کے ساحروں " کے ساتھ سازش کرکے طے کیا گیا تھا ، لیکن اب اس تیسرے مرحلہ پر افرنگ کے ساحروں کی فراست بھی ، انھیں ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ کام نہ آ سکے گی۔ یہ خیالات شکوک و شبہات سب مشیروں کے دلوں میں اور تمام اہل شوریٰ کے قلوبؔ میں پیدا ہوتے ہیں۔ پانچواں مشیر ان سب کی نمائندگی کرتے ہوئے ان ہی خیالات کا اظہار کرتا ہے اور آخر میں اپنے آقا ابلیس کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

میرے آقا ! وہ جہاں زیر و زبر ہونے کو ہے
جس جہاں کا ہے فقط تیری سیادت پر مدار

اب سب منتظر تھے کہ دیکھیں بارگاہِ شیطانی سے کیا جواب ملتا ہے۔ بالآخر ابلیس اپنی مسند صدارت سے ان کا جواب دیتا ہے۔ ابتدا ہی متکبرانہ انداز میں وہ اپنے گذشتہ کارناموں کو یاد دلاتا ہے۔ میں نے شرق و غرب کو لڑا دیا۔ میں نے اقوام یورپ کو باہم ایک دوسرے سے دست و گریبان کر دیا۔ پھر وہ مارکس کی فتنہ پردازی کا جواب دیتے ہوئے کہتا کہ مارکس نادان ہے ، کیونکہ وہ یہ سمجھتا ہے کہ یہ سرمایہ دارانہ تہذیب بہت آسانی کے ساتھ تہ و بالا ہو سکتی ہے۔

کارگاہِ شیشہ ، جو ناداں سمجھتا ہے اسے
توڑ کر دیکھے تو اس تہذیب کے جامِ و سبو

اشتراکیت میں ایک بنیادی کمزوری ہے۔ فطرت نے انسانوں کو اصول مساوات پر پیدا نہیں کیا۔ ایک انسان اپنے قوائے جسمانی عقلی و ذہنی کے لحاظ سے دوسرے انسان سے مختلف ہے۔ عدمِ مساوات جب فطرت ہی کا اپنا ایک اٹل اصول ہے تو معاشی حیثیت سے تمام انسانوں کو ایک ہی سطح پر کیسے لایا جا سکتا ہے ؟

دستِ فطرت نے کیا ہے جن گریبانوں کو چاک
مزد کی منطق کی سوزن سے نہیں ہوتے رفو

لہذا اشتراکیت اصول فطرت کے خلاف ہے اور ابلیس پوری خود اعتمادی اور نہایت ہی تحقیر آمیز انداز میں اپنے مشیروں سے کہتا ہے -

" یہ کارل مارکس ! جس سے تم ڈر رہے ہو - سہمے جا رہے ہو - اس میں اتنا بل بوتا ہی نہیں کہ میرے بچھائے ہوئے جال کی کسی گرہ کو کاٹ کر پھینک دے ; اس کا نظام میرے نظام سے ٹکر نہیں لے سکتا اگر لے گا تو اس کے پرخچے اُڑ جائیں گے - اس کی تعلیم میری تعلیم کے سامنے بہت پھیکی اور ہلکی ہے اور یہ اشتراکی ! ! ان کی میرے سامنے بساط ہی کیا ہے - یہ تو " کوچہ گرد ہیں " پریشان روزگار ہیں ان کے " چہرے پژمردہ " اور ان کے دماغ آشفتہ ہیں ! ! —— یہ میرا کیا بگاڑ سکتے ہیں ؟ ! ان سے تمھیں ڈرنے اور خوف کھانے کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں -

کب ڈرا سکتے ہیں مجھ کو اشتراکی کوچہ گرد
یہ پریشان روزگار ، آشفتہ مغز ، آشفتہ ہو "

اقبال نے نہایت دلآویز انداز میں ، اس نظم میں یہ بتایا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام ابلیسی نظام ہے اور کارل مارکس نے اس نظام پر حملہ کیا ہے - سرمایہ دارانہ نظام کے سب کارندے ، مشیرانِ ابلیس ہیں اور یہ سب کے سب اس حملہ سے خوفزدہ ہیں - اقبال نے اس شاعرانہ تصور کے ذریعہ سرمایہ و محنت کی موجودہ کشمکش کی طرف بڑے دلچسپ انداز میں اشارہ کیا ہے ، اور اس طرح مارکس اور اس کی اشتراکیت کو بڑا خراجِ تحسین پیش کیا ہے ، لیکن ابلیس نے سرمایہ داری کا جو مرض اس دنیا میں پھیلا دیا ہے ، اشتراکیت کو وہ اس کا صحیح علاج نہیں سمجھتے کیونکہ یہ علاج ان کی نظر میں فطری نہیں ہے - اس علاج سے سرمایہ داری کے مرض کی بجائے دوسرے امراض پیدا ہو جاتے ہیں - ابلیس کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے اشتراکیت کی اس بنیادی کمزوری کو واضح کیا ہے ، الغرض اقبال سرمایہ داری و اشتراکیت دونوں کے مخالف ہیں -

پھر وہ کون سے معاشی نظام کے حامی ہیں ؟

اقبال کی نظر میں متوازن اور فطری معاشی نظام دراصل اسلام کا معاشی نظام ہے ۔ ابلیس کی مجلس شوریٰ والی اسی نظم میں وہ فرماتے ہیں کہ ابلیس کے سرمایہ دارانہ نظام پر کامیابی کے ساتھ اگر کوئی نظام ضرب لگا سکتا ہے تو وہ اسلام ہے ۔ شیطان کے مشیر جمہوری سرمایہ دارانہ نظام سے مطمئن ہیں ، لیکن اشتراکی نظام سے گھبرائے ہوئے ہیں ، مگر خود شیطان اشتراکیوں سے خوف زدہ نہیں ہے بلکہ وہ ان کو خاطر میں نہیں لاتا ۔ انھیں کوئی اہمیت ہی نہیں دیتا ہے ، البتہ وہ لرزاں و ترساں ہے تو اسلام سے ۔ " فتنہ فردا " ابلیس کی نظر میں اشتراکیت نہیں ، اسلام ہے ، وہ اسلام اور اسلام کے معاشی نظام سے اتنا گھبرایا ہوا ہے کہ ابھی جن مشیروں کے سامنے اس نے ناز و تبختر کے ساتھ اپنی کامیابی و کامرانی کے واقعات بیان کئے تھے اور اشتراکیوں کا مضحکہ اور اشتراکیت کا مذاق اڑایا تھا ، یکایک جب اس کو اسلامی نظام یاد آ جاتا ہے تو اس کی کامیابی کا نشہ ہرن ہو جاتا ہے ، اس کے غرور و تمکنت کی قبائے زریں چاک چاک ہو جاتی ہے اور وہ ایک لمحہ کے لئے یہ بھول جاتا ہے کہ مشیرانِ با تدبیر اس کے حضور میں حاضر ہیں ! ! فرطِ خوف سے وہ بے ساختہ چیخ اٹھتا ہے ۔

الحذر ! آئینِ پیغمبر سے سو بار الحذر !
حافظ ناموسِ زن ، مرد آزما ، مرد آفریں

اقبال اس کے بعد بڑے دل نشین الفاظ میں اسلام کے معاشی نظام کی بعض بنیادی خصوصیات کی طرف اشارہ کرتے ہیں ۔ فرماتے ہیں ۔

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
نے کوئی فغفور و خاقاں ، نے فقیرِ رہ نشیں
کرتا ہے دولت کو ہر آلودگی سے پاک و صاف
منعموں کو مال و دولت کا بناتا ہے امیں
اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں ! اللہ کی ہے یہ زمیں

یہ ہمارا موضوع نہیں ہے کہ اقبال کی نظر میں جس معاشی نظام کا خاکہ تھا اس کی ایک واضح تصویر یہاں کھینچیں ۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ جن لوگوں کی نظر اقبال کے کلام اور اس کلام کی روح پر ہے اور جنھوں نے اقبال کے ذہن کو اس کے کلام و پیام ، تقریروں اور تحریروں میں پڑھنے کی کوشش کی ہے ، وہ اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ جس متوازن اور فطری معاشی نظام کے وہ قائل تھے ، وہ اسلام ہی کا معاشی نظام تھا ۔ اس سلسلے میں اقبال نے جو اشعار کہے ہیں ، ممکن ہے کہ ان کی مختلف تعبیریں کی جائیں اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ان کے ان اشعار کی مختلف تعبیریں کی گئیں ۔ اشعار فی الحقیقت ذہن کی اپج اور طبع کی جولانی کا لطیف نتیجہ ہوتے ہیں ۔ اس لئے ان میں اختلافِ تعبیر کی بھی زیادہ گنجائش ہوتی ہے ۔ یہاں ہم اقبال کے اشعار اور ان کے مطالب کی صحیح تعبیر و تشریح میں نہیں الجھیں گے ۔ البتہ ان کے خطبات و خطوط کے بعض ایسے اقتباسات پیش کریں گے جن سے غیر مبہم طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے ذہن میں کون سے معاشی نظام کی تصویر ہے ۔ وہ خطبۂ صدارت کل ہند مسلم کانفرنس میں مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

" وہ دین جس کی تم نمائندگی کر رہے ہو ، فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی ایسی تربیت کرتا ہے ، جس کی وجہ سے وہ اپنا سب کچھ خدا اور انسان کی خدمت کے لئے دے دیتا ہے ۔ اس کے (احیائے دین کے) امکانات ابھی ختم نہیں ہوئے ہیں ۔ وہ اب بھی ایک نئی دنیا کی تخلیق کر سکتا ہے ۔ جہاں انسان کا سماجی مرتبہ اس کی ذات پات ، یا اس کے رنگ ، یا اس کی کمائی ہوئی آمدنی کی مقدار سے نہیں ، بلکہ اس طرز زندگی سے متعین ہوتا ہے جو وہ گزارتا ہے ۔ جہاں غریب امیروں پر ٹیکس لگاتے ہیں ، جہاں انسانی معاشرہ کی اساس مساواتِ شکم پر نہیں بلکہ روحانی مساوات پر رکھی جاتی ہے ۔ جہاں ایک عامی ، حاکمِ وقت کی لڑکی سے شادی کر سکتا ہے ، جہاں خانگی ملکیت ایک امانت ہے اور جہاں سرمایہ کو اس طرح اندوختہ کرنے کی

اجازت نہیں دی جاتی کہ دولت کے حقیقی پیدا کنندہ کو غلام بنا لیا جائے[۳۳]"

مسٹر جناح کے نام اپنے ایک خط میں (مورخہ ۲۱ مئی سنہ ۱۹۳۷ء) وہ لکھتے ہیں۔

"اسلامی قوانین کا طویل اور محتاط مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو پوری طرح سمجھ کر نافذ کیا جائے تو کم از کم ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے حق کی طمانیت تو حاصل ہو جاتی ہے[۳۴]"

ان اقتباسات کے پڑھنے کے بعد کوئی گنجلک باقی نہیں رہتی اور بین طور پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ علامہ اقبال نہ تو سرمایہ داری کے قائل تھے اور نہ اشتراکیت کے بلکہ وہ ان دونوں نظام ہائے معاشی کے بجائے اسلامی نظام معیشت کے حامی تھے ——

حضرتِ علامہ ہندوستان کی معاشی دنیا میں اس دہری کشمکش کو دیکھ رہے تھے ، جس کی طرف ہم اوپر اشارہ کر آئے ہیں ۔ وہ جانتے تھے کہ ہندوستانی سرمایہ و بیرونی سرمایہ اور ہندوستانی صناع و غیر ملکی صناع میں جو کشمکش جاری ہے وہ حصول آزادی کے بعد بڑی حد تک ، ممکن ہے کہ ختم ہو جائے ، لیکن ملکی سرمایہ اور ملکی محنت کے مابین جو تنازعہ برپا ہو چکا ہے ، آزادی حاصل ہو جانے کے بعد وہ فرو ہونے کے بجائے اور زیادہ سخت ہو جائے گا ۔ اس نزاع کا بالآخر کیا انجام ہو گا ، اس کے متعلق انھوں نے کوئی پیش گوئی نہیں کی لیکن انھیں اس امر کا اندیشہ تھا کہ بالآخر فتح خواہ کسی گروہ کی ہو ، ہندوستان میں سرمایہ

۳۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء ص ۵۴ -

۳۴- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۶ -

و محنت کی اس کشمکش کے باعث کشت و خون ہو کر رہے گا۔ چنانچہ، وہ اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

" مجھے ڈر ہے کہ ملک کے بعض حصوں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کو دہرایا جائے گا پھر ہندوؤں کی ہئیت سیاسی میں جواہر لال کی اشتراکیت کے داخلہ سے خود ہندوؤں میں کافی کشت و خون ہونے کا امکان ہے۔[۳۵] "

——— اور فطرتاً اقبال نہیں چاہتے تھے کہ ہندوستان ، نظام سرمایہ داری و اشتراکیت کا میدان کارزار ، اور یہ سر زمین خود ہندوستانیوں کے خون سے لالہ زار بن جائے ! !

اقبال کا شاہ منصوبہ | اقبال نے کسی متعصبانہ اور محدود زاویۂ نظر سے نہیں بلکہ انسانی فلاح و بہبود کے وسیع ترین نقطۂ نظر سے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے ان عناصر اربعہ پر نظر ڈالی اور یہ محسوس کیا کہ اگر ہندوستان کے مستقبل کا خاکہ ان تصورات کے موقلم سے تیار کیا جائے اور اس کے اجتماعی نقشہ کو اس چوکھٹے میں آویزاں کیا جائے ، تو اس میں نہ صرف ہندوستان کی " اجتماعی انا " گھٹ کر رہ جائے گی بلکہ یہ خاکہ اور نقشہ انسانیت کے عالمی منصوبہ (World Plan) پر ایک بدنما داغ بن کر رہ جائے گا ———

اقبال نے ایک جویائے حقیقت مفکر اور ایک عملی مدبر کی حیثیت سے اس امر کی کوشش کی کہ ایک ایسے تہذیبی نظام کا پتہ چلایا جائے ، جو انسانوں کے باہمی اختلافات رنگ ، زبان ، نسل اور وطن کو ختم کرکے ایک عالمگیر قانون کا ان کو پابند بنا دے اور اس طرح گروہوں ، جماعتوں ، نسلوں اور قوموں میں بٹی ہوئی اولاد آدم کو پھر ایک مرتبہ " انسانی برادری " اور " عیال اللہ " (Family of God) میں تبدیل کر

۳۵- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۷ -

دے[۳۶] ——— پھر وہ تہذیبی خاکہ و نقشہ ایسا ہو کہ اس کے تمام زاویوں میں کامل توافق اور اعلیٰ درجہ کا توازن بھی پایا جائے ۔ اجتماعی زاویۂ نظر سے اس میں جماعت اور فرد کے مابین کشمکش کی بجائے ہم آہنگی ہو ۔ سیاسی نقطہ نظر سے اس میں " فرد کی خودی " کو پروان چڑھنے کا پورا پورا موقع بھی ملے اور " اجتماعی انا " کی حفاظت کے لئے کمال درجہ کا سیاسی نظم بھی اس میں پایا جائے ——— معاشی زاویہ نگاہ سے اس تہذیبی خاکے کے نقش و نگار میں نہ تو غریبوں کے خون سے رنگ آمیزی کی جائے اور نہ ہی طبقاتی تصادم سے اس کے حسین نقوش کو بھیانک بنا دیا جائے ۔ اقبال نے اپنے عمیق مطالعہ اور گہرے غور و فکر کے بعد جس تہذیبی اجتماعی نظام کا پتہ چلایا اور جس کو بطور اصول و عقیدے کے اختیار کیا ، وہ اسلام تھا ۔ اس کا ایقان تھا کہ یہی ایک ایسا تہذیبی و اجتماعی نظام ہے ، جو انسانیت کے رفیع و بلند مقاصد کو پورا کرتا ہے ——— لیکن اقبال نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو جن تصورات کے سایہ میں پرورش پاتے دیکھا ، وہ اس تہذیبی نظام کے بنیادی تصورات سے ٹکراتے تھے ۔ ان کے مابین کوئی مفاہمت ممکن ہی نہ تھی ، اور ان کے درمیان کوئی جوڑ اور پیوند لگایا ہی نہیں جا سکتا تھا ! !

ہندوستان میں وطنی قومیت کا تصادم براہ راست اسلامی قومیت سے تھا اور سیکولرزم کی راست ضرب دینی سیاست پر پڑتی تھی ۔ البتہ پارلیمانی جمہوری نظامِ حکومت اور اسلامی تصور حکمرانی میں ایک گونہ اور بعید مفاہمت ممکن تھی ، لیکن وطنی قومیت اور لادینیت کے تصورات کو بطور اصول موضوعہ تسلیم کرکے اگر جمہوری پارلیمانی نظامِ حکومت کو ہندوستان کے اندر رائج کیا جائے ، تو اقبال کے نقطۂ نظر سے وہ جماعت ، جو ہندوستان میں اس مثالی تہذیبی ، اجتماعی نظام کی حامی اور علمبردار تھی ، نہ صرف یہ کہ دوسری اقوام کا ضمیمہ بن کر رہ جاتی بلکہ اس کی زندگی کا نصب العین اور مقصد حیات فوت ہو جاتا ——— وطنی قومیت کے

۳۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۲۲ ۔

اصول کو تسلیم کرکے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو تشکیل دینے کے معنیے یہ تھے کہ مسلمان اپنی ہستی کو جدید ہندوستانی قوم میں مدغم کرکے انسانی وحدت اور عالمی برادری کے نصب العین سے دست کش ہو جائیں۔ دین و سیاست کی تفریق کو قبول کرنے کے معنی یہ تھے کہ اسلام کے ان معاشی و معاشرتی قوانین کو سرد خانے میں بند کر دیا جائے جن کے متعلق اقبال کا یہ ایقان تھا کہ ان میں اتنی لچک اور ایسی خوبی پائی جاتی ہے کہ وہ زمانے کی رفتار کا ساتھ بھی دے سکتے ہیں اور اس کی گتھیوں کو سلجھا بھی سکتے ہیں[۳۷]۔ پھر اس کے یہ مضمرات بھی تھے کہ اسلام کے نظامِ سیاست و حکومت کے چہرے پر سے "عربی شہنشاہیت" کے نقاب کو الٹ کر اس کے رخِ تاباں کا دنیا کو جلوہ نہ دکھایا جائے[۳۸]!

مختصر یہ کہ اقبال کے ذہن میں ہندوستان کی اجتماعی زندگی کا جو نقشہ تھا وہ کسی فرقہ یا گروہ کے مخصوص مفادات کو پیش نظر رکھ کر نہیں بنایا گیا تھا، بلکہ وہ انسانوں کی حیاتِ اجتماعی کے اعلیٰ ترین اقدار کا شاہ منصوبہ (Master Plan) تھا۔ اسلامی قومیت، دینی سیاست، قرآنی حکومت اور ایک سمویا ہوا متوازن نظامِ معیشت —— یہ اس منصوبے کے اجزائے ترکیبی تھے۔ اقبال نے ہندوستان کی اجتماعی زندگی کو اسی شاہ منصوبے کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کی۔ یہ ان کا تیسرا کارنامہ ہے —— !!

اقبال کی شاہ ضرب | ہندوستان میں کئی عوامل کے زیر اثر وطنی قومیت لادین سیاست اور پارلیمانی جمہوری نظامِ حکومت کے تصورات اپنی جگہ بنا چکے تھے ان میں سب سے بڑا عامل خود حکمران جماعت تھی۔ برطانوی حکومت اصولاً ان تین تصورات، یعنی وطنی قومیت، لادین سیاست اور پارلیمانی جمہوری نظامِ حکومت کی قائل تھی اور وہ ان تصورات سے ہٹ کر

۳۷۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال، مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۶۰۔

۳۸۔ ایضاً ص ۱۵۔

ہندوستان کی دستوری ترقی کے لئے کوئی دوسری راہ تجویز ہی نہیں کر سکتی تھی - پھر اس کا مفاد بھی اس میں مضمر تھا کہ وہ جمہوری دستوری اصلاحات کو جستہ جستہ نافذ کرتی جائے اور اس جال میں ہندوستان کو زیادہ سے زیادہ عرصہ تک (الجھا کر) اپنے شہنشاہی مقاصد کو پورا کرتی رہے - ہندو اکثریت ایک دوسرا اہم عامل تھی - وطنی قومیت کا تصور اس کے کسی مذہبی ، معاشی یا معاشرتی اصول سے ٹکراتا ہی نہیں تھا بلکہ اپنی روح و مزاج کے لحاظ سے ہندو مذہب ایک وطنی مذہب ہی ہے - "مادر وطن" وطنی قومیت کا اگر مقدس اور بنیادی اصول ہے تو "ماترِ بھومی" ہندو مذہب کا پوتر دھرم ہے ! جمہوری پارلیمانی نظام حکومت میں ہندوؤں ہی کا مفاد پوشیدہ تھا اس لئے کہ وہ ایک مستقل اکثریت رکھتے تھے اور جمہوریت کے پردے میں آسانی کے ساتھ اپنی حکومت جو درحقیقت عددیت ہوتی ، قائم کر سکتے تھے ! ! اب رہی لادین سیاست تو اس کو بطور اصول نہ سہی بلکہ بطور حکمتِ عملی کے اختیار کرنے میں ان کا ہرج ہی کیا تھا ؟ !

انگریزی حکومت کی سرپرستی اور ہندو اکثریت کی تائید کے علاوہ ان تصورات کو ترقی یافتہ دنیا کی عام حمایت حاصل تھی - مغرب کے تمام متمدن ممالک ، دراصل ان ہی تصورات کے آفریدہ تھے اور مغرب کو بحیثیت مجموعی ، خواہ مادی وسائل کے لحاظ سے ہو یا افکار کی ثروت کے اعتبار سے ، ایک گونہ نہیں بلکہ تقریباً تمام تر عالمی سیادت حاصل تھی - گویا ان تصورات کو نہ صرف انگریزوں اور ہندوؤں کی تائید و حمایت حاصل تھی بلکہ یہ تصورات فی الحقیقت تمام دنیا پر حکمرانی کر رہے تھے -

ایک طرف تو یہ تصورات اور ان کی پشت پر یہ قوتیں کام کر رہی تھیں اور دوسری طرف اقبال کے تصورات تھے، جن کی پشت پر صرف ماضی کی شاندار تاریخ تھی ، حال کی کوئی جاندار طاقت نہ تھی - البتہ ایک مضمحل اور پژمردہ اقلیت ان کی حمایت کر رہی تھی اور اس کی یہ حمایت بھی شعوری سے زیادہ غیر شعوری ، عقلی سے زیادہ ایک معنی میں جذباتی تھی —— یہ تصورات دراصل دو مختلف نظام ہائے زندگی اور دو متضاد

تہذیبوں کی نمائندگی کر رہے تھے اور ان کے مابین ایک خاموش پیکار جاری تھی ۔ ذرا چشم تخیل سے اس نقشہ جنگ کو دیکھئے ——

ایک طرف وطنی قومیت ، لا دین سیاست اور پارلیمانی جمہوریت کے نظریوں کو ذخیرہ کرنے والے ، ذہنوں کو ماؤف کرنے والے پرچم تھے اور ان کو اونچا رکھنے کے لیے اکثریت کے بکتر بند دستے ، ان کے پیچھے حکومت وقت کے توپ خانے اور سب سے آخر میں ، لیکن کسی سے کم نہیں ، مغرب کی ، یورپ کی ، ترقی پذیر ، زندہ ، پر شکوہ تہذیب کے ڈویژن اپنے دبابوں اور مشین گنوں کے ساتھ موجود تھے !! —— اور دوسری طرف اسلامی قومیت ، دینی سیاست ، قرآنی حکومت ، اسلامی معیشت کا علم تھا جس کو سر بلند رکھنے کے لیے رنجور و مہجور ، افسردہ و پژمردہ اقلیت کے سپاہی تھے ، جن کی شمشیریں کند ہو چکی تھیں ، جن کے نیزے زنگ آلود ہو چکے تھے اور جن کی زرہیں ٹوٹی ہوئی تھیں !! اس طرف وہ پرچم اس فوج کے لیے حال کا ، زندگی کا سر چشمہ بنا ہوا تھا اور اس طرف یہ علم ان سپاہیوں کے ہاتھوں میں ماضی کا ، دھندلی روایات کا محض ایک نشان بن کر رہ گیا تھا —— ! —— لیکن علامہ اقبال اس کے پرچم کی بجائے اسی علم کو ہندوستان میں سر بلند رکھنا چاہتے تھے اور مغرب کے ان تصورات کی بجائے ان کے مخالف اسلامی تصورات کو حکمران دیکھنا چاہتے تھے !! سوال یہ تھا کہ اس کی عملی شکل کیا ہو سکتی ہے ؟ اس سوال کا جواب صرف مدبر و سیاس یا محض مفکر و فلسفی سے بن نہ آتا ۔ مدبر و سیاس ان تصورات سے دست بردار ہو کر حکمران تصورات کو قبول کر لیتا یا پھر ان میں پیوند لگانے کی کوشش کرتا ۔ دونوں صورتوں میں اس کی ناکامی یقینی تھی ۔ فلسفی و مفکر ان تصورات سے ہاتھ تو نہ اٹھاتا مگر ان ہی تصورات میں کھویا ہوا ، وہ اپنے کنج عزلت میں بیٹھا رہتا ۔ یہ گویا حالات کے سامنے سپر انداز ہونے کے مماثل تھا ۔ اقبال کا ذہن فلسفی و سیاست دان سے بھی بلند تھا ۔ اس نے نہ تو ان تصورات سے دست بردار ہونا ہی گوارا کیا اور نہ حالات سے مجبور ہو کر اپنی شکست کا اعلان کیا ۔ اس نے ہندوستان کے ان حالات میں اپنے تصورات کی روح کو مجسم کرنے کے لیے ایک ایسا قالب تجویز کیا ، جو کسی معمولی

سیاستدان یا ادنٰی درجے کے فلسفی کے ذہن کی پیدا وار نہیں بلکہ اقبال جیسے "شاہ دماغ" (Master Mind) کا کمال تھا ! اور یہ قالب تھا پاکستان ! یعنی ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہندوستان ——— !! دوسرے الفاظ میں ہندوستان کے بر عظیم میں ایک ایسے خطہ کا تعین ، جہاں ان تصورات کی عملی جلوہ دکھا کر تمام دنیا کو ایک اسلامی ہیئت اجتماعیہ انسانیہ ، ایک نصب العینی و مثالی معاشرے کے حقیقی خد و خال ، اصلی نقش و نگار اور پورے حسن و جمال کا مشاہدہ کرایا جائے !! عملی سیاست میں بھی اقبال کا چوتھا ، حقیقی اور عظیم ترین فکری کار نامہ ہے !!!

کیا یہ شاعری تھی ؟ ——— تفلسف تھا ؟ ——— یا سیاست تھی ؟ ——— جی ہاں ! یہ شعر بھی تھا ، ——— فلسفہ بھی تھا اور ——— سیاست بھی ! ——— کیا یہ سیاست دان کی شاعری تھی ؟ ——— شاعر کی حکمت عملی تھی ؟ یا فلسفی کی سیاست تھی ؟ ؟

جی نہیں ! یہ ایک امتزاج تھا ——— شاعر کی تصوریت (الف) - فلسفی کی عقلیت (ب) اور سیاستدان کی واقعیت (ج) کا امتزاج ——— دلکش اور حسین !!

یہ ایک شاہکار تھا ——— شعریت انسانی ، فراست ایمانی ـ سیاست قرآنی کا شاہ کار ——— باوقار و پر تمکین !!!

اگر قیادت نام ہے ، قوم کی اجتماعی ، شعوری و غیر شعوری خواہشات کے متعین اور مجسم کر دینے کا تو اقبال نے گزری ہوئی ، موجودہ اور آنے والی ہندوستانی مسلمان نسلوں کی اجتماعی ، شعوری ، تحت شعوری اور غیر شعوری خواہشوں اور تمناؤں کو حضرت سید احمد شہید رحمتہ اللہ علیہ کے بعد پہلی مرتبہ اسلامی ہند کے اس تصور میں مرکوز کر دیا تھا ——— !

غور کیجیئے تو معلوم ہوگا کہ تصورات کی جس کشمکش کا ذکر اوپر کیا گیا ہے ، اگر یہ کشمکش پورے طور پر برپا ہو کر رہتی تو نتیجہ کیا کچھ ہوتا ! اقبال کی فکری قیادت کا یہ ایک بے مثال کار نامہ ہے کہ

الف - Idealism ب - Rationalism ج - Realism

اس نے اس نازک موقع پر اس پیکار افکار کو اپنے طبعی اور منطقی نتیجہ پر پہنچنے سے پہلے ، ایک ماہرِ حرب کی طرح محاذِ جنگ کی نوعیت کو بدل دیا ! ! ——— اُدھر گو مقاصد دنی اور پست تھے مگر دشمن قوی تھا ، اور پورے سازو سامان سے لیس تھا - پھر اس نے پیش قدمی بھی پوری تیاری کے ساتھ کی تھی - ادھر گو مقاصد جلیل تھے ، مگر عزائم پست تھے ، صفیں کج تھیں اور اسلحہ ناکارہ تھے - پیش قدمی تو کجا دشمن کی یلغار کو سہار لینا بھی مشکل تھا - ایسے موقع پر کھلی جنگ شکست کے مترادف تھی اور صلح شکست سے بھی بد تر ہوتی - اسلامی ہند کی یہ تجویز برعظیم ہند کی اس رزم تصورات میں در اصل ، اقبال کی ایک شاہ ضرب (Master Stroke) تھی ، جس نے مسلم قوم کو مجہول مفاہمت کی ذلت سے بچا لیا اور ہندوستان میں اسلامی تصورات کی شکست کو فتح سے بدل دیا —— ! !

اقبال نے ایک طرف تو یہ دیکھا کہ ہندوستان کی اجتماعی و سیاسی زندگی کے تصورات اور ان کے اپنے تصورات میں ایک کشمکش برپا ہے - پھر انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ ان تصورات کو غالب و حکمران بنانے کے لیے جس سیرت و کردار ، جس سازو سامان کی ضرورت ہے ، وہ موجود نہیں ہے ——— لیکن دوسری طرف انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ ہندوستان کے شمال مشرق و شمال مغرب میں اکثریت ان لوگوں کی ہے ، جو ان تصورات پر ایقان و ایمان رکھتے ہیں - فریقِ مقابل اسلامی قومیت ، دینی سیاست - قرآنی حکومت اور اسلامی نظامِ معیشت سے تو انکار کرتا ہے ، لیکن جمہوریت و اکثریت کی مرضی کا وہ قائل ہے - اقبال نے فریقِ مخالف کے اسی اصول کو اپنے بچاؤ اور اس کی شکست کے لیے استعمال کیا اور اس ایک ترکیب سے اس کے سارے ہتھیار چھین لیے - انھوں نے کہا تمھاری وطنی قومیت ، لا دینی سیاست ، پارلیمانی جمہوری نظامِ حکومت ، سرمایہ داری یا اشتراکیت کے اگر تمام ہندوستانی یا ہندوستانیوں کی اکثریت قائل ہے تو اس کو رائج کرو ، لیکن ہندوستان کے دو گوشوں میں ایک بڑی اکثریت اسلامی قومیت ، دینی سیاست ، قرآنی حکومت اور اسلامی معیشت کے تصورات کو قبول کرتی ہے ، لہذا تمھارے ہی جمہوری اصول کی رو سے ان خطوں کے رہنے والوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی

اجتماعی زندگی کو ان ہی تصورات کے مطابق ڈھالیں ! (لکم دینکم ولی دین)

کیا یہ نعرہ جنگ تھا ؟ تنگ نظری تھی ؟ ہند کی بد خواہی تھی ؟ فرقہ پرستی تھی ؟

یقیناً نہیں ، یہ پیام امن تھا ! فراخ حوصلگی تھی ! برصغیر کی خیر خواہی تھی ؟ انسانیت دوستی تھی ؟

ایک پیچیدگی | ہندوستان کے ان دو گوشوں میں مسلمانوں کی اکثریت اقبال کے لیے ایک نقطۂ کامیابی (Point of Vantage) تھا ۔ لیکن یہیں ان کو ایک پیچیدگی کا بھی سامنا کرنا پڑا ۔ اس پیچیدگی کے دو پہلو تھے ۔ ایک تو یہ کہ اقبال نے ۱۹۰۸ع کے بعد سے لگا تار وطنیت کی مخالفت کی تھی ، اب انھوں نے اسلامی ہند کی یہ تجویز پیش کی تھی ۔ بادی النظر میں اس پر وطنیت کا دھوکا ہو سکتا تھا ۔ یہ خیال کیا جا سکتا تھا کہ اقبال نے جب ہندوستان کے شمال مغربی و شمال مشرقی گوشوں کے رہنے والوں کی اکثریت کو علیحدہ قوم قرار دیا ——— اور ان کے لیے حق خود ارادیت (Right of Self determination) کا ادعا کیا ——— تو گویا وہ ان خطوں کو اس قوم کا وطن (Homeland) بنانا چاہتا تھا ، اس طرح پھر پھرا کو اقبال نے عملی دنیا میں نظریہ وطنیت کو قبول کر لیا ! لیکن یہ خیال سطح بینی کا نتیجہ ہے اگر اقبال نے عملی سیاسیات کی بھول بھلیوں میں پھنس کر نظریہ وطنیت کو قبول کر لیا ہوتا تو وہ شمال مغربی ہند اور بنگال کے تمام باشندوں کو بلا امتیاز مذہب و ملت ایک قوم قرار دیتا لیکن اس نے ان خطوں کے صرف مسلمانوں ہی کو قوم قرار دیا[۳۹] ! ——— گویا یہاں بھی قومیت کا شیزادہ وطن نہیں بلکہ اسلام ہے ۔ پھر اس سلسلے میں انھوں نے اتنی احتیاط برتی کہ اپنی کسی تقریر یا تحریر میں ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی گوشوں کو قومی وطن (Home Land) قرار نہیں دیا ! اور واقعہ یہ ہے کہ اقبال کے نقطہ نظر سے یہ سرزمین مسلمانوں کا قومی وطن

۳۹- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ۔ ناشر شیخ محمد اشرف ۔ لاہور ۔ مطبوعہ ۱۹۴۳ع - ص ۲۲

نہیں بلکہ محض ایک طرح کا "مرکزِ محسوس" یا ایک ایسا میدانِ عمل ہے، جہاں مسلمان آزادی کے ساتھ اسلامی تصور حیات کو عملاً متشکل و متمثل کر سکتے ہیں ! !——

اقبال اور اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کا مسئلہ ، اس پیچیدگی کا دوسرا پہلو یہ تھا کہ ان دو گوشوں کے علاوہ مابقی ہندوستان میں مسلمان اقلیت میں تھے اقبال کی اس تجویز نے مسلم اکثریت کے صوبوں کی گتھی کو سلجھا دیا تھا لیکن مسلم اقلیت کو ان ہی اسلامی تصورات کے ساتھ زندہ رہنے کا کوئی سامان فراہم نہیں کیا تھا ۔ اقبال کے سیاسی افکار کو بحیثیت مجموعی سامنے رکھنے اور ان پر غور و فکر کرنے کے بعد ، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں ہند کی مسلم اقلیت کے مسئلہ کو حل کرنے کی تین تجویزیں تھیں ۔

۱۔ ایک تجویز تو یہ تھی کہ اکثریتی صوبوں کے مسائل میں اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو عملاً شامل نہ کیا جائے ۔ بالفاظ دیگر عملی سیاسیات میں اکثریتی صوبوں اور اقلیتی صوبوں کے مسائل کو ایک دوسرے سے علیحدہ رکھا جائے ۔ اکثریتی صوبوں کے لیے جو تحریک چلائی جائے اس کی اخلاقی تائید ہندوستان کے سب ہی مسلمان کریں لیکن عملاً اس میں اقلیتی صوبوں کے مسلمان حصہ نہ لیں ۔ اسی طرح اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے لیے جو تحریک شروع کی جائے اکثریتی صوبوں کے مسلمان اس کی اخلاقی تائید کرنے کے باوجود اس میں عملاً شریک نہ ہوں ۔ یہ خیال کہیں واضح طور پر اور کہیں اشارتاً ان کے بعض خطوط میں ملتا ہے ۔

چنانچہ مسلم اکثریتی صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق کی تجویز پیش کرتے ہوئے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کے خط میں وہ مسٹر جناح کو لکھتے ہیں ۔

"ذاتی طور پر میں یہ رائے رکھتا ہوں کہ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو فی الحال مسلم اقلیتوں کے صوبوں کو نظر انداز کر دینا پڑے گا ۔ مسلم اقلیت اور مسلم اکثریت کے

صوبوں کا مفاد اسی طریقہ کار کے اختیار کرنے میں مضمر ہے۔"[۴۰]

اسی خط میں علامہ مرحوم مسٹر جناح سے یہ خواہش کرتے ہیں کہ و (مسٹر جناح) تقسیم ہند کی تجویز کا ذکر کم از کم اپنے خطبہ صدارت میں کر دیں - جن الفاظ میں علامہ مرحوم نے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا ہے وہ قابل غور ہیں - فرماتے ہیں -

"میں محسوس کرتا ہوں کہ آپ کو اپنے خطبہ میں کم از کم اس طریقۂ کار (Line of action) کی طرف اشارہ ضرور کر دینا چاہیے جو شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں کو انجام کار لازماً اختیار کرنا ہی پڑے گا۔"[۴۱]

یہاں طریقہ کار سے علامہ کی مراد تجویز پاکستان ہے اور وہ یہ نہیں کہتے کہ اس تجویز کو پورے ہندوستان کے مسلمان اختیار کر لیں بلکہ صاف الفاظ میں یہ خیال ظاہر کرتے ہیں کہ صرف شمال مغربی ہندوستان کے مسلمانوں یا صرف اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کو یہ تجویز انجام کار اختیار کرنی پڑے گی - اسی طرح ایک دوسرے خط میں ، اس تجویز کے سلسلہ میں وہ شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کی ایک علیحدہ کانفرنس بلانے کا خیال ظاہر کرتے ہیں -

الغرض مسٹر جناح کے نام جو خطوط انھوں نے لکھے ہیں ، ان میں جہاں کہیں تجویز پاکستان کا ذکر کیا گیا ہے وہاں وہ خصوصیت کے ساتھ شمال مغربی ہند یا اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا ذکر کرتے ہیں اقبال ایک مفکر و فلسفی تھے اور مفکر و فلسفی عموماً اپنی تجاویز و افکار میں تخصیص سے زیادہ تعمیم ہی پیش نظر رکھتے ہیں - پھر اقبال کے تفکر کا رشتہ ایک ایسے نظام فکر سے وابستہ تھا ، جس نے ساری انسانیت کو اپنے دائرے میں گھیر لیا تھا - ان کے ذہن و فکر کی ان بنیادی خصوصیات

۴۰- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح - ناشر شیخ محمد اشرف - لاہور - مطبوعہ ۱۹۴۳ء - ص ۲۲

۴۱- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۲۲

کو سامنے رکھئے اور پھر ان خطوں کو پڑھیئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ تجویز پاکستان کے سلسلہ میں طریقہ کار کا ذکر کرتے ہوئے ، شمال مغربی حلقہ یا اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کے ساتھ اقبال کی تخصیص ، معنویت سے خالی نہ تھی ۔

بہرحال مذکورہ بالا خطوط میں ان کے ذہن کو بین السطور پڑھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا شاید غلط نہ ہو کہ وہ مسلم اکثریت کے صوبوں کی تحریک میں مسلم اقلیت کے صوبوں کو عملاً شریک کرنا نہیں چاہتے تھے ، یہ تجویز تو صرف طریقہ کار یا پالیسی سے متعلق تھی ۔ لیکن اصل سوال یہ ہے کہ مسلم اقلیتی صوبوں کے مسئلے کا حل ان کے ذہن میں کیا تھا ؟ اکثریتی صوبوں کے لئے تو انھوں نے ایک علیحدہ وفاق یا پاکستان کی تجویز پیش کی تھی ۔ یہ اکثریتی صوبوں کی منزلِ مقصود تھی ۔ لیکن اقلیتی صوبوں کی منزلِ مقصود اقبال کی نظر میں کیا تھی ؟

۲۔ علامہ اقبال نے اسلامی ہند یا پاکستان کا جو تصور پیش کیا تھا ، وہ دراصل اس بنیادی نقطہ نظر سے پیدا ہوا تھا کہ اسلامی قومیت اور وطنی قومیت میں تضاد باہمی ہے ۔ عملاً یہ تضاد وہاں نمایاں ہو جاتا ہے ، جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، لیکن جہاں مسلمان اکثریت میں ہیں وہاں وطنی قومیت اور اسلامی قومیت میں عملاً کوئی تصادم برپا نہیں ہوتا بلکہ اسلامی قومیت و وطنی قومیت میں ہم آہنگی پیدا ہو جاتی ہے ۔ اقبال اقبال نے یہ دیکھا کہ ہندوستان میں بحیثیت مجموعی مسلمان اقلیت میں ہیں اور اقلیت میں ہونے کی وجہ سے اسلامی قومیت اور ہندوستانی قومیت میں عملاً تصادم ہو رہا ہے لیکن جب ذرا انھوں نے نظر غائر ڈالی تو انھیں معلوم ہوا کہ ہندوستان میں مسلمان ہر جگہ اقلیت میں نہیں ہیں بلکہ کم از کم دو خطوں میں ان کی اکثریت ہے ، اس لئے اگر ان دو خطوں کو کل ہند وفاق کا ایک جزو بنانے سے احتراز کیا جائے اور ان کا ایک علیحدہ وفاق بنا دیا جائے ، تو اسلامی قومیت و وطنی قومیت کا یہ تصادم کم از کم ان خطوں کی حد تک عملی طور پر رفع ہو جاتا ہے ، لیکن اقلیتی صوبوں میں یہ تصادم بہرحال ہو کر رہے گا اور اس تصادم کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ان خطوں کے مسلمان ہندوستانی قومیت میں جذب ہو جائیں گے ۔

اقبال کی نظر میں اس مشکل کو حل کرنے کی صورت یہ تھی کہ اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کو تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری دلائی جائے بالفاظ دیگر اقبال کے ذہن میں "اسلامی ہند یعنی پاکستان" اکثریتی صوبوں کے مسلمانوں کا نصب العین تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

"اس قومیت (وطنی قومیت) کا اسلام سے اس وقت تصادم ہوتا ہے، جبکہ وہ ایک سیاسی تصور بن جاتی ہے اور اتحادِ انسانی کے بنیادی اصول ہونے کا دعویٰ کرتی ہے، اور یہ مطالبہ کرتی ہے کہ اسلام شخصی عقیدے کے پس منظر میں چلا جائے اور قومی زندگی میں ایک حیات بخش عنصر کی حیثیت سے باقی نہ رہے۔ ترکی، ایران، مصر اور دیگر اسلامی ممالک میں قومیت کا مسئلہ پیدا ہی نہیں ہو سکتا۔ ان ممالک میں مسلمانوں کی زبردست اکثریت ہے اور یہاں کی اقلیتیں جیسے یہودی، عیسائی اور زرتشتی اسلامی قانون کی رو سے یا تو اہلِ کتاب ہیں یا اہلِ کتاب سے مشابہ جن سے معاشی و ازدواجی تعلقات قائم کرنا، اسلامی قانون کے لحاظ سے بالکل جائز ہے۔ قومیت کا مسئلہ مسلمانوں کے لئے صرف اُن ممالک میں پیدا ہوتا ہے، جہاں وہ اقلیت میں ہیں اور جہاں قومیت کا یہ تقاضا ہو کہ وہ اپنی ہستی کو مٹا دیں۔ جن ممالک میں مسلمان اکثریت میں ہیں، اسلام قومیت سے ہم آہنگی پیدا کر لیتا ہے کیونکہ یہاں اسلام اور قومیت عملاً ایک ہی چیز ہے جن ممالک میں مسلمان اقلیت میں ہیں، مسلمانوں کی یہ کوشش کہ ایک تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری حاصل کی جائے، حق بجانب ہوگی۳۲"

گویا تہذیبی وحدت کی حیثیت سے خود مختاری کا حصول یہ دوسری تجویز تھی جس کے ذریعہ علامہ اقبال مسلم اقلیتی صوبوں کا مسئلہ حل کرنا چاہتے تھے۔

۳۲۔ مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ حیدر آباد دکن ص ۱۷۶

۳۔ ہجرت کو اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے لئے ان کی تیسری تجویز قرار دیا جا سکتا ہے ۔ اگرچہ علامہ مرحوم کی کسی تحریر میں اس تجویز کا واضح طور پر ذکر موجود نہیں ہے تاہم ان کے سیاسی افکار کے پس منظر میں ان کے بعض اشعار سے اس قسم کی ہجرت کے متعلق ہمیں کچھ اشارے مل جاتے ہیں ۔ وہ فرماتے ہیں ۔

ہو قیدِ مقامی تو نتیجہ ہے تباہی
رہ بحر میں آزادِ وطن صورتِ ماہی

ہے ترکِ وطن سنتِ محبوبِ الٰہی
دے تو بھی نبوت کی صداقت پہ گواہی

وطنیت کے خلاف انہوں نے ہجرتِ نبوی کے واقعہ سے استدلال کیا ہے اور ان کے اس استدلال سے ہم یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ جب ہندوستان میں ایک اسلامی ہند کی تشکیل ہو جائے تو غیر اسلامی ہند کے مسلمان اس دارالاسلام کی طرف ہجرت کریں ۔

حوالہ جات باب ۹

۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۵
۲۔ مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۸۲
۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳۸
۴۔ مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۹۳
۵۔ ایضاً ص ۱۹۴ — ۶۔ ایضاً ص ۷۰
۷۔ ایضاً ص ۱۷۴ — ۸۔ ایضاً ص ۸۴
۹۔ ایضاً ص ۸۸ — ۱۰۔ ایضاً ص ۱۹۰
۱۱۔ ایضاً ص ۱۹۲ — ۱۲۔ ایضاً ص ۱۷۶

۱۳- ایضاً ص ۱۸۵
۱۴- مکاتیب اقبال حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ ص ۲۳۲
۱۵- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۵۸
۱۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۵
۱۷- ایضاً ص ۳۰
۱۸- ایضاً ص ۳۱
۱۹- ایضاً ص ۹ و ۱۰
۲۰- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۱۳۳
۲۱- تلاش حق (گاندھی جی کی خود نوشت سوانح عمری) ناشر مکتبہ جامعہ دہلی ص ۳۳۹
۲۲- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۱۳
۲۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳ و ۴
۲۴- ایضاً ص ۱۴
۲۵- مکاتیب اقبال حصہ دوم مرتبہ شیخ عطا اللہ ص ۳۹۳
۲۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۲
۲۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳۰
۲۸- ایضاً ص ۲۱۱
۲۹- ایضاً ص ۵۲
۳۰- ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ اِن اسلام از علامۂ اقبال مطبوعہ لاہور اپریل ۱۹۲۸ع ص ۱۴۷
۳۱- ملفوظات اقبال مرتبہ محمود نظامی ص ۱۷۲
۳۲- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۹۵ و ۱۹۶
۳۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۵۴
۳۴- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ع ص ۱۶
۳۵- ایضاً ص ۱۷
۳۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۲
۳۷- ایضاً ص ۶۰

۳۸۔ ایضاً ص ۱۵
۳۹۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۲۲
۴۰۔ ایضاً ص ۲۳
۴۱۔ ایضاً ص ۲۴
۴۲۔ مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۷۶

باب ۱۰

اقبال کی فکرِ سیاسی کا شاہکار

آزاد مقتدر مملکت یا خود مختار ریاست | " ہندوستانی معاشرہ کی اکائیاں یورپی ممالک کی مانند علاقہ واری نہیں ہیں - ہندوستان ایسے انسانی گروہوں کا ایک براعظم ہے جو مختلف نسلوں سے تعلق رکھتے ہیں ، مختلف زبانیں بولتے ہیں ، اور مختلف مذاہب کے پیرو ہیں - ان کے طرز عمل کو متعین کرنے والا عنصر مشترک نسلی شعور نہیں ہے - ہندو بھی کوئی ہم آہنگ گروہ نہیں ہے - فرقہ وارانہ گروہوں کے وجود کو تسلیم کئے بغیر ، ہندوستان پر یورپی جمہوریت کے اصول کو منطبق نہیں کیا جا سکتا - اس لئے ہندوستان کے اندر ایک اسلامی ہند کی تشکیل کا مسلم مطالبہ بالکل حق بجانب ہے - میرے خیال میں آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی قرارداد سے اسی ہم آہنگ " کل " کے شریفانہ نصب العین کا اظہار ہوتا ہے ، جو مختلف اکائیوں کی جداگانہ ہستی کو فنا کرنے کی بجائے ان کو اس امر کے مواقع عطاء کرتی ہے کہ وہ ان امکانات کو جو ان کے اندر مضمر ہیں ، روبعمل لا سکیں - اور مجھے شبہ نہیں ہے کہ یہ اجتماع ان مسلم مطالبات کی جو اس قرارداد میں درج ہیں ، پر زور تائید کرے گا ، شخصی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں - میری یہ خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت (State) بنا دی جائے -

برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود مختاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر ، مجھے تو یہی نظر آتا ہے ، کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ (Consolidated) مسلم مملکت کی تشکیل مسلمانوں ، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لئے بالآخر مقدر ہو چکی ہے[1] "

یہ ہے وہ تجویز جو ہندوستان کے مفکر سیاستدان علامہ اقبال نے بتاریخ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء اپنے خطبۂ صدارت مسلم لیگ منعقدہ الہ آباد میں ہند کے دستوری مسئلہ کے حل اور اسلامی ہند کی تشکیل کے متعلق پیش کی تھی ۔ عام طور پر اس کو تقسیم ہند اور قیام پاکستان کی تجویز سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ علامہ مرحوم نے اِس تجویز کے ذریعہ تقسیم کا تصور پیش نہیں کیا ۔ ان ہی میں سے قاضی عبدالحمید صاحب ایم ۔ اے ۔ پی ۔ ایچ ڈی بھی ہیں ، جنھوں نے ایک بہت ہی دلچسپ مضمون رسالہ اردو کے اقبال نمبر میں " اقبال کی شخصیت اور اِس کا پیغام " کے عنوان سے لکھا ہے ۔ قاضی صاحب نے اس مضمون میں یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ علامہ اقبال کی یہ تجویز دراصل تقسیم ہند یا اسلامی ہند کی تشکیل کے تصور پر مبنی نہ تھی ۔ قاضی صاحب کا یہ مضمون اِس لئے اہم ہے کہ انھوں نے اِس خیال کو اپنے ذاتی خیال کی حیثیت سے پیش نہیں کیا ، بلکہ علامہ اقبال ہی کی زبانی اِس کی توضیح و توجیہہ پیش کی ہے ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

" میرے دل میں علامہ مرحوم کی طرف سے یہ کھٹک تھی کہ یہ شاعرِ انقلاب و آزادی کس طرح بعض مرتبہ ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے ، جس سے ہندوستان کی آزادی کی راہ میں بجائے مدد پہنچنے کے اور مشکل پیدا ہو جاتی ہے ۔ چنانچہ سنہ ۱۹۳۰ء میں یورپ کو روانگی سے قبل علامہ نے لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب ، سندھ اور بلوچستان وغیرہ کو

۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء ص ۱۲ ۔

ملا کر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہئے ۔ اِس پر اخبارات میں بڑی دھوم مچی ، اور اقبال پر الزامات عائد کئے گئے کہ وہ ہندوستانی قومیت کو برباد کرنا چاہتے ہیں ۔ میں نے اِس کے متعلق ان سے دریافت کیا تو فرمانے لگے کہ میں ضرور چاہتا ہوں کہ ہندوستان میں اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے ایک مرکز ہو اور یہ مرکز ظاہر ہے کہ صرف شمالی ہند کا صوبہ ہو سکتا ہے ، لیکن اس سے میرا یہ مفہوم نہیں کہ وہ ہندوستان کا ایک جزو ہو کر نہ رہے ۔ میں تو ایک صحیح وفاق کا حد درجہ قائل ہوں ۔ میں تو چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اِس ملک کی آزادی کے ضامن ہوں ۔ اگر باہر سے لوگ اِس ملک پر حملہ کریں گے تو ہم اِس ملک کی حفاظت کریں گے ، ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے ۔ ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں نے باہر کے حملوں کو روکا ہے ۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسلمان شمالی ہند میں خود کو آزاد محسوس کریں تو خود کی آزادی کی آئندہ کیوں نہ حفاظت کریں ۔ میں نے دو تین صوبوں کو ملا کر جو ایک صوبہ بنانے کی تجویز پیش کی ہے تو اِس سے میرا مقصود یہ تھا کہ ہندو اور مسلمانوں میں جداگانہ اور مخلوط انتخاب کے مسئلے پر اتحاد ہو جائے ۔ ہندو ، پنجاب میں مخلوط انتخاب رائج کرنا چاہتے ہیں ۔ مسلمان اِس کے اِس بناء پر مخالف ہیں کہ انھیں ڈر ہے کہ کہیں ان کی تھوڑی سی اکثریت اقلیت میں تبدیل نہ ہو جائے ، اِس کا راز صرف یہ ہے کہ یہ چھوٹے چھوٹے صوبے پنجاب کے ساتھ ملحق کر دئے جائیں تو اِس طرح مسلمانوں کی آبادی اِس صوبہ میں ۶۰ فیصدی ہو جائے گی ، اور مسلمانوں کے دل سے یہ ڈر نکل جائے گا کہ وہ کبھی بھی اِس صوبہ میں اقلیت میں تبدیل کر دئے جائیں گے ۔ اِس صورت میں با آسانی مخلوط انتخاب رائج کر دیا جا سکے گا[۲] "

۲۔ رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۵ و ۱۹۶ ۔

قاضی صاحب کی ملاقات ، جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ، علامہ مرحوم سے جہاز پر ہوئی ، جب کہ ڈاکٹر صاحب گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لندن جا رہے تھے[۳] ۔ دوران سفر وہ ڈاکٹر صاحب سے جہاز پر ملتے جلتے رہے ، اور انہی ملاقاتوں میں انھوں نے تقسیم ہند کے مسئلہ سے متعلق بھی ڈاکٹر صاحب سے گفتگو کی اور ڈاکٹر صاحب نے اِس سلسلے میں جو توضیحات پیش کیں ان کو اپنے الفاظ میں ، ان ملاقاتوں کے کئی سال بعد اِس مضمون میں قلمبند کیا ۔ قاضی صاحب کا یہ مضمون اپنی بعض خصوصیات کے اعتبار سے بہت قابلِ قدر ہے ، لیکن جہاں تک علامہ اقبال کی زندگی کے بعض تاریخی واقعات اور ان کے بعض خیالات کا تعلق ہے ، ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قاضی صاحب نے ان کے اظہار میں قدرے لاپروابی سے کام لیا ہے ، مثلاً قاضی صاحب فرماتے ہیں ۔

> " مجھے خیال بھی نہ تھا کہ علامہ اقبال مرحوم کے ساتھ مجھے کچھ دن گزارنے اور ان کی زبانی ان کے خیالات سننے کا موقع ملے گا ۔ لیکن قسمت کی یاوری دیکھئے کہ علامہ اقبال جس وقت دوسری گول میز کانفرنس سنہ ۱۹۳۳ء میں مسلمانانِ ہند کے وفد کے صدر کی حیثیت سے لندن جا رہے تھے تو میرا ان کا جہاز پر ساتھ ہو گیا[۴] "

اِس مختصر سے اقتباس میں دو فاش غلطیاں ہیں ، ایک تو یہ کہ دوسری گول میز کانفرنس سنہ ۱۹۳۳ء میں منعقد ہوئی ، حالانکہ دوسری گول میز کانفرنس ۷ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ء سے شروع ہوئی اور یکم دسمبر سنہ ۱۹۳۱ء کو ختم ہو گئی[۵] ۔

علامہ اقبال نے یقیناً دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی ، لیکن یہ کانفرنس سنہ ۱۹۳۳ء میں منعقد نہیں ہوئی ، اِس لئے ان کا یہ سفر سنہ

۳۔ ایضاً ص ۱۹۳ ۔
۴۔ ایضاً ص ۱۹۳ ۔
۵۔ رپورٹ گول میز کانفرنس ۔

۱۹۳۳ء میں نہیں ہو سکتا بلکہ سنہ ۱۹۳۱ء ہی میں ہونا چاہئے ۔ لیکن اگر یہ سمجھا جائے کہ قاضی صاحب کو غلط فہمی ہوئی اور انھوں نے تیسری گول میز کانفرنس کی بجائے دوسری گول میز کانفرنس لکھ دیا تو یہ بھی درست نہیں ، اس لیے کہ تیسری گول میز کانفرنس کا افتتاح ۱۷ نومبر سنہ ۱۹۳۲ء کو ہوا ۔ اور بتاریخ ۲۴ دسمبر سنہ ۱۹۳۲ء اس کا اختتام ہوا ۔ گویا یہ سفر جس میں " قاضی صاحب کو علامہ اقبال سے ملاقات میسر آ گئی تھی ، اگر تیسری گول میز کانفرنس کے سلسلے میں تھا ، تو بھی سنہ ۱۹۳۳ء غلط ہے ۔ دوسری فاش غلطی ان کے اس بیان میں یہ ہے کہ وہ علامہ اقبال کو " مسلمانانِ ہند کے وفد کا صدر " بناتے ہیں ، حالانکہ دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں علامہ مرحوم نے صرف ایک رکن کی حیثیت سے شرکت کی ہے ۔

اِسی قسم کی غلطیاں اس مضمون کے اُس اقتباس میں بھی موجود ہیں ، جو ہم قبل ازیں درج کر چکے ہیں ۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں ۔

" سنہ ۱۹۳۳ء میں یورپ کو روانگی سے قبل علامہ نے لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہئے "

معلوم نہیں اس سے قاضی صاحب کا مفہوم کیا ہے ؟ آیا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۳ء میں علامہ یورپ روانہ ہوئے یا وہ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ سنہ ۱۹۳۳ء میں انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھا تھا ۔ بہرحال دونوں صورتوں میں وہ ایک غلط سنہ کا ذکر کر رہے ہیں ۔ علامہ اقبال سنہ ۱۹۳۱ء میں یا دوسری مرتبہ سنہ ۱۹۳۲ء میں یورپ روانہ ہوئے اور بتاریخ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء مسلم لیگ اجلاس میں انھوں نے خطبۂ صدارت پڑھا تھا ۔ پھر قاضی صاحب یہ بھی فرماتے ہیں کہ خطبہ علامہ مرحوم نے لکھنؤ میں پڑھا تھا ، حالانکہ مسلم لیگ کا یہ اجلاس جس میں علامہ اقبال نے زیر بحث تجویز پیش کی تھی ، لکھنو میں نہیں الہ آباد میں منعقد ہوا تھا !

ان فاش غلطیوں کے باعث اِس مضمون میں ، جو واقعات بیان کئے

گئے ہیں ، ان کی قدر و قیمت بہت گھٹ جاتی ہے اور یہ امر مشتبہ ہو جاتا ہے کہ دوران سفر علامہ اقبال کی زبانی جو باتیں قاضی صاحب نے سنیں ، وہ انھیں پوری طرح یاد بھی رہی ہوں گی اور علامہ مرحوم نے اپنے خیالات کی جو تشریح و توضیح ان کے سامنے فرمائی ، اس کو انھوں نے ذہن نشین بھی رکھا ہو گا اور من و عن اپنے مضمون میں دہرایا بھی ہوگا ؟ تاریخی غلطیوں سے قطع نظر قاضی صاحب نے جس انداز سے علامہ مرحوم کے مطالب کو بیان کرنے اور دہرانے کی کوشش کی وہ تمام تر ناقص ہے - وہ فرماتے ہیں -

" علامہ نے لکھنؤ کے خطبۂ صدارت میں فرمایا تھا کہ ہم کو پنجاب ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک اسلامی صوبہ بنا لینا چاہیے "

ہم نے اوپر علامہ مرحوم کے خطبۂ صدارت کا وہ پورا اقتباس دیا ہے ، جس میں یہ تجویز پیش کی گئی تھی - کیا اس میں کہیں "اسلامی صوبہ" بنا لینے کی تجویز کا ذکر ہے ؟ اور اگر فی الحقیقت علامہ مرحوم نے اسلامی صوبہ بنا لینے کی تجویز پیش کی تھی تو پھر بقول قاضی صاحب " اس پر اخبارات میں بڑی دھوم کیوں مچی " اور اقبال پر یہ الزامات کیوں عائد کئے گئے کہ " وہ ہندوستانی قومیت برباد کرنا چاہتے ہیں " ؟ کیا مختلف چھوٹے صوبوں کو ملا کر ایک صوبہ بنانے کی تجویز اتنی انقلاب آفریں تھی ؟ پھر اگر علامہ مرحوم نے اپنے خطبۂ صدارت میں صرف " ایک اسلامی صوبہ" بنانے کی تجویز پیش کی تھی تو خود قاضی صاحب کے دل میں علامہ مرحوم کی طرف سے یہ " کھٹک " کیونکر پیدا ہو گئی تھی کہ یہ " شاعر انقلاب و آزادی کس طرح بعض مرتبہ ایسے خیالات کا اظہار کرتا ہے ، جس سے ہندوستان کی آزادی کی راہ میں بجائے مدد پہنچنے کے اور مشکلیں پیدا ہو جاتی ہیں " - " حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے " اسلامی صوبہ " نہیں بلکہ " اسلامی اسٹیٹ " بنانے کی تجویز پیش کی تھی - اور یہ بات ہر اس شخص پر واضح ہے ، جس نے خطبۂ مذکور کو پڑھنے کی زحمت گوارا کی ہو -

قاضی صاحب نے اپنے الفاظ میں علامہ مرحوم کی جو توضیحات پیش

کی ہیں ، ان میں خود تضاد پایا جاتا ہے اور کوئی شخص جس نے اقبال کی تقریروں و تحریروں کو پڑھا ہو ، یہ باور نہیں کر سکتا کہ وہ ایک مختصر سی توضیح میں بھی متضاد باتیں کہنے لگیں گے ، مثلاً قاضی صاحب لکھتے ہیں کہ علامہ اقبال نے فرمایا ۔

" میں ضرور چاہتا ہوں کہ اسلامی تہذیب و تمدن کے لئے ایک مرکز ہو اور یہ مرکز ظاہر ہے کہ صرف شمالی ہند کا یہ صوبہ ہو سکتا ہے ، لیکن اس سے میرا یہ مفہوم نہیں ہے کہ وہ ہندوستان کا ایک جزو ہو کر نہ رہے "

اگر یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال اسلام کو ایک ایسا دین سمجھتے تھے ، جس کا ایک مستقل علیحدہ معاشی ، سیاسی اور تمدنی نظام ہے ، اور اسی اسلام کے لئے ہندوستان میں وہ ایک مرکز بنانا چاہتے تھے تو وہ مرکز ہندوستان کا جزو کیسے بن سکتا تھا ؟ اور آگے چلئے ، قاضی صاحب علامہ اقبال کے مفہوم کو اپنے الفاظ میں اس طرح دہراتے ہیں ۔

" میں تو چاہتا ہوں کہ ہندوستان کے مسلمان اس ملک کی آزادی کے ضامن ہوں ، اگر باہر سے لوگ اس ملک پر حملہ کریں گے تو ہم اس ملک کی حفاظت کریں گے ، ہمیشہ سے ایسا ہی ہوتا چلا آیا ہے ۔ ہمیشہ ہندوستان کے مسلمانوں نے باہر کے حملوں کو روکا ہے ، اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر مسلمان شمالی ہند میں خود کو آزاد محسوس کریں تو خود کی آزادی کی آئندہ کیوں نہ حفاظت کریں "

لیکن یہ شمالی ہند میں مسلمانوں کی آزادی کیسی جبکہ یہ خطہ اس ہندوستان کا جزو ہو کر رہے گا جہاں ہندو اکثریت کی حکومت ہو گی ؟

بہرحال ان تمام فاش غلطیوں اور متضاد بیانیوں کے پیش نظر یہ امر محتاج نظر ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنی اس تجویز کے متعلق جو توضیح و تشریح کی تھی ، اس کو قاضی صاحب نے صحیح انداز میں پانچ چھ سال بعد ادا کیا ۔

ایک اور گروہ بھی ہے ، جو ڈاکٹر صاحب کی اس تجویز میں تقسیم ہند کے تصور کو مضمر نہیں دیکھتا ۔ اس گروہ کی دلیل یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے اپنے اسی خطبۂ صدارت میں اس مجوزہ اسلامی اسٹیٹ کو خود مختار ریاست (Autonomous State) کہا ہے ۔ چنانچہ اسلامی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کرنے کے بعد اس کی نوعیت کی تشریح کرتے ہوئے ، وہ فرماتے ہیں ۔

" ہندوؤں کو اس امر سے نہیں ڈرنا چاہئے کہ خود مختار مسلم ریاستوں کی تشکیل کے معنی یہ ہوں گے کہ ان ریاستوں میں ایک قسم کا مذہبی راج ہو گا[۶] "

اس سلسلے میں ذرا آگے چل کر ، وہ پھر کہتے ہیں ۔

" لہذا یہ واضح ہے کہ ہندوستان کی آب و ہوا ، نسلوں ، زبانوں عقیدوں اور معاشرتی نظاموں کے لامحدود اختلافات کو پیش نظر رکھتے ہوئے خود مختار ریاستوں (Autonomous States) کی تشکیل ، جن کی بنیاد زبان ، نسل ، تاریخ ، مذہب کے اتحاد اور معاشی مفادات کی یکسانیت پر رکھی گئی ہو ، وہ واحد ممکن العمل طریقہ ہے ، جس سے ہندوستان میں ایک مستحکم دستوری ہئیت حاصل ہو سکتی ہے[۷] "

اس گروہ کا کہنا یہ ہے کہ علامہ مرحوم نے جس اسلامی ریاست کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ، وہ مقتدر (Sovereign) نہیں بلکہ خود مختار (Autonomous State) تھی اور جب وہ خود اس ریاست کو خود مختار ریاست (Autonomous State) کہہ رہے ہیں ، تو ان کے ذہن میں وفاق ہند کا تصور موجود تھا کیوں کہ خود مختار ریاست لازماً وفاق کا جزو ہوتی ہے ۔ وفاق اور خود مختاری لازم و ملزوم ہیں ۔ گویا اقبال کے نقطۂ

۶۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۴ ۔

۷۔ ایضاً ص ۱۵ ۔

نظر سے شمال مغربی ہند کی یہ خود مختار مسلم ریاست ایک آزاد مملکت نہ ہوتی ، بلکہ دیگر خود مختار ریاستوں کی مانند وفاقِ ہند کا ایک جزو ہوتی ۔

یہ استدلال قوی معلوم ہوتا ہے ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ علامہ مرحوم نے اپنی اس تجویز کے بعض پہلوؤں کی تشریح کرتے ہوئے دو جگہ خود مختار ریاست (Autonomous State) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ ان سے بظاہر یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ شاید علامہ مرحوم کے ذہن میں وفاق کا تصور موجود تھا ۔ اصل میں اس شبہ کے پیدا ہونے کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ بعض ممالک میں انگریزی لفظ اسٹیٹ (State) دو مختلف معنی میں استعمال ہوتا ہے ۔ مقتدر (Sovereign) مملکت کو بھی اسٹیٹ (State) ہی کہا جاتا ہے اور ایسی ریاست کو بھی اسٹیٹ (State) کہا جاتا ہے ۔ جو صرف اپنے اندرونی معاملات (Internal Affairs) میں آزاد ہو اور بیرونی معاملات (External Affairs) میں کسی دوسری طاقت کے زیر اثر یا محکوم ہو ، مثلاً ممالکِ متحدہ امریکہ ایک وفاقی مملکت ہے اور اس کے پچاس اجزاء ہیں اور یہ اجزاء مقتدر (Sovereign) نہیں بلکہ خود مختار (Autonomous) ہیں ۔ لیکن خود متحدہ ممالک امریکہ مقتدر (Sovereign) مملکت ہے ۔ انگریزی زبان میں اس مقتدر مملکت کو بھی اسٹیٹ کہا جاتا ہے اور اس کے خود مختار اجزاء کے لئے لفظ اسٹیٹ استعمال کیا جاتا ہے لیکن اُردو زبان میں ان دو قسم کی سیاسی ہیئتوں کے لئے دو مختلف اصلاحات وضع کی گئی ہیں ۔ پہلی کو ہم مملکت کہتے ہیں اور دوسری کو ریاست ۔ لیکن چونکہ انگریزی زبان میں لفظ اسٹیٹ دونوں معنی میں استعمال ہوتا ہے ، اس لئے علامہ مرحوم کی اس تجویز سے متعلق بھی یہ شبہ پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے جس مسلم اسٹیٹ کا ذکر کیا ہے وہ مقتدر نہیں بلکہ صرف خود مختار ہے ، کیونکہ جہاں انہوں نے اپنی اس تجویز کا ذکر کیا ہے ، وہاں صرف لفظ اسٹیٹ ہی استعمال کیا ہے ۔ مقتدر مملکت (Sovereign State) یا خود مختار ریاست (Autonomous State) کے الفاظ استعمال نہیں کئے ہیں ۔ البتہ اس تجویز سے متعلق بعض امور کی تشریح کرتے ہوئے انہوں نے خود مختار ریاست (Autonomous State) کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے غور طلب امر یہ ہے کہ جن الفاظ میں

انھوں نے اپنی اس تجویز کو پیش کیا ہے ۔ وہاں خود مختار ریاست (Autonomous State) کی اصطلاح استعمال نہیں کی ہے ، بلکہ صرف لفظ اسٹیٹ (State) استعمال کیا ہے ، حالانکہ اگر ان کے پیش نظر مقتدر(Sovereign) نہیں بلکہ صرف خود مختار (Autonomous State) ریاست کی تشکیل ہی تھی تو وہ وہیں خود مختار (Autonomous State) کے الفاظ استعمال کر کے اس کی تشریح کر سکتے تھے لیکن انھوں نے ایسا نہیں کیا ۔ پھر جہاں انھوں نے اس تجویز کو پیش کیا ہے ، وہیں یہ الفاظ بھی استعمال کئے ہیں ۔

" برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود اختیاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر ، مجھے تو یہی نظر آتا ہے کہ شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم مملکت (State) کی تشکیل ، مسلمانوں ، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لئے بالآخر مقدر ہو چکی ہے ۔"

" برطانوی سلطنت کے اندر حکومت خود اختیاری ملے یا برطانوی سلطنت سے باہر " ۔ یہ الفاظ قابل غور ہیں ۔ اگر اقبال کے ذہن میں یہ مسلم مملکت ایک مقتدر مملکت نہ ہوتی تو وہ " برطانوی سلطنت سے باہر " کے الفاظ استعمال نہ کرتے ۔ اگر یہ مسلم مملکت اسلامی سلطنت سے باہر رہ کر تشکیل دی جا سکتی ہے ، تو پھر وہ ایک خود مختار ریاست نہیں بلکہ ایک " مقتدر مملکت" ہی ہوگی ۔

دوسرا غور طلب امر یہ ہے کہ ایسی مملکت کے قیام کی تجویز وہ کیوں پیش کر رہے تھے ۔ وہ خود فرماتے ہیں ۔

" لہذا میں ہندوستان اور اسلام کے بہترین مفادات کے پیش نظر ایک مستحکم و متحدہ مسلم مملکت کے قیام کا مطالبہ کر رہا ہوں ، اس سے اندرونی توازن قوت کی بدولت ہندوستان میں تحفظ اور امن پیدا ہو جائے گا ، اور اسلام کے لئے ایک ایسا موقع حاصل ہوگا کہ وہ اس ٹھپہ سے نجات حاصل کرے ، جو عرب شہنشاہیت نے اس پر لگا دیا ہے ، اور اپنے قانون ، اپنی تعلیم اور اپنی ثقافت کو حرکت میں لائے اور انھیں اپنے اصلی مزاج اور عنصر حاضر

کی روح سے قریب تر کر دے[۸]۔"

اس بیان سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ان کے پیش نظر دو مقاصد تھے ایک تو یہ کہ مسلم مملکت کے قیام سے ہند میں "توازنِ قوت" پیدا ہو جائے گا ، جس کی وجہ سے موجودہ ہند امنی دور ہو جائے گی اور دوسرے یہ کہ اس مملکت میں اسلامی قانون ، اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات رائج ہوں گے - سوال یہ ہے کہ اگر اس تجویز سے اُن کی مراد یہ تھی کہ شمال مغربی ہند میں محض ایک اسلامی صوبہ یا ایک خود مختار مسلم ریاست بنا دی جائے تو کیا اس سے ہندوستان میں "توازنِ قوت" پیدا ہو جاتا تھا ؟

اگر ان کے پیش نظر وفاق ہند کا تصور تھا اور یہ مسلم ریاست اس وفاق کا ایک جزو ہوتی تو پھر "توازنِ قوت" کس طرح پیدا ہوتا ؟ پھر اگر یہ فرض بھی کر لیا جائے کہ "توازن قوت" کی بنیاد پر ہی وفاق ہند بنایا جائے ، تو بھی اس کی شکل کیا ہوتی ؟ ایک طرف تو یہ ایک خود مختار مسلم ریاست ہوتی اور دوسری طرف اس کے مقابلے میں برطانوی ہند کی دیگر سات خود مختار ریاستیں ہوتیں ، یعنی سات اور ایک کا تناسب - پھر دیسی ریاستوں کو بھی اگر اس وفاق میں شریک کر لیا جاتا تو یہ تناسب اور بھی گھٹ جاتا ، کیا یہ "توازنِ قوت" ہوتا ؟

علامہ مرحوم نے اس ریاست کی تشکیل کا دوسرا مقصد یہ بتلایا ہے کہ یہاں اسلامی قانون ، اسلامی ثقافت اور اسلامی تعلیمات کا نفاذ ہوگا ـــــ یہی نہیں بلکہ ان کو اس انداز میں نافذ کیا جائے گا کہ ایک مرتبہ پھر دنیا اسلامی نظام کا اصلی جلوہ دیکھ سکے ، پھر یہ بھی کہ یہاں اسلامی حکومت کے دامن پر سے عرب شہنشاہیت کے داغ کو دھونے کی کوشش کی جائے گی کیا مسلم ریاست ، وفاقِ ہند کا ایک جزو ہو کر ایسا اقدام کر سکتی تھی ؟ کیا ایسا وفاق ممکن تھا کہ اس کے ایک جزو میں اسلامی حکومت قائم ہو

۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۵

اور دینی قوانین نافذ ہوں اور دیگر اجزاء میں ان کے برعکس لادینی حکومتیں قائم اور دنیوی قوانین نافذ ہوں ؟

تیسرا اور اہم نکتہ جو اس بحث میں دیکھنے کا ہے ، وہ یہ ہے کہ علامہ مرحوم کا مجموعی سیاسی تفکر کیا تھا ؟ ہم بتا چکے ہیں کہ عملی سیاسیات میں انہوں نے قلابازیاں نہیں کھائیں ، اور ان کے سیاسی تفکر میں تضاد و انتشار کی جگہ ایک قسم کی ہم آہنگی و یکسانیت پائی جاتی ہے - ہند کی سیاسیات میں انہوں نے جو حصہ لیا ہے ، اگر اس کا خلاصہ خالص دستوری زبان میں پیش کرنا چاہیں تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہندوستان میں وہ مرکزیت . . . . . (Centralization) کے مخالف اور مرکز گریزی کے پر زور حامی تھے - انہوں نے جداگانہ انتخاب کی پر زور حمایت کی - یہ مرکزیت کی پہلی مخالفت تھی - سائمن کمیشن کے سامنے مکمل صوبہ جاتی خود مختاری کی پر زور تائید کی بلکہ اسی مسئلہ پر لیگ کی معتمدی سے استعفاء دے دیا - یہ بھی مرکزیت کے خلاف ایک کوشش تھی - نہرو رپورٹ میں وحدانی حکومت کا ڈول ڈالا گیا تھا ، علامہ مرحوم نے اس کی مخالفت کی تھی - نہرو رپورٹ کے خلاف آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقد ہوئی ، جس میں واضعین رپورٹ کے تصور وحدانی حکومت کی سخت مخالفت کی گئی اور علامہ اقبال مرحوم اس کانفرنس کے بانیوں میں سے ایک تھے - ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے انہوں نے کل ہند وفاق کی مخالفت کی تھی - وہ فرماتے ہیں -

" میں نے کل ہند مسلم لیگ کے خطبہ میں کل ہند وفاق کے تصور خلاف اپنی آواز بلند کی تھی[۹]-"

۱۹۳۱ء میں انہوں نے دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی اور اس کی اقلیتوں والی کمیٹی کی کارروائی میں حصہ لیا - لیکن وفاق ہیئت کی کمیٹی سے کسی قسم کی دلچسپی کا اظہار نہیں کیا ، بلکہ اس کمیٹی

۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۳۱

کے مسلم مندوبین کو یہ مشورہ دیا کہ وہ اس کمیٹی کی کارروائیوں میں حصہ نہ لیں ۔ جب مسلم مندوبین نے ڈاکٹر صاحب کے مشورے اور اپنے سابقہ فیصلہ کے خلاف اس کمیٹی کے مباحث میں حصہ لیا ، تو انھوں نے سخت احتجاج کیا اور ہندوستان واپس آ کر کل ہند مسلم کانفرنس کے سالانہ اجلاس میں ان مسلم مندوبین کے طرز عمل پر سخت تنقید کی اور کھلے اجلاس میں ان کے رویہ کی مذمت میں ایک قرارداد منظور کروائی ، اور جب فرقہ وارانہ فیصلے کا اعلان ہوا تو انھوں نے اس کے متعلق بیان دیتے ہوئے ایک مرتبہ پھر مکمل صوبجاتی خود مختاری پر زور دیا ۔ چنانچہ انھوں نے کہا ۔

" میں یہاں اس امر کو واضح کر دوں کہ مختلف جماعتوں کو نشستوں کا محض دینا ہی کوئی بڑی نتیجہ خیز بات نہیں ہے ، جو چیز اہم ہے ، وہ یہ ہے کہ اقتدار کا کتنا حصہ ہندوستانی صوبوں کو منتقل کیا جاتا ہے ، اگر حقیقی اقتدار صوبوں کو دیا گیا تو اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ ہندوستان کی اقلیتوں ——— مسلم و غیر مسلم ——— کو ملک میں اپنے سیاسی مؤقف کو بہتر بنانے کا موقعہ ملے گا ۔"[10]

اس کے بعد جب ۱۹۳۲ء میں انھوں نے تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی تو وہاں اپنی اس رائے کا اظہار کیا کہ

" صوبوں کو مکمل خود مختاری دی جائے ، لیکن ہندوستان میں ان کا کوئی مشترکہ مرکز نہ ہو ، بلکہ وہ آزاد ریاستیں (Dominions) ہوں ، جن کا راست تعلق لندن میں وزیر ہند سے ہو ۔"[11]

الغرض گول میز کانفرنسوں کے دوران بھی ، اس طرح وہ مرکز گریز

۱۰- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور، طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ ص ۱۸۵

۱۱- پاکستان مصنفہ ڈاکٹر امبیڈکر ، ص ۳۲۹

رجحانات کا اظہار کرتے رہے - لندن سے واپس آنے کے بعد انھوں نے گول میز کانفرنس کے متعلق ایک بیان بتاریخ ۲۶ فروری ۱۹۳۳ء جاری کیا ، جس میں گول میز کانفرنس کے مجوزہ دستور کے صرف اس پہلو پر اظہار طمانیت کیا کہ اس میں " واضح طور پر اقلیتوں کے تحفظ کے اصول کو تسلیم کر لیا گیا ہے" لیکن اس کے مرکزی وفاق اجزاء کے متعلق عمداً خاموشی اختیار کی - اس خاموشی کے یہ معنی نہ تھے کہ وہ وفاق مرکزی حکومت کے قائل ہو چکے تھے - مسلم مندوبین گول میز کانفرنس کے طرز عمل پر دسمبر ۱۹۳۳ء میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اپنے ایک بیان میں بعض اعتراضات کئے تھے - اس کے جواب میں علامہ مرحوم نے بتاریخ ۶ دسمبر ۱۹۳۳ء ایک اخباری بیان جاری کیا ، جس میں وہ فرماتے ہیں -

" آخر میں ، میں ایک راست سوال پنڈت جواہر لال نہرو سے کرتا ہوں - ہندوستان کا مسئلہ کس طرح حل ہوگا اگر اکثریتی فرقہ نہ تو ان اقل ترین تحفظات پر رضامند ہو ، جو آٹھ کروڑ کی اقلیت کے لئے ضروری ہیں اور نہ ہی کسی تیسری جماعت کے فیصلے کو تسلیم کرے بلکہ ایک ایسی قومیت کا راگ الاپتا رہے ، جس کے روبہ عمل آنے سے صرف اسی کا فائدہ ہے ؟

اِس مؤقف کے صرف دو ہی متبادل معنی ہیں یا تو ہندوستان کے اکثریتی فرقہ کو اپنا یہ مستقل مؤقف تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ مشرق میں برطانوی شہنشاہیت کا ایک آلۂ کار (Agent) ہے - یا پھر ملک کو مذہبی ، تاریخی اور ثقافتی اشتراک کی بنیادوں پر ازسر نو تقسیم کرنا پڑے گا تاکہ انتخاب کے سوال اور فرقہ وارانہ مسئلہ کو اس کی موجودہ صورت میں ختم کر دیا جا سکے"[۱۲]

گویا جس زمانے میں انھوں نے گول میز کانفرنس کے مجوزہ دستور

۱۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور - طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۲۱۲

کے بعض پہلوؤں پر اظہار طمانیت کیا اور اس کے وفاق پہلو پر خاموشی اختیار کی ، اِس زمانے میں بھی ان کے رجحانات مرکز گریزی کی طرف مائل تھے اور اقتباس بالا کے خط کشیدہ الفاظ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اِس زمانے میں بھی وہ تقسیم ہند ہی کو ہندوستان کے دستوری مسئلہ کا واحد حل سمجھتے تھے اور وفاق مرکزی حکومت کے متعلق انھوں نے جب کبھی خاموشی اختیار کی وہ محض مصلحتاً تھی ، جس کی تشریح ہم آگے چل کر کریں گے ۔

سنہ ۱۹۳۴ع و سنہ ۱۹۳۵ع میں ان کی سیاسی سرگرمیاں قدرے سرد پڑ جاتی ہیں ۔ سنہ ۱۹۳۶ع میں پھر وہ عملی سیاسیات میں حصہ لیتے ہیں ۔ اور سنہ ۱۹۳۶ع سے لے کر سنہ ۱۹۳۸ع تک وہ بہت ہی اہم مسائل پر قائد اعظم جناح کو مشورے دیتے رہے ہیں ، جن کی تفصیلات ہم نے گذشتہ صفحات میں بیان کی ہیں ۔ منجملہ اور مشوروں کے ان کا سب سے اہم مشورہ یہ تھا کہ برصغیر ہند میں کشت و خون سے بچنے اور دائمی امن قائم کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ ملک کو تقسیم کر دیا جائے ۔ چنانچہ بتاریخ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ع وہ قائد اعظم کے نام لکھتے ہیں ۔

" اِس ملک میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ اور اس کا ارتقاء ایک یا ایک سے زائد آزاد مسلم مملکتوں (A Free Muslim State or States) کے قیام کے بغیر ممکن نہیں ہے ۔ کئی سال سے یہ میرا ایماندارانہ ایقان رہا ہے اور میں اب بھی مسلمانوں کی روٹی کے مسئلہ کو حل کرنے اور ساتھ ہی ایک پر امن ہندوستان حاصل کرنے کا اسی کو واحد طریقہ سمجھتا ہوں[۱۳] "

اور ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ع کے خط میں تو وہ بہت ہی واضح الفاظ میں لکھتے ہیں ۔

" میرے خیال میں تو جدید دستور سارے ہندوستان کو ایک ہی

۱۳۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۶ ۔

وفاق میں مربوط کر لینے کی تجویز کی بناء پر بالکلیہ یاس انگیز ہے ۔ ان خطوط (Line) پر ، جن کا ذکر میں نے اوپر کیا ہے ، مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق (A Seperate Federation of Muslim Provinces) کی تشکیل ہی وہ واحد طریقہ عمل ہے ، جس کے ذریعہ ہم ایک پر امن ہندوستان حاصل کر سکتے اور مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے بچا سکتے ہیں ۔ شمال مغربی ہندوستان اور بنگال کے مسلمانوں کو کیوں نہ ایسی قوم قرار دیا جائے ، جنھیں ہندوستان کے اندر اور ہندوستان سے باہر رہنے والی دوسری قوموں کی مانند خود اختیاری کا استحقاق ہے[۱۳] "

ان اقتباسات سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گول میز کانفرنس اور قانون سنہ ۱۹۳۵ء کے نفاذ کے بعد بھی ان کے رجحانات مرکز گریز ہی تھے اور وہ کل ہند وفاق کے مخالف تھے ۔ اس کے برعکس وہ چاہتے تھے کہ " ایک یا ایک سے زائد آزاد مسلم مملکتیں قائم ہوں " ۔ دوسرے الفاظ میں جیسا کہ انھوں نے ۲۱ جون کے خط میں صاف طور پر لکھا ہے کہ وہ " مسلم صوبوں کا ایک علیحدہ وفاق " تشکیل دینا چاہتے تھے ۔ ان دو خطوط سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ذہن میں مسلم مملکت کا جو تصور تھا ، وہ وفاق ہند کا کوئی جزو نہ تھا بلکہ وہ ہند کے شمال مغرب اور شمال مشرق کے صوبوں کو ملا کر ایک علیحدہ آزاد مقتدر اسلامی وفاقی مملکت (Independent Sovereign Islamic Federal State) قائم کرنا چاہتے تھے ۔ ان خطوط سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ ان کے ذہن میں یہ تصور صرف سنہ ۱۹۳۷ء ہی میں پیدا نہیں ہوا تھا ، بلکہ جیسا کہ وہ خود فرماتے ہیں ، " کئی سال سے ان کا یہ ایماندارانہ ایقان (Honest Conviction) رہا تھا " واضح رہے کہ یہ اعلان وہ کسی عوامی جلسے میں یا پبلک پلیٹ فارم پر نہیں کر رہے ہیں کہ اس کے متعلق یہ گمان کیا جائے کہ یہ محض خود ستائی ہے ، بلکہ بہت ہی راز دارانہ انداز میں اپنے ان خیالات کو مسلمانوں کے قائد مسٹر محمد علی جناح

۱۳- ایضاً ص ۲۲ -

پر اپنے خانگی خطوط میں ظاہر کر رہے ہیں ، جنھیں لکھتے وقت ان کے ذہن میں یہ خیال کبھی نہیں آیا ہوگا کہ یہ خطوط کسی وقت شائع بھی کئے جائیں گے ، پھر احتیاط کا یہ عالم ہے کہ قائد اعظم محمد علی جناح جیسے محتاط شخص کے نام بھی یہ خطوط وہ بہ " صیغہ راز " ہی لکھتے ہیں ۔ پھر ان کے خلوص و دیانت داری اور تشہیر سے بے نیازی کا اظہار ان الفاظ سے بھی ہوتا ہے ، جو انھوں نے اِس سلسلے میں استعمال کئے ہیں ۔

ایک بات بالکل واضح ہے کہ مئی اور جون سنہ ۱۹۳۷ء میں مسٹر محمد علی جناح سے خط و کتابت کرتے ہوئے انھوں نے جو تجویز پیش کی تھی ، وہ قطعی طور پر تقسیم ہند اور ایک علیحدہ آزاد وفاق مسلم مملکت کی تجویز تھی اور اِس تجویز کے متعلق خود علامہ مرحوم کا بیان ہے کہ ان کا " کئی سال سے ایماندارانہ ایقان " یہی تھا ۔ " کئی سال " کا اگر ہم تعین کرنا چاہیں تو یقیناً یہی کہیں گے کہ سنہ ۱۹۳۰ء سے ہی ان کا یہ ایماندارانہ ایقان تھا کہ ملک کو تقسیم کرکے ایک علیحدہ آزاد مقتدر مسلم مملکت بنائی جائے ۔ بہرحال علامہ اقبال کے اِس مرکز گریز رجحان قائد اعظم کے نام ان کے یہ دو خطوط اور پھر اس کے ساتھ ان کی اِس تشریح کو " کہ کئی سال سے میرا یہ ایماندارانہ ایقان رہا ہے " اگر پیش نظر رکھا جائے ، تو یہ ماننا پڑے گا کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں انھوں نے مسلم مملکت کے قیام کی جو تجویز پیش کی تھی ، وہ اُن کے تصور میں ، وفاق ہند کا کوئی جزو نہیں تھی بلکہ ایک علیحدہ آزاد مقتدر مملکت تھی ۔

بعض متعلقہ سوالات

پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) انھوں نے سنہ ۱۹۳۰ء میں اپنی اِس مسلم مملکت کے متعلق " خود مختار ریاست " (Autonomous State) کے الفاظ کیوں استعمال کئے ؟ اِسی سلسلے میں بعض اور سوالات بھی پیدا ہوتے ہیں ، مثلاً

(۲) سنہ ۱۹۳۰ء ہی کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی قرارداد کی کیوں تائید کی ۔

حالانکہ اِس قرارداد میں وفاق حکومت کے نفاذ کا مطالبہ کیا گیا تھا ؟ اور

(۳) سائمن رپورٹ کے بعض اجزاء کی تائید کیوں کی ، حالانکہ اِس میں وفاق طرز حکومت کی سفارش کی گئی تھی ؟

(۴) اگر علامہ نے سنہ ۱۹۳۰ء میں سنجیدگی کے ساتھ تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی ، تو انھوں نے دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں (جس کے وہ باقاعدہ رکن تھے) اپنی اس تجویز کو باضابطہ طور پر کیوں پیش نہیں کیا اور اِس کو آگے بڑھانے کے اِس زرین موقع کو کیوں کھو دیا ؟

پہلے سوال کے دو جوابات دئے جا سکتے ہیں ، ایک جواب تو یہ ہے کہ خود مختار ریاست (Autonomous State) سے ان کی مراد نو آبادی درجہ (Dominion Status) کی ریاست ہے یعنی برطانوی دولت عامہ کے اندر خود مختاری (Autonomy within the British Common-Wealth) بالفاظ دیگر ایسی خود مختار ریاست جو برطانوی دولت عامہ (British Common-Wealth) کی رکن ہو ۔ جس زمانے میں علامہ مرحوم نے یہ خطبہ پڑھا ہے ، اُس وقت ہندوستانی سیاست کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ یہ تھا کہ آیا ہندوستان کی منزلِ مقصود کامل آزادی کو (Complete Inde-pendence) قرار دیا جائے یا درجۂ نو آبادیات (Dominion Status) کو اِس مسئلہ پر ہندوستانی سیاست دانوں کے دو مکاتیبِ خیال بن گئے تھے ۔ ایک مکتب خیال تو وہ تھا ، جو کامل آزادی کو ہندوستان کا سیاسی نصب العین قرار دیتا تھا وہ یہ چاہتا تھا کہ ہندوستان ، کا مثلاً ایک آزاد مملکت بن جائے اور اِس کا کوئی تعلق ، برطانوی دولت عامہ سے نہ رہے ۔ اور دوسرا مکتب خیال ان لوگوں کا تھا ، جو یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان کو ایسی آزادی ملے جیسی دوسری نو آبادیات مثلاً آسٹریلیا کو حاصل ہے ۔ یہ لوگ ہندوستان کو برطانوی دولتِ عامہ کا ایک رکن بنائے رکھنا چاہتے تھے ۔ علامہ مرحوم نے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں خطبۂ صدارت پڑھا تھا اور دسمبر سنہ ۱۹۲۸ء میں نہرو رپورٹ کو آل پارٹیز کنونشن اور

کانگریس نے منظور کر لیا تھا - نہرو رپورٹ نے کامل آزادی کی بجائے درجہ نو آبادیات (Dominion Status) کو ہندوستان کی منزلِ مقصود قرار دیا تھا اور نہرو رپورٹ کی اِس سفارش پر ابھی ملک کے طول و عرض میں بڑے تیز و تند مباحث ہو چکے تھے - دسمبر سنہ ۱۹۲۹ع میں کانگریس نے لاہور کے اجلاس میں درجہ نو آبادیات کو رد کرکے آزادیٔ کامل کی قرارداد پاس کر دی تھی - مسلمانوں میں بھی اِس مسئلہ کے تعلق سے دو مختلف مدارس فکر پائے جاتے تھے - ایک مدرسۂ فکر کامل آزادی کا حامل تھا - مولانا حسرت موہانی اور مولانا محمد علی اِس کے نمایاں سربراہ کار تھے- دوسرا مدرسۂ خیال درجہ نو آبادیات کا قائل تھا - سر محمد شفیع وغیرہ اِس مکتب کی نمائندگی کر رہے تھے - علامہ مرحوم کا تعلق عملاً اِسی دوسرے گروہ سے تھا اور اِس گروہ کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لئے انھوں نے مقتدر مملکت (Sovereign State) کی بجائے خود مختار ریاست (Autonomous State) کے الفاظ استعمال کئے - ان الفاظ کے استعمال ہی سے مسٹر کوپ لینڈ کو غلط فہمی ہوئی - اِس نے لکھا " خود مختار ریاستوں (Autonomous States) سے ان کی مراد آزاد و مقتدر ریاستیں نہ تھیں ، ان کے ذہن میں ایک کل ہند ڈھیلے ڈھالے مرکزی وفاق حکومت کا تصور تھا[۱۵] " —— لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے ان کی مراد وفاقِ ہند کی رکن ریاست نہ تھی بلکہ برطانوی دولتِ عامہ کی رکن ریاست تھی - لیکن وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ آزادی کامل کے حامی ان کی اِس تجویز سے محض اِس لئے بھڑک جائیں کہ وہ اِس مسلم مملکت کو برطانوی دولتِ عامہ کا رکن بنائے رکھنا یا صرف نو آبادیاتی درجہ کی مملکت بنانا چاہتے ہیں ، اِس لئے انھوں نے اپنی اصل تجویز جن الفاظ میں پیش کی ، وہاں صرف مستحکم مسلم ریاست کے الفاظ استعمال کئے اور ساتھ ہی ساتھ یہ بھی بتایا کہ " خود اختیاری خواہ برطانوی سلطنت کے اندر رہ کر ملے یا برطانوی سلطنت کے باہر " ایک مستحکم مسلم اسٹیٹ ہندوستان کے شمال مغرب میں قائم ہونی چاہئے - ظاہر ہے کہ " خواہ برطانوی سلطنت

۱۵- انڈیا اے ری اسٹیٹمنٹ مصنفۂ کوپ لینڈ ، ص ۱۸۹ -

کے اندر یا برطانوی سلطنت کے باہر " ——— یہ الفاظ انھوں نے محض اِس انتہا پسند گروہ کے نقطہ نظر کی رعایت سے استعمال کئے تھے ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ علامہ مرحوم کو "آزادیٔ کامل " یا " درجۂ نو آبادیات " کی قانونی و دستوری موشگافیوں سے اپنی اِس تجویز کے سلسلے میں زیادہ تعلقِ خاطر نہیں تھا ۔ وہ اِس بحث میں الجھنا نہیں چاہتے تھے کہ آیا درجۂ نو آبادیات ، آزادی کامل کے مماثل ہے یا نہیں اور جو مملکتیں برطانوی دولتِ عامہ کی رکن ہیں آیا انھیں پوری آزادی حاصل ہے یا نہیں ، یا انھیں مقتدر مملکتیں (Sovereign State) کہا جا سکتا ہے یا نہیں ۔ پھر انھیں اِس بحث سے بھی دلچسپی نہ تھی کہ ہندوستان کے حالات کا لحاظ کرتے ہوئے آزادیٔ کامل کو سیاسی نصب العین قرار دینا چاہئے یا درجۂ نو آبادیات کو ۔ ان کی نظر میں اہم ترین مسئلہ جو کچھ تھا وہ یہ تھا کہ اِس ملک میں ایک خطۂ زمین اسلامی نظام کی جلوہ گری کے لئے علیحدہ متعین کرا لیا جائے ، اِس لئے وہ مقتدر مملکت (Sovereign State) کے الفاظ استعمال کرکے انتہا پسند گروہ کی ایک گونہ ہمدردی تو حاصل کر سکتے تھے ، مگر اعتدال پسند جماعتوں کی ہمدردیوں کو بالکلیہ کھو دیتے اور حکمران جماعت کی ناراضی کو اِس نازک موقع پر خواہ مخواہ مول لیتے اور یہ سیاسی فراست کا کوئی اچھا مظاہرہ نہ ہوتا ! اِسی لئے انھوں نے ایسے الفاظ میں اِس تصور کو پیش کیا ، جن میں انتہا پسند و اعتدال پسند دونوں گروہوں کے نقاطِ نظر کی رعایت ملحوظ تھی ۔ اور یہ مقصد بھی پیش نظر تھا کہ برطانوی حکومت بھی اِس تجویز کو سنتے ہی چراغ پا نہ ہو جائے ۔

علامہ مرحوم کے دانستہ اِس قدر محتاط الفاظ استعمال کرنے کے باوجود بعض جماعتوں نے عمداً ان کے ان الفاظ سے کھیلنے اور برطانوی حکومت کو بدگمان کرکے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ۔ چنانچہ سردار اجل سنگھ اور سردار پورن سنگھ دو سکھ قائدین نے "سکھ اور ہندوستان کا جدید دستور کے عنوان سے ۱۲ نومبر ۱۹۳۱ع کو ایک یاد داشت دوسری گول میز کانفرنس میں گشت کروائی ۔ اس یاد داشت میں سردار صاحبانؒ نے لکھا تھا ۔

"کل ہند مسلم کانفرنس کے صدر کے مطالبہ کے پیش نظر ہمیں یقین ہے کہ ہندوستان کے فوجی صوبے کو دستور جدید میں ایک مسلم صوبہ کی حیثیت سے درج کرنے کے معنی یہ ہیں کہ ہندوستان کو برطانوی دولت عامہ کی رکنیت سے علیحدہ کر دیا جائے (صدر مسلم کانفرنس) کا مطالبہ یہ تھا کہ "ایک مستحکم شمال مغربی مملکت خواہ وہ برطانوی سلطنت کے اندر ہو یا باہر" جس میں پنجاب سرحد ، بلوچستان اور سندھ شامل ہوں (قائم کی جائے)[۱۶]"

سردار صاحبان کا مقصد یہ تھا کہ برطانوی ارباب حل و عقد کی نظروں میں علامہ اقبال کی اس تجویز کو ایک مخالف برطانیہ ہتّوا بنا کر پیش کیا جائے ، علامہ مرحوم کے ایماء سے مولانا شفیع داؤدی نے اس کے جواب میں ایک دوسری یاد داشت گول میز کانفرنس میں گشت کروائی ، جس میں سردار صاحبان کی پھیلائی ہوئی - اس غلط فہمی کا ازالہ کیا گیا تھا[۱۷]"

بہر حال علامہ مرحوم نے ایک ایسے زمانے میں اس تجویز کو پیش کیا تھا جب کہ آزادی کامل اور درجہ نو آبادیات کے مسئلہ پر ہندوستانیوں اور مسلمانوں میں مختلف مکاتیب خیال بن چکے تھے - پھر یہ تجویز اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بالکل اچنبھے کی چیز تھی - علامہ مرحوم کو اس کا پورا پورا اندازہ تھا کہ یہ ایک ایسا اچھوتا خیال ہے ، جس سے ہندوستانی و برطانوی سیاستدان گوش آشنا نہیں ہیں - اس لیے وہ اس کو آسانی سے قبول نہیں کرینگے ، بلکہ یہ تجویز ان کو ایک عجیب وغریب ذہنی الجھن میں مبتلا کر دے گی اور انہیں اندیشہ تھا کہ کہیں اس کا انوکھا پن ہی اس کے رد کر دیئے جانے کا باعث نہ بن جائے اس لیے وہ نہیں چاہتے تھے کہ اس تجویز کو ایسے الفاظ میں بیان کیا جائے ، جس سے ہندوستانی سیاستدانوں اور مسلم رہناؤں کے مختلف مکاتیب خیال محض اپنے مطمح نظر سے مختلف نوعیت کی چیز ہونے کے باعث اس کو یک لخت پس پشت ڈال

۱۶- دوسری گول میز کانفرنس کی رپورٹ جلد دوم ص ۱۴۰۰ .

۱۷- ایضاً ص ۱۴۴۰ .

دیں ، اور برطانوی اربابِ حل و عقد اس کو سنتے ہی بلا وجہ بھڑک اٹھیں ۔ یہ تو تھا پہلے سوال کا جواب ۔

(۲) دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ حالات کا اقتضاء یہ تھا کہ وہ آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی منظور شدہ قرار داد کی تائید کرتے ۔ ہم بیان کر چکے ہیں کہ نہرو رپورٹ نے وحدانی طرزِ حکومت کی سفارش کی تھی ۔ اِس رپورٹ سے متعلق مسلمانوں میں تین گروہ پیدا ہو گئے تھے ۔ سعی بلیغ کے بعد مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو مسلم کانفرنس میں یکجا کیا گیا تھا ، نہرو رپورٹ کے خلاف اس طرح مسلمانوں کا ایک مشترکہ محاذ بنایا گیا تھا اور اس محاذ سے وحدانی طرز حکومت کی بجائے ، وفاقی حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا ۔ جس کو مسلم اکثریت کی تائید حاصل تھی ۔ مزید براں اس کانفرنس کی منظور شدہ قرار داد میں ، جس وفاقی حکومت کا مطالبہ کیا گیا تھا ، اس کی نوعیت یہ تھی کہ اس میں چند گنے چنے اختیارات مرکزی حکومت کو حاصل ہوتے تھے اور باقی اختیارات صوبوں کے سپرد کیے جا رہے تھے ۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی ایک مرکز گریز رجحان تھا اور علامہ اقبال کے عمومی رجحان سے قریب تر ہی تھا ۔ فرق صرف اس قدر تھا کہ علامہ مرحوم کا رجحان ، اس رجحان سے صرف "ایک قدم آگے تھا[۱۸]" ۔ اور یہ کوئی عملی سیاست نہ ہوتی کہ علامہ مرحوم اپنے سے قریب تر مکتب خیال اور مسلمانوں کے سوادِ اعظم کو چھوڑ کر ، محض اپنی لیڈری کو چمکانے کی خاطر بس اپنی تجویز ہی پر اصرار کرتے ۔ اسی لیے انھوں نے جماعتی حیثیت سے اِس قرار داد کی تائید کی اور اس کے بعد اپنی شخصی حیثیت سے تقسیمِ ہند یا اسلامی ہند کے اس تصور کو مسلمانوں کے سامنے رکھا ۔

(۳) اب ہم تیسرے سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں ، اس میں شک نہیں کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ میں سائمن کمیشن کے متعلق ہمدردانہ نقطۂ نظر اختیار کیا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ

۱۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ص ۱۲

سائمن کمیشن نے مکمل صوبہ جاتی خود مختاری اور جداگانہ انتخابات کی سفارش کی تھی اور یہ دو امور ڈاکٹر صاحب کی نظر میں بہت اہم تھے۔ علاوہ ازیں اس نے صوبجات کی مذہبی ، لسانی اور ثقافتی بنیاد پر از سر نو تقسیم کی سفارش بھی کی تھی ۔ یہ سفارش علامہ مرحوم کے نقطۂ خیال سے میل کھاتی تھی اسی لیے آپ نے اس سفارش کی تائید کی ، مگر ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ

> یہ از سر نو تقسیم ، جس کی سائمن رپورٹ میں سفارش کی گئی ہے دو شرائط کو پورا کرنے کے بعد روبہ عمل لائی جائے (۱) دستور جدید کے نفاذ سے قبل ہی یہ تقسیم عمل میں آ جائے ، اور (۲) اس طرح روبکار لایا جائے کہ اس سے فرقہ وارانہ مسئلہ بالآخر حل ہو جائے[۱۹]"

سائمن رپورٹ نے وفاق حکومت قائم کرنے کی سفارش کی تھی اور علامہ مرحوم نے اس کی اس سفارش کو اپنے خطبۂ صدارت میں "اصولاً پر مغز" (Sound in principle) قرار دیا[۲۰]۔ اس کی اصل وجہ سمجھنے کی خاطر تھوڑی دیر کے لیے سائمن رپورٹ کے پس منظر کو ذہن میں لانا پڑے گا۔ مانٹیگو چیمس فورڈ اسکیم میں برطانوی ہند کے لیے ایک مرکزی مقننہ کے قیام کی سفارش کی گئی تھی ، جس کے نمائندے بالواسطہ صوبائی مقننہ سے نہیں بلکہ براہ راست منتخب ہوتے ، اور اسی سفارش پر عمل بھی ہو رہا تھا ۔ مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ نے وفاق کو ایک بعید امکانی چیز قرار دیا تھا ، اور نہرو رپورٹ نے وحدانی طرز حکومت پر زور دیا تھا ۔ سائمن کمیشن کی سفارشات کے منظر عام پر آنے سے قبل تک حکومتِ وقت کی پالیسی بھی وحدانی حکومت کی تائید میں تھی اور نہرو رپورٹ کو منظور کرکے اکثریتی فرقہ یا کانگریس نے بھی اسی وحدانی طرز حکومت کی حمایت

۱۹- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۵

۲۰- ایضاً ص ۱۷

کی تھی ۔ بالالفاظِ دیگر وحدانی حکومت کے قیام پر حکمران جماعت اور اکثریتی فرقہ دونوں ایک معنی میں اس وقت متفق تھے ۔ اقلیتیں اور خصوصاً مسلمان وحدانی طرز حکومت کے خلاف تھے ۔ اسی کی وجہ وہ بے اعتمادی تھی ، جو ۱۹۲۳ء کے فرقہ وارانہ فسادات اور ہندو مسلم اتحاد کی شکست کے باعث اکثریتی فرقہ کی جانب سے مسلمانوں کے دلوں میں عام طور پر پیدا ہو چکی تھی ۔ اب مسلمانوں نے اپنے دستوری موقف پر غور کیا تو انہوں نے یہ محسوس کیا کہ وہ پورے ہندوستان میں ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے ہیں ، لیکن پنجاب ، سرحد ، سندھ ، بلوچستان اور بنگال میں ان کی اکثریت ہے ۔ یہاں بھی صورت حال یہ تھی کہ پنجاب و بنگال میں ان کی برائے نام اکثریت تھی ۔ سرحد ، سندھ ، بلوچستان میں وہ موثر اکثریت رکھتے تھے ، لیکن سرحد و بلوچستان میں دستوری اصلاحات نافذ نہیں تھیں ، اور سندھ بمبئی پریسیڈنسی کا ایک جزو بنا ہوا تھا ۔ ان صوبوں میں اپنی موثر اکثریت کو زندگی اور طاقت عطاء کرنے کی انہوں نے ضرورت محسوس کی اور اسی لیے یہ مطالبہ کیا کہ سرحد اور بلوچستان میں دیگر صوبوں کی مانند دستوری اصلاحات نافذ کی جائیں ، اور سندھ کو بمبئی سے علیحدہ کرکے ایک مستقل صوبہ بنایا جائے ۔ لیکن یہ بھی کافی نہ تھا ۔ کیونکہ سرحد و بلوچستان کو دستوری اصلاحات عطا کرنے اور سندھ کو ایک مستقل صوبہ قرار دینے کے بعد بھی اگر مرکز میں وحدانی حکومت قائم کی جائے تو پنجاب ، بنگال ، سرحد ، بلوچستان و سندھ میں مسلم اکثریت ہونے کے باوجود یہ صوبے مرکزی وحدانی حکومت کے ماتحت ہو جاتے ، اور مرکز میں ہندوؤں کی اکثریت رہتی ! بالفاظ دیگر ان صوبوں میں اپنی اکثریت رکھنے کے باوجود مسلمانوں کو کوئی فائدہ نہ پہنچتا ! ! بلکہ وہ ہندوؤں کے ماتحت ہی رہتے ۔ اس کا علاج انہوں نے یہ تجویز کیا کہ مرکز میں وحدانی حکومت کی بجائے وفاقی حکومت قائم ہو ۔ وحدانی حکومت کو زیادہ اختیارات حاصل ہوتے ہیں ، اور اِس کا حیطۂ اقتدار بہت وسیع ہوتا ہے ۔ اس کے برعکس وفاق مرکزی حکومت کو نسبتاً کم اختیارات حاصل ہوتے ہیں ، بلکہ صحیح معنی میں وفاق کے اندر مرکز اور اجزاء میں اقتدار منقسم ہو جاتا ہے اور مرکز کا حیطۂ اقتدار بھی محدود ہو جاتا ہے ۔ اِس کو صرف

ان ہی امور کی حد تک اختیارات حاصل ہوتے ہیں ، جن کی صراحت دستور میں کر دی جاتی ہے ، اِس طرح ایک معنی میں اجزاء مرکز کے کلی دباؤ سے بڑی حد تک بچے رہتے ہیں ۔ یہاں چونکہ مسلمان بحیثیت مجموعی پورے ہندوستان میں ایک اقلیت کی حیثیت رکھتے تھے لیکن ان پانچ صوبوں میں ان کی اکثریت تھی ، اِس لئے وہ چاہتے تھے کہ یہ صوبے مرکز کے کلی دباؤ سے محفوظ رہیں ، اور اختیارات مرکز اور صوبوں کے درمیان منقسم ہو جائیں ۔ اگر وحدانی طرز حکومت قائم ہو جائے تو یہ صوبے مرکز کے کلی دباؤ میں رہنے اور اِس طرح یہاں بھی مسلم اکثریت ہندو مرکزی حکومت کے زیر اقتدار آ جاتی ۔ وفاق حکومت ، اِس ہندو اقتدار سے گریز کی ایک صورت تھی ، پھر تقسیم اختیارات کے نقطۂ نظر سے وفاق کی بھی دو صورتیں ہیں ، ایک تو یہ کہ اہم اور زیادہ اختیارات جن کو اصطلاح میں مابقی اختیارات (Residuary Powers) کہا جاتا ہے ، مرکز کو حاصل رہیں ، اور گنے چنے اختیارات اجزاء کو دیئے جائیں ، اس صورت میں مرکز طاقتور رہتا ہے اور اجزاء کمزور رہتے ہیں ۔ اِس کے برعکس دوسری صورت یہ ہے کہ مابقی اختیارات صوبوں کو دیئے جائیں اور مرکز کو گنے چُنے اختیارات حاصل ہوں ۔ اس دوسری صورت میں مرکز کمزور رہتا ہے ۔ مسلمان چونکہ پانچ صوبوں میں اکثریت رکھتے تھے اِس لئے اِن کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ مابقی اختیارات صوبوں کو حاصل ہوں اور گنے چُنے اختیارات مرکز کو دیئے جائیں تاکہ مرکز کمزور رہے اور مسلم اکثریت کے اِن صوبوں پر اس کے اقتدار کی گرفت ڈھیلی رہے ، لیکن چونکہ ہندو کل ہند اکثریت رکھتے تھے ، اِس لئے مسلمانوں کے برعکس ان کا رجحان پہلے تو یہ تھا کہ ملک میں وحدانی حکومت قائم ہو ، تاکہ مرکز مضبوط رہے ، اس کے بعد جب برطانوی حکومت نے وفاقی طرز حکومت کی تائید کرنی شروع کی ، تو انھوں نے اِس امر پر زور دیا کہ مابقی اختیارات مرکز کو دیئے جائیں ، تاکہ مرکز طاقتور رہے ، اور صوبوں پر اِس کی گرفت سخت ہو ۔ ہندوستان کی مرکزی حکومت سے متعلق یہ وہ دستوری کشمکش تھی ، جو ملک کی دو بڑی جماعتوں میں جاری تھی ۔ یہی وہ پس منظر ہے جس میں سائمن رپورٹ کی اِس سفارش کا مطالعہ کرنا چاہیئے ، جس کی تائید اصولی حیثیت سے علامہ

اقبال نے کی ہے ۔ ہم بتا چکے ہیں کہ مانٹیگو چیمس فورڈ رپورٹ میں وحدانی طرز پر مرکزی مقننہ کی سفارش کی گئی تھی اور اِس پر عمل بھی ہو رہا تھا ۔ نہرو رپورٹ نے بھی وحدانی طرز پر زور دیا تھا ۔ گویا سائمن کمیشن کی سفارشات سے قبل ہندوستان کی مرکزی حکومت کی نوعیت سے متعلق حکمران جماعت اور اکثریتی فرقہ کا ایک ہی رجحان تھا ۔ اِس رجحان کے خلاف سائمن کمیشن نے اپنی رپورٹ میں وفاقی حکومت کی سفارش کی تھی ۔ اِس تمام بحث کی روشنی میں یہ واضح ہوتا ہے کہ سائمن کمیشن کی یہ سفارش ، مسلمانوں کے عام مفاد ، عمومی رجحان اور علامہ مرحوم کے اِس مرکز گریز رجحان (جس کی مفصل تشریح ہم کر آئے ہیں) سے قریب تر تھی ۔ اِسی لئے انہوں نے اصولاً اس کو " پرمغز " بتایا ۔ سائمن کمیشن نے وفاق کی سفارش تو کی تھی ، لیکن ساتھ ہی یہ رائے بھی ظاہر کی تھی کہ فی الحال مرکز میں عاملہ ، مقننہ کے سامنے جواب دہ نہ ہو ، تاوقتیکہ صوبوں میں اولاً مکمل خود مختار حکومت کا تجربہ نہ ہو جائے ۔ وفاقی مرکزی حکومت کے متعلق کمیشن نے یہ اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ " خواہ صوبوں میں برطانوی پارلیمانی نظام کامیاب ہو جائے ، لیکن اِس کی نقل وفاقی مرکز میں ناممکن ہی دکھائی دیتی ہے ۔" یہ نقطۂ نظر بھی مسلمان اقلیت اور علامہ اقبال کے رجحان سے بہت قریب تھا ۔ علامہ مرحوم کا رجحان اِس سلسلے میں کچھ اس انداز کا تھا ۔ اولاً سرے سے کوئی مرکزی حکومت ہی نہ ہو ، اگر یہ ناممکن العمل قرار پائے اور ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت قائم ہی کر دی جائے تو وہ ایسی وفاقی حکومت ہو ، جس کو صرف چند گنے چنے اختیارات دیئے جائیں اور اجزاء یا صوبوں کو زیادہ اختیارات حاصل ہوں ، یعنی انہیں مکمل خود مختاری دی جائے ، لیکن وفاق مرکزی حکومت اِس وقت تک وجود میں نہ آئے جب تک کہ صوبوں میں حکومتِ خود اختیاری کا تجربہ کامیاب نہ ہو جائے ، اور اگر یہ تجربہ کامیاب بھی ہو جائے ، تو مرکز میں جو وفاقی حکومت قائم ہو ، وہ صرف برطانوی ہند ہی تک محدود رہے ۔ اس میں دیسی ریاستوں کو شامل نہ کیا جائے ۔ اِس کی وجہ یہ تھی کہ دیسی ریاستوں کی بڑی اکثریت ہندو تھی اور علامہ مرحوم کو یہ اندیشہ تھا کہ برطانوی ہند ہی کی حد

تک جو وفاق بنے گا ، اِس کی مرکزی حکومت میں ہندو اکثریت رہے گی ، اور جب اِس دائرے کو پھیلا کر اِس میں دیسی ریاستوں کو شامل کر لیا جائے گا ، تو مرکز کی ہندو اکثریت میں مزید اضافہ ہو جائے گا - اِس نقطہ کو انہوں نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ میں اِس طرح بیان کیا -

" سچی بات یہ ہے کہ ہندوستانی والیانِ ریاست (جن میں صرف چند ہی مسلمان ہیں) کی وفاق اسکیم میں شرکت سے دو مقاصد پورے ہو رہے ہیں - ایک تو یہ ہے کہ برطانوی اقتدار کو جیسا کہ عملاً وہ اس وقت ہندوستان میں جاری و ساری ہے ، قائم و برقرار رکھا جا رہا ہے اور یہ سب سے زیادہ اہم مقصد ہے اور دوسرے یہ کہ اِس کی وجہ سے کل ہند وفاق مجلس (All India Federal Assembly) میں ہندوؤں کو بے پناہ اکثریت حاصل ہو رہی ہے -

اگر مسلمان خاموشی کے ساتھ کسی ایسی اسکیم پر رضامند ہو جائیں تو یہ اسکیم ان کا ، ہندوستان کے اندر ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے بہت جلد خاتمہ کر دے گی - اس طرح کے تشکیل دادہ وفاق کی حکمتِ عملی (Policy) کو ہندو والیانِ ریاست ، جن کا مرکزی وفاق اسمبلی میں سب سے بڑا گروپ ہوگا ، عملاً اپنے قابو میں رکھیں گے - سامراجی معاملات میں وہ ہمیشہ تاج کی حمایت کریں گے اور جہاں تک ملک کے اندرونی انتظامی معاملات کا تعلق ہے ، وہ ہندوؤں کی بالادستی (Supremacy) کو برقرار رکھنے اور مستحکم کرنے میں ان کی مدد کرتے رہیں گے " [۲۱]

الغرض وفاق حکومت کے متعلق علامہ مرحوم کا یہ نقطۂ نظر تھا - چونکہ سائمن کمیشن کی سفارش کا نہج بھی تقریباً اسی قسم کا تھا ، اس لئے

۲۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۹

انھوں نے اس کو اصولاً درست قرار دیا ۔ لیکن علامہ مرحوم نے ساتھ ہی اس سفارش پر تنقید بھی کی ۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ سائمن کمیشن نے یہ جو سفارش کی تھی کہ مرکز میں فی الحال ذمہ دارانہ حکومت قائم نہ ہو ، اس کی اصلی وجہ یہ تھی کہ حقیقی اقتدار کو برطانیہ اپنے ہاتھوں میں محفوظ رکھنا چاہتا تھا ۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں ۔

> "انگلستان کے پنڈتوں نے جب یہ محسوس کیا کہ مرکز میں جمہوریت کا نفاذ ان کے مفادات کے خلاف عمل کرے گا ، اور اگر ذمہ دارانہ حکومت کی طرف انھوں نے مزید قدم بڑھایا ، تو وہ ان تمام اختیارات کو جو اس وقت ان کے ہاتھوں میں ہیں ، ہضم کر لے گا تو انھوں نے جمہوریت کے تجربے کو مرکز کی بجائے صوبوں کی طرف منتقل کر دیا"[۲۲]

ظاہر ہے کہ مسلمانوں کا نقطۂ نظر یہ نہ تھا بلکہ یہ تھا کہ اگر وفاقی حکومت قائم ہی ہو تو ان کے مفادات اور سیاسی حقوق کا مناسب تحفظ کیا جائے ، لیکن کمیشن نے اس جانب توجہ نہیں کی تھی ، اسی لئے علامہ مرحوم کو کمیشن کی اس پالیسی سے شکایت تھی ، چنانچہ وہ لکھتے ہیں ۔

> "حقیقت یہ ہے کہ وہ (یعنی کمیشن) اس سے آگے نہیں جاتا کہ جمہوریت کو رائج کرنے کے باعث جو صورت حال برطانیہ کے لئے پیدا ہوگئی ہے ، اس سے گریز کی راہ سجھائے اور فرقہ وارانہ مسئلہ کو بالکلیہ نظر انداز کر کے اس کو جہاں تہاں چھوڑ دے "[۲۳]

الغرض کمیشن کی بعض سفارشات کو علامہ مرحوم نے اس لئے نہیں سراہا کہ مسلم مملکت کے قیام کی جو تجویز انھوں نے پیش کی تھی ، وہ

۲۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ع ص ۱۷

۲۳۔ ایضاً ص ۱۷

وفاقِ ہند کا ایک جزو تھی بلکہ اس لئے ان سفارشات کی انھوں نے تائید کی کہ وہ ان کے عمومی رجحان سے قریب تر تھیں۔

(۴) اب ہم چوتھے سوال کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ یہ سوال کرنے والوں کے ذہن میں عموماً دو رجحانات ہوتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ علامہ مرحوم نے اپنے خطبہ صدارت میں جو تجویز پیش کی تھی، محض ایک شاعرانہ ترنگ تھی، بعد میں خود اقبال نے سنجیدگی کے ساتھ اس کو کوئی اہمیت نہ دی۔ یہاں تک کہ اِس تجویز کے ہندوستان میں پیش کرنے کے بعد ہی، جب انھیں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع ملا، تو انھوں نے اس تجویز کو آگے بڑھانے کی کوشش نہ کی۔ دوسرا رجحان یہ ہوتا ہے کہ اِس تجویز کے ذریعہ علامہ مرحوم نے جو کچھ چاہا، وہ صرف اس قدر تھا کہ پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک صوبہ بنا دیا جائے اور یہ صوبہ وفاقِ ہند کا ایک جزو رہے۔ اسی لئے جب گول میز کانفرنس کا عمومی رجحان وفاقِ ہند کی تائید میں تھا تو انھوں نے اپنی اِس تجویز پر، جو حقیقت میں کوئی نئی تجویز نہ تھی، زور دینا مناسب نہ سمجھا۔

واقعہ یہ ہے کہ اس سوال اور اس سوال کے ان دونوں شاخسانوں کی حقیقی نوعیت کو معلوم کرنا علامہ مرحوم کی سیاست کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے نہایت ضروری ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ علامہ اقبال کی یہ تجویز نہ تو ان کی کسی شاعرانہ ترنگ کا نتیجہ تھی اور نہ ان کی یہ مسلم مملکت، وفاق ہند کا کوئی جزو تھی، بلکہ ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے عمومی رجحانات اور حقیقی اسلامی تصورات کے مابین جو خفیہ لیکن گہری آویزش ہو رہی تھی، اس کو پر امن طریقہ پر حل کرنے کی یہ ایک عملی تدبیر تھی ——

یہ شاعر کا رنگین تخیل اور اس کے جذبات کی وقتی ترنگ نہ تھی بلکہ ایک مفکر سیاستدان کے "دس سال"[۲۳] کے غور و فکر کا نتیجہ اور ایک مخلص و مدبر رہنما کا "ایمان دارانہ ایقان"[۲۴] (Honest Conviction)

۲۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ء
ص ۱۶

تھا ۔ اگر واقعی یہ تجویز انہوں نے وقت کے وقت جذبات کی رو میں مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے پیش کر دی تھی اور بعد میں خود اس کو انہوں نے کوئی سنجیدہ اہمیت نہ دی ہوتی ، تو وہ قائد اعظم محمد علی جناح کو بار بار اس جانب متوجہ نہ کرتے ۔ علامہ مرحوم کے متعلق چاہے جو کچھ بھی کہا جائے ، لیکن ان کی دیانت اور ان کا اخلاص تو بہرحال مسلّم ہے ۔ اگر حقیقت یہی تھی کہ زورِ خطابت کے مظاہرہ کے طور پر ، انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی تو پھر سات سال بعد ، وہ قائد اعظم کو اس تجویز کے متعلق یہ نہ لکھتے کہ

"کئی سال سے یہی میرا ایمان دارالہ ایقان رہا ہے ۔"[۴۴]

پھر بھی اِس سوال کا جواب دینا باقی رہتا ہے کہ گول میز کانفرنسوں میں علامہ مرحوم نے اپنی اس تجویز کو آگے کیوں نہیں بڑھایا ؟ اِس کا مختصراً جواب یہ ہے کہ وقت کا تقاضا ، حالات کا اقتضاء اور مصلحت و تدبر کا مطالبہ ہی یہ تھا کہ علامہ مرحوم اپنی اس تجویز کو ان کانفرنسوں میں پیش نہ کرتے ۔ اِس اجمال کی تفصیل معلوم کرنے کے لئے ایک مرتبہ پھر ہمیں اِس زمانے کے حالات کو اپنے ذہن میں تازہ کرنا پڑے گا ۔

گول میز کانفرنس سے معاً پہلے ہندوستانی سرزمین ، ہندو اور مسلمانوں کا ایک سیاسی اکھاڑہ بنی ہوئی تھی ۔ شہروں اور دیہاتوں میں ہندو عوام اور مسلم عوام بالعموم ایک دوسرے سے دست و گریباں تھے اور کانگریس، ہندو مہاسبھا اور مسلم لیگ و مسلم کانفرنس کے پلیٹ فارم سے ہندو نیتا اور مسلم قائدین ایک دوسرے کو دعوت مبارزت دے رہے تھے ۔ ہندو اکثریت کی خواہش یہ تھی کہ ایک ملک اور ایک قوم کی بنیاد پر یہاں ، ایک ایسے دستور کو نافذ کر دیا جائے ، جس میں مرکزی حکومت طاقتور ترین ہو ، تاکہ اقلیتوں کے مرکز گریز رجحانات فنا ہو جائیں اور وہ خود بھی اِسی ایک واحد ہندوستانی قوم کا ایک ضمیمہ یا جزو بن کر رہیں ۔ ان کے اِس رجحان کا اظہار ہندو مہاسبھا کی قراردادوں اور نہرو رپورٹ کی اُن سفارشات سے ہوتا ہے ، جن میں نہرو کمیٹی نے جداگانہ انتخابات کی تنسیخ ، مخلوط انتخاب بلا تعین نشست کی ترویج اور وحدانی طرز حکومت

کے نفاذ پر زور دیا تھا ۔ کانگریس نے نہرو رپورٹ کو منظور کر کے اپنے آپ کو عملاً اسی رجحان کے حوالے کر دیا تھا ۔ نہرو رپورٹ کی اس منظوری سے مسلمانوں کی آنکھوں کے سامنے ایک بجلی سی کوند گئی ، اور ان کے قائدین کی اکثریت نے یہ محسوس کیا کہ اگر اس نوع کا دستور ہندوستان میں نافذ ہو جائے ، جس کا ڈھانچہ نہرو رپورٹ نے تیار کیا ہے ، تو مسلم قوم کی جداگانہ ہستی ہی فنا ہو جائے گی ۔ اس زہر کا تریاق انہوں نے آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی کی قرارداد میں تلاش کیا ۔ علامہ مرحوم بھی اس کے پر زور حامی تھے ، اس لئے کہ مسلم قوم کی جداگانہ ہستی کا تحفظ ان کے بنیادی سیاسی تصورات میں سے ایک تھا ۔ آل پارٹیز مسلم کانفرنس میں قرارداد دہلی تو منظور کر لی گئی تھی ، لیکن سوال یہ تھا کہ اس کو روبہ عمل کس طرح لایا جائے ؟ صرف اس قرارداد کا منظور کر لینا کوئی بڑی عملی سیاست نہ تھی ۔ عملی سیاست تو یہ تھی کہ اس کو یا اس کے اہم ترین اجزاء کو ہندوستانی سیاست کے دیگر اہم فریقوں سے منوایا جائے ، اور یہ اہم فریق دو ہی تھے (۱) ہندو اکثریت (۲) برطانوی حکومت ۔ ہندو اکثریت نے نہرو کمیٹی کے مباحث ، آل پارٹیز کنونشن کی گفتگوؤں اور کانگریس و ہندو مہاسبھا کے اجلاسوں میں مسلمانوں کے ان مطالبات کو ، جو قرارداد میں مدون کئے گئے تھے ، یا ان کے بعض معتدل اجزاء کو درخور اعتناء نہ سمجھا ۔ بلکہ اس کے برعکس کانگریس نے ۱۹۳۰ء میں اپنے نقطۂ نظر کو حکومت سے منوانے کی خاطر سول نافرمانی کی مہم شروع کر دی تھی ۔ غرض کہ مسلمانوں کے شدید فرقہ پرست قائدین تو کجا ، مسٹر محمد علی جناح اور مولانا محمد علی جیسے قدیم کانگریسی زعماء کو بھی کانگریس اور ہندو اکثریت کے رویہ سے مایوسی ہو چکی تھی ۔ گویا قرارداد دہلی کی بنیاد پر ہندو اکثریت یا کانگریس سے مفاہمت کا اب کوئی سوال ہی نہ رہا تھا ۔ اس طرح ہندوستانی سیاست کے ایک فریق کو اس قرارداد کے اہم اور معتدل مطالبات پر بھی رضامند کرنے کی کوشش رائیگاں ہو چکی تھی ۔ اب رہ گیا دوسرا فریق یعنی برطانوی حکومت ، تو یہ فریق دراصل اس مسئلہ میں ایک کلیدی حیثیت (Key Position) رکھتا تھا ، کیونکہ اس کی ان مسلم مطالبات پر رضامندی

کے معنی یہ تھے کہ انھیں دستوری منظوری حاصل ہو چکی ہے ۔ ایسی صورت میں دانائی و تدبر کا تقاضہ یہ تھا کہ اِس فریق کو ہموار کرنے کی تمام کوششیں کی جائیں اور ہر اس سعی سے اجتناب کیا جائے ، جس سے یہ فریق بھی بھڑک جائے ۔ قرارداد دہلی کے وہ مطالبات جن کا تعلق جداگانہ انتخاب ، سندھ کی علیحدگی ، سرحد و بلوچستان میں اصلاحات کے نفاذ ، پنجاب و بنگال میں مسلمانوں کی آئینی اکثریت کے تحفظ سے تھا ، مسلم قوم کی جداگانہ ہستی کے لئے ، بمنزلہ روح کے تھے اور ظاہر ہے کہ ان کا برطانوی حکومت سے منوانا ، اس موقع پر مقدم تھا ۔ گول میز کانفرنس میں ڈاکٹر صاحب اور دیگر مسلم مندوبین کی اِسی لئے تمام تر کوشش یہی رہی کہ ان بنیادی مطالبات کو جن پر مسلم قوم کی جداگانہ ہستی کا انحصار ہے ۔ برطانوی حکومت سے منوا لیا جائے ۔ ڈاکٹر صاحب کی تجویز اِسی وقت زیر غور آ سکتی تھی جبکہ مسلمانوں کے یہ بنیادی مطالبات تسلیم کر لئے جاتے ۔ ان بنیادی امور کو منوائے بغیر ڈاکٹر صاحب کی تجویز پر غور و بحث کرنا ، ایسا ہی تھا جیسا کہ گاڑی کے پیچھے گھوڑا لگایا جائے حقیقت یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی یہ مسلم مملکت دراصل اسلامی عظمت کا ایک دلکش قصر تھا ، جس کی بنیاد ان ہی مطالبات پر قائم تھی اور ایک ہوشیار معمار کا کام یہ نہیں ہے کہ وہ بنیادوں کو استوار کرنے سے قبل ہی اپنے قصر کے سقف و سائبان اور اس کی دیواروں و میناروں کو محض اس لئے تعمیر کرنے لگے کہ یہیں اس کو اپنے نقش و نگار اور فن و کمال کا حقیقی مظاہرہ کرنا ہے ! اگر علامہ مرحوم گول میز کانفرنس میں اپنی اِس اسکیم کے پلندے کو لئے لئے پھرتے اور اس کو آگے بڑھانے کی کوشش کرتے تو اس سے یقیناً ان کی اپنی خود بینی و خود پسندی کا اظہار تو ہوتا ، مگر یہ ان کی عملی سیاستدانی کا مظاہرہ نہ ہوتا ! !

واقعہ یہ ہے کہ علامہ مرحوم کی یہ اسکیم قرارداد دہلی سے ، جیسا کہ وہ خود کہتے ہیں ، ایک قدم آگے تھی ، بلکہ یوں کہنا چاہئیے کہ جس دستوری موقف میں اِس وقت مسلمان تھے اور جس منزلِ مقصود کی طرف علامہ مرحوم انھیں لے جانا چاہتے تھے ، ان دونوں کے درمیان قراردادِ دہلی کی حیثیت ایک سنگِ میل کی سی ہے ، جس کو طے کئے بغیر اصلی

منزلِ مقصود تک پہنچنا محال تھا ۔ اگر علامہ مرحوم اس امر کی کوشش کرتے کہ مسلمان اِس سنگِ میل کو نظر انداز کر کے ، یا اس پر سے چھلانگ لگا کر ، منزلِ مقصود تک پہنچ جائیں تو یہ کوشش ، مسلمانوں کو ایک خلاء میں معلق کر دینے کے مترادف ہوتی! ــــــ پھر اِس واقعہ کو بھی پیشِ نظر رکھیے کہ دوسری گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم مفاہمت کی ان تھک کوشش کی گئی ۔ لیکن یہ کوشش ناکام ہی رہی ۔ اب مسلمانوں کو ہندوؤں سے مفاہمت کی جو رہی سہی توقع تھی ، وہ بھی بالکلیہ ختم ہو چکی تھی اور وہ ایسے موقف میں آ گئے تھے ؛ جہاں انہیں اپنے مطالبات کو منوانے کے لئے لازماً برطانوی حکومت پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا ۔ اِس منزل پر عملی سیاست کا تقاضا یہ تھا کہ برطانوی اربابِ اقتدار کو بلاوجہ بدگمان و ناراض نہ کیا جائے ، تاکہ وہ ان مسلم مطالبات کو آسانی اور سہولت کے ساتھ مان لیں اور اِس امر کا اندیشہ تھا کہ اگر علامہ مرحوم کی اِس اسکیم کو پُر زور طریقہ پر گول میز کانفرنس میں آگے بڑھانے کی کوشش کی جاتی تو برطانوی اربابِ اقتدار محض اِس اسکیم کے انوکھے پن اور ان کے بنیادی تصورات (وطنی قومیت و لادین سیاست) سے معارض ہونے کے باعث ، خواہ مخواہ چیں بہ چیں ہو جاتے ، جس کا بُرا اثر ان بنیادی مطالبات پر پڑتا ۔

محض اِس اسکیم کا انوکھا پن اور اِس کے بنیادی تصورات ہی برطانوی اربابِ اقتدار کی ناراضی کا باعث نہ بنتے بلکہ اس سے بھی زیادہ قوی ، ایک اور اندیشہ تھا ۔ وہ اندیشہ یہ تھا کہ کہیں برطانوی مدبرین اِس کو قدیم مسلم مغلیہ سلطنت کے احیاء کا ایک جدید روپ نہ سمجھ لیں ۔ جو لوگ برطانوی قوم کی نفسیات سے واقف ہیں ، وہ آسانی سے اِس امر کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اگر اِس اسکیم کو یکایک باضابطہ طریقہ سے ، گول میز کانفرنس میں پیش کر دیا جاتا ، تو برطانوی قوم کی رگِ حمیت یقیناً بھڑک اٹھتی ۔ کسی مسئلہ کو ایک اصولی مسئلہ بنا کر اپنے وقت پر انگریزوں کے سامنے پیش کیا جائے تو یقیناً وہ اِس پر سنجیدگی کے ساتھ غور کرنے کے لئے ہمیشہ آمادہ و تیار رہتے ہیں ، لیکن اگر اِس مسئلہ کو بے موقع اور ایسے انداز سے پیش کیا جائے جس سے اِن کے قومی اعزاز کو ذرا سی بھی ٹھیس لگنے کا

اندیشہ ہو تو سرے سے اِس معقول مسئلہ کے مخالف بن جاتے ہیں ۔ انگریزوں نے ہندوستان کا اقتدار مسلمانوں سے چھینا تھا ۔ ۱۸۵۷ء میں اِن کے خلاف جو تحریک آلِھی اِس میں ہندو اور مسلمان دونوں ہی شریک تھے ، لیکن اِس تحریک کو انھوں نے غدر کا نام دیا اور اپنا سارا غصہ مسلمانوں پر آتارا۔ اِن کے ذہن میں اس وقت بس یہی بات بیٹھ گئی کہ مسلمان ، جن سے ہم نے سلطنت چھینی تھی ، اب پھر اپنے اقتدار کو حاصل کرنا چاہتے ہیں ۔ اسی لئے انھوں نے ہندوؤں کو تو معاف کر دیا ، لیکن مسلمانوں پر نہ صرف مظالم ڈھائے بلکہ ایک عرصہ تک ان پر معاشی اور سیاسی ترقی کے دروازے بند کر دیئے ۔ علامہ اقبال کی یہ تجویز یقیناً ہندوستان میں پھر ایک مرتبہ اسلامی مملکت کے قیام ہی کی ایک کوشش تھی ، اِس لئے انھیں اندیشہ تھا کہ جس قوم نے ۱۸۵۷ء کی تحریک کو غدر کا نام دیا اور اِس کو قدیم مغلیہ سلطنت کے احیا کی ایک کوشش سے تعبیر کر کے ، مسلمانوں پر مصائب کے پہاڑ توڑے تھے ، وہی قوم اِس اسکیم کے باقاعدہ اور باضابطہ پیش کر دیئے جانے پر پھر آگ بگولہ نہ ہو جائے !

مذکورہ بالا خطرہ کوئی موہوم یا خیالی خطرہ نہ تھا ۔ علامہ اقبال نے برصغیر میں مسلم مملکت (پاکستان) کے قیام کی تجویز دسمبر ۱۹۳۰ء میں پیش کی تھی ۔ یہ زمانہ ہندو مسلم اختلافات کے عروج کا زمانہ تھا ۔ دراصل تحریکِ ترکِ تعاون کے بعد ہی ۱۹۲۳ء میں ہندو مسلم اختلافات شروع ہو چکے تھے ۔ اِس کے بعد سے یہ اختلافات بڑھتے گئے ۔ ہندوؤں نے بلا وجہ مسلمانوں پر بے اعتمادی کا اظہار کرنا شروع کر دیا ، اور طرح طرح سے انھیں مطعون و بدنام کیا ۔ اِس سلسلہ میں چھوٹے درجہ کے ہندو لیڈروں نے ہی نہیں بلکہ نہایت اونچے درجہ کے نیتاؤں نے بھی مسلمانوں کے خلاف نہایت رکیک پروپاگنڈا کرنے سے احتراز نہیں کیا ۔ اِس پروپاگنڈے کا سب سے تیز ہتھیار ، " پان اسلامزم " تھا ۔ کانگریس کے سب سے بڑے لیڈر اور ہندوؤں کے مہاتما ، گاندھی جی نے بھی اِس اوچھے ہتھیار کو استعمال کرنے میں قباحت محسوس نہیں کی ۔ انھوں نے فروری ۱۹۲۵ء میں اپنے اخبار میں لکھا ۔

" ہندو مسلمانوں سے اِس لئے خائف ہیں کہ جب کبھی مسلمانوں

کے ہاتھ میں قوت آئی ، انھوں نے ہندوؤں کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کیا ، اگرچہ ہندوؤں کی اکثریت تھی ، لیکن مٹھی بھر حملہ آوروں نے ان کو مغلوب کر دیا ، اور اِس ملک میں اسی تجربہ کے دوبارہ پیش آنے کا خطرہ ہے اور مسلمان لیڈروں کی سچائی اور خلوص کے باوجود عام مسلمانوں کا بیرونی مسلمان حملہ آوروں سے مل جانا یقینی ہے[۲۵] "

کانگریس کے ایک دوسرے بڑے لیڈر لالہ لجپت رائے نے جو دراصل ہندو مہاسبھا کے نیتا تھے ، اِسی زمانہ میں صاف صاف کہا ۔

" میں سات کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ ، افغانستان ، وسط ایشیاء ، عرب ، عراق ، اور ترکی کے مسلح غول رہتے ہوں گے ، جن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا[۲۶] "

اِسی کو " پان اسلامزم " کا خطرہ کہا جاتا تھا ۔ اور چاہے عام ہندو یا ان کے یہ بہادر نیتا یہ خطرہ واقعی محسوس کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں ، بہرحال اِس " پان اسلامزم " کا انھوں نے بڑے زور و شور سے پراپیگنڈا کر رکھا تھا ۔ اِس پراپیگنڈے کا ایک واضح مقصد انگریزوں کو مسلمانوں کی طرف سے بد ظن کرنا بلکہ انہیں بھڑکانا تھا ۔

یہ ایک تاریخی حقیقت تھی کہ انگریزوں نے برصغیر میں حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی ۔ پھر انہیں اپنی حکومت کے لئے خطرہ بھی ، شمال مغرب کی طرف سے تھا ، جہاں اُن کے زیر اقتدار علاقہ میں اکثریت مسلمانوں کی تھی ۔ پھر یہ مسلمان ، نڈر ، بہادر ، یا ان کی نظر میں "سرکش" رہے تھے ۔ یہی وجہ تھی کہ پنجاب میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہندوستان

۲۵- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ، مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۳۱ع ص ۱۸۹ ۔

۲۶- اخبار مرہٹہ ۲ فروری سنہ ۱۹۳۰ع بحوالہ سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ، مطبوعہ عزیزی پریس آگرہ سنہ ۱۹۳۱ع ص ۱۹۰ ۔

کے دیگر صوبوں کی بہ نسبت دیر سے ہوا - سرحد میں سنہ ۱۹۳۶ء سے پہلے اصلاحات نافذ ہی نہیں کی گئیں ، علاوہ ازیں ان علاقوں کا جغرافیائی محل وقوع ایسا تھا کہ ان کے مغرب میں مسلم مملکتوں کا زنجیرہ سا پھیلا ہوا تھا ، افغانستان ، ایران ، ترکی اور پھر عرب ممالک - انگریزوں نے ایک طرف شمال مغربی ہند کے مسلم علاقہ کو سیاسی و معاشی حیثیت سے پس ماندہ رکھا ، اور دوسری طرف انھوں نے افغانستان سے مسلسل تین جنگیں لڑ کر اسے کمزور کر دیا اور ایران کی طاقت کو ابھرنے نہ دیا - یہ سب کچھ اِسی لئے تھا کہ ہندوستان کی برطانوی حکومت کے لئے شمال مغرب سے کوئی خطرہ پیدا نہ ہو ! !

اب اگر کسی گوشہ سے اِس قسم کے خطرہ کی کوئی بات سنائی دیتی تو انگریز کان کھڑے کر لیتے تھے - اِس معاملہ میں پوری انگریزی قوم بڑی " ذی حس " (Allergic) تھی - ان کی " حساسیت " (Allergy) کی بعض اور وجوہات بھی تھیں ، براعظم ایشیا اور افریقہ کے جن حصوں پر برطانوی سامراج قابض تھا ، وہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ، اسلام ، ان سب مسلمانوں کو اخوت کی دعوت دیتا اور انھیں ایک ہی لڑی میں پروتا تھا - ماضی میں مسلمانوں کی یہی " اخوت " ، ایک عالمی برادری کو منصہ شہود پر لا چکی تھی ، جس کی ایک سیاسی تنظیم خلافت ترکیہ کی شکل میں رونما ہوئی تھی - برطانوی استعمار نے خلافت ترکیہ کا تیاپانچا کیا ہی اِس لئے تھا کہ مسلمانوں کا کوئی مرکز اتحاد رہنے نہ پائے اور ایک عالمی قوت بن کر ان کے ابھرنے کا کوئی امکان ہی پیدا نہ ہو - گویا نہ رہے بانس نہ بجے بانسری - سچی بات یہ ہے کہ انگریزوں نے اتنی عظیم الشان اور وسیع سلطنت قائم کر لی تھی کہ اِس میں سورج غروب نہ ہوتا تھا ، اور اِس کا کوئی مدِ مقابل یا اِس کو چیلنج کرنے والا نہ تھا - تاہم اگر اِس سامراجی دیو کو کسی طرف سے کوئی خطرہ تھا ، تو اِس کے زیر اثر و زیرِ انتداب و اقتدار مسلمانوں کی یہی " عالمی اخوت " تھی ، جس کو انھوں نے " پان اسلام ازم " کا نام دے رکھا تھا - اِس سے خطرہ محسوس کرنے میں وہ ایک حد تک حق بجانب بھی تھے ، کہ صلیبی جنگوں میں ، اِسی اخوت سے وہ ٹکر لے چکے تھے ، اور اِس کی قوت کا

اندازہ کر چکے تھے ۔ کانگریس اور ہندو مہاسبھا کے لیڈروں کے ہاتھوں میں مسلمانوں کے خلاف انگریزوں کو بھڑکانے کا " پان اسلامزم " سے زیادہ کارگر ہتھیار اور کیا ہو سکتا تھا ، چنانچہ جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے یہ ہتھیار سنہ ۱۹۲۳ع کے بعد سے مسلسل استعمال کیا گیا اور انگریزوں کو بھڑکایا گیا ۔

ہم بتا چکے ہیں کہ علامہ اقبال کی مسلم مملکت والی اِس اسکیم کو بھی پان اسلامزم کا ایک شاخسانہ قرار دیا گیا تھا ۔ محض یہ بات کہ یہ مملکت برصغیر کے جن خطوں میں قائم ہو رہی تھی ، ان میں یہ شمال مغربی علاقے بھی شامل تھے ، جہاں کے مسلمان " لڑاکو " اور اِسی لئے انگریز کی نظر میں سرکش تھے ، اور جن کا جغرافیائی اتصال مسلمانوں کی دیگر مملکتوں ، افغانستان اور ایران وغیرہ سے ہوتا تھا ، اِس امر کے لئے کافی تھا کہ اِس کو پان اسلامزم کی ایک وسیع اور ہمہ گیر اسکیم کا ایک جز قرار دے دیا جائے ۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ علامہ اور ان کی اِس اسکیم کو نازک مواقع پر " پان اسلامزم " کے پروپیگنڈے کا نشانہ بنایا گیا ۔ دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن روانہ ہوتے وقت ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع بمبئی کرانیکل کے نامہ نگار نے بمبئی میں ان سے جو دوسرا سوال کیا وہ یہی تھا کہ

" پان اسلامزم کے متعلق آپ کا کیا تصور ہے "

اِس سوال کے پیچھے جو ذہنیت کام کر رہی تھی ، وہ یہی تھی کہ علامہ اقبال اور ان کی اِس تجویز کو اِس رکیک لیکن مؤثر پراپیگنڈے میں ملوث کیا جائے ۔ پھر لندن میں اِسی دوسری گول میز کانفرنس کے دوران ایڈورڈ تھامسن نے لندن کے سب سے زیادہ مشہور کثیرالاشاعت و قیع اور مقتدر اخبار " ٹائمز " مورخہ ۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع میں اپنا وہ خط شائع کیا جس میں انھوں نے علامہ اقبال کی اِس تجویز کو " پان اسلامی سازش" قرار دیا تھا ! اِس خط کا پورا متن ہم گذشتہ صفحات میں درج کر آئے ہیں ۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ اِس زمانہ میں دوسری گول میز کانفرنس کے اجلاس ہو رہے تھے ۔ ان اجلاسوں میں علامہ اقبال شریک ہو رہے

تھی ، لیکن انھوں نے اپنی اِس تجویز کے متعلق ابھی تک کچھ نہیں کہا تھا ۔ نہ کانفرنس کے اندر ، نہ کسی پبلک جلسہ میں اور نہ کسی اخبار کے صفحات پر ۔ ہوا صرف یہ کہ اخبار ٹائمز نے اپنی اشاعت مورخہ ۲۹ ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع کو ایک اداریہ میں جس کا عنوان "ہندوستانی اقلیتیں" تھا — اقلیتوں کے مؤقف کی وضاحت کی تھی ، اور اِسی سلسلہ میں اِس نے مسلمانوں پر لگائے جانے والے الزام " پان اسلامزم " پر اظہار تاسف کیا تھا ، بس ایڈورڈ تھامسن صاحب کے لئے یہ بہانہ کافی تھا ، انھوں نے ایک خط شائع کرایا ، اِس کا عنوان رکھا " پان اسلامی سازش " اور اِس " پان اسلامی سازش " کے ثبوت میں اقبال کی اِس تجویز کو پیش کیا ، بلکہ اِس کو اِس سازش کی بنیاد قرار دیا ۔ تھامسن کے الفاظ ملاحظہ کیجئے ۔ وہ ٹائمز کے ایڈیٹر کو مخاطب کرکے لکھتے ہیں ۔

> " ۲۹ ستمبر کے مقالہ افتتاحیہ میں جس کا عنوان " ہندوستانی اقلیتیں" تھا ، آپ نے پان اسلامی سازش کی الزام تراشی پر اظہار افسوس کیا ۔ اِس کی " بنیاد " ایسے بیانات پر ہے ، جیسا کہ سر محمد اقبال نے گذشتہ دسمبر میں اپنے خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں دئے ہیں[۲۷] "

اِس کے بعد انھوں نے اقبال کے خطبۂ صدارت سے وہ عبارت نقل کی جس میں اِس تجویز کا ذکر ہے ۔ پھر انھوں نے بلا ضرورت آغا خاں پر بھی یہ کہہ کر کیچڑ اچھالی کہ

> " وہ (یعنی آغا خاں) یہ بھی بتاتے کہ اپنی انسانی اخوت کی تعلیم کو روبہ عمل لانے میں اسلام عیسائیت پر بھی فوقیت رکھتا ہے[۲۸] "

۲۷۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ڈار ناشر اقبال اکادمی ص ۱۱۷ ۔

۲۸۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی ص ۱۱۸ ۔

ظاہر ہے کہ یہ " اسلامی اخوت " ہی تھی ، جس کو یہ انگریز " پان اسلامزم " کہتے تھے - اور یہ پان اسلامزم ہی تھی جو ایڈورڈ تھامسن کے دل میں پھانس بن کر چبھ رہی تھی ، اور اقبال و آغا خاں پر کیچڑ اچھالنے پر مجبور کر رہی تھی - تھامسن نے کیچڑ اچھالنے پر ہی اکتفا نہ کی ، بلکہ اقبال کی تجویز کو انہوں نے کھینچ تان کر دفاع ہند سے نتھی کر دیا اور یہ تک کہہ دیا -

" ذرا نقشہ پر نظر ڈالیے اور دیکھیے کہ بقیہ ہندوستان کے لئے کسی قسم کی قابل دفاع سرحد باقی رہ جاتی ہے[۲۹] " ؟

ذرا دیکھیے بات کہاں سے چلی اور تان کہاں جا کر ٹوٹی ! بات چلی تو تھی ٹائمز کے اداریہ سے جس میں اقلیتوں کا تحفظ اور ان کے مؤقف پر روشنی ڈالی گئی تھی - تھامسن نے زبردستی بے محل اور بے موقع اقبال اور ان کی تجویز مسلم مملکت (پاکستان) کو اِس بحث میں گھسیٹ لیا ، اِس کو پان اسلامی سازش قرار دیا ، اسلامی اخوت پر چوٹ کی . عیسائیت پر اسلام کی فوقیت کا طنزاً ذکر کیا اور بالآخر برطانوی مملکت ہند کے لئے دفاعی نقطۂ نظر سے اِس کو ایک خطرہ قرار دے ڈالا !

ان حالات میں ، اور ایسے ماحول میں کیا یہ بات ملت کے مفاد میں ہوتی کہ علامہ اپنی تجویز " مسلم مملکت " کو ضابطہ طریقہ پر اور آئینی انداز میں گول میز کانفرنس کے اندر پیش کرتے ؟ اور اگر پیش کرتے تو کیا کامیاب ہو جاتے یا الٹے ملت کے سیاسی مؤقف کو نقصان پہنچاتے ؟

عملی سیاست میں " وقت " بہت اہم عنصر ہے - " بروقت " کارروائی سے بہترین نتائج حاصل ہوتے ہیں اور اگر وہی کارروائی یا اِس کے متعلق کسی ایک لفظ کا اظہار بے وقت ہو تو ، دہ چند نقصان بھی پہنچ جاتا ہے - کامیاب سیاست دان وہی ہے ، جو صحیح وقت پر صحیح قدم اٹھاتا ہے - اور اگر یہی صحیح قدم ، وہ غلط وقت پر اٹھائے تو نہ صرف خود

۲۹- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی - اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۸ -

ٹھوکر کھاتا ہے ، بلکہ اپنے ساتھ اپنی قوم کو بھی لے ڈوبتا ہے ۔ علامہ اقبال نے اپنی مسلم مملکت والی تجویز سنہ ۱۹۳۰ء میں پیش کر دی تھی تاکہ قوم کے سامنے ایک نصب العین آ جائے ، اور وہ اِس پر سوچ بچار کرے ۔ ملت کے سامنے اِس تجویز کو رکھنے کا یہ صحیح وقت تھا ، کیونکہ وہ اس وقت ہندوؤں کی طرف سے چوٹ کھائی ہوئی تھی ، اور انگریزوں کی طرف سے مطمئن نہ تھی ۔ نفسیاتی نقطۂ نظر سے اسے اِس وقت ایک مطمح نظر کی تلاش تھی جو اِس کو ہندو اکثریت کے خطرہ سے نجات دلائے اور اِس کی دبی ہوئی امنگوں اور چھپی ہوئی خواہشوں کی تسکین کا سامان فراہم کرے ۔ اقبال نے مسلم مملکت کے قیام کی اِس تجویز کو اِس نفسیاتی موقع پر ملت کے سامنے رکھ کر ، انھیں یہ مطمح نظر فراہم کر دیا ، لیکن ابھی وہ وقت نہیں آیا تھا کہ اِس تجویز کو ایک مطالبہ کی صورت میں باضابطہ طور پر برطانوی حکومت کے سامنے پیش کیا جاتا ۔ برطانوی سامراج کی گرفت ابھی ڈھیلی نہیں ہوئی تھی ، پھر مسلمانوں کی طرف سے انگریزوں کے دل میں کوئی " نرم گوشہ" (Soft Corner) بھی موجود نہ تھا ۔ اِس کے برعکس وہ انھیں ہمیشہ بدگمانی کی نظروں سے دیکھتے اور ہر وقت ان سے چوکنے رہا کرتے تھے ۔ سنہ ۱۹۱۶ء کی " ریشمی رومال " والی تحریک ، جس کے بانی مبانی مسلمان اکابر شیخ الہند مولانا محمود الحسن ، مولانا عزیز گل و مولانا حسین احمد مدنی تھے ، انگریزوں کی نظر میں سلطنت برطانیہ کے خلاف ایک " پان اسلامی سازش " تھی جس میں افغانستان اور ترکی جیسے مسلم ممالک کو شمال مغربی سرحد کی طرف سے ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی گئی تھی ۔ یہ پان اسلامی سازش کبھی ان کے ذہن سے محو نہ ہوئی تھی ۔ سنہ ۱۹۲۰ء کی تحریک ترک تعاون و سول نافرمانی میں عام مسلمانوں نے ہندوؤں سے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا ۔ اِس تحریک میں جان مجلسِ خلافت اور اِس کے مسلمان لیڈروں علی برادران نے ڈالی تھی[۹]، اور تحریکِ خلافت کی بنیاد کوئی مقامی ہندوستانی مسئلہ نہ تھا ، بلکہ ماورائے حدودِ ہند ، مسلمانوں کی عالمی اخوت کے مظہر ، خلافتِ ترکیہ کی بقاء و تحفظ کا مسئلہ تھا ۔ گویا وہی " اخوت اسلامی " یعنی " پان اسلامزم " ہی تھی ، جس نے تحریک خلافت

کے روپ میں مسلمانوں کو سنہ ۱۹۲۰ء میں انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دیا تھا ۔ اور انگریزوں سے بڑھ کر اِس حقیقت سے کون واقف تھا ؟ پھر شمال مغربی سرحد کا یہ خطرہ تو ان کے ذہن میں ہر وقت گھومتا رہتا تھا ، جس کا اظہار ایڈورڈ تھامسن کے مذکورہ بالا خط سے ہوتا ہے ۔ الغرض مسلمانوں کو بحیثیت مجموعی انگریزوں کا وہ اعتماد کبھی بھی حاصل نہ ہوا ، جو ہندوؤں کو حاصل تھا ، وہ ان کی نظر میں ایسے عناصر تھے ، جن کے تعلقات ہند سے باہر کی طاقتوں سے ہمیشہ رہے ۔ پھر ان تعلقات کا محرک کوئی معمولی جذبہ نہ تھا ، بلکہ " اخوت اسلامی " (پان اسلامزم) تھی جس نے یورپ میں ان کے چھکے چھڑا دئے تھے ، اور ہندوستان میں بھی انھیں چین سے حکومت کرنے نہ دی تھی ۔ ریشمی رومال کی سازش ، خلافت کی تحریک شمال مغربی ہند کی طرف سے سرکشی ، افغانی ہوا ، ـــــ ان سب باتوں کی وجہ سے انگریزوں کے دل ، مسلمانوں کی طرف سے پہلے ہی صاف نہ تھے ، اور اب دوسری گول میز کانفرنس کے موقع پر تھامسن نے انھیں اور بھڑکایا تھا ۔ یہ وقت کسی لحاظ سے بھی موزوں نہ تھا کہ علامہ اقبال اپنی یہ تجویز برطانوی حکومت کے سامنے رکھتے ۔ اِس سے حاصل تو کچھ نہ ہوتا ، الٹے یہ تجویز مسلمانوں کے مفاد کے خلاف پڑتی ! یہی وجہ تھی کہ علامہ اقبال نے نہ صرف اِس تجویز کو دوسری گول میز کانفرنس میں پیش نہیں کیا ، بلکہ ایڈورڈ تھامسن کے زہریلے خط کا جو جواب ، انھوں نے شائع کرایا اِس میں ایسا انداز اختیار کیا ، جس سے ان کی یہ تجویز ، "خطرناک" کے بجائے " معصوم " نظر آئے ۔

ڈاکٹر تھامسن کے جواب میں انھوں نے پہلی بات تو یہ کہی کہ انھوں نے مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت میں " برطانوی سلطنت سے باہر " مسلم مملکت کے قیام کا " مطالبہ " پیش نہیں کیا تھا ، بلکہ جو کچھ انھوں نے کہا تھا ، وہ مستقبل میں پیش آنے والے واقعات کے متعلق ایک " تخمینہ " (Guess) تھا ۔ اقبال کے الفاظ یہ تھے ۔

" کیا میں ڈاکٹر تھامسن سے یہ کہہ سکتا ہوں کہ میں نے برطانوی سلطنت سے باہر مسلم مملکت کا " مطالبہ " پیش نہیں کیا

ہے بلکہ دھندلے مستقبل میں ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی کے متعلق یہ ایک " تخمینہ " ہے ، جو برصغیر ہند کے مقدر کی اِس وقت صورت گری کر رہی ہیں[۳۰] "

پھر دوسری بات انہوں نے یہ کہی کہ وہ ہندوستان کی ایسے صوبہ جات میں از سر نو تقسیم کے حامی ہیں ، جس میں کسی ایک فرقہ کی مؤثر اکثریت ہو ۔ اور تیسری بات انہوں نے یہ کہی کہ اِس تقسیم کی تائید انگریزوں نے سائمن رپورٹ میں اور ہندوؤں نے نہرو رپورٹ میں کی ہے ۔ اقبال کے اپنے الفاظ ملاحظہ ہوں ۔

" میں ہندوستان کی ، ایسے صوبہ جات میں از سر نو تقسیم کا حامی ہوں ، جس میں کسی ایک فرقہ کی مؤثر اکثریت ہو ، جس کی وکالت نہرو رپورٹ اور سائمن رپورٹ نے کی ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ مسلم صوبوں کے متعلق میری تجویز اِسی تخیل کو آگے بڑھاتی ہے[۳۱] "

آخر میں دفاع ہند اور برطانوی سلطنت کے خلاف جس خطرہ کی نشان دہی تھامسن نے کی تھی ، اِس کی صفائی میں انہیں یہ کہنا پڑا ۔

" ہندوستان کی شمال مغربی سرحد پر مطمئن اور منظم مسلم صوبوں کا ایک سلسلہ سطح مرتفع ایشیا کی بھوکی نسلوں کے خلاف ہندوستان کے لئے اور برطانوی سلطنت کے لئے ایک فصیل ثابت ہو گا[۳۲] "

ایسے گھٹے ہوئے ماحول میں انہیں یہاں تک کہنا پڑا کہ

" کوئی ہندوستانی مسلمان ، جو عقل کا کوئی شائبہ رکھتا ہے ، عملی

۳۰۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۱۱۹ ۔

۳۱۔ ایضاً ص ۱۲۰ ۔

۳۲۔ ایضاً ص ۱۲۰ ۔

سیاست کے ایک منصوبہ کی حیثیت سے برطانوی دولت عامہ سے باہر شمال مغربی ہند میں ، مسلم مملکت یا مملکتوں کے سلسلہ کو قائم کرنے کا خیال نہیں کر رہا ہے[۳۳] "

اِس نقرہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا درست نہ ہوگا کہ علامہ نے اپنی مسلم مملکت والی تجویز ترک کر دی تھی، کیونکہ وہ اِسی خط میں کہتے ہیں کہ مسلم مملکت کے قیام کا جو ذکر ، انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں کیا تھا وہ دراصل ان زبردست قوتوں اور ان کی کارفرمائیوں کے مطالعہ کا حاصل تھا ، جو انہیں برصغیر ہند کے مستقبل کی تشکیل کرتے ہوئے دکھائی دے رہی ہیں ۔ اگر تھامسن کی الزام تراشی کے مقابلہ میں وہ اپنی اِس تجویز سے دستبردار ہی ہونا چاہتے تھے تو صاف الفاظ میں اِس سے اپنی برأت کا اظہار کر دیتے ، لیکن انھوں نے ایسا نہیں کہ بلکہ اپنے اِس تصور مسلم مملکت کے متعلق انھوں نے وہی ٹھوس ، پُر مغز اور جاندار الفاظ اِس خط میں بھی استعمال کئے ہیں ، جو انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں استعمال کئے تھے ۔ وہاں انھوں نے کہا تھا کہ " شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم مملکت کی تشکیل " مسلمانوں کے لئے " مقدر " ہو چکی ہے اور یہاں وہ کہہ رہے ہیں کہ یہ مسلم مملکت ، " ان زبردست قوتوں کی امکانی کارفرمائی " کے نتیجہ میں ظہور پذیر ہوگی ۔ جو " برصغیر ہند کے مقدر کی صورت گری کر رہی ہیں " یہ تو برأت نہ ہوئی ، ادعّا ہوا ! تو پھر علامہ کو یہ سب " باتیں " کیوں کہنی پڑیں ؟ غالب نے کہا تھا ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادہ و ساغر کہے بغیر

یا پھر ایک دوسرے شاعر نے کہا تھا ۔

ع چھپا جاتا ہوں اپنے دل کا مطلب استعاروں میں

۳۳- ایضاً ص ۱۱۹ ۔

تو اقبال کو بھی یہاں " مشاہدۂ پاکستان " کی گفتگو کرتے ہوئے " بادہ و ساغر " کی باتیں بنانی پڑیں اور اپنے دل کا مطلب " سیاسی استعاروں " میں چھپانا پڑا ! —— یہ اقبال کی سیاسی فراست تھی ! ! مقصد اِس تمام داستان سرائی سے ان کا یہ تھا کہ مسلمانوں کے خلاف جو غبار انگریزوں کے دلوں میں پہلے ہی سے بھرا ہوا تھا ، اور جس کو دوسری گول میز کانفرنس کے اہم اور نازک موقع پر تھامسن نے مزید ہوا دی تھی ، اس کو کسی حد تک صاف کر دیا جائے ۔ جب حالات ایسے پیچیدہ اور موقع ایسا نازک ہو کہ بات بادہ و ساغر کہے بغیر نہ بنے اور زبان استعاروں کی استعمال کرنی پڑے تو پھر یہ سوال کہاں اور کیسے پیدا ہوتا ہے کہ اقبال نے کیوں گول میز کانفرنس میں پاکستان کی تجویز کو پیش نہیں کیا ؟

الغرض علامہ اقبال کی فراستِ ایمانی نے تدبر و مصلحت کا یہی تقاضا سمجھا کہ اِس تجویز کو آئینی طور پر آگے نہ بڑھایا جائے ، گویا گول میز کانفرنس کے موقع پر اِس اسکیم کو پیش نہ کرنا اِس امر کی دلیل نہیں ہے کہ یہ اسکیم علامہ مرحوم کی کوئی سنجیدہ تجویز نہیں بلکہ ایک شاعرانہ ترنگ تھی یا یہ کہ وہ اِس کو وفاقی اسکیم ہی کا ایک جزو سمجھتے تھے بلکہ یہ ان کے تدبر اور عملی سیاست سے مکمل واقفیت کا ایک ثبوت ہے ۔ بے محل نہ ہوگا اگر یہاں ہم گول میز کانفرنس کے ایک مندوب ، ان حالات کے ایک چشم دید گواہ اور ایک ایسے شخص کی ، جس نے اِس زمانے کی سیاست میں نمایاں عملی حصہ لیا ، شہادت کو پیش کر دیں ۔ ڈاکٹر بی ۔ آر امبیڈکر ، پاکستانی اسکیم کے گول میز کانفرنس میں پیش نہ کئے جانے کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں ۔

> " یہ ہو سکتا ہے کہ مسلمانوں نے اِس پر (یعنی پاکستانی اسکیم پر) اِس خیال سے اصرار نہیں کیا کہ کہیں ارباب اقتدار ناخوش نہ ہو جائیں چونکہ انھیں اِس وقت اپنے چودہ نکات حاصل کرنے کے لئے برطانوی ارباب اقتدار پر بھروسہ کرنا پڑ رہا تھا ، اِس لئے انھوں نے مدبرین کی مانند سیاسی کھیل سے پوری واقفیت کا

اظہار کیا ، اور اِس امر کو ترجیح دی کہ انتظار کریں اور چودہ نکات پہلے حاصل کر لیں[۳۴]"

علامہ مرحوم کی اِس تجویز کو شاعرانہ ترنگ یا وفاق اسکیم کا ایک جزو سمجھنا درست ہوتا ، اگر انھوں نے مسلم لیگ کے پلیٹ فارم سے اِس تجویز کو پیش کرنے کے بعد پھر اِس کی طرف توجہ نہ دی ہوتی - لیکن حقیقت یہ ہے کہ گول میز کانفرنس کے موقعہ پر بھی انھوں نے اِس تجویز کو اپنے ذہن سے محو نہیں کیا تھا - ان کے تدبر و فراست کا تقاضا یہ تھا کہ وہ رسمی طور پر اِس اسکیم کو پیش نہ کرتے ، لیکن ان کی دور بینی ، عاقبت اندیشی اور مصلحت سنجی کا اقتضاء یہ تھا کہ وہ اپنی اِس تجویز کو مستقبل میں اپنے وقت پر روبکار لانے کے لئے ، اِسی زمانے میں زمین ہموار کرتے - چنانچہ اسی غرض سے انھوں نے خانگی صحبتوں اور نجی گفتگوؤں میں برطانوی اہل فکر و نظر کو اپنی اس اسکیم کی معقولیت و افادیت سے آشنا کیا اور بعض سنجیدہ اصحاب حل و عقد کو اپنے نقطۂ نظر کا قائل بھی کر دیا ، جس کی تفصیل ہم گذشتہ صفحات میں پیش کر چکے ہیں -

دوسری گول میز کانفرنس میں تو یقیناً انھوں نے اپنی اِس تجویز کو پیش نہیں کیا ، کیونکہ مصلحت اور تدبر کا تقاضا ہی یہ تھا ، البتہ تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر انھوں نے کانفرنس کے باہر اور کانفرنس کے اندر بھی اِس تجویز کو پیش کیا ! —— کانفرنس کے باہر انھوں نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے جلسہ میں معززین و اکابرین برطانیہ کے سامنے نہایت پُر مغز تقریر کی اور اِس تقریر میں نہایت وضاحت کے ساتھ اپنی اِس تجویز کا ذکر کیا اور کہا -

"میرا ذاتی خیال اب بھی یہ ہے کہ یہی ایک ممکنہ حل ہے[۳۵]"

۳۴- پاکستان از ڈاکٹر امبیڈکر ص ۳۲۹ و ۳۳۰ -

۳۵- لیٹرز اینڈ رائیٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ناشر اقبال اکیڈمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع ص ۷۵ -

پھر خود اعتمادی اور اپنی رائے پر وثوق کا یہ عالم کہ انھوں نے پیش گوئی کے انداز میں کہا۔

"میں انتظار کروں گا ، اِس وقت کا جب کہ تجربہ اس تجویز کی دانشمندی یا غیر دانشمندی کو خود ہی ظاہر کر دے گا[۳۵]"

اور جب اِسی تیسری گول میز کانفرنس کے اندر انھیں تقریر کرنے کا موقع ملا تو انھوں نے ہندوستان کے آئندہ دستور کے لئے "لامرکز" کی تجویز پیش کی ۔ انھوں نے یہ رائے دی کہ ہندوستان کا آئندہ دستور اِس نوعیت کا بنایا جائے کہ اِس میں سرے سے کوئی مرکزی حکومت ہی نہ ہو ، بلکہ ہر صوبہ کو آزاد ڈومینین کی حیثیت حاصل ہو ، اور ان تمام صوبہ جات کا تعلق لندن میں وزیر ہند سے ہو ۔ غور سے دیکھا جائے تو علامہ اقبال کی یہ رائے دراصل اِسی اسکیم کی بدلی ہوئی صورت تھی ۔ جب ہندوستان میں کوئی مرکزی حکومت نہ ہو اور ہر صوبہ ایک ڈومینین قرار دے دیا جائے تو اِس کے بعد دوسرے مرحلہ پر مسلم صوبوں کو باہم ملا کر ایک وحدانی یا وفاقی مملکت قائم کرنا آسان ہو جاتا ۔ گویا "لامرکز" کی یہ تجویز ، مسلم مملکت کے قیام کا پہلا مرحلہ ثابت ہوتی ! بہرحال علامہ اقبال نے تیسری گول میز کانفرنس کے موقع پر جب کہ فضا نسبتاً صاف اور ہموار ہو چکی تھی ، پاکستان کی تجویز ، کانفرنس کے باہر بھی پیش کی اور اندر بھی ۔ اگرچہ اِس وقت بھی یہ احتیاط ضرور برتی کہ اِس کو مطالبہ کی شکل نہیں دی ! کیونکہ یہی مصلحتِ وقت اور عملی سیاست کا تقاضا تھا ۔ البتہ ان دونوں مواقع پر جس انداز میں انھوں نے اِس تجویز کا ذکر کیا ، اِس سے اِس مسلم مملکت کے قیام کے بارے میں ان کے مکمل استناد اور کامل ایقان کا اظہار ہوتا ہے ! !

مندرجہ بالا مباحث کا خلاصہ یہ ہے کہ علامہ اقبال نے سنہ ۱۹۳۰ع میں اپنی اِس تجویز کو سنجیدگی سے پیش کرنے کے باوجود آل پارٹیز مسلم کانفرنس کی قرارداد دہلی اور سائمن کمیشن کی بعض سفارشات کی تائید اصولاً اِس لئے کی تھی کہ یہ قرارداد اور یہ سفارشات مجموعی حیثیت سے علامہ اقبال کے عمومی رجحان سے قریب تر تھیں اور انھوں نے اپنی تجویز

کو خود مختار ریاست کے الفاظ کا جامہ اِس لئے نہیں پہنایا اور دوسری گول میز کانفرنس میں اِس کو باضابطہ طریقہ پر اِس لئے پیش نہیں کیا کہ عملی سیاست اور مصلحتِ وقت کا یہی تقاضا تھا ! !

اِس تمام بحث سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم نے جو تجویز پیش کی تھی ، اِس میں تقسیم ہند کا تصور مضمر تھا اور وہ اصولاً ایک علیحدہ آزاد وفاق اسلامی مملکت کے قیام ہی کی ایک تجویز تھی ــــ لیکن اگر کوئی شخص علامہ مرحوم کے مجموعی سیاسی تفکر سے صرف نظر کرکے ان کے خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ کے بعض فقروں سے یہ استدلال کرے کہ ان کی مسلم مملکت ، وفاقِ ہند ہی کا ایک جزو تھی تو پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس ریاست اور وفاق ہند کے مابین ، علامہ مرحوم کی نظر میں ، تعلقات کی نوعیت کیا تھی ؟

علامہ مرحوم کے خطبات و بیانات میں ہمیں ان تعلقات کے متعلق کوئی مفصل و واضح تصور نہیں ملتا ۔ پوری تحقیق و تفحص کے بعد جو چیز سامنے آتی ہے ، اِس کا تعلق صرف دفاع سے ہے ۔ لیکن علامہ اقبال نے دفاعی مسئلہ کو اپنے خطبۂ صدارت میں براہ راست ایک موضوع بنا کر یا وفاق ہند اور اِس مسلم مملکت کے باہمی تعلقات کی نوعیت پر بحث کرتے ہوئے نہیں اٹھایا ۔ اِس مسلم مملکت سے متعلق ہندو اکثریت کو دو ہی ممکنہ شدید اندیشے لاحق ہو سکتے تھے ، ایک تو یہ کہ اِس مسلم مملکت میں رہنے والی غیر مسلم اقلیت کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا اور دوسری یہ کہ اگر ہندوستان پر کوئی بیرونی طاقت حملہ کر دے تو یہ مسلم مملکت کہیں دشمنوں کا ساتھ تو نہ دے گی ۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے خطبہ میں ان دونوں اندیشوں کی تردید کی ۔ پہلے اندیشہ کی تردید کرتے ہوئے ، انھوں نے یہ واضح کیا کہ اِس مسلم مملکت میں طرز حکومت تو یقیناً اسلامی ہی ہوگا ، لیکن یہ طرز حکومت کوئی مثلاً راج یا تھیوکریسی تو ہے نہیں کہ ان کے مذہب اور ثقافت میں زبردستی مداخلت کا اندیشہ پیدا ہو بلکہ اسلامی احکام ہی کے مطابق اسلامی حکومت کا یہ فرض ہے کہ وہ غیر مسلموں کے نہ صرف جان ، مال ، عزت و آبرو ، بلکہ ان کے

مذہب ، مذہبی روایات اور عبادت گاہوں کی بھی حفاظت کرے[۳۶] -

دوسرے اندیشہ کا ازالہ کرتے ہوئے انھوں نے کہا -

" مجھے اِس میں شبہ نہیں ہے کہ اگر ایک وفاقی حکومت قائم ہو جائے تو مسلم مملکت ہندوستان کی دفاعی اغراض کی خاطر ایک غیر جانبدار ہندوستانی فوج اور بحری افواج کی تشکیل کے لئے خوشی کے ساتھ رضامند ہو جائے گی[۳۷] "

یہاں بھی انھوں نے جن الفاظ میں ایک غیر جانبدار فوج رکھنے کی تجویز پیش کی ہے ، اِس سے قطعیت کے ساتھ یہ نتیجہ نہیں نکالا جا سکتا کہ مسلم مملکت وفاق ہند کا ایک جزو ہو گی ، وہ کہتے ہیں کہ " مسلم مملکت خوشی کے ساتھ رضامند ہو جائے گی " - یہ رضامندی لازمی نہیں ہے کہ از روئے دستور ہی ہو بلکہ یہ رضا مندی ایک معاہدہ کے ذریعہ بھی دی جا سکتی ہے - لیکن قطع نظر ان امور کے ہم تھوڑی دیر کے لئے یہ تسلیم کر لیتے ہیں کہ علامہ مرحوم کے پیش نظر وفاقِ ہند ہی کا تصور تھا تو مندرجہ بالا اقتباس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ وفاقی حکومت کے سپرد وہ صرف دفاعی معاملات کرنا چاہتے تھے یا اگر اِس سے بھی ہم آگے بڑھنا چاہیں تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ دفاع اور وہ مواصلات جو دفاع کے لئے ضروری ہوں ـــــ یہی دو امور ان کے نقطہ نظر سے وفاقی امور تھے اور بقیہ دیگر معاملات میں یہ مسلم مملکت بالکلیہ آزاد ہوتی - اگر بحث کو ختم کرنے کی خاطر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ علامہ مرحوم کے پیش نظر وفاقی حکومت کا یہی تصور تھا ، تو یہ کم و بیش وہی تجویز ہے ، جو کل ہند مسلم لیگ کی جانب سے قائد اعظم محمد علی جناح نے ۱۲ مئی سنہ ۱۹۴۶ع کو کانگریس اور کابینی مشن (Cabinet Mission) کے پاس روانہ کی تھی - مسلم لیگ کی اِس اسکیم کا پہلا فقرہ یہ تھا -

---

۳۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۱ -

۳۷- ایضاً ص ۲۵ -

" پنجاب ، سرحد ، بلوچستان ، سندھ ، بنگال اور آسام ، ان چھ صوبوں کو ملا کر ایک گروپ بنایا جائے اور یہ گروپ بجز امور خارجہ دفاع ، اور ایسے مواصلات جو دفاع سے متعلق ہوں ، بقیہ تمام امور انجام دے گا ۔ امور خارجہ دفاع اور مواصلات متعلقہ دفاع کا تعلق پاکستان گروپ اور ہندوستان گروپ کی دستور ساز جماعتوں سے ہو گا[۳۸] "

اِس اسکیم میں مذکورہ بالا چھ صوبوں کا ایک گروپ بنایا گیا تھا ، جس کو پاکستانی گروپ کہا گیا ہے ۔ اور بقیہ صوبوں کا ایک دوسرا گروپ بنایا گیا تھا ، جس کو ہندوستانی گروپ سے موسوم کیا گیا ہے ۔ یہ دونوں گروپ اپنی اپنی جگہ علیحدہ علیحدہ وفاق تھے ، پھر ان وفاقوں کے درمیان ایک عہدیہ (Confederation) کی تشکیل کی تجویز پیش کی گئی تھی ، جس کے سپرد صرف تین امور تھے (۱) دفاع (۲) مواصلات متعلقِ دفاع (۳) امور خارجہ ـــــ اسی طرح علامہ مرحوم کے ذہن میں بھی ، زیادہ سے زیادہ ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ ہو سکتا ہے کہ ایک ڈھیلے ڈھالے عہدیہ (Confederation کا تصور ہو ، اور یہ بھی صرف ایک بعید مفروضہ امکان ہے ۔ واضح رہے کہ یہ بات بھی ہم نے برسبیل تنزل اور مخالفین کے بے بنیاد مفروضات کو محض بحث کی خاطر تسلیم کرتے ہوئے کہی ہے ۔ یعنی بفرضِ غلط اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ علامہ اقبال کے ذہن میں وفاقِ ہند کا کوئی تصور تھا ، تو وہ زیادہ سے زیادہ کچھ ایسا ہی تصور ہو سکتا ہے ، جس میں صرف دفاع امرِ مشترکہ ہو ، ورنہ حقیقت تو یہ ہے کہ ان کے ذہن میں ، جیسا کہ ثابت کیا گیا ہے ، کل ہند وفاق کا کوئی تصور سرے سے تھا ہی نہیں ، بلکہ اِس کے برعکس انھوں نے مسلم صوبوں کے ایک بالکلیہ جداگانہ ، علیحدہ اور کلیۃً آزاد وفاق کی تجویز پیش کی تھی ، جس کا کوئی دستوری تعلق کل ہند وفاق سے نہ تھا ! !

۳۸- سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح جلد دوم ، مرتبہ جمیل الدین احمد مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ع ص ۳۹۳ ۔

یہاں تک تو ہم نے یہ بتایا کہ علامہ اقبال نے اپنے خطبۂ صدارتِ مسلم لیگ میں مسلم مملکت کے قیام کا جو تصور پیش کیا تھا ، اِس کی مختلف تعبیریں کی گئیں ۔ کسی نے اِس کو وفاقِ ہند کا جز کہا ، کسی نے اِس کو وفاق ہند کے اندر محض ایک خود مختار صوبہ قرار دیا ، اور بعضوں نے اِس کو تقسیمِ ہند کے مغائر ٹھیرایا ۔ گذشتہ صفحات میں ہم نے ان تعبیرات کا اور اِس سلسلہ میں ، جو دلائل پیش کئے گئے اور جو سوالات اٹھائے گئے تھے ، ان سب کا مفصل تنقیدی جائزہ لیا ہے اور یہ ثابت کیا ہے کہ حضرتِ علامہ نے جو تجویز پیش کی تھی ، اُس میں تقسیم ہند کا تصور مضمر تھا اور وہ تجویز دراصل ایک بالکلیہ آزاد اور کلیۃً مقتدر مسلم مملکت کے قیام ہی کی تجویز تھی ۔ اب آئیے ان تعبیرات سے بھی بڑھ کر اِس سلسلہ کی ایک اور دلچسپ بات پر غور کریں ، جو علامہ کے متعلق بعض ذمہ دار اشخاص نے بیان کی ہے ، اور وہ بات یہ ہے کہ اقبال نے ہندوستان کو تقسیم کرکے ایک آزاد مقتدر مسلم مملکت (پاکستان) کو قائم کرنے کی تجویز ضرور پیش کی تھی ، لیکن اپنی زندگی کے آخری ایام میں وہ اِس تجویز سے منحرف ہو گئے تھے ! !

انحراف ؟
ایک من گھڑت افسانہ ! !

پنڈت جواہر لال نہرو اپنی مشہور تصنیف "ڈسکوری آف انڈیا" (Discovery of India) میں لکھتے ہیں ۔

" اقبال پاکستان کے اولین حامیوں میں سے ایک تھے ، تاہم انھوں نے اِس کے مضمر خطرہ اور اِس کی لغویت کو محسوس کر لیا تھا ۔ ایڈورڈ تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک گفتگو کے دوران اقبال نے ان سے کہا کہ انھوں نے پاکستان کی وکالت اِس لئے کی تھی کہ ان کی حیثیت مسلم لیگ کے اجلاس کے صدر کی تھی لیکن انھیں یقین تھا کہ یہ (تجویز) ہندوستان کے لئے بحیثیت مجموعی اور مسلمانوں کے لئے بالخصوص مضر ہوگی ۔ غالباً انھوں نے اپنی رائے تبدیل کر دی یا اِس سوال پر ابتداءً زیادہ غور نہیں کیا تھا کیونکہ اِس وقت اِس کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہوئی

تنی[۴۹] "

کچھ ایسی ہی بات کل ہند کانگریس کے سابق صدر اور بھارتی جمہوریہ کے سابق راشٹریتی ڈاکٹر راجندر پرشاد نے اپنی کتاب " انڈیا ڈیوائڈڈ (India Divided) میں لکھی ہے اور انھوں نے بھی ایڈورڈ تھامسن ہی کا حوالہ دیا ہے۔ منشا بھارت کے ان دونوں مقتدر لیڈروں کا یہ تھا کہ اقبال کو اپنی تجویز پاکستان سے منحرف دکھا کر اِس نظریہ یا تصور کے کھوکھلے پن کو ثابت کیا جائے۔

پنڈت جواہر لال نہرو اور ڈاکٹر راجندر پرشاد نہ صرف بھارت کے مقتدر حکمران اور کانگریس کے بااثر سیاسی لیڈر رہے ہیں، بلکہ ان دونوں کا شمار برصغیر ہند کے ذی علم دانشوروں میں ہوتا تھا۔ پھر دونوں علامہ اقبال کے خلوص، ان کے علم و فضل اور شاعرانہ خوبیوں کے معترف بھی تھے، پنڈت جواہر لال نہرو نے تو مندرجہ بالا اقتباس کے بعد ہی علامہ سے اپنی ملاقات کا ذکر جس انداز میں کیا ہے، اِس سے ان کی عقیدت مندی کا اظہار ہوتا ہے۔ تاہم اِس اعتراف عظمت و اظہار عقیدت کے باوجود ان دونوں نے علامہ اقبال جیسے مخلص مفکر کے متعلق یہ فیصلہ صادر کر دیا کہ وہ اپنی ہی پیش کردہ تجویز سے منحرف ہو گئے تھے، اور اپنے اِس فیصلہ کی بنیاد ان دونوں نے رکھی بھی تو کاہے پر؟ کسی دستاویزی ثبوت یا ذاتی علم و مشاہدہ پر نہیں بلکہ اپنے دوست، کانگریس کے ہوا خواہ، مسلم لیگ کے مخالف ایڈورڈ تھامسن کی بیان کردہ روایت پر! آہ، علم و فضل، خلوص و شرافت بھی سیاست کے گرداب میں آ کر کہاں سے کہاں جا نکلتے ہیں، کس بلندی سے، کتنی پستی میں جا گرتے ہیں؟

آئیے اب ذرا یہ دیکھیں کہ جس روایت کی بنیاد پر، بھارت کے سابق

۴۹۔ ڈسکوری آف انڈیا (Discovery of India) از پنڈت جواہر لال نہرو، مطبوعہ میریڈین بکس لمیٹڈ لندن، اشاعت دوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ع ص ۳۳۰۔

صدر راجندر پرشاد ، اور سابق وزیر اعظم جواہر لال نہرو نے یہ فیصلہ صادر کیا ہے ، وہ کیا ہے ، اور علم و تحقیق کی دنیا میں اِس کا کیا رتبہ ہے :

پروفیسر ایڈورڈ تھامسن کی دو کتابوں میں ہمیں یہ روایت ملتی ہے - پہلی کتاب " اِنلسٹ انڈیا فار فریڈم (Enlist India for Freedom) ہے - یہ کتاب لندن سے سنہ ۱۹۴۰ء میں شائع ہوئی - اِس میں انھوں نے لکھا -

" چند سال سے ہندوستان کے ایک حصہ کو قطع کرکے مسلم ریاست بنانے کے لئے ہلچل مچی ہوئی ہے —— اِس ہنگامہ کی ابتدا کس نے کی ، یہ معاملہ قدرے متنازعہ فیہ ہے ، عام طور پر اِس کا محرک ایک شاعر سر محمد اقبال کو قرار دیا جاتا ہے - آبزرور میں ایک مرتبہ میں نے لکھا تھا کہ انھوں نے پاکستان منصوبے کی حمایت کی تھی - اقبال میرے ایک دوست تھے اور انھوں نے میرے غلط تصور کی اصلاح کر دی - پہلے انھوں نے اس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ میرے وسیع ، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے ، پھر انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن ہے ، ہندو فرقہ کے لئے تباہ کن ہے اور مسلم فرقہ کے لئے تباہ کن ہے - آخر میں انھوں نے کہا ، لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں ، اِس لئے میرا فرض ہے کہ میں اِس تجویز کی حمایت کروں ۴۰ "

دوسری کتاب جس میں یہ روایت درج ہے ، سنہ ۱۹۴۲ء میں شائع ہوئی ، اِس کا نام ہے " (Ethical Ideals in India Today) " اِس میں تھامسن لکھتے ہیں -

" اقبال بیک وقت ، ایک فلسفی ، شاعر ، عالم دین اور سیاستدان تھے - انھوں نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے ، جب کہ انھیں

۴۰- انلسٹ انڈیا فار فریڈم از ایڈورڈ تھامسن ، مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰ء ص ۵۸ -

معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں ، مجھ کو ایک خط میں نہایت دل شکستگی اور رنج و افسوس کے ساتھ لکھا تھا کہ میرے وسیع ، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی برپا ہوتی نظر آتی ہے[۳۱] "۔

ان دونوں اقتباسات پر ایک تنقیدی نظر ڈال لیجئے۔

(۱) پہلی ہی نظر میں ان دونوں روایتوں کے مابین اختلاف نظر آتا ہے۔ پہلے اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ تھامسن اور علامہ اقبال میں اس موضوع پر " گفتگو " ہوئی۔ پنڈت تو واضح طور پر کہتے ہیں کہ " تھامسن نے لکھا ہے کہ ایک " گفتگو " کے دوران اقبال نے اپنا یہ انحراف بیان کیا تھا۔ مگر تھامسن دوسرے اقتباس میں یہ لکھتے ہیں کہ اقبال نے اپنے ایک " خط " میں یہ خیال ظاہر کیا تھا ! سنہ ۱۹۳۰ع میں تو وہ " گفتگو " کا ذکر کرتے ہیں اور سنہ ۱۹۳۲ع میں وہ " خط " کی بات کرتے ہیں۔ اب اِس کا فیصلہ کون کرے کہ دراصل گفتگو ہوئی تھی یا خط لکھا گیا تھا ؟ کہیں دروغ گو را حافظہ نباشد والی بات تو نہیں ہے کہ سنہ ۱۹۳۲ع میں تھامسن صاحب کو یہ یاد ہی نہ رہا کہ انہوں نے سنہ ۱۹۳۰ع میں گفتگو کا حوالہ دیا ہے ؟ یا یہ بات ہے کہ اپنے سابقہ بیان کو زیادہ مدلّل بنانے کے لئے انہوں نے " گفتگو " کی بجائے "خط" کا ذکر کر دیا ہے کیونکہ گفتگو والی بات میں تو کئی شبہات پیدا ہو سکتے ہیں کہ خدا جانے اقبال نے کیا کہا اور تھامسن نے کیا سمجھا ! اگر اپنی بات کو مدلّل بنانا ہی تھا ، تو پھر انہیں اس خط کی نقل (فوٹو کاپی) شائع کرنی چاہئے تھی ! لیکن انہوں نے ایسا نہیں کیا ، بس یہ لکھنے پر ہی اکتفا کیا کہ اقبال نے خط لکھا تھا ! گویا علمی دنیا میں ان کی ساکھ اتنی اونچی ہے کہ وہ " گفتگو " کو " خط " قرار دیں ، یا خط کو گفتگو کہہ دیں اور چاہے یہ خط پیش نہ کریں ، ان کی بات مانی ہی جائے گی اور پایۂ اعتبار سے ساقط کسی حالت میں قرار نہیں دی جائے گی !

۳۱۔ ایتھیکل آئیڈیلس ان انڈیا ٹوڈے ، از ایڈورڈ تھامسن مطبوعہ سنہ ۱۹۳۲ع۔

واقعہ یہ ہے کہ بات بنے یا نہ بنے ، تھامسن نے خط کا یہ فسانہ تراش کر اپنی داستان کو دلکش ضرور بنا دیا ہے ! !

(۲) اِس داستان کی " دلکشی " یہ ہے کہ یہ خط بھی اقبال نے " اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے " لکھا تھا ، " جبکہ انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ وہ اِس دنیا سے رخصت ہو رہے ہیں " - گویا تھامسن سے اقبال کے بہت گہرے مراسم تھے ، اور انھیں اِس دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے ، جو ضروری اور اہم کام انجام دینا تھا ، وہ بس یہی " اقرار خطا " تھا ! یعنی تھامسن صاحب پوپ تھے ، جن کے سامنے اقبال نے مرنے سے پہلے " اعتراف گناہ " (Confession) کر لیا تھا ! دلچسپی اِس افسانہ میں اِس خط کے ذکر سے پیدا ضرور ہو گئی ، تاہم تھامسن صاحب کی بات بنتی نظر نہیں آتی - بات بنانے کے لئے بھی تو تھوڑا بہت سلیقہ چاہئے ! افسوس کہ تھامسن کو وہ بھی نہ آیا -

یہ تو تھا وہ تضاد و اضطراب جو ان دونوں روایتوں میں پایا جاتا ہے - اب یہ دیکھئے کہ خود اِس روایت میں انہوں نے کیا کہا ؟

(۳) تھامسن صاحب لکھتے ہیں -

> " انھوں نے (یعنی اقبال نے) فرمایا کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن ہے ، ہندو فرقے کے لئے تباہ کن ہے ، اور مسلم فرقہ کے لئے تباہ کن ہے ، آخر میں انھوں نے کہا ، لیکن میں مسلم لیگ کا صدر ہوں ، اِس لئے میرا فرض ہے کہ میں اِس تجویز کی حمایت کروں[۴۳] "

تھامسن نے یہاں اقبال کی دو حیثیتوں کا ذکر کیا ہے ، ایک حیثیت ان کی شخصی و ذاتی ہے اور دوسری مسلم لیگ کے صدر کی - ذاتی و شخصی حیثیت میں وہ پاکستان کی تجویز کو برطانیہ ، ہندو اور مسلمان ، سب کے لئے مضرت رساں بلکہ تباہ کن قرار دیتے ہیں ، لیکن صدر مسلم لیگ کی حیثیت سے وہ اِس کی " حمایت " کرنا اپنا " فرض " سمجھتے ہیں !

۴۳- انلسٹ انڈیا فار فریڈم ، از ایڈورڈ تھامسن ص ۵۸ -

کیا اقبال کی پوری سیاسی سرگذشت کو بغور پڑھنے کے بعد کسی کو ان میں یہ منافقت و مداہنت نظر آتی ہے ؟ ---- پھر حقیقت واقعہ کیا ہے ؟ کیا اقبال نے "صدر مسلم لیگ کی حیثیت" سے تجویز پاکستان کی حمایت کی تھی ؟

مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے تجویز پاکستان کی حمایت ان کا فرض ، اِس وقت قرار پاتی جب کہ خود مسلم لیگ نے اِس تجویز کو منظور کر لیا ہوتا ! اب یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ علامہ اقبال کی زندگی میں کسی وقت بھی مسلم لیگ نے پاکستان کی تجویز کو منظور ہی نہیں کیا تھا ! منظور کرنا تو کجا ، اِس کی عاملہ ، شوریٰ ، (کونسل) یا اِس کے کسی جلسہ عام میں ان کے حینِ حیات یہ گفتگو ہی نہیں آئی ۔ قرارداد پاکستان تو علامہ اقبال کے انتقال کے تقریباً دو سال بعد مارچ سنہ ۱۹۴۰ میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں منظور ہوئی ! پھر علامہ اقبال پر بحیثیت صدر اِس کی حمایت کا فرض کیسے عائد ہوتا تھا ؟ علامہ اقبال مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء کے صدر تھے اور قرارداد پاکستان مارچ سنہ ۱۹۴۰ء میں بمقام لاہور منظور ہوئی ! کیا تھامسن صاحب نے خواب میں تو یہ نہیں دیکھا تھا کہ ان کے "دوست" علامہ اقبال سنہ ۱۹۴۰ء میں مسلم لیگ کے اجلاس لاہور کی صدارت فرما رہے ہیں ! اگر یہ خواب تھا ، تو یہ خواب سچا تھا ، اِس لئے کہ یہ علامہ اقبال کی روح ہی تو تھی ، جو قراردادِ پاکستان کے اندر بول رہی تھی ۔ تھامسن صاحب کو اپنی زندگی میں "سچی بات" کہنے کی توفیق تو نہیں ہوئی ، البتہ یہ ان کی خوش بختی ہے کہ کم از کم ایک مرتبہ "سچا خواب" دیکھنے کی انھیں سعادت ضرور حاصل ہو گئی ! !

(۴) تھامسن صاحب کی روایت کے مطابق علامہ اقبال ذاتی حیثیت سے تجویزِ پاکستان کے مخالف تھے اور شخصی طور پر اِس کو ہندو مسلمان اور برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن سمجھتے تھے ! اب ذرا اقبال سے پوچھئے کہ وہ اِس بارے میں کیا کہتے ہیں ۔ وہ اپنے خطبۂ صدارت مسلم لیگ میں تجویزِ پاکستان کو پیش کرنے سے پہلے آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی سنہ ۱۹۲۹ء کی قرارداد کا ذکر کرتے ہیں اور کہتے ہیں ۔

"مجھے شبہ نہیں کہ یہ اجتماع ، ان مسلم مطالبات کی جو اِس قرارداد میں درج ہیں ، پُر زور تائید کرے گا"

پھر اِس کے بعد فرماتے ہیں (خط کشیدہ الفاظ پر نظر رہے) ۔

"شخصی طور پر میں ان مطالبات سے بھی ایک قدم آگے بڑھنا چاہتا ہوں[۴۳]"

"میری یہ خواہش ہے کہ پنجاب ، صوبہ سرحد ، سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک واحد مملکت (State) بنا دی جائے[۴۴]"

اقبال یہاں واضح طور پر یہ کہہ رہے ہیں کہ پاکستان کی تجویز ان کی اپنی "شخصی و ذاتی" تجویز ہے ، مسلم لیگ کی سرکاری (Official) تجویز نہیں ہے ۔ مسلم لیگ کی سرکاری (Officia!) تجویز تو وہ قرارداد ہے ، جو آل پارٹیز مسلم کانفرنس منعقدہ دہلی میں منظور ہوئی تھی ۔ مگر تھامسن صاحب فرماتے ہیں مسلم لیگ کی سرکاری تجویز ، قراردادِ پاکستان تھی اور شخصی طور پر علامہ اِس کے مخالف تھے ! یہ ہے تھامسن صاحب کی وہ علمی دیانت ، جس پر پنڈت جی اور راجن بابو دونوں نے بھروسہ کرکے ایک مخلص انسان کے خلاف انحراف و منافقت کا فیصلہ کر ڈالا !

(۵) تھامسن صاحب لکھتے ہیں ۔

"انہوں نے (یعنی اقبال نے) اِس بات پر تشویش کا اظہار کیا کہ میرے وسیع ، غیر منظم اور فاقہ کش ملک میں طوائف الملوکی

۴۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۲۰ ۔
اقبال کے اپنے الفاظ یہ ہیں ۔
(Personally I would go further than the demands embodied in it)

۴۴۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۲۰ ۔

برپا ہوتی نظر آتی ہے ، پھر انھوں نے فرمایا کہ پاکستان کا منصوبہ برطانوی حکومت کے لئے تباہ کن ہے ، ہندو فرقے کے لئے تباہ کن ہے ، اور مسلم فرقے کے لئے تباہ کن ہے[۳۵] ''

علامہ اقبال نے قائد اعظم کے نام اپنے دو خطوط میں اِسی " طوائف الملوکی " کا ذکر کیا ہے ، مگر دیکھئیے کہ وہ وہاں " پاکستان کے منصوبہ '' کے متعلق کیا کہتے ہیں - ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ع کے خط میں وہ لکھتے ہیں -

" اسلامی قوانین کا طویل اور محتاط طریقہ پر مطالعہ کرنے کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اگر اس نظامِ قانون کو اچھی طرح سمجھا اور اس کو روبہ عمل لایا جائے تو کم سے کم ہر شخص کو زندگی بسر کرنے کے حق کی طمانیت حاصل ہو جاتی ہے ، لیکن اس ملک میں شریعت اسلامیہ کے نفاذ اور اس کا ارتقا ایک یا ایک سے زائد آزاد مسلم مملکتوں کے قیام کے بغیر ممکن نہیں - کئی سال سے یہ میرا ایماندارانہ ایقان رہا ہے اور میں اب بھی مسلمان کی روٹی کے مسئلہ کو حل کرنے کا اور ساتھ ہی ایک پُر امن ہندوستان حاصل کرنے کا اسی کو واحد طریقہ سمجھتا ہوں اگر ہندوستان میں یہ چیز ناممکن ہے تو دوسری متبادل صورت خانہ جنگی کی ہے ، جو واقعتاً کچھ عرصہ سے ہندو مسلم فسادات کی صورت میں جاری ہے ، مجھے ڈر ہے کہ ملک کے بعض حصوں میں مثلاً شمال مغربی ہندوستان میں فلسطین کو دہرایا جائے گا[۳۶] ''

پھر ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ع کو وہ ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

'' میں آپ سے کہتا ہوں کہ ہم فی‌الواقعی خانہ جنگی (Civil War)

۳۵- انسلسٹ انڈیا فار فریڈم ، از ایڈورڈ تھامسن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰ع ص ۵۸ -

۳۶- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۶ و ۱۷ -

کی حالت میں زندگی بسر کر رہے ہیں ، فوج اور پولیس نہ ہو تو یہ خانہ جنگی چشم زدن میں عام ہو جائے ۔ گذشتہ چند ماہ سے ہندوستان میں ہندو مسلم فسادات کا ایک سلسلہ قائم ہو چکا ہے ۔ صرف شمال مغربی ہند میں اس تین ماہ میں کم از کم تین فرقہ وارانہ فسادات رونما ہو چکے ہیں ۔ ہندوؤں اور سکھوں کی طرف سے توہین رسول اکرم کی کم از کم چار وارداتیں پیش آ چکی ہیں توہینِ رسول کی ان چار وارداتوں میں مجرم فی‌النار کر دیا گیا ۔ سندھ میں قرآن کریم کو نظرِ آتش کرنے کے واقعات بھی پیش آئے ہیں . . . .

ان حالات میں یہ ظاہر ہے کہ ایک پُر امن ہندوستان حاصل کرنے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ لسانی ، مذہبی اور نسلی میلانات کی بناء پر ملک کو از سر نو تقسیم کر دیا جائے ۔ اکثر برطانوی مدبرین اس حقیقت کو محسوس کرتے ہیں اور ہندو مسلم فسادات ، جو اس دستور کے جلو میں پوری تیزی سے رونما ہو رہے ہیں ، یقین ہے کہ ملک کی صحیح صورت حال کو ان پر واضح کر دیں گے ۔ مجھے یاد ہے کہ انگلستان سے میری روانگی سے قبل لارڈ لوتھیان نے مجھ سے کہا تھا کہ تمھاری اسکیم ہی ہندوستان کی مشکلات کا واحد حل ہے[۴۷] ''

ان دونوں خطوط میں واضح طور پر خانہ جنگی کا ذکر ہے اور اس پر دلی رنج و ملال کا اظہار بھی کیا گیا ہے ۔ تھامسن صاحب بھی یہی کہتے ہیں کہ ان کے نام ، جو مبینہ خط اقبال نے تحریر کیا تھا ، اس میں طوائف الملوکی کا ذکر کیا گیا تھا ، لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ قائد اعظم کے نام محولہ بالا دونوں خطوط میں اس '' خانہ جنگی '' کا واحد حل وہ یہ قرار دیتے ہیں کہ ہندوستان کو ''لسانی ، نسلی و مذہبی میلانات کی بناء پر از سرِ نو تقسیم کر دیا جائے'' تاکہ '' ایک ایسی مسلم مملکت

۴۷۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ ۱۹۴۳ء ص ۲۹ تا ۳۱ ۔

قائم ہو ، جس میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ ہو سکے " ـــــ مگر تھامسن صاحب فرماتے ہیں کہ اس طوائف الملوکی کا ذکر کرنے کے بعد اقبال نے ان سے کہا تھا کہ پاکستان کا منصوبہ حکومت برطانیہ ، ہندو اور مسلمان سب کے لئے تباہ کن ہے ! بالفاظ دیگر قائد اعظم کو وہ یہ لکھتے ہیں کہ ہندوستان کی " خانہ جنگی " کا " حل " پاکستان ہے اور تھامسن صاحب سے یہ کہتے ہیں کہ ہندوستان کی " طوائف الملوکی " کا " سبب " پاکستان ہے ! ! پھر ان دونوں متضاد باتوں کے کہنے کا زمانہ بھی تقریباً ایک ہی ہے - کیونکہ بقول تھامسن صاحب یہ بات اقبال نے اپنے انتقال سے کچھ عرصہ پہلے کہی تھی ، واقعہ یہ ہے کہ مسٹر جناح کو یہ خطوط انھوں نے اپنی وفات سے صرف دس ماہ قبل تحریر فرمائے تھے ! ـــــ یہ علامہ کی تضاد بیانی نہیں ، بلکہ پروفیسر موصوف کی صریح دروغ بافی ہے -

(٦) پروفیسر ایڈورڈ تھامسن کی دروغ بافی کا نہایت واضح اور محکم ثبوت یہ ہے کہ حضرت علامہ تجویزِ پاکستان پیش کرنے کے بعد سے مرتے دم تک اپنے اس منصوبہ کی حمایت و وکالت کرتے رہے - ذرا واقعات ذیل پر سلسلہ وار نظر ڈال لیجئے -

(الف) علامہ اقبال نے پاکستان کی تجویز دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں پیش کی تھی - اس کے بعد ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع میں انھیں دوسری گول میز کانفرنس منعقدہ لندن میں شرکت کا موقع ملا - اسی زمانہ میں ان ہی پروفیسر صاحب نے " پان اسلامی سازش " کے عنوان سے ، اخبار ٹائمز کی اشاعت مورخہ ۳ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع میں اپنا ایک مراسلہ شائع کرایا تھا ، جس کا ذکر تفصیل کے ساتھ ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں - اقبال نے اس کا جواب دیا ، جو اسی اخبار میں ۱۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۱ع کو شائع ہوا - پروفیسر موصوف نے اس وقت بھی اقبال کے خلاف بڑی شرانگیزی کی ، کہ ان پر پان اسلامی سازش کا الزام لگا کر انھیں بڑے ہی نازک اور پریشان کن مؤقف میں ڈال دیا تھا ، مگر ڈاکٹر اقبال نے اپنے جواب میں "پاکستان"

کو ہندوستان کے مقدّر کی صورت گری کرنے والے تاریخی عوامل کی کارفرمائی کا لازمی نتیجہ قرار دیا تھا اور حتمی طور پر یہ حکم لگایا تھا کہ یہ نتیجہ رونما ہو کر رہے گا[۴۸] !

(ب) علامہ کو تیسری گول میز کانفرنس میں شرکت کا موقع بھی ملا ۔ یہاں انہوں نے کانفرنس کے اندر ہندوستان کے لئے " لامرکز " والی تجویز پیش کی ، جو درحقیقت منصوبہ پاکستان کو روبہ عمل لانے کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ۔ پھر کانفرنس سے باہر نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے ایک جلسہ میں ، پاکستان کی تجویز کو ایسے الفاظ میں پیش کیا ، جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ انہیں اپنی اس تجویز پر پختہ اعتماد اور پکا یقین ہے[۴۹] ''

(ج) علامہ اقبال کی اسی تقریر پر ، جو انہوں نے نیشنل لیگ آف انگلینڈ کے مذکورہ بالا جلسہ میں کی تھی ، پنڈت جواہر لال نہرو نے سخت تنقید کی تھی ۔ علامہ نے اس کا جواب ۶ دسمبر سنہ ۱۹۳۳ء کو دیا ، جس میں انہوں نے " ہندوستان کے مسئلہ کا حل " یہ تجویز کیا کہ '' ملک کو مذہبی ، تاریخی اور تہذیبی میلانات اور ہم آہنگی کی بنیاد پر از سر نو تقسیم کر دیا جائے[۵۰] '' ۔ یہ ہندوستان کو " مذہبی ، تاریخی و تہذیبی میلانات و ہم آہنگی کی بنیاد پر تقسیم کرنا " ، یہی تو '' منصوبہ پاکستان '' ہے !

(د) اپنی وفات سے ٹھیک دس ماہ تیئس (۲۳) دن قبل وہ اپنے

۴۸۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال ، مرتبہ بی ۔ اے ڈار ، شائع کردہ اقبال اکیڈمی نومبر سنہ ۱۹۶۷ء ص ۱۱۹ ۔

۴۹۔ ایضاً ص ۷۵ ۔

۵۰۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ء ص ۲۱۲ ۔

خط[۵۱] مورخہ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ء میں اپنے اسی منصوبہ کو مسلمانوں کی طرف سے مطالبہ کی شکل میں پیش کرنے کے لئے قائد اعظم کو توجہ دلاتے ہیں ۔ اس خط کا متعلقہ اقتباس ، ہم درج کر آئے ہیں ۔

(ب) پھر شدید علالت کے دوران ، مرنے سے ٹھیک دس ماہ پہلے قائد اعظم کے نام اپنے خط[۵۲] مورخہ ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء میں دوبارہ اپنے اسی منصوبہ کو روبہ عمل لانے کے لئے اصرار کرتے ہیں ۔ اس خط کے پورے متن کا ترجمہ ہم گذشتہ صفحات میں درج کر آئے ہیں ،

(ج) مشہور مصنف و عالم دین مولانا ابوالحسن علی ندوی نے علامہ اقبال سے ۲۲ نومبر سنہ ۱۹۳۷ء کو ملاقات فرمائی تھی ، علامہ کا انتقال اس ملاقات کے صرف پانچ ماہ بعد یعنی ۲۱ اپریل سنہ ۱۹۳۸ء کو ہوا ۔ مولانا لکھتے ہیں کہ اس ملاقات میں علامہ اقبال نے ۔

" پاکستان کے بارے میں فرمایا کہ جو قوم اپنا ملک نہیں رکھتی ، وہ اپنے مذہب اور تہذیب کو بھی برقرار نہیں رکھ سکتی ۔ دین و تہذیب ، حکومت و شوکت ہی سے زندہ رہتے ہیں ۔ اس لئے پاکستان ہی مسلم مسائل کا واحد حل ہے اور یہی اقتصادی مشکلات کا حل بھی ہے[۵۳] "

مندرجہ بالا اتنے ڈھیر سارے شواہد اور قائد اعظم و مولانا علی میاں ندوی جیسے معتبر وثقہ " گواہوں " کے بیانات کے بعد بھی کیا یہ کہنا

۵۱- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ناشر شیخ محمد اشرف لاہور مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ء ص ۱۴ تا ۱۸ ۔

۵۲- ایضاً ص ۱۸ تا ۲۳ ۔

۵۳- " نقوش اقبال " مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی ، شائع کردہ مجلس نشریات اسلام ، کراچی سنہ ۱۹۷۳ء ص ۳۵ ۔

باقی رہ جاتا ہے کہ پروفیسر ایڈورڈ تھامسن نے جو کچھ بیان فرمایا ہے ، وہ محض کذب و افترا اور دروغ بے فروغ ہے !

پروفیسر موصوف نے یہ زیادتی صرف علامہ اقبال کے ساتھ ہی نہیں کی ، بلکہ انھوں نے حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کو بھی نہ بخشا !

اپنی اسی کتاب " انلسٹ انڈیا فار فریڈم " (Enlist India for Freedom) میں قائد اعظم سے اپنے ایک انٹرویو کو بھی انھوں نے درج کیا ہے ، جس کا موضوع دو قومی نظریہ ہے ۔ جب قائد اعظم کی توجہ اس کتاب کی جانب مبذول کرائی گئی تو انھوں نے اپنے ایک اخباری بیان میں فرمایا کہ مسٹر تھامسن ان سے کبھی ملے ہی نہ تھے ! اور جو الفاظ پروفیسر صاحب موصوف نے ان سے منسوب کئے ہیں ، وہ انھوں نے کبھی کہے ہی نہ تھے ! !

قائد اعظم تو بقید حیات تھے، اسی لئے انھوں نے آکسفورڈ یونیورسٹی کے اس عالم و فاضل پروفیسر کے جھوٹ کا پول کھول دیا ، لیکن علامہ اقبال کے بارے میں پروفیسر موصوف نے یہ افتراء پردازی ان کے انتقال کے دو سال بعد کی ، ـــــ اقبال بھی زندہ ہوتے ، تو اس جعل کو بے نقاب کر دیتے ، لیکن آج بھی ان کے سیاسی افکار و اعمال ، ان کی تقریریں و تحریریں ، ببانگ دھل یہ اعلان کر رہی ہیں کہ پروفیسر ایڈورڈ تھامسن کا بیان محض ایک من گھڑت افسانہ ہے ! سچ ہے جھوٹ کے پیر نہیں ہوتے ! ـــــــ مگر پنڈت جواہر لال نہرو نے تھامسن کے جھوٹ پر ہی اس نام نہاد انحراف کی بنیاد رکھ دی ۔ پھر اپنی طرف سے اس پر ایک ردا یہ چڑھایا کہ

> "زندگی کے متعلق ان کا (یعنی اقبال کا) مجموعی نقطۂ نظر تقسیم ہند یا پاکستان کے تصور سے متعلق بعد کے پیش شدہ واقعات سے لگا نہیں کھاتا ۔ اپنی زندگی کے آخری ایام میں اقبال اشتراکیت کی طرف زیادہ سے زیادہ مائل ہو گئے تھے ۔ سویٹ روس نے ، جو زبردست ترقی کی تھی ، اِس نے ان کو اپنی طرف کھینچ لیا تھا ، ان کی شاعری نے بھی بالکلیہ مختلف رنگ اختیار کر

لیا تھا؟[۵۴]"

اس عبارت کے آخری فقروں میں پنڈت جی نے جس مسئلہ کو چھیڑا ہے ، وہ ایک علیحدہ مقالہ کا طالب ہے ، اور یہ اس کتاب کا موضوع بھی نہیں ہے ، تاہم ، ہم یہاں یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ پنڈت جی کا یہ فرمانا کہ " زندگی کے متعلق اقبال کا مجموعی نقطۂ نظر پاکستان کے تصور سے لگا نہیں کھاتا '' سراسر غلط ہے۔ ان کے اس بیان سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اقبال کو پڑھنے اور سمجھنے کی انھوں نے سرے سے کوئی سنجیدہ کوشش ہی نہیں کی ! یہ دعوے سے کہا جا سکتا ہے کہ ۱۹۰۸ء کے بعد اقبال کے سینکڑوں اشعار میں سے کوئی ایک شعر ، ان کے متعدد بیانات ، مضامین اور تقاریر میں سے کوئی ایک فقرہ بھی نکال کر پیش نہیں کیا جا سکتا ، جو تصور پاکستان کے منافی ہو۔ اس کے برعکس ابتدائی دور (یعنی سنہ ۱۹۰۸ء سے قبل کے دور) کو چھوڑ کر ، ان کی شاعری ، مقالات ، خطوط اور تقاریر کا بنظر غائر مطالعہ کرنے کے بعد " زندگی کے متعلق ان کا جو مجموعی نقطۂ نظر" سامنے آتا ہے ، اس کا فطری داعیہ ، برصغیر میں ایک ایسی مملکت کا قیام ہے ، جہاں اسلامی شریعت نافذ ہو سکے ! ! آخری دور میں ان کے جس رجحان کا ذکر پنڈت جی نے کیا ہے ، اس کے متعلق ہم نے گزشتہ صفحات میں اپنے موضوع کے حدود میں رہتے ہوئے ، بحث کی ہے۔ ان کا یہ رجحان ، ان کے آخری شعری کارنامہ " ارمغان حجاز" کی " ابلیس کی مجلس شوریٰ" والی نظم میں بہت کھل کر سامنے آ گیا ہے ، اور اس کی عملی شکل کا اظہار ، اپنی زندگی کے بالکل آخری ایام میں قائد اعظم کے نام لکھے ہوئے دو خطوط مورخہ ۲۸ مئی و ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ء سے ہوتا ہے۔

پنڈت جی نے تھامسن کی روایت کا ذکر کرنے کے بعد علامہ اقبال سے اپنی ملاقات کا حال بیان کیا ہے۔ اس ملاقات کی ایک دلچسپ بات

۵۴۔ ڈسکوری آف انڈیا (انگریزی) مصنفہ پنڈت جواہر لال نہرو ، مطبوعہ میریڈین بکس لمیٹڈ لندن اشاعت سوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء ص ۳۳۰۔

یہ ہے کہ علامہ نے پنڈت نہرو کے متعلق ایک نہایت ہی بلیغ فقرہ کہا ہے ۔ پنڈت جی لکھتے ہیں کہ

" میرے رخصت ہونے سے کچھ پہلے انہوں نے (یعنی اقبال نے) کہا " تمہارے اور جناح کے مابین کیا چیز مشترک ہے ؟ وہ ایک سیاست دان (Politician) ہیں ، اور تم ایک محب وطن (Patriot) ہو[۵۵] "

اپنے متعلق اقبال کے اس ریمارک کو درج کرنے کے بعد پنڈت جی اس پر تبصرہ کرتے ہیں اور پھر آخر میں اعتراف کرتے ہیں ۔

" اقبال یہ کہنے میں بالکل حق بجانب تھے کہ میں کچھ زیادہ سیاست دان نہیں ، اگرچہ سیاست نے مجھے اپنی گرفت میں لے لیا ، اور مجھے اپنا شکار بنا لیا[۵۵] "

حقیقت یہ ہے کہ پنڈت جی اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود نہ صرف سیاست گزیدہ تھے ، بلکہ وہ اپنے ہی تصورات کے جال میں گرفتار بھی تھے ۔ اب بھلا انہیں سیاست کے جھمیلوں سے اتنی فرصت کہاں ملی ہو گی کہ وہ اقبال کی شاعری اور ان کے تصور حیات کا بنظر تعمق مطالعہ کرتے جو کچھ انہوں نے اِدھر اُدھر سے پڑھا ، اِن سے اُن سے سنا ، بس اِسی سے یہ نتیجہ اخذ کر بیٹھے کہ اقبال کا مجموعی تصور زندگی ، پاکستان کے نظریہ سے میل نہیں کھاتا ! واقعہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے دلفریب تصورات کا " شکار " ہوتا ہے ، اس کو دوسروں کے آئینۂ افکار میں بھی اپنی ہی صورت نظر آتی ہے !

۵۵- ڈسکوری آف انڈیا از پنڈت جواہر لال نہرو ، مطبوعہ میریڈین بکس لمیٹڈ لندن اشاعت سوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء ص ۳۳۰ ۔

حوالہ جات باب ۱۰

۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۲
۲- رسالہ اردو اقبال نمبر طبع جدید ص ۱۹۵ و ۱۹۶
۳- ایضاً ص ۱۹۳
۴- ایضاً ص ۱۹۳
۵- رپورٹ گول میز کانفرنس
۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۴
۷- ایضاً ص ۱۵
۸- ایضاً ص ۱۵
۹- ایضاً ص ۱۴
۱۰- ایضاً ص ۱۸۵
۱۱- پاکستان از ڈاکٹر امبیڈکر ص ۳۲۹
۱۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۱۲
۱۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۶
۱۴- ایضاً ص ۲۲
۱۵- انڈیا اے ری اسٹیٹ منٹ از کوپ لینڈ ص ۱۸۹
۱۶- دوسری گول میز کانفرنس کی رپورٹ جلد دوم ص ۱۴۰۰
۱۷- ایضاً ص ۱۴۴۰
۱۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۲
۱۹- ایضاً ص ۱۵
۲۰- ایضاً ص ۱۷
۲۱- ایضاً ص ۱۹
۲۲- ایضاً ص ۱۷
۲۳- ایضاً ص ۱۷
۲۴- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۶
۲۵- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۱۸۹
۲۶- ایضاً ص ۱۹۰
۲۷- لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی - اے ڈار ص ۱۱۷
۲۸- ایضاً ص ۱۱۸
۲۹- ایضاً ص ۱۱۸
۳۰- ایضاً ص ۱۱۹
۳۱- ایضاً ص ۱۲۰
۳۲- ایضاً ص ۱۲۰
۳۳- ایضاً ص ۱۱۹

۳۴۔ پاکستان از ڈاکٹر امبیڈکر ص ۳۲۹ و ۳۳۰
۳۵۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار ص ۵۷
۳۶۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۱
۳۷۔ ایضاً ص ۲۵
۳۸۔ سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف مسٹر جناح ، جلد دوم مرتبہ جمیل الدین احمد مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ع ص ۳۹۳
۳۹۔ ڈسکوری آف انڈیا از جواہر لال نہرو مطبوعہ میریڈین بکس لیمٹڈ لندن اشاعت سوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ع ص ۳۳۰
۴۰۔ اِنلسٹ انڈیا فار فریڈم از ایڈورڈ ٹھامسن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰ع ص ۵۸
۴۱۔ ایتھیکل آئیڈیلس اِن انڈیا از ایڈورڈ تھامسن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۲
۴۲۔ اِنلسٹ انڈیا فار فریڈم از ایڈورڈ تھامسن ص ۵۸
۴۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۲۰
۴۴۔ ایضاً ص ۱۲۰
۴۵۔ اِنلسٹ انڈیا فار فریڈم از ایڈورڈ تھامسن ص ۵۸
۴۶۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۶ و ۱۷
۴۷۔ ایضاً ص ۱۹ و ۲۱
۴۸۔ لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار ص ۱۱۹
۴۹۔ ایضاً ص ۵۷
۵۰۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۲۱۲
۵۱۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۴ تا ۱۸
۵۲۔ ایضاً ص ۱۸ تا ۲۳
۵۳۔ "نقوشِ اقبال" مصنفہ مولانا ابوالحسن علی ندوی شائع کردہ مجلس نشریاتِ اسلام کراچی سنہ ۱۹۷۳ع ص ۳۵
۵۴۔ ڈسکوری آف انڈیا (انگریزی) ، از پنڈت جواہر لال نہرو ، مطبوعہ میریڈین بکس لمیٹڈ لندن اشاعت سوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ع ص ۳۳۰
۵۵۔ ایضاً ص ۳۳۰

باب ۱۱

پاکستان کی نظریاتی اساس، اقبالی زاویہ نگاہ سے

تصور پاکستان کے محرکات | یہ بحث بہت ہی پیچیدہ اور ساتھ ہی بہت دلچسپ ہے کہ پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت اقبال کے ذہنی محرکات کیا تھے؟ ایک مکتبِ خیال کی رائے ہے کہ یہ تصور ان کے ذہنی قنوطیت کا ایک نتیجہ تھا۔ عبدالمالک آروی صاحب لکھتے ہیں!

"اقبال اس (پاکستانی) تصور کے بانی کی حیثیت سے ہندوستان کے دشمن نہ تھے، یہ ان کا فلسفیانہ تصور تھا۔ ہندوستان کی جنتا کی زندگی کا نقشہ دیکھ کر وہ اس قنوطیت میں مبتلا ہو گئے ہوں گے"[1]

عبدالمالک صاحب نے ان مختصر سے فقرات میں یہ بیان کرنے کی کوشش کی ہے کہ ہندوستان کے باشندوں کی باہمی آویزش، ہندو مسلم سر پھٹول اور فرقہ وارانہ نوعیت کے سیاسی اختلافات کو دیکھ کر اقبال کا دل بیٹھ گیا تھا اور وہ مایوسی کی اس منزل پر پہنچ گئے تھے جہاں سے وہ ہندو مسلم اتحاد کے خوشگوار منظر کا تصور ہی نہیں کر سکتے تھے۔ پاکستان اقبال کے اسی مایوسانہ ذہن کی پیداوار ہے! کیا اقبال کا یہ ذہنی تجزیہ درست ہے؟ کیا شاعر امید فی الواقع قنوطی سیاستدان تھا ــــ؟؟

یہ صحیح ہے کہ فرقہ وارانہ کشیدگی پر اقبال کا دل کڑھتا تھا۔ انہوں نے اپنی تقریروں، تحریروں اور اشعار میں بارہا اس پر اظہار افسوس

۱- اقبال کی شاعری، از عبدالمالک آروی۔ ص ۳۲۰

کیا ہے۔ برصغیر ہند کا کوئی سچا بھی خواہ اس صورت حال پر رنج و افسوس کا اظہار کئے بغیر نہیں رہ سکتا اور یہ بھی صحیح ہے کہ ان کا پیدائشی تعلق ایک ایسی سر زمین سے تھا ، جہاں فرقہ وارانہ کشیدگی ، وسعت و شدت کا لحاظ کرتے اپنی انتہا کو پہونچی ہوئی تھی ۔ لیکن اس نے ان میں قنوطی ذہنیت پیدا نہیں کر دی تھی اور وہ ہندو مسلم اتحاد کے امکان سے مایوس نہیں ہو گئے تھے ۔ ۱۹۳۰ء کے خطبۂ صدارت میں انھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا ، اسی خطبہ صدارت میں وہ ہندو مسلم اتحاد پر اظہار خیال کرتے ہوئے کہتے ہیں ۔

"یہ بہر حال تکلیف دہ امر ہے کہ اندرونی ہم آہنگی کے ایک ایسے اصول کو دریافت کرنے کی جو کوششیں کی گئیں وہ اب تک ناکام رہیں ۔ یہ کوششیں ناکام کیوں ہوئیں؟ شاید اس لیے کہ ہم ایک دوسرے کے عزائم کو شک و شبہ کی نظر سے دیکھتے ہیں اور بباطن ایک دوسرے پر چھا جانا چاہتے ہیں —— باہمی تعاون کے اعلیٰ تر مفادات کی خاطر ہم ان اجاروں سے شاید دست بردار ہونا نہیں چاہتے ، جن کو اتفاق حالات نے ہمارے سپرد کر دیا ہے اور ہم اپنی انانیت کو ایسی قومیت کے پردے میں چھپانا چاہتے ہیں ، جن سے بظاہر وسیع القلب حب الوطنی کے جذبات کو تحریک ہوتی ہے ، لیکن جو بباطن اتنی ہی تنگ نظر ہے جتنی کہ ذات پات یا ایک قبیلہ ہو سکتا ہے ۔

شاید ہم یہ تسلیم کرنا نہیں چاہتے کہ ہر طبقہ کو اس بات کا حق حاصل ہے کہ وہ اپنی ثقافتی روایات کے مطابق آزادانہ ترقی کرے ہماری ناکامی کے اسباب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہوں ، تاہم میں اب بھی پر امید ہوں ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ واقعات کا رجحان کسی نہ کسی کی داخلی ہم آہنگی کی طرف ہے[۲]"

۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال۔ مرتبہ شاملو۔ ناشر المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ۔ ص ۱۰

اس اقتباس سے کیا ظاہر ہوتا ہے ، قنوطیت یا رجائیت ؟ ۱۹۲۳ء سے ہندو مسلم اختلافات کا دور شروع ہوتا ہے اور اس کے ساتھ ہی باہمی اتحاد و اتفاق کی متعدد کوششیں بھی ہوتی ہیں لیکن یہ کوششیں عروس کامیابی سے ہمکنار نہیں ہوتیں ۔ اس ناکامی کے وجوہ مختلف اشخاص کی نظر میں مختلف تھے ، لیکن مفکر اقبال نے ، جو اس مناقشہ کے تمام فریقوں کی نفسیات اور ان کے ذہنی امراض سے واقف تھا ، ان کا صحیح تجزیہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچا کہ اس اختلاف کی بنیادی وجہ الانیت اور تنگدلی ہے ۔ اس وقت کس کی نظر اتنی باریک بین تھی کہ اس آویزش کی روح میں ڈوب کر ان امراض کا پتہ چلاتی —— لیکن اس کے باوجود ، اقبال مایوس نہیں ہے ، فرقہ وارانہ کشیدگی کے اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں بھی وہ اپنے دل میں امید کے چراغ جلائے رکھتا ہے ۔

جولائی ۱۹۳۱ء میں وہ سر فرانسس ینگ ہسبنڈ کے نام اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں ۔

"ہندوستان کی اندرونی کشمکش اور نا اتفاقی ، امنِ عالم میں خلل پیدا کرنے والے عناصر رہے ہیں ۔ موجودہ صورتِ حال کتنی ہی تشویشناک کیوں نہ دکھائی دیتی ہو ، میں اس امر سے نا امید نہیں ہوں کہ ہندوستان میں فرقہ وارانہ مفاہمت ممکن العمل ہے ، مجھے ہندو مسلم مسئلہ —— جس سے آج یہ ملک دو چار ہے —— کی سنجیدگی اور اہمیت کا احساس اور ان عملی مشکلات کا بھی علم ہے ، جو اس مسئلہ کے عملی حل میں حائل ہیں ۔ لیکن میں یہ یقین کرنے کے لیے اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتا ، جیسا کہ کئی اشخاص انگلستان اور ہندوستان دونوں ممالک میں بد قسمتی سے اس کا شکار ہو جاتے ہیں ، کہ دونوں فرقوں کو متحد کرنے کی تمام مساعی رائگاں جائیں گی[۳]"

۳۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ۔ مرتبہ شاملو ۔ ناشر المنار اکادمی لاہور ۔ طبع دوم ستمبر ۱۹۴۸ء ۔ ص ۱۶۶

یہ تو ۱۹۳۰ع کے اواخر اور ۱۹۳۱ع کے اوائل کی باتیں تھیں - لیکن اب یہ دور ختم ہو چکا تھا - ستمبر ۱۹۳۱ع میں ہندوستان کے اندر نہیں ، ہندوستان کے باہر ، برطانیہ عظمیٰ کے قلب لندن میں ، پھر کسی پارک و ہوٹل ، جلسہ و کنونشن میں نہیں ، دوسری گول میز کانفرنس میں ہندو مسلم اتحاد کی سعی کی گئی اور اس میں اقبال اور دیگر مسلم قائدین کے علاوہ ، ہندوستان کی قومی تحریک کے عظیم المرتبت رہنما اور ہندوؤں کے مسلمہ مہاتما گاندھی جی بھی شریک تھے - ایک چھوڑ چار باضابطہ اجلاس اور کئی خانگی نشستیں ہوئیں ، لیکن ہر اجلاس ناکام اور ہر نشست لاحاصل ثابت ہوئی - اس کے بعد تو اقبال کو نا امید ہو جانا چاہیے تھا - لیکن نہیں ۶ دسمبر ۱۹۳۳ع کو انھوں نے ایک اخباری بیان جاری کیا ، جس میں وہ فرماتے ہیں -

"وہ شخص جو مختلف فرقوں کو متحدہ قومیت میں ضم کر دینے کی مخالفت کرتا ہے ، لازماً ہر صورت قوم کا دشمن نہیں ہے - یہ ظاہر ہے کہ ہندوستان کے مختلف فرقوں کے بعض مفادات مشترک ہیں - جہاں تک ان مفادات کا تعلق ہے ، مختلف فرقوں میں سمجھوتہ ممکن ہے اور میرے عقیدے کے مطابق تو یہ سمجھوتہ لازماً ہو کر رہے گا - موجودہ صورت حال تو ملک کی سیاسی ترقی کی ایک لازمی منزل ہے [۴]"

اتنی بلند سطح پر ہندو مسلم گفتگوئے مفاہمت ہوئی اور نتیجتاً ناکام ہوئی لیکن پھر بھی اقبال نا امید نہیں ہے ! !

ان تمام حقائق کے پیش نظر یہ کہنا کہ پاکستان کے تصور نے اقبال کی قنوطیت میں جنم لیا ، یقیناً غلط ہو گا - حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی سیاسی صورت حال کا اقبال نے بڑا گہرا مطالعہ کیا تھا - وہ نہ تو قوم پرستی کی تحریک سے متاثر ہوئے اور نہ فرقہ وارانہ اختلافات سے مایوس ہو کر انھوں نے پاکستان کا تصور پیش کیا - وہ قوم پرستوں کی مانند نہ تو اتنے

۴- ایضاً ص ۲۱۱

رجائی تھے کہ یہ سمجھ لیتے کہ ہندوستان کی ساری جماعتیں گھل مل کر ایک ہو جائیں گی اور نہ ہی فرقہ پرستوں کی طرح اتنے قنوطی تھے کہ ان اختلافات و فسادات کو ہندوستانی سیاست کی ایک مستقل صورت یقین کر لیتے - اس مسئلے سے متعلق نہ تو وہ بہت ہی خوش آئند توقعات رکھتے تھے اور نہ بالکل مایوس ہی تھے بلکہ ایک حقیقت پسند کی حیثیت سے انھوں نے اس مسئلہ پر نگاہ ڈالی تھی - ان کا نقطہ نظر مایوسانہ نہ تھا ، بلکہ حقیقت پسندانہ تھا اور اسی حقیقت پسندی نے ان پر یہ واضح کیا تھا کہ عرف عام میں جس کو "فرقہ وارانہ مسئلہ" کہا جاتا ہے ، وہ حقیقت میں بین الاقوامی مسئلہ تھا اور وہ جانتے تھے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی جس "منزل" سے اس وقت گزر رہی تھی ، وہ لازماً "سیاسی ترقی کی ایک عبوری منزل" ہے - اس کے بعد ایک دن آئے گا ، جب بین الاقوامی سطح پر اس مسئلہ کو طے کیا جائے گا !

بعض اشخاص یہ خیال کرتے ہیں کہ علامہ مرحوم کی صوبائیت یا پنجابیت ہی تصور پاکستان کی اصل محرک ہے - طفیل احمد منگلوری لکھتے ہیں -

> ۱۹۱۶ع کے میثاق ملی کی رو سے جو کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان مسٹر جناح کی صدارت میں مرتب ہوا ، صوبجات بنگال اور پنجاب کی کونسلوں میں مسلمان ممبروں کی تعداد ان کی آبادی کی نسبت سے کم کر دی گئی تھی ، جس کی وجہ سے مسلمانوں کی اکثریت اقلیت میں منتقل ہو گئی - اس نقصان کا اثر اہل پنجاب کے قلوب پر بہت تھا ، اس کی تلافی کے لیے ڈاکٹر سر محمد اقبال نے ایک تدبیر نکالی اور اس کا تذکرہ الہ آباد کے اجلاس مسلم لیگ منعقدہ دسمبر ۱۹۳۰ع میں اپنے خطبہ صدارت میں کیا[۵]"

طفیل احمد صاحب نے یہ الزام لگا تو دیا لیکن اس کے ثبوت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی ! اس الزام کا جواب اقبال کی شاعری ، خطبات و

۵- مسلمانوں کا روشن مستقبل ، از طفیل احمد منگلوری ، ص ۶۳ .

بیانات کا ایک ایک لفظ دے رہا ہے ۔ اقبال نے ہمیشہ مادیت اور مادی علائق کی پر زور مذمت کی ۔ انسانوں کو نسل و نسب ، رنگ و زبان ، قبیلہ و علاقہ کے تنگ تر دائروں میں تقسیم کرنے کے خلاف وہ عمر بھر زبان و قلم سے جہاد کرتا رہا ، اور الخلق عیال اللہ کی ساری عمر اس نے تبلیغ کی ۔ انتہا یہ کہ مرض الموت میں مبتلا اور بستر مرگ پر پڑے ہوئے بھی اس نے علاقہ واریت اور وطنی قومیت کے بت پر ضرب کاری لگائی تھی ! —— اس کے باوجود اس پر یہ الزام کہ اس نے پنجاب کے تنگ تر دائرے میں رہنے والوں کے مفاد کی خاطر پاکستان کا تصور پیش کیا تھا ! !

خرد کا نام جنوں رکھ دیا جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

حقیقت یہ ہے کہ تصور پاکستان کا ذہنی محرک اقبال کا جذبۂ یاس تھا نہ تعلق پنجاب ، بلکہ اس کا حقیقی محرک تھا ، ان کا عشق اسلام ! انھوں نے انسانی زندگی اور اس کے حقائق کا گہرا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہونچے کہ بنی نوع انسان کی انفرادی و اجتماعی نجات اسلام اور صرف اسلام میں ہے ۔ اسلام نے پہلے ان کے ذہن و دماغ پر قبضہ کیا اور اس کے بعد وہ ان کے قلب و روح پر چھا گیا ۔ پہلے تو عقل و فکر نے ان کو اسلام کی سچائی کا قائل کیا اور جب یہ سچائی ان کے دل میں اتر گئی ، تو وہ اسلامی حقائق کے دیوانے اور عاشق زار بن گئے ۔ ان کی چشم دیندار و نگۂ پاکباز نے ساڑھے تیرہ سو سال کے پردوں کو اٹھا کر اس مثالی اور نصب العینی معاشرہ کی ایک جھلک دیکھ لی ، جس کو روح محمد نے پرورش کیا تھا ، سوز صدیق نے پروان چڑھایا تھا اور صولت فاروق نے نکھارا تھا —— بیسویں صدی کی گھٹا ٹوپ تاریکی میں روشنی کی اس جھلک نے ان کے دل کو بقعہ نور بنا دیا ، اور ان کی نظر میں وہ بصیرت پیدا کر دی تھی ، جس کی مدد سے وہ انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر مسئلہ کو حل کرتے تھے ۔ اقبال کے دل و نگاہ پر تو اس روح پرور ہلالی روشنی نے قبضہ کر لیا تھا ، لیکن ان کی آنکھوں نے کیا نظارہ دیکھا ؟ یورپ کو مادیت نے اپنی قبامیں لپیٹ لیا تھا ، ایشیا پر موت کی سی خوفناک غشی طاری

تھی اور وسط ایشیا کا وہ خطہ جہاں جلال اسلامی نے کئی برس تک دنیا کو اپنا پر شوکت نظارہ دکھایا تھا ، اب موت و زیست کی کشمکش میں مبتلا تھا - انھوں نے اپنی زندگی میں دو مرتبہ عالم اسلام کو موت کے منہ میں جا کر واپس آتا ہوا دیکھا ـــــ ایک تو اس وقت جب کہ روس و برطانیہ کے اتحاد نے ممالک اسلامیہ کو ختم کر دینے کے منصوبے باندھے تھے ـــــ اور دوسرے جنگ عظیم کے دوران جبکہ وطنی قومیت اور لادینی سیاست کی ریشہ دوانیوں اور وسیسہ کاریوں نے وحدت اسلامی کو پارہ پارہ کر دیا تھا ! اور اختتام جنگ پر خلافت ترکیہ کے انخلاء نے بظاہر وحدت اسلامی کی تجہیز و تکفین کے آخری مراسم ادا کیے تھے ، لیکن اقبال کی نگاہ ہوشیار نے عالم اسلام کی خاکستر سے ان چنگاریوں کو اڑتے ہوئے دیکھ لیا تھا ، جو جمال الدین افغانی کی شخصیت میں آ کر جمع ہو گئی تھیں ـــــ انھوں نے دیکھا کہ اس بطل حریت کی روح میں ان چنگاریوں نے وہ آگ لگا دی جو ایک اسلامی ملک سے دوسرے اسلامی ملک میں پھیلتی جا رہی تھی اور وہ تڑپ پیدا کر دی ، جس کا اثر لازماً دنیائے اسلام پر ہو کر رہا[6]-

یہ نظارہ تو مغربی دنیا اور مشرق وسطیٰ کا تھا ، لیکن خود اس خطہ زمین کی کیا حالت تھی ، جس سے ان کا وطنی تعلق تھا ؟ غلامی کا طوق ہندوستان کے گلے میں پڑا ہوا تھا ، اور وہ اس طوق کو اتار کر مغربی تصورات کی بیڑیاں اپنی خوشی سے پہننا چاہتا تھا - اقبال نے چاہا کہ اسلامی تصورات کے تیشہ سے ان بیڑیوں کو توڑ پھینکدے لیکن غلاموں کی ایک عظیم اکثریت ان بیڑیوں کو اپنا زیور سمجھ رہی تھی - ان حالات میں اس نے یہی مناسب سمجھا کہ کم از کم برصغیر ہند کے اس خطے کو اس ذہنی غلامی سے بچا لیا جائے جہاں اس نصب العینی معاشرہ کے نام لیواؤں کی اکثریت رہتی سہتی ہے ـــــ تاکہ وہ تصورات ، جنھوں نے اس کی روح کی گہرائیوں میں اپنا گھر کر لیا تھا ، جنھوں نے عالم اسلامی

٦- مضامین اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ ، احمدیہ پریس ، چار مینار ، حیدر آباد دکن ، بار اول ۱۳۶۲ھ ، ص ۱۶۶

کو موت کی آغوش میں جانے سے بچا لیا اور جنھوں نے جمال الدین افغانی کی تحریک وحدتِ اسلامی کے ذریعہ ممالک اسلامیہ میں روحِ اسلامی کی تڑپ پیدا کی تھی ، اس خطہ میں جلوہ گر کیے جا سکیں ---- مختصر یہ کہ (۱) اسلامی حقائق کا عشق (۲) عالم اسلام کی بربادی (۳) انغلاء خلافتِ ترکیہ (۴) جمال الدین افغانی کی تحریکِ وحدتِ اسلامی اور (۵) ہندوستان کی خیر سگالی کا جذبۂ بے پایاں ---- اقبال کے ماحول ، عالم اسلام کے حوادث اور اقبال کے سیاسی تفکر پر بحیثیت مجموعی غور کرنے کے بعد ، ہم کہہ سکتے ہیں کہ یہی وہ محرکات ہیں ، جو تصورِ پاکستان کے پسِ پردہ اقبال کے ذہن میں کام کر رہے ہیں ۔ گویا خارجی شہادت کی بناء پر ہم انہیں محرکات قرار دے رہے ہیں ۔ آئیے ۔ دیکھیں کہ ہمیں ان ذہنی محرکات میں کوئی داخلی شہادت بھی ملتی ہے ۔

پاکستان کی تجویز ، علامہ اقبال نے دسمبر ۱۹۳۰ء میں مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ الہ آباد کے خطبہ صدارت میں پیش کی تھی ۔ یوں تو اس تجویز کے پس منظر کے طور پر ان کے ذہن میں جو تصورات و خیالات کار فرما رہے ہیں ، انہیں ان کے پورے کلام و پیام ، تقاریر و بیانات میں سے بآسانی ڈھونڈ کر نکالا اور پیش کیا جا سکتا ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص ان کے صرف اسی خطبۂ صدارت کو بنظر غائر پڑھ لے تو اس کو ان کے اس ذہنی محرک کا پتہ چل جائے گا ، جو اس تجویز کے پیچھے کار فرما تھا ۔

یہ خطبہ ایک ایسی جماعت کے سالانہ اجلاس میں پڑھا گیا تھا ، جو علمی نہیں بلکہ بالکلیہ سیاسی جماعت تھی ۔ اس سیاسی جماعت کا مقصد نظری طور پر سیاسی مسائل کے بارے میں اظہار خیال کرنا نہ تھا ، بلکہ یہاں تو عملی طور پر مسلمانوں کی سیاسی رہنمائی کرنا تھی ۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس خطبۂ صدارت کے ابتدائی حصہ میں جو کافی طویل ہے ، ان سیاسی اور عمرانی مسائل پر بحث کی گئی ہے ، جو قطعاً نظری یا علمی (Acadmic) ہیں ، اور جن کا اس وقت کی عملی سیاست سے بظاہر کوئی تعلق نظر نہیں آتا ۔ خود علامہ کو اس بات کا احساس تھا ۔ تب ہی تو انھوں نے کہا ۔

”مجھے امید ہے کہ آپ مجھے اس خالص علمی بحث کے لیے معاف

فرمائیں گے۔"

یہ علمی بحث ، اسلام کے اصول سمرانی ، نظریہ سیاسی اور تصور قومیت کی مختصراً مگر جامع تشریح ہے ۔ مسلم لیگ کوئی علمی ادارہ ، یا اکادمی تو تھی نہیں کہ وہاں اس قسم کے مباحث چھیڑے جاتے ۔ سوال یہ ہے کہ ایک خالص عملی سیاسی جماعت کے پلیٹ فارم سے اس قسم کی علمی باتیں کرنے کا کیا تک تھا ؟ کیا اقبال اس قدر غیر متوازن ذہن رکھتے تھے کہ انھیں اس امر کا احساس نہ تھا کہ کون سی بات کس محل و موقع پر کہنی چاہیئے ! اگر آپ غور سے اس خطبہ صدارت کو پڑھیں تو آپ خود محسوس کریں گے کہ اقبال نے یہ باتیں بے محل نہیں کہی تھیں ۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان باتوں کے کہنے کا اس سے زیادہ موزوں محل اور موقع نہ تھا ۔ انھوں نے یہ باتیں ، اپنے خطبۂ صدارت کے ابتدائی حصہ میں محض اس لیے کہی ہیں کہ آگے چل کر اسی خطبہ میں انھوں نے جو تجویز برصغیر میں ایک نئی آزاد مسلم مملکت کے قیام کی پیش کی ہے اس کے لیے ذہنوں کو پہلے سے تیار و آمادہ کر لیا جائے ۔ واقعہ یہ ہے کہ اس زمانہ کے سیاسی ماحول میں ، جب کہ یہ خطبۂ صدارت پڑھا گیا تھا ۔ یہ تجویز ایک انوکھی تجویز تھی اور غیروں کو ہی نہیں بلکہ اپنوں کو بھی اچنبھے میں ڈالنے والی ! ـــــ اب تک مسلمان ، جداگانہ انتخاب ، نشستوں کے تحفظ ، ملازمتوں میں تناسب اور تمدنی حقوق وغیرہ کے لیے لڑ رہے تھے ، جن کی آخری شکل قائد اعظم کے چودہ نکات کے نام سے سب کے سامنے آئی تھی ۔ بنیا کانگریس ان حقوق و تحفظات میں ڈنڈی مارنے کے لیے ادھار کھائے بیٹھی تھی اور ہندو مہاسبھا تو ان کی سرے سے مخالف تھی ۔ ایسے ماحول اور ان حالات میں ایک نئی آزاد مسلم مملکت کے قیام کی تجویز سے غیروں کا چراغ پا ہونا تو لازمی تھا ہی ، اپنے بھی حیرت زدہ ہو کر رہ جاتے ! ! اسی لیے علامہ اقبال نے ایک ماہر نفسیات کی طرح ان سنجیدہ علمی مباحث کے ذریعہ مسلمانوں کے قلوب کو تیار اور غیروں کے اذہان کو صاف کیا ۔ یوں اپنی بات کو اپنوں کے دلوں میں اتارنے اور غیروں سے منوانے کے

۷۔ اسپیچس اینڈ سٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، طبع ثانی ، ص ۷

لیے راستہ ہموار کیا ۔ اب اس کو آپ چاہیں تو پاکستان کا اقبالی فلسفہ کہیے ، نظریاتی اساس کہیے یا علمی توجیہ قرار دے لیجئے ۔ حقیقت یہ ہے کہ خطبۂ صدارت کے یہ سارے علمی مباحث ہی ، اقبال کا وہ ذہنی سرمایہ ہے ، جس سے اس تصور کی تعمیر ہوئی ہے ۔

یہاں ہم بخوف طوالت ان تمام علمی نکات کا جائزہ نہیں لے سکتے ، جو علامہ نے اپنے خطبہ کے ابتدائی حصے میں بیان کئے ہیں کہ انھوں نے یہاں اصطلاحاً نہیں بلکہ واقعتاً سمندر کو کوزہ میں بند کیا ہے ۔ اس لئے ہم ان کے خطبہ صدارت سے صرف ایک فقرہ پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں ، جو حقیقتاً اس تجویز کا محرک اور اقبال کے ذہن کی کلید ہے ۔ وہ فقرہ یہ ہے ۔

" ہندوستان دنیا میں سب سے بڑا مسلم ملک ہے ۔ اس ملک میں اسلام کی زندگی ، بحیثیت ایک تمدنی قوت کے ، بڑی حد تک اس امر پر منحصر ہے کہ اس کو ایک مخصوص رقبہ میں مرتکز کر دیا جائے[۸] "

یہی اقبال کی نظر میں پاکستان کی تشکیل کا جواز ، اور اس کے قیام کی سب سے بڑی ، سب سے محکم دلیل ہے ۔

اسلام کا ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے ارتکاز (Centralization) اقبال کے تصور پاکستان کی روح ہے ۔ اسلام کی ابتدائی تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس ارتکاز کے بعد ہی اسلام ایک تمدنی قوت کی حیثیت سے نہ صرف زندہ رہا ، نشو و نما پائی بالیدگی حاصل کی بلکہ وہ ربع مسکون پر چھا گیا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں اسلام کی تبلیغ کی ، ایک حد تک آپ کو کامیابی ہوئی ۔ کچھ لوگ مسلمان ہوئے ، مگر مکہ میں بڑی حد تک اسلام شخصی مذہب (Personal Faith) بنا رہا ۔ آپ کے اغراض و مقاصد بلکہ اسلام کی بنیادی غرض و غایت کے لئے حقیقتاً یہ کامیابی کافی نہ تھی ۔ اب

۸۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، مطبوعہ لاہور طبع ثانی ص ۱۳ ۔

آپ نے طائف پر نظر ڈالی ۔ وہاں بھی وہی صورت پیش آئی ، جو مکہ میں پیش آ چکی تھی ۔ پھر آپ نے قرب و جوار پر نظر ڈالی ۔ بالآخر انتخاب یثرب کا ہوا ۔ اللہ کے حکم سے اللہ کے رسول نے مکہ سے مدینہ ہجرت کی اور مدینہ پہنچ کر نہ صرف تبلیغ کی ، بلکہ ایک مثالی مملکت (Ideal State) قائم کر دی ۔ اب اسلام صرف ایک شخصی مذہب (Personal Faith) عادات، عقائد و رسوم کا مجموعہ ہی نہ رہا بلکہ ایک اجتماعی نظام بن گیا ! اقبال کے الفاظ میں ہجرت کے بعد ، پہلی مرتبہ اسلام کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے یثرب میں سرور عالم (Leader of the World) نے مرتکز کر دیا ! ! سیرت نبوی کے اس عظیم الشان واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کے بنیادی مقاصد کے لئے صرف تبلیغ ہی کافی نہیں ہے بلکہ تبلیغ سے بھی ایک قدم آگے بڑھ کر اسلام کو تمدنی قوت کی حیثیت سے مرتکز کرنے کی ضرورت ہے ۔ اگر "اشاعت" ہی کافی تھی اور "ارتکاز" ضروری نہ تھا ، تو پھر رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کو ہجرت کی صعوبت اٹھانے اور ایک نصب العینی مملکت کی نیو ڈالنے کی ضرورت کیا تھی ! ! مکہ کی سعئی اشاعت کے دوران اسلام پھیلا تو ضرور ، لیکن مدینہ کی کوشش ارتکاز کے بعد ہی وہ پھلا پھولا اور ایک تمدنی قوت بن کر اس نے نہ صرف اس مدنی مملکت کے اندر بلکہ اس کے باہر تمام عالم پر اپنے اجتماعی برکت کی بارش کر دی ! ——— مندرجہ بالا فقرہ لکھتے وقت اقبال کے ذہن میں صدر اول کی اسلامی تاریخ کا یہی تابناک واقعہ تو نہ تھا ؟ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ "اسلامی تعلیمات کی روح سے اتصال دائمی رکھنے کے باعث[۹]" اس مختصر سے فقرہ میں انھوں نے اسلام کی اس تاریخی حقیقت اور اس کے بنیادی تقاضہ کو سمو دیا ہو ؟ یہ محض قیاس آرائی نہیں ، بلکہ ایک حقیقت ہے کہ اسلام ایک تمدنی و تہذیبی قوت کی حیثیت سے مرتکز ہو کر انسانوں کی انفرادی و اجتماعی زندگی کو اپنے حیطۂ اقتدار میں لے لینا چاہتا ہے ۔ وہ مسیحیت کی طرح یہ نہیں کہتا کہ جو قیصر کا ہے ، وہ قیصر کو دو اور

۹۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، مطبوعہ لاہور طبع دوم سنہ ۱۹۴۸ع ص ۳ ۔

جو خدا کا ہے وہ خدا کو دو۔ وہ اس بات کا بھی روادار نہیں ہے کہ انسانوں کے اجتماعی معاملات کی باگ ڈور سیکولرزم کے حوالے کرکے ، خود ایک نجی عقیدے کی حیثیت سے انسانوں کی انفرادی زندگی کے گوشۂ عافیت میں چلا جائے۔ وہ ایک مضمحل ، غیر مؤثر ، مجہول مذہب یا ایک مجموعۂ عبادات و رسوم " دھرم " (Cult) نہیں ہے۔ وہ ایک باأثر فعّال اور حیات بخش عنصر کی حیثیت سے انسانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی پر چھا جانا چاہتا ہے۔ انہیں اپنے قابو میں لا کر ان کی صورت گری کرنا چاہتا ہے۔ وہ زبردستی یقیناً نہیں کرتا۔ لا اِکراہ فی الدین ، لیکن زیر دست بن کر رہنا بھی اس کی فطرت میں داخل نہیں ہے۔ وہ دست نگری اور محکومی پر کسی صورت رضامند نہیں ہے۔ دست نگری اور محکومی کی بات تو رہی ایک طرف ، باطل سے مفاہمت و مصالحت بلکہ اغماض و چشم پوشی تک اسے گوارا نہیں ہے۔ وہ اس دنیا میں مغلوب و محکوم ، منفعل و مضمحل رہنے کے لئے نہیں بلکہ فاتح و مقتدر " غالب و کار آفریں ، کار کشا و کار ساز " بننے کے لئے آیا ہے۔ ھوالذی ارسل رسولہٗ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ و لو کرہ المشرکون۔ (ترجمہ) " اسی نے بھیجا اپنے رسول کو ہدایت اور سچا دین دے کر تاکہ اس کو غلبہ دے ہر دین پر ، خواہ یہ امر مشرکوں پر شاق ہی کیوں نہ گذرے "۔

الکلمۃ اللہ ھی العلیا ۔ اللہ ہی کا کلمہ ہی " بلند و بالا " ہے ۔ یہ ہے اسلام کی سرشت کا تقاضا اور یہ ہے اس کی فطرت کا داعیہ ! یہ داعیہ ایک ایسی حقیقت ہے ، جو ہر اس شخص پر آشکارا ہو جاتی ہے ، جس نے تھوڑے سے غور و فکر کے ساتھ اسلام کا مطالعہ کیا ہو۔ پنجاب کے مشہور ہندو نیتا لالہ لاجپت رائے نے اسی حقیقت سے آگاہ ہونے کے بعد بنگال کے کانگریسی لیڈر ، سی آر داس کو سنہ ۱۹۲۵ء میں وہ مشہور تاریخی خط لکھا تھا ، جس کا حوالہ قائد اعظم محمد علی جناح نے مسلم لیگ کے اجلاس لاہور والے خطبہ صدارت میں دیا تھا۔ لالہ جی نے لکھا تھا۔

" ایک اور نکتہ ہے ، جو مجھے حال میں بہت زیادہ ستاتا رہا ہے ،

اور جو ایک ایسا نکتہ ہے ، جس پر میں چاہتا ہوں کہ آپ احتیاط سے غور فرمائیں اور وہ ہندو مسلم اتحاد کا مسئلہ ہے ۔ پچھلے چھ مہینے کے دوران میں نے اپنا بیشتر وقت مسلمانوں کی تاریخ اور مسلمانوں کی شریعت کے مطالعہ پر صرف کیا اور میں یہ خیال کرنے پر مائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد ممکن ہے نہ قابل عمل ہے ۔ مسلمانوں کے جو لیڈر تحریک عدم تعاون میں شریک ہیں ، ان کے خلوص کو مانتے ہوئے اور تسلیم کرتے ہوئے ، میں سمجھتا ہوں کہ ان کا مذہب ہندو مسلم اتحاد کی قسم کی ہر چیز کے لئے مؤثر رکاوٹ بنتا ہے ۔ آپ کو وہ گفتگو یاد ہو گی جو میں نے حکیم اجمل خاں صاحب اور ڈاکٹر کچلو کے ساتھ کی تھی اور آپ کو کلکتہ میں سنائی تھی ۔ ہندوستان میں حکیم صاحب سے زیادہ عمدہ مسلمان نہیں ہے لیکن سوال یہ ہے کہ آیا وہ یا کوئی دوسرا مسلمان لیڈر قرآن کے خلاف کوئی کام کر سکتا ہے ۔ میں تو بس یہی اُمید قائم کر سکتا ہوں کہ اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ غلط ہے اور مجھے اس چیز سے زیادہ کسی اور چیز سے سکون حاصل نہ ہو گا کہ مجھے یقین دلایا جائے کہ اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ غلط ہے ۔ لیکن اگر اسلامی شریعت کے متعلق میرا مطالعہ صحیح ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اگرچہ ہم برطانیہ کے خلاف متحد ہو سکتے ہیں لیکن ہم جمہوری اصولوں کے مطابق ہندوستان پر حکومت کرنے کے لئے متحد نہیں ہو سکتے ۔ تو پھر اس کا علاج کیا ہے ۔ میں سات کروڑ مسلمانوں سے نہیں ڈرتا بلکہ یہ سوچتا ہوں کہ ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں کے ساتھ افغانستان ، وسطِ ایشیاء ، عرب ، عراق اور ترکی کے مسلح غول ایسے ہوں گے جن کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا ۔ میں ایمانداری اور خلوص کے ساتھ اس کا قائل ہوں کہ ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت ہے یا ہندو مسلم اتحاد مناسب ہے ۔ میں مسلم لیڈروں پر بھروسہ کرنے کے لئے بھی تیار ہوں ، لیکن قرآن

اور حدیث کے احکام کا کیا ہو گا ۔ مسلم لیڈر ان احکام کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تو کیا ہمارا انجام تاریک ہے[10] "

لالہ لاجپت رائے کا یہ تاثر تو ان کے صرف چھ ماہ کے مطالعۂ اسلام و اسلامی قانون کا ماحصل تھا ، تو پھر کیا اقبال ، جس نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ اسلام ، اس کے نظام شریعت و سیاست ، اس کی تہذیب و تاریخ اور ادب کے گہرے مطالعہ میں صرف کیا تھا[11] ، اس حقیقت مبرهن سے بے بہرہ رہ سکتا تھا ؟ ہرگز نہیں ! اقبال نے عملی سیاست میں داخل ہوتے وقت ہی کہا تھا ۔

" اس وقت جو قوتیں دنیا میں کارفرما ہیں ، ان میں سے اکثر اسلام کے خلاف کام کر رہی ہیں لیکن لیظہرہ ، علی الدین کلمۃ کے دعوے پر میرا ایمان ہے کہ انجام کار اسلام کی قوتیں کامیاب اور فائز ہوں گی[12] "

پھر انھوں نے اپنے خطبہ صدارت مسلم لیگ میں اسلام کے اس فطری داعیہ اور اندرونی تقاضے کو صرف ایک بلیغ و دلکش فقرہ میں یوں ادا کیا ۔

"Islam is itself a destiny and will not suffer a destiny"

" اسلام خود ایک تقدیر ہے ، وہ کسی دوسری تقدیر کو انگیز نہیں کر سکتا[13] "

۱۰- اخبار مرہٹہ ، ۲ فروری سنہ ۱۹۳۰ع بحوالہ سیاست ملیہ ، از محمد امین زبیری ص ۱۹۰ ۔

۱۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۳ ۔

۱۲- اخبار " زمیندار " مورخہ ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۲۶ع ۔

۱۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، مطبوعہ لاہور ، طبع دوم ص ۷ ۔

اگر اسلام کے بارے میں اقبال کا تصور یہ ہے تو پھر بات ادق اور پیچیدہ نہیں ، صاف اور واضح ہے کہ پاکستان کا تصور پیش کرتے وقت ان کا ذہنی محرک یہی اور صرف یہی ایک '' تقدیر ساز قوت '' تھی !

تصور پاکستان کے تعلق سے اقبال کے ذہنی محرک کی تلاش یا یہ معلوم کرنا کہ اقبال کے ذہن میں پاکستان کی نظریاتی اساس (پاکستان کی آئیڈیالوجی) کیا ہے ، اس لئے اہم ہے کہ عام طور پر اقبال ہی کو تصور پاکستان کا خالق یا اولین بانی سمجھا جاتا ہے ۔ لیکن اقبال کی یہ حیثیت بھی مابہ النزاع بن گئی ہے اور بعض حلقوں میں تو اس بات کی عمداً کوشش کی گئی ہے کہ ان سے یہ منصب بھی چھین لیا جائے اور دوسروں کو اس پر فائز کیا جائے ! آئیے ، یہ تحقیق بھی کر لیں کہ پاکستان کا تصور ، اپنے پورے مضمرات کے ساتھ سب سے پہلے کس نے پیش کیا ۔ اسی سلسلہ میں پاکستان کی آئیڈیالوجی یا اس کی نظریاتی اساس پر بھی مزید روشنی پڑ جائے گی ۔

اقبال —— تصور پاکستان کا پہلا بانی ؟

پاکستان کا تصور سب سے پہلے کس نے پیش کیا ؟ جواب میں مختلف نام لئے جاتے ہیں ۔ سرسید احمد خاں ، ولفریڈ سکاون بلنٹ ، مولانا عبدالحلیم شرر ، سر تھیوڈور ماریسن ولایت علی بمبوق ، خیری برادراں ، عبدالقادر بلگرامی ، نادر علی ، مولانا محمد علی جوہر ، خاں صاحب سردار محمد گل خاں ، مولانا حسرت موہانی ، لالہ لاجپت رائے ، مولانا مرتضیٰ احمد خاں اور چودھری رحمت علی(الف) ۔

الف۔ سوائے سر تھیوڈور ماریسن کے یہ سب نام جناب پیرزادہ شریف الدین نے اپنی کتاب '' منزل بمنزل '' میں پیش کئے ہیں ۔ پیرزادہ صاحب نے ان میں سے کسی ایک کو تصرر پاکستان کا بانی قرار نہیں دیا ہے ۔ البتہ انھوں نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ تقسیم ہند کا تصور مختلف زمانوں میں کن لوگوں کے ذہن میں گردش کرتا رہا ہے تاہم اس سے تاثر یہی پیدا ہوتا ہے کہ اقبال سے قبل ان حضرات نے یہ تصور پیش کیا تھا ۔

آئیے دیکھیں ، ان لوگوں نے کیا کہا ہے۔

سنہ ۱۸۶۷ع میں جب اردو ہندی کا جھگڑا شروع ہوا تو سرسید نے بنارس کے انگریز کمشنر مسٹر شیکسپیئر کے سامنے جن خیالات کا اظہار کیا تھا ، انھیں ہم اس کتاب کے دوسرے باب میں درج کر آئے ہیں۔ سرسید نے اس وقت ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو مختلف قومیں قرار دیا تھا اور یہ پیش گوئی کی تھی کہ یہ دو مختلف قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہیں ہو سکیں گی[14]۔ سنہ ۱۸۸۳ع میں انھوں نے ایک تقریر میں کہا۔

" اب فرض کیجئے کہ سارے انگریزوں کو ہندوستان چھوڑنا پڑ جائے —— تو پھر ہندوستان کے حکمران کون ہوں گے ؟ کیا یہ ممکن ہے کہ ان حالات میں ہندو اور مسلمان دونوں قومیں ایک ہی تخت سلطنت پر بیٹھ سکیں اور اقتدار کی حد تک مساویانہ حیثیت برقرار رکھ سکیں ؟ یقیناً نہیں قطعاً ناممکن یہ لازمی اور ضروری ہے کہ ان میں سے کوئی دوسرے کو مغلوب کرے اور اپنا زیرنگیں بنا لے[15] "

سر سید نے اسی دو قومی نظریہ کی بنیاد پر مارچ سنہ ۱۸۸۸ع میں بمقام میرٹھ اپنی مشہور و معروف تقریر میں انڈین نیشنل کانگریس کی مخالفت کی۔ پھر جب مسٹر بدر الدین طیب جی صدر کانگریس نے اجلاس مدراس کے بعد مسلمانوں کو کانگریس میں شرکت کی ترغیب دی تو سر سید نے ان کی سخت مخالفت کی اور ایک بیان جاری کیا ، جس میں انھوں نے کہا۔

" یہ امر واقعہ ہے کہ کوئی مسلمان خواہ وہ ایک موچی ہو یا

۱۴- حیات جاوید ، از مولانا الطاف حسین حالی طبع ثانی ص ۴۰۔

۱۵- (The Making of Pakistan) از رچرڈ سائمنڈز ، مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ع ص ۳۱ و " پاکستان منزل بمنزل " از پیرزادہ شریف الدین طبع اول سنہ ۱۹۶۵ع مطبوعہ انجمن پریس کراچی ص ۶۷۔

اعلیٰ خاندانی آدمی ، ہرگز ہرگز یہ گوارا نہ کرے گا کہ مسلمانوں کا رتبہ گھٹا کر انھیں ایک ایسی حیثیت دے دی جائے ، جہاں رہ کر وہ اپنے آپ کو ایک ایسی دوسری قوم کا غلام محسوس کریں جو ان کی پڑوسی قوم ہے[۱۶] "

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ سر سید ہندوؤں اور مسلمانوں کی دو قومیں تصور کرتے تھے اور ان کے باہم مل کر رہنے یا آزادی ہند کی صورت میں ان دونوں قوموں کی مشترکہ حکومت کو ناممکن خیال کرتے تھے ۔ ان کا خیال تھا کہ اگر ہندوستان برطانوی تسلط سے آزاد ہو جائے گا تو ان دونوں قوموں میں سے کوئی ایک قوم غالب ہو جائے گی اور دوسری قوم کو غلام بنا لے گی ۔ اس کے بجائے اس مسئلہ کا کوئی دوسرا متبادل حل بھی ان کے ذہن میں تھا یا نہیں اس کا کوئی پتہ نہیں چلتا یا کم از کم ان کے بیانات سے اس کا اظہار نہیں ہوتا ۔ یہ صحیح ہے کہ وہ دو قومی نظریے کے حامی تھے ۔ ہندو مسلم مشترکہ معاشرت و مخلوط حکومت کے سخت مخالف تھے تاہم صرف اسی بناء پر انھیں تصور پاکستان کا پہلا بانی قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ نہ تو انھوں نے کوئی متبادل تجویز پیش کی اور نہ ہندوستان کی تقسیم اور مسلم مملکت کے قیام کی طرف کوئی اشارہ کیا ۔ وجہ بالکل واضح ہے ۔ سر سید کے زمانے میں سیاسی حالات ایسے تھے ہی نہیں کہ وہ کوئی متبادل تجویز پیش کرتے یا تقسیم ہند کی رائے دیتے ۔ اس وقت تو ہندوستان پر انگریزوں کی گرفت بہت مضبوط تھی اور آزادیٔ ہند کی منزل ابھی بہت دور تھی ۔ اس زمانے میں مسئلہ مجالس قانون ساز کی تشکیل اور ان میں محدود پیمانہ پر عوامی نمائندگی کا تھا ۔

ولفریڈ سکاون بلنٹ ایک ادیب تھا ۔ اس نے لارڈ رپن کے زمانہ میں ہندوستان کا دورہ کیا اور ایک کتاب بعنوان (Ideas about India) لکھی اس میں اس نے لکھا ۔

۱۶- پاکستان منزل بمنزل ، از پیرزادہ شریف الدین ص ۴۲ ۔

" میرے بارے میں کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ میں ہندوستان کے لئے شاہی ایوان (امپیریل پارلیمنٹ) کی وضع کی گئی کسی چیز پر زور دے رہا ہوں ۔ ہندوستان ایک بہت ہی وسیع و فراخ براعظم جیسا ہے اور یہ ایک ایسی کثیر رنگ برنگی اور گوناگوں نسلوں سے آباد اور معمور ہے کہ یہ قطعاً ممکن نظر نہیں آتا کہ ان کو ملا کر اور ایک دوسرے میں مدغم کرکے کوئی ایک واحد اسمبلی تشکیل دی جائے ، جو ان نمائندوں پر مشتمل ہو جو کسی قابل تصور یا ممکنہ ضابطہ اور طریقہ انتخاب کے ذریعہ منتخب ہو سکیں[۱۷] "

اپنی اس رائے کی بنیاد پر دسمبر سنہ ۱۸۸۳ء میں بلنٹ نے یہ تجویز پیش کی کہ شمالی ہند کے تمام صوبوں کو عملی طور پر مسلم حکومت کے تحت دے دیا جائے اور جنوبی ہند کے صوبوں کو ہندو حکومت کے تحت ۔ " اس منصوبے میں بہرحال برطانوی حکومت کو ایک نگران طاقت کی حیثیت سے برقرار رہنا تھا اور انگریزی افواج کو بھی ہر صوبہ میں مقیم رہنا تھا تاکہ ان صوبوں کو برطانوی حمایت حاصل رہ سکتی لیکن سارے دیوانی نظم و نسق ، قانون سازی اور مالیات کو ملکی ہاتھوں میں دے دینا ضروری تھا[۱۸] "

ان اقتباسات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ

۱۔ بلنٹ ہندوستان کو ایک ملک نہیں بلکہ ایک وسیع ذیلی براعظم (Sub-continent) سمجھتا تھا ۔

۲۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو علیحدہ قومیں قرار دیتا تھا ۔

۳۔ ان دونوں کی مشترکہ یا مخلوط حکومت کو وہ ناقابل عمل سمجھتا تھا اور اسی لئے

۱۷۔ (Ideas about India) از بلنٹ ص ۸۹ ، بحوالہ پاکستان منزل بمنزل از شریف الدین پیرزادہ ص ۱٦۳ ۔

۱۸۔ ایضاً ص ۱٦۳ ، ایضاً ص ۴۷ ۔

۴۔ اس نے شمالی ہند کے صوبوں کو مسلم حکومت کے تحت اور جنوبی ہند کے صوبوں کو ہندو حکومت کے تحت رکھنے کی تجویز پیش کی تھی۔

ان تمام تصورات کے باوجود اس کی اس تجویز کو تقسیم ہند کی تجویز قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ وہ ان صوبوں پر برطانوی حکومت کی نگرانی و تسلط کو ضروری سمجھتا تھا۔ البتہ وہ ان صوبوں کی محدود خود مختاری (Limited Provincial Authority) دینے کا قائل تھا۔ ظاہر ہے کہ ان تمام صوبوں پر برطانوی حکومت کا تسلط اور انگریزی افواج کی نگرانی، ہندوستان کو ایک "سیاسی وحدت" (Political Unit) بنائے رکھتے۔ اس نقطۂ نظر سے دیکھئے تو بلنٹ کے تصورات سے پاکستان کی صورت گری نہیں ہوتی۔ برطانوی تسلط کے خاتمہ کے بعد، اس ذیلی براعظم کا سیاسی نقشہ کیا ہوگا؟ شمالی ہند کے مسلم صوبوں اور جنوبی ہند کے ہندو صوبوں میں علیحدہ علیحدہ آزاد و مختار مملکتیں قائم ہوں گی یا ان کے مابین کوئی مشترکہ سیاسی نظم ہوگا۔ اس بارے میں بلنٹ خاموش ہے۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس زمانے میں برطانوی سامراج کے خاتمہ کا تصور کسی انگریز کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ لیکن جب تک ان سوالات کا واضح جواب نہ دیا جائے، کسی شخص کو تصور پاکستان کا پیش کنندہ قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اردو کے مشہور ناول نگار مولانا عبدالحلیم شرر لکھنوی، ماہ نامہ "دلگداز" کے ایڈیٹر تھے۔ انھوں نے لکھنؤ سے اگست سنہ ۱۸۹۰ءمیں ایک ہفت روزہ "مہذب" بھی جاری کیا تھا۔ اس کے شذرات میں وہ ہندو مسلم مسائل پر بھی اظہار خیال کرتے تھے(الف)۔ ڈاکٹر عبدالسلام

الف۔ مولانا شرر کا رسالہ دلگداز تو مشہور تھا لیکن "مہذب" کا کچھ زیادہ چرچا نہ تھا۔ اسی لئے بعض علمی حلقوں میں اس کے متعلق شکوک و شبہات کا اظہار کیا گیا۔ جناب شریف الدین پیرزادہ نے بھی اپنی کتاب "پاکستان منزل بمنزل" کے صفحہ ۶۷ پر اپنے شبہ

خورشید نے ان شذرات کا مطالعہ کرنے کے بعد لکھا ۔

" ہندو مسلم چپقلش کے بارے میں انھوں نے جو شذرے وقتاً فوقتاً لکھے ہیں ان سے اس زمانے کی سیاست کا یہ پہلو قدرے اجاگر ہوتا اور براعظم کی اسلامی سیاست کے طالب علم پر یہ انکشاف بھی ہوتا کہ دو قومی نظریہ کسی ایک شخص یا جماعت کی ایجاد نہیں تھا بلکہ ایک شذرے سے تو پاکستان کے تصور کی بھی ایک ہلکی سی جھلک نظر آتی ہے[۱۹] "

اپنے اس تاثر کی تائید میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے شذرات کے مختلف اقتباسات پیش کئے ہیں ۔ جس شذرہ میں انھیں پاکستان کے تصور کی ہلکی سی جھلک نظر آئی ، وہ ۲۳ اگست سنہ ۱۸۹۰ء کے شذرہ میں شائع ہوا ہے ۔ اس کا متعلقہ اقتباس درج ذیل ہے ۔

" ہمارے خیال میں اگر ایسا ہی وقت آ گیا ہے کہ کسی کی مذہبی رسوم بغیر دوسرے کی توہین و دل شکنی کے پوری نہیں

بقیہ حاشیہ صفحہ ۸۶۴

کا اظہار اس طرح کیا ہے " مولانا شرر دلگداز کے ایڈیٹر تھے ۔ " مہذب " نام کبھی نہیں سنا " ۔ راقم الحروف نے " صحافت پاکستان و ہند میں " اور " کاروان صحافت " کے مصنف ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، صدر شعبہ صحافت ، پنجاب یونیورسٹی سے استفسار کیا تو موصوف نے صراحت فرمائی کہ " مہذب " کے پہلے دو سال کے فائل ان کے پاس موجود تھے ۔ پھر انھوں نے ان کو تحفہ کے طور پر لاہور میوزیم کے حوالے کر دیا ۔ اب یہ فائل لاہور میوزیم میں موجود ہیں ۔

۱۹- " صحافت پاکستان ہند میں " مصنفہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اول جون سنہ ۱۹۶۳ء ص ۲۷۰ و ۲۷۱ اور " کاروان صحافت " مصنفہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ناشر انجمن ترقی اردو کراچی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۶۴ء ص ۶۶ ۔

ہوتیں اور نہ اتنا صبر و تحمل ہے کہ دوسرا فریق ان باتوں کو
طرح دے تو ہندوستان کے اضلاع کو ہندو مسلمان باہم تقسیم کر
لیں اور اپنی اپنی آبادیاں علیحدہ کر لیں[۲۰] "

اس شذرہ کے متعلق ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ وضاحت بھی کر دی ہے کہ اس میں عیدالاضحیٰ کے فسادات کا ذکر کیا گیا ہے اور یہ نتیجہ اخذ کیا گیا ہے کہ برصغیر کی مختلف قوموں کو ایک قرار دینا غلطی ہے[۲۱] -

مہذب کے مندرجہ بالا اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

(۱) مولانا شرر ہندوؤں اور مسلمانوں کو دو علیحدہ قومیں قرار دیتے تھے ،

(۲) وہ اس بات سے مایوس تھے کہ یہ دو قومیں باہم مل کر رہ سکتی ہیں ،

(۳) اسی لئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ " ہندو اضلاع " اور " مسلم اضلاع " جدا جدا ہوں تاکہ ان کی آبادیاں علیحدہ رہ سکیں -

ظاہر ہے کہ یہ " ہندو اضلاع " اور " مسلم اضلاع " کے قیام کی تجویز ہے - اس تجویز میں تو " ہندو صوبوں " اور " مسلم صوبوں " کا تصور بھی نہیں ملتا چہ جائیکہ اس کو " ہندو مملکت " اور " مسلم مملکت " کی تجویز قرار دیا جائے - شرر کی اس تحریر سے ہندوؤں اور مسلمانوں کی

۲۰- " صحافت پاکستان و ہند میں " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ، ناشر مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول ، جون سنہ ۱۹۶۳ع ص ۲۷۱ او " کاروان صحافت " ص ۶۷ -

۲۱- " صحافت پاکستان و ہند میں " مصنفہ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ناشر مجلس ترقی ادب لاہور ، طبع اول جون سنہ ۱۹۶۳ع ص ۲۷۱ " کاروان صحافت " ص ۶۷ -

باہمی مغائرت کا احساس تو یقیناً مترشح ہوتا ہے۔ اگر اس احساس مغائرت ہی کو ڈاکٹر عبدالسلام خورشید تصور پاکستان کی ہلکی سی جھلک قرار دے رہے ہیں تو خیر ، ورنہ پاکستان کا تصور احساس مغائرت کا نہیں بلکہ ایک واضح ، قطعی اور پختہ سیاسی شعور کی صورت گری کا نام ہے۔ علاوہ ازیں شرر کے اس احساس کا محرکِ اولین " عدمِ رواداری " ہے جو دونوں قوموں کے افراد میں انھیں دکھائی دے رہی تھی اور یہی عدم رواداری ، مذہبی رسوم کی پُر امن طریقہ پر بجا آوری میں انھیں مانع نظر آ رہی تھی۔ اسی لئے انھوں نے " ہندو اضلاع " اور " مسلم اضلاع " کا تصور پیش کیا۔ ظاہر ہے کہ یہ محرک نہ تو وقیع ہے اور نہ ہمہ گیر! ان دلائل کی روشنی میں پاکستان کے تصور کو شرر کے ذہن کی پیداوار قرار نہیں دیا جا سکتا۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ سر تھیوڈور ماریسن سابق پرنسپل علی گڑھ کالج نے سب سے پہلے پاکستان کا تصور پیش کیا تھا۔ جس عبارت کی بنیاد پر انھیں اس تصور کا بانی قرار دیا جاتا ہے وہ یہ ہے۔

" اگر ہندوستان کے پانچ ملین مسلمان کسی صوبہ یا ملک کے کسی حصہ میں جمع کر دئے جائیں۔ مثال کے طور پر شمالی ہند میں تو ایک قومی اسپرٹ ان علاقوں میں پیدا ہو جائے گی جس سے حالیہ مسئلہ کا جزوی حل ہو سکتا ہے[۲۲] "

یہ بات انھوں نے سنہ ۱۸۹۹ع میں کہی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ کوئی باضابطہ سیاسی تجویز یا اسکیم نہیں تھی ! اور نہ انھوں نے کسی مسلم مملکت کے قیام کا منصوبہ پیش کیا۔ سنہ ۱۸۹۹ع میں کوئی انگریز ، خواہ وہ کتنا ہی لبرل ، روشن خیال بے تعصب اور منصف مزاج کیوں نہ ہو۔ برصغیر میں مسلم مملکت کے قیام کا تصور کر ہی نہیں سکتا تھا۔ یہ تو ایک مبہم سرسری سا خیال ہے ، جو ایک مضمون نگار ، محض مضمون آرائی کے شوق میں پیش کرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ ہم اس کو ہندوؤں سے

۲۲۔ " ہندوستان میں شہنشاہی حکومت " از تھیوڈور ماریسن ص ۴۔

مسلمانوں کی علیحدگی کی تجویز کہہ سکتے ہیں وہ بھی اس خیال سے کہ ان میں قومیت کا جذبہ پیدا ہو جائے نہ کہ کوئی "مسلم مملکت" قائم ہو۔ پھر ماریسن کے مندرجہ بالا الفاظ میں یہ تصور بھی جھلکتا ہے کہ اس قومیت یا اس کے اپنے الفاظ میں "قومی اسپرٹ" کا تعلق ارض وطن سے ہے۔ یہ گویا یورپی نظریہ وطنیت یا وطنی قومیت ہی ہے جس کا اطلاق وہ مسلمانوں پر کرنا چاہتے تھے اور جس کی مخالفت اقبال کے بنیادی سیاسی عقائد میں داخل تھی۔ الغرض موریسن کا یہ خیال کوئی سوچا سمجھا منصوبہ یا برصغیر کی اہم ترین سیاسی گتھی کا حل نہیں ہے۔ نہ اس میں برصغیر کی تقسیم کا کوئی ذکر ہے اور نہ مسلم مملکت کے قیام کی طرف کوئی اشارہ ہی ہے!

کہا جاتا ہے کہ ولایت علی بمبوق نے بھی یہ تصور پیش کیا تھا۔ ولایت علی، علی گڑھ کے تعلیم یافتہ تھے۔ بارہ بنکی میں وکالت کرتے تھے۔ مولانا محمد علی جوہر کے معتقد و مداح اور رفیق کار تھے اور ان کے اخبار "کامریڈ" میں گپ کا کالم، بمبوق کے قلمی نام سے مزاحیہ انداز میں لکھا کرتے تھے۔ مئی سنہ ۱۹۱۳ع میں اسی کالم میں انہوں نے ایک خیالی انٹرویو لکھا تھا۔ اس انٹرویو کا متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

"سوال: ہندو مسلم مسئلہ آپ کس طرح حل کریں گے۔

جواب: ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ کر دینا چاہئے۔ شمالی ہند مسلمانوں کے حوالہ کر دیا جائے اور مابقی ہندوؤں[۲۳] کے"۔

اس انٹرویو سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ولایت علی بمبوق دو قومی نظریہ کے قائل تھے، اور اسی بنیاد پر وہ ان دو قوموں کو ہندوستان کے دو حصوں میں بسانا چاہتے ہیں، لیکن یہ واضح نہیں ہے کہ دو حصے، دو مختلف مملکتیں بنیں گی یا ان کی حیثیت صرف صوبوں کی ہو گی ———

۲۳- اخبار "کامریڈ" مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۳ع جلد ۵ شمارہ ۳۸، بحوالہ "پاکستان منزل بمنزل" از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۱۱۔

پھر اس تجویز کو بمبوق نے " گپ" کے مزاحیہ کالم میں جگہ دے کر اس کی وقعت کو گرا دیا بلکہ اس کے سنجیدہ پن پر پانی پھیر دیا ہے ! ایسی صورت میں انھیں کس طرح اس تصور کا پہلا بانی قرار دیا جا سکتا ہے ؟ پاکستان کا تصور کوئی ہنسی مذاق تو تھا نہیں ، یہ تو ایک قوم بلکہ قوموں کی قسمت کا فیصلہ کرنے والا تصور تھا !

خیری برادران کو بھی تصور پاکستان کا بانی بتایا جاتا ہے ۔ یہ دو بھائی تھے ۔ ایک کا نام ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور دوسرے کا پروفیسر عبدالستار خیری تھا ۔ کہا جاتا ہے کہ ۱۹۱۷ع میں انھوں نے یہ تصور پیش کیا تھا ۔ پہلی عالمی جنگ کے دوران اکتوبر یا ستمبر ۱۹۱۷ع میں اسٹاک ہوم میں سوشلسٹ انٹرنیشنل کا ایک اجلاس امن کے امکانات پر غور کرنے کے لئے منعقد ہوا تھا ۔ اس اجلاس میں انڈین پیٹریاٹک لیگ (انجمن محبان ہند) کے نمائندوں کی حیثیت سے خیری برادران نے شرکت کی تھی اور ایک تحریری یادداشت پیش کی تھی ۔ اس یادداشت میں انھوں نے ہندوستان کو ہندو ہندوستان اور مسلم ہندوستان میں تقسیم کر دینے کی تجویز رکھی تھی ۔ اس تجویز کے الفاظ کیا تھے ، اس میں " ہندو صوبوں " اور " مسلم صوبوں " کا ذکر تھا یا " ہندو مملکت" اور " مسلم مملکت " کا ، پھر ان دونوں مملکتوں کے مابین کوئی دستوری رشتہ تجویز کیا گیا تھا یا نہیں ۔ اس کا پتہ نہیں چل سکا ۔ تاہم عبدالستار خیری نے اپنے ایک مکتوب مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۴۱ع میں جو انھوں نے مسٹر اٹیلی لارڈ پریوی سیل حکومت برطانیہ کے نام لکھا تھا ، حسب ذیل وضاحت کی ہے ۔

> " ہندوستان کا واحد حل بس یہی ممکن ہے کہ ہر (یونٹ) وحدت کو یعنی ہر نام نہاد و دیسی ریاست اور برطانوی ہند کے ہر موجودہ صوبے کو حق خود اختیاری کے استعمال کی اجازت دی جائے تاکہ وہ اس طرز حکومت کو منتخب کر لیں ، جس کے تحت وہ رہنا پسند کرتے ہوں ۔ یہ وحدتیں دو تین یا اس سے زیادہ وحدتوں پر مشتمل وفاقوں میں شامل ہو سکتی ہیں ۔ کئی وحدتوں کے یہ وفاق اگر اس بات کو پسند کریں تو ایک دوسرے سے مل کر اس سے کہیں بڑے وفاق کو تشکیل دے سکتے ہیں . . . . . حقیقی

اور اصلی وحدتوں میں سے بعض وحدتیں تو رقبہ اور ...... آبادی کے لحاظ سے یورپ کی چند بڑی بڑی ریاستوں سے بھی بڑی ہوں گی۔ یہ خود مختار وحدتیں ایک ہندوستانی دولت مشترکہ کی طرح کوئی ایسی چیز بن سکیں گی جنھیں علیحدگی کا بھی حق حاصل ہو۔ کسی قسم کا دباؤ یا جبر نہیں ہونا چاہئیے۔ اس طرح مسلم وحدتیں اس قابل ہو سکیں گی کہ وہ اپنا ایک الگ وفاق بنائیں یا پھر وہ اگر اس چیز کو اپنے مفاد میں سمجھیں یا اگر ہندو ہی ان کے اندر اپنا اعتماد پیدا کر سکیں تو ایک زیادہ بڑے وفاق میں شامل ہو سکتے ہیں لیکن مسلمان جبر اور زبردستی کے آگے کبھی سر نہ جھکائیں گے[۲۴]"۔

یہ بات صحیح ہے کہ خیری برادران نے اسٹاک ہوم سوشلسٹ انٹرنیشنل کانفرنس منعقدہ ستمبر یا اکتوبر ۱۹۱۷ء تقسیم ہند کی تجویز پیش کی تھی کیونکہ اس کی تصدیق اس کانفرنس کے سیکرٹری جنرل مسٹر کاسیلی ہوسمنس نے اپنے مکتوب بنام مسٹر اٹیلی مورخہ ۳۰ دسمبر ۱۹۴۱ء میں کی ہے[۲۵]۔ لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ جو وضاحت پروفیسر عبدالستار خیری نے اپنے مکتوب بنام مسٹر اٹیلی مورخہ ۲۲ اگست ۱۹۴۱ء میں کی ہے، جس کو ہم اوپر درج کر آئے ہیں، وہ ان کی اسٹاک ہوم کانفرنس والی تجویز سے متعلق تھی۔ یہ شبہ اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ اصل تجویز ۱۹۱۷ء میں پیش کی گئی تھی اور وضاحت اگست ۱۹۴۱ء میں کی جا رہی ہے! اس دوران سیاسی حالات کافی تیز رفتاری سے بدلتے رہے۔ ۱۰ مارچ ۱۹۴۰ء میں قرارداد پاکستان مسلم لیگ کے اجلاس لاہور میں پیش کی جا چکی تھی اور اب ہندوستان کے پریس و پلیٹ فارم پر "پاکستان" ہی سب سے بڑا سیاسی موضوع بنا ہوا تھا۔ ہو سکتا ہے کہ پروفیسر خیری نے اس سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے اپنی اسٹاک ہوم والی تجویز کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی ہو۔ صحیح اندازہ تو اسی وقت قائم ہو سکتا ہے جب کہ خیری

۲۴- "پاکستان منزل بمنزل" از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۱۴

۲۵- ایضاً ص ۱۱۷ و ۱۱۸

برادران کی یہ تجویز اپنے اصلی الفاظ میں ہمارے سامنے ہو - لیکن افسوس ہے کہ اس تجویز کے الفاظ ہماری دسترس سے باہر ہیں - سیکرٹری جنرل اسٹاک ہوم کانفرنس مسٹر کامیلی ہوسمنس نے گو اس تجویز کے پیش کئے جانے کی تصدیق کی ہے لیکن انھوں نے اس تجویز کے الفاظ کو درج نہیں کیا - انھوں نے صرف یہ بتانے پر اکتفا کیا ہے کہ

" اسٹاک ہوم کانفرنس پر میری کتاب جو ۱۹۱۸ء کے آغاز میں " اپسالا " (Upsala) سے فرانسیسی زبان میں " اسٹاک ہوم " کے نام سے شائع ہوئی تھی ، اس کے صفحات ۳۰۷ اور ۳۰۸ پر ہندوستانی مسلمانوں کی مرکزی کمیٹی کی رپورٹ(الف) کا "خلاصہ" مل جائے گا وہ محض ایک خلاصہ ہے[۲۶] "

بالفاظ دیگر خیری برادران کی اصل تجویز اور اس کے الفاظ کا کہیں وجود ہی نہیں ہے - اب رہی پروفیسر ستار خیری کی ۱۹۳۱ء میں پیش کردہ وضاحت ، تو یہ امر مشتبہ ہے کہ ان کی اصل تجویز یہی تھی یا ۱۹۳۱ء کی سیاسی فضا کو دیکھتے ہوئے ، انھوں نے اپنی تجویز کو یہ رنگ دینے کی کوشش کی تھی - تاہم بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ ان کی ۱۹۱۷ء میں پیش کردہ تجویز وہی تھی جس کی وضاحت انھوں نے ۱۹۳۱ء میں کی ہے ، تو بھی دیکھنا یہ ہے کہ اس تجویز میں پاکستان کا تصور پایا جاتا ہے یا نہیں - پروفیسر ستار خیری کہتے ہیں کہ ہندوستان کے صوبوں اور دیسی ریاستوں کو حق خود اختیاری دیا جائے تاکہ یہ صوبے اور ریاستیں مختلف سیاسی وحدتیں (Units) بن جائیں - پھر یہ وحدتیں ایک سے زیادہ وفاق بنائیں گی - ایک مسلم وحدتوں کا وفاق ہوگا اور دوسرا ہندو وحدتوں کا ، یہاں تک تو درست ہے کیونکہ مسلم وحدتوں کا وفاق ہی "پاکستان" ہے لیکن پروفیسر خیری اپنی بات اسی پر ختم نہیں کرتے بلکہ وہ کچھ آگے بڑھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ مسلم وفاق اور ہندو وفاق ایک دوسرے سے مل کر اس سے کہیں بڑے وفاق کو تشکیل دے سکتے ہیں ، یہ

(الف) مراد ، خیری برادران کی تجویز ہے - مصنف

۲۶- پاکستان منزل بمنزل - از شریف الدین پیرزادہ ص ۱۱۷

کھہ کر وہ آگے نہیں بڑھتے بلکہ ٹھوکر کھاتے اور تصور پاکستان سے پیچھے ہٹ جاتے ہیں کیونکہ ہندو وحدتوں کے ساتھ ایک "بڑے وفاق" میں شمولیت ، تصور پاکستان کی نفی ہے ، خواہ یہ شمولیت کسی جبر ، دباؤ اور زبردستی کے بغیر خوش دلی اور رضامندی کے ساتھ ہی کیوں نہ ہو ! قابل غور بات یہ ہے کہ پروفیسر خیری نے عہدیہ (Confederation) کے بجائے بڑے وفاق (Federation) کے الفاظ استعمال کئے ہیں ۔ وفاق (خواہ وہ چھوٹا ہو یا بڑا) کی سیاسی اصطلاح میں مرکزی حکومت کا تصور ضرور موجود رہتا ہے ۔ ہندو وفاق اور مسلم وفاق کی ایک بڑے وفاق میں شمولیت سے ، ایک مرکزی حکومت کا تصور ابھرتا ہے اور یہ " تصور " پاکستان کے تصور پر پانی پھیر دیتا ہے ! ان حقائق کی روشنی میں خیری برادران کو تصور پاکستان کے پہلے "بانیان" قرار دینا مشکل نظر آتا ہے ۔

عبدالقادر بلگرامی ایک غیر معروف شخص ہیں ۔ ان سے بھی تصور پاکستان کو وابستہ کیا جاتا ہے ۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی لکھتے ہیں ۔

"مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں ایک شخص محمد عبدالقادر بلگرامی نے بدایون کے ایک اخبار ذوالقرنین میں ایک کھلی چٹھی گاندھی جی کے نام شائع کرائی ، جس چٹھی میں اس پر زور دیا کہ برعظیم کو ہندوؤں اور مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور اضلاع کی ایک فہرست بھی دے دی ، جو مغربی اور مشرقی پاکستان کی موجودہ حدود سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی ۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس منصوبے نے کچھ توجہ اپنی طرف جذب کی ، کیوں کہ بعد میں اس کو ایک رسالہ کی شکل میں شائع کیا گیا ، جس کی یکے بعد دیگرے دو اشاعتیں ہوئیں ۔ دوسری اشاعت کی تاریخ دسمبر ۱۹۲۵ء تھی[۷۲]۔"

۷۲- "مسلم کمیونٹی آف انڈو پاکستان سب کنٹیننٹ" از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ص ۲۹۵ و "برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ" از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ، مترجمہ ہلال احمد زبیری شائع کردہ شعبۂ تصنیف و تالیف کراچی یونیورسٹی ۱۹۶۷ء ص ۳۸۳

واقعہ یہ ہے کہ یہ کھلی چٹھی قاضی عزیز الدین احمد بلگرامی مرحوم نے "ہندو مسلم اتحاد پر مہاتما گاندھی کے نام کھلا خط" کے عنوان سے اخبار ذوالقرنین بدایوں میں مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء شائع کرائی تھی۔ قاضی صاحب مرحوم ضلع ہر دوئی (یو ، پی) کے رہنے والے تھے۔ علی گڑھ میں انھوں نے تعلیم پائی تھی اور یو ، پی کی سیول سروس سے منسلک ہو گئے تھے۔ وہ کئی سال تک ڈپٹی کلکٹر کی حیثیت سے سرکاری خدمات انجام دیتے رہے ، اور بعد میں ریاست بھرت پور کے دیوان بھی مقرر ہوئے[۲۸]۔ جس زمانہ میں انھوں نے اخبار ذوالقرنین میں یہ "کھلا خط" شائع کرایا ، وہ سرکاری ملازم (ڈپٹی کلکٹر) تھے ، اس لیے انھوں نے اپنا نام مخفی رکھا اور اپنے نام کے بجائے اپنے بھائی محمد عبدالقدیر (ن. ک. محمد عبدالقادر) بلگرامی کے نام سے یہ خط چھپوایا[۲۹]۔ محمد عبدالقدیر بلگرامی یقیناً غیر معروف تھے ، لیکن قاضی عزیز الدین احمد ، اس زمانہ میں اور بعد میں دیوانِ ریاست بھرت پور کی حیثیت سے ایک جانی پہچانی شخصیت تھے۔ اخبار ذوالقرنین میں اشاعت کے بعد ، اس خط کو ایک پمفلٹ (کتابچہ) کی شکل میں انھوں نے دسمبر ۱۹۲۵ء میں چھپوایا ، پھر اس کے بعد ایک اور مطبع اس کو بار بار چھاپتا رہا[۳۰]۔ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی نے اس خط کو حاصل کرکے اپریل ۱۹۷۰ء میں کتابی شکل میں شایع کیا ہے۔

اصل خط (۵۸) اٹھاون صفحات پر مشتمل ہے ، جس میں سے چون (۵۴) صفحات "ذبیحہ گاؤ" سے متعلق ہیں اور باقی چار صفحات میں "ہندو مسلم اتحاد" کا وہ حل پیش کیا گیا ہے ، جس کو "تقسیم ہند" کا "منصوبہ" قرار دیا جاتا ہے۔ اس خط کا اصل موضوع ، خود مصنف کے الفاظ میں یہ ہے کہ اس میں

۲۸۔ "اوپن لیٹر ٹو مہاتما گاندھی" شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی مطبوعہ ۱۹۷۰ء ص VI و ص XIII

۲۹۔ ایضاً ص XIV

۳۰۔ ایضاً ص XIV

"ذبح و قربانی کے متعلق نہایت تحقیق کے ساتھ عقلی ، نقلی اور اقتصادی پہلو سے بحث کرکے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مسلمان اس شرعی حق سے ، جو شعائر اللہ میں داخل ہے ، کسی ملکی مصلحت سے یا خیالی نفع کی توقع پر دست بردار نہیں ہو سکتے"

مندرجہ بالا عبارت مصنف نے اس کتابچہ کے سر نامہ پر لکھی ہے -

یہ خط ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے ، مارچ اور اپریل ۱۹۲۰ء میں شائع ہوا - یہ زمانہ تحریک ترکِ تعاون و تحریک خلافت کے آغاز کا ہے ، اور پہلے باب میں ہم یہ بھی بتا چکے ہیں کہ ان دونوں تحریکوں سے قبل ، ذبیحہ گاؤ ، مساجد کے سامنے باجہ بجانے وغیرہ پر ہندو مسلم سر پھٹول ہونے لگی تھی ، جس کے آغاز کا سہرا لوکمانیہ تلک کے سر تھا - ۱۹۱۹ء و ۱۹۲۰ء کی تحریکِ ترک تعاون و تحریکِ خلافت کے دوران ہندوؤں اور مسلمانوں میں مثالی اتحاد پیدا ہو گیا تھا ، جس کے اسباب ہم اس کتاب کے تیسرے باب میں بیان کر آئے ہیں - ان تحریکوں کے زمانہ میں مسلم زعماء کی کوشش یہ تھی کہ اس اتحاد کو ہر قیمت پر قائم و برقرار رکھا جائے - چنانچہ اپنی اس خواہشِ اتحاد اور جوشِ روا داری میں وہ اس حد تک آگے بڑھ گئے کہ انھوں نے ایک طرف سوامی شردھانند کو جامع مسجد دہلی کے منبر پر لا بٹھایا ، تو دوسری طرف مسلمانوں کو ہندوؤں کی دلجوئی کی خاطر ، رضا کارانہ طور پر گائے کی قربانی سے دست کش ہو جانے کی ترغیب دی - بنیادی طور پر گائے کی قربانی کا مسئلہ نہ صرف فقہی بلکہ عقیدہ کا مسئلہ تھا ، اس لیے مسلمان اہلِ علم کے حلقوں میں اس ترغیب کا ناگوار ردِ عمل ہوا - قاضی عزیزالدین احمد صاحب نے اسی ردِ عمل کی ترجمانی کی اور جیسا کہ انھوں نے دعویٰ کیا ہے ، قرآن و سنت اور اقوالِ فقہا کی روشنی میں مدلل طور پر یہ ثابت کیا کہ مسلمان ، محض ہندوؤں کی دلجوئی کی خاطر گائے کی قربانی جیسے شعارِ اسلامی سے دست بردار نہیں ہو سکتا - اس سلسلہ میں انھوں نے مسلم زعماء کے طرز عمل پر تند و تلخ لہجہ میں تنقید بھی کی - یہ تو تھا اس کتابچہ کا موضوع بحث ، اور یہی "تقسیم ہند" کے اس مبینہ "منصوبے" کا پس منظر بھی ہے -

ان کا کہنا یہ تھا کہ ذبیحہ گاؤ یا اذان و صلواۃ میں مداخلت ، خالص مذہبی مسائل ہیں اور ہندو مسلم اتحاد ایک سیاسی مسئلہ ہے ۔ ان کی رائے یہ تھی کہ

"مذہب کو سیاسیات سے بالکل علیحدہ رکھا جائے تاکہ جانبین کے معتقدات ناجائز دخل اندازی سے محفوظ رہیں[۳۱]"

ان کی نظر میں ذبیحہ گاؤ وغیرہ جیسے خالص مذہبی معاملات میں ہندوؤں کی مداخلت ہی ، ہندو مسلم اتحاد کی راہ میں واحد رکاوٹ نہیں تھی ، بلکہ وہ کہتے ہیں کہ خالص سیاسی مسائل مثلاً

"اردو ہندی کا جھگڑا ، نظامِ سلطنت میں ہمارے (یعنی مسلمانوں کے) حقوق کی مزاحمت انتخابِ جداگانہ سے انکار ، سرکاری ملازمت کی کشمکش وغیرہ وغیرہ بھی اپنی اپنی جگہ پر اتحاد کے موانع ہیں[۳۲]"

اس لیے وہ حسب ذیل تجویز پیش کرتے ہیں ۔

"ایک زبردست کمیشن مساوی التعداد ہندو مسلمانوں کے معتمد علیہ اشخاص کا مقرر کیا جائے جو حسب ذیل اسکیم پر غور کرنے کے بعد ایک قابل قبول اور ممکن العمل فیصلہ کر دے ۔

(۱) ہندوستان کی تقسیم از سر نو قومیت کی بناء پر اس طرح کی جاوے کہ ہر قوم کے لیے بڑے سے بڑا حصہ اس کی آبادی کا علیحدہ کر دیا جائے اور یہ حصہ اس قوم کا حلقہ اثر قرار دیا جائے مثلاً

مسلمانوں کے لیے حسب ذیل تین صوبے بنائے جا سکتے ہیں ۔

(الف) صوبہ سرحدی و مغربی پنجاب کے دس اضلاع : راولپنڈی ، اٹک ، جہلم ، گجرات ، شاہ پور ، میانوالی ، جھنگ ، مظفر گڑھ ،

۳۱- اوپن لیٹر ٹو مہاتما گاندھی شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ص ۵۸

۳۲- ایضاً ص ۵۹

ڈیرۂ غازی خاں اور ملتان کو یکجا کرکے ایک صوبہ بنا دیا جائے۔

(ب) بنگال میں بوگرا ، رنگپور ، دیناجپور ، جیسور ، ندیا ، فرید پور ، ڈھاکہ ، راج شاہی ، پبنا ، میمن سنگھ ، باقر گنج ، لواکھلی ، ٹپرا و چٹگانگ کے اضلاع کا دوسرا صوبہ بنا دیا جائے

(ج) سندھ کو بمبئی پریسیڈنسی سے جدا کرکے ، تیسرا صوبہ بنا دیا جائے

(۲) یہ بات اصولاً طے کر دی جائے کہ اس تقسیم کے بعد ہر حصۂ ملک کا نظم و نسق اس کے کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لیے کیا جائے گا

(۳) قلیل التعداد اقوام کی حفاظت و ادائے مراسمِ مذہبی و حقوقِ ملازمت وغیرہ کے قواعد مرتب کیے جائیں اور ان کے لیے قومی سیاسی اہمیت کی بناء پر حسب ضرورت دارالامن قائم کیے جائیں مثلاً پنجاب میں سکھ ایک با اثر قوم ہے ، لیکن کسی واحد ضلع میں وہ بلحاظ آبادی کے ہنود یا مسلمانوں سے زیادہ نہیں ہے ، جو اس کا حلقۂ اثر بنایا جا سکے اسی لیے قومی و پولیٹیکل اہمیت کی بناء پر ان کے لیے ایک دارالامن قائم کیا جائے۔ لودھیانہ اور امرت سر اس کے لیے بہت موزوں ہیں ۔ ان مقامات کا نظامِ حکومت سکھوں کے مفاد کے لحاظ سے ترتیب دیا جائے۔ سیالکوٹ ، عیسائیوں کا ملجا و ماویٰ قرار دیا جائے اور ان کو وہاں وہی حقوق دیے جائیں ، جو سکھوں کو امرت سر و لودھیانہ میں ۔ اسی طرح ممالک متحدہ آگرہ اودھ میں ، جو اسلامی تمدن کا گہوارہ ہے ، مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کے لیے خاص انتظام کی ضرورت ہو گی ۔

(۴) تبادلۂ آبادی کے لیے سہولتیں بہم پہنچانی چاہئیں ، تاکہ قلیل التعداد اقوام کے افراد ، جو کسی وجہ سے ترکِ وطن کرکے ، خود اپنی قوم کے حلقۂ اثر میں جانا چاہیں ، وہ بغیر نقصان کے تبدیلِ سکونت کر سکیں

(۵) کمیشن کا مجوزہ فیصلہ قومی معاہدہ کی صورت میں ، ترتیب دیا جائے اور گورنمنٹ کے سامنے بطور ملکی مطالبہ کے عمل درآمد کے لیے پیش کیا جائے ۔

(۶) جس وقت تک اس طرح کا معاہدہ نہ ہو جائے ۔

(الف) مسلمانوں کے انتخاب جداگانہ کی مخالفت نہ کی جائے ۔

(ب) پنجاب اور بنگال میں مسلمانوں کی نمائندگی کا تناسب آبادی کی بناء پر قرار دیا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

(ج) مذہبی مناقشات کے انسداد کے لیے قومی پنچایتیں قائم کی جائیں ، جن میں ہندو مسلمانوں کے نمایندوں کی تعداد مساوی ہو[۳۳]"

یہ ہے بلگرامی صاحب کا سینہ منصوبہ' تقسیم ہند یا پاکستان ! اس پر ایک سر سری نظر ڈالنے ہی سے واضح ہو جاتا ہے کہ

(۱) اس میں کہیں بھی "مسلم مملکت یا مسلم ریاست" کا مطلقاً ذکر نہیں ہے -

(۲) صرف تین مسلم صوبوں کا ذکر ہے ۔ سرحد اور مغربی پنجاب کے دس اضلاع کو ملا کر ایک صوبہ بنایا گیا ہے ۔ مشرقی بنگال کے چودہ اضلاع کو ملا کر ایک دوسرا صوبہ بنایا گیا ہے اور اس میں بھی سلہٹ ، (جو بنگال کی سرحد سے متصل آسام میں مسلمانوں کی اکثریت کا علاقہ تھا) کو شامل نہیں کیا گیا ہے ۔ تیسرا صوبہ سندھ کا ہے ۔ بلوچستان کا سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے ، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ بلوچستان کی اس وقت کی حیثیت (Position) پر مصنف نے صاد کر دیا ہے یعنی یہ کہ وہ گورنر جنرل و وائسرائے ہند کی براہ راست نگرانی میں رہے ، بالفاظ دیگر مرکزی حکومت ہند کی اس پر حکمرانی ہو ۔ الغرض تین مسلم

۳۳- این اوپن لیٹر ٹو مہاتما گاندھی شائع کر دہ ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی ص ۵۹ ، تا ۶۱

صوبوں کی حدود نمائی (Demarcation) کی گئی ہے ، لیکن یہ نہیں بتایا گیا ہے کہ ان صوبوں کا اپنا علیحدہ مرکز ہوگا یا یہ کل ہند مرکز سے وابستہ ہوں گے -

(۳) اس میں کوئی شک نہیں کہ اس طرح "قومیتِ مذہبی" کی بناء پر ہندوستان کی "از سر نو تقسیم" کی گئی ہے ، لیکن یہ وضاحت نہیں ہے کہ یہ "تقسیم" انتظامی (administrative) ہے ، سیاسی (Political) ہے یا دستوری (Constitutional) ہے - اگر یہ تقسیم انتظامی ہے تو اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے کیونکہ نظم و نسق کو چلانے کے نقطۂ نظر سے صوبوں کے حدود میں رد و بدل تو ہوتا ہی رہتا ہے - اگر یہ تقسیم سیاسی ہے ، تو بھی تقسیم ہند کا یہ منصوبہ پاکستان کا منصوبہ نہیں ہو سکتا کیونکہ یہ تین صوبے سیاسی حیثیت سے داخلی خود مختاری کے حامل ہوں گے - مکمل آزادی انہیں حاصل نہ ہوگی کہ وہ بقیہ ہندوستان سے "ایک مرکز" کے ذریعہ نتھی رہیں گے - اس تقسیم کو دستوری تقسیم اسی وقت کہا جا سکتا ہے جبکہ وہ ہندوستان کی مرکزی یا وفاقی حکومت کے ماتحت نہ ہوں ، بلکہ ان کا اپنا علیحدہ مرکز ہو - اس منصوبہ کو بنظر غائر دیکھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ان مسلم صوبوں کا کوئی علیحدہ مرکز تجویز نہیں کیا گیا ہے ، بلکہ اس کے فقرہ (۲) میں یہ کہا گیا ہے کہ "ہر حصۂ ملک کا نظم و نسق اس کی کثیر التعداد رعایا کے مفاد کے لیے کیا جائے گا"، جس سے یہی مترشح ہوتا ہے کہ مصنف کے ذہن میں ایک انتظامی یا سیاسی تقسیم (administrative or political division) کا نقشہ ہے - اس رائے کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ وہ تقسیم شدہ حصص ملک کو "مسلم مملکت" یا "ہندو مملکت" نہیں بلکہ متعلقہ قوموں کے "حلقہ ہائے اثر" قرار دیتے ہیں - یعنی مذکورہ بالا تین صوبے "مسلم حلقۂ اثر" ہیں اور ہندوستان کے بقیہ صوبے "ہندو حلقۂ اثر"- اور اسی لیے وہ تبادلۂ آبادی کی سہولتیں بہم پہنچانی چاہتے ہیں - بالفاظ دیگر مصنف کے پیش نظر ان حلقہ ہائے اثر کے

لیے داخلی خود مختاری یا ان صوبوں کے لیے مکمل صوبائی خود مختاری کا منصوبہ ہے - اس طرح "حلقہ ہائے اثر" ہوتے ہوئے بھی وہ کل ہند مرکز سے آزاد متصور نہیں ہو سکتے -

(۴) اس اسکیم کے روبہ عمل آنے تک مصنف جداگانہ انتخاب کو برقرار رکھنا چاہتے ہیں - دیکھیئے فقرہ (۲) الف - اس کے یہ معنی ہیں کہ جوں ہی یہ اسکیم نافذ ہو جائے گی ، وہ جداگانہ انتخاب سے دست بردار ہو جائیں گے - اس مشروط آمادگی سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں حلقہ ہائے اثر (ہندو حلقہ اثر اور مسلم حلقہ اثر) کو وہ ایک مشترکہ مرکز سے وابستہ رکھنے میں کوئی قباحت محسوس نہیں کرتے - یہ وہی بات ہے ، جو آگے چل کر ۱۹۲۷ع میں "تجاویز دہلی" (Delhi proposals) میں کہی گئی تھی ، جس کا ذکر ہم گذشتہ صفحات میں کر آئے ہیں - تجاویز دہلی میں بھی کل ہندوستان کے لیے ایک ہی مرکز کا تصور کارفرما تھا ، البتہ پنجاب و بنگال کے علاوہ سندھ ، سرحد اور بلوچستان کو مساوی الدرجہ صوبے قرار دینے کا مطالبہ کیا گیا تھا ، کیونکہ یہ مسلم اکثریت (یا حلقہ اثر) کے علاقے تھے اور اس کے بدلے میں جداگانہ انتخاب سے دست برداری کی پیش کش کی گئی تھی - اس لحاظ سے قاضی صاحب کے اس منصوبے کو "تجاویز دہلی" کا پیش خیمہ تو کہا جا سکتا ہے ، پاکستان کا منصوبہ قرار نہیں دیا جا سکتا ! !

آگرہ (یو پی) کے ایک وکیل نادر علی کے متعلق چودھری خلیق الزماں صاحب نے اپنی کتاب پاتھ وے ٹو پاکستان میں انکشاف کیا ہے کہ ۱۹۲۱ع میں انھوں نے ایک کتابچہ لکھا تھا ، "جس میں انھوں نے ہندو مسلم مسئلہ کے مختلف حل پر خیال آرائی کرتے ہوئے ایک حل ہندوستان کی تقسیم کا بھی پیش کیا تھا"[۳۴]۔ پاتھ وے ٹو پاکستان کی اشاعت کے بعد

۳۴- پاتھ وے ٹو پاکستان از چودھری خلیق الزماں ص ۲۳۸

اکتوبر ۱۹٦۷ء میں چودھری صاحب نے اپنی اسی کتاب کو "شاہراہ پاکستان" کے نام سے اردو میں شائع کیا "شاہراہ پاکستان" میں وہ اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں ۔

"۲۱-۱۹۲۰ء میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی صاحب نے جو خلافت تحریک کے سخت مخالف تھے ، ایک پمفلٹ لکھا ، جس میں انھوں نے کوئی اعداد و شمار نہیں لکھے اور نہ کسی رقبہ کو متعین کیا ، صرف تقسیم ہند کا ذکر کیا ہے ۔ میں نے یہ پمفلٹ بچشم خود دیکھا ہے[۳۵]"

یہاں ایک مبہم بات کہی گئی ہے ۔ نہ تو اس پمفلٹ کا متن دیا گیا ، اور نہ اس کے اقتباسات ہی دیے گئے ہیں ۔ محض یہ کہہ دینے سے کہ ہندو مسلم مسئلہ کے مختلف حل کے منجملہ انھوں نے ایک حل ہندوستان کی تقسیم کا بھی پیش کیا تھا ، بات نہیں بنتی ! کیا ہندوستان کی یہ تقسیم ، ہندو مسلم صوبوں میں تھی یا دو مختلف مملکتوں —— ہندو مملکت اور مسلم مملکت —— میں تھی ؟ اس سوال کا جواب ، اس قسم کے موہوم اشارات میں نہیں ملتا ۔ پھر خود چودھری صاحب اعتراف کرتے ہیں کہ نادر علی نے کوئی اعداد و شمار لکھے نہ کسی رقبہ کو متعین کیا ۔ جب نہ رقبہ متعین کیا گیا اور نہ اعداد و شمار ہی دیے گئے تو پھر یہ کوئی قطعی تجویز کیا ہوئی ؟

علاوہ بریں اس کا ذکر نہ تو اس زمانے کے کسی اخبار یا رسالہ میں ملتا ہے اور نہ کسی دوسرے معتبر یا معتمد علیہ شخص کی زبانی یہ بات سنی گئی ! چودھری خلیق الزماں صاحب کا یہ بیان کہ اس پمفلٹ کو انھوں نے بچشم خود دیکھا تھا ، اپنی جگہ درست سہی ، ہم اسے جھٹلانا بھی نہیں چاہتے ، کیونکہ اس طرح کے پمفلٹ اور مضامین تو ہر زمانہ میں نکلا ہی کرتے ہیں ، تاہم اس قسم کی عامیانہ اور سطحی باتیں کرنے والوں کے

۳۵۔ "شاہراہ پاکستان" از چودھری خلیق الزماں اشاعت اول مطبوعہ کراچی ۱۹٦۷ء ص ۱۰۸

سر "تصورِ پاکستان" پیش کرنے کا سہرا تو نہیں باندھا جا سکتا!

چودھری خلیق الزماں صاحب نے یہ بھی لکھا ہے کہ

"جب ایک ہندو مسلم مصالحتی کانفرنس ، جو شملہ کے قریب سلوگرہ میں ہوئی تھی ، نا کامیاب ہو گئی تو مولانا محمد علی نے علی گڑھ میں اپنی ایک تقریر میں یہ کہا کہ اگر ہندو مسلم مسئلہ طے نہ ہوا تو ہندوستان ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا ۔ اس سلوگرہ کانفرنس میں لالہ لجپت رائے ، پنڈت مالویہ اور چند دوسرے لیڈران اور مسلمانوں کی طرف سے مولانا محمد علی اور مولانا ابوالکلام آزاد شریک تھے اور اسی سال لاہور میں مسلم لیگ نے وحدانی طرز حکومت کے بجائے فیڈرل طرز حکومت کی تجویز منظور کی[36]"

چودھری خلیق الزماں ۲۴-۱۹۲۳ء کی بات کر رہے ہیں ۔ ستمبر ۱۹۲۳ء میں کل ہند کانگریس کا ایک خصوصی اجلاس بمقام دہلی زیر صدارت مولانا ابوالکلام آزاد منعقد ہوا تھا ۔ اور اسی اجلاس میں ایک کمیٹی نیشنل پیکٹ تیار کرنے کے لیے معرض وجود میں آئی[37] ۔ اس کمیٹی کا مقصد فرقہ وارانہ مسئلہ کا حل تلاش کرنا تھا ۔ اس کمیٹی کا اجلاس سلوگرہ یا سولن میں ہوا تھا[38]، چودھری خلیق اسی مصالحتی کمیٹی کے اجلاس کا ذکر کر رہے ہیں ۔ یہ واقعہ ہے کہ اس قسم کی مصالحتی کمیٹیاں ہمیشہ ناکام رہی ہیں ۔

چودھری خلیق کہتے ہیں کہ اس کمیٹی کی ناکامی سے متاثر ہو کر

۳۶- "شاہراہ پاکستان" از چودھری خلیق الزماں ۔ اشاعت اول ۔ اکتوبر ۱۹۶۷ء مطبوعہ ایجوکیشنل پریس ، کراچی ، ص ۸۰۱

۳۷- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پٹا بھی سیتا رامیا ، ص ۲۱۶ و ۲۱۷

۳۸- سیاست ملیہ ، از محمد امین زبیری ، مطبوعہ آگرہ ، مارچ ۱۹۴۱ء ، ص ۱۷۰

مولانا محمد علی جوہر نے علی گڑھ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ

" اگر ہندو مسلم مسئلہ طے نہ ہوا تو ہندوستان ، ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا "

آگے چل کر چودھری صاحب کہتے ہیں کہ " اسی سال لاہور میں مسلم لیگ نے وحدانی طرز حکومت کے بجائے فیڈرل طرز حکومت کی تجویز پیش کی " ۔ چودھری خلیق الزمان کا اشارہ مسلم لیگ کے غیر معمولی اجلاس کی طرف ہے ، جو بمقام لاہور ، مئی سنہ ۱۹۲۴ع میں زیر صدارت مسٹر محمد علی جناح منعقد ہوا تھا ۔ اس اجلاس میں یہ قرارداد منظور کی گئی تھی کہ ۔

" ہندوستان کے صوبوں کو ایک مشترکہ حکومت کے تحت وفاق بنیاد پر مربوط کیا جائے[۳۹] "

چودھری خلیق الزماں کے مندرجہ بالا اقتباس کو اس تاریخی سیاق و سباق میں دیکھنے کے بعد ، یہ تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ مولانا محمد علی سے ، جو تقریر وہ منسوب کر رہے ہیں وہ بے بنیاد نہیں ہے ، اگرچہ مولانا کی جو تقریریں اب تک شائع ہو چکی ہیں ، ان میں ہمیں اس تقریر کا پتہ نہیں چلا ۔ بہرحال یہ تسلیم کرتے ہوئے بھی کہ مولانا نے اپنی علی گڑھ والی تقریر میں تقسیم ہند کا ذکر کیا تھا ، ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ اس میں تصور پاکستان کی جھلک تو پائی جاتی ہے لیکن پاکستان کا مکمل اور قطعی تصور نہیں ملتا ۔ مولانا نے حسبِ روایت چودھری خلیق الزماں جو بات کہی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو سر سید نے سنہ ۱۸۶۷ع میں حسبِ روایت مولانا حالی بیان کی تھی ۔ جس کا ذکر ہم اس کتاب کے پہلے باب میں کر آئے ہیں ۔ سر سید نے بنارس کے انگریز کمشنر کے سامنے کہا تھا ۔

۳۹- فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (انگریزی) از عظیم حسین مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ع ص ۲۴۴ ۔

" اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں (ہندو مسلمان) کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی ۴۰ "

حقیقت ِ واقعہ یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کی کوششوں میں ہمیشہ سلمان لیڈر پیش پیش رہے لیکن ہندو نیتاؤں کی تنگ نظری اور تعصب کی جہ سے ہمیشہ انھیں نا کامی ہوئی ۔ مولانا محمد علی جوہر سے بڑھ کر ہندو سلم اتحاد کی کوششیں شاید ہی کسی اور لیڈر نے کی ہوں لیکن ہر مرتبہ نھیں نا کامی کا منہ دیکھنا پڑا ۔ ایسی ہی نا کامی انھیں سلوگرہ میں ہوئی ۔ س نا کامی سے جھنجھلا کر انھوں نے کہا کہ " ہندوستان ، ہندو انڈیا ور مسلم انڈیا میں تقسیم ہو جائے گا " ۔

یہ جھنجھلاہٹ کی ایک لہر تھی ، جو ہندو مسلم اتحاد کے دلدادہ د علی کے ذہن و دماغ میں پیدا ہوئی تھی ۔ یا زیادہ سے زیادہ اسے ایک سم کی پیش گوئی کہا جا سکتا ہے ، جو حالات کے رخ کو دیکھ کر مولانا نے کی تھی ۔ سر سید نے بھی اسی قسم کی پیش گوئی کی تھی ۔ اس قسم کی اتوں کو ان بزرگوں کی فراست یا دور بینی پر محمول تو کیا جا سکتا ہے بکن اس کو پاکستان کی " تجویز " قرار نہیں دیا جا سکتا کیونکہ اس بات نو انھوں نے تجویز کے طور پر پیش ہی نہیں کیا بلکہ مستقبل کے بارے یں اپنے ایک خیال کا اظہار کیا ہے ۔ پھر اس میں تصور پاکستان کے زمی اجزاء کی صراحت نہیں ہے کہ ہندو انڈیا اور مسلم انڈیا کے خطے کون کون سے ہوں گے ، ان کے مابین کسی قسم کا سیاسی اشتراک ہو گا وہ بالکلیہ ایک دوسرے سے علیحدہ ہوں گے ۔ آیا وہ دو مستقل مملکتیں وں گی یا وہ ایک کل ہند وفاق کے اجزاء ہوں گے ۔

حقیقت یہ ہے کہ سنہ ۱۹۲۳-۲۴ء میں ان سب باتوں پر غور و فکر سرنا قبل از وقت تھا ۔ ملک کے سیاسی حالات ابھی اس مرحلے میں داخل ں نہیں ہوئے تھے کہ کسی طباع شخص کا ذہن اس طرف منتقل ہوتا ۔ خان صاحب سردار محمد گل خان صاحب کو بھی تصور پاکستان کا

۴۰۔ حیات ِ جاوید ، از مولانا الطاف حسین حالی ، طبع ثانی ص ۹۴ ۔

پہلا بانی بتایا جاتا ہے - سردار صاحب ڈیرہ اسماعیل خان کی انجمن اسلامیہ کے صدر تھے - انھوں نے صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے سنہ ۱۹۲۲ع میں شہادت دی تھی - اس شہادت کے دوران ، جو رائے انھوں نے سرسری طور پر ظاہر کی - اسی کو پیش نظر رکھتے ہوئے ، انھیں تصور پاکستان کا پہلا بانی بتایا جاتا ہے - صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ کے متعلقہ اجزاء درج ذیل کئے جاتے ہیں تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ سردار صاحب نے جو کچھ کہا تھا ، وہ کیا تھا -

" مسٹر سمبرتھ ، رکن تحقیقاتی کمیٹی کا سوال : آپ کی انجمن کی بنیاد پان اسلامزم پر ہے - یعنی یہ کہ اسلام ایک قسم کی جمیعت اقوام (League of Nations) ہے اور اسی لئے اس صوبہ (سرحد) کا پنجاب میں انضمام اس مطمع نظر کے خلاف ہو گا - یہی تخیل آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا ہے - کیا یہ صحیح ہے ؟

سردار صاحب کا جواب : یہی ہے ، لیکن مجھے کچھ اور اضافہ کرنے دیجئے - ان کا خیال یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد کبھی نہ ہو سکے گا - ان کی خواہش ہے کہ یہ صوبہ علیحدہ رہے - جب مجھ سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ تیرا خیال کیا ہے تو میں بحیثیت رکن انجمن یہ خیال ظاہر کرتا ہوں کہ ہم ہندو اور مسلمانوں کی علیحدگی کو پسند کریں گے - ۲۳ کروڑ ہندو جنوب میں اور ۸ کروڑ مسلمان شمال میں - ہندوؤں کو راس کماری تا آگرہ کا علاقہ اور مسلمانوں کو آگرہ تا پشاور کا خطہ دے دیجئے - میرا مطلب یہ ہے کہ ایک مقام سے دوسرے مقام میں تبادلہ آبادی ہو ——— یہ تجویز تبادلہ آبادی کی ہے ، تباہی کی نہیں - یہ یقیناً ناقابل عمل ہے لیکن اگر یہ قابل عمل ہو تو ہم کسی دوسری تجویز پر اس کو ترجیح دیں گے[۴۱] "

۴۱- صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ ، بابتہ سنہ ۱۹۲۴ع ص ۱۲۲ و ۱۲۳ -

عبارتِ بالا سے یہ واضح ہوتا ہے کہ یہ محض رائے زنی ہے ، کوئی تجویز یا اسکیم نہیں ہے ، پھر خان صاحب خود ہی اس کو " ناقابل عمل " بتاتے ہیں - اس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے دو علیحدہ " علاقوں " کا ذکر ضرور ہے ، ہندو یا مسلم مملکت کے قیام کا کوئی تذکرہ نہیں ہے - وجہ وہی ہے کہ سنہ ۱۹۲۳ع میں حالات ایسے تھے کہ کوئی شخص " مسلم مملکت " کا خیال اپنے ذہن میں نہیں لا سکتا - دراصل خان صاحب نے بھی مسلمانوں کو ہندوؤں سے علیحدہ کرنے کی خواہش ظاہر کی تھی ، مسلمانوں کی " مملکت " کا قیام ان کے پیش نظر نہ تھا -

مہم آزادی کے سورما ، مسلمانوں کے بے نفس لیڈر رئیس الاحرار ، مولانا حسرت موہانی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہوں نے سنہ ۱۹۲۴ع میں ایک منصوبہ پیش کیا تھا - منصوبہ یہ تھا -

" (الف) مستقبل کی آزاد ریاستِ ہند کے لئے دو قومی (ہندو ، مسلم) بنیاد تسلیم کریں -

(ب) مسلم اکثریتی صوبوں کو مسلم ریاستوں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں تبدیل کریں اور

(ج) ان ریاستوں کا ایک ہندوستانی وفاق قائم کرکے اس کو ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل اعالی اختیاری قومی حکومت کے تحت کر دیں[۴۳] "

اس منصوبے سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا حسرت موہانی دو قومی نظریے کے حامی تھے اور اسی بنیاد پر وہ ہندو مسلم " ریاستوں " کی تشکیل کرنا چاہتے تھے - ان کے منصوبہ کا یہ جزو تصور پاکستان سے میل کھاتا ہے ، لیکن ان ریاستوں کی تشکیل کے بعد وہ ان دونوں ریاستوں کا ایک " وفاق " قائم کرنا چاہتے ہیں - اور اس وفاق حکومت میں وہ

۴۳- " پاکستان " از چودھری رحمت علی ، ص ۲۱۶ ، بحوالہ " پاکستان منزل بمنزل " از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۲۳ -

ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو شریک کرتے ہیں ۔ ظاہر ہے کہ منصوبہ کا یہ جزو ایک آزاد مقتدر (Sovereign) مسلم مملکت پاکستان کے تصور کے منافی ہے ۔

تصور پاکستان کے سلسلہ میں لالہ لاجپت رائے کا نام بھی لیا جاتا ہے ۔ یہ بات بڑی دلچسپ اور نہایت حیرت انگیز ہے ۔ اس لئے کہ لاجپت رائے پکے ہندو اور کٹر مہاسبھائی تھے ۔ اس میں شک نہیں کہ کانگریس کے صف اول کے نیتاؤں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور کلکتہ کانگریس منعقدہ ستمبر سنہ ۱۹۲۰ع کی انہوں نے صدارت کی تھی[۴۳] ۔ لیکن وہ ہندو مہاسبھا کے صدر بھی رہ چکے تھے ۔ سیاسی عقائد کے لحاظ سے وہ تلک کے جانشین تھے[۴۴] ، اور جداگانہ انتخاب کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی کے سخت خلاف تھے ۔ سنہ ۱۹۲۴ع کے اواخر میں انہوں نے " راوی سے برہم پترا تک " کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضامین لکھا اور مختلف اخبارات " دی ہندوستان ٹائمز " ، " بمبئی کرانیکل " ، " سوراجیہ " اور " ٹریبیون " میں شائع کرایا ، اس میں انہوں نے لکھا ۔

> " وہ تمام افراد ، جو جداگانہ رائے دہندگی کے ساتھ ساتھ ملک کے تمام نمائندہ اداروں میں فرقہ وارانہ نمائندگی کا مطالبہ کرتے ہیں ۔ انہیں چاہئے کہ وہ اس امر کا ایمانداری سے اعتراف کریں کہ وہ قوم پرستی (Nationalism) یا ایک متحدہ ہندوستان پر ایمان نہیں رکھتے ۔ دونوں چیزیں قطعاً ناقابل مفاہمت ہیں . . . . سخت الفاظ کو نہایت نرمی سے ادا کرتے ہوئے یہ خوش کلامی کرنا کہ یہ محض آزمائشی تجویز ہے اور یہ کہ ایک وقت آئے گا،

۴۳۔ انڈیا ونس فریڈم ، از مولانا ابوالکلام آزاد ، مطبوعہ کلکتہ فروری سنہ ۱۹۵۹ع ص ۱۰ ۔

۴۴۔ مولانا محمد علی جوہر کا بیان ہے کہ " لالہ لاجپت رائے تلک مہاراج کی طرف سے صدارت کانگریس کے امیدوار بنائے گئے تھے" اخبار ہمدرد مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۹۲۶ع ۔

جب مسلمان فرقہ وارانہ نمائندگی کے مطالبہ سے دستبردار ہو جائیں گے ، محض فریب ہے اور اس فریب میں کسی کو نہ آنا چاہئے ۔ ایک بار اگر آپ جداگانہ رائے دہندگی کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی کا اصول تسلیم کریں تو پھر بغیر خانہ جنگی یا باہمی کشت و خون ، اس کو منسوخ کرنا ممکن ہی نہیں ۔ خانہ جنگی یا باہمی کشت و خون کے معنی پھر یہی ہوں گے کہ ایک فرقہ کی دوسرے فرقہ پر فوقیت اور ایک کا دوسرے پر غلبہ[۳۵] "

اس اقتباس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ جداگانہ انتخاب کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی سے بے انتہا پریشان اور حد درجہ خائف تھے اور ان کا خیال تھا کہ جداگانہ انتخاب کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی کا نتیجہ لازماً ہندو مسلم جنگ کی صورت میں برآمد ہو گا ۔ اسی لئے وہ اس سے نجات کی راہ تلاش کرنا چاہتے تھے ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ذہن میں اس سے نجات کا ایک طریقہ یہ تھا کہ مسلم اکثریت رکھنے والے چھوٹے چھوٹے صوبے قائم کر دئے جائیں ۔ اسی خیال سے انھوں نے مولانا حسرت موہانی کی اس تجویز کی تائید کی جو ہم گذشتہ صفحات میں درج کر آئے ہیں ۔ اپنے اسی سلسلہء مضامین " راوی سے برہم پترا تک " میں وہ ایک جگہ لکھتے ہیں ۔

" مولانا حسرت موہانی نے حال ہی میں کہا ہے کہ مسلمان برطانوی حکومت کے تحت ہندوستان کے مقبوضاتی درجہ (Dominion Status) کو کبھی تسلیم نہیں کریں گے ۔ ان کے پیش نظر جو مقصد ہے وہ ایک قومی وفاقی حکومت کے تحت ہندو ریاستوں سے متحدہ ہندوستان میں علیحدہ مسلم ریاستوں کا قیام ہے ۔ وہ ایسی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے قیام کے بھی حق میں ہیں ، جو ایک دوسرے سے پیوست ہندو مسلم آبادیوں پر مشتمل ہوں ۔ اگر فرقہ

۳۵۔ " محمد علی جناح : اے پولیٹیکل اسٹڈی " از مطلوب الحسن سید ، ص ۲۲۷ ۔

وارانہ نیابت و نمائندگی اور جداگانہ رائے دہندگی ہی کو ضابطہ اور قاعدہ بننا ہے تو مولانا حسرت موہانی کے چھوٹے چھوٹے صوبوں سے متعلق اسکیم واحد قابل عمل تجویز نظر آتی ہے[۳۶]"

اور اسی پس منظر میں لاجپت رائے نے اپنی اسکیم پیش کی ، جو یہ تھی -

" میری تجویز تو یہ ہے کہ پنجاب کو دو صوبوں میں تقسیم کر دینا چاہئے مغربی پنجاب ، جو ایک بھاری مسلم اکثریت کے ساتھ ملسم حکومت کے تحت ایک صوبہ ہو ، اور مشرق پنجاب ہندو سکھ اکثریت کے ساتھ ایک غیر مسلم حکومت کے تحت صوبہ ہو۔ میں بنگال کے بارے میں کچھ عرض نہیں کرتا - یہ چیز میرے لئے ناقابل تصور ہے کہ بنگال کے مالدار بے حد ترقی پسند اور زندگی سے بھرپور ، باشعور ہندو اس معاہدہ کو کبھی بھی عملی جامہ پہنائیں گے ، جو سی - آر داس کی رضامندی سے طے پایا ہے(الف) ، اس کے معاملے میں بھی میری یہی رائے ہے(ب) -

میری اسکیم کے تحت مسلمانوں کو چار مسلم ریاستیں ملیں گی - (۱) پٹھان صوبہ یا شمال مغربی صوبہ سرحد ، (۲) مغربی پنجاب ، (۳) سندھ اور (۴) مشرق بنگال - اگر ہندوستان کے کسی اور

۳۶- محمد علی جناح ، اے پولیٹیکل اسٹڈی ، از مطلوب الحسن سید ، ص ۲۲۸ -

الف- یہاں لاجپت رائے نے اس معاہدہ کی طرف اشارہ کیا ہے ، جو بنگال کے مشہور روشن خیال کانگریسی لیڈر سی - آر داس کے فارمولے کی بناء پر ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین طے پایا تھا - اس فارمولے کے تحت مسلمانانِ بنگال کو ملازمتوں اور مجلس مقننہ و کلکتہ کارپوریشن میں مراعات دی گئی تھیں - مصنف

ب - مطلب یہ ہے کہ بنگال کو بھی پنجاب کی طرح مسلم بنگال اور ہندو بنگال میں تقسیم کر دیا جائے-

حصہ میں مسلمانوں کے ایک دوسرے سے پیوست علاقے ہیں اور اس حد تک وسیع کہ ایک صوبہ کی صورت اختیار کر سکیں تو انھیں بعینہ اسی طرح ترتیب دے دیا جائے لیکن یہ بالکل واضح طور پر سمجھ لینا ضروری ہے کہ یہ ایک متحدہ ہندوستان نہیں ہے ۔ اس کا صاف مطلب ہے ، ہندوستان کی تقسیم ، مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان میں[۴۷] "

یہ ہے لالہ لاجپت رائے کی وہ اسکیم جس کو تجویز پاکستان کہا جاتا ہے ۔ لالہ جی ، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ، جداگانہ انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی سے خائف تھے ۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر یہ طریقہ جاری رہا تو اس کا لازمی نتیجہ ایک نہ ایک دن ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین " کشت و خون " اور " خانہ جنگی " اور بالآخر ایک فرقہ کے دوسرے فرقہ پر غلبہ کی صورت میں برآمد ہو گا ۔ اسی لئے وہ اس طریقہ کو ختم کرنا چاہتے تھے، لیکن وہ محسوس کرتے تھے کہ اس طریقہ کو ختم کرنا آسان نہیں ہے ، کیونکہ جیسا کہ انھوں نے اسی سلسلہ میں ایک جگہ لکھا ہے ۔

" حکومت (برطانیہ) اس طریقہ کار کو اختیار کرنے کا قطعی ارادہ کر چکی ہے وہ اس طریقہ میں موجودہ حالات کو مستقلاً برقرار رکھنے کا بہترین تیقن دیکھ رہی ہے[۴۸] "

اسی لیے انھوں نے مولانا حسرت موہانی کی تجویز میں جداگانہ انتخاب و فرقہ وارانہ نمائندگی سے گریز کی ایک راہ دیکھی اور مولانا کے منصوبہ کی تائید کی اور اسی منصوبہ کی روشنی میں اپنی اسکیم پیش کی ، جس میں پنجاب و بنگال کو تقسیم کیا گیا تھا ۔ کیونکہ ایک کٹر مہاسبھائی اور پنجابی ہندو ہونے کی حیثیت سے وہ کسی صورت میں یہ نہیں چاہتے تھے کہ پورا پنجاب ایک مسلم صوبہ قرار دیا جائے اسی لیے مولانا کے منصوبہ کو اپنے

۴۷- محمد علی جناح : اے پولیٹیکل اسٹڈی ، از مطلوب الحسن سید ، ص ۲۳۰ ۔

۴۸- ایضاً ص ۲۲۸ ۔

حسب مرضی ڈھالنے کے لیے انہوں نے پنجاب و بنگال کی تقسیم کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے مسلم صوبوں کے قیام کی اسکیم پیش کی۔ واضح رہے کہ "یہ مسلم صوبوں" کی اسکیم تھی نہ کہ چار مسلم صوبوں پر مشتمل ایک آزاد مقتدر "مسلم مملکت" کی۔ اگرچہ لالہ جی نے اپنی اسکیم میں "وفاقِ ہند" یا "مرکز" کا کوئی ذکر نہیں کیا ہے تاہم اپنی اس اسکیم سے معاً پیشتر انہوں نے مولانا حسرت موہانی کے منصوبہ کی تائید کی ہے اور ہم دیکھ چکے ہیں کہ مولانا کے منصوبہ میں " ایک ہندوستانی وفاق " اور اس وفاق کے لیے "ہندوؤں اور مسلمانوں پر مشتمل اعلیٰ اختیاری قومی حکومت" کا تصور واضح طور پر موجود تھا۔ گویا لالہ جی ایک کل ہند مرکز کے ساتھ چار چھوٹے چھوٹے مسلم صوبے قائم کرنا چاہتے تھے۔

علاوہ بریں لالہ جی کی اس اسکیم کو ان کے اس خط کے ساتھ ملا کر پڑھیے، جو انہوں نے سی، آر، داس کے نام لکھا تھا، اور جس کو ہم اسی باب میں چند صفحات قبل درج کر آئے ہیں تو معمولی سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والا بھی اسی نتیجہ پر پہنچے گا کہ لالہ جی کی یہ اسکیم "چار مسلم صوبوں" کی اسکیم تھی نہ کہ "ایک آزاد مقتدر مسلم مملکت" کی۔ یہ بات ذہن نشین رہے کہ انہوں نے یہ خط بھی اسی زمانے میں لکھا تھا، جب کہ انہوں نے یہ اسکیم پیش کی تھی۔ اپنے اس خط میں انہوں نے دو نکات پر زور دیا تھا۔ ایک تو یہ کہ برطانوی حکومت کے خلاف، آزادی کی جنگ لڑنے کے لیے تو مسلمان، ہندوؤں کے ساتھ مل کر متحدہ محاذ بنا سکتے ہیں، لیکن آزادی کے بعد مغربی نظام جمہوریت کے تحت متحدہ ہندوستان کی حکومت چلانے کے لیے ہندوؤں سے اشتراک عمل نہیں کر سکتے، کیونکہ اسلامی شریعت، ان کے مطالعہ کے مطابق، اپنے پیروؤں کو ایسے اشتراک کی اجازت نہیں دے سکتی۔ دوسرا نکتہ انہوں نے یہ بیان کیا تھا کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد نہ صرف ہندوستان کے سات کروڑ مسلمان آزاد ہو جائیں گے، بلکہ ان کی پشت پر افغانستان، وسط ایشیا، عرب، عراق اور ترکی کے مسلح غول ہوں گے۔ لالہ جی نے اپنے اسی خط میں مسلمانوں کے اس وسیع تر اتحاد سے انتہائی ڈر اور خوف کا اظہار کیا تھا۔ اور بغیر کسی جھجک کے یہ لکھا تھا کہ "اس کا مقابلہ نہیں کیا جا سکتا" اگر یہ سمجھا جائے کہ

لالہ جی کی یہ اسکیم ، چار صوبوں کو ملا کر ایک "آزاد مقتدر مسلم مملکت" کے قیام ہی کی اسکیم تھی تو ظاہر ہے کہ یہ مسلم مملکت ، برصغیر کے شمال مغرب کی متصلہ مسلم مملکتوں (افغانستان ، ایران ، عرب ، عراق اور ترکی وغیرہ) کے ساتھ مل کر ، ہندوستان کی ہندو مملکت کے لیے لالہ جی کے تصور کے مطابق کیا ایک ایسا خطرہ نہ بن جاتی ، جس کا مقابلہ بقول ان کے نہیں کیا جا سکتا تھا ؟ کیا لالہ جی ایسا خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھے ؟ اور کیا وہ خود ہی ایسی اسکیم پیش کرتے ، جس سے ایسا خطرہ پیدا ہونے کا قومی امکان تھا ؟

بات در اصل یہ تھی کہ لالہ لاجپت رائے کے ذہن میں دو خطرات منڈلا رہے تھے ۔ ایک خطرہ جداگانہ انتخاب کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی کا تھا ، جس کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ نہ تو مسلمان اس سے دست بردار ہوں گے اور نہ برطانوی حکومت اس کو منسوخ کرے گی ۔ دوسرا خطرہ جو کابوس بن کر ان کے ذہن پر چھایا ہوا تھا ، یہ تھا کہ حصول آزادی کے بعد ، ہندوستان کے مسلمان بالخصوص شمال مغربی ہند کے مسلمان ، افغانستان ، وسط ایشیا ، عرب اور ترکی کے مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندوستان (بھارت ماتا) پر حملہ کر دیں گے ۔ وہ اپنے چشم تصور سے مستقبل میں ہندوستان کے ہندوؤں کی سلامتی اور آزادی کو ان دو خطروں میں گھرا ہوا پا رہے تھے ۔ برطانوی حکومت کے دوران ، جداگانہ انتخاب کے ساتھ فرقہ وارانہ نمائندگی کے مستقلاً جاری رہنے کا لازمی نتیجہ ان کی نظر میں یہ برآمد ہونے والا تھا کہ برطانوی تسلط کے خاتمہ کے ساتھ ہی ہندوؤں اور مسلمانوں میں "باہمی کشت و خون" ہو اور "ایک فرقہ دوسرے فرقے پر غلبہ پالے" اگر اس غلبہ کی نوعیت یہ ہو سکتی کہ ہندو ، مسلمانوں پر مسلط ہو جائیں تو لالہ جی کی دلی مراد پوری ہو جاتی لیکن انھیں تو ایک دوسرا ہی غم کھائے جا رہا تھا ۔ ان کے ذہن میں اس کشت و خون یا خانہ جنگی کی یہ تصویر ابھرتی تھی کہ ایک طرف تو ہندو ہوں گے اور دوسری طرف برصغیر ہند کے مسلمان ، جن کی پشت پر "افغانستان ، وسطِ ایشیا ، عرب اور ترکی کے مسلح غول ہوں گے"۔ وہ اس تصور سے لرز اٹھتے تھے ۔ اس طرح وہ ان دونوں خطروں کو ایک دوسرے سے پیوستہ

(Inter linked) دیکھ رہے تھے اور ان سے نجات حاصل کرنے کے لیے ہی انھوں نے اپنی یہ اسکیم پیش کی تھی کہ بنگال اور پنجاب کو تقسیم کرکے مسلمانوں کی قوت کو کمزور کیا جائے اور مغربی پنجاب ، مشرقی بنگال سندھ اور سرحد کے چھوٹے چھوٹے مسلم صوبے قائم کیے جائیں - پھر ان مسلم صوبوں کو کل ہند مرکز کی گرفت میں رکھا جائے - مسلم صوبوں کے قیام کے بعد ، مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب اور فرقہ وارانہ نمائندگی سے دستبردار کرانا آسان ہو جائے گا - اس طرح کشت و خون کرانے والا یہ خطرہ خود بخود ختم ہو جائے گا اور کل ہند مرکز میں ان بسلم صوبوں کو جکڑ لینے کے بعد شمال مغربی سرحدی خطرہ کا بھی سدباب ہو جائے گا - یہ تھے لالہ جی کے ذہنی تحفظات - چالاکی انھوں نے یہ کی کہ اپنے ذہنی تحفظات کو مولانا حسرت موہانی کی آڑ لے کر چھپایا تھا -

بات در اصل یہ تھی کہ لالہ جی کو مولانا کے منصوبہ میں جداگانہ انتخاب سے نجات ، متحدہ ہندوستان کے حصول اور اس متحدہ ہندوستان کی آزادی کو شمال مغربی سرحدی مسلم حملہ کے خطرہ سے محفوظ کرنے کی ایک صورت نظر آئی - اسی لیے انھوں نے مولانا کے اس منصوبہ کو اپنے موافق مرام کرکے پیش کیا تھا - لیکن وہ ہندو مسلم مسئلہ کے بارے میں ایک ایک قدم پھونک پھونک کر رکھنے کے عادی اور قائل تھے - کہنے کو تو مولانا کے منصوبہ کی اپنی ترمیم کے ساتھ ، انھوں نے تائید کر دی لیکن وہ پھر ایک مرتبہ چونک اٹھے کہ اس اقدام سے بھی بالآخر ہندوستان متحد نہیں رہ سکے گا بلکہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا - اپنے مضمون کے آخر میں ان کا یہ کہنا کہ

"اس کا صاف مطلب ہے ہندوستان کی تقسیم ، مسلم ہندوستان اور غیر مسلم ہندوستان میں"

در اصل تقسیم ہند کے اس خطرہ سے اپنے ہندو بھائیوں کو آگاہ کرنا تھا جو مولانا حسرت موہانی کے منصوبے میں سے بھی انھیں اپنا سر نکالتا دکھائی دے رہا تھا - اس نقطۂ نظر سے دیکھیے تو لالہ لاجپت رائے کی اسکیم میں پاکستان کی کوئی جھلک نظر نہیں آتی - در اصل یہ چار مسلم صوبوں

(۱) شمال مغربی سرحد (۲) مغربی پنجاب (۳) سندھ (۴) مشرقی بنگال) کے قیام کی اسکیم تھی ، جن کو وہ کل ہند مرکز کے کھونٹے سے مضبوطی کے ساتھ باندھے رکھنا چاہتے تھے ۔ لیکن اس میں بھی انھیں علیحدگی کا "سپنا" نظر آیا ۔ اس لیے اپنی اس تحریر کی روشنائی خشک ہونے سے قبل "وہ اپنی تجاویز سے منحرف ہو گئے[۴۹]"۔ امر واقعہ یہ ہے کہ لالہ جی نہ صرف پکے مہاسبھائی اور راسخ العقیدہ ہندو تھے بلکہ وہ مسلمانوں کے مزاج سے واقف اور بڑی حد تک اسلامی احکام سے آگاہ تھے ، جس کا اظہار انھوں نے خود سی ، آر ، داس کے نام موسومہ اپنے خط میں کیا ہے ۔ اور مولانا محمد علی جوہر نے تو یہ انکشاف بھی کیا تھا کہ "لالہ لاجپت رائے تو وہ بزرگ ہیں ، جن کے والد بزرگوار قرآن کریم کی تلاوت کیا کرتے تھے اور غالباً انھیں بھی اس کی تعلیم دی تھی[۵۰]"۔ الغرض مذہبی عقائد کے لحاظ سے وہ پکے ہندو اور سیاسی نظریات کے اعتبار سے تلک کے چیلے تھے ۔ پھر وہ مسلمان کے مزاج اور اسلامی شریعت سے آگاہ بھی تھے ۔ ان کے مذہبی اور سیاسی عقائد کا تقاضا تھا کہ ہندوستان متحد رہے اور اس پر ہندوؤں کی حکومت ہو ۔ یعنی "اکھنڈ بھارت" اور "رام راج" ان کا نصب العین تھا لیکن وہ مسلمان اور اسلام کو اس نصب العین کے لیے عظیم خطرہ سمجھتے تھے اور اس سے فرار کی راہ تلاش کرنا چاہتے تھے لیکن یہ راہ انھیں سجھائی نہیں دیتی تھی ۔ ایک ایسے شخص سے "پاکستان" کے تصور کو منصوب کرنا ، سیاسی بے بصری نہیں تو اور کیا ہے ؟

مولانا مرتضیٰ احمد خان کا نام بھی اسی سلسلہ میں لیا جاتا ہے ۔ یہ پنجاب کے ایک صحافی تھے ، انھوں نے

"روز نامہ انقلاب میں ، جو لاہور کا ایک مقبول اور کثیر الاشاعت روز نامہ تھا ، چار مسلسل مضامین کا ایک سلسلہ لکھ کر شائع

۴۹۔ محمد علی جناح : اے پولیٹیکل اسٹڈی ، از مطلوب الحسن سید ، ص ۲۳۰

۵۰۔ اخبار ہمدرد ، مورخہ ۳ نومبر ۱۹۲۶ع

کیا ، جس میں انھوں نے واضح اور کھلم کھلا الفاظ میں یہ لکھا تھا کہ ہندو مسلم مسئلہ کا حل ایک مسلم قومی وطن ، جو پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور شمال مغربی صوبہ سرحد پر مشتمل ہو ، کے قیام میں مضمر ہے —— یہ مضامین دسمبر ۱۹۲۸ء میں شائع ہوئے تھے —— ان کی اشاعت نے ایک اردو روز نامہ پرتاپ (الف) کو اپنی طرف متوجہ کیا اور اس نے بڑی شدت کے ساتھ اس خیال کی مخالفت کی ۔ اس مخالفت کے جواب میں مولانا مرتضیٰ احمد خاں نے ایک جواب الجواب جاری کیا اور اس بات کا دعویٰ کیا کہ حق خود ارادی کے بین الاقوامی طور پر تسلیم شدہ اصول کی بنیاد پر ایک مسلم قومی وطن کا قیام ، وہ واحد مقصد اعلیٰ ہے جس کے لیے مسلمان قربانیاں پیش کر سکتے ہیں[۵۱]"۔

یہاں بھی یہی دقت ہے کہ مرتضیٰ احمد خاں کے مضمون کا کوئی اقتباس نہیں دیا گیا ہے ، جس سے یہ اندازہ ہو سکے کہ انھوں نے "پنجاب" ، سندھ ، بلوچستان اور شمال مغربی صوبہ سرحد" پر مشتمل جس "مسلم وطن" کا مطالبہ کیا تھا ، اس کی حیثیت کیا تھی ۔ آیا وہ وفاق ہند کا کوئی جزو تھا یا ایک آزاد مقتدر مملکت تھی ۔ محض یہ کہہ دینا کہ "ہندو مسلم مسئلہ کا حل" انھوں نے "ایک مسلم قومی وطن" کر قرار دیا تھا ، کافی نہیں ہے ۔ ان چار صوبوں کو ملا کر ایک مسلم وطن تو قرار دیا جا سکتا ہے ، اور اس سے ہندو مسلم مسئلہ بڑی حد تک حل بھی ہو سکتا ہے ' لیکن اس مسلم وطن کو وفاق ہند کا جز بھی قرار دیا جا سکتا ہے ۔ ایسی صورت میں یہ "پاکستان" نہیں ہو سکتا ۔ پاکستان تو یہ اسی وقت قرار دیا جائے گا ، جب یہ مسلم وطن ، وفاق ہند کا کوئی جز نہیں بلکہ ایک آزاد مقتدر مملکت ہو ۔ مندرجہ بالا اقتباس سے مسلم وطن کی اس نوعیت پر

الف ۔ پرتاپ ، پنجاب کا ایک مہاسبھائی اخبار تھا

۵۱۔ ڈاکٹر عبدالسلام خورشید کا مضمون (Origin of Pakistan) ، پاکستان ٹائمز ، مورخہ ۲۳ مارچ ۱۹۶۳ء بحوالہ پاکستان منزل بمنزل ، از پیر زادہ شریف الدین ، ص ۱۵۱

کوئی روشنی نہیں پڑتی -

بعض اشخاص کا یہ دعویٰ ہے کہ چوہدری رحمت علی تصور پاکستان بلکہ منصوبہ پاکستان کے پہلے پیش کنندہ ہیں - آیئے اس ادعا کا جائزہ لیں -

چوہدری رحمت علی تحصیل و ضلع ہوشیار پور (پنجاب) میں پیدا ہوئے تھے - اسلامیہ کالج لاہور میں انھوں نے تعلیم پائی - ۱۹۱۹ء میں بی - اے کی ڈگری لی - اس کے بعد کچھ عرصہ ملازمت کی - ۱۹۲۷ء میں وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے انگلستان گئے - کیمبرج اور ڈبلن کی جامعات سے انھوں نے ایم اے اور قانون کی ڈگریاں لیں - پھر وہ کیمبرج ہی میں رہ پڑے - بتاریخ ۲۸ جنوری ۱۹۳۳ء ، لندن میں انھوں نے چار ورق کا ایک پمفلٹ بزبان انگریزی شائع کیا - جس کا عنوان تھا "اب یا کبھی نہیں" (Now or Never) - اس پمفلٹ پر چودھری رحمت علی کے علاوہ محمد اسلم ، شیخ محمد صدیق اور عنایت اللہ خاں کے دستخط تھے - اس پمفلٹ میں انھوں نے برصغیر ہند میں مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق کا مطالبہ کیا تھا- یہ زمانہ لندن میں تیسری گول میز کانفرنس کے انعقاد کا زمانہ تھا - ۲۴ دسمبر ۱۹۳۲ء کو تیسری گول میز کانفرنس ختم ہو چکی تھی - تاہم کانفرنس کے بعض مندوبین ابھی لندن میں موجود تھے چوہدری صاحب نے اپنا یہ پمفلٹ ان مندوبین میں تقسیم کیا اور برطانوی عوام میں بھی اس کا کافی پروپگنڈا کیا -

اس پمفلٹ کی بنیاد پر ہی چوہدری رحمت علی کو تجویز پاکستان کا اولین مجوز قرار دیا جاتا ہے - اس میں کوئی شک نہیں کہ چوہدری صاحب نے اس پمفلٹ میں مطالبہ کیا تھا کہ مسلم اکثریت کے پانچ علاقوں ، پنجاب ، افغانیہ (یعنی صوبہ سرحد) کشمیر ، سندھ اور بلوچستان پر مشتمل ایک آزاد خود مختار مسلم مملکت پاکستان قائم کی جائے[۵۲]- لیکن سوال یہ ہے کہ یہ تجویز انھوں نے کب پیش کی ؟ جنوری ۱۹۳۳ء میں ! ——

۵۲- پمفلٹ (Now or Never) ، از چوہدری رحمت علی ، مطبوعہ انگلینڈ ۱۶ مونٹینگ روڈ ، کیمبرج ، اشاعت ثانی ، ص ۵

اور علامہ اقبال نے ان ہی صوبوں پر مشتمل متحدہ مسلم مملکت کی تجویز چوہدری رحمت علی کے پمفلٹ کی تاریخ اشاعت سے تین سال قبل پیش کی تھی ایسی صورت میں اس امر کا کیسے ادعا کیا جا سکتا ہے کہ چوہدری رحمت علی تصور پاکستان کے پہلے بانی تھے ؟

اصلی بات یہ ہے کہ خود چوہدری صاحب نے اس اولیت کا سہرا اپنے سر باندھنے کی کوشش کی ہے ۔ انھوں نے اسی پمفلٹ میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ ان کی تجویز علامہ اقبال کی تجویز سے مختلف ہے ۔ وہ کہتے ہیں کہ ''اقبال کی تجویز یہ تھی کہ ہمارے پانچ مسلم اکثریتی شمالی صوبوں میں سے چار صوبوں کو ملا کر ایک اکائی بنائی جائے اور اسے کل ہند وفاق کا جز رہنے دیا جائے[۵۳]'' اور ان کی اپنی تجویز یہ ہے کہ مسلم صوبوں کا ایک علیحدہ وفاق ہو ۔

ابھی چند صفحات قبل ہم نے اس پر کافی تفصیل بحث کی ہے کہ اقبال کی مجوزہ ''مسلم مملکت'' وفاقِ ہند کا کوئی جزو تھی یا نہیں اور مدلل طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ علامہ کل ہند وفاق کے شدید مخالف تھے ، انھوں نے مسلم صوبوں کے ایک ایسے جداگانہ آزاد وفاق کی تجویز پیش کی تھی جس کا کوئی دستوری تعلق کل ہند وفاق سے نہ تھا ۔ ان حقائق کے پیش نظر چوہدری رحمت علی اور ان کے حامیوں کے دعویٰ کو بے دلیل ہی کہا جائے گا ۔

واقعہ یہ ہے کہ چودھری صاحب کی یہ اسکیم علامہ مرحوم ہی کے تصور اسلامی ہند پر مبنی تھی ۔ جزئیات و تفصیلات میں البتہ کچھ فرق تھا ۔ ہمارے اس دعوے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ چوہدری رحمت علی علامہ اقبال کے فیض یافتہ تھے ۔ فقیر سید وحید الدین صاحب لکھتے ہیں ۔

"۱۹۱۶ء کے لگ بھگ کی بات ہے جب اسلامیہ کالج لاہور ۔

۵۳۔ پمفلٹ (Now or Never) ، از چوہدری رحمت علی ، مطبوعہ کیمبرج اشاعت ثانی ۱۹۳۴ ، ص ۶

سینیر طلبا جن میں سیالکوٹ کے چوہدری محمد حسین بھاڑنگی اور چوہدری رحمت علی قابل ذکر ہیں ، ڈاکٹر صاحب (علامہ اقبال) کی مجلسوں میں شریک ہوا کرتے تھے ۔ یہ طلبا شعر و شاعری سے گہرے شغف کے علاوہ قومی اور مذہبی تحریکوں سے پرجوش دلچسپی رکھتے تھے ۔ ڈاکٹر صاحب ان نوجوان جوشیلے طلبا کے ساتھ بڑی شفقت سے پیش آتے اور اپنے علمی فیوض سے استفادہ کا زیادہ سے زیادہ موقع دیتے ۔ یہ وہ زمانہ ہے جب ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور شہرت کا آفتاب پورے عروج پر تھا . . . .

. . . .

چوہدری رحمت علی نے آگے چل کر قومی تحریکوں میں ، جس طرح حصہ لیا ، اس میں ڈاکٹر صاحب کا فیض صحبت شامل تھا[۵۴]۔

کہا جا سکتا ہے کہ چودھری رحمت علی کا فیض یافتہ اقبال ہونا اپنی جگہ درست و صحیح ، تاہم اس سے یہ کہاں ثابت ہوتا ہے کہ وہ اقبال کے اس تصور " مسلم مملکت " سے متاثر تھے؟ یہ تو مسلمہ بات ہے کہ رحمت علی نے اقبال کے افکار و خیالات اور ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا ۔ پھر یہ بھی واضح بات ہے کہ جب علامہ اقبال نے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں مسلم مملکت کا تصور پیش کیا ، تو وہ کیمبرج میں پڑھ رہے تھے ۔ علامہ اقبال کی اس تجویز کا اسی زمانے میں بڑا چرچا ہوا ۔ اپنوں اور پرایوں نے اس پر توجہ کی ۔ تعلیم یافتہ حلقوں میں عرصہ تک یہ تجویز موضوع بحث بنی رہی ۔ رحمت علی تو حضرت علامہ کے معتقد اور ان کی صحبتوں کا فیض اٹھائے ہوئے تھے ، یقیناً انھوں نے کیمبرج ہی میں حضرت علامہ کے اس خطبۂ صدارت کو پڑھا ہو گا اور چونکہ وہ فطرتاً " جوشیلے نوجوان " تھے ، اس لئے اقبال کی اس تجویز ، مسلم مملکت سے متاثر بھی ہوئے ہوں گے ۔ یہ محض قیاس آرائی نہیں ہے بلکہ ایک امر واقعہ ہے ۔ سنہ ۱۹۳۰ء میں پاکستان کی تجویز پیش کرنے کے بعد علامہ اقبال ستمبر

۵۴- روزگار فقیر ، جلد اول از فقیر سید وحید الدین ، ص ۱۲۵

سنہ ۱۹۳۱ء میں دوسری گول میز کانفرنس میں شرکت کی غرض سے لن
گئے اور یہاں ان کا قیام تقریباً دو ماہ رہا ۔ اسی زمانہ میں وہ کیمبرج ب
گئے اور یہاں ایک جلسہ سے خطاب بھی کیا ۔ کیمبرج میں جن لوگوں
ان کا استقبال کیا ، ان میں ہم چودھری رحمت علی کو بھی دیک
ہیں[۵۵] ۔ اس سے اتنا تو بہرحال ثابت ہوتا ہے کہ دوسری گول میز کانفر
(۲۷ ستمبر تا ۲۰ نومبر سنہ ۱۹۳۱ء) کے دوران قیام ، چودھری رحم
علی علامہ اقبال سے ملتے رہے ۔ اب اس سلسلہ میں ایک نہایت معتبر روا
سن لیجئے ۔

جناب عبدالوحید خاں صاحب ، کل ہند مسلم لیگ کی شوریٰ (کونس
کے رکن ، تحریک پاکستان کے پُر جوش علمبردار ، قائد اعظم کے پرس
اور پیرو رہے ہیں ۔ وہ پاکستان کی پہلی دستور ساز اسمبلی کے رکن ا
مرکزی وزیر مواصلات بھی رہ چکے ہیں اور کئی بلند پایہ کتابوں
مصنف بھی ہیں ۔ انھوں نے علامہ اقبال سے سنہ ۱۹۳۵ء میں بمقام بھو
ملاقات کی تھی ۔ اپنی اس ملاقات کا حال بیان کرتے ہوئے وہ لکھتے ہیں

”ہندوستان کے جدید تنظیمی رجحانات سے علامہ صاحب ہ
مطمئن نظر آتے تھے ۔ مسلمان مرکزی اسمبلی کے انتخابات مس
یونٹی بورڈ کے ماتحت لڑ چکے تھے ۔ مسلم لیگ کے عروق مر
میں خون دوڑانے کا خیال مسلم لیڈروں میں پیدا ہو چلا تھا
اس لئے علامہ اقبال کو یقین تھا کہ مسلم ہندوستان اپنی خاکہ
سے ایک جہان نو کی تعمیر میں کامیاب ہو گا ۔ یہ جہان نو ا
وقت پاکستان کے نام سے موسوم و مشہور ہو چکا تھا ۔ مس
مفکرین نے علامہ اقبال کی پیش کردہ اسکیم پاکستان پر سنجید
سے غور کرنا شروع کر دیا تھا ۔ میرے استفسار پر آپ
فرمایا ۔ پاکستان کے قیام سے میرا مقصد صرف مسلمانوں کا قو
نسلی یا تمدنی تحفظ ہی مقصود نہیں ہے بلکہ میں چاہتا ہوں

۵۵- سفر نامہ اقبال ، از محمد حمزہ فاروقی ، ناشر مکتبہ معیار کراچی ،
۱۹۷۳ء ص ۵۰ ۔

ہندوستان کے ایک حصہ میں مسلمانوں کو آزاد اور خود مختار حکومت قائم کرنے کا موقع مل جائے ، جس میں وہ اسلام کے قوانین و آئین کو عملی جامہ پہنا سکیں ۔ اس پر میں نے آپ سے پاکستان کی وجہ تسمیہ کے متعلق دریافت کیا ۔ اس زمانے میں اس کا انتساب چودھری رحمت علی صاحب سے کیا جا رہا تھا اور چودھری صاحب موصوف لندن میں اس اسکیم کو اسی نام سے متعارف کرا رہے تھے ۔ اس پر علامہ اقبال نے مجھے جو جواب دیا اس سے اس نظریہ کی تردید ہوتی تھی ۔ اس لئے میں نے مزید وضاحت کی درخواست کی تو آپ نے فرمایا ، جب گول میز کانفرنس کی شرکت کے لئے سنہ ۱۹۳۱ء(الف) میں لندن میں مقیم تھا ۔ ایک مرتبہ چودھری رحمت علی صاحب میرے پاس آئے اور کہا جو اسکیم آپ نے مسلم لیگ کے الہ آباد سیشن کے خطبۂ صدارت میں پیش کی ہے ، اس کے مطابق اگر کوئی حکومت وجود میں آئی تو اس کا نام کیا ہو گا ؟ اس پر میں نے کہا ۔ شمال مغربی ہندوستان کے ہر صوبے کا پہلا لفظ لے لو اور بلوچستان کا " تان " لے لو تو اتفاق سے ایک بامعنی اور عمدہ لفظ بن جاتا ہے یعنی پاکستان ، یہی اس حکومت کا نام ہوگا ۔ مجھے خوب یاد ہے کہ آپ نے ہر صوبہ کا پہلا لفظ اس طرح شمار کیا ۔ پنجاب کا " پ " آزاد قبائل کا " ا " کشمیر کا " ک " سندھ کا " س " اور بلوچستان کا " تان " پھر آپ نے فرمایا کہ یہ نام ہو ، خواہ کوئی دوسرا ، مقصد یہ ہے کہ اپنی اکثریت کے علاقوں میں ان کو خود

الف۔ کتاب " تاثرات و تصورات " میں سنہ ۱۹۳۰ء درج ہے لیکن جناب عبدالوحید خان صاحب نے مصنف کے نام اپنے ایک نجی خط میں اس سنہ کی تصحیح کی ۔ صحیح سنہ ۱۹۳۱ء ہے ۔

حکومت کرنے کا حق ہونا چاہئے[۵٦] "

یہ ایک ذمہ دار ثقہ راوی کی نہایت معتبر روایت ہے - اس روایت سے تین باتیں ثابت ہوتی ہیں - ایک تو یہ کہ چوہدری رحمت علی علامہ اقبال سے دوران قیام لندن سنہ ۱۹۳۱ع میں ملتے رہے - یہ زمانہ خطبۂ صدارت الہ آباد (جس میں علامہ نے پاکستان کا تصور پہلی مرتبہ پیش کیا تھا) سے صرف نو ، دس ماہ بعد کا ہے - دوسری یہ کہ انھوں نے ان ملاقاتوں میں حضرتِ علامہ سے ان کی تجویز پاکستان پر گفتگو کی - تیسری یہ کہ لفظ پاکستان بھی ڈاکٹر اقبال ہی نے وضع کیا تھا !

الغرض علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور ، دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں پیش کیا جب کہ جودھری رحمت علی نے اپنی اسکیم " پاکستان " کے نام سے جنوری سنہ ۱۹۳۳ع میں پیش کی - پھر یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ چودھری صاحب علامہ اقبال کے عقیدت مند اور ان کے فیض یافتہ تھے - خطبۂ صدارت الہ آباد میں پاکستان کی تجویز پیش کرنے کے بعد ، جب اقبال ستمبر سنہ ۱۹۳۱ع لندن گئے تو وہ وہاں ان سے ملتے رہے - وہ اس تجویز سے اتنے متاثر تھے کہ اس کے متعلق نہ صرف ان سے گفتگو کی بلکہ اس کا نام بھی پوچھا - پھر اسی نام سے انھوں نے تیسری گول میز کانفرنس (جنوری سنہ ۱۹۳۳ع) کے موقع پر اپنی اسکیم کا پراپیگنڈا کیا - ان تمام شواہد سے یہ بات قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے کہ تصور پاکستان کے پہلے بانی یا خالق چودھری رحمت علی نہیں ہیں بلکہ یہ تصور انھوں نے علامہ اقبال ہی سے لیا تھا -

عام طور پر لفظ " پاکستان " کی ایجاد کا سہرا بھی چودھری رحمت علی کے سر باندھا جاتا ہے لیکن عبدالوحید خاں صاحب کی مندرجہ بالا روایت سے اس کی تردید ہو جاتی ہے - راقم الحروف نے جناب عبدالوحید

۵٦- " تاثرات و تصورات " از عبدالوحید خاں ، ناشر مکتبہ ایوان ادب لاہور ، طبع اول ، دسمبر سنہ ۱۹٦۰ع ص ٦۱ و ٦۲ اور روز نامہ نوائے وقت لاہور ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹٤۹ع مضمون " لالہ لبِ آبجو "-

خان صاحب سے دریافت کیا کہ ، آپ کی روایت معتبر سہی ، لیکن یہ ایک عام شہرت یافتہ روایت کے خلاف ہے ۔ اگر آپ کے پاس اپنی بیان کردہ روایت کو مزید محکم بنانے کے لئے کوئی دلیل ہو تو بیان فرمائی جائے ۔ اس پر جناب خان صاحب نے از راہ کرم بذریعہ خط مورخہ ۱۱ نومبر سنہ ۱۹۷۳ع جو جواب ارسال فرمایا ، اس کے متعلقہ حصے درج ذیل ہیں ۔

" میرے پاس دو دلیلیں تھیں ، جو میرے اپنے بیان اور علامہ اقبال کی شہادت کے علاوہ تھیں ۔

(۱) چودھری رحمت علی کا کوئی بیان یا رسالہ ، علامہ سے ملاقات سے قبل نظر نہیں آیا ۔ نہ انہوں نے کہیں اس کا دعویٰ کیا کہ علامہ صاحب سے انہوں نے ایسا کوئی ذکر کیا ۔ اگر چودھری صاحب موجد ہوتے ، تو یہ ناممکن تھا کہ اس کا ذکر علامہ صاحب سے نہ کرتے اور ان کے تاثرات قلمبند نہ کرتے ۔ البتہ چودھری رحمت علی نے مجھ سے یہ شکایت لاہور میں سنہ ۱۹۳۷-۳۸ع میں کی کہ علامہ صاحب نے اپنی کوئی مفصل اسکیم گول میز کانفرنس میں نہیں رکھی ۔

(۲) چودھری رحمت علی کا جو رسالہ "Now or Never" میری نظر سے گزرا ، وہ سنہ ۱۹۳۳ع کا شائع شدہ تھا ، اور پنجاب کی لائبریری میں تھا ۔ البتہ گذشتہ سال مجھے اس کی ضرورت پڑی تو غائب تھا یعنی کسی صاحب نے نکلوایا ، پھر واپس نہیں کیا ۔ جو رسالہ میں نے پڑھا ، اس میں پاکستان اردو کے نہیں بلکہ انگلش کے پہلے حرف سے ایک ملک بنتا تھا ، اس میں "T" سے "Turkistan" "I" سے "Iran" تھا اور اسی طرح کے اور لفظ تھے ۔ یعنی وہ تخیل ہی مختلف تھا ۔ چودھری رحمت علی نے اپنے پاکستان میں کئی مسلم ممالک بھی شامل کر رکھے تھے ۔ ممکن ہے پہلے ایڈیشن میں انہوں نے صرف ہندوستان کے صوبوں کا نام

رکھا اور مزید توسیع اگلے ایڈیشن میں کر لی ہو(الف)۔
چودھری خلیق الزماں اور غلام رسول مہر میرے لکھنے ہی پر
اس کی تحقیق فرما چکے ہیں کہ علامہ سے ملاقات سے قبل
چودھری صاحب (رحمت علی) نے پاکستان کا نام نہیں لیا تھا اور
وہ اس نکتہ سے بے حد متاثر تھے ۔ پھر ان دونوں نے لائبریری
سے وہ رسالہ منگوایا تو ان کا یقین اور بھی بڑھ گیا "

جناب عبدالوحید خاں صاحب کی یہ دونوں دلیلیں کافی وزنی ہیں ، ان کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ علامہ اقبال کی ملاقات سے قبل چودھری رحمت علی نے پاکستان کی اسکیم یا پاکستان کی اصطلاح کے بارے میں کوئی بات ہی نہیں کی ۔ پھر اپنے پمفلٹ (Now or Never) میں انھوں نے خود بھی یہ دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ اس لفظ کے موجد ہیں ۔ خان صاحب کی دوسری دلیل ، پہلی دلیل سے قوی تر ہے کہ ان کا لفظِ پاکستان ، انگریزی زبان کا لفظ (Pakistan) تھا اور یہ بھی کہ انھوں نے اس میں کئی مسلم ممالک شامل کر رکھے تھے ۔ ہم یہاں ان کی انگریزی کتاب " پاکستان " سے ایک اقتباس درج کرتے ہیں جس سے معلوم ہو گا کہ ان کے لفظ " پاکستان " کی نوعیت کیا تھی ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

(الف) چودھری رحمت علی کے پمفلٹ "Now or Never" کے دوسرے ایڈیشن مطبوعہ سنہ ۱۹۳۴ء کا اصلی نسخہ راقم الحروف نے " قومی عجائب گھر کراچی " میں دیکھا ہے ۔ اس کتابچہ کے صفحہ ۴ و ۵ پر چودھری صاحب نے لفظ پاکستان کو پنجاب ، شمال مغربی سرحدی صوبہ ، کشمیر ، سندھ اور بلوچستان کے لئے استعمال کیا ہے اور اس امر کی بھی انھوں نے وضاحت کی ہے کہ پاکستان سے مراد " ان صوبوں کا ایک علیحدہ مسلم وفاق ہے " غالباً عبدالوحید خاں صاحب کو کچھ تسامح ہو گیا ۔ بات دراصل یہ ہے کہ چودھری رحمت علی نے کتابچہ "Now or Never" میں نہیں بلکہ اپنی ایک دوسری کتاب " پاکستان " میں اس لفظ کی جو تشریح کی ہے ، اس میں انھوں نے دیگر مسلم ممالک مثلاً ایران و ترکستان وغیرہ کو پاکستان میں شامل کیا ہے ۔

"Pakistan is both a Persian and Urdu Word. It is Composed of letters taken from our home Lands —— "Indian" and "Asian". That is Punjab, Afghania (North West Frontier Province) Kashmir, Iran, Sind, (including Kutch and Kathiawar) Thukaristan, Afghanistan and Baluchistan. It means the land of the Paks —— The Spritually Pure and Clean"

ترجمہ :

" پاکستان ، اردو اور فارسی دونوں زبانوں کا لفظ ہے ۔ یہ ان حروف سے مل کر بنا ہے جو ہمارے ایشیائی و ہندوستانی قومی وطن ہیں یعنی پنجاب ، افغانیہ (شمال مغربی صوبہ سرحد) کشمیر ، ایران ، سندھ (بشمول کچھ اور کاٹھیا واڑ) طوخارستان ، افغانستان اور بلوچستان ۔ اس کے معنی ہیں پاکوں —— روحانی طور پر پاک و صاف لوگوں —— کی سرزمین>۵۷ "

اس اقتباس سے عبدالوحید خان صاحب کے بیان کی تصدیق ہوتی ہے کہ چودھری صاحب کا لفظ پاکستان ، اردو کے حروف سے مل کر نہیں بنا تھا ، بلکہ انگریزی حروف کو جوڑ کر بنایا گیا تھا یعنی ۔

P	کا	Punjab
A	کا	Afghania
K	کا	Kashmir
I	کا	Iran
S	کا	Sind
T	کا	Tukharistan
A	کا	Afghanistan
N	کا آخری حرف	Baluchistan

۵۷- "Pakistan" از چودھری رحمت علی ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۷ء ص ۲۲۴ و ۲۲۵ ۔

اس طرح انگریزی کے حروف کو جوڑ کر ایک لفظ بنانے میں چودھری رحمت علی کو ایک طرح کی ذہنی زحمت اٹھانی پڑی ۔ انھوں نے افغانیہ (Afghania) نام کا ایک ملک تراشا ۔ پھر طوخارستان (Tukharistan) کو بھی ایک ملک بتایا ۔ پتہ نہیں یہ ترکستان کی بگڑی ہوئی صورت ہے یا کچھ اور ۔ نہ جانے کیوں انھوں نے ترکی یا ترکستان کا نام نہیں لیا اور اس کے بجائے طوخارستان (Tukharistan) کا لفظ رکھنا پسند کیا ۔ پھر افغانستان کو بھی اس میں شامل کیا اور ان تمام ممالک کے ابتدائی حروف کو لے کر بلوچستان (Baluchistan) کے آخری حرف "N" سے جوڑ دیا ! اس کے برعکس علامہ اقبال نے عبدالوحید خاں صاحب کے سامنے جس طریقہ سے اس لفظ کو ڈھالا ، وہ بہت ہی سبک ، سہل اور آسان تھا ۔ ان کے ذہن میں یہ اردو کا لفظ تھا اور چار علاقوں —— پنجاب ، آزاد قبائلی علاقہ ، کشمیر ، سندھ —— کے سر حروف اور بلوچستان کے " تان " سے مل کر بنتا تھا ۔ یہ پانچوں علاقے برصغیر میں واقع تھے اور یہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی ۔ پھر ان مسلم اکثریت کے علاقوں کو ملا کر ایک آزاد مسلم مملکت تشکیل دینی تھی ، نہ کہ افغانستان ، ایران ، ترکستان (جو پہلے ہی آزاد مسلم ممالک تھے) اور برصغیر کے مذکورہ بالا مسلم اکثریتی علاقوں کو ملا کر کوئی مملکت بنانی تھی ! معلوم ایسا ہوتا ہے کہ چودھری رحمت علی نے لفظ پاکستان اور اس کی لفظی ترکیب تو علامہ سے معلوم کر لی ، پھر اس میں اپنے تخیل کی آمیزش کی ۔ اس آمیزش کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ وہ انگریزوں کو لفظ " پاکستان " اور اس کے مفہوم سے روشناس کرانا چاہتے تھے ۔ وہ انگلستان میں مقیم تھے اور وہیں پاکستان کا پراپیگنڈا کر رہے تھے ۔ ان کے مخاطب انگریز ہی تھے ، اسی لئے انھوں نے اردو کے حروف پ ، ا ، ک ، س اور تان کو جوڑنے کے بجائے P ، A ، K ، I ، S ، T ، A اور N ، کو ملانے کی کوشش کی اور اس کوشش میں ان کو افغانیہ ، طورخستان وغیرہ جیسے الفاظ تراشنے پڑے ۔ اور افغانستان ، ایران جیسے آزاد مسلم ممالک کے سر حروف کو بطور قرض لینا پڑا !

مندرجہ بالا مباحث سے یہ واضح ہوتا ہے کہ تصور پاکستان کے پہلے

بانی یا خالق چودھری رحمت علی نہیں ، بلکہ علامہ اقبال ہیں اور پاکستان کا لفظ بھی ان کا ایجاد کردہ نہیں بلکہ حضرت علامہ کا وضع کردہ ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس تصور اور اس اصطلاح کو چودھری رحمت علی نے ڈاکٹر اقبال سے لیا اور اپنے طور پر اس کا پراپیگنڈا کیا ۔ اس حقیقت کے باوجود یہ پوچھا جا سکتا ہے کہ

(۱) یہ غلط فہمی(الف) کیسے پیدا ہوئی کہ تجویز پاکستان کے پہلے محرک ڈاکٹر اقبال نہیں بلکہ چودھری رحمت علی ہیں ۔

(۲) یہ بات کیسے عام ہوئی کہ پاکستان کا نام علامہ اقبال کا تجویز کردہ نہیں بلکہ چودھری رحمت علی کا ایجاد کردہ ہے !

ان دونوں سوالوں کے جوابات تھوڑے سے غور و فکر کے بعد سمجھ میں آ جاتے ہیں ۔

الف۔ تعجب ہے کہ یورپی محققین بھی اس غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ پاکستان کی اصطلاح چودھری رحمت علی کی وضع کردہ ہے ۔

" آر ۔ ڈبلیو ، برج فیلڈ ، شریک مدیر ، نوٹس اینڈ کیوریز نے مس ری پروسر (جنھوں نے کولینڈال نیوز پیپر ریفرنس لائبریری ، برٹش میوزیم اور لندن کے دوسرے کتب خانوں میں متعلقہ مواد سے رجوع کیا تھا) جوڈلین لائبریری کی کارپرداز مس جی۔ایم برگس سر اولف کیرو ، ڈاکٹر پرسیویل اور ایمانیول کالج کے استاد مسٹر ای ، ویل ، یوان اور دیگر بہت سے افراد کی مدد و اعانت سے ان ماخذ اور اس مطبوعہ مواد کا اچھی طرح جائزہ لیا جو اس اصطلاح (پاکستان) کے ماخذ اصلی پر روشنی ڈال سکتا تھا ۔ تحقیق و تفتیش کا نتیجہ یہ نکلا کہ یہ اصطلاع چودھری رحمت علی کی وضع کردہ ہے "

نوٹس اینڈ کیوریز (Notes & Queries) جلد ۷ شمارہ ، ۴ مطبوعہ اپریل سنہ ۱۹۶۰ع ۔

یہ ہے بلند پایہ محققین کی تحقیق انیق ۔ نام بڑے درشن چھوٹے ! !

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ اس غلط فہمی کا سب سے بڑا سبب علامہ اقبال کا حزم و احتیاط ہے ۔ علامہ نے سب سے پہلے دسمبر سنہ ۱۹۳۰ء میں یہ تصور پیش کیا ۔ اس تصور کے اس وقت پیش کرنے کا محرک ، وہ نفسیاتی کیفیت تھی ، جو ہندوؤں کی بے وفائی اور انگریزوں کی مسلم کش پالیسی کے باعث ملتِ اسلامیہ برصغیر ہند میں پائی جاتی تھی ۔ وہ اس وقت ایک مطمح نظر کی تلاش میں تھے ۔ علامہ نے یہ مطمح نظر مہیا کر دیا —— لیکن اس کے بعد انھوں نے بڑے حزم و احتیاط سے کام لیا ، اس تجویز کے پیش کرنے کے بعد انھیں دوسری اور تیسری گول میز کانفرنس میں حصہ لینے کا موقعہ ملا ، لیکن انھوں نے ان کانفرنسوں میں اس تجویز کو باضابطہ طریقہ سے پیش نہیں کیا ۔ کانفرنسوں سے لوٹنے کے بعد بھی ہندوستان میں انھوں نے اپنی تجویز کا پراپیگنڈا نہیں کیا ۔ اسی وجہ سے بعض حلقوں میں یہ غلط فہمی پیدا ہو گئی کہ حضرت علامہ نے مسلم مملکت کی جو تجویز اپنے خطبۂ صدارت میں پیش کی تھی وہ وفاقِ ہند کا ایک جزو تھی یا یہ کہ انھوں نے اپنی اس تجویز سے رجوع کر لیا تھا ۔ واقعہ یہ ہے کہ اپنی اس تجویز کو گول میز کانفرنس میں پیش نہ کرنے یا اس کے بعد اس کا پراپیگنڈا نہ کرنے کی اصل وجہ یہ نہ تھی کہ ان کی مجوزہ مسلم مملکت وفاقِ ہند کا ایک جزو تھی یا یہ کہ وہ اس سے دستبردار ہو چکے تھے ، بلکہ اصل وجہ ان کا محتاط طرز عمل تھا اور یہ طرز عمل مقتضائے وقت کے مطابق تھا ۔ ہندوؤں کا " افغانی ہوّا " انگریزوں کا " پان اسلامزم " اور مسلمانوں کے چودہ نکات ، اس محتاط طرز عمل کے حقیقی اسباب تھے ۔ ہندوؤں نے شمال مغربی سرحد کی طرف سے خطرہ کا شور مچا رکھا تھا ۔ انگریز پان اسلامزم کے نام سے بدکتے اور بھڑکتے تھے ۔ پھر مسلمانوں کے صرف دو بڑے صوبے تھے جہاں مقننہ میں انھیں برائے نام اکثریت دی گئی تھی ۔ ابھی سندھ کی بمبئی سے علیحدگی ہونی تھی ۔ صوبہ سرحد و بلوچستان میں سیاسی اصلاحات کا نفاذ ہونا تھا ، مکمل صوبائی خود مختاری ان تمام صوبوں کو ملنی تھی ۔ ان مراحل کے طے پا جانے کے بعد ہی برصغیر میں مسلم مملکت کے قیام کی تحریک کو آگے بڑھایا جا سکتا تھا ۔ نہیں ، بلکہ ایک اور مرحلہ —— بڑا ضروری اور کٹھن مرحلہ باقی

تھا ۔ اور وہ تھا پوری ملت کو جو اس وقت متفرق و منتشر تھی ، ایک ہی سیاسی پلیٹ فارم پر لانا ، ایک ہی جھنڈے تلے جمع کرنا ۔ اس کے بغیر مجوزہ مسلم مملکت کے سلسلہ میں کسی قسم کا اقدام ، کسی نوع کی تحریک اور کسی انداز کا پراپیگنڈا مہمل و بے سود ہی نہیں ، مضرت رساں بھی تھا ۔ اس مسئلہ پر ہم نے گذشتہ صفحات میں تفصیل سے روشنی ڈالی ہے ۔ ان حالات اور ایسے ماحول میں علامہ کا محتاط طرز عمل نہ صرف مناسب و درست تھا بلکہ " مدبرانہ " تھا ۔ برصغیر ہند کی سیاست میں وہ ایک ذمہ دارانہ مقام کے حامل تھے ۔ وہ کل ہند مسلم لیگ اور کل ہند مسلم کانفرنس کے صدر رہ چکے تھے ۔ گول میز کانفرنس کے ایک نہیں دو مرتبہ مندوب منتخب کئے جا چکے تھے۔ برطانیہ کے اعلیٰ سیاسی حلقوں میں ان کی علمی و سیاسی حیثیت کا وزن محسوس کیا جاتا تھا ۔ اگر موقع و محل کی اہمیت و نزاکت کا خیال کئے بغیر ایک لفظ بھی ان کی زبان سے نکل جاتا تو اس کے مضر اثرات مرتب ہوتے ۔ یہی وجہ ہے کہ خطبۂ صدارت الہ آباد میں انہوں نے مسلم مملکت کی اس تجویز کو نہایت محتاط الفاظ میں بیان کیا ۔ دوسری گول میز کانفرنس میں انہوں نے اس تجویز کے متعلق ایک لفظ نہیں کہا ۔ تیسری گول میز کانفرنس میں اس تجویز سے متعلق اپنے مفہوم کو انہوں نے دوسرے انداز میں پیش کیا ، پھر جب سنہ ۱۹۳۵ء کے دستور کے تحت سندھ کی بمبئی سے علیحدگی عمل میں آ چکی سرحد میں اصلاحات نافذ کر دی گئیں ، صوبائی خود مختاری کے دور کا آغاز ہوا اور مسلمانوں کی بکھری ہوئی جمیعت مسلم لیگ کے جھنڈے تلے جمع ہونے لگی تو انہوں نے قائد مسلم لیگ کو اس طرف متوجہ کیا ۔ سنہ ۱۹۳۷ء کے وسط میں وہ غالباً محسوس کرنے لگے تھے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ اس تجویز کو آگے بڑھانے کے لئے مؤثر طور پر عملی اقدامات کئے جائیں ۔ چنانچہ اس مجوزہ مسلم مملکت کو مسلمانوں اور برصغیر ہند کے مسائل کا واحد حل قرار دیتے ہوئے قائد اعظم کے نام اپنے خط مورخہ ۲۸ مئی سنہ ۱۹۳۷ء میں انہوں نے لکھا ۔

" مسلم ہندوستان کو اپنے مسائل کو حل کرنے کے قابل بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ ملک کو از سر نو تقسیم کر دیا جائے

اور مکمل اکثریت والی ایک یا زائد مسلم مملکتوں کا قیام عمل میں لایا جائے۔ کیا آپ نہیں سمجھتے ہیں کہ ایسے مطالبہ کا وقت آن پہنچا ہے؟ ۵۸ "

یہاں بھی وہ حتمی طور پر اپنی یہ رائے ظاہر نہیں کرتے ہیں کہ اس مسلم مملکت کے "مطالبہ" کا وقت آ گیا ہے بلکہ قائد اعظم سے اس وقت کی موزونیت و عدم موزونیت کے متعلق ان کی رائے دریافت کرتے ہیں۔ اس مرحلہ پر بھی ان کے حزم و احتیاط کا عالم یہ ہے کہ وہ ۲۸ مئی والے اس مکتوب کو "قائد اعظم کے نام ایک کھلا خط" کے عنوان سے اخباروں میں شائع کرانا چاہتے تھے لیکن مزید غور کرنے پر انھوں نے اس کھلے خط کی اشاعت کے لئے بھی اس "وقت" کو موزوں نہ سمجھا۔ چنانچہ اس خط کے آخر میں لکھتے ہیں۔

"اس خط کے موضوع پر میرا ارادہ تھا کہ آپ کے نام ایک طویل اور کھلا خط اخبارات میں شائع کراؤں لیکن مزید غور و خوض کے بعد میں نے یہ محسوس کیا کہ موجودہ وقت ایسے اقدام کے لئے موزوں نہیں ہے"

یوں ۲۸ مئی والا یہ "کھلا خط" "خانگی خط" بن گیا۔ پھر یہ خانگی خط بھی کسی اور کے نام نہیں، قائد اعظم جیسے محتاط ترین مدبر کے نام ہے۔ مگر اس خط کے سرنامہ پر بھی بائیں طرف لفظ (Confidential) بصیغہ راز درج ہے۔ یہ ان کے حزم و احتیاط کی انتہا ہے۔ ان کے اسی حزم و احتیاط کے باعث بعض حلقوں میں وہ غلط فہمی پیدا ہوئی جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔

ایک طرف حالات کا یہ اقتضا، علامہ اقبال کی ذمہ دار سیاسی شخصیت، پھر ان کا محتاط رویہ تھا اور دوسری طرف چودھری رحمت علی تھے، جن کا برصغیر ہند کی سیاست میں کوئی مقام نہ تھا۔ وہ ذمہ داری

۵۸- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۸ -

سے تمام تر سبک سر ، تدبر ، مصلحت بینی و مصلحت سنجی سے بالکلیہ بے تعلق ، مخلص ، جوشیلے اور دھن کے پکے نوجوان تھے - ان کے ذہن و دماغ پر پاکستان کے تصور نے قبضہ کر لیا تھا اور وہ بس یہ سمجھ بیٹھے تھے کہ محض پراپیگنڈے کے بل پر اس تصور کو منصہ شہود پر جلوہ گر کیا جا سکتا ہے - اسی لئے انھوں نے اس موضوع پر پمفلٹ ، اشتہارات اور خطوط وغیرہ کی بھرمار کر دی اور اسی کو اپنا محبوب مشغلہ بنا لیا - علامہ اقبال نے گول میز کانفرنسوں کے زمانے میں اکابرین برطانیہ سے تبادلۂ خیال کرکے پاکستان کے لئے جو راہ ہموار کی اس پر تدبر و احتیاط کا پردہ پڑا رہا - ہندوستان میں وطنی قومیت کے خلاف اسلامی قومیت کا جو شعلہ انھوں نے مسلمانوں کے دلوں میں بھڑکایا ، اس پر ان کی شاعری کا پردہ پڑا رہا ، اور قائد اعظم جیسے سیاست داں کو منصوبۂ تقسیم ہند کی طرف متوجہ کرکے آمادۂ عمل کرنے کی جو ترغیب دی اس پر " راز" کا پردہ پڑا رہا ! ——— لیکن رحمت علی کو ان پردوں کی کیا ضرورت تھی - ان کا عمل تو بے نقاب بلکہ عالم آشکارا تھا - یہی وجہ تھی کہ ظاہر بینوں نے " آشکارا " تو دیکھ لیا ، " پنہاں " کو نہ دیکھا اور یہ سمجھ بیٹھے کہ چودھری رحمت ہی " مجوز پاکستان " ہیں ! !

دوسرے سوال کا جواب یہ ہے کہ علامہ کی شہرت سے بے نیازی کے باعث ہی یہ بات عام ہوئی کہ علامہ نہیں بلکہ چودھری رحمت نے مجوزہ مسلم مملکت کا نام پاکستان رکھا تھا - حضرت علامہ کی سیرت کا یہ ایک نمایاں پہلو ہے کہ وہ عامیانہ شہرت (Cheap Popularity) سے کوسوں دور بھاگتے تھے - ان کے دوست ، احباب اور تمام ملنے جلنے والے اس کی تصدیق کرتے ہیں - چودھری رحمت علی نے ان کی خدمت میں حاضر ہو کر ، اس مملکت کا نام پوچھا ، تو انھوں نے بتا دیا - پھر اس کا کسی سے تذکرہ کرنے کی انھوں نے ضرورت ہی نہ سمجھی - عبدالوحید خاں صاحب نے کرید کرید کر جب ان سے دریافت کیا تو انھیں حقیقت حال بتا دی - وہ بھی اس انداز سے کہ

" یہ نام ہو ، خواہ کوئی دوسرا ، مقصد یہ ہے کہ اپنی اکثریت

کے علاقوں میں ان کو (مسلمانوں) خود حکومت کرنے کا
حق ہو[۵۹] "

ظاہر ہے کہ اصل مقصد کے مقابلہ میں اس نام کی ان کے پاس زیادہ اہمیت بھی نہ تھی اور یہ بات تو ان کے مقام سے بہت ہی فروتر تھی کہ ایک لفظ یا اصطلاح کی ایجاد کا سہرا وہ اپنے سر باندھنے کی کوشش کرتے۔ جناب عبدالوحید خاں صاحب نے راقم الحروف کے نام اپنے خط مورخہ ۱۱ نومبر ۱۹۷۳ع میں صحیح لکھا کہ

" علامہ نے مجھ سے (یعنی عبدالوحید خاں صاحب سے) یہ نہیں کہا کہ میں اس نام کے موجد ہونے کا دعویدار ہوں۔ دراصل سنہ ۱۹۳۵ع میں اس قسم کی کوئی بحث تھی ہی نہیں ، اور اگر ہوتی بھی تو علامہ صاحب اس چھوٹی بحث میں نہ الجھتے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ اس نام کو میں نے چودھری رحمت کے استفسار پر اس طرح بتا دیا تھا "

الغرض علامہ اقبال کو یہ نام سوجھا اور انھوں نے چودھری رحمت علی کو یہ نام بتا دیا۔ پھر کچھ اپنی کمال بے نیازی سے اور کچھ اپنی لا ابالی طبیعت کے سبب اس طرف توجہ ہی نہ دی اور عبدالوحید خاں صاحب کو بھی اس وقت تک نہ بتایا جب تک کہ انھوں نے کرید کرید کر سوال نہ کیا۔ اس معاملہ میں ان کی شان بے نیازی کا عالم یہ تھا کہ ان کے قریب ترین رفقا بھی اس سے ناواقف نکلے کہ " پاکستان " کا نام بھی علامہ ہی کا تجویز کردہ تھا۔ میں نے سنہ ۱۹۶۰ع میں جناب سید نذیر نیازی صاحب سے اس بارے میں استفسار کیا تو انھوں نے از راہ نوازش اپنے مکتوب مورخہ ۲۵ جنوری سنہ ۱۹۶۰ع میں یہ جواب دیا۔

" ابھی شاہد حسین صاحب رزاق(الف) ملے —— وہ بحوالہ دکن

۵۹- تاثرات و تصورات ، از عبدالوحید خاں ، ناشر مکتبہ ایوان ادب لاہور طبع اول دسمبر سنہ ۱۹۶۰ع ص ۶۲ ۔

الف۔ شاہد حسین صاحب رزاق ایم ۔ اے (عثمانیہ) کئی بلند پایہ کتابوں کے مصنف ہیں اور آج کل ادارۂ ثقافت اسلامیہ سے منسلک ہیں ۔

ٹائمز کہتے ہیں کہ پاکستان کا نام حضرت علامہ ہی کا تجویز کردہ ہے - یہ بھی کہ بعض دوسرے حضرات کا بھی یہی کہنا ہے - لہٰذا میں ذاتی طور سے اس امر کا کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا - ممکن ہے یہ نام ان ہی کا تجویز کردہ ہو "

پھر ایک بات یہ بھی ذہن میں آتی ہے کہ غالباً مصلحت وقت کے باعث بھی انھوں نے اس نام کی تشہیر مناسب نہ سمجھی ہو - " پاکستان" کا لفظ ہی ہندوؤں کو بھڑکانے والا تھا - " پاکستان بمقابلہ ہندوستان " ـــ گویا پاک ملک یہ تو ناپاک ملک وہ ـــ چنانچہ سنہ ۱۹۴۰ع میں بمقام لاہور ، کل ہند مسلم لیگ نے جو قرارداد منظور کی تھی ، اس میں لفظِ " پاکستان " استعمال نہیں کیا گیا تھا - قائد اعظم اور دیگر قائدین نے بھی اس وقت اس کو قراردادِ پاکستان کہنا مناسب نہ سمجھا - البتہ بیگم مولانا محمد علی نے اپنی تقریر میں " پاکستان " کا لفظ استعمال کیا تھا - ہندو اخبارات بیگم صاحبہ کی زبان سے نکلے ہوئے اس لفظ کو لے اڑے اور انھوں نے اس کے خلاف واویلا مچایا - پھر ان ہی اخبارات نے اس لفظ کو اتنا اچھالا اور اس کو ایسی شہرت دی کہ یہ ہندو مسلم اور انگریز سب کی زبان پر چڑھ گیا ـــــــ الغرض جب علامہ اقبال نے یہ لفظ تراشا ، اس وقت تحریک پاکستان عملاً شروع نہیں ہوئی تھی - مسلمانوں کے بیشتر مطالبات معرض التوا میں پڑے ہوئے تھے- پھر مسلمان منظم بھی نہیں ہوئے تھے ، اور ہندو ان کے سخت خلاف تھے ، ان حالات میں اس اصطلاح کی علامہ اقبال جیسی ذمہ دار شخصیت کی زبان سے تشہیر ، آ رے بیل ، سینگ مار ، والی بات ہوتی ! شاید یہ بھی ایک وجہ ہو کہ اس لفظ کو خود سے منسوب کرکے اس کو شہرت دینا مناسب نہ سمجھا -

بہرحال ایک طرف علامہ اقبال کی بے نیازی ، حزم و احتیاط کا یہ عالم اور دوسری طرف چودھری رحمت علی کے پراپیگنڈے کا یہ حال تھا کہ انھوں نے دھڑلے سے اس لفظ کو اپنے پمفلٹ ، اشتہارات اور خطوط میں استعمال کیا ، پھر پاکستان کے نام سے ایک ہفتہ وار جاری کیا ـــــــ " پاکستان نیشنل لبریشن موومنٹ " کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا -

سنہ ۱۹۳۵ع میں اسی ادارہ کی طرف سے ایک کتاب ، جس کا نام " پاکستان " تھا ، شائع کی۔[۶۰] - یہ صحیح ہے کہ علامہ اقبال نے " پاکستان " کا لفظ وضع کیا لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس کو تحریروں اور تقریروں میں سب سے پہلے چودھری رحمت علی مرحوم نے استعمال کیا ۔ استعمال ہی نہیں کیا ، بلکہ عام کیا —— اسی لئے لوگوں نے یہی سمجھا کہ وہی اس کے موجد ہیں ، لیکن حقیقت یہ ہے کہ علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں پیش کیا اور چودھری رحمت علی نے ان کے اس تصور سے متاثر ہو کر جنوری سنہ ۱۹۳۳ع میں اپنی تجویز پیش کی ۔ اس لئے اولیت کا سہرا چودھری رحمت کے سر نہیں باندھا جا سکتا ۔

چودھری خلیق الزماں نے اپنی کتاب " پاتھ وے ٹو پاکستان " میں چودھری رحمت علی اور علامہ اقبال کا جس انداز میں ذکر کیا ہے ، اس سے یہ تاثر پیدا ہوتا ہے کہ چودھری رحمت علی سے متاثر ہو کر علامہ اقبال نے پاکستان کا تصور مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد منعقدہ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں پیش کیا تھا ۔ وہ لکھتے ہیں ۔

" نومبر دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں پہلی گول میز کانفرنس کے دوران رحمت علی نے لندن میں کئی مسلم لیڈروں سے ملاقات کی اور انھیں اپنی تقسیم (ہند) والی اسکیم سمجھائی ، جس کو انھوں نے پہلی مرتبہ پاکستان کا نام دیا تھا اور آخرکار دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع میں علامہ اقبال نے ، خود اس اسکیم کو کل ہند مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد کے صدر کی حیثیت سے فاش کیا تھا[۶۱] "

چودھری خلیق الزماں صاحب نے دانستہ یانا دالستہ غلط بیانی سےکام لیا ہے ۔ یہ ان کا اپنا چشم دید واقعہ نہیں ہے ۔ وہ دسمبر ۱۹۳۰ع والی پہلی گول میز کانفرنس کے موقع پر لندن میں موجود ہی نہیں تھے ۔ اپنی

۶۰- روز نامہ جنگ کراچی مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۷۱ع ۔

۶۱- پاتھ وے ٹو پاکستان از خلیق الزماں ص ۲۳۸ ۔

اس کتاب کے صفحہ ۱۰۸ پر انہوں نے اس کانفرنس میں شرکت کرنے والے نمایاں افراد کے نام گنائے ہیں ، ان میں خود اپنا ذکر نہیں کیا ہے ۔ پھر اسی کتاب کے صفحہ ۱۰۹ پر بتاریخ ۲۵ دسمبر ۱۹۳۰ع زاہدہ خاتون سے اپنی شادی کا ذکر کیا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دسمبر ۱۹۳۰ع میں وہ لندن میں نہیں بلکہ ہندوستان ہی میں تھے ۔ لہذا ان کا یہ بیان کہ نومبر دسمبر ۱۹۳۰ع میں پہلی گول میز کانفرنس کے دوران رحمت علی نے لندن میں کئی مسلم لیڈروں سے ملاقات کی اور انھیں اپنی اسکیم سمجھائی ، چشم دید واقعہ نہیں ہے ۔ یہ بات انہوں نے محض اپنے قیاس سے لکھ دی ہے ۔ ہم ثابت کر آئے ہیں کہ چوھدری رحمت علی صاحب نے نومبر دسمبر ۱۹۳۰ع میں نہیں بلکہ جنوری ۱۹۳۳ع میں اپنی اسکیم سے تیسری گول میز کانفرنس کے بعض شرکاء کو روشناس کرایا تھا اور دسمبر ۱۹۳۰ع میں علامہ اقبال نے مسلم لیگ کے اجلاس الہ آباد میں پاکستان کا تصور پیش کیا تھا ۔ لہذا یہ کہنا غلط ہے کہ علامہ اقبال ، چوھدری رحمت علی کی اسکیم سے متاثر ہوئے تھے ۔

یہاں تک تو ہم نے تاریخی حقائق و شواہد کی روشنی میں یہ بتایا ہے کہ تصور پاکستان کو جن اشخاص سے منسوب کرنے کی کوشش کی جاتی ہے ، ان میں سے کسی کو بھی تصور پاکستان کا بانی اول قرار دینا درست نہیں ہے ۔ ان میں سے بعض (جیسے سر سید ، سرتھیو ڈور ماریسن) نے صرف دو قومی نظریہ کا اظہار کیا ۔ بعض (جیسے بلنٹ ، شرر ، بمبوق ، خیری برادران ، سردار گل خان ، مولانا حسرت موہانی ، لاجپت رائے ، مرتضی احمد خان) نے مسلم اضلاع یا مسلم صوبوں کے قیام کا خیال ظاہر کیا اور بعض (جیسے عبدالقادر بلگرامی اور نادر علی) نے "حلقہ اثر یا تقسیم ہند" کی مبہم تجویز پیش کی ۔ یہ صحیح ہے کہ یہ سب تجاویز ۱۹۳۰ع سے قبل (یعنی علامہ اقبال کے تصور پاکستان پیش کرنے سے پہلے) کی ہیں ، لیکن ان میں سے کسی تجویز میں بھی واضح طور پر مسلم صوبوں کے ایک علیحدہ وفاق یا ایک آزاد مقتدر ، مسلم مملکت کے قیام کا ذکر نہیں ہے ! ان تجاویز کی حمایت میں زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جب ہم ان تجاویز کو پڑھتے ہیں تو ہمارے متخیلہ میں پاکستان کا موہوم سا "تصور" یا ہلکی

سی جھلک پیدا ہوتی ہے ، لیکن اقبال کی پوری سیاسی فکر اور عملی سیاسی جد و جہد کے پس منظر میں ، جب ہم ان کے خطبۂ صدارت مسلم لیگ اور قائداعظم کے نام ان کے دونوں خطوط (مورخہ ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء اور ۲۱ جون ۱۹۳۷ء) کو بنظر غائر دیکھتے ہیں تو ہماری آنکھوں کے سامنے پاکستان کی نہایت واضح ، بہت ہی صاف اور کاملاً جامع "تصویر" اجاگر ہوتی ہے ۔ حقیقت یہ ہے کہ مذکورہ بالا تمام تجاویز میں صرف ایک ہی "قدر مشترک" ہے ۔ اور وہ "قدر مشترک" یہ ہے کہ ان میں ایک "تاثر" یا ایک "احساس" پایا جاتا ہے ـــــ مسلمانوں کی ہندوؤں سے علیحدگی کا تاثر یا مسلمانوں کی ہندوؤں سے مغائرت کا احساس ! لیکن پاکستان کا تصور کسی مبہم احساس یا سرسری تاثر کا نام نہیں ہے ۔ وہ ایک قوم کے واضح ، قطعی اور پختہ شعور کی عملی تجسیم و تشکیل کا نام ہے ! ـــــ علیحدگی کا یہ تاثر یا مغائرت کا یہ احساس تو اسی وقت پیدا ہو گیا تھا ، جب برصغیر ہند کی سر زمین پر مسلمان نے پہلا قدم رکھا ! پھر یہ تاثر اور یہ احساس ، ہر دور اور ہر قرن میں موجود رہا اور اس کا اظہار بھی اسی دور کے مصنفین اور دانشوروں کی تحریروں میں ہوتا رہا ۔ برطانوی دور میں بھی (حالانکہ یہ دور غلامی تھا) برابر یہ احساس موجود تھا ، ہاں کبھی یہ اجاگر ہوا تو ، کبھی دب سا گیا ، اور کبھی کبھی بھڑک بھی اٹھا ، لیکن فنا یا ناپید کبھی نہ ہوا ۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ مسلمان کا وہ احساس ہے ، جو اس کے "لاشعور" میں ہمیشہ موجود رہتا ہے ـــــ اقبال کا کارنامہ یہ ہے کہ وہ اپنی نغمہ سرائی کے ذریعہ اس احساس کو مسلمانانِ برصغیر کے "لاشعور" سے نکال کر ان کے "شعور" میں لے آئے ، پھر اپنی صوتِ سرمدی سے اس شعور کو پختہ کیا اور اپنی سیاسی بصیرت سے اس کی عملی تجسیم و تشکیل کا خاکہ پیش کیا ـــــ اور یہی ان کی اولیت ہے ـــــ اب اس مسئلہ پر ایک اور نقطۂ نظر سے غور کیجیئے !

کہا جاتا ہے اور بالکل صحیح طور پر کہا جاتا ہے کہ پاکستان کی بنیاد "دو قومی نظریہ" ہے ـــــ "ہندو ، مسلمان دو قومیں ہیں" یہ نظریہ کسی ایک فرد کا تراشیدہ ، یا کسی ایک مخصوص زمانہ کی پیدا وار نہیں ہے ۔ یہ نظریہ اسلام کا وضع کردہ ہے اور بعثت نبوی (چھٹی صدی عیسوی)

سے لے کر آج تک موجود ہے اور انشاء اللہ قیامت تک موجود رہے گا۔ گردش لیل و نہار ، سلطنتوں کے عروج و زوال ، حکومتوں کی اکھاڑ پچھاڑ کے باوجود یہ نظریہ ہر ملک ، ہر زمانہ اور ہر دور میں موجود رہا اور اب تک چلا آ رہا ہے۔ اسی لیے یہ نظریہ ہمیں ہر ملک کے اور ہر دور کے مسلم مفکرین کے ہاں ملتا ہے۔ ہندوستان کے دور جدید میں سر سید ، حالی اور شبلی وغیرہ اس کے حامی اور وکیل رہے ہیں ، لیکن محض اس بناء پر انھیں تصور پاکستان کا بانی قرار دینا ایک عجیب سی بات ہوگی۔

دو قومی نظریہ بے شک پاکستان کی بنیاد ہے لیکن محض اس بنیاد کی طرف اشارہ کر دینے سے قصر پاکستان کی تشکیل نہیں ہو جاتی ہے۔ اس بنیاد پر کچھ دیواریں استوار کرنی پڑتی ہیں ، جب کہیں جا کر اس قصر کی تعمیر و تشکیل ہو پاتی —— منطقی زبان میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ برصغیر میں ہندو مسلمان دو قومیں ہیں —— یہ مقدمہ کبریٰ (Major Premises) ہے ، اور یہ دونوں قومیں ایک ہی سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتیں۔ یہ مقدمۂ صغریٰ ہے۔ لہذا ان کو علیحدہ علیحدہ خطۂ ارضی میں اپنی اپنی پسند کے مطابق زندگی بسر کرنے کا موقع دیا جائے۔ یہ اس کبریٰ اور صغریٰ کا نتیجہ ہے اور مسلمانوں کے تعلق سے اسی نتیجہ کا دوسرا نام پاکستان ہے۔

پاکستان کے مقدمۂ کبریٰ (یعنی ہندو ، مسلمان دو قومیں ہیں) پر سب سے بڑا اعتراض یہ وارد کیا گیا کہ ہندو مسلمان دو قومیں کیوں ہیں ، جب کہ وہ ایک ہی "ہندوستان" میں رہتی ہیں ؟ موجودہ زمانے میں ایک ہی جغرافیائی حدود میں رہنے والوں کو باوجود ، اختلاف زبان و مذہب ، رنگ و نسل ایک ہی قوم گردانا جاتا ہے ، گویا وطنی قومیت کے نقطۂ نظر سے ہندو مسلمان دو مختلف قومیں نہیں ہیں بلکہ وہ ایک قوم کے دو طبقے یا فرقے (Communities) ہیں۔ اس اعتراض کا جواب مسلم اکابرین میں سے متقدمین نے بھی دیا اور متاخرین نے بھی ، لیکن یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اس اعتراض کا نہایت پر زور ، مدلل اور دندان شکن جواب اقبال ہی نے دیا ہے۔ یہاں ہمیں ان کے اس جواب کی تفصیلات میں جانے

کی ضرورت نہیں ہے ۔ گذشتہ اوراق میں اس پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے ۔ مختصراً یہ کہ انھوں نے بتایا کہ اسلام ، ایک قوت جاذبہ ہے ، وہ ایک ایسا عنصر ہے ، جو مختلف رنگ ، نسل ، زبان اور جغرافیائی حدود کے لوگوں کو باہم ایک دوسرے سے اس طرح مربوط و پیوست کرتا ہے کہ وہ ایک قوم بن جاتے ہیں ۔ اس بنیاد پر قومیت کی تعمیر و تشکیل ، مذموم نہیں ، بلکہ حد درجہ محمود اور دور جدید میں تو بغایت مطلوب ہے ۔ برصغیر ہند کے مسلمان ، اسی بنیاد پر ایک قوم ہیں ۔ وہ قابل احترام ہی نہیں بلکہ لائقِ صد رشک قوم ہیں کہ قوم کے حقیقی اور جدید ترین معنی میں وہی اور صرف وہی ایک قوم کہلائے جانے کے مستحق ہیں ——— یوں پاکستان کے مقدمہ کبریٰ یا اولین بنیاد کا دفاع کرنے میں ہمیں اقبال کا ہمسر کوئی نظر نہیں آتا ، ——— جبھی تو مولانا عبدالماجد دریا بادی نے فرمایا تھا کہ اس مسئلہ میں وہ "امام العصر" تھے ۔

مقدمہ صغریٰ (ہندو مسلم ایک سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتے) پر یہ اعتراض کیا گیا کہ ہندو مسلمان دو قومیں ، ہونے کے باوجود ، کیوں ایک آزاد سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتے ؟ مسلمانوں کی طرف سے اس اعتراض کے مختلف جوابات دیئے گئے ۔ پھر ان کے جوابات پر ہندوؤں نے تنقید کی اور ان کے جواب الجواب دیئے ۔ ایک نظر اس "مناظرہ" پر بھی ڈال لیجئے ۔

مسلمانوں کا ایک جواب یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں زبردست معاشرتی اختلاف پایا جاتا ہے ۔ ان دونوں کا رہنا سہنا ، کھانا پینا ، بول چال ، ایک دوسرے سے بے حد مختلف ہے اسی لئے انھیں ایک نظامِ سیاسی کے تحت باندھ کر رکھنا ظلم ہے ۔ اس جواب پر ہندوؤں کی طرف سے یہ تنقید کی گئی کہ یہ دونوں قومیں صدیوں سے مل جل کر رہتی چلی آئی ہیں اور باوجود سماجی اختلافات کے انگریز کے دور غلامی میں بھی وہ ایک دوسرے کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرتی رہی ہیں پھر مستقبل کے آزاد سیاسی نظام میں یہ یکجائی کیوں ممکن نہیں ؟ آزاد ہندوستان کا سیاسی نظام تو سیکولر (Secular) ہوگا اور سیکولر نظام افراد یا قوموں کے نجی معاملات میں مداخلت یا ان سے تعرض نہیں کرتا ! ایسے نظام کے تحت تو

مسلمانوں کا ہندوؤں کے ساتھ مل کر زندگی بسر کرنا ، ممکن العمل ہی نہیں خوش آئند بھی ہے !!

ہندو مسلمان ، ایک آزاد سیاسی نظام کے تحت مل جل کر کیوں زندگی بسر نہیں کر سکتے ؟ ـــــ اس اعتراض کا دوسرا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ان دونوں قوموں میں معاشی نقطہ نظر سے بڑا تفاوت پایا جاتا ہے ۔ ہندو مالدار اور سرمایہ دار ہیں اور مسلمان ان کے مقابلہ میں بحیثیت مجموعی غریب اور مفلوک الحال ہیں ۔ اگر یہ دونوں قومیں ایک ہی سیاسی نظام کے تحت رہیں گی تو سرمایہ دار ہندو ، نادار مسلمانوں کا استحصال کرے گا ۔ اور مسلمان کو اپنی معاشی حالت سدھارنے کا موقع نہیں ملے گا ۔ جواب الجواب میں روشن خیال اور ترقی پسند ہندوؤں کی طرف سے کہا گیا کہ اولاً تو یہ کہنا درست نہیں کہ سارے کے سارے ہندو " سرمایہ دار " ہیں اور سب کے سب مسلمان " نادار " ہیں ۔ غریب مسلمان بھی ہیں اور ہندو بھی ، سرمایہ داروں میں ہندو بھی ہیں اور مسلمان بھی ۔ گو ہندو سرمایہ داروں کی تعداد زیادہ ہے ، تاہم ان کی آبادی بھی کثیر ہے ۔ دراصل غربت و ناداری کا مسئلہ ہندوستان کا عام معاشی مسئلہ ہے ۔ اس کا تعلق ہندو یا مسلم سے نہیں بلکہ ہندوستان کے تمام باشندوں سے ہے ۔ اگر ہندو سرمایہ دار کے مفادات ، نادار مسلمان سے ٹکراتے ہیں تو ہندو محنت کش سے بھی ٹکراتے ہیں ۔ اگر مسلمان سرمایہ دار کے معاشی مفادات کا تصادم نادار ہندو سے ہوتا ہے تو مسلم مزدور سے بھی ہوتا ہے ۔ معاشی نقطہ نظر سے ہندو اور مسلم میں تفریق کرنا غلط ہے ۔ دراصل ہندو سرمایہ دار اور مسلم سرمایہ دار کے مفادات میں ہم آہنگی ہے اور نادار ہندو اور نادار مسلم کے مفادات میں یکسانیت ہے ۔ تصادم اگر ہے تو سرمایہ داروں اور محنت کشوں کے مابین ہے اور اس کا حل تقسیم ہند یا ہندو اور مسلمان کی علیحدگی نہیں ہے ۔ بلکہ " اشتراکیت '' ہے ۔ اگر ہندوستان کا سیاسی نظام سیکولر اور معاشی نظام اشتراکی قرار دیا جائے تو پھر مسلمانوں کو ہندو سرمایہ داروں کے استحصالِ ناجائز سے خوف زدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ۔ کیونکہ اشتراکی نظام کے تحت استحصال کا خاتمہ ہو جائے گا اور مسلمان ترقی کی شاہراہ پر گامزن ہوں گے ۔

ہندو مسلم باہم مل کر ایک سیاسی نظام کے تحت کیوں زندگی بسر نہیں کر سکتے ؟ ہندوؤں کے اس اعتراض کا تیسرا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں میں تاریخی دشمنی پائی جاتی ہے۔ ماضی میں یہ باہم جنگ و جدل کرتے رہے ہیں اور حال میں بھی لڑتے بھڑتے رہے ہیں ۔ مسلمان کا جو ہیرو ہے ، وہ ہندو کی نظر میں " راکشس " ہے اور ہندو کا " سورما " مسلمان کے نزدیک گردن زدنی ہے ۔ کسی صورت ان دونوں قوموں کا مل جل کر رہنا محال ہے ۔ اس جواب پر ہندو دانشور اور مفکرین نے کہا کہ ہندو مسلمان کی اس نام نہاد مبینہ دشمنی کو تاریخی روپ انگریز مصنفین نے سامراجی مقاصد کے پیش نظر دیا ہے ۔ مسلمان اور ہندو صدیوں سے اس برصغیر میں مل جل کر رہتے آئے ہیں ۔ ان کے آپس میں اگر لڑائیاں ہوئی ہیں تو " دوستی " کے دل افروز مناظر بھی دیکھنے میں آئے ہیں ۔ اب رہی ان کی حالیہ سر پھٹول ، تو یہ تمام تر انگریزی سامراج کا شاخسانہ ہے ۔ سنہ ۱۹۲۰ع کی تحریک عدم تعاون و تحریک خلافت نے ثابت کر دیا کہ ہندو مسلم بھائی بھائی ہیں ۔ انگریز نے ان کو لڑایا اور جب تک انگریزی سامراج باقی ہے ، ہندو مسلمان لڑتے رہیں گے کیونکہ تقسیم کرو اور حکومت کرو (Devide and Rule) اس کی پالیسی ہے ۔ جس دن یہ سامراجی نظام ختم ہو جائے گا ، اسی دن ہندو مسلم دشمنی بھی اپنی موت آپ مر جائے گی ۔ پھر بفرض غلط یہ تاریخی دشمنی ہے بھی ، تو اس کا جاری رکھنا کہاں کی دانائی ہے ؟ دونوں قوموں کی مستقلاً علیحدگی یا تقسیم ہند سے اس تاریخی دشمنی پر نہ صرف مہر توثیق ثبت ہو جائے گی بلکہ اس کو سند دوام مل جائے گی ـــــ اس دشمنی کو نہ صرف مٹایا جانا چاہئے بلکہ اس کو دوستی اور بھائی چارہ میں تبدیل کرنا چاہئے اور اس کا طریقہ دوری و علیحدگی ، نہیں ، قربت و موانست ہے ۔

ہندو مسلمان باہم مل کر کیوں نہیں رہ سکتے ؟ اس سوال کا چوتھا جواب مسلمانوں کی طرف سے یہ دیا گیا کہ ہندوستان کا آئندہ دستور " جمہوری " ہو گا اور ایک جمہوری نظام میں عملاً اکثریت کی حکومت ہوتی ہے ۔ ہندوستان میں ہندو اکثریت میں ہیں اور مسلمان اقلیت میں اس

لئے جمہوری نظام دستوری کے تحت ہندو اکثریت حاکم ہو گی اور مسلمان اقلیت عملاً ان کی محکوم ہو گی ۔ اس لئے ان دونوں قوموں کی علیحدگی ضروری ہے تاکہ ہر قوم اپنے اپنے علاقوں میں حاکم ہو ۔ اس کا جواب الجواب ، کانگریسی لیتاؤں نے یہ دیا کہ ہندوستان کا دستور جہاں جمہوری ہو گا وہاں سیکولر (لادینی) بھی ہو گا اور سیکولر دستور کسی طبقہ سے مذہب کی بناء پر امتیاز نہیں برتتا ۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ جمہوری نظام میں حکومت اکثریت کی ہوتی ہے ۔ مگر یہ اکثریت کسی ایک طبقہ یا فرقہ کی نہیں ہوتی بلکہ سیاسی جماعت (Political Party) کی ہوتی ہے اور ملک میں آئندہ سیاسی جماعتیں اپنے معاشی پروگرام کی بناء پر تشکیل پائیں گی ۔ اس میں ہندو بھی ہوں گے اور مسلمان بھی ۔ پھر جس سیاسی جماعت کو عام انتخابات میں اکثریت حاصل ہو گی وہی حکومت بنائے گی اور اس حکومت کے ارکان ہندو بھی ہوں گے اور مسلمان بھی ہوں گے ، پارسی ، سکھ اور عیسائی بھی ۔ یہ حکومت بلا امتیاز مذہب و ملت سبھی ہندوستانیوں کی حکومت ہو گی ۔ ایسی حکومت میں ایک مسلمان ہر عہدہ بلکہ بڑے سے بڑا منصب یعنی وزارت عظمیٰ بھی حاصل کر سکتا ہے اور صدارت پر بھی فائز ہو سکتا ہے ۔ علاوہ ازیں اگر مسلمانوں کو ایسے سیاسی نظام میں اپنے سیاسی حقوق کے تعلق سے کچھ خدشات اور اندیشے لاحق ہیں تو دستور میں ان کے لئے " تحفظات " بھی دئے جا سکتے ہیں ، بلکہ ان کے ساتھ '' مراعات '' بھی روا رکھی جا سکتی ہیں ! !

الغرض '' ہندو مسلمان باہم مل کر ایک سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتے'' اس مقدمہ کی تائید میں مسلمانوں نے مندرجہ بالا دلائل پیش کئے اور ہندوؤں کی طرف سے ان کے جو جوابات دئے گئے ، انھیں ہم نے مختصراً مگر وضاحت کے ساتھ یہاں بیان کر دیا ہے ۔ ہمیں اس مناقشہ و مناظرے کے تمام پہلوؤں کو واضح کرنا یا اس کی تفصیلات میں جانا نہیں ہے ، یہاں ان کے مختصر سے تذکرے سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اس مقدمہ کی تائید میں جو دلائل پیش کئے ، ہندوؤں نے ان پر نکتہ چینی کی اور ان کے جوابات دئے ۔ ان کی اس تنقید سے یہ واضح ہوتا ہے کہ نہ صرف کانگریسی ہندو بلکہ ترقی پسند افراد بھی مسلمانوں

کے پیش کردہ ان دلائل سے قائل معقول اور مطمئن نہیں ہوئے۔ وہ اعتراضات پر اعتراضات کرتے رہے اور ان دلائل کو اپنی تنقیدوں کا نشانہ بناتے رہے۔ پھر یہ کہنا بھی غلط نہ ہو گا کہ ان کے یہ اعتراضات کچھ ایسے بے وقعت اور ان کی یہ تنقیدیں کچھ ایسی بے وزن بھی نہ تھیں!

" برصغیر ہند میں ہندو اور مسلمان ایک ہی سیاسی نظام کے تحت باہم مل کر زندگی بسر نہیں کر سکتے" —— یہ پاکستان کا مقدمہ صغریٰ ہے۔ ہندوؤں اور مخالفین پاکستان کا سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ اس "کیوں" کے جو جوابات مسلمان مفکرین، سیاسی رہنماؤں اور دانشوروں نے دئے ہیں، انہیں مختصراً ہم نے اوپر بیان کر دیا ہے۔ آئیے اب یہ دیکھیں کہ اس "کیوں" کا جواب علامہ اقبال نے کیا دیا ہے۔ ان کا جواب یہ تھا۔

جس شیرازہ بند طاقت یا عنصر نے مسلمانوں کو ایک قوم بنایا ہے، وہ اسلام اور صرف اسلام ہے اور اسلام عرفِ عام میں "کوئی مجموعۂ عقائد، عبادات و رسوم (Cult) یا یورپی اصطلاح میں " مذہب " (Religion) نہیں ہے[۶۲] "۔ وہ ایک دین ہے اور یہ " دین " ایک نجی معاملہ (Private Affair) نہیں ہے[۶۳] " بلکہ " یہ اخلاقی نصب‌العین کے ساتھ ساتھ ایک قسم کی عمرانی ہئیت بھی ہے —— عمرانی ہئیت سے مراد ایک ایسا سماجی ڈھانچہ ہے جس کی تنظیم ایک قانونی نظام کے ذریعہ کی گئی ہے اور جس کے اندر ایک مخصوص اخلاقی نصب‌العین نے زندگی کی روح پھونکی ہے[۶۴] " بالفاظ دیگر " یہ ایک مکمل اور دائمی عمرانی سیاسی تنظیم ہے[۶۵] "۔

۶۲- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی ص ۴ و ۵ و ص ۸۔
۶۳- ایضاً سنہ ۱۹۴۸ع ص ۳۸۔
۶۴- ایضاً ص ۱ و ۲۔
۶۵- ایضاً ص ۱۲۰۔

" اس کا معاشرتی نظام اسی کا آفریدہ ہے اور اس معاشرتی نظام کو اسلام کے اخلاقی نصب‌العین سے جدا نہیں کیا جا سکتا[۶۶] " ۔ واضح الفاظ میں اسلام کے اپنے نہ صرف عقائد و شعائر ہیں بلکہ اس کا اپنا سماجی ، معاشی ، تہذیبی اور سیاسی نظام ہے ۔ اور یہ سب ایک دوسرے سے پیوستہ ہیں ، وہ ایک مکمل ضابطہ حیات یا دین کلی ہے اور یہ سب اس " کل " کے اجزاء لاینفک ہیں ۔ اب اس دین کا تقاضہ یہ ہے کہ اس کے قوانین و ضوابط کو انفرادی و اجتماعی زندگی دونوں میں نافذ کیا جائے ۔ اس کا داعیہ یہ ہے کہ اس کے اخلاقی نصب‌العین کے ساتھ اس کے سماجی ، معاشی اور سیاسی نظام کو بروئے کار لایا جائے ۔ اسلام فقط محراب و منبر کی زینت بن کر رہنا نہیں چاہتا بلکہ وہ تخت و تاج کو زیرنگیں کرنا چاہتا ہے اور اسی لئے وہ " تمکن فی‌الارض " کا مطالبہ کرتا ہے ! —— اور اگر مسلمان حقیقی معنوں میں اس " دین کلی " کا معتقد و علمبردار ہے ، تو وہ اپنے دین کے اس مطالبہ سے اعراض نہیں کر سکتا ۔ وہ دوسری اقوام کے ساتھ مل جل کر کسی سیکولر ، اشتراکی جمہوری نظام کے تحت اپنی زندگی کو مامون و مصؤن بنانے کی بجائے اپنے دین کے اس تقاضہ کو پورا کرنے پر متعین و مامور ہے ۔ کیا دیگر اقوام ہند بالخصوص ہندو قوم ، متحدہ ہندوستان میں مسلمان کو اس کے دین کے اس تقاضہ کو پورا کرنے کا موقع دینے کے لئے تیار ہے ؟ اگر " ہاں " تو پھر علیحدگی ، تفریق و تقسیم کا کوئی سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ! اور اگر " نہیں " تو علیحدگی و تقسیم ناگزیر ہے تاکہ مسلمان کم از کم ان خطوں میں جہاں وہ اکثریت میں ہیں اپنے دین کے اس تقاضہ کو پورا کر سکیں !

یہ تھی اقبال کی وہ توجیہہ ، جو انھوں نے ہندو مسلمان کے باہم مل کر ایک ہی سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہ کر سکنے کے سلسلہ میں پیش کی تھی اور یہی وہ دلیل بھی تھی ، جس کی بنیاد پر انھوں نے ایک علیحدہ مملکت کا مطالبہ پیش کیا تھا !

۶۶- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی سنہ ۱۹۴۸ع ص ۹

سوال کیا جا سکتا ہے کہ یہ توجیہہ و دلیل ان کے یہاں کہاں پائی جاتی ہے؟ جواب یہ ہے کہ اقبال کا سنہ ۱۹۰۵ع کے بعد سے سارا "کلام" ہی اس توجیہہ کا آئینہ دار ہے اور سیاسی نقطہ نظر سے ان کے پیام کا نچوڑ ہی یہ ہے۔ اگر قطعیت کے ساتھ اور معین طور پر اس دلیل و توجیہہ کو دیکھنا ہو تو ان کے خطبہ صدارت مسلم لیگ سنہ ۱۹۳۰ع کے ابتدائی ثلث حصہ کا بنظر غائر مطالعہ کیجئے، پھر وہیں پر یہ بھی دیکھ لیجئے کہ یہ دلیل و توجیہہ انھوں نے اپنی تجویز "پاکستان" کو پیش کرنے سے معاً پہلے درج کی ہے۔ خطبہ صدارت کے ابتدائی حصہ میں تو انھوں نے اس دلیل کو واضح اور منقح کرکے پیش کیا ہے۔ پھر اس کو انھوں نے صرف دو بلیغ فقروں میں سمو بھی دیا ہے۔ ان فقروں کو ہم نے گذشتہ صفحات میں نقل کیا ہے اور یادداشت کو تازہ کرنے کے لئے یہاں پھر دہرایا جاتا ہے۔ ایک فقرہ تو یہ ہے، جس کو انھوں نے تجویز پاکستان سے پہلے بیان کیا ہے۔

" اسلام خود اپنی تقدیر آپ ہے اور وہ کسی دوسری تقدیر کو انگیز نہیں کر سکتا[۶۷] "

یہ وہی بات ہے کہ اسلام صرف رونق محراب و منبر بنے رہنے پر اکتفا کرنا نہیں چاہتا۔ کسی دوسرے نظام کو تخت پر براجمان کرکے اس کی چاکری تو کجا، اس کی زلّہ ربائی، خوشہ چینی خیمہ برداری بلکہ ہم نشینی بھی اسے گوارا نہیں۔ وہ انا و لاغیری کا نعرہ لگاتا اور صاف صاف تمکن فی الارض کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی مفہوم کو اقبال نے ایک دوسری جگہ اس طرح ادا کیا ہے۔

" اسلام اپنے اصول اجتماعیہ انسانیہ میں کسی کام چلاؤ سمجھوتہ (Modus Vivendi) کو قبول نہیں کرتا اور وہ ہئیت اجتماعیہ انسانیہ کے کسی اور آئین سے کسی قسم کا راضی نامہ کرنے کو

۶۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع ثانی ص ۷۔

تیار نہیں ہے ۔ درحقیقت وہ اعلان کرتا ہے کہ اسلام کے سوا ہر دستور العمل نامعقول اور مردود ہے[۶۸] "

" قرآن ببانگ دہل اعلان کرتا ہے کہ اسلام کے سوا ہر نظام نامعقول اور مردود ہے[۶۹] "

اقبال نے دوسرا بلیغ فقرہ ، جو تجویز پاکستان پیش کرنے کے معاً بعد اپنے خطبہ صدارت میں درج کیا ہے ، یہ ہے ۔

" اس ملک میں اسلام کی زندگی کا انحصار بہت بڑی حد تک اس امر پر ہے کہ اس کو بحیثیت ایک تمدنی قوت کے ایک مخصوص خطہ میں مرتکز کر دیا جائے[۷۰] "

تمدنی قوت کی حیثیت سے اسلام کے ارتکاز کے معنی اس کے سوا اور کیا ہیں کہ اسلام جس غرض سے " تمکن فی الارض " کا مطالبہ کرتا ہے اس کو پورا کیا جائے یعنی مسلمانانِ برصغیر کو وہ اقتدار یا قوتِ نافذ حاصل ہو ، جس کے ذریعہ وہ اسلام کے اجتماعی نظام کو برصغیر کے مخصوص رقبے یا خطے میں بروئے کار لا سکیں ! !

پاکستان کے مقدمۂ صغریٰ (یعنی ہندو مسلمان باہم مل کر واحد سیاسی نظام کے تحت آزادانہ زندگی بسر نہیں کر سکتے) کی تائید میں جو دیگر دلائل مسلمانوں کی طرف سے پیش کئے گئے تھے ، وہ یا تو سماجی و معاشی تھے ، یا تاریخی و سیاسی ۔ اس لحاظ سے وہ جزوی دلائل تھے ، ان پر غیر مسلم دانشور خصوصاً کانگریسی ہندو نکتہ چینیاں کرتے اور ان میں طرح طرح کے مین میکھ نکالتے رہے —— مگر اقبال کی یہ دلیل ، دلیل کلی تھی ۔ اس نے ان کو ساکت و صامت ہی نہیں قائل معقول کر دیا ۔

۶۸- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور ، طبع ثانی ص ۲۲۵

۶۹- ایضاً ص ۲۲۵ -

۷۰- ایضاً ص ۱۳ -

اب چناں و چنیں کی کوئی گنجائش ہی نہ رہی تھی ۔ یوں یہ دلیل ، دلیل کلی نہیں ، برہانِ قاطع بھی تھی ! !

گذشتہ مباحث پر ایک نظر ڈالنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ پاکستان کے دونوں مقدمات (مقدمہ کبریٰ کہ ہندو اور مسلمان دو قومیں ہیں اور مقدمہ صغریٰ کہ یہ دونوں قومیں باہم مل کر واحد سیاسی نظام کے تحت زندگی بسر نہیں کر سکتیں) یا دونوں بنیادوں کے لئے واضح ، روشن اور محکم دلائل علامہ اقبال ہی نے پیش کئے ہیں —— ان دلائل کا خلاصہ یا نچوڑ کیا ہے ؟ یہی کہ اسلام ہی مسلمانوں کو ایک قوم بناتا اور وہی ان کو غیروں کی غلامی سے نجات دلا کر تختِ اقتدار پر متمکن کرتا ہے ! اسی لئے تو اقبال نے بڑی بلند آہنگی سے کہا تھا ۔

" مسلمانوں کی تاریخ سے میں نے جو ایک سبق سیکھا ہے ، وہ یہ ہے کہ تاریخ کے نازک ترین لمحات میں اسلام ہی ہے ، جس نے مسلمانوں کو بچایا نہ کہ بالعکس[۱۷] "

اقبال نے ثابت کر دیا کہ ان کا مطالعۂ تاریخ ، صد فی صد درست تھا ۔ لاریب کہ مسلمانانِ برصغیر کی تاریخ کے نازک ترین لمحات میں اسلام ہی ان کے کام آیا ۔ اسی نے برصغیر کے منتشر و متفرق مسلمانوں کو ایک قوم بنایا اور اسی نے ان کو ہندو اکثریت کی دائمی غلامی سے نجات دلا کر ، برصغیر کے ایک حصہ میں آزادی و اقتدار کی نعمت سے بہرہ ور کیا ! ! —— یوں یہ دلائل ، مقدماتِ پاکستان کے دلائل و توجیہات ہی نہیں ہیں یہ پاکستان کی نظریاتی بنیادیں ہیں ! !

مندرجہ بالا مباحث کی روشنی میں غور کیجئے تو پاکستان کے تین اجزاء قرار پاتے ہیں (۱) برصغیر ہند کی ہندو اکثریت اور مسلم اکثریت کے خطوں میں تقسیم (۲) مسلم خطوں میں ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام (۳) اس مملکت کا ایک واضح و متعین مقصد یعنی اسلامی طرز زندگی کا احیاء

۱۷- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو ، مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۸ء ص ۳۵

اور اسلامی قوانین کا اجراء ــــــ ان تینوں میں سے ، کسی ایک جزو کے بغیر پاکستان کا تصور مکمل نہیں ہوتا ! ظاہر ہے کہ پاکستان کا تصور تقسیم۔ ہند پر مبنی ہے ۔ اس تقسیم کا مقصد ایک آزاد مسلم مملکت کا قیام ہے ، پھر اس مملکت کا قیام ، محض اس لیے مطلوب نہ تھا کہ دنیا کی مملکتوں میں ایک اور مملکت کا اضافہ ہو جائے یا دنیا کے نقشہ میں جو مسلم ممالک نظر آتے ہیں ، ان میں مزید ایک اور مسلم ملک کا رنگ بھی ابھر آئے ۔ یہ مملکت برائے مملکت مطلوب نہ تھی بلکہ ایک خاص مقصد کے لیے ، اس مملکت کا تصور پیش کیا گیا تھا اور وہ مقصد تھا ، دین کلی کا نفاذ ! ــــــ اب ان تینوں اجزا کو ذہن میں رکھ کر ان اشخاص کی تجاویز پر غور کیجئے ، جن سے اس تصور کو منسوب کیا جاتا ہے ۔ اگر یہ تینوں اجزا کسی شخص کی پیش کردہ تجویز میں نظر آتے ہیں ، تو بے شک اس کو اس تصور کا بانی اول قرار دیا جا سکتا ہے اور اگر یہ تینوں اجزا کسی تجویز میں نہیں ملتے یا ان میں سے کوئی ایک جز یا دو اجزا ملتے ہیں تو پھر اس کے سر اولیت کا یہ سہرا باندھا نہیں جا سکتا ۔ تصور پاکستان کے سلسلہ میں ، جن اشخاص کے نام لیے جاتے ہیں ، ان کی تجاویز کو ہم نے صفحات گذشتہ میں نقل کیا ہے ، ان میں سے کسی میں بھی یہ تینوں اجزا نہیں پائے جاتے ۔ ان میں صرف ایک جز یعنی مسلمانوں کی علیحدگی کا ذکر مشترک ہے ۔ کچھ اشخاص نے تو صرف جداگانہ قومیت کا ذکر کیا ہے اور بعضوں نے اس سے ایک قدم آگے بڑھ کر مسلمانوں کے علیحدہ صوبوں یا وطن (Home Land) یعنی ان کی علیحدہ بود و باش کا ذکر کیا ہے مگر ان میں سے کسی نے بھی آزاد مسلم مملکت کے قیام اور پھر اس کے مقصد اعلیٰ یعنی اسلام کے اجتماعی نظام کو بر روئے کار لانے کا اعلان نہیں کیا ! ہاں اقبال کے تصور میں یہ تینوں اجزاء واضح طور پر پائے جاتے ہیں ۔ انھوں نے اپنی تقاریر ، بیانات اور خطبات میں (۱) تقسیم ہند (۲) مسلم مملکت کے قیام ، اور (۳) اجزائے قوانین دینی و احیائے نظام اسلامی کا غیر مبہم الفاظ میں اعلان کیا ! ! ــــــ اس لحاظ سے اولیت کا سہرا ، ان ہی کے سر باندھا جانا چاہیے ۔

یہ حقیقت ہے کہ علامہ اقبال ہی نے سب سے پہلے ۱۹۳۰ع میں برصغیر کے شمال مغربی حصہ میں مسلم مملکت قائم کرنے کا تصور پیش کیا۔ ۱۹۳۱ع میں انھوں نے اس کا نام "پاکستان" رکھا۔ ۱۹۳۷ع میں انھوں نے بنگال کو بھی اپنی اس اسکیم میں شامل کر لیا[۷۲]۔ اور اس کے اغراض و مقاصد کا بھی واضح الفاظ میں اعلان کیا۔ اسی لحاظ سے وہی اس برصغیر کے پہلے مسلمان ہیں، جنھوں نے پاکستان کا تصور، اس کے مالہٗ و ماعلیہ اور عواقب و نتائج پر غور کرنے کے بعد، ہندوستان کے پیچیدہ سیاسی مسئلہ کے عملی حل کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔ ڈاکٹر بی۔ آر۔ امبیڈکر، مسٹر کوپ لینڈ اور قائد اعظم محمد علی جناح کو اعتراف ہے کہ علامہ اقبال ہی اس تصور کے پہلے بانی تھے۔

مسلم لیگ کی ۱۹۴۰ع والی قرار داد لاہور کو (جو عرف عام میں قرار داد پاکستان کہلاتی ہے) لفظ بلفظ نقل کرنے کے بعد ڈاکٹر امبیڈکر لکھتا ہے۔

> "اس میں شبہ نہیں کہ یہ قرار داد، اسی اسکیم کو دوبارہ زندہ کرتی ہے جو سر محمد اقبال نے مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقد لکھنو (الف) دسمبر ۱۹۳۰ع کے خطبہ صدارت میں پیش کی تھی"[۷۳]

کوپ لینڈ لکھتا ہے۔

> ۱۹۳۸ع کے موسم بہار تک لیگ کی حکمت عملی منفیانہ تھی۔ لیکن اب ایک نئی حکمت عملی، ایک نیا اصول، مسلمانوں کے دماغوں پر چھا رہا تھا۔ اب مسلمانوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ وہ فرقہ نہیں، ایک قوم ہیں۔ اس لیے ان علاقوں کے مسلمانوں کو

۷۲۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ لاہور ۱۹۴۳ع ص ۲۲

(الف) ڈاکٹر امبیڈکر نے سہواً لکھنو لکھ دیا ہے۔ در اصل الہ آباد ہونا چاہیے تھا، مصنف

۷۳۔ "پاکستان" از ڈاکٹر امبیڈکر، ص ۵

باہم مربوط کرکے ایک یا ایک سے زاید ریاستیں بنائی جائیں ۔ پھر ان کا وفاق ہو ، یہ خیال وہی تھا ، جو سر محمد اقبال نے ۱۹۳۰ع میں پیش کیا تھا[۷۴]"

قائد اعظم محمد علی جناح فرماتے ہیں ۔

"اگرچہ وہ (یعنی علامہ اقبال) ایک بڑے شاعر اور فلسفی تھے ، لیکن وہ کچھ کم عملی سیاست دان نہ تھے ۔ اسلامی تصورات پر یقین محکم اور ایمان کامل رکھتے ہوئے وہ ان چند لوگوں میں سے تھے ، جنھوں نے سب سے پہلے ہندوستان کے شمال مغربی و شمال مشرقی منطقوں میں ، جو مسلمانوں کے تاریخی وطن رہے ہیں ، ایک اسلامی مملکت قائم کرنے کا تخیل پیش کیا تھا[۷۵]"

مندرجہ بالا اقتباسات سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ قرار داد لاہور میں ، پاکستان کا جو تصور پیش کیا گیا تھا ، اس کو ڈاکٹر امبیڈکر، کوپ لینڈ اور قائد اعظم جناح ، کسی اور کی طرف نہیں بلکہ علامہ ہی کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اگر ان ذمہ دار حضرات کی نظر میں اس تصور کا بانی کوئی اور شخص ہوتا تو وہ ضرور اس کا نام لیتے !

تاریخی و تدریجی مراحل | اب ہم مختصراً ان تاریخی مدارج کا ذکر کریں گے ، جن کو طے کرکے علامہ اقبال کی یہ تجویز اگست ۱۹۴۷ع میں ایک ٹھوس حقیقت بن گئی ! ——— ۱۹۳۰ع میں علامہ مرحوم نے جب یہ تجویز پیش کی تھی ، اس وقت اس تجویز پر بڑی لے دے ہوئی ، لیکن بعض سنجیدہ اصحاب فکر و نظر اور خصوصاً بعض نو جوانوں کی توجہ کو اس تجویز نے اپنی طرف جذب کر لیا ۔ علامہ مرحوم ، جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں ، مصلحتاً یہ نہیں چاہتے تھے کہ اس تجویز پر اسی وقت عمل بھی کیا جائے ۔ اسی لیے اس پر انھوں نے زور بھی نہیں دیا تھا لیکن چوھدری رحمت علی

۷۴- "انڈیا : اے ری اسٹیٹ منٹ" مصنفہ کوپ لینڈ ص ۱۸۹

۷۵- "سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح ۔ جلد دوم مرتبہ جمیل الدین احمد ، مطبوعہ لاہور ، ص ۲۳۲

نے ، جو اس تجویز سے پوری طرح متاثر ہو چکے تھے - ۱۹۳۳ء
ایک پمفلٹ "اب یا کبھی نہیں" (Now or Never) لندن میں شائع
جس میں انھوں نے علامہ کی اسکیم ہی کو "پاکستان" کے نام سے رو
کرایا ، اس میں انھوں نے شمال مغربی ہند کے مسلم اکثریت رکھنے
پانچ علاقوں یعنی (۱) پنجاب (۲) افغانیہ یعنی صوبہ سرحد (۳) آ
(۴) سندھ (۵) بلوچستان کو شامل کیا تھا ، لیکن اس اسکیم کی طرف
وقت بھی توجہ نہیں کی گئی - اگست ۱۹۳۴ء میں فرقہ وارانہ فیصلہ
اعلان ہوا اور جون ۱۹۳۵ء میں جدید دستور ہند نے منظوری کے آ
مراحل طے کر لیے - اس دستور میں اور خصوصاً فرقہ وارانہ فیصلہ
مسلمانوں کے اکثر و بیشتر مطالبات کو منظور کر لیا گیا تھا -
دیگر چودہ نکات یا قرار داد دہلی کی روح اس دستور اور فرقہ وارانہ
میں آ چکی تھی - ہم بتا چکے ہیں کہ علامہ اقبال کی نظر میں فرقہ
فیصلہ اور قانون حکومت ہند بابتہ ۱۹۳۵ء صرف اس حد تک قابل
تھے کہ ان میں اصولاً مسلمانوں کی جداگانہ ہستی کو تسلیم کر لیا گیا
گویا ملت اسلامیہ کے کاروان نے ایک ضروری درمیانی منزل کو طے
لیا تھا -

۱۹۳۶ء میں جدید دستور کے تحت تمام صوبوں میں انتخابات ہو
اس سلسلہ میں علامہ اقبال نے مسٹر جناح کی ان کوششوں کی تائید کی
وہ تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع کرنے کے لیے کر رہے
علامہ مرحوم یہ چاہتے تھے کہ دستور جدید اور خصوصاً صوبجاتی خود
کے تحت مسلمانوں میں مرکزیت پیدا کرنے اور ان کے قومی شعور
مستحکم کرنے کے ، جو مواقع حاصل ہو رہے ہیں ، ان سے پوری
فائدہ اٹھایا جائے - اس کے لیے وہ یہ ضروری سمجھتے تھے کہ مسلمان
ایک ہی کل ہند سیاسی جماعت ہو اور اسی جماعت کے ٹکٹ پر منتخب
مسلمان صوبائی اسمبلیوں میں حصہ لیں اور وہاں اس جماعت کی پالیسی پر
پیرا ہوں - اسی لیے انھوں نے پیری اور بیماری کی حالت میں پنجاب
لیگ کی صدارت کے فرائض انجام دیئے -

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ مرحوم یہ سمجھتے تھے کہ صوبائی خود مختاری اور جداگانہ انتخابات کے باعث مسلمانوں کا قومی استحکام عمل میں آئے گا اور اس درمیانی منزل کو طے کرنے کے بعد وہ اپنی حقیقی منزل مقصود تک پہنچنے یعنی آزاد اسلامی مملکت قائم کرنے کے قابل ہو جائیں گے -

۱۹۳۶ء کے انتخابات میں کانگریس کو چھ صوبوں میں نمایاں کامیابی حاصل ہوئی اور ۱۹۳۷ء میں کانگریس نے ان صوبوں کی عنان اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لی - اسی زمانے میں کانگریس اور مسلم لیگ میں زبردست رسہ کشی شروع ہوئی - اس کے دو بنیادی اسباب تھے ، ایک تو یہ کہ کانگریس نے مسلم لیگ کو مسلمانوں کی واحد نمائندہ جماعت تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور رابطہ مسلم عوام کی تحریک شروع کر دی تھی ، اور دوسرے یہ کہ ان چھ صوبجات میں کانگریس نے مشترکہ وزارتیں بنانے سے انکار کر دیا ، اور صرف ان مسلمانوں کو وزارت میں شامل کیا جنھوں نے کانگریس کے عہد نامہ (Pledge) پر دستخط کیے تھے - رابطہ مسلم عوام کی تحریک کا آغاز اور مشترکہ وزارتیں بنانے سے انکار —— کانگریس کی ان دو حکمت ہائے عملی نے مسلم عوام اور قائدین میں اضطراب پیدا کر دیا اور اس اضطراب نے ہندو مسلم اتحاد کے تابوت میں آخری کھیل ٹھونک دی - علامہ اقبال نے محسوس کیا کہ اب لوہا گرم ہو چکا ہے ، اور یہی وقت ہے جب کہ اس پر ضرب لگانی چاہئے - قوم اور قائدین قوم مایوسی کے اندھیرے میں گھر چکے تھے - اس موقع پر علامہ اقبال نے امید کی شمع جلائی اور انھوں نے مئی و جون ۱۹۳۷ء میں مسٹر محمد علی جناح کو ، جو آئندہ چل کر مسلمانوں کے قائد اعظم بننے والے تھے ، دستور ہند کے وفاق جزو کی مضرتوں کی طرف توجہ دلائی اور مسلمانوں کی منزل مقصود کی طرف بار بار متوجہ کیا -

اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ نے اپنے اجلاس خصوصی منعقدہ کراچی میں دستور حکومت ہند بابتہ سنہ ۱۹۳۵ء کے وفاق جزو کی مخالفت

کی[۷۶] - اور سنہ ۱۹۳۸ء کے سالانہ اجلاس پٹنہ میں متبادل دستوری اسکیم تیار کرنے کی قرارداد منظور کی[۷۷] - اس کے بعد آلینی سب کمیٹی منعقدہ لاہور میں ایک تفصیلی اسکیم مرتب کرنے کا کام ڈاکٹر سید عبداللطیف کے سپرد ہوا - سنہ ۱۹۳۹ء میں لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے ڈاکٹر عبداللطیف نواب صاحب ممدوٹ ، سر سکندر حیات خاں وزیر اعظم پنجاب ، ڈاکٹر سید ظفرالحسن صاحب صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی ، ڈاکٹر افضال حسین قادری ، استاد شعبہ جغرافیہ مسلم یونیورسٹی نے مختلف اسکیمیں پیش کیں - یہ اسکیمیں تفصیلات کے لحاظ سے گو ایک دوسرے سے مختلف ہیں لیکن ان سب میں مشترکہ طور پر علامہ مرحوم ہی کا تصور یعنی برصغیر ہند کے اندر ایک اسلامی ہند کا تخیل کارفرما تھا - ان میں ڈاکٹر عبداللطیف اور سر سکندر کی تجاویز اہم تھیں - ڈاکٹر سید عبداللطیف صاحب نے ہندوستان کو مختلف تہذیبی حلقوں (Cultural Zones) میں تقسیم کیا تھا - اور ان حلقوں کے لئے ایک عہدیہ (Confederacy) کی تجویز پیش کی تھی[۷۸] - سر سکندر نے تمام صوبوں اور ریاستوں کو سات خطوں (Regions) میں تقسیم کیا تھا - ان میں سے دو خطے یعنی شمال مشرق و شمال مغرب کے خطے ، مسلم اکثریت کے خطے تھے اور بقیہ پانچ خطے ہندو اکثریت کے تھے - ہر خطہ کو ایک وفاق قرار دیا گیا تھا اور صوبوں کے لئے خود مختار حکومت تجویز کی گئی تھی - پھر ان سب خطوں کے لئے ایک مرکز تجویز کیا گیا تھا - یہ مرکز دراصل ایک ایجنسی مرکز تھا - امور خارجہ ، دفاع ، محاصل ، درآمد و برآمد اور سکہ کے معاملات اس مرکز کے سپرد کئے گئے تھے - گویا مرکز کو دراصل ان خطوں کے ایجنٹ کی حیثیت دی گئی تھی ، جو بذات خود کچھ نہیں کر سکتا تھا ، بلکہ صرف ان خطوں

۷۶- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۲۷۹ -

۷۷- فاؤنڈیشنز آف پاکستان ، از پیرزادہ شریف الدین جلد دوم ص ۳۲۱ قرارداد نمبر ۱۰ -

۷۸- دی کلچرل فیوچر آف انڈیا از ڈاکٹر سید عبداللطیف مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا پریس بمبئی سنہ ۱۹۳۸ء -

کی مرضی کو بروئے کار لا سکتا تھا[۷۹] ۔ یہ دراصل وفاق اور عہدیہ کی ایک درمیانی صورت تھی ۔ سنہ ۱۹۴۰ع میں چودھری رحمت علی نے اپنے منصوبے کا دوسرا حصہ بنگستان اور عثمانستان کے نام سے شائع کیا[۸۰] ۔ اس میں انھوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ آسام اور بنگال کو ملا کر ایک مسلم مملکت قائم کی جائے اور اس کا نام بنگستان یا بانگ اسلام ہو اور حیدر آباد دکن کی ریاست آصفیہ کو انھوں نے اس وقت کے فرمانروا میر عثمان علی خان کے نام سے منسوب کرکے ایک آزاد مملکت عثمانستان قرار دینے کی تجویز پیش کی تھی ، گویا سنہ ۱۹۴۰ع میں ان کی تجویز یہ تھی کہ برصغیر میں تین آزاد مسلم مملکتیں —— (۱) پاکستان (۲) بنگستان (۳) عثمانستان —— ہوں ۔

ان مختلف اسکیموں پر مارچ سنہ ۱۹۴۰ع تک اصحاب فکر و نظر غور کرتے رہے ۔ بالآخر ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ع کا وہ تاریخی دن آ ہی گیا ، جب مسلم لیگ نے لاہور کے معرکۃ الآرا سالانہ اجلاس میں اپنی مشہور و معروف قرارداد کے ذریعہ علامہ اقبال کی تجویز کو مسلمانان ہند کا نصب العین قرار دے دیا ۔ اس قرارداد کا متن حسب ذیل ہے ۔

" (۱) کل ہند مسلم لیگ کی مجلس شوریٰ (کونسل) اور مجلس عاملہ نے ۲۷ اگست ، ۱۷-۱۸ ستمبر اور ۲۲ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ع اور ۳ فروری سنہ ۱۹۴۰ع کو دستوری مسئلہ سے متعلق منظور شدہ قراردادوں کی متابعت میں ، جو طریق عمل اختیار کیا ، ان کی تصدیق و توثیق کرتے ہوئے کل ہند مسلم لیگ کا یہ اجلاس پر زور طریقہ پر اس امر کا اعادہ کرتا ہے کہ دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ع میں وفاق کی جو اسکیم شامل کی گئی ہے وہ اس

۷۹۔ پنجاب اسمبلی کی رپورٹ جلد نمبر ۱۶ ، ص ۸ مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۱ع ۔

۸۰۔ ملت اینڈ ہرٹن نیشنز (Millat and Herten Nations) از چودھری رحمت علی مطبوعہ ۱۰ جون سنہ ۱۹۴۰ع ص ۳ ۔

ملک کے خاص حالات کا لحاظ کرتے ہوئے یکسر ناموزوں و ناقابل عمل اور مسلم ہندوستان کے لئے بالکلیہ ناقابل قبول ہے۔

(۲) وائسرائے نے بتاریخ ۱۸ اکتوبر سنہ ۱۹۳۸ء ملک معظم کی حکومت کی جانب سے جو اعلان کیا ہے ، اس میں گو یہ یقین آفرینی پائی جاتی ہے کہ قانونِ دستورِ حکومتِ ہند کی بنیاد جس حکمت عملی اور منصوبے پر رکھی گئی ہے ، اس کو ہندوستان کی مختلف جماعتوں ، مفادات اور فرقوں کے باہمی مشورہ سے دوبارہ زیر غور لایا جائے گا ، تاہم یہ اجلاس اپنی مستحکم رائے کو ضبط تحریر میں لانا چاہتا ہے کہ مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہ ہو گا ، جب تک کہ پورے کے پورے دستوری منصوبہ پر از سر نو غور نہیں کیا جائے گا اور یہ کہ کوئی نظر ثانی شدہ منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابل قبول نہیں ہو گا ، اگر وہ ان کی توثیق اور رضا مندی سے مرتب نہ کیا جائے۔

(۳) کل ہند مسلم لیگ کے اس سالانہ اجلاس کی یہ غور کردہ رائے ہے کہ کوئی دستوری منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہو گا ، اگر وہ حسب ذیل بنیادی اصولوں پر مبنی نہ ہو ، یعنی یہ کہ

جغرافیائی متصلہ اکائیوں کے ایسے خطے بنائے جائیں —— اور ضرورت ہو تو ان میں علاقہ واری تبدیلیاں کی جا سکتی ہیں —— جن میں مسلمانوں کی عددی اکثریت ہو ، جیسا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی علاقے ہیں ، تاکہ ان خطوں میں ایسی آزاد ریاستیں قائم کی جائیں جن کی اکائیاں خود مختار اور مقتدر ہوں۔

(۴) ان اکائیوں اور خطوں کے دستور میں اقلیتوں کے لئے ان کے مشورہ سے مناسب ، مؤثر ، منشوری تحفظات واضح طور پر مہیا کئے جائیں ، تاکہ ان کے مذہبی ، ثقافتی ، معاشی ، سیاسی ، انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا تحفظ ہو۔ اور اسی طرح

ہندوستان کے دیگر حصوں میں بھی جہاں مسلمان اقلیت میں ہیں ، ان کے مشورہ سے ان کے اور دیگر اقلیتوں کے لئے مناسب ، مؤثر ، منشوری تحفظات واضح طور پر دستور میں رکھے جائیں تاکہ ان کے مذہبی ، ثقافتی ، معاشی ، سیاسی ، انتظامی اور دیگر حقوق کی صیانت ہو۔

(۵) مزید برآں یہ اجلاس مجلس عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق ایک دستوری اسکیم اس خیال کے پیش نظر مرتب کرے کہ ان خطوں کو بالآخر سارے اختیارات مثلاً دفاع ، معاملات خارجہ ، حمل و نقل ، چنگی اور دیگر ایسے ہی ضروری اختیارات حاصل ہوں گے ۔

علامہ اقبال نے کل ہند وفاق کی مخالفت کی تھی[۸۱] ۔ قرارداد لاہور کے پہلے فقرے میں بھی کل ہند وفاق کو ناموزوں اور ناقابل قبول قرار دیا گیا ہے ۔ علامہ مرحوم نے ہندوستان کے شمالی مغربی اور مشرقی منطقوں میں ایک آزاد مقتدر مسلم وفاقی مملکت کے قیام کی تجویز پیش کی تھی[۸۲] ۔ مذکورہ بالا قرارداد کے فقرات نمبر ۳ و نمبر ۵ کو ملا کر پڑھنے سے تقریباً اسی قسم کی مملکت کا تصور پیدا ہوتا ہے —— علامہ اقبال نے جیسا کہ ہم بیان کر چکے ہیں ، اقلیتی صوبوں کے مسلمانوں کے مسئلہ کا یہ حل پیش کیا تھا کہ تہذیبی وحدت کی حیثیت سے انھیں خود مختاری دلائی جائے ۔ اسی تصور کو قرارداد لاہور کے فقرہ نمبر ۴ میں ضبط تحریر میں لانے کی کوشش کی گئی ہے —— ان ہی امور کے پیش نظر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ فی الجملہ اس قرارداد کے ذریعہ مسلم لیگ نے علامہ اقبال ہی کے تخیل کو مسلمانانِ ہند کا نصب العین قرار دیا تھا —— یہ صرف

۸۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ، ناشر المنار اکادمی لاہور طبع دوم ستمبر سنہ ۱۹۴۸ع ص ۱۹ و ۲۱ ۔

۸۲۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۲ ۔

ہمارا ادعا نہیں ہے بلکہ خود قائد اعظم محمد علی جناح ـــــ جن کی قیادت و صدارت میں مسلم لیگ نے یہ قرارداد منظور کی تھی ـــــ معترف ہیں کہ اقبال ہی کا تصور و تخیل اس قرارداد میں جلوہ گر ہے ۔ چنانچہ مسٹر جناح لکھتے ہیں ۔

" ان کے (اقبال) خیالات بنیادی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے . . . . اور کچھ عرصے کے بعد یہی خیالات مسلمانان ہند کی اس متحدہ خواہش کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ۔ جس کا اظہار کل ہند مسلم لیگ کی ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۴۰ع والی منظور شدہ قرارداد لاہور میں کیا گیا تھا جو عام طور پر قرارداد پاکستان کے نام سے موسوم ہے[۸۳] "

ستمبر سنہ ۱۹۳۹ع میں دوسری عالمگیر جنگ کا آغاز ہوا ، برطانوی حکومت نے دوران جنگ ہندوستان کی سیاسی جماعتوں کا تعاون حاصل کرنا چاہا ۔ اس غرض سے سراسٹیفورڈ کرپس اپریل سنہ ۱۹۴۲ع میں ہندوستان آئے اور اپنی تجاویز پیش کیں ۔ ان تجاویز کی ایک اہم خصوصیت یہ تھی کہ انھوں نے ہندوستان کے مختلف صوبہ جات کے لئے ایک " یونین " کے قیام کی سفارش کی تھی اور صوبہ یا صوبوں کے گروپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ وہ چاہیں تو اس یونین سے علیحدہ رہیں ۔ گویا اس تجویز میں اس اصول کو تسلیم کر لیا گیا تھا ، جس پر قرارداد لاہور مبنی تھی ۔

سنہ ۱۹۴۴ع میں کانگریس کے مشہور رہنما مسٹر راج گوپال اچاری نے قائد اعظم محمد علی جناح کی خدمت میں اپنا مشہور فارمولا روانہ کیا ۔ جس میں حق خود ارادیت (Right of self determination) کی بنیاد پر ہندوستان کے مختلف علاقوں کی علیحدگی کو تسلیم کیا گیا تھا ۔ اسی فارمولے کی بناء پر قائد اعظم محمد علی جناح اور مہاتما گاندھی میں گفتگوئے مفاہمت ہوئی ۔ لیکن مہاتما گاندھی نے دو قومی نظریہ کو ماننے سے انکار

۸۳- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ۔ ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۴ و ۵ ۔

کر دیا ۔ اسی لئے یہ گفتگو ناکام ہو گئی ۔

اس گفتگو کی ناکامی کے بعد کانگریس نے قرارداد لاہور کی مخالفت میں اپنا پورا زور صرف کرنا شروع کر دیا ـــــ اور مسلم لیگ نے پاکستان کو اپنا عقیدہ بنا لیا ۔ سنہ ۱۹۴۶ع تک دونوں میں بڑے زور شور سے کشمکش ہوتی رہی ۔ مارچ سنہ ۱۹۴۶ع میں برطانوی حکومت نے ہندوستان کے دستوری مسئلہ کو سلجھانے کے لئے اپنا ایک وفد روانہ کیا ، جو برطانوی کابینہ کے ممتاز اراکین پر مشتمل تھا ۔ کابینی وفد نے ہندوستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو شملہ کانفرنس میں جمع ہونے کی دعوت دی ۔ اس کانفرنس میں کانگریس و مسلم لیگ نے شرکت کی اور وزیر ہند کے فارمولے پر غور کیا ۔ فارمولا یہ تھا ۔

" ہندوستان کے مختلف صوبوں کے دو گروپ ہوں گے ۔ ایک گروپ میں ایسے صوبے ہوں گے جن کی بیشتر آبادی ہندو ہے اور دوسرے گروپ میں وہ صوبے ہوں گے جن کی بیشتر آبادی مسلمان ہے اور ان دو گروپوں کی ایک یونین بنائی جائے گی ۔ جس کے سپرد امور خارجہ ، دفاع اور مواصلات ہوں گے[۸۳] "

اس کانفرنس میں کئی دن تک بحث مباحثے ہوتے رہے ۔ بالآخر قائد اعظم محمد علی جناح سے خواہش کی گئی کہ وہ تحریری طور پر اپنے مطالبات روانہ کریں ۔ چنانچہ بتاریخ ۱۲ مئی سنہ ۱۹۴۶ع مسلم لیگ کی جانب سے قائد اعظم نے اپنی تجاویز کابینی وفد اور کانگریس کے پاس روانہ کر دیں ۔ ان تجاویز میں پنجاب ، سرحد ، بلوچستان ، سندھ ، بنگال اور آسام کو ملا کر ایک گروپ بنایا گیا تھا ۔ یہ گویا پاکستان گروپ تھا ۔ بقیہ صوبوں کو ہندوستان کا نام دیا گیا تھا ۔ اور ان دونوں گروپوں کے لئے دو علیحدہ وفاق تجویز کئے گئے تھے ۔ پھر ان دو وفاقوں کے لئے ایک یونین کی تجویز پیش کی گئی تھی جس میں دونوں وفاقوں کی مساوی نمائندگی کا مطالبہ کیا گیا تھا اور امور خارجہ ، دفاع اور مواصلات متعلقہ دفاع کی

۸۳۔ " انڈیا : اے ری اسٹیٹ منٹ " از کوپ لینڈ ص ۲۹۳ ۔

حد تک اس یونین کے اختیارات محدود کر دیئے گئے تھے ۔ ہر گروپ کو یہ اختیار دیا گیا تھا کہ دس سال کے بعد وہ چاہے تو یونین سے علیحدہ ہو سکتا ہے ۔ یہ دراصل عہدیہ (Confederacy) کی اسکیم تھی کانگریس نے اِن تجاویز کو ماننے سے انکار کر دیا اور اس کے برعکس مرکز میں طاقتور وفاقی حکومت کے قیام کی تجویز پیش کی تھی ، جس کے سپرد امور خارجہ ، دفاع ، زر ، درآمد برآمد اور دیگر ایسے ہی معاملات ہوں اور صوبوں کے مختلف گروپ بنانے کی سختی سے مخالفت کی ۔ کابینی وفد نے اپنی جانب سے ایک علیحدہ اسکیم پیش کی ، جس میں ہندوستان کو تین خطوں الف ۔ ب ۔ ج میں تقسیم کیا گیا تھا ۔ پھر ان خطوں اور دیسی ریاستوں کو ملا کر ایک یونین بنانے کی تجویز پیش کی گئی ، جس کے سپرد امور خارجہ ، دفاع اور مواصلات کئے گئے تھے ۔ لیکن کانگریس و مسلم لیگ دونوں نے اس اسکیم کو رد کر دیا ۔

جون سنہ ۱۹۴۷ع میں لارڈ ماؤنٹ بیٹن ، وائسرائے ہند نے ایک اور اسکیم پیش کی ، جس پر بالآخر کانگریس اور مسلم لیگ دونوں نے اتفاق کر لیا اور اسی اسکیم کے مطابق بتاریخ ۱۴ اگست سنہ ۱۹۴۷ع پاکستان کا قیام عمل میں آیا ۔

الغرض قانونِ دستورِ ہند سنہ ۱۹۳۵ع کی عملاً ناکامی کے بعد سے ہندوستان کی سیاست کا محور علامہ اقبال کی تجویز بنی رہی ۔ اور مسلمانوں کی عملی و فکری سیاست میں اسی تصور کی روح اپنا کام کرتی رہی ۔ ڈاکٹر سید عبداللطیف کی اسکیم ، سر سکندر کی تجویز اور اصحاب علی گڑھ کی اسکیمیں ، مسلم لیگ کی قرارداد لاہور ، سر اسٹیفورڈ کرپس کی سفارشات ، راجہ جی اور وزیر ہند کا فارمولا ، قائد اعظم کی ۱۲ مئی سنہ ۱۹۴۶ع والی تجاویز ، کابینی وفد اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے منصوبے —— یہ سب علامہ مرحوم کے اس تصور کے اطراف گھومتے ہوئے نظر آتے ہیں ۔ فرق صرف اس تصور سے قرب و بُعد کا ہے ۔

بخوفِ طوالت ہم یہاں تفصیل سے ان تمام نقاط اشتراک و اختلاف پر روشنی نہیں ڈالیں گے ، جو ان مختلف دستوری منصوبوں اور علامہ اقبال کی

تجویز کے مابین پائے جاتے ہیں ۔ تاہم اس موقع پر بعض اہم اور دلچسپ نقاط کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے ۔

یہ تمام تجاویز اس امر میں مشترک تھیں کہ ہندوستان کے دستوری سیاسی مسئلہ کا حل مرکزیت میں نہیں ، مرکز گریزی بلکہ ایک حد تک لامرکزیت (Decentralization) میں ہے ۔ علامہ اقبال کے سیاسی تفکر اور ان کی اسلامی ہند والی تجویز کا دستوری محور بھی یہی تخیل ہے ۔ یہ گویا اقبال کے تصور پاکستان اور ان تمام تجاویز کا قدر مشترک ہے ، لیکن ان کے مابین جو نقطہ اختلاف تھا وہ بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہے ۔ یہ نقطہ اختلاف دراصل ہندوستان کے مسئلہ کو حل کرنے کے انداز کا اختلاف ہے ۔

مسئلہ ہند کے حل کا اقبالی انداز ہندوستان کے دستوری مسئلہ کو حل کرنے کے لئے اقبال کے علاوہ جن اشخاص نے یہ مختلف منصوبے پیش کئے تھے ، انھیں ہم تین گروہوں میں تقسیم کر سکتے ہیں (۱) برطانوی حکومت (۲) ہندو اکثریت یا کانگریس (۳) مسلمان ـــــ ان تینوں مکاتیب خیال کی اس مسئلہ سے متعلق رسائی (Approach) کا انداز محدود اور خالص سیاسی ہے ۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ اس مسئلہ کو اس کے وسیع پس منظر میں حقیقی تناسبِ نظر سے نہیں دیکھ رہے تھے اور وہ صرف ہندوستان کے محض ایک دستوری مسئلہ کو سیاسی تطابقات (Political adjustment) ادھوری تدابیر (Half-Measures) اور پیوند کاری (Patch-Work) کے ذریعہ حل کرنا چاہتے تھے ـــــ !

برطانوی حکومت کی جانب سے جو تجاویز وقتاً فوقتاً پیش کی گئیں ، ان میں یہ نقطۂ نظر کارفرما تھا کہ ہندوستان کے مختلف طبقے ، فرقے اور سیاسی جماعتیں جدا جدا سیاسی مفادات رکھتی ہیں ۔ اس لئے ایسی تجاویز پیش کی گئیں ، جن پر ان سب کا زیادہ سے زیادہ تعاون حاصل ہو سکے ۔

ہندو اکثریت یا کانگریس کے ترقی پسند و حقیقت شناس اہل فکر و نظر کی جانب سے جو فارمولے پیش کئے گئے یا جو مذاکرات ہوئے ، ان میں مسلمانوں کی دلجوئی (Appeasement) یا ان کو بعض مراعات

(Concessions) دینے کی ذہنیت نمایاں تھی - یہ بھی گویا سیاسی تطابق (Political adjustment) کی ایک صورت تھی - اس مکتبِ خیال نے اپنے اس تطابق کی بنیاد جس سیاسی مسئلہ پر رکھی ، وہ یہ تھا کہ ہندوستان کے ہر جغرافیائی علاقے کو حق خود ارادیت (Right of self determination) حاصل ہے - اگر بعض جغرافیائی علاقے کل ہند مرکز کے ماتحت یا اس کی راست نگرانی میں رہنا نہیں چاہتے تو ان کی اس خواہش کے برخلاف انھیں مجبور نہیں کیا جا سکتا - راجہ جی کا فارمولا اور گاندھی جی کی مسٹر جناح سے سنہ ۱۹۴۴ع میں مراسلت اور باہمی مذاکرات اسی اصول پر مبنی تھے-

مسلمانوں کے چیدہ اصحاب فکر و نظر اور ماہرینِ نظم و نسق نے جو خاکے پیش کئے تھے وہ بھی سیاسی تطابق کی اس گرد سے پاک نہیں تھے - ڈاکٹر لطیف نے اپنی اسکیم کی بنیاد جغرافیائی خطوں کے بجائے تہذیبی علاقوں پر رکھی تھی - اس لحاظ سے وہ ڈاکٹر اقبال سے اک گونا قریب ہو گئے تھے - لیکن ان کی اس اسکیم میں بھی تحفظات کا وہی قدیم تخیل کام کر رہا تھا جس کے ارد گرد مسلم لیگ کی تحریک گذشتہ تیس سال سے گھوم رہی تھی ، کیونکہ انھوں نے ان علاقوں کی خود مختاری کا مطالبہ کیا تھا ، جہاں مسلمانوں کی ثقافت کے واضح اور نمایاں آثار پائے جاتے تھے ، مثلاً شمال مغربی ہند میں پنجاب ، سندھ ، بلوچستان اور سرحد اور شمال مشرقی ہند میں بنگال و آسام اور جنوبی ہند میں حیدر آباد دکن اور وسط ہند میں دہلی اور اجمیر ——— یہ گویا ثقافتی بنیاد پر سیاسی تطابق کو حاصل کرنے کی ایک کوشش تھی - سر سکندر کی اسکیم بھی سیاسی تطابق کی ہی ایک شکل تھی ، انھوں نے ایک ماہر نظم و نسق کی حیثیت سے انتظامی مشینری کے ذریعہ سیاسی تطابق حاصل کرنے کی سعی کی تھی -

بہرحال برطانوی حکومت کی تجاویز ، کانگریس کے فارمولے اور مسلم اصحاب فکر کے منصوبے ——— ان سب میں محدود سیاسی نقطہ نظر نمایاں طور پر جھلکتا ہے ——— لیکن اس مسئلہ کے تعلق سے علامہ اقبال کی رسائی (Approach) کا انداز ان سب سے جداگانہ تھا - اور یہ انداز کسی تنگ نظری (Narrow Vision) اور سیاسی تطابق کا آفریدہ نہ تھا - انھوں

نے اس مسئلہ کو صرف ہندوستان کے محض ایک دستوری و سیاسی مسئلہ کی حیثیت نہیں دی تھی اور اسی لئے اس کا حل تطابقات میں تلاش نہیں کیا ۔ ان کے نزدیک اس مسئلہ کی اہمیت و نوعیت صرف اتنی ہی نہ تھی کہ وہ مسلمانوں کا ایک سیاسی مسئلہ تھا اور اسی لئے ثقافتی یا انتظامی بنیاد پر سیاسی تطابق کے کسی فارمولے کو انھوں نے جزو دستور بنانے کی کوشش نہیں کی ۔ بالفاظ دیگر ان کی رسائی کا انداز سیاسی ، دستوری ، انتظامی یا جدید یورپی اصطلاح میں قومی نہ تھا بلکہ خالص " انسانی " تھا —— ! !

—— ایک مرتبہ ان صفحات پر غائر نظر ڈال لیجئے جہاں ہم نے ان کے سیاسی فلسفہ کی تشریح کی ہے ۔ آپ خود محسوس کریں گے کہ اس مسئلہ کے متعلق ان کی رسائی کچھ اس انداز کی تھی ۔

اسلام صرف ایک مذہب (Religion) نہیں بلکہ ایک دین ، ایک ضابطہ حیات ایک نظام زندگی (System of Life) ہے ۔ دنیا میں اسلام کے سوا جتنے اجتماعی و عمرانی نظام (Social Systems) ظہور میں آئے یا اس وقت پائے جاتے ہیں ، ان میں سے ہر ایک یا تو نسل و وطن یا رنگ و زبان یا پھر گروہ و جماعت کی آلائشوں میں ملوث ہے ۔ اسلام اور صرف اسلام ہی ایک ایسا دین ہے ، جو ان گندگیوں سے پاک اور منزہ ہے ۔ اس کا مقصد کسی خاص نسل ، وطن ، رنگ ، گروہ یا جماعت کی خدمت گذاری نہیں بلکہ پوری بنی نوع انسان کی فلاح عامہ اور ساری انسانیت کی سر بلندی ہے —— اس دین کا اقتضا اور انسانیت کی فلاح عامہ کا مطالبہ یہ ہے کہ اس کو عملاً پوری دنیا میں جاری و ساری کیا جائے ، غالب و حکمران بنایا جائے —— موجودہ دنیا نے ابھی تک اس امر کا احساس نہیں کیا ہے کہ اس کے درد کا درمان یہی ہے ۔ وہ مختلف ازمز (Isms) کی راہ ضلال ، ٹیڑھے راستوں اور پرپیچ پگڈنڈیوں پر سے گزرتے ہوئے اس جوالا مکھی کی طرف غیرشعوری طور پر رواں دواں ہے ، جس کا پھٹ پڑنا یقینی ہے اور وہ صراط مستقیم اور شاہراہ نجات اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گئی ہے جو اس کو اس کی منزل مقصود اور اس کے سرچشمہ حیات و کامرانی تک پورے تحفظ و

تیقن کے ساتھ پہنچاتی ہے -

عالم انسانیت کو اس راہِ ضلال سے ہٹا کر اس صراطِ مستقیم پر ڈال دینے کے لئے محض زبانی تبلیغ و ہدایت ممد و معاون تو ہو سکتی ہے لیکن کافی اور مؤثر نہیں - اس مقصد کے حصول کا مؤثر طریقہ یہ ہے کہ ایک معیاری معاشرہ اور مثالی مملکت اس نظام کی بنیادوں پر تشکیل دی جائے تاکہ موجودہ عالم انسانی کی نظروں کے سامنے اس شاہراہ حیات کا دروازہ باب السلام بن کر وا ہو —— اس معیاری معاشرہ اور اس مثالی مملکت کی تشکیل کے لئے برصغیر کی سر زمین موزوں ہو سکتی ہے اس لئے کہ " ہندوستان ہی دنیا کا سب سے بڑا مسلم ملک ہے[۸۵] "۔ اسلام کا برصغیر ہند پر یہ حق ہے کہ وہ یہاں اپنی مثالی مملکت اور اپنا معیاری معاشرہ قائم کرے اور برصغیر ہند کے یہ شایانِ شان ہے کہ عالم انسانی کے سامنے امن و سلامتی کے اس دروازہ کو کھول کر حیات و نجات کی شاہراہ اس کو دکھا دے —— لیکن اگر حالات و واقعات، تنگ نظری و تنگ دلی رقابتوں اور عصبیتوں کے باعث پورے ہندوستان کو اس سعادت سے محروم رہنا پڑے تو کم از کم اس کے شمال مغربی و مشرق گوشوں ہی کو روشنی کے وہ مینار بنا دیئے جائیں جو بھٹکتی ہوئی انسانیت کو بالآخر اس کی صحیح راہ پر ڈال دیں —— !!

سنہری تقدیر کے روشن نقوش / علامہ اقبال نے دنیائے انسانیت کے اضطراب، عالم اسلام کی کیفیت، مسلمانانِ ہند کی حالت اور ہندوستان کی اجتماعی زندگی کے عناصر کا تجزیہ کیا، اسلام کے حقائق و مقتضیات کا عمیق مطالعہ کیا اور ان کی روح تک رسائی حاصل کرنے کے بعد انہوں نے بتاریخ ۲۹ دسمبر سنہ ۱۹۳۰ع یہ پشین گوئی کی -

" شمال مغربی ہند میں ایک مستحکم و متحدہ مسلم مملکت کی

۸۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور ص ۱۰۳ -

تشکیل ، مسلمانوں ، کم از کم شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کے لئے بالآخر مقدر ہو چکی ہے[۸۶] "

سترہ سال ، چار ماہ ، پندرہ دن کے بعد تقدیر کا یہ لکھا پورا ہوا ۔ اور علامہ مرحوم کی یہ پیشین گوئی قدر کی مبارک رات کو مجسم حقیقت بن گئی ! ! بتاریخ ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ع انہوں نے یہ واضح کیا کہ اس مسلم مملکت میں بنگال بھی شامل ہے[۸۷] ۔

—— یہی نہیں بلکہ ایک معنی میں انہوں نے اس مملکت کے دارالسلطنت کی بھی نشان دہی کر دی تھی ۔ چنانچہ مسلم لیگ کے خطبۂ صدارت سنہ ۱۹۳۰ع میں انہوں نے فرمایا ۔

" کراچی بڑھتے بڑھتے ایک روز لازماً ہندوستان کا دوسرا دارالسلطنت بن جائے گا[۸۸] "

پھر انہوں نے اس زمانے میں مسلمانوں کی صف میں سے اس سیاستدان کو ڈھونڈ نکالا ، جو مسلمانوں کو طوفان بلا سے بچا کر منزل مقصود تک پہنچانے والا تھا اور جس کے ہاتھوں اس اسلامی مملکت کی داغ بیل پڑنے والی تھی ۔ ۲۱ جون سنہ ۱۹۳۷ع کے خط میں وہ مسٹر جناح کو ان الفاظ میں مخاطب کرتے ہیں ۔

" آج ہندوستان میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جس کی جانب مسلم جماعت اس طوفان بلا میں جو شمال مغربی ہندوستان میں اور شاید پورے ہندوستان میں آ رہا ہے ، اپنی محفوظ رہنمائی کے لئے

۸۶۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال ، مرتبہ شاملو، ناشر المنار اکادمی لاہور ، ص ۱۲

۸۷۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۲۲

۸۸۔ مضامین اقبال ، مرتبہ تصدق حسین تاج ، مطبوعہ احمدیہ پریس ، حیدر آباد دکن ص ۱۳۶ ۔

دیکھنے کا حق رکھتی ہے[۸۹]"

یہ وہ زمانہ ہے جب کہ پنجاب اور بنگال ، سرحد اور سندھ نے مسٹر محمد علی جناح کی قیادت کو تسلیم نہیں کیا تھا ، اور لیگ کا اثر و نفوذ جو کچھ تھا ، صرف اقلیتی صوبوں ہی میں تھا ۔ جناح صرف "مسٹر" ہی تھے۔ ابھی قائد اعظم نہیں بنے تھے ۔ لیکن اقبال کی نگاہِ مردم شناس نے دس سال قبل اس " مسٹر" میں اس " قائد " کو دیکھ لیا تھا ، جو مسلمانوں اور خصوصاً شمال مغربی ہند کے مسلمانوں کو طوفان بلا سے بچانے والا تھا ——— !

حوالہ جات باب ۱۱

۱۔ اقبال کی شاعری از عبدالمالک آروی ص ۳۲۰

۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۰

۳۔ ایضاً ص ۱۶۶ ۴۔ ایضاً ص ۲۱۱

۵۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل از طفیل احمد منگلوری ص ۶۳۰

۶۔ مضامینِ اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۶۶

۷۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۷

۸۔ ایضاً ص ۱۳ ۹۔ ایضاً ص ۳

۱۰۔ اخبار مرہٹہ ۲ فروری سنہ ۱۹۳۰ع بحوالہ سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۱۹۰

۱۱۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳

۸۹۔ لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ، ناشر شیخ محمد اشرف لاہور ، مطبوعہ سنہ ۱۹۴۳ع ص ۱۹ -

۱۲- اخبار زمیندار مورخہ ۲۱ نومبر سنہ ۱۹۲۶
۱۳- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۷
۱۴- حیات جاوید از مولانا الطاف حسین حالی طبع ثانی ص ۴۹
۱۵- دی میکنگ آف پاکستان (The Making of Pakistan) از رچرڈ سائمنڈز (Richard Symonds) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ع ص ۳۱ اور " پاکستان منزل بمنزل " از پیرزادہ شریف الدین ص ۶۷
۱۶- پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۲۷
۱۷- آئیڈیاز ابوٹ انڈیا (Ideas about India) از بلنٹ ص ۸۹ بحوالہ پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۶۳
۱۸- آئیڈیاز ابوٹ انڈیا (Ideas about India) از بلنٹ ص ۱۶۳ بحوالہ پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۴۷
۱۹- " صحافت پاکستان و ہند میں " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۲۷۰ و ۲۷۱ اور " کاروانِ صحافت " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۶۶
۲۰- " صحافت پاکستان و ہند میں " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۲۷۱ و " کاروانِ صحافت " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۶۷
۲۱- "صحافت پاکستان و ہند میں" از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۲۷۱ و " کاروانِ صحافت " از ڈاکٹر عبدالسلام خورشید ص ۶۷
۲۲- " ہندوستان میں شہنشاہی حکومت " از تھیوڈور ماریسن ص ۴
۲۳- اخبار کامریڈ مورخہ ۱۰ مئی سنہ ۱۹۱۳ع جلد ۵ شمارہ ۳۸ بحوالہ پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۱۱
۲۴- پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۱۴
۲۵- ایضاً ص ۱۱۷ و ۱۱۸ ۲۶- ایضاً ص ۱۱۷
۲۷- مسلم کمیونٹی آف انڈو پاکستان سب کنٹیننٹ (Muslim Community of Indo Pakistan Sub-Continent) از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی ص ۲۹۵ و " برعظیم پاک و ہند کی ملت اسلامیہ " از ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مترجمہ ہلال احمد زبیری ناشر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی سنہ ۱۹۶۷ع ص ۳۸۴

۲۸- " این اوپن لیٹر ٹو مہاتما گاندھی" (An Open Letter to Mahatma Gandhi) شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۷۰ع ص VI و XIII
۲۹- ایضاً ص XIV
۳۰- ایضاً ص XIV
۳۱- ایضاً ص ۵۸
۳۲- ایضاً ص ۵۹
۳۳- ایضاً ص ۵۹ تا ۶۱
۳۴- " پاتھ وے ٹو پاکستان " از چودھری خلیق الزماں ص ۲۳۸
۳۵- " شاہراہِ پاکستان " از چودھری خلیق الزماں ص ۸۰۱
۳۶- ایضاً ص ۸۰۱
۳۷- کانگریس کی تواریخ (ہسٹری آف دی کانگریس) از ڈاکٹر پتابھی سیتا راميا ص ۴۱۶ و ۴۱۷
۳۸- سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۱۷۰
۳۹- " فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری " از عظیم حسین ص ۴۴۲
۴۰- حیات جاوید از مولانا الطاف حسین حالی ص ۴۹
۴۱- صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی کی رپورٹ بابتہ سنہ ۱۹۲۴ع ص ۱۲۲ و ۱۲۳
۴۲- پاکستان از چودھری رحمت علی ص ۲۱۶ بحوالہ پاکستان منزل بمنزل از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۲۳
۴۳- انڈیا ونس فریڈم (India Wins Freedom) از مولانا ابوالکلام آزاد ص ۱۰
۴۴- اخبار ہمدرد مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۹۲۶ع
۴۵- " محمد علی جناح : اے پولیٹیکل اسٹڈی " از مطلوب الحسن سید ص ۲۲۷
۴۶- ایضاً ص ۲۲۸
۴۷- ایضاً ص ۲۳۰
۴۸- ایضاً ص ۲۲۸
۴۹- ایضاً ص ۲۳۰
۵۰- اخبار ہمدرد مورخہ ۳ نومبر سنہ ۱۹۲۶ع
۵۱- پاکستان ٹائمز مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۶۲ع بحوالہ " پاکستان منزل بمنزل " از پیرزادہ شریف الدین ص ۱۵۱

۵۲۔ "Now or Never" از چودھری رحمت علی ص ۵
۵۳۔ ایضاً ص ۹
۵۴۔ " روز گار فقیر " جلد اول از فقیر سید وحید الدین ص ۱۲۵
۵۵۔ " سفرنامۂ اقبال " از محمد حمزہ فاروقی ص ۵۰
۵۶۔ " تاثرات و تصورات " از عبدالوحید خاں ص ۶۱ و ۶۲ اور اخبار نوائے وقت لاہور مورخہ ۱۲ ستمبر سنہ ۱۹۴۹ع
۵۷۔ " پاکستان " (Pakistan) از چودھری رحمت علی ص ۲۲۴ و ۲۲۵
۵۸۔ " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " ص ۱۸
۵۹۔ " تاثرات و تصورات " از عبدالوحید خاں ص ۶۲
۶۰۔ روز نامہ " جنگ " کراچی مورخہ ۲۳ مارچ سنہ ۱۹۷۱ع
۶۱۔ پاتھ وے ٹو پاکستان از چودھری خلیق الزماں ص ۲۳۸
۶۲۔ اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۳ و ۵ و ۸
۶۳۔ ایضاً ص ۳۸
۶۴۔ ایضاً ص ۱ و ۲
۶۵۔ ایضاً ص ۱۲۰
۶۶۔ ایضاً ص ۹
۶۷۔ ایضاً ص ۷
۶۸۔ ایضاً ۲۲۵
۶۹۔ ایضاً ص ۲۳۵
۷۰۔ ایضاً ص ۱۳
۷۱۔ ایضاً ص ۳۵
۷۲۔ " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " ص ۲۲
۷۳۔ " پاکستان " (Pakistan or Partition of India) از ڈاکٹر امبیڈکر ص ۵
۷۴۔ انڈیا : اے ری اسٹیٹ منٹ مصنفہ کوپ لینڈ ص ۱۸۹
۷۵۔ " سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف مسٹر جناح " جلد دوم مرتبہ جمیل الدین احمد ص ۲۳۲
۷۶۔ سیاست ملیہ از محمد امین زبیری ص ۲۷۹
۷۷۔ فاؤنڈیشنز آف پاکستان از پیرزادہ شریف الدین جلد دوم ص ۳۲۱ قرارداد نمبر ۱۰
۷۸۔ "دی کلچرل فیوچر آف انڈیا " از ڈاکٹر سید عبداللطیف مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا پریس بمبئی سنہ ۱۹۳۸ع

۷۹- پنجاب اسمبلی کی رپورٹ جلد نمبر ۱۶ ص ۸ مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۳۱ء
۸۰- ملت اینڈ ہرٹن نیشنز (Millat and Herten Nations) از چودھری رحمت علی ص ۳
۸۱- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۹ و ۱۴
۸۲- " لیٹرز آف اقبال ٹو جناح " ص ۲۲
۸۳- ایضاً ص ۴ و ۵
۸۴- " انڈیا : اے ری اسٹیٹ منٹ از کوپ لینڈ ص ۲۹۳
۸۵- اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو ص ۱۳
۸۶- ایضاً ص ۱۲
۸۷- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۲۲
۸۸- مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج ص ۱۳۶
۸۹- لیٹرز آف اقبال ٹو جناح ص ۱۹

کتابیات

کتابیں ، مقالات ، خطبات و مضامین

اقبال ، سر محمد :

بانگِ درا ، طبع ہشتم جون سنہ ۱۹۴۳ء مطبوعہ لاہور

اسرار و رموز (مثنوی) یعنی اسرارِ خودی و رموزِ بے خودی اشاعت چہارم و پنجم سنہ ۱۹۴۰ء مطبوعہ لاہور

بالِ جبریل ، طبع چہارم جون سنہ ۱۹۴۴ء مطبوعہ لاہور

ضرب کلیم ، اشاعت اول مطبوعہ لاہور

جاوید نامہ ، طبع سوم سنہ ۱۹۵۴ء مطبوعہ لاہور

پیام مشرق ، طبع ہفتم سنہ ۱۹۴۸ء مطبوعہ لاہور

زبور عجم ، طبع دوم اپریل سنہ ۱۹۴۴ء مطبوعہ لاہور

پس چہ باید کرد اے اقوامِ مشرق معہ مسافر مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۳۶ء

ارمغانِ حجاز ، طبع دوم اگست سنہ ۱۹۴۴ء مطبوعہ لاہور

کلیات اقبال مرتبہ محمد عبدالرزاق مطبوعہ حیدر آباد دکن ستمبر سنہ ۱۹۲۴ء

رختِ سفر (شاعرِ مشرق کا غیر مدون کلام) مرتبہ محمد انور حارث نقش اول جنوری سنہ ۱۹۵۲ء مطبوعہ کراچی

اسپیچس اینڈ اسٹیٹ منٹس آف اقبال مرتبہ شاملو طبع ثانی ستمبر سنہ ۱۹۴۸ء ناشر المنار اکادمی لاہور

مضامین اقبال مرتبہ تصدق حسین تاج مطبوعہ احمدیہ پریس چار مینار حیدر آباد دکن ۱۳۶۲ھ

مکاتیب اقبال (اقبال نامہ) حصہ اول مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور

مکاتیب اقبال (اقبال نامہ) حصہ دوم مرتبہ شیخ عطاء اللہ مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۵۱ع
مکتوباتِ اقبال مرتبہ سید نذیر نیازی مطبوعہ سنہ ۱۹۵۷ع
لیٹرز آف اقبال ٹو جناح (انگریزی) مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۳ع
لیٹرز اینڈ رائٹنگس آف اقبال مرتبہ بی ۔ اے ڈار ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۷ع
ری کنسٹرکشن آف ریلیجیس تھاٹ اِن اسلام مطبوعہ لاہور اپریل سنہ ۱۹۲۸ع
گفتار اقبال مرتبہ محمد رفیق افضل ناشر ادارۂ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۶۹ع
مقالات اقبال مرتبہ سید عبدالواحد معینی مطبوعہ اشرف پریس لاہور سنہ ۱۹۶۳ع
شاد اقبال مرتبہ ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور مطبوعہ حیدر آباد دکن ۔

ابوالحسن علی ندوی ، مولانا :

نقوش اقبال شائع کردہ مجلس نشریاتِ اسلام کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۷۳ع

ابوالکلام آزاد ، مولانا :

انڈیا ونس فریڈم (India Wins Freedom) مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۵۹ع

اشتیاق حسین قریشی ، ڈاکٹر :

مسلم کمیونٹی آف انڈو پاکستان سب کنٹیننٹ (Muslim Community of Indo-Pakistan Sub-Continent) " برعظیم پاک و ہند کی ملتِ اسلامیہ " مترجمہ بلال احمد زبیری ناشر شعبۂ تصنیف و تالیف و ترجمہ کراچی یونیورسٹی سنہ ۱۹۶۷ع

الطاف حسین حالی ، مولانا :

حیاتِ جاوید ، طبع ثانی مطبوعہ دسمبر سنہ ۱۹۰۲ع

امبیڈکر ، بی - آر ، ڈاکٹر :

پاکستان آر پارٹیشن آف انڈیا (Pakistan or Partition of India) مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ء و پہلا پاکستانی ایڈیشن مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ء

امین محمد ، زبیری :

" سیاست ملیہ " مطبوعہ آگرہ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

بلنٹ ولفرڈ سکاون :

آئیڈیاز ابوٹ انڈیا (Ideas about India)

پتابھی سیتا رامیا ، ڈاکٹر :

" کانگریس کی تواریخ " (History of the Congress) مطبوعہ سنہ ۱۹۳۵ء

تھامسن ایڈورڈ ، پروفیسر :

ایتھیکل آئیڈیاس ان انڈیا (Ethical Ideals in India) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۲ء

انلسٹ انڈیا فار فریڈم (Enlist India for Freedom) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۴۰

جواہر لال نہرو :

" میری کہانی " حصہ اول مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی

" ڈسکوری آف انڈیا (Discovery of India) مطبوعہ میریڈین بکس لمیٹڈ لندن اشاعت سوم ستمبر سنہ ۱۹۵۱ء

جان برائٹ ، رائٹ آنریبل ایم - پی :

اسپیچس بائی جان برائٹ (Speeches by John Bright) مرتبہ جیم ، الف ، تھیوز ولڈ روجر مطبوعہ میکملن اینڈ کمپنی لندن و نیو یارک سنہ ۱۸۹۲ء

جناح محمد علی ، قائد اعظم :

سم ریسنٹ اسپیچس اینڈ رائٹنگس آف جناح (Some Recent Speeches and Writings of Jinnah) جلد دوم مرتبہ جمیل الدین احمد مطبوعہ لاہور سنہ ۱۹۴۷ع

چراغ حسن ، حسرت :

" اقبال نامہ "

حمزہ ، محمد ، فاروقی :

" سفرنامہ اقبال " مطبوعہ کراچی سنہ ۱۹۷۳ع

حسن ریاض :

" پاکستان ناگزیر تھا " اشاعت دوم اگست سنہ ۱۹۷۰ع مطبوعہ کراچی

حسین احمد مدنی ، مولانا :

" مکتوبات شیخ الاسلام " جلد سوم مرتبہ نجم الدین اصلاحی ناشر مکتبہ دینیہ دیوبند مطبوعہ اکتوبر سنہ ۱۹۶۴ع

" متحدہ قومیت اور اسلام " طابع و ناشر محمد سمیع اللہ قاسمی مالک کتب خانہ عزیزیہ اردو بازار جامع مسجد دہلی

" نقش حیات " جلد دوم (مولانا حسین احمد مدنی کی خود نوشت سوانح حیات) مطبوعہ نیشنل پرنٹنگ پریس دیوبند اپریل سنہ ۱۹۵۴ع

خلیق الزماں ، چودھری :

" شاہراہ پاکستان " اشاعت اول اکتوبر سنہ ۱۹۶۷ع مطبوعہ کراچی

پاتھ وے ٹو پاکستان (Path way to Pakistan) ناشر لانگ منس پاکستان مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ع

رحمت علی ، چودھری :

"Now or Never" اشاعت ثانی مطبوعہ کیمبرج سنہ ۱۹۳۴ع

"Pakistan" مطبوعہ سنہ ۱۹۴۷ع
"Millat and Herten Nations" مطبوعہ ۱۰ جون سنہ ۱۹۴۴ع

راجندر پرشاد ، ڈاکٹر :
" ہندوستان کا مستقبل "

رئیس احمد جعفری :
" سیرت محمد علی " ناشر مکتبہ جامعہ ملیہ دہلی مطبوعہ سنہ ۱۹۳۱ع

سائمنڈز رچرڈ :
" دی میکنگ آف پاکستان " (The Making of Pakistan) مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۵۰ع

سچدانند سنہا ، ڈاکٹر :
اقبال ، دی پوئٹ اینڈ ہز مسیج (Iqbal , The Poet and his Message) مطبوعہ نیشنل پریس الہ آباد سنہ ۱۹۴۷ع

شریف الدین ، پیرزادہ :
پاکستان منزل بمنزل ، طبع اول اگست سنہ ۱۹۶۵ع مطبوعہ انجمن پریس کراچی
فاؤنڈیشنز آف پاکستان جلد دوم (Foundations of Pakistan Vol. II) مطبوعہ نیشنل پبلشنگ ہاؤس کراچی سنہ ۱۹۶۹ع

طاہر محمد ، فاروقی :
" سیرت اقبال " ناشر قومی کتب خانہ لاہور طبع سوم ستمبر سنہ ۱۹۴۹ع

طالوت :
نظریہ قومیت ، مولانا حسین احمد مدنی اور علامہ اقبال ناشر کتب خانہ قاسمیہ لدھیانہ

طفیل احمد ، منگلوری :
" مسلمانوں کا روشن مستقبل " مطبوعہ دہلی سنہ ۱۹۴۵ع

عاشق حسین ، بٹالوی ، ڈاکٹر :
" اقبال کے آخری دو سال " ناشر اقبال اکادمی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۱ع

عبدالسلام ندوی ، مولانا :
" اقبال کامل " مطبوعہ دارالمصنفین اعظم گڑھ سنہ ۱۹۴۸ع

عبدالسلام خورشید ، ڈاکٹر :
" صحافت پاکستان و ہند میں " ناشر مجلس ترقی ادب لاہور طبع اول جون سنہ ۱۹۶۳ع
"کاروان صحافت " ناشر انجمن ترقی اردو کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۶۴ع

عبدالقدیر ، بلگرامی :
مہاتما گاندھی کے نام کھلا خط (An open Letter to Mahatma Gandhi) شائع کردہ پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کراچی مطبوعہ سنہ ۱۹۷۰ع

عبداللطیف ، سید ، ڈاکٹر :
دی کلچرل فیوچر آف انڈیا (The Cultural Future of India) مطبوعہ ٹائمز آف انڈیا پریس بمبئی سنہ ۱۹۳۸ع

عبدالمالک آروی :
اقبال کی شاعری ، ناشر ادارۂ طاق دبستان مطبوعہ سنہ ۱۹۴۶ع

عبدالوحید خاں :
تاثرات و تصورات ، ناشر مکتبۂ ایوان ادب لاہور مطبوعہ نقوش پریس طبع اول دسمبر سنہ ۱۹۶۰ع

عظیم حسین :
فضل حسین : ایک سیاسی سوانح عمری (Fazal Hussain : A Political Biography) مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۴۵ع

غلام دستگیر رشید (مرتب) :
" آثارِ اقبال " مطبوعہ حیدر آباد دکن سنہ ۱۹۴۶ء
" فکرِ اقبال " مطبوعہ کراچی طبع دوم سنہ ۱۹۵۶ء
کوپ لینڈ :
" انڈیا ، اے ری اسٹیٹ منٹ " (India, A Re-statement)
گاندھی ، ام ۔ کے ، مہاتما :
" تلاشِ حق " (خود نوشت سوانح عمری مترجمہ ڈاکٹر سید عابد حسین)
ناشر مکتبۂ جامعہ دہلی طبع چہارم سنہ ۱۹۳۹ء
مارس گائر اینڈ اپاڈوری :
اسپیچس اینڈ ڈاکومنٹس آن دی انڈین کانسٹی ٹیوشن (Speeches and Documents on the Indian Constitution) مطبوعہ بمبئی سنہ ۱۹۵۷ء
ماریسن ، تھیوڈور :
" ہندوستان میں شہنشاہی حکومت "
محمد علی ، جوہر ، مولانا :
مضامین محمد علی حصہ اول و حصہ دوم مرتبہ محمد سرور مطبوعہ مکتبہ جامعہ دہلی ، طبع اول سنہ ۱۹۴۰ء
محمود نظامی (مرتب) :
ملفوظات اقبال مطبوعہ لاہور ، بار اول
مزمدار ، اے ، سی :
" اہلِ ہند کا ارتقا "
مصلح ، ابو محمد :
اقبال اور قرآن ، مطبوعہ حیدر آباد دکن

مطلوب الحسن ، سید :
محمد علی جناح : اے پولیٹیکل اسٹڈی (Mohammad Ali Jinnah : A Political Study) ناشر شیخ محمد اشرف کشمیری بازار لاہور
مطبوعہ سنہ ۱۹۴۵ء

وحید الدین ، فقیر ، سید :
" روزگار فقیر " جلد اول مطبوعہ لائن آرٹ پریس کراچی بار چہارم
مئی سنہ ۱۹۶۳ء بار پنجم سنہ ۱۹۶۵ء جلد دوم مطبوعہ کراچی
بار دوم نومبر سنہ ۱۹۶۴ء
"حیات اقبال " شائع کردہ تاج کمپنی لاہور
قانون دستور حکومت ہند سنہ ۱۹۳۵ء (Government of India Act 1935)

اخبار ، رسالے ، یادداشتیں ، رپورٹیں

کامریڈ (Comrade) بابتہ سنہ ۱۹۱۳ء

ہمدرد ، بابتہ سنہ ۲۶ ، ۲۷ ، ۲۸ ، ۱۹۲۹ء

انقلاب لاہور (روز نامہ) ، بابتہ سنہ ۲۷ ، ۲۸ ، ۲۹ ، ۳۰ ، ۳۱ ، ۳۲ ، ۳۳ ، ۱۹۳۵ء

زمیندار لاہور (روز نامہ) ، بابتہ سنہ ۲۹ ، ۱۹۲۷ء

اخبار ٹریبیون لاہور (Tribune) ، بابتہ سنہ ۱۹۳۱ء

اخبار لیڈر الہ آباد (Leader) ، بابتہ سنہ ۱۹۳۳ء

سول اینڈ ملٹری گزٹ لاہور (Civil and Military Gazzette)
بابتہ سنہ ۱۹۲۶ء و ۱۹۳۶ء

پاکستان ٹائمز لاہور (Pakistan Times) ، بابتہ سنہ ۱۹۶۲ع

اخبار امروز (روز نامہ) کراچی ، بابتہ سنہ ۱۹۵۰ع

اخبار جنگ (روز نامہ) کراچی ، بابتہ سنہ ۱۹۶۷ع و ۱۹۷۱ع

انڈین اینول رجسٹر (Indian Annual Register) ، بابتہ سنہ ۱۹۲۸ع جلد اول و دوم ، بابتہ سنہ ۱۹۳۱ع جلد اول و دوم ، بابتہ سنہ ۱۹۳۷ع جلد اول -

کانگریس بلیٹن نمبر ۴ ، بابتہ ۱۲ اگست سنہ ۱۹۳۴ع

نیرنگ خیال لاہور (ماہ نامہ) اقبال نمبر

جوہر اقبال (رسالہ) شمارۂ خصوصی یاد گار علامہ اقبال مطبوعہ سنہ ۱۹۳۸ع ، ناشر انجمن اتحاد جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی

رسالۂ اردو ، اقبال نمبر طبع جدید سنہ ۱۹۳۸ع

یادداشت مسلم لیگ (Memorandum of Muslim League) برائے سائمن کمیشن ، مطبوعہ نیو یونین پریس لاہور

رپورٹ سائمن کمیشن مطبوعہ لندن سنہ ۱۹۳۰ع (Indian Statutory Commission, Chairman Sir John Simon Report London) 1930

رپورٹ گول میز کانفرنس جلد اول و دوم (Indian Round Table Conference Minutes Vol. I, II)

رپورٹ آل پارٹیز کانفرنس الہ آباد سنہ ۱۹۲۸ع (All Parties Conference, 1928 Report of the Committee to determine the Principles of the Constitution of India, Allahabad, 1928

رپورٹ مشترکہ پارلیمانی کمیٹی مطبوعہ لندن (Report from the Joint Select Committee of the House of Lords and the House of Commons on the Government of India Bill)

رپورٹ رولٹ کمیٹی (Sedition Committee Report, Chairman : Justice S.A.T. Rowlatt Calcutta, 1918)

رپورٹ : بریف نوٹ آن دی ایڈمنسٹریشن آف جموں اینڈ کشمیر سنہ ۱۹۳۱ء (Brief Note on the Administration of Jammu and Kashmir, 1931)

رپورٹ گلانسی کمیشن

رپورٹ صوبہ سرحد کی تحقیقاتی کمیٹی بابتہ سنہ ۱۹۲۴ء

رپورٹ پنجاب اسمبلی جلد نمبر ۱۶ مورخہ ۱۱ مارچ سنہ ۱۹۴۱ء

اشاریه

- اشخاص
- اماکن

اشخاص

چ

ح

ش

ص

ض

ط

ظ

غ

ف

ن

و

ہ

ی

—:o:—

اماکن

الف

پ

ت

ج

م

ی

—:o:—

اغلاط نامہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۳	۸	فومی	قومی
۶	۱۳	نبشنل	نیشنل
۱۰	۱۳	شبواجی	شیواجی
۱۰	۲۳	بون	یون
۳۵	۱۵	یزار	بیزار
۳۹	۲۵	ساملو	شاملو
۵۳	۱۴	توضبح	توضیح
۷۱	۲۱	Rowaltt Bill	Rowlatt Bill
۷۵	۱۶	صلح پائیں	صلح طے پائیں
۹۳	۲۵	خود مندان	خرد مندان
۹۵	۱۵	چس	جس
۹۸	۲۴	علحیدہ	علیحدہ
۹۹	۲۲	قائدبن	قائدین
۱۰۱	۲۵	زاوہٗ	زاویہٗ
۱۰۸	۱۸	مقاطمہ	مقاطعہ
۱۰۸	۲۱	اسکبم	اسکیم
۱۰۸	۲۶	جبکر	جیکر
۱۱۲	۱۴	کلکنہ	کلکتہ
۱۲۰	۱۰	منسقل	مستقل
۱۵۷	۱۵	بیں	میں

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۱۷۷	۱۲	اننخاب	انتخاب
۱۸۹	۱	کے	سے
۱۹۲	۱۳	نحفظ	تحفظ
۲۰۶	۱۲	یغ	یعنی
۲۰۷	۸	مغرپی	مغربی
۲۰۹	۲۷	نحریکات	تحریکات
۲۱۶	۸	Member Sleeping	Sleeping Member
۲۲۹	۲	پابلدی	پابندی
۲۳۱	۱ ، ۵	توضیع	توضیح
۲۳۷	۱۲	آبرور	آبزرور
۲۴۳	۲۲	ایمرے میکڈانلد	ریمزے میکڈانلڈ
۲۵۹	۱۷	یونٹی	یونیٹی
۲۸۹	۳	کبا	کیا
۲۹۷	۱۴	اراکبن	اراکین
۳۰۳	۸	لایخل	لاینحل
۳۰۷	۲۷	روسرا	دوسرا
۳۰۹	٦	نئی	نئی
۳۲۰	٦	پیاں	بیان
۳۲۷	۲۲	بوطانوی	برطانوی
۳۰۳	۵	Undisciplened	Undisciplined
۳۳۴	۱۲	آ ی	تھی
۳۵۴	۱٦	اک	ایک
۳٦۰	۱	ھی	بھی
۳٦۴	۲۵	اوبچی	اونچی
۳٦۷	٦	ض	محض
۳۸۵	۱۱	لارڈ لنگٹن	لارڈ ولنگڈن
۴۲۵	۴	برظانیہ	برطانیہ

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۴۴۴	۲۰	کارگوگر	کارگر
۴۶۶	۵	تعنیرات	تغیرات
۵۰۱	۱۰	ناریگ	نارنگ
۵۶۰	۲۲	ہویا یا	ہو پایا
۵۶۴	۱۲	جورسپروڈنڈس	جورسپروڈنس
۵۶۶	۳	کے	کی
۵۷۵	۲۰	آب	آپ
۵۹۷	۱۶	ہونا	ہوتا
۶۴۶	۱۰	تعلیم و تعلیم	تعلیم و تدریس
۶۴۶	۲۳	کروں گا	کروں گا
۶۴۷	۱۲	کنابوں	کنایوں
۶۵۳	۸	تیں	تین
۶۵۴	۲۲	اسپریزم	امپیریلزم
۶۶۳	۱	آہ گا	آگاہ
۶۶۴	۱۰	عام بشیریت	عالم بشریت
۶۷۵	صفحہ نمبر	۴۷۵	۶۷۵
۶۷۸	۲۰	اس ثقافت	اس کی ثقافت
۶۸۰	۲۵	نتائج	نتائج
۶۸۲	۱۹	پر	پر
۷۰۹	۱۳	توڑ	توڑنا
۷۱۸	۲	انشا پروازوں	انشا پردازوں
۷۱۸	۴	تحویک	تحریک
۷۲۳	۹	Seclarism	Secularism
۷۲۸	۱۶	بنی نوع	بنی نوع
۷۶۰	۱۵	ابتدا ہیں	ابتدا میں
۷۶۸	۱۴	ہرج	حرج
۷۷۴	۴	دوسر	دوسرا

صفحہ	سطر	غلط	صحیح
۷۷۵	۱	پ س	پاس
۷۷۵	۲	کیا	کیا
۷۹۸	۲۵	ایک	ایک
۷۹۸	۲۶	معرب	مغرب
۷۹۸	۲۶	بوطانوی	برطانوی
۷۹۸	حاشیہ	کوب لینڈ	کوپ لینڈ
۸۳۰	۳	راشپٹریتی	راشترپتی
۸۴۲	۱۱	رجحان	رجحان
۸۴۳	۸	ڈاکٹر	ڈاکٹر
۸۴۶	۱۲	پہنچ	پہنچ
۸۵۳	۱	افغالی	افغانی
۸۵۶	۲۳	تہذبی	تہذیبی
۸۷۲	۱۳	اشنیاق حسین	اشتیاق حسین
۸۷۶	۳	پینا	پٹنا
۸۹۳	۴	روشنائی	روشنائی
۸۹۵	۳	جائز	جائزہ
۸۹۸	حاشیہ	حمزہ قاروقی	حمزہ فاروقی
۹۲۷	۲۴	کوپا لینڈ	کوپ لینڈ

——:o:——